تفسیر مظہری
تالیف
ضیاء القرآن پبلیکیشنز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفسیر مظہری جلد اوّل

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیر اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین ۔ بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور ۔ کراچی ۔ پاکستان

نام کتاب	تفسیر مظہری (جلد اول)
تالیف	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ
	مولانا محمد انور مگھالوی
	فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد	ایک ہزار
اشاعت	دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ	1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

فیکس:۔ 042-7238010

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

ادارہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز اپنے آغاز سے علم دین کی ترویج واشاعت کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے اور اپنے قارئین تک ایسی کتب پہنچا رہا ہے جو ظاہری ومعنوی حسن سے آراستہ و پیراستہ ہوتی ہیں، انہیں کاوشوں کی بناء پر اسے کثیر قارئین کا اعتماد حاصل ہے جو اس کا عظیم سرمایہ ہے۔

ہماری ہمیشہ سے یہ خواہش اور کوشش رہی ہے کہ اپنے احباب کی خدمت میں جب بھی نئی کتاب کی صورت میں کوئی تحفہ پیش کریں تو وہ ہمارے اس اعتماد کے رشتہ کو مضبوط سے مضبوط تر کرے۔

آج ہم آپ کی خدمت میں تفسیر مظہری کی صورت میں ارمغان محبت پیش کر رہے ہیں جو بیہقیٔ زماں علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہ العزیز کا علمی شاہکار ہے۔ یہ ہماری چار سالہ مسلسل محنتوں کا ثمر ہے۔

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف کے زیر انتظام دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کے تین فضلاء نے اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے اور دارالعلوم کے پچاس سے زائد فضلاء نے عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے اس کے مصادر کی تخریج کی ہے۔ اس کے لئے ہمیں کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، اس راستہ کے شناور پر وہ مخفی نہیں۔ تاہم آپ کی محبتوں کی صورت میں جو صلہ ملتا ہے وہ تمام تھکن کو دور کر دیتا ہے، مالی اخراجات سے صرف نظر کرنے پر مجبور کرتا ہے اور ہمیں نیا عزم وحوصلہ عطا کرتا ہے۔

ہم نے اپنے رب کریم سے عہد کر رکھا ہے کہ احباب کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے، ان کے حسن ذوق کو کبھی ٹھیس نہ پہنچائیں گے اور ان کے اعتماد پر پورا اترنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔

طالب دعا

محمد حفیظ البرکات شاہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دل کی بات

انسان کی زندگی میں بعض ساعتیں ایسی آتی ہیں جو اس کی زندگی کا رخ متعین کرتی ہیں۔ انہی سعید ساعتوں کے طفیل انسان ایسے ایسے عظیم کام کر گزرتا ہے جن کا پہلے اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔

ہمارے لئے وہ لمحات بڑی خوش بختیاں لائے جب محمد حفیظ البرکات شاہ صاحب اور میجر (ر) محمد ابراہیم شاہ صاحب مدظلہما العالی نے جنوری 1999ء میں حضرت خواجہ پیر محمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کے موقع پر فرمایا کہ ہماری خواہش ہے کہ تفسیر مظہری کا اردو زبان میں ترجمہ کرائیں۔ ادارہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز کی طرف سے اس کی اشاعت کا شاندار انداز میں اہتمام کیا جائے گا۔

تفسیر مظہری سے لگاؤ اور محبت تو پہلے سے موجود تھی کیونکہ حضور ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر ضیاء القرآن میں علمی مسائل کی توضیح میں تفسیر مظہری کا اکثر حوالہ دیا۔ تفسیر مظہری کی عبارات اور توجیہات پڑھ کر دل کو اطمینان و ایقان نصیب ہوتا، ساتھ ہی ساتھ تفسیر بیضاوی کی تدریس کے دوران اس سے استفادہ کا موقع بھی ملا۔ تاہم علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہ العزیز کے علمی شاہکار "تفسیر مظہری" کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا خواب و خیال بھی نہ تھا، اس کا باعث ان دونوں حضرات کی توجہ اور خواہش بنی۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کام کی تکمیل کا سہرا بھی انہیں کے سر سجتا ہے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اگر اس کام کے مکمل ہونے تک آپ کی پیہم شفقت اور فراخدلی کے ساتھ مالی تعاون شامل حال نہ ہوتا تو یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکتا۔

حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے تفسیر میں علم تجوید و قرأت کے قواعد اور ائمہ قرأت کے اقوال، علم نحو کے دقیق مسائل اور نحوی تراکیب، ائمہ فقہ کے اقوال اور مسائل فقہ نیز تصوف کے اسرار و رموز کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت کسی بحث کو حذف نہیں کیا گیا بلکہ ان علمی مباحث کو آسان فہم الفاظ میں اردو زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جب ہم یہ ترجمہ کر رہے تھے، اس عرصہ میں دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف میں ضیاء القرآن کے مصادر کی تخریج کا کام جاری تھا۔ ہم نے محمد حفیظ البرکات شاہ صاحب کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہمارا ارادہ ہے کہ موجودہ دور کی ضروریات کے مطابق تفسیر مظہری کے مصادر کی تخریج بھی کرائی جائے تو آپ نے بڑی خندہ پیشانی سے اس تجویز کو قبول کیا اگرچہ اس کام کی وجہ سے ضیاء القرآن پبلی کیشنز کو بے شمار زائد وسائل صرف کرنا پڑے، انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑی اور مسودہ کی اصلاح کے لئے کئی بار علماء سے رجوع کرنا پڑا لیکن اس دوران کبھی ان کی پیشانی پر شکن نمودار نہ ہوئی۔

ہم دار العلوم کے ان فضلاء کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں جنہوں نے تفسیر مظہری کے مصادر کی تخریج کا کام اپنے ذمہ لیا اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے دورہ حدیث شریف کے سال کا اکثر وقت اس کام میں صرف کیا۔ گرمی اور

سردی کی شدت ان کے حوصلوں کو پست نہ کر سکی۔ اپنے مقالات کے معائنہ کے دوران کمال صبر و حوصلہ کا مظاہرہ کیا اور اہل علم کے سامنے یہ ارمغانِ محبت پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی بارگاہ سے خصوصی نوازشات عطا فرمائے اور انہیں دنیا میں مینارۂ ہدایت بنائے۔

ہم علامہ افتخار احمد تبسم کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے مسودہ پر نظر ثانی کی، مصادر کو مسودہ پر منتقل کرنے سے لے کر اس کی تصحیح کے تمام مراحل کا کام سرانجام دیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے طفیل ان کے علم و عمل میں برکتیں عطا فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔

سید محمد اقبال شاہ گیلانی، محمد انور مگھالوی، ملک محمد بوستان

فضلاء و اساتذہ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ

بھیرہ شریف

تخریج مصادر کے بارے میں چند گزارشات

1۔ حضرت مفسر علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بیہقی وقت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ نے ایک حدیث کے مراجع کے طور پر کئی کتب کے نام لکھے ہیں تاہم تخریج میں صرف ایک کتاب کے حوالہ پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

2۔ اگر حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے دوسری کتب کے ساتھ صحاح ستہ میں سے کسی کتاب کا ذکر کیا ہے تو تخریج میں صحاح ستہ کو ترجیح دی گئی ہے۔

3۔ صحیحین میں سے اس کتاب کے حوالہ کی تخریج کی کوشش کی گئی ہے جو الفاظ میں زیادہ موافقت رکھتی تھی۔

4۔ متفق علیہ حدیث کا حوالہ عموماً مشکوٰۃ شریف سے نقل کیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض مواقع پر صحاح ستہ کے حوالے بھی مشکوٰۃ شریف کے دیئے گئے ہیں کیونکہ الفاظ میں مکمل مطابقت ملتی ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے مشکوٰۃ شریف کو ہی پیش نظر رکھا ہے۔

5۔ ایک وقت میں علماء کرام کی کثیر تعداد کام کر رہی تھی اور لائبریری میں مختلف مطابع کے شائع کردہ سیٹ موجود تھے جس وجہ سے مختلف اشاعتی اداروں کی کتب سے استفادہ کیا گیا۔ قارئین کی سہولت کے لئے مکتبوں کے نام تحریر کر دیئے گئے ہیں تاکہ ابہام پیدا نہ ہو۔

6۔ پہلی دفعہ مطبع کا مکمل نام دیا گیا ہے، بعد میں اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اشارہ کر دیا گیا ہے۔

7۔ حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے مفسرین کے اقوال معالم التنزیل المعروف تفسیر بغوی، تفسیر خازن اور در منثور سے اخذ کئے ہیں۔ جن تفاسیر کو مختلف مطابع نے شائع کیا ہے۔ قارئین کی سہولت کے پیش نظر آخری جلدوں میں زیر آیت ہذا لکھا گیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ان تفاسیر کی ان آیات کے تحت یہ قول دیکھا جا سکتا ہے۔

التقدیم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ رب العٰلمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہٖ واصحابہٖ اجمعین الی یوم الدین۔ اما بعد!

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے دست قدرت سے تخلیق فرما کر اور وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ کی سعادت سے بہرہ ور فرما کر مسجود ملائک ہونے کا شرف عظیم عطا فرمایا اور پھر اس صفحۂ گیتی پر اپنا خلیفہ بنا کر مبعوث فرمایا۔ تو اس طرح آپ کی وساطت سے ساری اولادِ آدم کو تمام مخلوقات میں اَفْضَلُ الْخَلْق ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ انسان کی اسی عصمت ورفعت اور عزت وکرامت کو دیکھ کر ابلیس لعین حسد وبغض کی آگ میں جل گیا۔ لہٰذا اس نے حضرت انسان کو صراطِ مستقیم سے بھٹکانے اور خالق حقیقی سے اس کا رشتہ بندگی توڑنے کا بیڑہ اٹھایا اور پھر اپنی تمام تر توانائیاں اور قوتیں اسے اپنے مکروفریب میں پھنسانے کے لئے صرف کرنے لگا۔ لیکن اس کے برعکس رحمٰن ورحیم رب نے اپنے بندوں کی اصلاح اور انہیں آدابِ بندگی کی تعلیم دینے کے لئے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء ورسل علیہم السلام کی ایک کثیر تعداد مختلف اوقات اور مختلف علاقوں میں مبعوث فرمائی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی جناب خاص سے نصاب تعلیم کے طور پر مخصوص کتب اور صحائف بھی ان پر نازل فرمائے۔ تاکہ راہ ہدایت کے متلاشی علم کے نور سے اپنے سینوں کو منور کر کے حقوق بندگی ادا کرتے ہوئے بندہ نوازی کے استحقاق کی صلاحیت حاصل کر لیں اور راستے کی تمام تر مشکلات، کفر وشرک کی ظلمتوں اور شیطانی ہتھکنڈوں کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے عرفان ربانی کے ادراک کی نعمت سے مالا مال ہو سکیں۔ چنانچہ یہ سلسلہ مسلسل چلتا رہا یہاں تک کہ باری آئی مقصودِ کائنات، حضرت آمنہ کے دریتیم اور محبوب رب العالمین سیدنا ومولانا حضرت محمد مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ والثناء کی۔ آپ ﷺ ختم نبوت کا تاج سجا کر رحمۃ للعالمینی کا لباس زیب تن فرما کر اور رشد وہدایت کا آخری صحیفۂ حیات ساتھ لے کر اس جہانِ رنگ وبو میں قدم رنجہ فرما ہوئے۔ انسانیت کا بخت سنورا، نورِ قرآن ہر سو پھیلا، کفر وضلالت کے اندھیرے کافور ہوئے، قلوب واذہان اسلام کی ضو سے روشن ہوئے، ابلیس کے گھر صفِ ماتم بچھی، انسان کے بختِ خفتہ کو بیدار کرنے کے لئے قرآن کی صورت میں حبل اللہ میسر آئی اور پروردگارِ عالم کے ساتھ رشتہ عبودیت میں استحکام پیدا ہوا۔

قرآن کریم وہ صحیفۂ حیات ہے جو انسان کو اپنے خالق اور مالک حقیقی کا پتہ دیتا ہے۔ مقامِ انسانیت سے آگاہ کرتا ہے۔ معاملاتِ حیات کو سنوارنے کا سلیقہ سکھاتا ہے، چاہے ان کا تعلق دنیا سے ہو یا آخرت سے، حالتِ امن میں عبادت وریاضت سے ہو یا حالت جنگ میں شجاعت وبہادری سے، ان کا تعلق معاشرت سے ہو یا معاش سے، تجارت سے ہو یا سیاست سے۔ المختصر وہ ایک عام شہری ہو یا حاکم وقت، قرآن کریم زندگی کے جمیع معاملات میں ہر ایک کی اتنی حسین اور دلکش راہنمائی فرماتا ہے کہ جو بھی اپنی حیاتِ مستعار کو اس کے احکام اور نصیحت کے تابع بنالے، ناکامی اس کے قریب دم نہیں مار سکتی۔ یہ قرآن ہی کا فیضان ہے کہ اس نے عرب کے بدوؤں اور تہذیب وثقافت سے ناآشنا لوگوں کو دنیا کا امام بنا دیا۔ حقوقِ انسانیت اور آدابِ معاشرت سے ناواقف لوگوں کو ہادی ورا ہبر بنا دیا۔

قرآن ایک ایسا آفتابِ عالم تاب ہے جو تا ابد قلوب واذہان کو نورِ حق سے منور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ باطل کے اندھیروں کو مٹانے کی قوت رکھتا ہے، اعمال میں تقویٰ وطہارت کا حسن پیدا کرتا ہے اور نظم کائنات میں تدبر وتفکر کا درس دیتا ہے۔ آنکھوں میں شرم وحیات کی طراوت، زبان میں حق وصداقت کی حلاوت، عمل میں دیانت وشرافت کی نفاست، معاملات میں معاملہ فہمی کی ظرافت اور فکر میں گہرائی وگیرائی کی وسعت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ آنکھوں میں شرم وحیا ہو اور پھر بے حیائی اور فحاشی جنم لے سکے، زبان قولِ حق کی امین ہو اور پھر کذب وافترا پردازی پنپ سکے، باہمی معاملات میں ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری کا احساس ہو اور پھر قتل وغارت گری عام ہو جائے۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن ہمارے دین ودنیا کا محافظ ہے، یہ ہمارے امن وسکون کا ضامن ہے، یہ ہماری مسرتوں اور خوشیوں کی نوید ہے۔

نزولِ قرآن کے دور کا عرب معاشرہ اس پر شاہد عادل ہے کہ جیسے جیسے قرآن کریم کی آیات بینات کا نزول ہوتا رہا ان کے طرزِ معاشرت اور نظمِ حیات میں ایک انقلاب رونما ہوتا گیا۔ چونکہ قرآن کریم مکمل طور پر بذریعہ وحی نازل ہوا، اس لئے یہ ضروری ہے کہ وحی کے معانی اور اقسام کا تذکرہ کیا جائے۔ لہٰذا ملاحظہ فرمایئے۔

وحی کا بیان

چونکہ دیگر صحائف اور کتبِ سماوی کی طرح قرآن مجید فرقان حمید بھی بذریعہ وحی خاتم الانبیاء حضور نبی رحمت ﷺ پر نازل کیا گیا ہے۔ اس لئے بنیادی طور پر یہ امر لازم ہے کہ اولاً وحی کا معنی ومفہوم ذہن نشین کر لیا جائے۔

وحی کی لغوی تعریف

فِيْ لُغَةِ الْعَرَبِ اَنَّ الْوَحْيَ الْاِشَارَةُ وَالْكِتَابَةُ وَالرِّسَالَةُ وَالْاِلْهَامُ وَالْكَلَامُ الْخَفِيُّ وَكُلُّ مَا اَلْقَيْتَهُ اِلٰى غَيْرِكَ (عمدۃ القاری: ج 1، ص 14)

لغتِ عرب میں لفظِ وحی متعدد معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اشارہ کرنا، لکھنا، رسالت کرنا، الہام کرنا، سراً کلام کرنا اور کسی غیر کی طرف کوئی چیز القاء کرنا۔

لغوی معنی کے اعتبار سے لفظِ وحی صرف انبیاء علیہم السلام کے لئے مختص نہیں، بلکہ غیر انبیاء حتیٰ کہ حیوانات کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ارشادِ ربانی ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ (قصص: 7)

اور ہم نے الہام کیا موسیٰ کی والدہ کی طرف کہ اسے (بے خطر) دودھ پلاتی رہو پھر جب اس کے متعلق تمہیں اندیشہ لاحق ہو تو ڈال دینا اسے دریا میں اور نہ ہراساں ہونا اور نہ غمگین ہونا۔

اس آیت طیبہ میں لفظِ وحی القاء اور الہام کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور یہ الہام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ہوا۔

اسی طرح سورہ نحل میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿68﴾ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (النحل:68,69)

اور ڈال دی آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات کہ بنایا کر پہاڑوں میں (اپنے) چھتے اور درختوں (کی شاخوں) میں اور ان چھپروں میں جو لوگ بناتے ہیں۔ پھر رس چوسا کر ہر قسم کے پھلوں سے پس چلتی رہا کر اپنے رب کی آسان کی ہوئی راہوں پر۔

اس آیت کریمہ میں بھی وحی کا لفظ القاء اور الہام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مگر یہ ایسا القاء ہے جو خالق کائنات نے مکھی کی سرشت اور فطرت میں رکھ دیا ہے۔ گویا یہ لفظ جبلی ادراک کے معنی میں مستعمل ہے۔

اور سورۂ مریم میں ارشاد فرمایا:

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (مریم:11)

پھر آپ نکل کر آئے اپنی قوم کے پاس (اپنے) عبادت خانہ سے تو اشارہ سے انہیں سمجھایا کہ تم پاکی بیان کرو (اپنے رب کی) صبح و شام۔

اس آیت طیبہ میں لفظ وحی اشارہ اور بعض کے نزدیک کتابت کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور یہ تذکرہ حضرت زکریا علیہ السلام کا ہے جو ایک نبی تھے۔

نتیجہ مذکورہ تینوں آیات بینات سے یہ ثابت ہوا کہ لفظ وحی اپنے لغوی معانی کے اعتبار سے عام ہے اور اس کا استعمال انبیاء علیہم السلام اور غیر انبیاء تمام کے لئے ہوا ہے۔

شرعی تعریف

اَمَّا الْوَحْيُ فَمَعْنَاهُ فِيْ لِسَانِ الشَّرْعِ "اَنْ يُّعْلِمَ اللّٰهُ تَعَالٰى مَنِ اصْطَفَاهُ مِنْ عِبَادِهٖ كُلَّ مَا اَرَادَ اِطْلَاعَهٗ عَلَيْهِ مِنْ اَلْوَانِ الْهِدَايَةِ وَالْعِلْمِ، وَلٰكِنْ بِطَرِيْقَةٍ سِرِّيَّةٍ خَفِيَّةٍ، غَيْرِ مُعْتَادَةٍ لِلْبَشَرِ۔

اصطلاح شرع میں وحی سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے منتخب بندوں کو علوم اور ہدایت میں سے اُن تمام چیزوں سے آگاہ کرنا ہے، جن سے وہ انہیں مطلع کرنے کا ارادہ فرمائے۔ مگر یہ اطلاع سرًّا اور خفیۃً ہوتی ہے اور عرف بشری کے مطابق نہیں ہوتی۔ (مناہل العرفان فی علوم القرآن: ج1، ص:64 از شیخ محمد العظیم زرقانی ازہری)

وحی اپنے اس معنی کے اعتبار سے گروہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے۔ کوئی دوسرا اس میں ان کے ساتھ شریک نہیں۔ لہٰذا حضور نبی رحمت ﷺ کی ذات اقدس پر سلسلۂ رسالت مکمل ہو جانے کے ساتھ ہی نزولِ وحی کا سلسلہ بھی اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ اس لئے آپ ﷺ کے بعد نہ ہی کوئی رسول مبعوث ہوگا اور نہ ہی کسی پر وحی کا نزول ہوگا۔

وحی کی اقسام

وحی کی اقسام سے مراد اس کے وہ مختلف طرق اور انداز ہیں جنہیں اپناتے ہوئے خالق کائنات اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام کو اپنی

مخصوص ہدایات اور پیغامات سے نوازتے ہیں۔ اس اعتبار سے وحی کی چار قسمیں ہیں:

1: القاء فی القلوب 2: پس پردہ ہمکلام ہونا 3: بذریعہ فرشتہ پیغام پہنچانا 4: رؤیاء صادقہ۔

پہلی تینوں قسموں کا ذکر اس ارشاد گرامی میں کیا گیا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (الشوریٰ:51)

اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ کلام کرے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ (براہ راست) مگر وحی کے طور پر یا پس پردہ یا بھیجے کوئی پیغامبر (فرشتہ) اور وہ وحی کرے اس کے حکم سے جو اللہ تعالیٰ چاہے۔

ان اقسام کی مختصر وضاحت درج ذیل ہے:

1: القاء فی القلوب

اس سے مراد یہ ہے کہ رب کریم کی طرف سے بغیر کسی واسطہ اور وسیلہ کے نبی کے دل میں ایسی بات ڈال دی جاتی ہے جو قطعی اور یقینی ہونے کے ساتھ ساتھ تمام تر شکوک وشبہات سے مبرا ہوتی ہے۔ اس قسم کو الہام اور نفث فی الروح کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ القاء فی القلب کبھی عالم بیداری میں ہوتا ہے جیسے حضور نبی رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رُوْعِيْ اَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ اَجَلَهَا وَرِزْقَهَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَجْمِلُوا الطَّلَبَ (سنن ابن ماجہ، باب التجارات)

بیشک روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ کوئی نفس اپنی مدت معینہ اور اپنا رزق مکمل ہونے سے قبل ہرگز نہیں مرے گا۔ پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور حسین انداز میں اپنا دامن طلب پھیلاؤ۔

آیت طیبہ میں "اِلَّا وَحْيًا" سے یہی قسم مراد ہے۔

2: پس پردہ ہمکلام ہونا

وحی کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خالق کائنات بلا واسطہ نبی سے اس طرح ہمکلام ہوتا ہے کہ نبی کے کان آواز تو سنتے ہیں مگر اس کی آنکھ متکلم کا مشاہدہ نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ وادی مقدس "طویٰ" میں ہوا۔ آپ نے اچانک ایک آگ ملاحظہ کی تو اپنی اہلیہ سے فرمایا:

اُمْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا (طہ:10)

اپنے گھر والوں کو کہا تم (ذرا یہاں) ٹھیرو۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔

پھر فرمایا:

"فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ (طہ:11-12)

پس جب آپ وہاں پہنچے تو ندا کی گئی اے موسیٰ! بلاشبہ میں تیرا پروردگار ہوں۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ (الاعراف:143)

اور جب آئے موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر اور گفتگو کی ان سے ان کے رب نے (تو اس وقت) عرض کی اے میرے رب! مجھے دیکھنے کی قوت دے۔

یہاں خالق کائنات نے اپنے پیارے کلیم کو شرف ہمکلامی تو بخشا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام شرف دیدار حاصل نہ کر سکے۔

تنبیہ:۔ یہ پیش نظر رہے کہ رب قدوس جسے مقام محبوبیت پر فائز فرمادے، اُسے شرف ہمکلامی کے ساتھ سعادت دیدار سے بھی بہرہ ور فرما دیتا ہے۔ پھر یہ کبھی عالم بیداری میں ہوتا ہے اور کبھی حالت خواب میں۔ جیسا کہ شب معراج رب کریم نے اپنے محبوب ﷺ کو لامکان کی بلندیوں پر یاد فرما کر اپنے حریم ناز میں دَنٰى فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى کا قرب عطا فرمایا اور اپنی شان قدرت کے مطابق اپنے محبوب سے راز و نیاز کی گفتگو فرما کر اپنی لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰى عنایات کریمانہ اور نوازشات رحیمانہ سے نوازا اور اس گفتگو کو صیغۂ راز میں رکھتے ہوئے فرمایا "فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى" اور حالت خواب میں دیدار اور کلام کا اثبات "رَأَيْتُ رَبِّيْ فِيْ أَحْسَنِ صُوْرَةٍ۔ الحديث" حدیث طیبہ سے ہوتا ہے۔

(مع القرآن الکریم:69، از شیخ جاد الحق علی جاد الحق شیخ الازہر)

3: بذریعہ فرشتہ پیغام پہنچانا

نزول وحی کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ رب کریم کسی فرشتہ کے واسطہ اور وسیلہ سے اپنا پیغام نبی تک پہنچاتا ہے۔ قرآن کریم مکمل طور پر بواسطہ جبرئیل امین علیہ السلام ہی حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر نازل ہوا۔ جیسا کہ رب کریم ارشاد فرماتا ہے:

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ:97)

آپ فرمایئے جو دشمن ہو جبریل کا (اسے معلوم ہونا چاہئے) کہ اس نے اتارا قرآن آپ کے دل پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔

سورۂ نحل آیت 102 میں ارشاد ہے:

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ

فرمایئے نازل کیا ہے اسے روح القدس نے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ تا کہ ثابت قدم رکھے انہیں جو ایمان لائے ہیں اور یہ ہدایت اور خوشخبری ہے مسلمانوں کے لئے۔

اور سورۂ شعراء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۙ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (الشعراء:193-194)

اترا ہے اسے لے کر روح الامین (یعنی جبریل) آپ کے قلب (منیر) پر تا کہ بن جائیں آپ (لوگوں کو) ڈرانے والوں سے۔

وحی کی اس نوع کی پھر تین صورتیں ہیں:

1: انسانی شکل میں فرشتہ کا آنا 2: ملکی شکل میں فرشتہ کا آنا 3: صلصلة الجرس۔

1: انسانی شکل میں فرشتہ کا آنا

وحی لے کر کبھی حضرت جبرئیل امین علیہ السلام انسانی شکل میں حضور نبی رحمت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے۔ اس طرح کہ حاضرین مجلس آپ کو دیکھتے بھی تھے اور آپ کا کلام بھی سنتے تھے۔ جیسا کہ کتب حدیث میں حدیث جبریل مشہور ہے کہ آپ دین کی تعلیم کے لئے ایک اعرابی کی شکل میں حاضر ہوئے۔ آپ اکثر اوقات صحابی رسول حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صورت میں حاضر خدمت ہوتے تھے مگر آپ کی شناخت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوا کسی کو نہیں ہوتی تھی۔ وحی کا یہ سب سے آسان طریقہ تھا۔

2: مَلَکی شکل میں فرشتہ کا آنا

کبھی حضرت جبرئیل امین علیہ السلام اپنی مَلَکی شکل میں چھ سو پروں کے ساتھ حاضر خدمت ہوتے۔ اس صورت میں حاضرین مجلس کو قطعاً آپ کی آمد کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ نہ کسی کی آنکھ آپ کو دیکھ سکتی اور نہ کوئی کان آپ کا کلام سن سکتے۔ آپ کی آمد کا احساس صرف اس سے ہوتا تھا کہ حضور نبی رحمت ﷺ بشریت سے نکل کر روحانیت کی طرف مائل ہوتے، جس کے سبب آپ کی طبیعت بوجھل ہو جاتی۔ استغراقی کیفیت کا غلبہ ہوتا اور بسا اوقات سونے والے آدمی کی طرح خراٹوں کی آواز آنے لگتی اور سخت سردی کے موسم میں بھی آپ کی پیشانی پسینے سے شرابور ہو جاتی تو آپ ﷺ پر اس کیفیت کے طاری ہونے سے نزولِ وحی کا علم ہو جاتا۔ جب یہ سلسلہ اختتام پذیر ہوتا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سب کچھ یاد کر چکے ہوتے۔

3: صلصلة الجرس

اس نوع کی تیسری صورت صلصلة الجرس ہے۔ یعنی جبرئیل امین علیہ السلام بالکل خفیہ انداز میں آتے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کانوں میں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دیتی اور اگر اس دوران حاضرین مجلس چہرۂ مصطفیٰ ﷺ کے قریب اپنے کانوں کو لاتے تو شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دیتی۔ کوئی بھی نہ کلام سن سکتا، نہ بات سمجھ سکتا۔ لیکن حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم بلاشک وشبہ مکمل طور پر وحی اخذ کرتے اور کلام یاد فرما لیتے۔ وحی کی یہ صورت آپ ﷺ پر سب سے زیادہ شدید اور گراں ہوا کرتی تھی۔ جیسا کہ حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں عرض کی یارسول اللہ ﷺ

كَيْفَ يَأْتِيكَ الْوَحْيُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَأَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ فَيُفْصَمُ عَنِّي وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَأَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِي فَأَعِي مَا يَقُولُ

(صحیح البخاری باب بدء الوحی)

قَالَتْ عَائِشَةُ وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا

(جامع ترمذی: ج2، ص205)

آپ پر وحی کیسے نازل ہوتی ہے؟ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کبھی وحی کے وقت گھنٹی کی سی آواز آتی ہے۔ یہ مجھ پر سخت گراں گزرتی ہے۔ جب وحی کا سلسلہ رک جاتا ہے تو اس کے الفاظ مجھے یاد ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات فرشتہ

انسانی صورت میں آ کر مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے اور میں اس کے الفاظ کو یاد کر لیتا ہوں۔ حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے دیکھا، جب سخت سردی کے موسم میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر وحی ہوتی تو جب وحی کا سلسلہ رکتا تو آپ ﷺ کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا ہوتا۔

4: رؤیاء صادقہ

وحی کی چوتھی قسم یہ ہے کہ حالت خواب میں نبی کو بصورت خواب کسی امر سے اس طرح مطلع کر دیا جاتا ہے کہ وہ آفتاب نصف النہار کی مثل واضح اور عیاں ہوتا ہے اور وہ ہر قسم کے وہم اور باطل کی آمیزش سے مکمل طور پر پاک ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عالم خواب میں اپنے آپ کو اپنے لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرتے دیکھا اور پھر حالت بیداری میں اسے حقیقت کا جامہ پہنا دیا۔ قرآن کریم نے بایں الفاظ تذکرہ کیا ہے۔

قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ؗ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (الصفت: 102)

وحی کی یہ صورت وحی فی المنام کہلاتی ہے۔ حضور نبی رحمت ﷺ کی وحی کا آغاز بھی رؤیا صادقہ سے ہوا تھا۔ نبی کا خواب قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔

منزل بہ کے اعتبار سے وحی کی اقسام

اس اعتبار سے وحی کی دو قسمیں ہیں۔

1:۔ وحی متلو 2:۔ وحی غیر متلو

1: وحی متلو

وحی کی اس قسم سے مراد قرآن مجید فرقان حمید ہے۔ جس کے الفاظ و معانی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر عالم بیداری میں بواسطہ جبرئیل امین علیہ السلام نازل کیے گیے، جس کی حفاظت وصیانت کی ذمہ داری اپنے سپرد کرتے ہوئے خالق کائنات نے فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر: 9)

بیشک ہم نے ہی اتارا ہے اس ذکر (قرآن مجید) کو اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

قرآن کریم حضور نبی رحمت ﷺ کی رسالت صادقہ کا زندہ ثبوت ہے اور اپنے الفاظ و معانی کے اعتبار سے اتنا محفوظ اور جامع ہے کہ نہ تو کوئی اس میں کسی نوع کے تغیر وتبدل کی جرأت کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز کرنے والا اس کی مثل ایک آیت لانے پر قادر ہو سکتا ہے۔

علاوہ ازیں قرآن کریم کی تلاوت عبادت ہے، بغیر طہارت اور وضو کے اسے مس کرنا جائز نہیں۔ اس کی تلاوت کے بغیر نماز ادا ہی نہیں ہوتی۔ اس کے مطالب و مفاہیم پر کامل دسترس رکھنے کے باوجود بھی اس کی روایت بالمعنی جائز نہیں۔ یہ اپنے الفاظ اور معانی دونوں کے اعتبار سے معجزہ ہے اور اس کا کلام الٰہی ہونا بالتواتر ثابت ہے۔

2: وحی غیر متلو

اس سے مراد وحی کی وہ قسم ہے جس میں رب کریم کی طرف سے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی طرف قرآن کریم کے علاوہ دیگر احکامات وحی کے متذکرہ طرق کے مطابق حالت بیداری یا عالم خواب میں نازل کئے گئے۔ وحی کی یہ قسم سنت کہلاتی ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اس کی طرف اشارہ فرمایا مثلاً:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم: 3-4)

اور تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے۔ نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء: 80)

وحی کی یہ قسم متعدد امور میں پہلی قسم سے مختلف ہے مثلاً:

1۔ حدیث طیبہ کے معانی و مطالب حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوتے ہیں اور پھر آپ ﷺ انہیں اپنے الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔ اسی لئے محققین علماء کی ایک جماعت کے نزدیک حدیث کی روایت بالمعنی جائز ہے۔

2۔ حدیث طیبہ کے الفاظ معجزہ نہیں اور نہ ہی ان کی تلاوت شامل عبادت ہے۔

3۔ اگرچہ حدیث طیبہ بذریعہ وحی آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئی مگر نہ تو یہ حالت بیداری کے ساتھ خاص ہے اور نہ ہی اس فرشتہ کی وساطت لازم ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے بھی یہ قسم پہلی سے مختلف ہے۔

تنبیہ:۔ بعض امور میں جب کہیں وحی کا نزول نہ ہوتا تو حضور نبی کریم ﷺ اپنی خداداد ذہانت وصلاحیت سے کام لیتے ہوئے اجتہاد فرماتے اور پھر آپ ﷺ کو اس کے صواب و ناصواب ہونے کے بارے مطلع کر دیا جاتا۔ اگر آپ ﷺ کا اجتہاد درست ہوتا تو اس پر قائم رہتے ورنہ حسب وحی اپنی رائے کو تبدیل فرما لیتے۔ (تاریخ حدیث ومحدثین، ص 27)

حدیث قدسی

وحی غیر متلو کی ایک صورت حدیث قدسی بھی ہے۔ اس سے مراد وہ حدیث ہے جو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے بطریق آحاد منقول ہو اور رب کریم کی طرف منسوب ہو۔ اس کے بارے علماء کے دو قول ہیں۔

1۔ حدیث قدسی کلام الٰہی ہے اور نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ سے روایت فرماتے ہیں۔ اسی لئے تو اس کی روایت کا انداز یہ ہوتا ہے۔ ''قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ مَا يَرْوِيْهِ عَنْ رَبِّهٖ'' یا اس طرح کہا جاتا ہے۔ ''قَالَ اللّٰهُ فِيْ مَارَوَاهُ عَنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ'' مگر اس کے باوجود اس میں قرآن کریم جیسی خصوصیات نہیں پائی جاتیں۔

2۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دیگر احادیث کی طرح یہ احادیث بھی حضور ﷺ کے الفاظ پر مشتمل ہیں۔ صرف ان کے معانی اور مطالب اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ ابوالبقاء کلیات میں فرماتے ہیں:

''قرآن کے الفاظ و معانی وحی جلی کے ذریعہ آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئے اور جہاں تک حدیث قدسی کا تعلق ہے، اس کے الفاظ نبی کریم ﷺ کے ہوتے ہیں اور اس کا معنی و مفہوم بذریعہ الہام یا خواب آپ پر القاء ہوتا ہے۔'' (تاریخ حدیث ومحدثین، ص 30)

نوٹ:۔ مذکورہ بالا بحث سے معلوم ہوا کہ بذریعہ وحی حضور نبی کریم ﷺ پر تین چیزوں کا نزول ہوا۔

1: قرآن کریم　2: حدیث قدسی　3: حدیث نبوی۔

ان تینوں کے مابین ایک جامع فرق بیان کرتے ہوئے بحث کے اختتام پر علامہ زرقانی فرماتے ہیں:

اَنَّ الْقُرْاٰنَ اُوْحِيَتْ اَلْفَاظُهٗ مِنَ اللّٰهِ اِتِّفَاقًا وَاَنَّ الْحَدِيْثَ الْقُدْسِيَّ اُوْحِيَتْ اَلْفَاظُهٗ مِنَ اللّٰهِ عَلَى الْمَشْهُوْرِ وَالْحَدِيْثَ النَّبَوِيَّ اُوْحِيَتْ مَعَانِيْهِ فِيْ غَيْرِ مَا اجْتَهَدَ فِيْهِ الرَّسُوْلُ وَالْاَلْفَاظُ مِنَ الرَّسُوْلِ (مناہل العرفان: ج1، ص52)

قرآن کریم کے الفاظ بالاتفاق اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ پر وحی کئے گئے۔ حدیث قدسی کے الفاظ کا من جانب اللہ ہونا خبر مشہور سے ثابت ہے اور حدیث نبوی کے معانی ان امور میں آپ کی طرف وحی کئے گئے جن میں آپ ﷺ نے اجتہاد نہیں فرمایا اور اس میں الفاظ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے اپنے ہوا کرتے ہیں۔

تنزیل القرآن کا بیان

قرآن مجید فرقان حمید کی تنزیل تین بار ہوئی۔

1: لوح محفوظ کی طرف

سب سے اول قرآن مجید کی تنزیل لوح محفوظ کی طرف ہوئی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (البروج: 22,21)

بلکہ وہ کمال شرف والا قرآن ہے۔ ایسی لوح میں لکھا ہے جو محفوظ ہے۔

لوح محفوظ پر قرآن کریم کا نزول کب اور کیسے ہوا، اس سے رب کریم ہی آگاہ ہے۔ یا وہ ذات جسے خود خالق کائنات نے اس غیب پر مطلع فرمایا ہے۔ ہاں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ لوح محفوظ پر مکمل قرآن کریم کا نزول یکبارگی ہوا۔

2: بیت العزۃ کی طرف

دوسری مرتبہ قرآن کریم لوح محفوظ سے آسمان دنیا میں بیت العزۃ کی طرف نازل ہوا۔ اور یہ نزول بھی نزول اول کی طرح یکبارگی ہوا۔ جیسے رب کریم ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (دخان: 3)

بیشک ہم نے اتارا ہے اسے ایک بابرکت رات میں۔

مزید فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (القدر: 1)

بے شک ہم نے اس (قرآن) کو اتارا ہے شب قدر میں۔

پھر سورۂ بقرہ میں ارشاد گرامی ہوا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرہ:185)

ماہ رمضان المبارک جس میں اتارا گیا قرآن۔

مذکورہ آیات بینات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مکمل قرآن کریم کا نزول رمضان المبارک کی ایک رات میں ہوا۔ جسے لیلہ مبارکہ اور لیلۃ القدر کے مقدس ناموں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر قرآن کریم کا نزول یکبارگی نہیں بلکہ متفرق طور پر ایک طویل عرصہ میں ہوا۔ تو اس سے یہ امر ثابت ہوا کہ یہ نزول لوح محفوظ سے آسمان دنیا میں بیت العزۃ کی طرف ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی نسائی، حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ روایت نقل کی ہے:

اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً اِلٰی سَمَآءِ الدُّنْيَا لَيْلَةَ الْقَدْرِ ثُمَّ اُنْزِلَ بَعْدَ ذٰلِكَ فِيْ عِشْرِيْنَ سَنَةً

کہ قرآن کریم آسمان دنیا کی طرف قدر والی رات میں یکبارگی نازل کیا گیا پھر اس کے بعد بیس سال میں نازل کیا گیا۔

اس روایت کے بارے امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ موقوف علی ابن عباس ہے مگر حکما مرفوع ہے۔

نوٹ:۔ تنزیل کی اس صورت کے بارے علاوہ ازیں تین اقوال اور بھی ہیں۔

1۔ قرآن کریم لوح محفوظ سے آسمان دنیا کی طرف بیس (20)، تیئس (23) یا پچیس (25) لیالی قدر میں ہوا۔ اور ہر رات اتنی مقدار میں نازل ہوا کہ پھر مکمل سال میں وہاں سے بتدریج حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی طرف منتقل کر دیا گیا۔

2۔ قرآن کریم کے نزول کی ابتداء لیلۃ القدر میں ہوئی اور پھر مکمل ہونے تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر مختلف اوقات میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔ اس قول کے مطابق بیت العزۃ کی طرف نزول قرآن کی نفی ہوتی ہے۔

3۔ لوح محفوظ سے یکبارگی نازل ہوا۔ پھر بیس راتوں میں حفظہ (محافظ فرشتے) نے بتدریج حضرت جبریل امین کی طرف منتقل کیا اور پھر انہوں نے بیس سال کے طویل عرصہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس پہنچایا۔

علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ تینوں اقوال کو پہلے کے مقابلہ میں مرجوح قرار دیا ہے۔

3: قلب مصطفیٰ ﷺ پر

تنزیل قرآن کی تیسری اور آخری صورت یہ ہے کہ بیت العزۃ سے قلب مصطفیٰ ﷺ پر حضرت جبریل امین علیہ السلام کے واسطہ سے قرآن کریم نازل ہوا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ

(الشعراء:193-195)

اور بلاشبہ یہ کتاب رب العالمین کی اتاری ہوئی ہے۔ اترا ہے اسے لے کر روح الامین (یعنی جبریل) آپ کے قلب (منیر) پر تاکہ بن جائیں آپ (لوگوں کو) ڈرانے والوں سے۔ یہ ایسی عربی زبان میں ہے جو بالکل واضح ہے۔

چونکہ قرآن کریم سارے عالم کے لئے مصدر نور تھا اور تمام مخلوق کے لئے ہدایت کا سرچشمہ تھا۔ اس لئے یکبارگی نازل ہونے کی بجائے تیئس (23) سال کی طویل مدت میں نازل ہوا۔

فضائل قرآن کا بیان

قرآن مجید فرقان حمید خالق ارض وسماء کی طرف سے نازل ہونے والی لاریب کتاب ہے۔انسان کی کیا مجال کہ اس کی خوبیاں اور فضائل حد شمار میں لا سکے۔مختصر یہ ہے کہ جس طرح خالق کائنات اپنی ذات اور کل صفات میں لاشریک اور لاثانی ہے۔اسی طرح اس کا کلام بھی اپنے تمام تر فضائل اور کمالات واوصاف میں لاشریک اور بے مثال ہے۔جیسا کہ رب کریم کے پیارے محبوب ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"فَضْلُ كَلَامِ اللّٰهِ عَلٰى سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللّٰهِ عَلٰى خَلْقِهٖ"

اللہ تعالیٰ کے کلام کو تمام کلاموں پر ویسی فضیلت حاصل ہے جیسی خالق کو اپنی مخلوق پر حاصل ہے۔

قرآن کریم نے اپنی فضیلت اور عظمت بیان کرتے ہوئے اپنی جامعیت اور آفاقیت کا یوں الفاظ تذکرہ کیا ہے:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (بنی اسرائیل:89)

اور بلاشبہ ہم نے طرح طرح سے (بار بار) بیان کی ہیں لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں (تاکہ وہ ہدایت پائیں) پس انکار کردیا اکثر لوگوں نے سوائے اس کے کہ وہ ناشکری کریں۔

لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (الانعام:59)

نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز مگر وہ لکھی ہوئی ہے روشن کتاب میں۔

اس مفہوم کی متعدد آیات بینات ہیں جن سے یہ حقیقت مثل آفتاب نصف النہار عیاں ہو جاتی ہے کہ کائنات میں ایسی کوئی شے نہیں، جس کا کسی اعتبار سے قرآن کریم میں تذکرہ نہ ہو۔گویا قرآن کریم ازل سے ابد تک جمیع ما کان اور ما یکون کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور ازمنہ ثلاثہ کے وہ تمام علوم وفنون جو ظاہر ہو چکے ہیں، یا مستقبل میں ظہور پذیر ہوں گے۔قرآن کریم ان تمام کا مخزن ومنبع ہے۔ جیسا کہ "وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" (نحل:89) سے بھی ظاہر ہے۔

ہر دور میں خداداد بصیرت وذہانت کے مالک ارباب علم ودانش اس کی لامحدود وسعتوں میں محو پرواز ہوتے ہیں اور اپنی ہمت وظرف کے مطابق نشان منزل کا سراغ لگاتے ہیں۔جب تک کائنات کی یہ رنگینیاں قائم ہیں۔یہ طبع آزمائی ہوتی رہے گی مگر اس کے باوجود کلام خداوندی کا احاطہ نہیں ہو سکے گا۔

بھلا وہ کلام جو اپنے الفاظ ومعانی، فصاحت وبلاغت، عذوبت وحلاوت، جامعیت وآفاقیت اور اثر انگیزی وسحر طرازی میں اس عظمت وشان کا حامل ہو کہ ہر دور کے منکرین کو یہ چیلنج دے رہا ہو۔

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (البقرۃ:23)

تو لے آؤ ایک سورۃ اس جیسی اور بلالو اپنے حمایتوں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔

تو پھر کون ہے؟ جو اس کے حقیقی کمالات واوصاف بیان کر سکے۔ذرا غور تو کیجئے

کون ہے؟ جو اس عظیم کلام سے وابستہ ہو اور دونوں جہاں میں سرخرو نہ ہو۔

کون ہے؟ جو عامل قرآن تو ہو، مگر خالق کائنات نے اسے اپنے خصوصی انعامات سے نہ نوازا ہو۔
کون ہے؟ جس نے اس بحر ذخار میں غواصی کی ہو، مگر اس کا دامن لعل و گوہر سے نہ بھرا ہو۔
کون ہے؟ جس کا سینہ مسکن آیات قرآنیہ ہو، دل ان کی ضیاء سے ضوفشاں ہو اور ذہن ان میں تدبر کناں ہو، مگر وہ تجلیات ربانی کا مرکز نہ ہو اور کتاب الٰہی کے اسرار و رموز اس پر ظاہر نہ ہوں۔
کون ہے؟ جس کا مسیحا قرآن ہو، مگر وہ شفایاب نہ ہو۔
کون ہے؟ جس کا ہادی و راہبر قرآن ہو، مگر وہ صراط مستقیم پر گامزن نہ ہو۔
کون ہے؟ جس کا شفیع قرآن ہو، مگر وہ جنت کی بہاروں کا مستحق نہ بنے۔
کونسا وہ گھر ہے جس میں تلاوت قرآن تو ہو مگر وہ ملائکہ رحمت کی آماجگاہ نہ بنے۔
اور کونسا وہ معاشرہ ہے؟ جس میں دستور قرآن رائج تو ہو مگر وہ امن و آشتی اور سکون و راحت کا گہوارہ نہ ہو۔ بلکہ جس کا تعلق قرآن سے مستحکم ہو جاتا ہے، قرآن کریم میں وہ جملہ اوصاف و کمالات اور فضائل و محاسن موجود ہیں کہ اسے گوہر مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے تو خالق کائنات نے اپنے قرآن کا کمال اس انداز سے بھی بیان کیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ أَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ (فاطر:29)

بے شک جو (غور و تدبر سے) تلاوت کرتے ہیں اللہ کی کتاب کی اور نماز قائم کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے رازداری سے اور اعلانیہ، وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو ہرگز نقصان والی نہیں۔
علاوہ ازیں کثیر آیات بینات ہیں، جو قرآن کریم کے فضائل و محاسن کی روشن دلیل ہیں۔ اب آخر میں صاحب قرآن حضور نبی رحمت ﷺ کی زبان حق ترجمان سے نکلے ہوئے چند ارشادات ملاحظہ فرمائیے اور قرآن کریم کے فضائل و کمالات پر سر دھنیے اور پھر اپنے دل کو نور قرآن سے منور کیجئے۔

1۔ "عَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ" (رواہ البخاری (عمدۃ القاری: ج20، ص42)

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سب سے بہتر وہ ہے جس نے خود قرآن پڑھا اور پھر دوسروں کو پڑھایا۔

2۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِّنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُوْنَهُ فِيْمَا بَيْنَهُمْ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ (رواہ مسلم و ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی قوم مساجد میں سے کسی مسجد میں کتاب اللہ کی تلاوت کرتی ہے اور آپس میں اس کا دور کرتے ہیں تو ان پر راحت و سکون نازل ہوتا ہے۔

رحمت الٰہی انہیں ڈھانپ لیتی ہے۔ ملائکہ رحمت انہیں گھیر لیتے ہیں اور رب کریم اپنے پاس موجود نوری مخلوق میں ان کا تذکرہ فرماتا ہے۔

3۔ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اَوْصِنِیْ۔ قَالَ عَلَیْكَ بِتَقْوَی اللّٰہِ فَاِنَّہٗ رَاْسُ الْاَمْرِ كُلِّہٖ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ زِدْنِیْ۔ قَالَ عَلَیْكَ بِتِلَاوَۃِ الْقُرْآنِ فَاِنَّہٗ نُوْرٌ لَّكَ فِی الْاَرْضِ وَذُخْرٌ لَّكَ فِی السَّمَآءِ (رواہ ابن حبان فی صحیحہ)

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے بارگاہ رسالت میں عرض کی، یارسول اللہ ﷺ مجھے نصیحت کیجئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تقویٰ اختیار کر، یہی تمام امور کی اصل ہے۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اور فرمایئے۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا قرآن کریم کی تلاوت اپنے اوپر لازم کر لے۔ اس لئے کہ وہ زمین میں تمہارے لئے نور ہے اور آسمان میں تمہارے لئے جمع شدہ خزانہ ہے۔

4۔ عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ الْبَاهِلِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِقْرَءُوْا الْقُرْآنَ فَاِنَّہٗ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ شَفِیْعًا لِاَصْحَابِہٖ (الحدیث رواہ مسلم)

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا قرآن کریم پڑھو۔ بیشک یہ قیامت کے دن صاحب قرآن کے لئے شفیع بن کر آئے گا۔

5۔ "عَنْ سَهْلِ بْنِ مُعَاذٍ عَنْ اَبِیْہِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَرَاَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِہٖ اُلْبِسَ وَالِدَاہُ تَاجًا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ضَوْءُہٗ اَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِیْ بُیُوْتِ الدُّنْیَا فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِیْ عَمِلَ بِهٰذَا" (رواہ ابوداؤد)

حضرت سہل بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قرآن کریم پڑھا اور اس کے مطابق عمل کیا قیامت کے دن اس کے والدین کو ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی اس روشنی سے کہیں زیادہ ہوگی، جو تمہارے دنیوی گھروں میں ہوتی ہے۔ تمہارا کیا گمان ہے، اس عمل کے بارے میں جو اس نے کیا۔

6۔ "عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ اِقْرَاْ وَارْقَ وَرَتِّلْ كَمَا تُرَتِّلُ فِی الدُّنْیَا فَاِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آیَۃٍ تَقْرَؤُهَا" (رواہ الترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا صاحب قرآن سے کہا جائے گا قرآن پڑھ اور ترقی کی منازل طے کرتا جا اور اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، جیسے دنیا میں ترتیل سے پڑھا کرتا تھا۔ بیشک تیری منزل اور مقام وہیں ہوگا جہاں تو آخری آیت ختم کرے گا۔

7۔ "عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ

مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ" رواہ البخاری والمسلم (مشکوٰۃ المصابیح:184 باب فضائل القرآن)

حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآنی تعلیمات کے ماہر حضرات ان فرشتوں کے ساتھ ہوں گے جو محترم، نیکوکار اور سفارت کے اہم فرائض سرانجام دینے والے ہیں۔

(مذکورہ تمام احادیث الترغیب والترہیب: ج2، ص342 تا 350 سے منقول ہیں۔)

8۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا "اَفْضَلُ عِبَادَةِ اُمَّتِیْ تِلَاوَةُ الْقُرْآنِ" (احیاء علوم الدین مترجم ج1، ص332)

(میری امت کی افضل ترین عبادت قرآن کریم کی تلاوت ہے۔)

9۔ "عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَاُ كَمَا يَصْدَاُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا جِلَاؤُهَا قَالَ كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ" رواہ البیہقی، (مشکوٰۃ المصابیح ص189)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بیشک یہ دل زنگ آلود ہو جاتے ہیں جیسے پانی لگ جانے سے لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ عرض کی گئی یارسول اللہ ﷺ! اسے دور کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کریم کی تلاوت کرنا۔

10۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں

كُلُّ اٰيَةٍ فِي الْقُرْآنِ دَرَجَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَمِصْبَاحٌ فِي بُيُوْتِكُمْ (احیاء علوم الدین مترجم: ج1، ص333)

11۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

اِنَّ الْبَيْتَ الَّذِيْ يُتْلٰى فِيْهِ الْقُرْآنُ اِتَّسَعَ بِاَهْلِهٖ وَكَثُرَ خَيْرُهٗ وَحَضَرَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَخَرَجَتْ مِنْهُ الشَّيَاطِيْنُ (احیاء علوم الدین: ج1، ص333)

جس گھر میں قرآن پاک کی تلاوت کی جائے، وہاں کے رہنے والوں کو خیر و برکت اور وسعت نصیب ہو جاتی ہے۔ فرشتے وہاں حاضر ہوتے ہیں اور شیاطین بھاگ جاتے ہیں۔

12۔ حضرت سفیان ثوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "اِذَا قَرَاَ الرَّجُلُ الْقُرْآنَ قَبَّلَ الْمَلَكُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ" (احیاء علوم الدین، ایضاً)

جب آدمی قرآن پڑھتا ہے تو فرشتہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام ارشادات میں قرآن کریم اور ان بلند اقبال اور خوش بخت افراد کی عظمت و شان بیان کی گئی ہے، جنہوں نے قرآن کریم سے اپنا لگاؤ پیدا کیا اور اپنے دلوں کو نور قرآن سے جلا بخشی۔ اسی نوع کے بیشمار ارشادات ہیں جن میں قرآن کریم اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے والوں کے مقام و مرتبہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اختصار کے پیش نظر صرف مذکورہ روایات پر ہی اکتفاء کیا گیا ہے ورنہ قرآن کریم کے فضائل تو "لا تعدّ ولا تحصی" ہیں۔

آدابِ تلاوتِ قرآن کا بیان

قرآن کریم فرقان حمید رب کریم کی طرف سے اپنے بندوں کی ہدایت اور دستگیری کے لئے آقائے دو جہاں ﷺ پر نازل ہوا۔

اس کی حیثیت واہمیت اور عظمت وشان دیگر تمام علوم وفنون کی اوراق اور ضخیم کتب سے کہیں زیادہ اور ارفع ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مقام ومرتبہ کے اعتبار سے کسی کتاب کو قرآن مجید سے کوئی نسبت نہیں۔

چونکہ اس کے مطالعہ کا مقصد صرف دل بہلانا اور وقت گزاری نہیں، بلکہ انسان کو اپنے بلند تر مقصد زیست سے آگاہ کرنا ہے، قول وفعل میں یکسانیت اور سیرت وکردار میں نکھار پیدا کرتا ہے اور ظاہر وباطن میں للّٰہیت اور عشق مصطفیٰ ﷺ کی ایک لہر دوڑاتا ہے۔ اس لئے اس سے حقیقی مقاصد حاصل کرنے کے لئے دوسری کتب کے برعکس اسے پڑھنے اور مَس کرنے کے کچھ آداب ہیں۔ جنہیں ملحوظ خاطر رکھ کر ہی اسے پڑھا جائے تو دل کی ظلمتیں کافور ہوتی ہیں۔ خفتہ صلاحیتیں جلا پاتی ہیں اور انسان مقرب بارگاہ الٰہی بنتا ہے اور اگر ان آداب کا لحاظ نہ رکھا جائے تو پھر نہ تو حقیقی مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو انسان مجرم بن جاتا ہے۔ لہٰذا ان ہی آداب میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ اگر قرآن کریم کی تلاوت اس سے دیکھ کر کی جائے تو پھر اسے ہاتھ لگانے کے لئے مکمل طور پر باطہارت اور باوضو ہونا ضروری ہے کیونکہ وضو کے بغیر قرآن کریم کو مَس کرنا قطعاً جائز نہیں۔ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں: لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (واقعہ:79) (پاک لوگوں کے سوا کوئی اسے مَس نہ کرے) ہاں اگر قرآن کریم کو چھوئے بغیر زبانی تلاوت کی جائے تو بلا وضو بھی جائز ہے۔

2۔ تلاوت کی ابتداء تعوذ اور تسمیہ سے کرنی چاہئے کیونکہ ارشاد رب کریم ہے:

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ (النحل:98)

سو جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو پناہ مانگو اللہ تعالیٰ سے اس شیطان (کی وسوسہ اندازیوں) سے جو مردود ہے۔

چنانچہ ابتداء اس طرح کرے:

أَعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَن يَحْضُرُونِ

میں شیطان مردود کے شر سے بچنے کے لئے ہر چیز سننے والے اور ہر شی کا علم رکھنے والے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں، اے میرے رب میں تیری قوت وعطا کے ساتھ شیاطین کی فساد انگیزی اور ان کے قرب سے بچنا چاہتا ہوں۔

بعد ازاں سورۃ الناس اور فاتحہ ایک ایک بار پڑھے۔ (احیاء علوم الدین مترجم: ج1،ص421)

3۔ تلاوت کے وقت وقار اور تمکنت کے ساتھ عاجزی وانکساری سے سر جھکائے قبلہ رو ہو کر بیٹھے یا کھڑا ہو۔ اگر لیٹ کر تلاوت کی تو بھی جائز ہے۔ مگر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر پڑھنا زیادہ موزوں اور بہتر ہے۔ رب کریم ارشاد فرماتا ہے:

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (آل عمران:191)

وہ عقل مند جو یاد کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور غور کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور تسلیم کرتے ہیں)۔

4۔ تلاوت کی مقدار کے لحاظ سے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا یہ ارشاد گرامی پیش نظر رہے:

مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فِيْ أَقَلَّ مِنْ ثَلٰثٍ لَمْ يَفْقَهْهُ (احیاء علوم الدین: ج1، ص417)

جس نے مکمل قرآن کریم تین سے کم دنوں میں پڑھا، اس نے اسے سمجھا نہیں۔

نیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو فرمایا "ایک ہفتہ میں ایک ختم کیا کرو۔" حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی یہی معمول تھا۔

5۔ قرآن کریم خوب ترتیل کے ساتھ یعنی ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا چاہئے۔ جیسا کہ خالق کائنات نے ارشاد فرمایا:

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلًا (المزمل: 4)

اور (حسب معمول) خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کیجئے قرآن کریم کو۔

اسی کے ذریعہ آیات قرآنیہ میں تفکر و تدبر کیا جا سکتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں "کہ اگر میں سورۂ بقرہ اور آل عمران ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہوئے سمجھتا جاؤں، تو یہ میرے نزدیک تیزی کے ساتھ سارا قرآن پڑھنے کی نسبت زیادہ پسندیدہ ہے۔"

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک شخص کو تیزی سے قرآن کریم پڑھتے سنا تو فرمایا:

إِنَّ هٰذَا مَا قَرَأَ الْقُرْآنَ وَلَا سَكَتَ (احیاء علوم الدین: ج1، ص417)

اس شخص نے قرآن بھی نہیں پڑھا اور چپ بھی نہیں رہا۔

6۔ دوران تلاوت جہاں آیت سجدہ آجائے اگر فوراً ممکن ہو تو سجدہ کرے۔ بصورت دیگر بعد میں سجدۂ تلاوت کرے۔ اور بہتر یہ ہے کہ اس میں جس قسم کا بیان اور تذکرہ ہو، سجدہ سے فارغ ہونے کے بعد اسی کے مطابق دعا مانگے تا کہ قول و فعل میں یکسانیت پیدا ہو جائے۔ مثلاً اگر آیت سجدہ یہ ہو:

خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (السجدہ: 15)

تو گر پڑتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے اور پاکی بیان کرتے ہیں اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اور غرور تکبر نہیں کرتے۔

تو پھر دعا اس طرح کرنی چاہئے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ السَّاجِدِيْنَ لِوَجْهِكَ وَالْمُسَبِّحِيْنَ بِحَمْدِكَ وَأَعُوْذُبِكَ أَنْ أَكُوْنَ مِنَ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ عَنْ أَمْرِكَ أَوْعَلٰى أَوْلِيَآئِكَ۔

اے اللہ مجھے ان لوگوں میں سے کر جو تیرے حضور میں جھکتے ہیں اور تیری حمد و تسبیح بیان کرتے ہیں۔ میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ میں ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جو تیرے حکم سے سرتابی کرتے ہیں یا تیرے اولیاء کے ساتھ تکبر سے پیش آتے ہیں۔

اور اگر آیت سجدہ یہ ہو:

وَيَخِرُّوْنَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا (بنی اسرائیل: 109)

اور گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل گریہ وزاری کرتے ہوئے اور یہ قرآن ان کے (خضوع و) خشوع کو بڑھا دیتا ہے۔

تو پھر دست دعا اس طرح دراز کرنا چاہئے:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الْبَاکِیْنَ اِلَیْکَ خَاشِعِیْنَ لَکَ

اے اللہ مجھے ان لوگوں میں سے کر دے جو تیری بارگاہ میں روتے اور عاجزی کرتے ہیں۔ (احیاء علوم الدین: ج 1، ص 422)

7۔ قرآن کریم حسین انداز میں خوش الحانی کے ساتھ پڑھنا چاہئے جیسا کہ حدیث طیبہ میں ہے:

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ زَیِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِکُمْ

(رواہ احمد وابوداؤد (مشکوۃ المصابیح: ص 191)

(قرآن کریم کو اپنی آوازوں کے ساتھ مزین کرو۔) اسی طرح ایک اور ارشاد گرامی ہے:

لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ (احیاء علوم الدین: ج 1، ص 419)

جو قرآن کریم خوش الحانی سے نہیں پڑھتا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اس لئے جہاں تک ممکن ہو تصنع، بناوٹ اور تکلف کے بغیر حسین انداز میں قرآن کریم پڑھنا چاہئے۔

8۔ قرآن کریم انتہائی درد و سوز، عاجزی و انکساری اور اپنے اوپر حزن و خوف کی کیفیت طاری کرتے ہوئے پڑھنا چاہئے۔ بلکہ رب کریم کے رعب و جلال اور ہیبت و جبروت کے باعث آنکھوں سے آنسو بہانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اُتْلُوا الْقُرْاٰنَ وَابْکُوْا فَاِنْ لَّمْ تَبْکُوْا فَتَبَاکَوْا (احیاء علوم الدین: ج 1، ص 422)

قرآن کریم کی تلاوت کرتے وقت آنسو بہاؤ اور اگر رونہ سکو تو رونے والوں کی صورت بنالو۔

اسی گریہ و زاری کے سبب ہی رحمت خداوندی کو اپنی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے۔

9۔ جو آیت پڑھے، اس کا حق ادا کرے یعنی آیت تسبیح و تکبیر پڑھے تو خود بھی سبحان اللہ اور اللہ اکبر کہے۔ اگر دعا و استغفار کی آیت تلاوت کرے تو اپنے لئے بھی دعا مانگے اور مغفرت طلب کرے۔ اگر کسی آیت میں انعامات الٰہیہ کا ذکر ہو تو ان کے لئے دست سوال دراز کرے۔ اگر کہیں عتاب و معصیت کا تذکرہ آئے تو اپنے لئے پناہ طلب کرے۔ غرضیکہ جس مضمون کی آیت پڑھے اسی قسم کے تاثر کا اظہار کرے۔

علاوہ ازیں بھی کئی چیزیں تلاوت کے آداب سے متعلق ہیں۔ ان کا تفصیلی تذکرہ آگے ترجمہ میں موجود ہے۔

تفسیر اور تاویل کا بیان

تفسیر کا لغوی معنی

فِی اللُّغَۃِ التَّفْسِیْرُ ھُوَ الْاِیْضَاحُ وَ التَّبْیِیْنُ

لغت میں تفسیر کا معنی وضاحت کرنا اور بیان کرنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے "وَلَا یَاْتُوْنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰکَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا" آیت طیبہ میں تفسیر سے مراد بیان اور تفصیل ہے۔ تفسیر کا مادہ مجرد "فسر" ہے۔ اس کا معنی ظاہر کرنا اور کھولنا ہے۔

اصطلاحی تعریف

(1) علامہ ابو حیان نے البحر المحیط میں علم تفسیر کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

عِلْمٌ يُبْحَثُ عَنْ كَيْفِيَّةِ النُّطْقِ بِأَلْفَاظِ الْقُرْآنِ وَمَدْلُوْلَاتِهَا وَأَحْكَامِهَا الْإِفْرَادِيَّةِ وَالتَّرْكِيْبِيَّةِ وَ مَعَانِيْهَا الَّتِيْ تُحْمَلُ عَلَيْهَا حَالَةَ التَّرْكِيْبِ وَتَتِمَّاتٍ لِذٰلِكَ

تفسیر ایسا علم ہے جس میں الفاظ قرآن ادا کرنے کی کیفیت، ان کے معانی ومطالب، ان کے انفرادی اور ترکیبی احکام، ان کے وہ معانی جن پر ترکیبی حالت میں انہیں محمول کیا جاتا ہے اور ان کے نسخ اور سبب نزول وغیرہ کے بارے بحث کی جاتی ہے۔

(2) علامہ زرکشی رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں:

اَلتَّفْسِيْرُ عِلْمٌ يُفْهَمُ بِهٖ كِتٰبُ اللّٰهِ الْمُنَزَّلِ عَلٰى نَبِيِّهٖ مُحَمَّدٍ ﷺ وَبَيَانِ مَعَانِيْهِ وَاسْتِخْرَاجِ اَحْكَامِهٖ وَحِكَمِهٖ

تفسیر وہ علم ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کو سمجھا جاتا ہے جو نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل کی گئی اور اس کے معانی کے بیان اور احکام وحکم کے استخراج کو پہچانا جاتا ہے۔

(3) بعض علماء نے خلاصہ کلام کے طور پر ان الفاظ میں تعریف بیان کی ہے۔

عِلْمٌ يُبْحَثُ فِيْهِ عَنْ اَحْوَالِ الْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ مِنْ حَيْثُ دَلَالَتِهٖ عَلٰى مُرَادِ اللّٰهِ تَعَالٰى بِقَدْرِ الطَّاقَةِ الْبَشَرِيَّةِ

تفسیر ایسا علم ہے جس میں طاقت بشریہ کے مطابق قرآن مجید کے احوال سے اس حیثیت سے بحث کی جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے معنی مرادیہ اور مقصود پر دلالت کرتا ہے۔

تاویل کا لغوی معنی

اَلتَّاْوِيْلُ مَاْخُوْذٌ مِنَ الْاَوْلِ وَهُوَ الرُّجُوْعُ

تاویل اَوْلٌ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی رجوع کرنا اور لوٹنا ہے۔

اصطلاحی تعریف

متاخرین فقہاء، متکلمین اور متصوفہ نے ان الفاظ میں تعریف بیان کی ہے۔

هُوَ صَرْفُ اللَّفْظِ مِنَ الْمَعْنَى الرَّاجِحِ اِلَى الْمَعْنَى الْمَرْجُوْحِ لِدَلِيْلٍ يَقْتَرِنُ بِهٖ

تاویل سے مراد کسی لفظ کو ایسی دلیل کے ساتھ راجح معنی سے مرجوح معنی کی طرف پھیرنا ہے جو اس کے ساتھ مقترن ہوتی ہے۔

تنبیہ:۔ مذکورہ تعریف میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاویل صحیح کے لئے دو امروں کا پایا جانا ضروری ہے۔

(1) لفظ اس معنی کا احتمال رکھتا ہو جس پر اسے محمول کیا جا رہا ہے اور یہ تقاضا بھی کرتا ہو کہ اس کا مرادیہ وہی معنی ہے۔

(2) وہ دلیل بھی واضح ہو جو لفظ کو راجح معنی سے مرجوح معنی کی طرف پھیرنے پر دلالت کرتی ہو۔

اگر مذکورہ دو چیزیں نہیں پائی جائیں گی تو تاویل فاسد ہوگی۔

تفسیر اور تاویل میں فرق

تفسیر اور تاویل کے درمیان فرق بیان کرنے میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔

(1) ابوعبیدہ اور ان کے ساتھ ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ تفسیر اور تاویل دونوں ہم معنی اور مترادف ہیں۔ متقدمین علمائے تفسیر میں یہی مشہور اور شائع ہے۔

(2) علامہ راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ تفسیر تاویل کی نسبت عام ہے۔ تفسیر کا زیادہ تر استعمال الفاظ میں ہوتا ہے اور تاویل کا معانی میں۔ تفسیر کا استعمال کتب الٰہیہ اور دیگر کتب میں بھی ہوتا ہے جبکہ تاویل صرف کتب الٰہیہ میں استعمال ہوتا ہے۔ تفسیر کا استعمال اکثر الفاظ کے مفردات میں ہوتا ہے جبکہ تاویل کا اکثر استعمال جملوں میں ہوتا ہے۔ تفسیر کا لفظ غریب الفاظ کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ وغیرہ الفاظ۔ یا مراد یہ کی تشریح و تبیین کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وغیرہ کی تفسیر یعنی وضاحت اور تشریح کیا ہے۔ جبکہ تاویل کبھی عام استعمال ہوتا ہے اور کبھی خاص۔ جیسا کہ لفظ کفر کبھی مطلق انکار کے لئے اور کبھی ذات باری تعالیٰ کے انکار کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظ ایمان کبھی مطلق تصدیق کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کبھی دین حق کی تصدیق کے لئے۔

(3) الماتریدیہ نے بیان کیا ہے کہ تفسیر لفظ کے معنی مراد یہ کی قطعیت پر دلالت کرتا ہے اور اس پر شہادت دیتا ہے کہ اس لفظ سے اللہ تعالیٰ کی مراد اور مقصود یہی ہے۔ بشرطیکہ اس پر کوئی قطعی اور یقینی دلیل قائم ہو جائے ورنہ تفسیر بالرائے ہوگی اور وہ ممنوع ہے۔ جبکہ تاویل میں لفظ کے محتملات میں سے کسی ایک کو بغیر قطع اور شہادت کے ترجیح دی جاتی ہے۔

(4) علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ تاویل سے مراد آیت کو اس معنی محتمل کی طرف پھیرنا ہے جو اس کے ماقبل اور مابعد کے موافق ہو اور طریقہ استنباط کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو، جبکہ تفسیر سے مراد آیت کے سبب نزول، شان اور قصہ وواقعہ کے بارے گفتگو کرنا ہے۔

(5) بعض نے کہا ہے تفسیر کا تعلق روایت سے ہوتا ہے اور تاویل کا تعلق درایت سے ہوتا ہے۔

(6) تفسیر سے مراد ان معانی کا بیان ہے جو وضع عبارت سے مستفاد ہوتے ہیں اور تاویل سے مراد ان معانی کا بیان ہے جو بطریق اشارہ مستفاد ہوتے ہیں۔ متاخرین کے نزدیک یہی معنی زیادہ مشہور ہے۔ (التفسیر والمفسرون: ج1، ص22)

علم تفسیر کا موضوع

”اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ مِنْ حَیْثُ فَہْمِ مَعَانِیْہَا وَقِیْلَ الْکِتَابُ الْعَزِیْزُ“

(علم تفسیر کا موضوع آیات قرآنیہ ہیں اس حیثیت سے کہ اس علم میں ان کے معانی سمجھے جاتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس علم کا موضوع کتاب اللہ ہے۔)

غرض:۔ ”اَلْمَعْرِفَۃُ بِمَعَانِیْ کَلَامِ اللّٰہِ عَلَی الْوَجْہِ الْاَکْمَلِ“

اس علم کا مقصود کلام الٰہی کے معانی کو مکمل طور پر سمجھنا ہے۔

غایت:۔ ”اَلْفَوْزُ بِسَعَادَۃِ الدَّارَیْنِ“ اس علم کی غایت دونوں جہاں کی سعادتوں کے ساتھ کامیاب ہونا ہے۔ اس طرح کہ دنیا

میں اوامر کی پیروی کی جائے اور نواہی سے اجتناب کیا جائے اور آخرت میں جنت اور اس کی نعمتیں میسر آئیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کی غایت اللہ تعالیٰ کے خطاب کو سمجھنا ہے جو کہ سعادت ابدیہ اور دولت سرمدیہ کا موجب ہے۔

شرف وعظمت:۔ تمام علوم شرعیہ میں سے علم تفسیر افضل ہے کیونکہ علوم کا شرف اور رتبہ ان کے موضوع کے شرف ورتبہ کے سبب ہوتا ہے چونکہ اس علم کا موضوع کلام اللہ ہے لہذا یہ سب سے اعظم اور اشرف ہے۔

تفسیر کے مصادر اور منابع کا بیان

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن کریم کی تفسیر کے لیے جن مصادر پر اعتماد کرتے تھے وہ چار ہیں۔

(1) قرآن کریم (2) سنت نبی کریم ﷺ (3) اجتہاد اور قوت استنباط (4) یہود ونصاریٰ میں سے اہل کتاب۔ ہر ایک کی مختصر وضاحت درج ذیل ہے۔

1: قرآن کریم

قرآن کریم فرقان حمید میں تدبر اور غور وفکر کرنے سے قرآن کریم کا یہ اسلوب نمایاں ہوتا ہے کہ اس عبارت میں کہیں ایجاز واختصار ہے تو کہیں اطناب وطوالت، کہیں کلام میں عموم پایا جا رہا ہے اور کہیں خصوص کا احتمال ہے۔ الختصر ایک ہی چیز کو مختلف انداز میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے مفسر کو چاہیئے کہ سب سے پہلے وہ آیات قرآنیہ میں ہی غور وفکر کرے اور اگر ایک آیت معانی ومطالب کے اعتبار سے دوسری آیت کی تفسیر بن سکتی ہو تو پھر قرآن کی تفسیر قرآن سے ہی کرنی چاہئے کیونکہ تفسیر القرآن بالقرآن ہی سب سے افضل واعلیٰ ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معمول مبارک یہی تھا پھر تفسیر القرآن بالقرآن کی مختلف صورتیں ہیں۔ فقط دو مثالیں پیش خدمت ہیں۔

1۔ ایک شی کا ذکر ایک مقام پر اختصار کے ساتھ ہو اور دوسرے مقام پر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ہو تو ایسی صورت میں اطناب ایجاز کی تفسیر ہوگا۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ بعض مقامات پر اختصار کے ساتھ ہے اور بعض مقامات پر تفصیل کے ساتھ ہے۔

2۔ اگر ایک مقام پر کلام مجمل ہوگا اور دوسرے مقام پر مفسر ہو تو مجمل کو مفسر پر محمول کی جائے گا مثلاً سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ (بقرہ:37)

اور پھر اس کی تفسیر سورۂ اعراف میں بیان فرمائی:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (الاعراف:23)

دونوں نے عرض کی اے ہمارے پروردگار! ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر اور اگر نہ بخشش فرمائے تو ہمارے لئے اور نہ رحم فرمائے ہم پر تو یہ یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں سے ہو جائیں گے۔

پس اس طرح کی متعدد انواع کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

(2) سنت رسول مکرم ﷺ

تفسیر قرآن کا دوسرا عظیم ماخذ ومصدر حضور نبی مکرم ﷺ کی سنت طیبہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم الرضوان کا یہ معمول مبارک تھا کہ جب بھی انہیں قرآن کریم کے بارے رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی تو فوراً بارگاہِ نبوی ﷺ میں حاضر خدمت ہوتے اور اپنی مشکل اور حاجت پیش کرتے اور حضور نبی رحمت ﷺ تفسیر بیان فرما کر مطالب ومفاہیم ان کے ذہنوں میں راسخ فرما دیتے کیونکہ قرآن کریم کے الفاظ میں مطالب ومفاہیم کے جو سمندر موجزن ہیں خالق کائنات نے مکمل طور پر ان کی گہرائی اور گیرائی سے اپنے محبوب ﷺ کو آگاہ فرما دیا ہے اور ان میں غواصی کی قوت واستعداد بھی آپ کو ودیعت فرما رکھی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ (النحل:44)

اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف تاکہ وہ غور وفکر کریں۔

اور آقائے دو جہاں ﷺ نے خود بھی ارشاد فرمایا:

اَلَا یُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰی اَرِیْكَتِهٖ یَقُوْلُ: عَلَیْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ فَمَا وَجَدْتُّمْ فِیْهِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْهُ وَمَا وَجَدْتُّمْ فِیْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ...... الحدیث

خبردار! قریب ہے کہ ایک پیٹ بھرا آدمی اپنے پلنگ پر بیٹھے کہہ رہا ہوگا۔ تم پر اس قرآن کو پکڑنا لازم ہے۔ پس جو چیز تم اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ الحدیث

لہٰذا اگر کتب حدیث کی طرف رجوع کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں کتاب التفسیر کے نام سے کئی ابواب پائے جاتے ہیں۔ جن میں قرآن کریم کے تفسیری معانی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ دو تین مثالیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

(1) امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اِنَّ الْمَغْضُوْبَ عَلَیْهِمْ هُمُ الْیَهُوْدُ وَاِنَّ الضَّآلِّیْنَ هُمُ النَّصَارٰی" (مغضوب علیہم (جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا) سے مراد یہودی ہیں اور ضالین (گمراہ، بھٹکنے والے) سے مراد نصاریٰ ہیں۔)

(2) امام ترمذی اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "اَلصَّلٰوةُ الْوُسْطٰی صَلٰوةُ الْعَصْرِ" (کہ الصلوٰۃ الوسطیٰ سے مراد نماز عصر ہے۔)

(3) امام ترمذی اور ابن جریر رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ "وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰی" کے بارے آپ نے فرمایا اس سے مراد لا الٰہ الا اللہ ہے۔

علی ہذا القیاس اس نوع کی تفسیری روایات کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

(3) اجتہاد اور قوتِ استنباط

صحابہ کرام علیہم الرضوان کا معمول مبارک تھا کہ اگر قرآن کریم کی تفسیر کے سلسلہ میں وہ پہلے مصادر میں سے کسی تک نہ پہنچتے تو پھر

اجتہاد اور عمل بالرائے کا راستہ اپناتے اور رُوحِ قرآن تک رسائی کی انتھک کوشش کرتے۔ چونکہ قرآن کریم لغت عرب میں نازل ہوا اور صحابہ کرام بھی عربی لغت کی باریکیوں سے فقط شناسا ہی نہیں بلکہ اس میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ اس لئے انہیں عربی الفاظ کی معنوی حقیقت کے ادراک میں کسی دقت اور پیچیدگی کا سامنا نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود اکثر صحابہ کرام علیہم الرضوان نے رائے اور اجتہاد سے تفسیر کرنے کے لئے چار چیزوں کو بطور معاون لازم قرار دیا تھا۔

(1) لغت کے اسرار و رموز سے کامل واقفیت (2) عادات العرب کی پہچان (3) نزولِ قرآن کے وقت جزیرۂ عرب میں یہود و نصاریٰ کے حالات کا علم (4) وسعتِ ادراک اور قوتِ فہم۔

(1) لغت کے اسرار و رموز سے کامل واقفیت

چونکہ قرآن کریم کی زبان عربی ہے۔ اس لئے ان سے مفاہیم و مطالب اخذ کرنے کے لئے عربی زبان کی باریکیوں اور پیچیدگیوں کا علم ہونا ازحد لازم اور ضروری ہے کیونکہ وہ آدمی جو عربی لغت پر کامل دسترس نہ رکھتا ہو، اس کے اسرار و رموز سے آگاہ نہ ہو اور لفظ کے حقیقی اور مجازی معنی میں استعمال سے واقف نہ ہو وہ قرآن کریم کی آیات طیبات کے حقیقی معانی کا ادراک کبھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی حقیقی مطلوب اور مدعیٰ تک اس کی رسائی ممکن ہے۔ اس لئے یہ لازم ہے کہ مفسر عربی لغت میں ماہرانہ بصیرت رکھتا ہو۔

(2) عادات العرب کی پہچان

قرآن کریم فرقان حمید میں بہت سی ایسی آیات بھی ہیں جن کے حقیقی معانی اور مطالب کا ادراک اُس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک اہل عرب کی ان عادات و اطوار اور رسوم و رواج کا علم نہ ہو جن پر نزولِ قرآن کے وقت وہ عمل پیرا تھے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ" (التوبہ: 37) اور "وَ لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا" (البقرہ: 189)

اور یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم داخل ہو گھروں میں ان کے پچھواڑے سے۔

اسی طرح کی کئی اور آیات طیبات بھی ہیں جن کے بارے حقیقی ادراک عربوں کے زمانہ جاہلیت کی عادات و اطوار کی واقفیت پر موقوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے اجتہاد اور رائے سے تفسیر کرتے وقت اس علم کو بھی لازم قرار دیا ہے۔

(3) یہود و نصاریٰ کے حالات کا علم

قرآن کریم میں بیسیوں ایسی آیات ہیں جو مخصوص واقعات اور حالات کے تحت نازل ہوئیں۔ کئی ایسی آیات ہیں جن میں یہود و نصاریٰ کے افعال و اعمال کا تذکرہ ہے اور کئی ایسی آیات ہیں جن میں ان کے نظریات اور عقائد کا رد کیا گیا ہے۔ لہٰذا ایسی آیات کا صحیح مفہوم ذہن نشین کرنے کے لئے اور ان سے منشاء الٰہی تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ آیات قرآنیہ کے اسبابِ نزول کا علم ہو اور ساتھ ہی یہ علم بھی ہو کہ جزیرۂ عرب میں جب قرآن کریم نازل ہو رہا تھا تو اس دوران یا اس سے قبل یہود و نصاریٰ کے نظریات اور اعتقادات کیا تھے؟ تاکہ آیات کے حقیقی معانی اور مطالب تک رسائی ممکن ہو سکے کیونکہ اسبابِ نزول اور مخصوص حالات کی پہچان کے بغیر آیات طیبات کی تفسیر کا حق ادا ہی نہیں ہو سکتا بلکہ حقیقی معانی کا ادراک اور معرفت ممکن ہی نہیں۔ جیسا کہ علامہ واحدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

لَا یُمْكِنُ مَعْرِفَةُ تَفْسِیْرِ الْاٰیَةِ دُوْنَ الْوُقُوْفِ عَلٰی قِصَّتِهَا وَبَیَانِ نُزُوْلِهَا

آیت کی تفسیر کی حقیقی پہچان اور معرفت اس کے واقعہ اور شان نزول پر واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔

اور ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

بَیَانُ سَبَبِ النُّزُوْلِ طَرِیْقٌ قَوِیٌّ فِیْ فَهْمِ مَعَانِی الْقُرْآنِ

اسباب نزول کا بیان قرآن کریم کی فہم وفراست کا انتہائی قوی اور مضبوط ذریعہ ہے۔

(4) قوتِ فہم اور وسعت ادراک

قوتِ فہم اور وسعت ادراک یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عطا اور عنایت ہے، اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فرمادیتا ہے۔ "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ" اور اپنے بندوں میں سے جن پر اس کی نظر انتخاب پڑتی ہے انہیں فہم وفراست کی قوت اور معرفت و ادراک کی نعمت سے مالا مال فرمادیتا ہے۔ قرآن کریم میں بہت سی ایسی آیات طیبات ہیں جن کی باریکیوں اور لطافتوں تک رسائی حاصل نہیں ہوسکتی۔ معانی کے انوار وتجلیات کو الفاظ کے پردوں کی دبیز تہوں سے ظاہر نہیں کیا جاسکتا، جب تک نور بصیرت اور فہم و ادراک کی وافر قوت حاصل نہ ہو۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان میں سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لئے حضور نبی رحمت ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ یہ دعا فرمائی "اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِیْلَ" (اے اللہ! اسے دین میں فقاہت عطا فرما اور تاویل وتفسیر کا علم عطا فرما)۔ اسی دعا کا نتیجہ تھا کہ آپ ترجمان القرآن کے لقب سے معروف ومشہور ہوئے، بے مثال قوت فہم سے معمور ہوئے اور عدیم النظیر نور بصیرت سے منور ہوئے۔ اسی لئے صحابہ کرام یہ ضروری سمجھتے تھے کہ قرآن کریم کی تفسیر کے لئے قوت فہم کا وافر ہونا اور وسعت ادراک کا پایا جانا لازم وضروری ہے۔

نوٹ:۔ چونکہ قوت ادراک اور نور بصیرت تمام کو یکساں اور مساوی حاصل نہیں، اس لئے صحابہ کرام کے مابین آیات طیبات کے معانی اور مفاہیم بیان کرنے میں تفاوت اور اختلاف موجود ہے۔ لیکن یہ علی وجہ البصیرت کہا جاسکتا ہے کہ ہر ایک نے قرآن کریم کے مطالب اور مفاہیم تک رسائی حاصل کرنے کے لئے نظر وفکر کی آخری حدوں کو چھوا اور اپنی تمام تر خداداد صلاحیت اور استعداد کو مطلوب تک پہنچنے کے لئے صرف کردیا کیونکہ قرآن کریم کی تفسیر فقط رائے اور اجتہاد سے کرنا جس کی کوئی اصل اور بنیاد نہ ہو، بالکل جائز نہیں۔ جیسا کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا:

وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (الاسراء:36)

اور نہ پیروی کرو اس چیز کی جس کا تمہیں علم نہیں۔

مزید فرمایا:

لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (النحل:44)

کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے۔

اس آیت میں بیان کی نسبت حضور نبی کریم ﷺ کی طرف ہے اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ تَکَلَّمَ فِی الْقُرْآنِ بِرَاْیِهٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَاَ

جس نے قرآن کریم کے بارے اپنی رائے سے کلام کی اور اس کی رائے صحیح بھی ہو تب بھی اس نے خطا کی۔

یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے۔

اسی طرح یہ ارشاد گرامی بھی ہے:

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (رواہ ابوداؤد)

جس نے قرآن کریم کے بارے بغیر علم کے کچھ کہا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم بنالیا۔

پہلی حدیث کے بارے علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس کا حقیقی مفہوم اور مراد یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے البتہ غالب گمان یہ ہے کہ رائے سے مراد ایسی رائے ہے جس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو اور ایسی رائے جس پر دلیل قائم ہو جائے اس سے کلام کرنا جائز ہے۔ المختصر ایسی رائے جس پر کوئی دلیل اور حجت قائم نہ ہو اس کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر کرنا قطعاً جائز نہیں۔

(زبدۃ الاتقان مترجم: 305)

طبقات المفسرین کا بیان

قرآن مجید فرقان حمید کی تفسیر و تشریح کا آغاز صاحب قرآن حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات ستودہ صفات سے ہوا۔ آپ ﷺ ہی قرآن کریم کے سب سے پہلے شارح اور مفسر ہیں اور بعد ازاں آپ ﷺ کے فیضان صحبت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس رتبہ علیا پر فائز ہوئے۔ بالخصوص دس افراد نے اپنا نام پیدا کیا اور شہرت دوام حاصل کی۔ اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

حضرات خلفائے راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

خلفائے اربعہ میں سے سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے علوم قرآن میں سے آپ کو اتنا حظ وافر عطا فرمایا تھا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ چنانچہ ابوطفیل رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ میں ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں حاضر ہوا تو آپ کو یہ فرماتے سنا:

سَلُوْنِيْ فَوَاللّٰهِ لَا تَسْئَلُوْنِيْ عَنْ شَيْءٍ إِلَّا أَخْبَرْتُكُمْ وَسَلُوْنِيْ عَنْ كِتَابِ اللّٰهِ فَوَاللّٰهِ مَا مِنْ آيَةٍ إِلَّا وَأَنَا أَعْلَمُ أَبِلَيْلٍ نَزَلَتْ أَمْ بِنَهَارٍ أَمْ فِيْ سَهْلٍ أَمْ فِيْ جَبَلٍ

مجھ سے سوال کرو۔ قسم بخدا! کسی بھی شی کے متعلق تم مجھ سے پوچھو گے تو میں تمہیں اس کے متعلق بتاؤں گا اور مجھ سے کتاب اللہ کے بارے سوال کرو۔ قسم بخدا! میں ہر آیت کے متعلق یہ جانتا ہوں کہ کیا وہ رات کے وقت نازل ہوئی یا دن کو، صحراء میں نازل ہوئی یا پہاڑ پر۔

اسی طرح حلیہ میں ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

وَاللّٰهِ مَا نَزَلَتْ آيَةٌ إِلَّا وَقَدْ عَلِمْتُ فِيْمَ أُنْزِلَتْ وَأَيْنَ أُنْزِلَتْ إِنَّ رَبِّيْ وَهَبَ لِيْ قَلْبًا عَقُوْلًا وَلِسَانًا سَئُوْلًا

قسم بخدا! میں ہر آیت کے بارے یہ جانتا ہوں کہ وہ کس کے بارے نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی۔ بلاشبہ میرے رب

نے مجھے انتہائی عقلمند اور دانا دل اور سوال کرنے والی زبان عطا فرمائی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑھ کر تفسیری روایات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلا کی ذہانت اور قوت فہم وادراک عطا فرما رکھی تھی۔ آیات قرآنیہ کے بارے اپنی معلومات کے متعلق خود فرماتے ہیں۔

"اس ذات کی قسم جس کے بغیر کوئی اور معبود نہیں! کتاب اللہ میں کوئی آیت بھی نازل نہیں ہوئی مگر اس کے بارے میں یہ جانتا ہوں کہ وہ کس کے بارے اور کہاں نازل ہوئی۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ کہیں مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا عالم موجود ہے اور اس تک سواریاں پہنچ سکتی ہیں تو اس سے علم کے حصول کے لئے میں ضرور وہاں پہنچ جاتا۔"

ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے ابوالبختری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کی، ہمیں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے کچھ بتائیے تو آپ نے فرمایا:

عَلِمَ الْقُرْآنَ وَالسُّنَّةَ ثُمَّ انْتَهٰى وَكَفٰى بِذٰلِكَ عِلْمًا

انہوں نے قرآن وسنت کا علم حاصل کیا اور اس کی انتہا تک پہنچے اور یہی علم ان کے لئے کافی ہوا۔

مسروق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کا علم چھ افراد میں محصور ہے یعنی حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابوالدرداء اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور پھر ان چھ افراد کا علم ان میں سے دو پر ختم ہوتا ہے یعنی حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

رہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما! آپ تو ترجمان القرآن ہیں۔ حضور نبی رحمت ﷺ کی خصوصی نوازشات اور دعاؤں کے سبب تمام علوم میں بالعموم اور علم تفسیر میں بالخصوص مطلع علم وحکمت پر ماہ تمام بن کر ابھرے اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ کریم مدنی آقا ﷺ نے پروردگار عالم کی بارگاہ میں کبھی یہ التجاء کی "اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ" اور کبھی اس طرح عرض کناں ہوئے "اے اللہ! انہیں حکمت عطا فرما" اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے تو آپ کو اس دعا سے بھی نوازا "اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيْهِ وَانْشُرْ مِنْهُ" (اے اللہ! انہیں برکت عطا فرما اور انہیں علم پھیلانے کا ذریعہ بنا۔) آپ ﷺ کی انہی دعاؤں کی برکت سے خالق کائنات نے آپ کو اس شرف سے نوازا کہ آپ خود فرماتے ہیں:

اِنْتَهَيْتُ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَعِنْدَهٗ جِبْرِيْلُ فَقَالَ لَهٗ جِبْرِيْلُ اِنَّهٗ كَائِنٌ حَبْرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ فَاسْتَوْصِ بِهٖ خَيْرًا

میں اکیلا حضور نبی رحمت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھا کہ اتنے میں حضرت جبرئیل امین علیہ السلام آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر خدمت ہوئے اور کہا یہ اس امت کا جید عالم ہوگا، اسے خیر کی نصیحت فرمایئے۔

بعد ازاں ایک دن آپ ﷺ نے آپ کو مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا "نِعْمَ تَرْجُمَانُ الْقُرْآنِ اَنْتَ" (تو کتنا اچھا اور اعلیٰ ترجمان القرآن ہے۔) خالق کائنات نے آپ کو اتنی فہم وفراست اور ذہانت وفطانت سے نواز رکھا تھا کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کو فرماتے "ذَاكُمْ فَتَى الْكُهُوْلُ اَنَّ لَهٗ لِسَانًا سَئُوْلًا وَقَلْبًا عَقُوْلًا" (تم میں یہ نوجوان (اپنی دانائی اور عقلمندی میں) بوڑھوں کی شکل ہے۔ اس کی زبان سوال کرنے والی ہے اور دل انتہائی دانا اور عقلمند ہے۔) بلکہ آپ تو انہیں شیوخ بدر میں شامل فرماتے تھے حالانکہ بعض پر یہ بات ناگوار بھی گزرتی تھی۔ لہٰذا حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان تمام پر آپ کے علمی مقام ومرتبہ

کو ظاہر کرنے کے لئے ایک دن تمام کو اکٹھا کیا اور فرمایا بتاؤ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کا مفہوم کیا ہے؟ تو ان میں سے بعض نے کہا اس میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا ہے کہ جب وہ ہماری مدد فرمائے اور فتح عطا فرمادے تو ہمیں چاہئے کہ ہم اس کی تسبیح وتحمید بیان کریں اور اس سے استغفار کریں۔ جبکہ بعض افراد خاموش رہے۔ بعد ازاں امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ سے اس کے بارے استفسار کیا۔ تو آپ نے جواباً عرض کی اس میں رسول اللہ ﷺ کے وصال پُر ملال کی خبر ہے۔ جس پر رب کائنات نے اپنے محبوب مکرم ﷺ کو آگاہ فرمایا ہے۔ تو آپ کے اس موقف کی تائید حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی فرمائی۔ رواہ البخاری

اور آپ کے تلمیذ رشید حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے "اِنَّهٗ اِذَا فَسَّرَ الشَّيْءَ رَاَيْتَ عَلَيْهِ النُّوْرَ"

(کہ جب آپ کسی شئی کی تفسیر بیان فرماتے تو میں آپ پر ایک خاص قسم کا نور دیکھتا۔)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان الفاظ میں آپ کی تفسیری صلاحیت کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں "كَاَنَّمَا يَنْظُرُ اِلَى الْغَيْبِ مِنْ سِتْرٍ رَقِيْقٍ" (جب آپ تفسیر بیان فرماتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے گویا آپ ایک باریک پردے سے غریب اور مخفی امور کی طرف دیکھ رہے ہیں۔)

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں "اِبْنُ عَبَّاسٍ اَعْلَمُ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ"

(التفسیر والمفسرون: 68، اسد الغابہ ج 3، ص 192 تا 195)

(جو کچھ حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا، ساری امت میں سے اس کے سب سے بڑے عالم حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں۔)

اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سید القراء تھے۔ کاتبین وحی میں سے ایک عظیم فرد تھے۔ ان کی شان میں خود آقائے دو جہاں ﷺ نے فرمایا "وَاَقْرَؤُهُمْ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ" (سب سے بڑھ کر قاری حضرت ابی بن کعب ہیں۔)

آپ کو یہ شرف اور عظمت بھی حاصل ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ابی بن کعب کو فرمایا "اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم ارشاد فرمایا ہے کہ میں تم پر یہ پڑھوں "لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الآیہ" یہ سن کر آپ نے عرض کی آقا ﷺ! کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو میرا نام لے کر یہ فرمایا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ یہ سن کر آپ کو اپنی قسمت اور بلند بختی پر رشک آنے لگا اور آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی لڑی بن کر جھڑنے لگے۔ اور ایک روایت میں اس طرح بھی ہے کہ آپ سے پوچھا گیا کیا آپ کو اس پر فرحت ومسرت ہوئی؟ تو آپ نے جواباً عرض کی کیوں نہیں۔ کونسی چیز فرحت وسرور کے منافی ہے جبکہ خالق کائنات خود فرماتا ہے: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (یونس: 58)

آپ صحابہ کرام میں سے کتاب اللہ کے اسرار ورموز اور معانی ومطالب پر گہری نظر رکھنے والے تھے۔ چونکہ آپ کتب قدیمہ کے ماہر اور جید عالم تھے اس لئے آپ آیات قرآنیہ کے اسباب نزول، تقدیم وتاخیر اور ناسخ ومنسوخ وغیرہ پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ لہٰذا تفسیر قرآن کے سلسلہ میں بہت سے لوگ آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ آپ سے تفسیری روایات کئی اسناد سے مروی ہیں مگر جسے تمام اسناد پر فوقیت حاصل ہے وہ یہ ہے "ابو جعفر الرازی عن ربیع بن انس عن ابی العالیہ عن ابیؓ بن کعب رضی اللہ

عنہ۔" اس سند سے تفسیر القرآن کا بہت بڑا نسخہ آپ سے مروی ہے۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، حاکم اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ نے کثیر روایات نقل کی ہیں۔

علم تفسیر کے مدارس کا بیان

آقائے دو جہاں حضور نبی رحمت ﷺ کے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرماتے ہی بتدریج اسلام کی تقویت اور ترقی کا آغاز ہوا۔ آپ ﷺ کے زمانہ مقدس میں کفار کے ساتھ کئی غزوات ہوئے جن میں خالق کائنات نے آپ کے غلاموں کو فتح مبین سے نوازا اور اطراف واکناف کے بلاد عرب میں رہائش پذیر قبائل کے افراد جوق در جوق نور اسلام سے اپنے تاریک دلوں کو بقعۂ نور بنانے لگے۔ اور تعلیمات قرآن سے اپنے قلوب واذہان اور جوارح کو مزین کرنے لگے۔ فتوحات اور اسلام کی ترقی کا یہ سلسلہ خلفائے راشدین کے ادوار میں بھی مسلسل جاری رہا اور اس وقت کی سپر طاقتیں اپنے تمام تر وسائل کے باوجود قوت اسلام کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گئیں۔ نتیجۃً اسلام کا نور عرب وعجم تک پھیلا، صحابہ کرام دور ونزدیک کے شہروں تک پہنچے اور قرآن کریم کے فیضان سے لوگوں کے سینوں کو فیض یاب کرنے لگے۔ اس لئے اس دور میں دیگر علوم کی طرح علم تفسیر کے مدارس بھی قائم ہوئے اور منظم انداز میں یہ فن بھی پروان چڑھنے لگا۔ یہ وہ عالیشان مدارس تھے جن میں مسند تدریس پر وہ صحابہ کرام رونق افروز تھے جو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے بلاواسطہ فیض یاب تھے اور شاگردان رشید تابعین عظام تھے۔ لہٰذا اس طرح تین مدارس کو خصوصیت کے ساتھ شہرت دوام حاصل ہوئی۔

(1) مدرسة التفسير في مكة المكرمة (2) مدرسة التفسير في المدينة المنورة

(3) مدرسة التفسير في العراق۔

1:۔ مدرسة التفسير في مكة المكرمة

مکہ مکرمہ میں مدرسہ تفسیر قائم کرنے کا شرف حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو حاصل ہوا۔ آپ مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوتے، تابعین عظام آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے۔ آپ کتاب الٰہی کے اسرار ورموز بیان فرماتے اور تابعین انہیں اپنے ذہنوں میں راسخ کرتے۔ آپ الفاظ کی دبیز تہوں میں چھپے معانی کی پردہ کشائی فرماتے اور تابعین انہیں اپنے سینوں میں ثبت کر لیتے۔ آپ اپنا شیریں زبان اور عشق و مستی میں ڈوبی آنکھوں سے مکتبہ نبوت سے حاصل کردہ علم کے ظاہری و باطنی انوار و تجلیات بکھیرتے، تو ان کی نورانی شعاعیں تابعین کے قلوب واذہان کو منور وروشن فرما دیتیں۔ وہ عالی بخت اور بلند ہمت افراد کثیر تعداد میں ہیں جنہیں آپ کے خوان کرم سے علم وحکمت کے موتی چننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ چند اسمائے گرامی یہ ہیں۔

حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد، حضرت عکرمہ مولی ابن عباس، حضرت طاؤس بن کیسان الیمانی اور حضرت عطاء بن ابی رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

ہر ایک کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کی کنیت ابو محمد یا ابو عبداللہ ہے اور اسم گرامی سعید بن جبیر بن ہشام الاسدی الوالبی ہے۔ آپ حبشی الاصل تھے۔ آپ کا

اخلاق و کردار انتہائی حسین اور روشن تھا۔ آپ کی اکثر روایات حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور کئی دیگر صحابہ کرام سے مروی ہیں۔ آپ کا شمار کبار تابعین میں ہے۔ علم تفسیر، حدیث اور فقہ میں آپ سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام پر فائز تھے۔ خصیف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ تابعین میں طلاق سے متعلقہ مسائل کے سب سے بڑے عالم حضرت سعید بن مسیب تھے، حج کے مسائل میں حضرت عطاء تھے، حلال و حرام کے بڑے عالم طاؤس تھے، تفسیر کے بڑے عالم ابوالحجاج مجاہد بن جبر تھے اور ان تمام کے جامع حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ (وفیات الاعیان ج 1، ص 364)

ابھی آپ نے اپنی حیات مستعار کی انچاس بہاریں ہی گزاری تھیں کہ شعبان 95ھ کو آپ کو قتل کر دیا گیا۔

حضرت مجاہد بن جبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسم گرامی مجاہد بن جبر ہے۔ آپ کی کنیت ابوالحجاج ہے اور بنی مخزوم سے تعلق کی بناء پر مخزومی کہلاتے تھے۔ آپ بہت بڑے قاری اور مفسر قرآن تھے۔ آپ کی ولادت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانۂ خلافت میں 21ھ میں ہوئی۔ اگرچہ آپ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بہت کم تفسیری روایات نقل کی ہیں لیکن آپ کی ثقاہت مسلم ہے۔ حضرت امام شافعی اور حضرت امام بخاری رحمہما اللہ تعالیٰ نے آپ کی تفسیر پر مکمل اعتماد کیا ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں کتاب التفسیر کے حوالے سے کثیر روایات نقل کی ہیں۔ مصعب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ تفسیر کے سب سے بڑے عالم مجاہد ہیں۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے آپ ثقہ، فقیہ، عالم اور کثیر الحدیث تھے۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے آپ بہت بڑے فقیہ، عابد اور متقی و پرہیزگار تھے۔ اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ابوبکر حنفی سے یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے سنا "إِذَا جَاءَكَ التَّفْسِيرُ عَنْ مُجَاهِدٍ فَحَسْبُكَ بِهِ" (کہ جب تیرے پاس مجاہد کی تفسیر آ جائے تو وہی تیرے لئے کافی ہے۔) آپ کی عمر تراسی (83) برس تھی کہ 104ھ میں پیغام اجل آ پہنچا۔ چنانچہ علم تفسیر کا عظیم امام شہر مکہ میں اپنے کریم رب کو سجدہ کرتے ہوئے ظاہر بین نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسم گرامی عکرمہ اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ آپ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ شام کے علاقہ بربر سے تعلق ہونے کی بناء پر بربری اور مدینہ طیبہ سے نسبت کی وجہ سے مدنی کہلاتے ہیں۔ آپ نے اپنے آقا حضرت ابن عباس، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام سے روایات نقل کی ہیں۔ آپ دیگر علوم میں بالعموم اور علم تفسیر میں بالخصوص مرتبہ علیا پر فائز تھے۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں فقہ اور قرآن کے جید علماء میں سے تھے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر کتاب اللہ کا کوئی عالم باقی نہیں رہا۔ اور یحییٰ بن ایوب مصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مجھ سے ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کیا تم نے عکرمہ سے کچھ لکھا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ تو انہوں نے کہا دو تہائی علم تم سے فوت ہو گیا۔ (فَاتَكُمْ ثُلُثَا الْعِلْمِ) آپ کا وصال 104ھ میں ہوا۔

حضرت طاؤس بن کیسان الیمانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسم گرامی ابوعبدالرحمٰن طاؤس بن کیسان الیمانی الحمیری الجندی ہے۔ آپ بحیر بن ریسان کے غلام تھے اور بعض نے کہا ہے کہ آپ ہمدان کے غلام تھے۔ آپ نے عبادلہ اربعہ اور دیگر صحابہ کرام سے روایات نقل کی ہیں۔ آپ بہت بڑے عالم، متقی اور کتاب اللہ کے اسرار و رموز سے خوب آگاہ تھے۔ آپ کے تقویٰ اور امانت کی شہادت دیتے ہوئے آپ کے استاذ محترم حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں مجھے یقین ہے طاؤس اہل جنت میں سے ہے۔ (اِنِّیْ لَاَظُنُّ طَاؤُسًا مِّنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ) اور عمرو بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے میں نے طاؤس رحمۃ اللہ علیہ کی مثل کوئی نہیں دیکھا۔ صحاح ستہ کے مصنفین نے اپنی کتب میں آپ کی مرویات نقل کی ہیں۔ ابن معین رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ آپ ثقہ ہیں اور ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے طاؤس رحمۃ اللہ علیہ اہل یمن کے شیخ ہیں۔ آپ 106ھ میں مکہ مکرمہ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور دنیا کی آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گئے۔

حضرت عطاء بن ابی رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسم گرامی ابومحمد عطاء بن ابی رباح المکی القرشی ہے۔ آپ 27ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کو حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام سے روایات لینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ بہت بڑے عالم، فقیہ اور کثیر الحدیث ثقہ راوی تھے۔ اہل مکہ جب حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس جمع ہوتے تھے تو آپ انہیں فرماتے "اے اہل مکہ! تم میرے پاس جمع ہوتے ہو حالانکہ تمہارے پاس عطاء ہے۔" (تَجْتَمِعُوْنَ اِلَیَّ یَااَهْلَ مَكَّةَ وَعِنْدَكُمْ عَطَاءٌ؟) حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "جتنے افراد سے میری ملاقات ہوئی میں نے عطاء سے افضل و اعلیٰ کسی کو نہیں دیکھا۔" (مَارَاَیْتُ فِیْمَنْ لَقِیْتُ اَفْضَلَ مِنْ عَطَاءٍ) حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تابعین میں سے چار افراد سب سے بڑھ کر عالم تھے۔ حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ مناسک کے، حضرت سعید بن جبیر علم تفسیر کے، حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سیر کے اور حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ حلال و حرام کے زیادہ ماہر تھے۔" ارجح قول کے مطابق آپ کا وصال 114ھ میں ہوا۔

2: مدرسة التفسير في المدينة المنورة

اسلامی سلطنت کی حدود وسیع ہونے کے سبب بہت سے صحابہ کرام اطراف و اکناف کے شہروں میں چلے گئے تاکہ دین اسلام کی ترویج و اشاعت کا کام احسن اور وسیع انداز میں سرانجام دیا جا سکے مگر اس کے باوجود ان کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی جو مدینہ منورہ کی نورانی اور بہار آفریں فضاؤں میں اپنے کریم آقا و مولیٰ ﷺ کے قرب و جوار میں ہی سکونت پذیر رہے۔ اسی دوران بہت سے صحابہ کرام نے تعلیم قرآن عام کرنے کے لئے سلسلۂ درس و تدریس کا آغاز کیا۔ لیکن ان تمام میں تنظیم اور فیضان علم عام ہونے کے اعتبار سے جو شہرت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مدرسہ کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کا مقدر نہ بن سکی۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں اکثر تابعین مفسرین آپ ہی کے فیض یافتہ ہیں۔ آپ کے دبستان علم سے علم و حکمت کے پھول چننے والوں کی تعداد تو کثیر ہے مگر ان میں تین نام خصوصی شہرت کے حامل ہیں۔

(1) حضرت ابوالعالیہ (2) محمد بن کعب القرظی (3) حضرت زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہم

حضرت ابوالعالیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسم گرامی ابوالعالیہ رفیع بن مہران ریاحی ہے۔ آپ حضور نبی رحمت ﷺ کے وصال کے دو سال بعد مشرف باسلام ہوئے۔ آپ نے حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام سے روایات نقل کی ہیں۔ آپ کا شمار ثقہ اور علم تفسیر کے ماہر تابعین میں ہے۔ ابن معین، ابوزرعہ، ابوحاتم اور عجلی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ابوالعالیہ ثقہ ہیں اور ابن ابی داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ صحابہ کرام کے بعد ابوالعالیہ سے بڑھ کر علم قرأت کو جاننے والا کوئی نہیں۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تفسیر کے بارے بہت بڑا نسخہ مروی ہے۔ جسے ابوجعفر رازی ربیع بن انس سے، وہ ابوالعالیہ سے اور وہ حضرت ابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ ارجح قول کے مطابق آپ کا وصال 90ھ میں ہوا۔

محمد بن کعب قرظی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسم گرامی محمد بن کعب بن سلیم بن اسد قرظی مدنی ہے۔ آپ کی کنیت ابوحمزہ یا ابوعبداللہ ہے۔ آپ کو حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام سے بلاواسطہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالواسطہ روایت کی سعادت حاصل ہے۔ آپ کو ثقاہت، عدالت، تقویٰ، کثرت حدیث اور تاویل القرآن میں خاص شہرت حاصل تھی۔ آپ کے بارے ابن عون رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نے قرظی سے بڑھ کر تاویل القرآن کا عالم کوئی نہیں دیکھا۔

(خلاصہ تہذیب الکمال، ص205)

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ آپ اہل مدینہ کے بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ آپ مسجد میں لوگوں کے سامنے کچھ بیان فرما رہے تھے کہ اسی دوران مسجد کی چھت گر پڑی۔ جس کے سبب 118ھ میں آپ اپنے ساتھیوں سمیت اس دار فانی سے دار بقاء کی طرف رحلت فرما گئے اس وقت آپ کی عمر اٹھہتر (78) برس تھی۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسم گرامی زید بن اسلم العدوی المدنی ہے اور کنیت ابواسامہ یا ابوعبداللہ ہے۔ آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ بہت بڑے فقیہ اور کبار تابعین میں سے عظیم مفسر تھے۔ آپ کے بارے امام احمد بن حنبل، ابوزرعہ، ابوحاتم اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ تمام نے کہا ہے کہ آپ ثقہ ہیں۔ لہٰذا آپ کی عدالت وثقاہت کے لئے ان چار کی شہادت ہی کافی ہے۔ آپ بھی بہت سے صحابہ کرام اور تابعین کی طرح قرآن کریم کی تفسیر رائے سے کرنا جائز سمجھتے تھے اور اس میں کوئی حرج نہیں جانتے تھے۔ مدینہ طیبہ کے علماء میں سے آپ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن بن زید اور حضرت امام مالک بن انس رحمہما اللہ تعالیٰ نے آپ سے زیادہ تر تفسیری روایات نقل کی ہیں۔ آپ کا وصال 136ھ میں ہوا۔

3:۔ مدرسۃ التفسیر فی العراق

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ کرام میں اپنا خاص مقام اور مرتبہ رکھتے تھے۔ آپ نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ

والتسلیم کی نظر کیمیا اثر سے علوم کے سمندر اپنے سینے میں سمو لئے اور پھر تا دمِ واپسیں اس فیضان کو تقسیم فرماتے رہے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کوفہ کا والی بنا کر بھیجا تو ان کے ساتھ وزیر اور معلم بنا کر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ فرمایا اور اہل کوفہ کی طرف یہ لکھ بھیجا کہ میں ابن مسعود کو تمہاری علمی راہنمائی کے لئے معلم بنا کر بھیج رہا ہوں۔ اگرچہ اہل کوفہ دیگر صحابہ کرام سے بھی علوم حاصل کرنے اور قرآن فہمی میں مشغول تھے مگر آپ کی مجلس کا رنگ نرالا تھا۔ حسن بے انداز تھا اور علم کا ایک بحرِ بے کنار موجزن تھا۔ آپ نے استدلال و استنباط کے لئے رائے کے استعمال کو بھی رواج دیا۔ اس لئے اہل عراق اہل الرائے ہونے کے سبب دوسروں سے ممتاز ہو گئے۔ علماء فرماتے ہیں کہ رائے اور اجتہاد سے استدلال کی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ڈالی ہے اور پھر یہی وراثت علمائے عراق میں منتقل ہوتی رہی۔ بہت سے خوش بخت اور عالی ہمت افراد نے اپنے سینوں کو آپ کے فیضانِ علم سے معمور کیا۔ ان میں سے چند مشہور اسمائے گرامی یہ ہیں۔

حضرت علقمہ بن قیس، حضرت مسروق، حضرت اسود بن یزید، حضرت مرہ الہمدانی، حضرت عامر الشعبی، حضرت حسن بصری اور حضرت قتادہ بن دعامہ سدوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

حضرت علقمہ بن قیس رحمۃ اللہ تعالیٰ

آپ کا اسم گرامی علقمہ بن قیس بن عبداللہ بن مالک نخعی الکوفی ہے۔ آپ کی ولادت حضور نبی رحمت ﷺ کے زمانہ مقدس میں ہوئی۔ آپ کو حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرامؓ سے روایات اخذ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرنے والوں میں آپ سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ دوسروں سے بڑھ کر آپ کی معرفت رکھنے والے ہیں اور سب سے زیادہ آپ کے علم سے واقف و آگاہ ہیں۔ عثمان نے کہا ہے علقمہ ثقہ راوی ہیں اور ابوالمثنی نے کہا ہے جب آپ علقمہ کو دیکھ لیں تو پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہ دیکھنا آپ کے لئے باعث ضرر نہیں۔ مرہ ہمدانی نے کہا ہے علقمہ کا شمار ربانیین میں ہے۔ ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ آپ کی عمر نوے برس تھی کہ 61ھ یا 62ھ میں آپ کا وصال ہو گیا۔

حضرت مسروق رحمۃ اللہ تعالیٰ

آپ کا اسم گرامی ابو عائشہ، مسروق بن اجدع بن مالک بن امیہ ہمدانی، کوفی العابد ہے۔ ایک دن حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ سے نام کے بارے پوچھا تو انہوں نے عرض کی میرا نام مسروق بن اجدع ہے۔ تو آپ نے فرمایا اجدع تو شیطان ہے۔ لہٰذا آپ مسروق بن عبدالرحمٰن ہیں، آپ کو خلفائے اربعہ، حضرت ابن مسعود، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام سے روایات لینے کا موقع ملا۔ آپ اپنے تقویٰ و پرہیزگاری اور علم و عدالت میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تلامذہ میں ممتاز تھے۔ قاضی شریح مشکل ترین مسائل میں آپ ہی سے مشاورت کیا کرتے تھے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں میں نے آپ سے بڑھ کر کسی کو علم کا طالب نہیں دیکھا۔ حضرت مسروق اپنے استاذ محترم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر کیمیا اثر سے علم تفسیر کے امام بنے اور کتاب اللہ کے معانی کی باریکیوں اور لطافتوں کو جاننے کے لئے ماہرانہ بصیرت سے سعادت اندوز ہوئے۔

آپ کی ثقاہت اور عدالت کا اعتراف تمام علمائے جرح وتعدیل نے کیا ہے۔ مشہور روایت کے مطابق 63ھ میں آپ کو پیغام اجل آ پہنچا اور آپ اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔

حضرت اسود بن یزید رحمہ اللہ تعالیٰ

ان کا اسم گرامی ابوعبدالرحمٰن اسود بن یزید بن قیس نخعی ہے۔ آپ کا شمار کبار تابعین میں ہے۔ آپ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رواۃ میں سے ایک ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اعظم، حضرت علی، حضرت حذیفہ اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام سے آپ کو احادیث روایت کرنے کا موقع ملا ہے۔ امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، ابن سعد اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ تمام نے آپ کی فقاہت، ثقاہت اور زہد وتقویٰ کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ کا وصال 74ھ یا 75ھ میں شہر کوفہ میں ہوا۔

حضرت مرہ ہمدانی رحمہ اللہ تعالیٰ

آپ کی کنیت ابواسمٰعیل، اسم گرامی مرہ بن شراحیل ہمدانی کوفی اور لقب العابد ہے۔ آپ مرۃ الطیب اور مرۃ الخیر کے القاب سے بھی معروف ہیں۔ آپ نے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام سے احادیث نقل کی ہیں۔ ابن معین اور عجلی رحمہما اللہ تعالیٰ نے آپ کی توثیق کی ہے۔ حارث غنوی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے مرہ ہمدانی نے سجدہ کیا یہاں تک کہ مٹی آپ کے چہرے کو کھا گئی۔ (سَجَدَ مُرَّةُ الْهَمْدَانِيُّ حَتّٰى اَكَلَ التُّرَابُ وَجْهَهٗ) آپ ہر روز چھ سو رکعت نماز نفل ادا کرتے تھے۔ آپ نے 76ھ میں اس جہانِ فانی سے رخت سفر باندھا۔

حضرت عامر شعبی رحمہ اللہ تعالیٰ

آپ کا اسم گرامی ابوعمرو، عامر بن شراحیل الشعبی، حمیری، کوفی ہے۔ آپ انتہائی بزرگ اور صاحب مرتبہ تابعی تھے اور کوفہ میں عہدۂ قضاء پر فائز تھے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ میں نے پانچ سو صحابہ کرام کو پایا اور عجلی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ آپ نے اڑتالیس صحابہ کرام سے حدیث کا سماع کیا۔ جن صحابہ کرام سے آپ نے احادیث روایت کیں ان میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام کے اسماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ابن معین، ابوزرعہ رحمہما اللہ تعالیٰ اور دیگر علمائے جرح وتعدیل نے کہا ہے کہ شعبی ثقہ ہیں۔ مکحول رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں میں نے آپ سے بڑھ کر فقیہ نہیں دیکھا اور عاصم نے کہا ہے کہ کوفہ، بصرہ اور حجاز میں شعبی سے بڑھ کر حدیث کا کوئی عالم میں نے نہیں دیکھا۔ آپ کی تاریخ ولادت اور وصال میں علماء کے مابین خاصا اختلاف ہے لیکن مشہور قول کے مطابق آپ کی ولادت 20ھ میں اور وصال 109ھ میں ہوا۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ

آپ کی کنیت ابوسعید اور اسم گرامی حسن بن ابی الحسن یسار بصری ہے۔ آپ انصار کے موالی تھے اور آپ کی والدہ خیرہ ام سلمہ کی آزاد کردہ لونڈی تھی۔ ابھی حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے دو سال باقی تھے کہ آپ کی ولادت باسعادت ہوئی اور آپ وادیٔ القریٰ میں ہی پروان چڑھے۔ آپ انتہائی فصیح وبلیغ اور زاہد ومتقی تھے اور زبان میں اتنی حلاوت تھی کہ بات سامعین کے

دلوں میں اتر جاتی تھی۔ آپ کو حضرت علی، حضرت ابن عمر، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دیگر کثیر صحابہ و تابعین سے روایت کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور احکام حلال و حرام میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے حسن سے پوچھا کرو کیونکہ انہوں نے جو سنا اسے یاد رکھا اور ہم بھول گئے۔ ابوعوانہ، حضرت قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا" میں جس فقیہ کے پاس بھی بیٹھا میں نے حسن کو اس سے افضل و اعلیٰ پایا۔" بکر مزنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جس کے لئے یہ امر باعث مسرت ہو کہ وہ ہمارے زمانے کا سب سے بڑا عالم دیکھے، تو اسے چاہئے کہ وہ حسن کی زیارت کرلے کیونکہ ان سے بڑھ کر ہم نے کسی کو عالم نہیں پایا۔ جب امام ابوجعفر محمد الباقر رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آپ کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا ان کا کلام انبیاء علیہم السلام کے کلام کے مشابہ ہوتا ہے۔" ذَالِکَ الَّذِیْ یَشْبَہُ کَلَامُہٗ کَلَامَ الْاَنْبِیَاءِ۔" المختصر آپ ظاہری و باطنی اوصاف حمیدہ اور خصائل جمیلہ سے متصف اور آراستہ تھے۔ آخر 110ھ کا زمانہ تھا خالق حقیقی کی جانب سے پیغام اجل آ پہنچا اور علم و عرفان کا یہ نیر تاباں اپنی تمام تر رفعتوں اور تابانیوں سمیت ظاہر بین نگاہوں سے پردۂ خاک میں روپوش ہو گیا۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ

آپ کی کنیت ابوالخطاب اور نام قتادہ بن دعامہ سدوسی الاکمہ ہے۔ آپ عربی النسل تھے اور بصرہ میں رہائش پذیر تھے۔ آپ کی قوت حفظ انتہائی قوی تھی۔ علم الانساب، شعر اور ایام العرب میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ لغت عربی میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا اور علم التفسیر میں ماہرانہ اور مدبرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ آپ کو حضرت انس، ابوالطفیل، ابن سیرین، عکرمہ اور عطاء بن ابی رباح رحمہم اللہ تعالیٰ اور کئی دیگر صحابہ و تابعین سے روایت کے مواقع میسر آئے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قتادہ سے احسن عراق کا کوئی باشندہ میرے پاس نہیں آیا۔ معمر رحمۃ اللہ علیہ نے زہری کو کہا تمہارے نزدیک قتادہ بڑے عالم ہیں یا مکحول؟ تو انہوں نے جواب دیا قتادہ۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قتادہ ثقہ اور مامون ہیں اور حدیث طیبہ میں حجت ہیں۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ثقات میں ذکر کیا ہے کہ قتادہ کا شمار قرآن اور فقہ کے علماء میں ہے اور آپ اپنے زمانے کے حفاظ میں سے تھے۔ ابھی آپ کی عمر چھپن برس تھی کہ پیغام وصال آ گیا۔ چنانچہ 117ھ میں آپ واصل الی اللہ ہو گئے۔

مذکورۃ الصدر مدارس میں پروان چڑھنے والے علمائے تفسیر میں سے ہر ایک اپنی مثال آپ تھا۔ ان کا تقویٰ و طہارت اور زہد و ورع بے مثال تھا۔ حصول علم میں ذوق تجسس اور دقت نظر قابل رشک تھی۔ ہر ایک کو اپنے مقام پر مرکزیت حاصل تھی لیکن اس کے باوجود بعض کو ثقاہت، فقاہت اور قرآن فہمی میں مہارت تامہ ہونے کے سبب دوسروں پر فوقیت حاصل تھی۔ چند روایات ملاحظہ فرمائیں۔

تابعین میں نامور مفسر حضرت مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں۔ فضل بن میمون آپ کا اپنا بیان نقل فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو تیس مرتبہ قرآن کریم پڑھ کر سنایا اور تین بار اس طرح پڑھا کہ ہر آیت پر رکتا اور آپ سے یہ استفسار کرتا کہ یہ آیت کس واقعہ کے بارے نازل ہوئی اور اس کی کیفیت کیا تھی؟ چنانچہ آپ اس مقام پر پہنچے کہ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے میزان میں نقل کیا" اَجْمَعَتِ الْاُمَّۃُ عَلٰی اِمَامَۃِ مُجَاہِدٍ وَالْاِحْتِجَاجِ بِہٖ" (کہ علم تفسیر میں آپ کی امامت اور قابل حجت ہونے پر امت کا اجماع ہے۔) اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علم تفسیر چار افراد سے حاصل کرو۔ حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد بن جبر، حضرت عکرمہ اور حضرت ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ۔

مذکورہ بالا تمام مفسرین کی تفسیری روایات ارشادات نبویہ اور آثار صحابہ پر مشتمل تھیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ قرآن کریم کی ہر ہر آیت کو شامل نہیں تھیں اور نہ ہی علیحدہ کتابی شکل میں مدون تھیں بلکہ ان میں صرف مشکل الفاظ اور دقیق مقامات کی وضاحت تھی۔ اور یہ تمام روایات دیگر احادیث طیبہ کے ساتھ ملحق اور مرقوم تھیں۔ بعد ازاں تبع تابعین کے دور کا آغاز ہوا تو اس میں ایسی تفاسیر منصۂ شہود پر آئیں جو ارشادات نبویہ آثار صحابہ اور اقوال تابعین پر مشتمل تھیں۔ ان مفسرین میں سے درج ذیل افراد نے شہرت دوام حاصل کی۔

حضرت زید بن ہارون متوفی 117ھ، حضرت شعبہ بن حجاج متوفی 160ھ، حضرت وکیع بن جراح متوفی 197ھ، حضرت سفیان بن عیینہ متوفی 198ھ، حضرت روح بن عبادہ متوفی 205ھ، حضرت عبدالرزاق بن ہمام متوفی 211ھ، حضرت آدم بن ابی ایاس متوفی 220ھ، حضرت عبد بن حمید متوفی 249ھ رحمہم اللہ تعالیٰ اور انہی کی مثل کئی دیگر مفسرین۔ ان کے بعد امام ابن جریر طبری متوفی 310ھ مطلع علم پر نمودار ہوئے اور احادیث و آثار پر مشتمل انتہائی حسین اور خوبصورت تفسیر لکھ کر اہل علم سے خوب داد تحقیق حاصل کی۔ آپ کی تفسیر اجل التفاسیر اور اعظم التفاسیر ہے۔ اسی دور میں ابن ماجہ متوفی 273ھ، ابوبکر بن منذر متوفی 318ھ، ابن ابی حاتم متوفی 327ھ، ابوالشیخ بن حبان متوفی 369ھ، حاکم متوفی 405ھ اور ابوبکر بن مردویہ متوفی 410ھ طبقہ مفسرین میں شامل ہوئے۔ ان تمام کی تفاسیر صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کی طرف ہی منسوب ہیں۔ ان تمام میں ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ اقوال کو توجیہ بعض کی بعض پر ترجیح اور اعراب و استنباط کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر آپ یہ پوچھیں تفاسیر میں سے کونسی تفسیر ہے جو قرآن کریم کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور ناظر کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتی ہے؟ تو میں یہ کہوں گا وہ امام ابو جعفر بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے۔ جس کے بارے تمام علماء کا اجماع ہے کہ اس کی مثل کوئی تفسیر منظر عام پر نہیں آئی۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تہذیب میں لکھا ہے کہ تفسیر کے بارے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کی مثل کسی نے کتاب تصنیف نہیں کی۔

اسی دور سے اب یہ رواج پڑ گیا کہ قرآن کریم کی ہر ہر آیت کی تفسیر ہونے لگی اور مدوّنہ شکل میں کتب تفاسیر منظر عام پر آنے لگیں۔

تفسیر کی مختلف انواع

حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ متنوع قسم کے علوم ایجاد ہوتے رہے اور ہر دور کے علماء نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق مختلف علوم میں مہارت تامہ اور ید طولیٰ حاصل کیا اور پھر جب خالق کائنات نے ان سے اپنی کتاب عزیز کی خدمت لی تو اس کی تفسیر کے دوران اپنے پسندیدہ علوم میں فنی مہارت اور کامل دسترس کا اظہار کیا۔ چنانچہ جہاں بعض مفسرین نے قرآن کریم کی تفسیر میں احادیث اور آثار صحابہ پر زیادہ اعتماد کیا تو بعض نے عقل ورائے اور علم کلام کا سہارا لیا۔ فقہی ماہرین نے مسائل فقہیہ کو خوب شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا اور صرف ونحو اور لغت کے شناوروں نے تفسیر میں انہی فنون کو ترجیح دی۔ بعض نے علوم بلاغت کا سہارا لے کر ادبی دنیا میں خوب داد تحقیق حاصل کی اور بعض نے علم تصوف کے رموز واشارات کو ترجیح دی۔ لہٰذا اس طرح آثاری، ادبی، کلامی، تاریخی، لغوی، فقہی اور اشاری تفاسیر اور متنوع اقسام کی تفاسیر مختلف ادوار میں منظر عام پر آتی رہیں اور قرآن کریم کے مطالب ومفاہیم واضح انداز میں بیان کر کے ہر دور کے لوگوں کی صحیح راہنمائی کرتی رہیں۔

وہ تفاسیر جن میں زیادہ تر انحصار احادیث وآثار پر کیا گیا ہے۔ ان میں سے چند کے اسماء درج ذیل ہیں۔

(1) جامع البیان فی تفسیر القرآن: مصنف امام ابوجعفر ابن جریر طبری، متوفی 310ھ۔
(2) بحر العلوم: مصنف علامہ ابواللیث ثمرقندی، متوفی 373ھ۔
(3) الکشف والبیان عن تفسیر القرآن: مصنف علامہ ابواسحاق الثعلبی، متوفی 427ھ۔
(4) معالم التنزیل: مصنف علامہ ابومحمد حسین البغوی، متوفی 510ھ۔
(5) المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز: مصنف علامہ ابن عطیہ اندلسی، متوفی 546ھ۔
(6) تفسیر القرآن العظیم: مصنف علامہ ابوالفداء حافظ ابن کثیر، متوفی 774ھ۔
(7) الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن: مصنف علامہ عبدالرحمٰن ثعالبی، متوفی 876ھ۔
(8) الدر المنثور فی التفسیر الماثور: مصنف علامہ جلال الدین سیوطی، متوفی 911ھ۔

وہ تفاسیر جن میں صرف ونحو، تصوف، فلسفہ اور علم کلام کی مباحث نمایاں دکھائی دیتی ہیں ان میں سے چند کے اسماء درج ذیل ہیں۔
(1) مفاتیح الغیب: مصنف امام فخر الدین، ابوعبداللہ محمد بن عمر بن حسین طبرستانی، الرازی، متوفی 606ھ۔
(2) انوار التنزیل واسرار التاویل: مصنف قاضی القضاۃ، ناصر الدین ابوالخیر، عبداللہ ابن عمر بن محمد بن علی، البیضاوی الشافعی، متوفی 691ھ۔
(3) مدارک التنزیل وحقائق التاویل: مصنف ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفی، الحنفی، متوفی 701ھ۔
(4) لباب التاویل فی معانی التنزیل: مصنف علاء الدین، ابوالحسن علی بن محمد بن ابراہیم البغدادی الشافی، متوفی 741ھ۔
(5) البحر المحیط: مصنف اثیر الدین، ابوعبداللہ، محمد بن یوسف بن علی ابن یوسف بن حیان اندلسی الشہیر بابی حیان، متوفی 745ھ۔
(6) غرائب القرآن ورغائب الفرقان: مصنف نظام الدین ابن الحسن بن محمد بن حسین خراسانی نیشاپوری المعروف بالنظام الاعرج، متوفی 728ھ۔
(7) تفسیر جلالین: مصنف امام جلال الدین محمد بن احمد بن محمد المحلی الشافعی، متوفی 864ھ و امام جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر بن محمد السیوطی الشافعی، متوفی 911ھ۔
(8) السراج المنیر فی الاعانۃ علی معرفۃ بعض معانی کلام ربنا الحکیم الخبیر: مصنف امام شمس الدین محمد بن محمد الشربینی الشافعی، متوفی 977ھ۔
(9) ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم: مصنف ابوالسعود محمد بن محمد بن مصطفیٰ العمادی الحنفی، متوفی 982ھ۔
(10) روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی: مصنف ابوالثناء، شہاب الدین، السید محمود آفندی، آلوسی، بغدادی، متوفی 1270ھ۔

اسی دوران معتزلہ نے اپنے باطل نظریات کی نشر و اشاعت کے لئے قرآن کریم کا سہارا لینے کی کوشش کی اور اپنے فاسد نظریات کے مطابق آیات قرآنیہ کی تفسیر اپنی فاسد اور مذموم رائے کے ساتھ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ معتزلی عقائد کی حامل چند مشہور تفاسیر

کے نام درج ذیل ہیں۔

(1) جامع التاویل لمحکم التنزیل: مصنف ابو مسلم محمد بن بحر اصفہانی، متوفی 322ھ۔

(2) تفسیر القرآن الکریم: مصنف عبید اللہ بن محمد بن جرو الاسدی معتزلی، متوفی 387ھ۔

(3) تنزیہ القرآن عن المطاعن: مصنف قاضی القضاۃ ابوالحسن عبدالجبار بن احمد شیخ المعتزلہ، متوفی 415ھ۔

(4) تفسیر القرآن: مصنف عبدالسلام بن محمد بن یوسف القزوینی شیخ المعتزلہ، متوفی 483ھ۔

(5) الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل: مصنف ابوالقاسم محمود بن عمر بن محمد بن عمر الخوارزمی، الزمخشری، الامام الحنفی المعتزلی، الملقب، بجار اللہ، متوفی 538ھ۔

برصغیر میں تفسیری خدمات

قرآن کریم، فرقان حمید تا قیام قیامت پوری انسانیت کے لئے منبع رشد و ہدایت ہے۔ ہر زمانے اور ہر علاقے کے باسیوں کی دنیوی اور اُخروی کامیابیوں کا سامان یہ اپنے جلو میں لئے ہوئے ہیں۔ ہر دور کے محققین اور مستند اہل علم کے لئے اس میں انگنت مخفی خزانے موجود ہیں۔ ہر ایک نے اپنی بساط اور ظرف کے مطابق محنت شاقہ اور جہد مسلسل کے ساتھ گوہر مراد حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس بحر زخار میں غواصی کر کے گوہر آبدار تلاش کرنے میں برصغیر کے علماء و مشائخ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے اور اپنے ذوق سلیم اور خداداد صلاحیتوں کو استعمال میں لا کر کتاب لا ریب سے منشاء الٰہی کو سمجھنے کی انتہائی کامیاب سعی فرمائی۔ یہ سلسلہ مسلسل چلتا رہا اور جب تک بزم کائنات کی رونقیں قائم رہیں گی، لیل و نہار کی آمد و رفت جاری رہے گی، علیم وخبیر رب کی کتاب عزیز کی خدمت ہوتی رہے گی۔ اگرچہ قرآن کریم کی تفاسیر فقط عربی زبان تک محدود نہیں بلکہ یہ سلسلہ تقریباً رائج الوقت تمام زبانوں تک پھیلا ہوا ہے مگر اب ہمارے پیش نظر صرف وہ تفاسیر ہیں جو عربی لغت میں تحریر کی گئیں اور وہ بھی مشتے از خروارے۔ چند نام درج ذیل ہیں۔

(1) لطائف ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز: مصنف علامہ مجد الدین ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی، متوفی 816ھ۔

(2) تیصیر الرحمن وتیسیر المنان: مصنف علامہ علاؤ الدین علی بن احمد مہائمی، متوفی 835ھ۔

(3) شئون المنزلات: مصنف علامہ علی متقی برہان پوری، متوفی 975ھ۔

(4) منبع نفائس العیون: مصنف علامہ شیخ مبارک بن خضر ناگوری، متوفی 1021ھ۔

(5) سواطع الالہام: مصنف ابوالفیض فیضی بن شیخ مبارک، متوفی 1004ھ۔

(6) تفسیرات الاحمدیہ فی بیان الآیات الشرعیہ: مصنف علامہ احمد بن ابوسعید المعروف ملا جیون، متوفی 1130ھ۔

(7) فتح الخبیر بما لابد من حفظہ فی علم التفسیر: مصنف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی 1176ھ۔

(8) تفسیر مظہری: مصنف علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، متوفی 1810ء۔

علاوہ ازیں بھی بہت سی ایسی تفاسیر ہیں جو عربی زبان میں تحریر کی گئیں۔ تمام تفاسیر اپنے اپنے مقام پر انتہائی اہم اور قابل تحسین

ہیں۔ مفسرین کی جہد مسلسل اور عرق ریزیوں کی بیش قیمت دلیل ہیں مگر اس وقت ہمارے پیش نظر حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی مایہ ناز تفسیر، تفسیر مظہری ہے۔ تو آیئے چند کلمات ملاحظہ فرمایئے۔

صاحب تفسیر مظہری کا تعارف

صاحب تفسیر مظہری عمدۃ المفسرین، فخر الواصلین، رموز تصوف کے امین اور مسلک امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے عظیم اور مایہ ناز فقیہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں۔ آپ کی ولادت 1722ء کو پانی پت میں ہوئی۔ کاتب تقدیر نے روز اول سے ہی دین اسلام کی خدمت اور کتاب زیست کو کتاب الٰہی کے تابع بنا کر رکھنا ان کے مقدر میں لکھ دیا تھا۔ چنانچہ آپ جیسے جیسے حیات مستعار کی منازل طے کرتے گئے، علمی تجسس بڑھتا ہی گیا اور آپ محققین اور ماہر اساتذہ کی بارگاہ میں زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت حاصل کر کے اپنے دامن کو علم کے موتیوں سے بھرتے رہے۔ آپ کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ مدرسہ رحیمیہ میں کافی عرصہ تک حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے زیر سایہ اور زیر شفقت رہے۔ اس دوران آپ نے قبلہ شاہ صاحب کی علمی اور روحانی تربیت سے اپنے آپ کو ظاہری و باطنی علوم سے خوب آراستہ کیا۔ آپ کی تصانیف کا بنظر عمیق مطالعہ کیا اور آپ کی فکر کو دل و دماغ میں راسخ کیا۔ بالخصوص علم تفسیر کے حوالے سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصنیف لطیف الفوز الکبیر انتہائی عمدہ اور حسین کتاب ہے۔ علم تفسیر سے واقفیت اور شناسائی حاصل کرنے کے لئے اس کا مطالعہ ازبس لازم اور ضروری ہے۔

حضرت قاضی صاحب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ جب رب قدوس نے آپ کو اس مقام رفیع پر فائز فرمایا کہ آپ کو اپنی کتاب لاریب کی تفسیر و توضیح کی توفیق اور سعادت ارزانی فرمائی تو آپ نے تفسیر لکھتے وقت حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ اصول وضوابط کا خاص التزام کیا۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمود الحسن عارف نے بھی کہا:

"اگر یہ کہا جائے تو عین مناسب ہوگا کہ الفوز الکبیر میں پیش کئے گئے اصولوں کے مطابق علم تفسیر پر پہلی کتاب "تفسیر مظہری" لکھی گئی کیونکہ اس تفسیر میں الفوز الکبیر کے اصولوں کا بڑا التزام کیا گیا ہے۔"

آپ نے علمی دنیا میں اپنا نام پیدا کیا۔ تحقیق و تدقیق کے کٹھن اور مشکل مراحل کو خوش اسلوبی سے طے کیا اور اس منصب رفیع پر فائز ہوئے کہ آپ کے بارے حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "قاضی ثناء اللہ پانی پتی تو بیہقی وقت ہیں۔" آپ کا یہ فرمان ہی ان کے علمی مقام کی عظمتوں اور رفعتوں کو پہچاننے کے لئے کافی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ تصوف کے اعتبار سے آپ کا روحانی تعلق حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمہ اللہ تعالیٰ سے تھا۔ آپ نے اپنے مرشد کریم کے دست حق پرست پر صرف بیعت ہی نہ کی بلکہ ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اپنے آپ کو انہی کے نام کر دیا۔ عقیدت ومحبت سے دیدہ و دل فرش راہ کئے۔ آپ کی نگاہ فیض رساں سے اپنے قلب و روح کو معرفت وحقیقت کے نور سے خوب منور کیا اور آپ کی وساطت سے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ تعالیٰ کے افکار ونظریات کو اپنے اوپر نافذ کیا۔ اس طرح تصوف کی کٹھن اور پرخار وادی سے دامن کو سمیٹ کر بڑی کامیابی کے ساتھ گزر رہے اور اپنے ظاہر و باطن کو علم و معرفت کے چشمہ صافی سے خوب سیراب کیا۔ آپ فقہی اعتبار سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے مقلد تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی فقہی بصیرت عطا فرمائی کہ آپ فقہ حنفی کے فقط ترجمان ہی نہیں بلکہ

پاسباں ثابت ہوئے۔ آپ نے علم و حکمت کے جو خزانے جمع کئے تھے، جب انہیں لوٹانے کا وقت آیا تو دل کھول کر سخاوت کا اظہار کیا، دونوں ہاتھوں سے علم کی خیرات تقسیم کی اور جو بھی آیا علم کے موتیوں سے اپنے دامن مراد کو بھر کر واپس لوٹا۔

تصنیف و تالیف کے ذریعے دینِ متین کی جو خدمت آپ نے سرانجام دی، رہتی دنیا تک ایک عالم اس سے فیض یاب ہوتا رہے گا اور ساتھ ہی آپ کے درجات قرب میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔ علم کا یہ مینار اپنی تمام تر رفعتوں اور بلندیوں کے ساتھ، معرفت و آگہی کا یہ پیکر اپنی تمام تر رعنائیوں اور عظمتوں کے ساتھ علوم عقلیہ و نقلیہ کے ساتھ ساتھ معرفت و روحانیت کا فیضان تقسیم کرتا رہا، علم کے پیاسے اپنے قلب و نظر کو سیراب کرتے رہے۔ بس ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ 1810ء میں پیغام اجل آ پہنچا اور یہ مرد حق آگاہ قاضی تقدیر کے فیصلے پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے ظاہر بین نگاہوں سے روپوش ہو کر تہ زمین چلا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

کچھ تفسیر مظہری کے بارے میں

اب آیئے ذرا غور فرمائیں اس تفسیر میں جو علم و معرفت کے حسین مرقع حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نوک قلم سے صفحۂ قرطاس کی زینت بنی وہ کتنی خوبیوں اور حسین خصوصیت کی حامل ہے۔

تو سب سے اول اس کے نام میں غور کرنے سے وجہ تسمیہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ نے اپنے مرشد کریم حضرت مظہر جان جاناں رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام کی نسبت سے اپنی اس عظیم کاوش کو مظہری کے نام سے موسوم فرمایا۔ تو یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آپ کے دل میں اپنے مرشد کریم کی محبت وارفتگی کی حد تک موجود تھی۔ تو پھر آپ کے دل میں محبت رسول ﷺ اور محبت الہٰی کی کیفیت کیا ہوگی۔ تو بلا شبہ یہ اس چیز کی دلیل ہے کہ قرآن فہمی کے لئے آپ نے یہ تفسیر محبت خداوندی میں گم ہو کر اور عشق مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ والثناء میں جھوم کر رقم فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے محققین اور علمائے ربانیین کے طبقہ میں اسے عدیم المثال پذیرائی نصیب ہوئی اور ایسا قبول نام حاصل ہوا جو اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں تک کے دارالعلوم دیوبند کے مشہور استاذ شارح بخاری مولانا محمد انور شاہ کشمیری نے کہا:

" شاید ایسی تفسیر بسیط ارض (روئے زمین) میں نہ ہو" (فکر و نظر برصغیر میں مطالعہ قرآن 16:)

اس سے قبل تفسیر کی جن متنوع اقسام کا ذکر کیا جا چکا ہے اگر اس حوالے سے تفسیر مظہری کو دیکھا جائے تو یہاں تمام اقسام کی جامع اور متفرق خصوصیات کی جامع تفسیر ہے، مثلاً اگر اس میں احادیث اور آثار صحابہ کی کثرت کو دیکھا جائے تو یہ تفسیر بالآثار نظر آتی ہے اور اگر اس کی فقہی مباحث کو پیش نظر رکھا جائے تو آپ نے انتہائی شرح و بسط کے ساتھ مسلک حنفی کے مطابق مسائل کا تذکرہ کیا ہے اور اپنے موقف کو اتنے مدلل انداز میں بیان کیا ہے کہ یہ کہنا پڑتا ہے اس میں فقہ کا رنگ غالب ہے اور اگر صرف و نحو کی تراکیب اور لغوی تحقیقات پر نظر کی جائے تو بیضاوی اور کشاف جیسی تفاسیر کے ہم پلہ نظر آتی ہے اور اگر تصوف کے حوالہ سے اس کا جائزہ لیا جائے تو آپ نے اتنے خوبصورت اور حسین پیرائے میں تصوف کی دقیق اور مشکل مباحث کا تذکرہ کیا ہے جس میں آپ کی انفرادیت مسلم ہے۔ المختصر جس اعتبار سے بھی تفسیر مظہری کا جائزہ لیا جائے یہ کامل اور مکمل دکھائی دیتی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ زبان انتہائی سلیس، لہجہ انتہائی خوبصورت اور تشریح و توضیح انتہائی مناسب ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ تفسیر مظہری تفسیر کی تمام اقسام کی جامع تفسیر ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں۔

آپ نے بڑی جرأت و ہمت کے ساتھ قوی دلائل کے ساتھ عقائد حقہ کی ترجمانی فرمائی اور فرق باطلہ کے فاسد نظریات کی بڑی

شدت کے ساتھ تردید فرمائی۔

آپ نے فقہی مسائل میں احناف کی برتری واضح دلائل کے ساتھ بیان فرمائی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر کہیں حنفی نظریات کے خلاف حدیث صحیح ملی تو پھر حدیث کو ترجیح دیتے ہوئے حنفی نظریہ سے اختلاف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی اور یہ طرز فکر بھی دراصل حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کے تابع ہے۔

تفسیر مظہری کی انہی خصوصیات اور اوصاف کے پیش نظر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے اپنی قومی زبان اردو میں منتقل کیا جائے تاکہ ذوق علم رکھنے والے اور قرآن کریم کے اسرار و رموز کو جاننے کا شوق رکھنے والے وہ اہل علم بھی اس سے استفادہ کر سکیں جن کی رسائی عربی زبان تک ممکن نہیں۔

لہٰذا ہم نے اپنی تمام تر کمزوریوں اور علمی کم مائیگی کے باوجود محض اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کرتے ہوئے آج سے چار سال قبل ترجمہ کا آغاز کیا۔ یہ درست ہے کہ ہر زبان کا اپنا اسلوب ہوتا ہے، اس کی اپنی تراکیب ہوتی ہیں۔ ان تمام کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی مفہوم کو ایک زبان سے دوسری میں منتقل کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ہم نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ ترجمہ سلیس ہو، تراکیب اور اسلوب بیان کے اعتبار سے حسین اور شستہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ صرفی و نحوی تراکیب، لغوی تحقیق اور قرأت کے اعتبار سے مختلف قراء کا اختلاف بھی حسب استطاعت آسان مگر خوبصورت انداز میں نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم کہاں تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں یہ فیصلہ قارئین فرمائیں گے۔

جہاں کہیں ہمیں اپنی جانب سے کچھ وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی، تو اسے قوسین کے درمیان نقل کیا۔ ہمارا قطعاً یہ دعویٰ نہیں بلکہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں کہ ہماری یہ کاوش کمزوری، نقص اور عیب سے مبرا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں، اس لئے ہم سے جو صحیح اور حسین کام ہوا تو وہ محض اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کی توفیق سے ہوا اور اس میں جو ضعف اور کمزوری رہی وہ ہماری کم علمی اور بے مائیگی کا نتیجہ ہے۔

بارگاہ خداوندی میں ہم فقیروں کی عاجزانہ التجا ہے کہ وہ اپنے حبیب لبیب ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے ہماری اس ادنیٰ کاوش اور سعی ناتمام کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور اگر کہیں دانستہ یا نادانستہ، عمداً یا سہواً کوئی خطا یا غلطی صادر ہوئی تو رحمۃ للعالمین نبی ﷺ کے طفیل اُسے معاف فرما دے اور دین اسلام اور خصوصاً بالخصوص اپنی کتاب مبین کی بیش از بیش خدمت کی توفیق ارزانی فرمائے۔

امین بجاہ نبیہ الکریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین والحمد للہ رب العالمین۔

از جانب مترجمین

سید محمد اقبال شاہ، ملک محمد بوستان، محمد انور مگھالوی

فضلاء و اساتذہ، مرکزی دار العلوم محمدیہ غوثیہ

بھیرہ شریف، ضلع سرگودھا۔ پاکستان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ مُحَمَّدِنِ الْمُصْطَفٰى وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔ رَبِّ يَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ وَتَمِّمْ بِالْخَيْرِ وَبِكَ نَسْتَعِيْنُ

سورۂ فاتحہ کے اسماء

1۔ **فاتحۃ الکتاب**:۔(وہ سورت جس سے کتاب مقدس کی ابتداء ہوتی ہے)۔

2۔ **اُمّ القرآن**:۔قرآن کی اصل۔

اس سورت کے یہ دونوں نام اس لئے رکھے گئے ہیں کہ یہ قرآن کی اصل ہے اور اس سے قرآن کریم کی ابتداء ہوتی ہے۔

3۔ **سبع مثانی**:۔(وہ سات آیات جو دہرائی جاتی ہیں)۔ یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ بالاتفاق اس کی سات آیات ہیں اور نماز میں دہرائی جاتی ہیں، بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ آیات دو مرتبہ نازل ہوئیں۔ ایک مرتبہ مکہ میں اور دوسری مرتبہ مدینہ طیبہ میں۔ صحیح مسلک یہ ہے کہ سورۂ حجر سے پہلے یہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ ابن جریر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا یہ ام القرآن ہے، یہ **فاتحۃ الکتاب** ہے اور یہ **سبع مثانی** ہے۔(1)

4:۔ **سورۃ کنز**:۔ اسحاق بن راہویہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ سورت عرش کے نیچے والے خزانے سے اتاری گئی ہے۔(2)

5:۔ **سورۃ الشفاء**:۔ اس کو شفاء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کیونکہ یہ ہر مرض کی دوا ہے۔ جیسا کہ ہم اس کے فضائل میں مزید وضاحت کریں گے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں [1] جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ [2]"

[1]۔ بسم اصل میں باسم تھا مگر کثرت استعمال کی وجہ سے الف ساقط ہو گیا ہے اور اس الف کے عوض باء کو لمبا کر کے لکھا جاتا ہے، امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: باء کو لمبا لکھو، سین کو ظاہر کرو اور میم کو گول بناؤ۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی عظمت کا اظہار ہے۔(3)

الاسم:۔ یہ سمو مصدر سے مشتق ہے کیونکہ دوسرے صیغے سُمَیّ اور سَمَّیْتُ اسی اشتقاق پر دلالت کرتے ہیں، اَلْوَسْم مصدر سے مشتق نہیں ہے (جیسا کہ کوفی علماء کا قول ہے)۔

یہاں اسم سے مراد یا تو ذات ہے، یا اسم ہی مراد ہے اور باء مصاحبت، استعانت یا تبرک کے مفہوم کے لئے ہے، اور استعانت (مدد

1۔ امام جلال الدین سیوطی الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 20 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 23

3۔ معالم التنزیل، المعروف تفسیر بغوی برحاشیہ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 15 مطبوعہ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر

طلب کرنا) اللہ تعالیٰ کے ذکر سے حاصل کی جاتی ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے مابعد فعل مقدر کے متعلق ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ذیشان: بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا، میں باء جارہ مابعد کے متعلق ہے، مابعد فعل کے متعلق اس لئے کیا ہے تا کہ حقیقتاً بھی ابتداء اللہ تعالیٰ کے اسم سے پائی جائے۔ عبدالقادر الرہاوی نے الاربعین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا" ہر وہ ذیشان کام جو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے شروع نہ کیا گیا ہو وہ بے برکت اور ادھورا ہے(1) اس تحقیق کے بعد اس کی عبارت یوں ہوگی بِسْمِ اللّٰهِ اَقْرَءُ۔

بعض علماء نے لفظ اللہ کو اسم جامد لکھا ہے لیکن حقیقت میں یہ الہ بمعنی معبود سے مشتق ہے(ا)۔ الہ سے ہمزہ کو حذف کیا گیا ہے اور اس کے عوض الف، لام لزوماً لگایا گیا ہے۔ اس لازمی (ب) عوض کی وجہ سے یا اللہ کہا جاتا ہے (اگر یہ الف لام لازمی نہ ہوتا تو یا حرف ندا اور الف لام جمع نہ ہوتے، کیونکہ معرف باللام پر حرف ندا آئے تو اسم سے پہلے ایھا کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے یا ایھا النبی) اشتقاق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دونوں لفظ معنی اور ہیئت ترکیبی میں ایک جیسے ہیں۔ مطلب یہ کہ اسم جلالت اللہ حقیقتاً اسم مشتق ہے مگر بعد میں اس واجب الوجود ذات کا علم بنایا گیا جو تمام کمالات کی جامع ہے اور ہر قسم کے عیب سے پاک اور منزہ ہے۔ اسی وجہ سے اس کی صفات ذکر کی جاتی ہیں مگر اسے بطور صفت استعمال نہیں کیا جاتا اور اظہار توحید کے لئے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا جاتا ہے، کبھی اپنے اصل معنی اشتقاق کے اعتبار سے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ؕ (اور وہی اللہ ہے آسمانوں اور زمین میں)۔

ج۔ یہ دونوں اسم رحمۃ سے مشتق ہیں جس کا مطلب دل کی وہ رقت اور نرمی ہے جو کسی پر احسان اور مہربانی کا تقاضا کرتی ہے، (اللہ تعالیٰ کی ذات دل اور اس میں نرمی پیدا ہونے کی صفت سے پاک ہے کیونکہ یہ بندے کی صفات ہیں) اس لئے اللہ تعالیٰ کے اسماء غایات اور نتائج کے اعتبار سے سمجھے جاتے ہیں، مبادیات کے اعتبار سے نہیں، جن کا مطلب اثر قبول کرنا ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دونوں اسم ایک ہی معنی میں مبالغہ کے صیغے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ الفاظ کی زیادتی کی وجہ سے رحمن میں مبالغہ زیادہ ہے، اسی وجہ سے یہ اسم اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے خاص ہے۔ جبکہ رحیم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص نہیں مخلوق کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں دونوں اسماء میں رقت اور نرمی کا مفہوم ہے مگر ایک دوسرے سے زیادہ رقت کا معنی رکھتا ہے پھر اس زیادتی میں کبھی کمیت کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے رَحْمٰنُ الدُّنْيَا وَرَحِيْمُ الْاٰخِرَةِ (کیونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کافر و مسلم دونوں لطف اندوز ہورہے ہیں) جبکہ آخرت میں رحمت کا اظہار صرف متقین و مومنین کے لئے ہوگا اور کبھی اس رحمت کی زیادتی کا اعتبار کیفیت کے اعتبار سے ہوتا ہے کہا جاتا ہے رَحْمٰنُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَرَحِيْمُ الدُّنْيَا چونکہ دنیا کی نعمتوں میں بڑی بڑی نعمتیں بھی ہیں اور چھوٹی نعمتیں بھی اس لئے رَحْمٰنُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ کہا جاتا ہے اور آخرت کی تمام نعمتیں بڑی ہیں اس لئے رَحِيْمُ الْاٰخِرَةِ نہیں کہا جاتا۔ رحمن کو پہلے اور رحیم کو بعد میں ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اعلام کی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے مخصوص ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت عام ہے۔ اسی عمومیت کے اظہار کے لئے اس اسم کو مقدم فرمایا نیز

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 31

(الف) بہتر یہ تھا کہ مشتق من الہ کی جگہ ماخوذ من الہ کہا جاتا کیونکہ حذف اور عوض کی صورت میں علماء کے عرف میں اشتقاق نہیں کہا جاتا۔

(ب) صرف عوض کی قید اس کی علت نہیں بن سکتی بلکہ کلام کی تکمیل کیلئے دوسری قید کا اضافہ لازمی ہے۔ ورنہ الناس اور اس جیسے دوسرے الفاظ کے ساتھ اس کلیہ کا ٹوٹنا لازم آتا ہے۔

دنیا زمانہ کے اعتبار سے آخرت سے مقدم ہے، اس لئے اس کی نعمتوں پر دلالت کرنے والے اسم کو مقدم فرمایا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے یا نہیں؟

مدینہ طیبہ اور بصری کے قراء، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے فقہاء کوفہ کا مسلک ہے کہ بسم اللہ نہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے اور نہ کسی دوسری صورت کا اور ہر سورت کی اس سے ابتداء یمن و برکت کے لئے کی جاتی ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ قرآن ہی نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن کا جزو ہے اور اس کا نزول سورتوں کے درمیان فرق کرنے کے لئے ہوا ہے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے جسے آپ نے بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح بھی کہا ہے کہ حضور نبی رحمت ﷺ بسم اللہ شریف کے نزول سے پہلے دو سورتوں کے درمیان جدائی اور حد فاصل نہ جانتے تھے(1) اس حدیث طیبہ کو ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے مرسل روایت کیا ہے اور لکھا ہے کہ مرسل اصح ہے۔

حضرت محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ سے بسم اللہ شریف کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: جو کچھ ان دو گتوں کے درمیان ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے: صاحب تفسیر ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر یہ قرآن حکیم کا حصہ نہ ہوتا تو اسے قرآن کریم میں کبھی نہ لکھا جاتا کیونکہ سلف صالحین نے حد درجہ قرآن حکیم کو دوسری چیزوں سے الگ رکھنے کی کوشش فرمائی ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے سورۂ فاتحہ کے اختتام پر آمین بھی نہیں لکھا۔

بسم اللہ شریف کے سورۂ فاتحہ کا جزو نہ ہونے پر دلائل

1۔ امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے حضور نبی کریم ﷺ، سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز پڑھی مگر ان نفوس قدسیہ میں سے کسی نے بھی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ بلند آواز سے نہیں پڑھی(2) اس کے علاوہ ہم سورۂ فاتحہ کے فضائل میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث روایت کریں گے جس میں ہے کہ نماز کو میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کیا ہے(3)۔

2۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میرے والد محترم نے نماز میں مجھے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پڑھتے ہوئے سنا، جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: بیٹا! دین اسلام میں بدعت سے اجتناب کر، میں نے رسول اللہ ﷺ، سیدنا صدیق اکبر، سیدنا عمر فاروق اور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی ہے، وہ بسم اللہ سے قرآن شروع نہ فرماتے تھے۔ اور میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو میرے والد صاحب سے زیادہ بدعت کو ناپسندیدہ اور مبغوض سمجھتا ہو(3) اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے جس میں ہے کہ کسی نے ان حضرات کو بسم اللہ پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔

بسم اللہ شریف کے سورۂ فاتحہ کا جزو ہونے پر دلائل

مکہ اور کوفہ کے قراء اور اکثر فقہاء حجاز فرماتے ہیں کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے مگر دوسری سورتوں کا جزو نہیں اور دوسری سورتوں سے

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 26-27 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ امام مسلم بن حجاج صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 172 (قدیمی کتب خانہ کراچی)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 169-170 (قدیمی)

پہلے سورتوں کو جدا کرنے کے لئے لکھی جاتی ہے جیسا کہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور انہوں نے اس روایت کی سند کو صحیح بھی کہا ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (اور بے شک ہم نے عطا فرمائی ہیں آپ کو سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم بھی) کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ سے مراد سورۂ فاتحہ ہے اور بسم اللہ اس سورت کی ساتویں آیت ہے۔ حضرت ابن عباس نے مجھے اسی طرح بتایا ہے جس طرح میں نے اس کو بیان کیا ہے پھر انہوں نے فرمایا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ساتویں آیت ہے۔

حضرت امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی نماز کی ابتداء بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے کرتے تھے(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں پہلی حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول کہ "بسم اللہ ساتویں آیت ہے۔" یہ مرفوع نہیں ہے یہ صرف حضرت ابن عباس (ا) کا خیال ہے۔ اور جو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت نقل کی ہے اس کی سند قوی نہیں ہے۔ ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ بسم اللہ صرف سورۂ توبہ کے علاوہ تمام سورتوں کا جزو ہے۔ یہ امام ثوری، ابن مبارک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ ان کی حجت یہ ہے کہ بسم اللہ مصحف میں قرآن کریم کے خط سے ہی لکھی جاتی ہے (ب)۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قرآن کا جزو ہونے کی دلیل ہے، ہر سورت کا جزو ہونے کی دلیل نہیں کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ سے صحت کے ساتھ مروی ہے کہ سورۂ ملک کی تیس آیات ہیں اور اس میں کسی شمار کنندہ کو اختلاف نہیں کہ بسم اللہ کے بغیر اس کی تیس آیات ہیں۔ مزید وضاحت ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ ملک کے تحت آئے گی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ

"سب تعریفیں اللہ کے لئے[1] جو مرحلہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کا ۔"

[1] وہ تعریف جو زبان کے ساتھ ہو اور کسی ایسے عمدہ فعل پر ہو جو اختیاری ہو، خواہ وہ تعریف کسی نعمت پر ہو یا نعمت کے بغیر ہو اسے حمد کہتے ہیں۔ حمد متعلق کے اعتبار سے شکر سے عام ہے کیونکہ شکر نعمت کے ساتھ خاص ہے (جبکہ حمد میں نعمت کا ہونا شرط نہیں) اور ادائیگی کے اعتبار سے شکر سے خاص ہے کیونکہ شکر زبان، دل، اور اعضاء ظاہری کے ساتھ ادا ہوتا ہے (جبکہ حمد زبان کے ساتھ خاص ہے) اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے اَلْحَمْدُ رَأْسُ الشُّكْرِ مَا شَكَرَ اللّٰهَ عَبْدٌ لَا يَحْمَدُهُ یعنی حمد شکر کی اصل ہے جس اللہ کے بندے نے اللہ تعالیٰ کی حمد نہیں کی اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کیا۔ اس حدیث کی سند یہ ہے عبدالرزاق عن قتادہ عن عبداللہ بن عمرو۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 33، وزارت تعلیم

(ا) یہ علماء کے نزدیک مسلم ہے کہ آیات کی ترتیب اور تعداد توقیفی ہے، ان کے متعلق عقل کو گفتگو کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پھر یہ ابن عباس کے بارے میں کیسے تصور کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ یہ بھی اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ ایسی صورتوں میں موقوف حدیث بھی مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں جب کسی مسئلہ میں صحابہ کرام سے روایات مختلف ہوں تو اس وقت موقوف حدیث کو مرفوع کے قائم مقام نہیں رکھا جاتا۔ ایسی صورت میں روایات ذکر کی جاتی ہیں جیسا کہ علماء کا کلیہ ہے۔

(ب) چونکہ بسم اللہ ہر سورت کے آغاز میں سورت کے خط کے ساتھ لکھی جاتی ہے اس لئے یہ دلیل ہے کہ بسم اللہ ہر سورت کا جزو ہے۔

المدح: ۔مدح حمد کی نسبت ہر اعتبار سے عام ہے۔ کیونکہ مدح مطلق عمدہ فعل پر ہوتی ہے۔

الحمد پر الف، لام جنس کا ہے اور اشارہ ہے اس کی طرف جس کو ہر شخص جانتا ہے یا یہ الف لام استغراق کے لئے ہے۔ تمام حمد اللہ تعالیٰ کے لئے ہے کیونکہ وہ بندوں کے افعال کا خالق ہے۔ نیز قرآن کریم کا ارشاد ہے وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (تمہیں جو نعمت بھی میسر ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے) اس میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ زندہ، قادر، مرید اور عالم ہے حتی کہ ہر حمد کا مستحق ہے۔ لِلّٰهِ میں اسم جلالت سے پہلے لام جارہ اختصاص کا معنی دینے کے لئے ہے مثلاً کہا جاتا ہے، اَلدَّارُ لِزَيْدٍ یعنی گھر زید کے ساتھ خاص ہے۔

الحمد للّٰہ کا جملہ اسمیہ خبریہ ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حمد کا مستحق ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہے اور اس جملہ کے مضمون سے ثناء کرنا مقصود ہے۔ اور اس جملہ میں بندوں کو ثناء کی تعلیم دینا مطلوب ہے۔ گویا کلام یوں ہے قُولُوا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ یعنی تم کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تا کہ مابعد کلام ایاک نعبد سے مناسبت ہو جائے۔

لـ رب کا معنی مالک ہے۔ جیسا کہ گھر کے مالک کو رَبُّ الدَّارِ کہا جاتا ہے اور رب تربیت کے معنی میں ہے جس کا مطلب آہستہ آہستہ کسی چیز کو مرتبہ کمال تک پہنچانا ہے، اور مصدر کا صفت کے طور پر استعمال مبالغہ کے لئے ہے جیسے صوم اور عدل مصدر ہونے کے باوجود صفت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی دوسرے کے لئے رب کا لفظ بغیر قید کے استعمال نہیں ہوتا جیسے رب الدار وغیرہ۔ لفظ رب کے ذکر میں یہ بھی دلیل ہے کہ عالم جس طرح اپنے وجود کے لئے اللہ کا محتاج ہے اسی طرح اپنی بقاء کے لئے بھی اس کا محتاج ہے۔

العالمین: ۔ عالم کی جمع ہے اور استعمال میں کوئی لفظ اس کا واحد نہیں ہے۔ عالم وہ اسم ہے جس کے ذریعے صانع کی پہچان ہوتی ہے جیسے الخاتم (اسم ہے جس کے ذریعے کسی چیز کا اختتام معلوم ہوتا ہے)۔ عالم سے مراد تمام ممکنات ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا "(فرعون نے کہا رب العالمین کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: وہ وہ ہے جو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک ہے)۔ (عالم کی تشریح سے قاری کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب عالم سے تمام ممکنات مراد ہیں تو پھر اس کی جمع کیوں بنائی گئی فرماتے ہیں:) عالم کے تحت مختلف اجناس کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی جمع بنائی گئی۔ پھر واؤ نون کے ساتھ جمع عقلاء کے غلبہ کے اعتبار سے ہے۔

حضرت وہب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں۔ ان میں سے ایک عالم دنیا ہے۔ اور یہ آبادی عالم کی وسعت میں ایسے ہے جیسے صحرا میں خیمہ۔ اور حضرت کعب الاحبار فرماتے ہیں، عالموں کی تعداد شمار نہیں کی جا سکتی، اللہ تعالیٰ کے لشکروں کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں عالم، ذوی العقول یعنی فرشتوں، جنوں اور انسانوں کا اسم ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

"بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا لـ"

لـ یہاں قراء نے وقف کی صورت میں روم (ا) کی اجازت دی ہے اور اسی طرح ہر مکسور اسم پر وقف کی صورت میں روم جائز ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے دوبارہ ذکر کرنے میں دلیل ہے کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا جز نہیں ہے تا کہ تکرار لازم نہ آئے (ب)، بعض علماء

(الف) یہ علم تجوید کی اصطلاح ہے جس کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔

(ب) یہ دلیل صحیح نہیں کیونکہ قرآن میں بہت سی آیات کا تکرار موجود ہے جیسے فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ میں کہتا ہوں اس قسم کا تکرار فصحاء و شعراء کے نزدیک مستحسن ہے۔ یہ ترتیب تکرار کا تعلق اس زمرہ میں نہیں آتا یا ایک کلی حقیقت ہے۔

فرماتے ہیں الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا دوبارہ ذکر اللہ تعالیٰ کے حمد کے مستحق ہونے کی علت بیان کرنے کے لئے ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؁

"مالک لے ہے روز جزا کا لے"

لے قرأت عاصم، الکسائی اور یعقوب نے مالک اور دوسرے قراء نے مَلِک پڑھا ہے ابوعمر نے الرحیم مَّلِک یعنی میم کو میم میں ادغام کرکے پڑھا ہے، اسی طرح ایک جنس کے دو متحرک یا ہم مخرج یا قریب المخرج حروف کو مدغم کیا جاتا ہے، اور دو ہم مثل حروف دو کلموں میں اکٹھے واقع ہوں تو سوائے چند صورتوں کے سترہ حروف میں ادغام ہوتا ہے۔ وہ سترہ حروف یہ ہیں۔ باء، تاء، ثاء، حاء، راء، سین، عین اور اس کے بعد والے یاء تک دس حروف۔ جیسے لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ، اَلشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ، ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ، لَا اَبْرَحُ حَتّٰى، فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ، وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى، وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ، وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ، تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ، الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ، اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا، جَعَلَ لَكُمْ، يَعْلَمُ مَا اَحْسَنُ نَّبِيًّا اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ، اِنَّهٗ هُوَ، حا کا اتصال مانع نہیں۔ نودی یا موسٰی اور تاء کو تاء میں ادغام کے لئے شرط ہے کہ پہلا تاء متکلم یا مخاطب کی تاء ضمیر نہ ہو۔ جیسے كُنْتُ تُرَابًا۔ اَنْتَ تُكْرِهُ اور جب پہلا حرف تنوین والا ہو تو پھر بھی ادغام نہ ہوگا جیسے وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ اسی طرح پہلا حرف مشدد نہ ہو جیسے تَمَّ مِيْقَاتُ اور وہ مقامات جو مذکورہ قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں وہ یہ ہیں:۔

(1)۔ يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ: اس میں ابوعمرو نے ادغام نہیں کیا کیونکہ اس سے پہلے نون ساکن موجود ہے۔ اور اس عدم ادغام پر اتفاق ہے۔

(2)۔ ہر وہ جگہ جہاں ہم مثل حرف اکٹھے ہوں مگر پہلے کلمہ سے آخری حرف حذف ہونے کے سبب سے دو حرف جمع نہ ہوں جیسے يَبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ۔ (يبتغ اصل میں يبتغي تھا) صرفی قاعدہ سے یا گر گئی ہے اس لئے دو غین اکٹھے ہو گئے ہیں۔ اس لئے ادغام نہیں کیا جاتا) دوسری مثال اِنْ يَّكُ كَاذِبًا يَخْلُ لَكُمْ۔ ابوعمرو نے ان کلمات میں اظہار و ادغام دونوں وجہیں جائز کی ہیں۔ تیسری مثال بعض کے نزدیک ال لوط۔ اس میں ادغام صحیح ہے۔ چوتھی مثال هُوَ کی واؤ جب ہا مضموم ہو ابوعمرو کی قرأت کے مطابق اور واؤ کے بعد واؤ واقع ہو جیسے هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ۔

یہ کل تیرہ مقامات ہیں جہاں ادغام میں اختلاف ہے مگر ادغام قوی ہے۔

پانچویں مثال۔ ھو کی واؤ جب ابوعمرو کی قرأت پر ہاء ساکن ہو یہ تین (ا) مقامات ہیں: فَهُوَ وَلِيُّهُمْ، وَهُوَ وَاقِعٌ۔ مگر بعض قراء فرماتے ہیں ان مقامات میں اظہار بلا اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں: اختلاف ہے، اظہار قوی (ب) ہے، یہ تمام صورتیں ایسے دو ہم مثل حروف کی تھیں جو دو کلموں میں واقع ہوں۔ مگر جب دو ہم مثل حروف ایک کلمہ میں ہوں تو صرف دو مقام پر ادغام ہوتا ہے، مَنَاسِكَكُمْ سورۂ بقرہ میں اور مَا سَلَكَكُمْ سورۂ مدثر میں۔ یہ دو ہم مثل حروف کے ادغام کی صورتیں تھی۔ مگر قریب المخرج دو حروف جو ایک کلمہ میں ہوتے ہیں مثلاً قاف کو کاف میں مدغم کیا جاتا ہے جب ان سے پہلے حرف متحرک ہو اور ان کے بعد میم ہو جیسے يَرْزُقُكُمْ۔ مگر مِيْثَاقَكُمْ و يَرْزُقُكَ، طَلَّقَكُنَّ کے ادغام میں اختلاف مروی ہے، ان کے علاوہ میں ادغام نہیں ہوتا۔ اور دو کلموں میں سولہ

(ا) صحیح یہ ہے کہ پانچ مقامات ہیں۔

(ب) یہ نحویوں کے نزدیک ہے قراء کے نزدیک نہیں۔

حروف میں ادغام ہوتا ہے جب وہ حرف منون، مجزوم، مشدد اور تاء مخاطب نہ ہو۔ حاء، عین میں مدغم ہوتی ہے زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ۔ جہاں بھی حاء اور عین ملتے ہیں وہاں حاء کو عین میں ادغام کرنا مروی ہے جیسے ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ، اَلْمَسِيْحُ عِيْسَى، لَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اور قاف کو کاف میں اور کاف کو قاف میں ادغام کیا جاتا ہے جب ان کا ماقبل حرف متحرک ہو جیسے خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ، لَكَ قُصُوْرًا، بخلاف فَوْقَ كُلِّ، وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا کے۔

ذِي الْمَعَارِجِ تَعْرُجُ میں جیم، تاء میں مدغم کی جاتی ہے۔ جیم، شین میں مدغم کی جاتی ہے جیسے اَخْرَجَ شَطْئَهٗ میں۔ شین، سین میں ادغام کی جاتی ہے جیسے ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا، ضاد شین میں لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ کے کلمہ میں مدغم کی جاتی ہے، اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ میں سین زاء میں، الرَّاْسُ شَيْبًا میں سین، شین میں۔ اور دال دس حروف میں مدغم کی جاتی ہے جیسے اَلْمَسٰجِدَ تِلْكَ، عَدَدَ سِنِيْنَ، الْقَلَائِدَ ذٰلِكَ، شَهِدَ شَاهِدٌ، مِنْ بَعْدِ ضَرَّاءَ، يُرِيْدُ ثَوَابَ، تُرِيْدُ زِيْنَةَ، نَفْقِدُ صُوَاعَ، مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ، دَاوٗدُ جَالُوْتَ اور دَارُ الْخُلْدِ جَزَاءً میں اختلاف ہے اور قرآن میں دال طاء کے ساتھ نہیں ملائی گئی اور دال مفتوحہ حرف ساکن کے بعد بغیر تاء کے کسی حرف میں مدغم نہیں کی جاتی۔ پس مندرجہ ذیل مقامات پر ادغام نہیں کیا جاتا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ، بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ، اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا، اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا، بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ بَعْدَ ظُلْمِهٖ، بَعْدَ ثُبُوْتِهَا صرف كَمَدْتَ تُنْذِرُهُمْ اور بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا میں دال تاء میں ادغام کی گئی ہے۔ تیسری کوئی مثال نہیں۔

اور تاء ان دس میں مدغم ہوتی ہے سوائے ایسی صورت کے جب تاء ہم شکل باب سے ہو۔ اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اسی طرح طاء میں جہاں بھی آئے۔ اور تاء دال میں نہیں ملائی جاتی مگر جب تاء ساکن ہو جیسے اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا۔ اور ایسی صورت میں ادغام واجب ہے جیسے اَلْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ، بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا، الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا، بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ اور وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا میں تاء، ضاد میں مدغم کی گئی ہے مگر اور کوئی مثال نہیں ہے۔ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا۔ اور الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِي۔ سورۃ نساء اور سورۃ نحل میں ہے اس کے علاوہ نہیں عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ۔

تاء حرف ساکن کے بعد واقع نہیں ہوتی مگر جب وہ حرف خطاب ہو اور اس میں ادغام نہیں ہوتا مگر وہ مقامات جہاں الف کے بعد واقع ہو۔ ایک جگہ پر ادغام میں کوئی اختلاف نہیں وہ یہ ہے اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ اور بقیہ مقامات میں اختلاف ہے جیسے حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا اور اسی طرح تاء مکسورہ میں بھی اختلاف ہے جیسے اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اور جِئْتِ شَيْئًا میں تاء مکسور کے ادغام میں اختلاف ہے حالانکہ یہ تاء خطاب کی ہے۔ جب تاء مفتوحہ ہو تو اظہار میں کوئی اختلاف نہیں جیسے جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا۔

اور ثاء جہاں بھی آئی ہے پانچ حروف میں مدغم کی جاتی ہے جیسے حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ، وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ، وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ اس کے علاوہ نہیں اور حَيْثُ شِئْتُمْ اور حَدِيْثُ ضَيْفِ ان کے علاوہ کسی جگہ مدغم نہیں ہوتی۔

الذال: یہ سین اور صاد میں مدغم ہوتی ہے جیسے مَا اتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ سورۃ کہف میں دو مقامات پر مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً۔

اللام: اس کو راء میں مدغم کیا جاتا ہے اور راء کو لام میں مگر جب یہ دونوں مفتوح ہوں اور حرف ساکن کے بعد ہوں تو ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہوتے جیسے كَمَثَلِ رِيْحٍ، هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ۔ جہاں ادغام نہیں ہوتا اس کی یہ مثالیں ہیں فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ، اِنَّ

الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ۔ لیکن قال کے لام کے بعد راء ہوتو ادغام ہوتا ہے اگرچہ ساکن کے بعد مفتوح بھی ہو جیسے قَالَ رَبِّ، قَالَ رَجُلَانِ، قَالَ رَبُّکُمْ۔

النون:۔ یہ لام اور راء میں مدغم ہوتا ہے جب اس کا ماقبل متحرک ہو جیسے "اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ، لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ، تَبَیَّنَ لَهُمْ نون کا ماقبل ساکن ہوتو ادغام نہیں ہوتا جیسے یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ، بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اَنّٰی یَکُوْنُ لَهُ الْمُلْکُ مگر نحن کا نون لام میں مدغم کیا جاتا ہے۔ جہاں بھی واقع ہو اگرچہ ساکن کے بعد جیسے نَحْنُ لَهُ، وَمَا نَحْنُ لَکَ اور یہ دس مقامات پر ہے۔

میم جس کا ماقبل متحرک ہو اور اس کے بعد باء ساکن ہو تو ساکن کی جاتی ہے اور اخفاء کیا جاتا ہے۔

الباء کو یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاءُ میں ہر جگہ میم میں ادغام کیا گیا ہے یہ پانچ مقامات ہیں۔ سوائے سورۂ بقرہ کے وہاں ابوعمرو کی قرأت کے مطابق باء ساکن ہے اور اس میں ادغام صغیر ہے۔ اور جہاں ابوعمرو نے ادغام کبیر کو جائز کہا ہے وہاں ان کے نزدیک تین اور وجوہ بھی جائز ہوتی ہیں (1) الاشمام (2) الروم (3) اظہار۔ مگر اشمام صرف حروف مضمومہ میں اور روم مضمومہ اور مکسورہ میں ہوتا ہے۔ مفتوحہ میں نہیں ہوتا۔

الاشمام کی تعریف:۔ دونوں ہونٹوں کو ملاتے ہوئے ضمہ کی طرف اشارہ کرنا۔

الروم کی تعریف:۔ کسی حرکت میں تلفظ اور اخفاء کو جمع کرنا۔ لیکن ابوعمرو کے نزدیک باء اور میم کے اجتماع کے علاوہ حروف میں اشمام اور روم ہوتا ہے جیسے نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا، یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاءُ، یَعْلَمُ مَّا اَعْلَمُ بِمَا کَانُوْا اور ادغام بہتر نہیں ہے(۱) جب کہ دونوں حروف سے پہلے کوئی حرف ساکن صحیح ہو کیونکہ اجتماع ساکنین ہو جاتا ہے، جیسے خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ، بَعْدَ ظُلْمِهِ، فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا، دَارُ الْخُلْدِ جَزَاءُ اور ادغام سے یہاں مراد کسی حرکت کے ساتھ بولنا ہے اور یہی اخفاء اور روم ہے۔ مگر یہاں ادغام کے ساتھ تعبیر مجازی ہے، مگر جب ساکن حرف مد یا لین ہوتو ادغام صحیح ہے جیسے فِیْهِ هُدًی وَقَالَ لَهُمْ وَیَقُوْلُ رَبَّنَا وَقَوْمِ مُوْسٰی وَکَیْفَ فَعَلَ۔ حقیقت حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

اَلْمَلِکُ وَالْمَالِکُ: بعض علماء فرماتے ہیں دونوں کا معنی رب ہے جیسے فرھین اور فارھین۔ حذرین اور حاذرین کا معنی ایک جیسا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ المالک، المِلک (بالکسر) سے مشتق ہے جس کا معنی رب ہے کہا جاتا ہے، مَالِکُ الدَّارِ (گھر کا مالک)، رَبُّ الدَّارِ (گھر کا مالک) اور المَلِکُ، المُلک (بالضم) سے مشتق ہے جس کا مطلب السلطان ہے۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ اور دونوں قرأتیں متواتر ہیں المَلِک کو مختار کہنا جائز نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اَلْمَلِکُ اور اَلْمَالِکُ کا معنی قادر ہے، یعنی جو کسی چیز کو نئے سرے سے وجود عطا کرنے پر قادر ہوتا ہے اور اس کا اطلاق اللہ کی ذات کے علاوہ کسی کے لئے حقیقی معنی میں نہیں ہوتا مگر دوسروں کے لئے مجازاً استعمال ہوتا ہے۔

ع۔ الدین کا مطلب جزاء ہے، اسی سے ایک مثل مشہور ہے اور مرفوع حدیث بھی ہے۔ کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ (جیسا کرو گے ویسا

(۱) یہ متاخرین قراء اور نحویوں کے نزدیک ہے لیکن متقدمین کے نزدیک ادغام محض اصح ہے۔ المحقق فرماتے ہیں: ادغام صحیح اہل اداء میں سے قدماء ائمہ کے نزدیک ثابت ہے اور ان کی نصوص اس پر مجتمع ہیں۔

بھروگے)اس حدیث کو ابن عدی نے الکامل میں ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور بیہقی نے ایک مرسل حدیث روایت کی ہے جو اس کی شاہد ہے، امام احمد نے مالک بن دینار سے نقل کیا ہے کہ یہ تورات میں ہے، الدیلمی نے فضالہ بن عبیدہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ یہ انجیل میں ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یوم الدین سے مراد یوم حساب ہے۔ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ یعنی انصاف پر مبنی حساب۔ بعض علماء فرماتے ہیں الدین کا معنی قہر ہے، اسی سے یہ مثل ہے دنتہٗ فدان: یعنی میں نے اس پر جبر کیا تو وہ مطیع بن گیا۔ یا دین کا معنی اسلام اور اطاعت ہے، کیونکہ اس دن صرف اسلام اور طاعت ہی نفع دے گی (اس لئے فرمایا اطاعت و اسلام کا دن)۔ اللہ تعالیٰ کی ملکیت کے لئے اس دن کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے اس لئے کہ دوسرے دنوں میں ملک کا اطلاق مجازاً دوسرے لوگوں کے لئے بھی ہوتا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں انذار اور ایاک نعبد کے قول کی طرف دعوت ہے۔ یہاں صفت کے صیغہ کو ظرف کی طرف مضاف کیا ہے، مفعول بہ کے قائم مقام رکھتے ہوئے۔ جیسے کہا جاتا ہے یَا سَارِقَ اللَّیْلَةِ۔ یہاں اسم فاعل بمعنی ماضی ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے فرمایا نَادٰی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ حالانکہ یہ واقعہ قیامت کے روز ہونا ہے لیکن جس کام کا وقوع یقینی ہو وہ اس کام کی مانند ہوتا ہے جو ہو چکا ہو۔ اس صفت کا معرفہ کی صفت واقع ہونا صحیح ہے۔ ان تمام صفات کو اللہ تعالیٰ کے حمد کے مستحق ہونے کی علت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، اور جو ان صفات سے متصف نہ ہو وہ حمد (تعریف) کا ہی اہل نہیں چہ جائیکہ اس کی عبادت کی جائے اور ایاک نعبد کے قول کے لئے تمہید کے طور پر ان صفات کو پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

الرحمٰن اور الرحیم کی صفات اللہ تعالیٰ کے اختیار پر دلالت کرتی ہیں اور بالذات کسی چیز کے ایجاب اور سابق اعمال کی وجہ سے جزاء کے وجوب کی نفی پر دلالت کرتی ہیں۔

پھر جب اس ذات کا ذکر کیا جو حمد کی مستحق ہے اور اس کی ایسی جلیل القدر صفات ذکر کیں جو اسے تمام ذاتوں سے جدا کرتی ہیں تو گویا علم معلوم معین بن گیا۔ اسی وجہ سے آگے خطاب کا صیغہ ذکر فرمایا۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ؀

"تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔[1]"

[1] قراء نے یہاں حالتِ وقف میں روم اور اشمام کو جائز قرار دیا ہے بلکہ ہر مضموم حرف پر روم اور اشمام کو جائز قرار دیا ہے، اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے وہ ذات جو ان صفات مذکورہ ممیزہ سے متصف ہے ہم عبادت اور اس پر استعانت بلکہ تمام امور پر مدد طلب کرنے کے لئے تجھے ہی خاص کرتے ہیں عربوں کی عادت ہے کہ کلام میں تفنن اور التفات پیدا کرتے ہیں یعنی غیب کے صیغوں سے خطاب کی طرف، خطاب سے غیب کے صیغوں کی طرف انتقال کرتے ہیں۔ اسی طرح متکلم کے صیغوں سے غیب و خطاب کی طرف کلام کو منتقل کر دیتے ہیں، اور اس تبدیلی سے مقصود سننے والے کو چوکنا کرنا اور متوجہ کرنا ہوتا ہے۔

عبادت کی تعریف:۔ انتہائی درجہ کے خضوع و انکساری کو عبادت کہتے ہیں۔ اسی سے مشتق طَرِیْقٌ مَعْبَدٌ ہے جس کا مطلب ہے ایسا راستہ جس کو کثرت سے پامال کیا گیا ہو۔

نعبد اور نستعین میں جمع کی ضمیریں قاری اور اس کے ساتھیوں کے لئے ہیں۔ جمع کے صیغوں کے ذکر میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز کا التزام کیا جائے۔ یہاں اِیَّاکَ کو دونوں جگہ مقدم کیا گیا ہے (حالانکہ مفعول کا مقام فعل اور فاعل کے بعد ہوتا ہے)

اس کی وجہ مفعول کی تعظیم، اہمیت اور تخصیص کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اس کا مطلب نَعْبُدُكَ وَلَا نَعْبُدُ غَيْرَكَ ہے(1) یعنی ہم تیری عبادت کرتے ہیں تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے الضحاک کے طریق سے حضرت ابن عباس سے یہی معنی روایت کیا ہے، بعض علماء فرماتے ہیں وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں واؤ حالیہ ہے۔ پھر مطلب یہ ہوگا ہم تجھ سے مدد طلب کرتے ہوئے تیری عبادت کرتے ہیں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝

"چلا ہم کو[1] سیدھے راستہ پر[2]"

1۔ یہ اسی معونت و مدد کا بیان ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے یا یہ علیحدہ کلام ہے جو مقصود اعظم یعنی ہدایت کے طلب کرنے کے لئے ذکر کی گئی ہے۔

ہدایت کا مفہوم:۔ مہربانی اور لطف کے ساتھ راہنمائی کرنا۔ اسی وجہ سے یہ خیر اور بھلائی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ہدایت کا فعل لام یا الی کے صلہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے مگر کبھی کبھی بغیر صلہ کے بھی متعدی ہوتا ہے۔ یہ مومنین اور نبی کریم ﷺ کی دعا ہے حالانکہ وہ پہلے بھی ہدایت یافتہ تھے۔ تو وہ اس دعا سے اس ہدایت پر دوام اور ہدایت کی زیادتی طلب کرتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور نوازشات غیر متناہی ہیں۔ جیسا کہ اہل سنت کا مذہب اور عقیدہ ہے۔

2۔ الصراط کو ابن کثیر نے حضرت قنبل کی روایت سے پورے قرآن میں جہاں بھی آیا اصل کے مطابق سین کے ساتھ پڑھا ہے خواہ معرف باللام یا مضاف یا نکرہ استعمال ہوا ہے۔

کیونکہ یہ سَرَطَ الطَّعَامَ سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے اس نے کھانا نگل لیا۔ راستہ کو صراط اس لئے کہتے ہیں کہ مسافر اس کو طے کر کے گویا نگل لیتے ہیں یا یہ راستہ مسافروں کو نگل لیتا ہے۔ باقی قراء نے لغت قریش کے مطابق صاد کے ساتھ پڑھا ہے۔ خلف نے ہر جگہ صاد اور زاء کے درمیان پڑھا ہے اسی طرح خلاد نے بھی۔ یہ ایک خاصہ ہے۔

المستقیم کا مطلب مستوی یعنی برابر اور سیدھا ہے۔ یہاں مراد حق کا راستہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں صراط مستقیم سے مراد ملت اسلامیہ(1) ہے(2) یہ دونوں قول ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے نقل کئے ہیں۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

"راستہ[1] ان کا جن پر تو نے انعام فرمایا نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا[2]"

1۔ اس آیت کا صِرَاطَ پہلے صِرَاطَ کا بدل کل ہے اور اس کا فائدہ تاکید اور اس بات پر نص قائم کرنا ہے کہ ان انعام یافتہ لوگوں کا راستہ ہی مستقیم اور سیدھا ہے اور اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے مراد وہ تمام نفوس قدسیہ ہیں جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمان و اطاعت پر ثابت اور مضبوط رکھا ہے۔ یعنی انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

1۔ انوار التنزیل و اسرار التاویل، المعروف تفسیر بیضاوی، سورۃ فاتحہ، جلد 1 صفحہ 11 مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

(الف) ابوالعالیہ اور حضرت الحسن نے الصراط المستقیم سے مراد رسول اللہ ﷺ اور شیخین کریمین کی سنت لی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے تم پر میری سنت اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑنا لازم ہے اور فرمایا میرے بعد دین کے معاملہ میں ابوبکر و عمر کی اقتداء کرو۔

2۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 58 مطبوعہ المکتبۃ الامیریہ مصر

قرأت: حضرت حمزہ نے علیہم، الیہم، لدیہم کو جہاں آئے ہیں، وقف یا وصل میں ہر جگہ ہاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ہاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے جمع کی میم کو وصل کی صورت میں اشباع کے ساتھ مضموم پڑھا ہے جب اس سے ساکن ملا ہوا نہ ہو۔ اور قالون نے اشباع اور عدم اشباع میں اختیار دیا ہے جب اس کے ساتھ ساکن ملا ہوا ہو یا نہ ملا (۱) ہو، اور ورش الف کے قطع کے وقت صرف اشباع کرتے تھے۔

جب الف میم سے متصل ہو اور حاء سے پہلے کسرہ یا یاء ساکنہ ہو جیسے بِهِمُ الْاَسْبَابُ، وَعَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تو حمزہ اور کسائی حاء اور میم پر ضمہ پڑھتے ہیں۔ ابو عمرو دونوں پر کسرہ پڑھتے ہیں اسی طرح یعقوب بھی دونوں پر کسرہ پڑھتے ہیں جب ان کا ماقبل مکسور ہو اور دوسرے قراء اصل کے مطابق ماقبل یاء اور کسرہ کی وجہ سے حاء کو کسرہ اور میم کو ضمہ دیتے ہیں۔ اور وقف کی صورت میں تمام کے نزدیک حاء کو کسرہ دیا جاتا ہے کیونکہ ماقبل کسرہ اور یاء ہوتی ہے، مگر تینوں کلمات میں حمزہ کا اختلاف ہے۔

ﷲ یہ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے بدل ہے یعنی انعام یافتہ وہ جو غضب اور گمراہی سے سلامت ہیں۔ یا یہ اللذین کی صفت مبینہ یا صفت مقیدہ ہے (صفت بنانے کے لئے موصوف کو نکرہ یا صفت کو معرفہ بنانا ضروری ہوگا) اسم موصول کو نکرہ کے قائم مقام سمجھا جائے موصول اسم نکرہ اس وقت ہوتا ہے جب اس سے مخصوص افراد مراد نہ ہوں جیسے شاعر کا قول ہے وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ میں لئیم آدمی کے پاس سے گزرتا ہوں تو وہ مجھے گالی دیتا ہے۔ یہاں لئیم معرف باللام ہے مگر نکرہ ہے کیونکہ اس سے کوئی مخصوص فرد مراد نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس کی صفت جملہ فعلیہ ذکر کی گئی ہے جو نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے۔ یا غیر کا لفظ نکرہ نہیں بلکہ معرفہ ہے کیونکہ یہ ایسی چیز کی طرف مضاف ہے جس کی ایک ضد ہے۔ ایسی صورت میں وہ متعین ہو جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے عَلَيْكُمْ بِالْحَرَكَةِ غَيْرِ السُّكُوْنِ۔ یہاں غیر معرفہ کے حکم میں ہے۔

علیہم نائب الفاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور لا زائدہ ہے جو غیر کے معنی کی نفی کی تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ گویا کلام یوں ہے لَا الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ۔

الغضب: ۔ انتقام کے ارادہ سے جو انسان کے نفس میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اسے غضب کہتے ہیں اور جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو مراد اس کیفیت کا نتیجہ ہوتا ہے (یعنی سزا دینا)۔

الضلالة: ۔ ہدایت کی ضد ہے۔ اس کا مطلب ہے، منزل تک پہنچانے والے راستہ سے ایک طرف ہٹ جانا، اس کے بہت سے درجات ہیں۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اور ترمذی نے اپنی سنن میں اور ابن حبان وغیرہ نے عدی بن حاتم سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا المغضوب علیہم سے مراد یہود اور الضالین سے مراد نصاریٰ ہیں(1)۔

ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابوذر سے اسی طرح روایت کیا ہے، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس، ابن مسعود، ربیع بن انس، زید بن اسلم سے یہی تفسیر نقل کی ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس تفسیر میں مفسرین کا کوئی اختلاف مجھے معلوم نہیں۔ یہ لفظ عام ہے جو کفار، نافرمان اور بدعتی تمام کو شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قاتل کے بارے فرمایا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ ایک اور جگہ فرمایا فَبَآءُوْ

1۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 58 مطبوعہ المکتبۃ الامیریہ مصر

حاشیہ (۱) یہ تعمیم سبقت قلمی ہے یا کاتبوں کی غلطی ہے کیونکہ حرف ساکن سے پہلے اشباع ممنوع ہے۔

بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلٰلُ ۔ (پس حق کے بعد کیا ہے بجز گمراہی کے)۔ایک اور جگہ فرمایا اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۔(یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری جدوجہد دنیوی زندگی کی آرائش میں کھو کر رہ گئی)۔

نوٹ:۔ سورۂ فاتحہ کے ختم کے وقت علیحدہ کر کے آمین کہنا سنت ہے۔ آمین مخفف ہے، مشدد نہیں ہے، ممدود اور مقصور دونوں طرح آیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا اس کا معنی اِسْمَعْ اور اِسْتَجِبْ ہے(1) یعنی (اے اللہ) قبول فرما۔ ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ نے نبی کریم ﷺ سے آمین کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا آمین کہا کرو۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مصنف میں، البیہقی نے دلائل میں ابو میسرہ سے روایت کیا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کو سورۂ فاتحہ پڑھائی تو جب وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہا تو جبرئیل نے آپ ﷺ سے کہا: آمین کہو(2) ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں ابو زہیر سے روایت کیا ہے کہ ایک صحابی نے فرمایا: آمین صحیفہ پر مہر کی طرح ہے۔ ہم حضور نبی کریم ﷺ کی معیت میں ایک رات باہر نکلے ہم ایک شخص کے پاس آئے جو دعا میں اصرار کر رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر اس نے مہر لگا دی تو اپنی دعا کی قبولیت کو واجب کر دے گا۔ ایک شخص نے پوچھا حضور کس چیز سے مہر لگائے؟ فرمایا آمین سے۔(3)

ابوداؤد، ترمذی اور دار قطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت نقل کی ہے جسے ابن حبان نے صحیح کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب وَلَا الضَّآلِّیْنَ پڑھتے تو آمین کہتے۔(4) صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب امام وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہے تو تم آمین کہو، بیشک ملائکہ بھی آمین کہتے ہیں اور امام بھی آمین کہتا ہے اور جس کی آمین ملائکہ کی آمین سے موافقت کرتی ہے اس کے پہلے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔(5)

سورۂ فاتحہ کے فضائل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے سورۂ فاتحہ جیسی سورت تورات، انجیل، زبور میں نازل نہیں ہوئی۔ یہ سات آیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہیں(6) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن صحیح کہا ہے۔ الحاکم نے بھی روایت کیا ہے اور مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ آپ ﷺ تشریف فرما تھے اور جبرئیل علیہ السلام بھی آپ کے پاس تھے اوپر سے آواز سنائی دی جبرئیل علیہ السلام نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا آسمان کا ایک دروازہ کھلا ہے جو کبھی نہیں کھلا تھا اور فرمایا اس سے ایک فرشتہ اترا ہے، وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا حضور ﷺ مبارک ہو دو نوروں کی جو آپ کو عطا ہوئے ہیں آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئے ہیں۔ فاتحۃ الکتاب اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات۔ اس کا جو حرف تم پڑھو گے وہ تمہیں عطا کیا جائے گا۔ اس کو مسلم نے روایت کیا

1۔ تفسیر بغوی برحاشیہ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 20 المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 43 (العلمیۃ)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 4 صفحہ 200 مطبوعہ مکتبۃ الرشد الریاض 4۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 134-135 وزارت تعلیم
5۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 176 (قدیمی) 6۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 111، وزارت تعلیم

ہے(1) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کیا ہے، نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے ہے میرے بندے کے لئے وہی ہے جو وہ مانگے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی۔ بندہ کہتا ہے الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری تعریف کی۔ بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ بندہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے۔ میرے بندے کے لئے وہی ہے جو اس نے سوال کیا۔ بندہ کہتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ تمام میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہی ہے جو اس نے سوال کیا۔ اس کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(2)

عبدالملک بن عمیر سے مرسلاً مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سورۂ فاتحہ ہر مرض کا علاج ہے۔ اس حدیث کو دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں اور البیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔(3)

حضرت عبداللہ بن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں قرآن کی بہترین سورت پر آگاہ نہ کروں جو قرآن میں نازل ہوئی ہے۔ میں نے عرض کی ضرور یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ نے فرمایا فاتحۃ الکتاب میرا گمان ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اس میں ہر مرض کی شفا ہے۔(4)

حضرت عبداللہ بن جابر سے ہی مروی ہے کہ سوائے موت کے سورۂ فاتحہ ہر مرض کی شفا ہے۔ اس حدیث کو الخلعی نے اپنی فوائد میں روایت کیا ہے حضرت ابوسعید بن المعلی سے مروی ہے کہ قرآن میں عظیم ترین سورت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہے، اس حدیث کو بخاری(5) البیہقی اور الحاکم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، افضل ترین قرآن اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہے(6) بخاری نے اپنی مسند میں حضرت ابن عباس کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ فاتحۃ الکتاب قرآن کے دو ثلث کے برابر ہے(7)۔ ابوسلیمان سے مروی ہے کہ کسی غزوہ میں نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی ایک شخص کے پاس سے گزرے جو گرا پڑا تھا کسی نے اس کے کان میں ام القرآن پڑھی تو (وہ ٹھیک ہو گیا)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ ام القرآن ہے اور یہ ہر مرض کی شفا ہے(8) ثعلبی نے معاویہ بن صالح سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری سے مرفوعاً مروی ہے کہ فاتحۃ الکتاب زہر کے لئے بھی شفا ہے(9)۔ اس حدیث کو سعید بن منصور نے اور البیہقی نے شعب میں روایت کیا ہے۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ایک سفر پر تھے، ہم ایک جگہ اترے تو ہمارے پاس ایک لونڈی آئی اور کہا ہمارے قبیلے کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ تم میں کوئی دم کرنے والا ہے تو ایک شخص اس کے ساتھ گیا اور ام القرآن پڑھ کر اسے دم کیا تو وہ سردار ٹھیک ہو گیا۔ یہ پورا واقعہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ کیسے جانتا تھا کہ یہ سورۂ دم ہے؟ اس کو بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(10)۔ ابوالشیخ اور

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 271 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 170 (قدیمی) 3۔ سنن دارمی، جلد 2 صفحہ 320 مطبوعہ دارالمحاسن قاہرہ
4۔ شعب الایمان، جلد 2 صفحہ 450 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت 5۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 749 (وزارت تعلیم)
6۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 32 7۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 23 8۔ ایضاً
9۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 22 10۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 23 (وزارت تعلیم)

ابوحبان نے الثواب میں ابوسعید اور ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے۔ السائب بن یزید سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ نے فاتحۃ الکتاب پڑھ کر میرے منہ میں دم فرمایا(1) اس کو طبرانی نے الاوسط میں روایت کیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جب تو بستر پر اپنا پہلو رکھے اور سورۃ فاتحہ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھے تو تو موت کے سوا ہر چیز سے محفوظ ہو گیا۔(2) اس کو بزار نے روایت کیا ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 22 (العلمیہ) 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 23

سورۃ بقرہ

سورۃ البقرۃ مدنی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت فرماتے ہیں کہ سورۃ البقرہ اور سورۃ النساء نازل ہوئیں تو میں آپ ﷺ کے پاس تھی (1) اس کی دو سو ستاسی آیات (ا) ہیں اور چھ ہزار ایک سو اکیس کلمات ہیں اور اس کے حروف پچیس ہزار پانچ سو ہیں۔

آیاتہا ۲۸۶ | سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ مَدَنِیَّۃٌ ۲ | رکوعاتہا ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾

الف لام میم ۔ لے

لے بعض علماء فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات سورتوں کی ابتداء میں سورتوں کے نام ہیں۔ بعض فرماتے ہیں یہ حروف زائد ہیں: اور پہلی کلام کے انقطاع اور نئی کلام کے آغاز پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کئے جاتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں: یہ ان کلمات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن سے انکا اختصار کیا گیا ہے جیسے شاعر کہتا ہے فَقُلْتُ لَهَا قِفِيْ فَقَالَتْ لِيْ قَافْ میں نے اسے کہا ٹھہر جا تو اس نے کہا ٹھہر گئی۔ اس میں قاف سے وقفت سے اختصار ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابو العالیہ سے روایت کیا ہے کہ الف سے مراد آلاء اللّٰه (اللہ تعالیٰ کی نعمتیں) لام سے مراد لطفہٗ (یعنی اللہ تعالیٰ کا لطف) اور میم سے مراد مُلْکُہٗ یعنی اس کی بادشاہی ہے(2)۔ عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور حاتم نے ابو العالیہ سے نقل روایت کیا ہے کہ الر، حم اور ن کا مجموعہ الرحمٰن ہے(3) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے الم کا معنی اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ روایت ہے(4) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مندرجہ ذیل حروف کے یہ مختلف معانی روایت فرمائے ہیں۔ المٓصٓ: اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ وَ اَفْصِلُ۔ الر: اَنَا اللّٰهُ اَرٰی۔ المر: اَنَا اللّٰهُ اَعْلَم وَ اَرٰی۔(5)

بعض علماء فرماتے ہیں یہ مختلف اقوام کی عمروں کی طرف اشارہ کرتے ہیں یعنی علم جمل کے حساب سے قوموں کی مدتوں اور عمروں کو بیان کرتے ہیں امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابن جریر نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس یہودی آئے تو آپ ﷺ نے الم کو تلاوت فرمایا۔ انہوں نے علم جمل کے حساب سے حساب لگایا اور کہا ہم اس دین میں کیسے داخل ہوں جس کی مدت اکہتر سال ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ ان کے اس کلام کو سن کر مسکرائے تو وہ کہنے لگے اس کے علاوہ بھی کچھ ہے آپ ﷺ نے المص، الر اور المر کے الفاظ تلاوت فرمائے۔ وہ کہنے لگے آپ ﷺ نے ہم پر معاملہ مشتبہ کر دیا ہے۔ ہمیں سمجھ نہیں آرہی کہ ہم کس کو لیں اور کس کو چھوڑیں(6)۔ حروف مقطعات کے بارے یہ تمام اقوال مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر مردود ہیں: اگر

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 747 (وزارت تعلیم)
2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 56 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بیضاوی صفحہ 15 (فراس)
4۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 67 (الامیریہ)
5۔ تفسیر بغوی بر حاشیہ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 22 (التجاریہ)
6۔ تفسیر بیضاوی صفحہ 15 (فراس)

(ا) آیات کی یہ تعداد بصریوں کے نزدیک ہے لیکن کوفیوں کے نزدیک اس کی دو سو چھیاسی آیات ہیں۔

انہیں سورتوں کے اسماء بنایا جائے تو ایک واضع کی طرف سے اعلام میں اشتراک کا وقوع لازم آتا ہے جو علمیت کے مقصود کے منافی ہے۔ اس طرح تین اسماء یا تین سے زیادہ اسماء کے ساتھ نام رکھنا ناپسندیدہ اور غیر معروف ہے، اسی طرح اگر یہ سورتوں کے اسماء ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بعض کے نام ہیں اور بعض کے نہیں ہیں۔ یہ عقل سے بعید ہے۔ دوسرا قول اس لئے مردود ہے کہ ان الفاظ کا کلام کی ابتداء اور انتہاء کے بیان کے لئے زائدہ ہونا عربوں میں معروف نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر دو سورتوں کے درمیان یہ الفاظ ذکر کئے جاتے۔ تیسرا قول اس لئے مردود ہے کہ کلمہ کے بعض حروف پر اکتفاء غیر مستعمل ہے، اور شعر کا جواب یہ ہے کہ یہ شاذ ہے اور شعر میں قفی کالفظ قرینہ ہے کہ قاف وقفت سے اختصار ہے لیکن سورتوں کی ابتداء میں ان حروف کا ہونا کوئی قرینہ نہیں ہے کہ الف، آلاء اللّٰہ سے اور لام لطف اللّٰہ سے اختصار ہے۔ اور صحابہ کرام سے جو اقوال مروی ہیں ان کی تاویل کی جائے گی ورنہ صحابہ کرام کے اقوال بھی آپس میں متعارض ہوں گے اور جن حروف پر یہ کلمات مشتمل ہیں ان میں سے کسی ایک کلمہ کے ساتھ حرف کو مخصوص کرنا ترجیح بلا مرجح ہے۔ چوتھا قول اس لئے مردود ہے کہ حضور ﷺ یہود کی سوچ پر مسکرائے۔ ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کا مسکرانا ان کی جہالت پر تعجب کے باعث تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں ان حروف سے قسم اٹھائی گئی ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء کے مفردات ہیں اور اس کے خطاب کی اصل اور مادہ ہیں۔ یہ تاویل بہت سی چیزوں کے اضمار کی محتاج ہے، جن پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کا مختار قول یہ ہے کہ حروف تہجی کلام کا عنصر اور کلام کے مفردات ہیں جن سے کلام مرکب ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے کلام کے مفردات میں سے چند حروف سورتوں کی ابتداء میں ذکر فرمائے تا کہ جن لوگوں کو قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر چیلنج کیا گیا ہے انہیں پتہ چل جائے کہ یہ کلام الٰہی انہی مفردات پر مشتمل ہے جن سے وہ اپنے کلام کو مرکب کرتے ہیں۔ اگر یہ غیر اللہ کا کلام ہوتا تو تم اس کی مثل لانے سے عاجز نہ آتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کلام معجز کے پہلے الفاظ جو کانوں سے ٹکرائیں وہ بھی اس کے اعجاز کی ایک مستقل نوع ہوں۔ کیونکہ ایک امی (ان پڑھ) شخص کا حروف کے اسماء سے کلام کرنا یقیناً معجزہ ہے جس طرح اس کا لکھنا معجزہ ہوتا ہے۔ خصوصاً یہاں ان حروف کو جس ترتیب اور حسن نظم سے ذکر کیا گیا ہے ایک ماہر کلام اور ادیب بھی اس سے عاجز ہے۔ کیونکہ یہاں چودہ حروف ذکر ہیں جو کل حروف تہجی کی تعداد کا نصف ہیں اور حروف کی تعداد کے مطابق انتیس سورتوں میں ہیں اور حروف کی تمام صفات مہموسہ، مجہورہ، شدیدہ، رخوہ وغیرہ کے نصف نصف پر مشتمل ہیں۔ جیسا کہ امام بیضاوی نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ایک اعجاز اس میں یہ بھی ہے کہ اکثر کلام ان چودہ حروف سے مرکب ہوتی ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ان کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ جس کلام کے ذریعے تمہیں چیلنج کیا گیا ہے وہ ان حروف سے مرکب ہے۔

میرے نزدیک (مفسر) حق یہ ہے کہ یہ متشابہات (1) میں سے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے درمیان راز ہیں۔ عوام الناس کو ان کا مفہوم سمجھانے کا ارادہ نہیں کیا گیا بلکہ رسول کریم ﷺ اور کامل متبعین کو سمجھانے کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔

---

(1) متشابہات کے متعلق علماء کی دو آراء ہیں، تاویل اور غور و فکر کے ذریعے ان کی مراد کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ ان کی مراد کا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ پہلے قول میں رسول اللہ ﷺ اور دوسرے لوگ اس مسئلہ میں برابر ہیں اور تفسیر میں جو دلائل ذکر کئے گئے ہیں وہ اسی قول کے مؤید ہیں۔ دوسرا قول ائمہ احناف کا مختار ہے ان کے نزدیک بھی رسول ﷺ اور غیر رسول برابر ہیں اور قول اول کے مؤیدین کے دلائل ان کے نزدیک مخدوش اور ضعیف تھے۔ پس ہر فریق کے مذہب کی تفصیل اور ہر ایک کی دلیل اور مخالف کی دلیل کا جواب بیان کرنا ضروری ہے۔ تا کہ کلام کا نتیجہ اور خلاصہ سمجھ میں آسکے۔ میں کہتا ہوں متشابہ وہ آیت ہوتی ہے جس کی مراد لغت عرب کو جاننے والا غور و فکر سے اور کوشش سے نہ حاصل کر سکے (بقیہ اگلے صفحے پر)

حضرت امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہر کتاب میں راز ہوتے ہیں اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے راز سورتوں کی ابتداء میں حروف مقطعات ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ایک کتاب کا ایک مخصوص راز ہوتا ہے اور اس کتاب کا مخصوص راز حروف تہجی ہیں(1)۔ ثعلبی نے یہ قول حضرت ابوبکر، حضرت علی اور کثیر رضی اللہ عنہم اجمعین سے حکایت کیا ہے۔ سمرقندی نے حضرت عمر، عثمان اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین سے حکایت کیا ہے۔ قرطبی نے حضرت سفیان ثوری، ربیع بن خثیم، ابوبکر ابن الانباری، ابن ابی حاتم رحمہم اللہ تعالیٰ اور محدثین کی ایک جماعت سے یہ قول حکایت فرمایا ہے۔

السجاوندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں قرون اولیٰ سے حروف تہجی کا معنی یہ مروی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی مکرم ﷺ کے درمیان راز ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو محرم رازوں کے درمیان کچھ ایسے مبہم کلمات ہوتے ہیں جو ان کے آپس کے اسرار کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں حروف مقطعات اور متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ خاص فرمایا ہے، نہ نبی کریم ﷺ کو ان کا علم عطا ہوا ہے اور نہ اولیاء کاملین کو۔ مگر یہ قول عقلاً بہت بعید ہے۔ کیونکہ خطاب ہمیشہ سمجھانے کے لئے ہوتا ہے۔ اگر ان کا علم ہی نہ دیا گیا تو اس کا مطلب ہوگا کہ مہمل لفظ کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، یا ہندی کو عربی کلام سے مخاطب کیا گیا ہے (جو عربی سمجھتا ہی نہیں) اور اس طرح قرآن تمام کا تمام بیان اور ہدایت بھی نہ رہے گا، نیز اللہ تعالیٰ کے ارشاد ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ پھر (اس کا بیان ہم پر ہے) کا کذب لازم آئے گا۔ حالانکہ اس ارشاد کا تقاضا یہ ہے کہ محکم اور متشابہ قرآن کا بیان بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو عطا ہونا واجب اور ضروری ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں راسخین فی العلم سے ہوں اور میں ان لوگوں میں سے ہوں جو مقطعات اور متشابہات کی تاویل جانتے ہیں۔ اسی طرح حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر مقطعات کی تاویل اور اسرار ظاہر فرمائے ہیں لیکن ان کا بیان عوام الناس کے لئے ممکن نہیں کیونکہ یہ چیز ان کے اسرار الٰہی ہونے کے منافی ہے۔ وَاللّٰہُ تعالیٰ اعلم۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں۔(2) یہ قول ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے الاسماء والصفات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

(گزشتہ سے پیوستہ) جب تک کہ شارع کی طرف سے اس کا بیان نہ آئے۔ جب آپ ﷺ اس کو اس طرح بیان فرما دیں کہ اس کا مراد و مقصود ظاہر ہو جائے تو اس کو علماء اصول کی اصطلاح میں مجمل کہتے ہیں جیسے نماز، زکوٰۃ، حج، عمرہ اور آیت ربا وغیرہ اگر نبی کریم ﷺ کی طرف سے بیان نہ پایا جائے تو اسے علماء اصول کی اصطلاح میں متشابہ کہتے ہیں پس اس معنی کے اعتبار سے متشابہ اخص ہے بنسبت معنی مذکور کے۔ حروف مقطعات، ید، وجہ، استویٰ علی العرش کا تعلق اس دوسرے قبیل سے ہے یعنی جن کا معنی متعین نہیں فرمایا گیا۔ پس اس نوع کے متعلق علماء کا اختلاف ہے بعض فرماتے ہیں ان کی تاویل ممکن ہے اور بعض فرماتے ہیں ان کی تاویل ممکن نہیں ہے بلکہ ان پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی مراد اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے بعض علماء فرماتے ہیں ان کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ مخصوص کیا ہے نبی کریم ﷺ اور ان کے متبعین میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے اکثر علماء کا یہی قول ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے متبعین میں سے جس کو چاہا ان کا علم عطا فرمایا۔ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان ایک راز ہیں۔ ہمارے نزدیک یہی قول مختار ہے اور اس قول کی تائید پر دلالت کرنے والے صحابہ کرام کے اقوال کتاب میں مذکور ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی برحاشیہ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 22 (التجاریہ)   2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 54 (العلمیہ)

ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یوں دعا کرتے تھے یا کٓھٰیٰعٓصٓ اِغْفِرْلِیْ (۴) حضرت ربیع بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کٓھٰیٰعٓصٓ کا یہ معنی مروی ہے مَنْ یُجِیْرُوَلَا یُجَارُ عَلَیْہِ کہ اے وہ ذات جو پناہ دیتی ہے اور اس کے خلاف پناہ نہیں دی جاتی۔(2)

بعض علماء فرماتے ہیں، یہ قرآن کے اسماء ہیں۔ یہ قول عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت فرمایا ہے۔(3) اس قول کی دلیل یہ دیتے ہیں الکتاب اور القرآن کے ساتھ ان اسماء کی خبر لگائی گئی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں اگر یہ اسماء اللہ تعالیٰ کے اسماء ہوں تو اللہ تعالیٰ کی بعض صفات پر دلالت کرنے والے ہوں گے جیسے دوسرے صفاتی اسماء حسنیٰ اللہ تعالیٰ کی صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر قرآن کے اسماء ہوں تو قرآن کی بعض صفات پر دلالت کرتے ہوں گے جیسے قرآن، فرقان، نور، حیاۃ، روح، ذکر، الکتاب کے الفاظ قرآن کی صفات میں سے کسی ایک صفت پر دلالت کرتے ہیں ان دونوں تقدیروں کی صورت میں عوام ان کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکتے بلکہ یہ خطاب یعنی نبی کریم ﷺ اور ان لوگوں کے ساتھ مختص ہے جنہیں اللہ تعالیٰ ان کے رموز عطا کرنا چاہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اسماء ہونے کی صورت میں ان کا معنی اور مفہوم سمجھنے کے بعد ہی ان کا حکم متصور ہو سکتا ہے۔ اگر یہ دونوں اقوال صحیح ہوں تو وہی معنی متعین ہوتا ہے جو ہم نے بیان کیا ہے یعنی یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے درمیان راز ہیں جنہیں کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ مگر کاملین متبعین میں سے جس کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے ان کا علم عطا فرماتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے وہ ارشادات جو متشابہات میں سے ہیں مثلاً:۔

یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ "اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی وہ بے حد مہربان کائنات کی فرمانروائی کے تخت پر متمکن ہوا۔ ھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَہُمُ اللّٰہُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ آئے ان کے پاس اللہ (کا عذاب) چھائے ہوئے بادلوں (کی صورت) میں۔

یہ آیات اور ان جیسی دوسری آیات جن کو ظاہر پر محمول کرنا محال ہے ان کی پیروی وہی کرتے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی ایک صفت پر دلالت کرتی ہے جنہیں رسول مکرم ﷺ اور کامل متبعین سمجھتے ہیں اس کی توضیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات لامحدود اور غیر متناہی (۱) ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ (اے حبیب) آپ فرما دیجئے اگر ہو جائے سمندر روشنائی میرے رب کے کلمات لکھنے کے لئے تو ختم ہو جائے گا سمندر اس سے پیشتر کہ ختم

1۔ تفسیر بیضاوی، جلد 1 صفحہ 16 (فراس) 2۔ الدر المنثور، جلد 4 صفحہ 466 3۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 54

(۱) علامہ بغوی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ یہود نے کہا تم کہتے ہو کہ ہمیں حکمت عطا کی گئی ہے اور تمہاری کتاب میں ہے کہ جس کو حکمت عطا کی گئی اس کو خیر کثیر عطا کیا گیا پھر آپ کہتے ہیں تمہیں علم میں سے تھوڑا عطا کیا گیا ہے۔ اس مکالمہ پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی یعنی اس کے علم اور حکمت کے کلمات غیر متناہی ہیں، اسی وجہ سے علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی معلومات غیر متناہی ہیں اگرچہ یہ غیر متناہی ہونا ان کے تعلقات کے غیر متناہی ہونے کے سبب ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات کی تمام جزئیات غیر متناہی ہیں اور ان صفات کا حصر بھی ممنوع ہے۔ متن کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ وہ اسماء جو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ مخصوص فرمائے ہیں انہیں مخلوق کا کوئی فرد نہیں جانتا اور یہ جائز ہے کہ اللہ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کو مقطعات کے ذریعے ان اسماء اور صفات کا علم عطا فرمایا ہو جس کا آپ ﷺ سے پہلے کسی کو علم نہ ہو اور صفات کا غیر متناہی ہونا ان کے تعلقات کے غیر متناہی ہونے کے اعتبار سے ہے اور کلمات کو صفات پر محمول کرنا بہت بعید ہے۔ ہر تعلق کے مقابلہ میں لفظ کا وضع کرنا واجب نہیں ہے تا کہ ان کا متناہی ہونا صفات کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہوں میرے رب کے کلمات۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائے اور اس کے علاوہ سات سمندر اسے (مزید) سیاہی مہیا کریں تو پھر بھی ختم نہیں ہوں گی اللہ کی باتیں۔

اس میں تو ذرا شک نہیں کہ معانی کے لئے جو الفاظ وضع کیے گئے ہیں وہ محدود اور متناہی ہیں اور انسانی عقول اللہ کی ذات وصفات کی حقیقت کے ادراک سے قاصر ہیں صرف معیت ذاتی یا صفاتی کی ایک نوع کے ذریعے اس کا کچھ ادراک متصور ہے، لیکن وہ معیت ذاتی یا صفاتی بھی غیر مکیف ہے، عوام کی فہم تو اس ادراک سے بہت دور ہے بلکہ خواص بھی کچھ ادراک کے باوجود مرتبۂ ذات کا ادراک نہیں رکھتے اسی وجہ سے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس ادراک کے درک سے عجز ہی ادراک ہے۔ اس کی ذات کے راز سے بحث کرنا ہی اشراک ہے مگر بعض صفات الٰہیہ غایات کے اعتبار سے اور مشاکلات کے اعتبار سے ممکنات کی صفات میں مشترک ہیں جنہیں ان اسماء سے تعبیر کیا گیا ہے جو مخلوق کی صفات پر دلالت کرتے ہیں جیسے حیات، علم، سمع، بصر، ارادہ، رحمت، قہر وغیرہ۔ انسان نے یہ گمان کیا کہ میں ان کی حقیقت سمجھ گیا ہوں حالانکہ اس نے ان صفات کی بعض وجوہ کو سمجھا ہے اور بعض صفات وہ ہیں جو ممکنات کی صفات سے شرکت نہیں رکھتیں۔ بعض صفات وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص فرمایا ہے کچھ ایسی صفات ہیں جنہیں خواص بھی نہیں سمجھتے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک دعا میں یوں عرض کیا:۔ اے اللہ میں تجھ سے ہر اس اسم کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں جس کے ساتھ تو نے خود اپنی ذات کو موسوم فرمایا یا جو اسم تو نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا ہے یا وہ اسم جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی ایک کو سکھایا یا جو تو نے اپنے علم غیب سے اپنے لئے مخصوص رکھا ہے(1)۔ اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں، حاکم نے مستدرک میں، امام احمد اور ابو یعلیٰ نے ابن مسعود سے روایت کی ہے یہ دعا اس شخص کے لئے وظیفہ ہے جسے قلبی روگ لاحق ہو۔ اور طبرانی نے یہ حدیث حضرت ابو موسیٰ سے روایت کی ہے۔

ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے اسماء ہوں جو عوام سے مخفی ہوں اور ان کے لئے ان کی لغات میں کوئی لفظ ہی وضع نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض اپنے نبی مکرم ﷺ کو ان حروف کے ذریعے الہام فرمائے ہوں اور ان کاملین متبعین کو جنہیں اللہ تعالیٰ نے

(گزشتہ سے پیوستہ) ادراک میں قدح کا باعث ہو بلکہ لفظ ایک معنی کلی کے لئے وضع کیا جاتا ہے جو غیر متناہی جزئیات پر منطبق ہوتا ہے پھر کسی معنی کے مقابلہ میں لفظ کا وضع نہ ہونا اس معنی کے معلوم نہ ہونے کا سبب نہیں ہوتا کیونکہ لفظ کے واسطہ کے بغیر بھی معنی کا تصور جائز ہے حقیقت کے تصور کا لفظ کے بغیر ممتنع نہ ہونا عدم لفظ کا مقتضی ہے کیونکہ تصور بالوجہ کافی ہے۔ اگر ان حروف کے ذریعے علم ضروری کا استفادہ دلالت وصفیہ کے ساتھ ہو تو اس کی اصل پر اشکال وارد ہوتا ہے کیونکہ یہ دلالت تو موجود ہی نہیں ہے کیونکہ یہ وضع عربوں کی وضع نہیں ہے حالانکہ قرآن سارا عربی ہے اور اگر استفادہ دلالت وضعیہ کے ذریعے سے نہ ہو بلکہ صرف مقابلہ اور لزوم روایت کی وجہ سے ہو تو ان حروف سے ایسا علم حاصل ہوگا جس کے لئے یہ وضع نہیں کیے گئے پس یہ دو شقیں بحال ہیں۔ میں کہتا ہوں تمام اسماء اور لغات کا واضع اللہ تعالیٰ ہے انسان نہیں ہیں۔ تعلیم کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام یا بیان کے ذریعے سے ہوئی۔ یہ قول علماء نے اس لئے کیا ہے تاکہ دور اور تسلسل لازم نہ آئے۔ پس اس صورت میں یہ کہنا ممکن ہے کہ یہ حروف مقطعات اللہ تعالیٰ کے علم میں معانی کے لئے وضع کئے گئے ہوں اور وضع کے ساتھ ان پر دلالت ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو ان حروف کے معانی اور ان کی صفات الہام فرمائی ہوں جیسا کہ آدم علیہ السلام کو تمام اسماء کے معانی القاء فرمائے تھے۔

1۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 391 (صادر)

خود پسند فرمایا ہو اور ان کے قلوب میں علم ضروری پیدا فرما دیا ہو جو ان حروف سے مستفاد ہو جیسے آدم علیہ السلام کو اسماء کا علم عطا فرمایا تھا اور بغیر کسی سابقہ لغت کے ان میں علم پیدا فرما دیا تھا کہ یہ لفظ فلاں معنی کے لئے ہے، یہ اس لئے تا کہ دور اور تسلسل لازم نہ آئے۔ یہ اسماء اور صفات نبی کریم ﷺ پر ان حروف کی تلاوت سے واضح اور منکشف ہو گئے تھے میرے شیخ و امام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کشف کے ذریعے پورا قرآن یوں ظاہر ہوا جیسے یہ برکت الہیہ کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے اور یہ حروف اس سمندر میں یوں ظاہر ہوتے ہیں گویا چشمے ہیں جو ابل رہے ہیں اور ان سے وہ پورا سمندر نکل رہا ہے۔

اس مکاشفہ کی بناء پر کوئی بعید نہیں کہ یہ حروف قرآن کے اسماء ہوں اور قرآن اس اجمال کی تفصیل ہو حقیقت اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ یہ توجیہ امام بیضاوی کے مختار قول کے منافی نہیں ہے۔ قرآن کی ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے اور ہر حد کا ایک مطلع ہے اور ہر حرف کی ایک حد ہے اور ہر حد کا ایک مطلع ہے، اس حدیث کو امام بغوی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے(1)۔ پس جیسے یہ حروف ظاہر میں قرآن کا عنصر اور اس کے مفردات ہیں اور اکثر کلام ان حروف سے مرکب ہے، اسی طرح ان حروف سے مراد قرآن کا اجمال ہو، ایسے چشمے ہوں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان راز ہوں جن پر مخاطب یعنی نبی کریم ﷺ اور اولیاء کاملین کے سوا کوئی مطلع نہیں ہے۔ ان حروف میں کئی لطائف اور وجوہ اعجاز ہیں۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

''یہ بڑی شان کتاب [1] ذرا شک نہیں اس میں [2] یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے [3]''

[1] یہ وہ کتاب ہے جسے محمد ﷺ پڑھتے ہیں اور مشرک اس کو جھٹلاتے ہیں، اس کا مشار الیہ سورۂ بقرہ سے پہلے نازل شدہ قرآن کا حصہ ہے یا تمام قرآن ہے جس کا بعض پہلے اتر چکا ہے۔

ذالک (ترکیب نحوی کے اعتبار سے) مبتدا ہے اور الکتاب خبر ہے یعنی وہ کتاب جو معہود اور موعود ہے یا یہ مراد ہے کہ وہ کتاب کامل جو اس اہل ہے کہ اسے کتاب کہا جائے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ ذالک موصوف ہے اور الکتاب صفت ہے اور مابعد کلام خبر ہے بعض علماء فرماتے ہیں اس کلام میں ھذا کا لفظ مضمر ہے یعنی یہ جو تمہاری طرف وحی کیا گیا ہے وہ کتاب ہے جس کے نازل کرنے کا ہم نے تورات اور انجیل میں وعدہ کیا ہے یا جس کا ہم نے تجھ سے اس سے پہلے اپنے اس قول، اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا (بے شک ہم جلد ہی القا کریں گے آپ پر ایک بھاری کلام) سے وعدہ فرمایا ہے۔ اس صورت میں ذالک مبتدا محذوف کی خبر ہے اور الکتاب ذالک کی صفت ہے۔

کتاب (صرفی اعتبار سے) مصدر ہے اور مکتوب کے معنی میں ہے، اور اَلْكَتْبُ کا اصل معنی اَلضَّمُّ اور اَلْجَمْعُ یعنی ملانا اور جمع کرنا ہے، اسی لئے لشکر کو کتیبہ کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی جمع ہوتا ہے، کتاب کو کتاب اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں ایک حرف دوسرے کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے، یا اس لئے کہ اس کو جمع کیا جاتا ہے۔

ذالک کے ساتھ اشارہ کتاب کی عظمت شان اور بلند رتبہ کی وجہ سے ہے اگرچہ یہ عام طور پر مشار الیہ بعید کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

[2] اس کے واضح (دلائل) اور روشن تعلیمات کی وجہ سے اس کے وحی الٰہی ہونے میں صحیح نظر و فکر کے بعد کوئی عقلمند شک نہیں کر سکتا۔ نفی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 12 (التجاریہ)

علما فرماتے ہیں یہ خبر نہی کے معنی میں ہے اس وقت مطلب یہ ہوگا اس میں شک وشبہ نہ کرو۔

لا نفی جنس کے لئے ہے اور فیہ اس کی خبر ہے یا فیہ صفت ہے اور للمتقین خبر ہے، ھدی حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا لا نفی جنس کی خبر محذوف ہے جیسے لاضیر میں خبر محذوف ہے اور فیہ، ھدی کی خبر ہے، مبتداء کے نکرہ ہونے کی وجہ سے خبر کو مقدم کیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی لَا رَیْبَ فِیْهِ فِیْهِ هُدًی۔ بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہ تمام جملے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں ہر بعد والا جملہ پہلے جملہ کی دلیل اور وضاحت ہے۔ اسی وجہ سے ان کے درمیان حرف عطف بھی ذکر نہیں ہوا۔ ذالک الکتاب جملہ ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو انتہائی کمال سے متصف ہے حتیٰ کہ ''لا ریب فیہ'' اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ (اسی طرح ھدی للمتقین کا قول ہے) متقین کے لئے ہدایت ہے۔

ابن کثیر نے وصل کی صورت میں اشباع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح ہر اس ھ ضمیر غائب کو اشباع بالیاء کے ساتھ پڑھتے ہیں جس کا ماقبل یاء ساکن ہو ورنہ واؤ کے ساتھ جیسے مِنْهُ اسی طرح تمام قراء ہر ھاء کو یاء کے اشباع کے ساتھ پڑھتے ہیں جس کا ماقبل متحرک مکسور ہو اور ماقبل مکسور نہ ہو تو واؤ کے اشباع سے پڑھتے ہیں جیسے یَضْرِبُهٗ لَهٗ۔ یہ اس صورت میں جب اس کے ساتھ حرف ساکن متصل نہ ہو۔ جب حرف ساکن متصل ہو تو اجتماع ساکنین کی وجہ سے اشباع کا مد ختم ہو جاتا ہے جیسے عَلَيْهِ الْكِتٰبُ وَلَهُ الْحُكْمُ۔ مگر جب کلمہ ناقص ہو اور اس کا آخر جزم کی وجہ سے حذف ہو گیا ہو اور ہ ضمیر کا ماقبل متحرک ہو تو قراء کا اختلاف ہے جیسے یُؤَدِّهٖ، نُوَلِّهٖ، فَاَلْقِهْ، وَیَتَّقْهِ وَنَاتِهٖ، وَیَرْضَهُ۔ ہم ان شاء اللہ اپنے اپنے مقامات پر ہر ایک کی وضاحت کریں گے۔ بعض نے ماقبل متحرک کو دیکھتے ہوئے اشباع کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے حرکت کے عارضی ہونے اور حرف محذوف پر تنبیہ کرنے کے لئے اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے محذوف حرف کی جگہ واقع ہونے کی وجہ سے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

یہ کتاب سراپا ہدایت ہے۔ یہ تیسرا جملہ ہے جو کتاب کے حق اور لاشک ہونے کی تاکید کرتا ہے۔ یا یہ جملے ایسے ہیں کہ ہر بعد والا جملہ پہلے جملہ کی دلیل کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ یہ کتاب کمال کے عروج پر ہے اس میں شک کرنا درست نہیں ہے اس لئے یقیناً یہ ہدایت ہے۔

ھدی مصدر ہے، اس کا معنی ہے راستہ کی راہنمائی کرنا، یا ایسی راہنمائی جو منزل مقصود تک پہنچانے والی ہو، ھدی بمعنی ھادی ہے یا مبالغہ کے لئے مصدر ذکر کیا گیا ہے جیسے عرب کہتے ہیں زید عدل (زید سراپا عدل ہے)۔ ہدایت کا پہلا معنی یعنی راستہ کی راہنمائی کرنا مراد ہے، اور قرآن سے فائدہ صرف متقی اور پرہیزگار ہی اٹھاتے ہیں۔ اس لئے ان کی تخصیص کر دی۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب دلالت سے مراد دلالت عامہ ہو جیسا کہ فرمایا ھُدًی لِّلنَّاسِ۔ قرآن تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے۔ اگر ہدایت کا دوسرا معنی ہو تو پھر ظاہر ہے کہ یہ اس شخص کے لئے راہنمائی مہیا کرتا ہے جس کی عقل کا آئینہ صاف ہو جیسے اچھی غذا صحت مند شخص کو فائدہ دیتی ہے۔ مریض اس سے نفع یاب نہیں ہوتا۔ اسی لئے فرمایا: شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا (باعث شفا ہے اور سراپا رحمت ہے اہل ایمان کے لئے اور قرآن نہیں بڑھاتا ظالموں کے لئے مگر خسارہ کو)۔

المتقی:۔ متقی وہ ہوتا ہے جو اپنے نفس کو ہر اس چیز سے بچاتا ہے جو آخرت میں اس کو نقصان دیتی ہے جیسے شرک سے اجتناب۔ یہ تقویٰ کا ادنیٰ درجہ ہے، پھر جو اسلام قبول کر کے اپنے نفس کو گناہوں سے بچاتا ہے تو یہ تقویٰ متوسط درجے کا ہے اور جو ہر اس چیز سے اجتناب

کرتا ہے جو لایعنی اور بے مقصد ہے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کرنے والی ہے، تو یہ تقویٰ کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد حَقَّ تُقٰتِهٖ سے یہی اعلیٰ مرتبہ مراد ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تقویٰ یہ ہے کہ تو اپنے آپ کو کسی سے بہتر نہ سمجھے۔ شہر بن حوشب نے فرمایا: متقی وہ ہے جو ایسی چیزوں کو بھی چھوڑ دیتا ہے جن کے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوتی کہ کہیں ان میں حرج نہ ہو۔

شیخین اور ابن عدی نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے(1) ان کے درمیان مشتبہات امور ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جس نے مشتبہات سے اجتناب کیا اس نے اپنی عزت اور اپنے دین کو بچالیا اور جو مشتبہات میں پڑ گیا وہ حرام میں پڑ گیا۔ جس طرح چرواہا چراگاہ کے اردگرد ریوڑ چراتا ہے ہوسکتا ہے اس کا ریوڑ چراگاہ میں واقع ہو جائے۔ خبردار، ہر بادشاہ کی کچھ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن سے روکا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی منع کردہ چیزیں اس کی زمین میں اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ خبردار! بیشک جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے جب وہ صحیح ہو تو پورا جسم صحیح ہوتا ہے۔ وہ بیمار ہو تو پورا جسم بیمار ہوتا ہے، خبردار وہ لوتھڑا دل ہے۔

الطبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الصغیر میں روایت کیا ہے حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے پس جو تجھے شک میں مبتلا کرے اس کو چھوڑ دے(2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں حدیث میں مذکور دل کی اصلاح کو صوفیاء کی اصطلاح میں فناء القلب سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ ولایت کا پہلا مرتبہ ہے اور دل کی اصلاح جسم کی اصلاح کے لئے ضروری ہے۔ نیز محرمات کے ارتکاب سے بچنے کے لئے مشتبہات سے اجتناب بھی ولایت کے لئے ضروری ہے، یعنی تقویٰ ولایت کے لئے لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ اِنْ اَوْلِیَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (اس کے متولی تو صرف پرہیزگار لوگ ہیں)۔ اس آیت کریمہ "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" میں تقویٰ کی جانب مشرف کو مجازاً متقی کہا گیا ہے جیسے مَنْ قَتَلَ قَتِيْلًا میں ہے، کہ جو قتل کیا جائے گا اسے پہلے ہی قتیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ

"وہ جو ایمان لائے ہیں[1] غیب پر[2] اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز[3] اور اس سے جو ہم نے انہیں روزی دی خرچ کرتے ہیں[4]"

[1] اگر تقویٰ کی تفسیر شرک سے اجتناب کرنا سے کی جائے تو یہ متقین کی صفت مقیدہ ہوگی ورنہ صفت موضحہ ہوگی جو اعمال کے اصول پر مشتمل ہے۔ مثلاً ایمان جس پر تمام اعمال کا دارومدار ہے، نماز جو دین کا ستون ہے، زکوٰۃ جو اسلام کا پل ہے، یا یہ صفت مادحہ ہے۔ یا یہ مبتداء ہے اور اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى اس کی خبر ہے۔

قراءت: ابوجعفر، ابوعمرو اور ورش نے یومنون میں ہمزہ کی جگہ واؤ کو پڑھا ہے۔ اسی طرح ابوجعفر ہر ساکن ہمزہ کو ضمہ کے بعد واؤ سے اور کسرہ کے بعد یاء سے بدل دیتے ہیں۔ مگر اَنْبِئْهُمْ، نَبِّئْهُمْ اور نَبِّئْنَا میں ہمزہ کو یاء سے نہیں بدلتے۔ ابوعمرو ہر ساکن ہمزہ کو ماقبل کے اعتبار سے یاء اور واؤ سے بدلتے ہیں مگر جب ہمزہ جزم کی وجہ سے ساکن ہو یا اس میں ایک لغت سے دوسری لغت کی طرف خروج ہو تو پھر ہمزہ کو نہیں بدلتے جیسے مُؤْصَدَةٌ وَرِءْيًا۔ اور ورش ہر ساکن ہمزہ کو واؤ، اور یاء سے بدلتے ہیں جو فعل کے فاء کلمہ میں ہو۔ مگر

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 28 (قدیمی)   2۔ کذا فی صحیح البخاری، جلد 1 صفحہ 275 (ملخصاً) (وزارت تعلیم)

تَوْرِی اور تَوْبِہ میں نہیں بدلتے۔ اور فعل کے عین کلمہ میں ہمزہ ہوتو اسے بھی بدلتے ہیں مگر جس فعل کا تعلق رُؤْیا مصدر سے ہو اور فِعِلٌ کے وزن پر عین کلمہ مکسور سے ہوتو اسکے ہمزہ کو نہیں بدلتے۔

الایمان:۔لغت میں ایمان تصدیق کرنے کو کہتے ہیں جیسے ارشاد ہے وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا۔ (اور آپ نہ مانیں گے ہماری بات) اور تصدیق زبان اور دل دونوں سے ہوتی ہے اور شریعت میں ایمان دل اور زبان سے ہر اس چیز کی تصدیق کرنے کو کہتے ہیں جو حضور نبی کریم ﷺ لیکر آئے اور اس کا ثبوت قطعی ہو اور اکراہ کی حالت کے سوا زبان کی تصدیق کے بغیر صرف قلبی تصدیق کا اعتبار نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ (اور انہوں نے انکار کر دیا ان کا حالانکہ یقین کر لیا تھا ان کی صداقت کا ان کے دلوں نے) نیز فرمایا:۔ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (وہ پہچانتے ہیں انہیں جیسے وہ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو) حالت اکراہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ (بجز اس شخص کے جسے مجبور کیا گیا اور اس کا دل مطمئن ہے ایمان کے ساتھ)۔ اسی طرح صرف تصدیق باللسان تصدیق بالقلب کے بغیر معتبر نہیں۔ جیسے منافقین کے ذکر میں فرمایا: وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں)۔

اعمال ایمان میں داخل نہیں ہیں اسی وجہ سے یقیمون الصلوۃ کا یؤمنون پر عطف صحیح ہے، اسی طرح امنوا پر وعملوا الصالحت کا عطف بھی صحیح ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، کہ ایک دن ہم بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضر تھے اچانک ایک شخص نمودار ہوا جس کا لباس انتہائی سفید، بال کالے سیاہ تھے، اس پر سفر کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا تھا ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا نہ تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے قریب دوزانو ہو کر، رانوں پر ہاتھ رکھ کر پورے ادب سے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پوچھا یا محمد مجھے اسلام کے بارے بتایئے آپ ﷺ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم محمد ﷺ کی گواہی دے، نماز قائم کرے، زکوۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے اور اگر استطاعت ہو تو حج کرے۔ اس شخص نے کہا آپ ﷺ نے صحیح فرمایا ہے، ہم اس پر متعجب ہوئے کہ خود سوال کرتا ہے اور خود ہی تصدیق کرتا ہے۔ پھر اس نے کہا حضور ﷺ مجھے ایمان کے متعلق بتایئے۔ فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، قیامت کے دن پر ایمان لائے اور ہر خیر و شر کو اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے وابستہ جانے۔ اس شخص نے کہا آپ ﷺ نے سچ فرمایا۔ پھر اس نے کہا حضور ﷺ مجھے احسان کے بارے بتلایئے آپ ﷺ نے فرمایا تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کیفیت میں کرو کہ گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم یہ کیفیت اختیار نہ کر سکو تو یہ خیال کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ پھر اس شخص نے کہا مجھے قیامت کے بارے میں بتایئے آپ ﷺ نے فرمایا اس کے متعلق جواب دینے والا سوال کرنے والے سے زیادہ جاننے والا نہیں ہے۔ پھر اس شخص نے کہا مجھے قیامت کی علامات بتایئے آپ ﷺ نے فرمایا جب باندیاں اپنے آقا جنیں گی اور تم دیکھو کہ ننگے بدن، ننگے پاؤں، تنگ دست چرواہے بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگیں گے۔ حضرت عمر فرماتے ہیں پھر وہ شخص چلا گیا۔ میں تھوڑی دیر ٹھہرا رہا تو آپ ﷺ نے فرمایا اے عمر اس سائل کو جانتے ہو؟ میں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا یہ جبرئیل تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے(1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی حدیث کچھ اختلاف کے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 27

ساتھ مروی ہے، اس میں ہے کہ جب تم دیکھو کہ ننگے بدن، ننگے پاؤں، گونگے، بہرے زمین کے بادشاہ بن گئے ہیں اور قیامت کا علم غیوبات خمسہ سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۔الخ۔(1) متفق علیہ۔

یہ حدیث پاک دلیل ہے کہ اسلام اعمال ظاہرہ کا نام ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا (اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ فرمایئے تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت اختیار کر لی ہے)۔

کبھی اسلام کا اطلاق ایمان پر بھی کیا جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (اور یاد کرو) فرمایا اس کو اس کے رب نے (اے ابراہیم) گردن جھکا دو۔ عرض کی میں نے اپنی گردن جھکا دی سارے جہانوں کے پروردگار کے سامنے)۔ یہ اصطلاح شرع میں دونوں معانی میں مشترک ہے۔

2۔ الغیب:۔ مصدر ہے جو مبالغہ کے لئے بطور صفت ذکر کیا گیا ہے جیسے الشہادۃ مصدر بطور صفت استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ اور غیب سے مراد ہر وہ چیز ہے جو لوگوں کی نظروں سے غائب ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات، ملائکہ، قیامت، جنت، دوزخ، صراط، میزان، عذاب قبر وغیرہ۔

یہ ترکیب نحوی میں یؤمنون کا مفعول بہ ہے اور باء اس کے متعلق ہے، یا بالغیب فاعل کے معنی میں ہے جو یؤمنون کے فاعل سے حال ہے، یعنی یُؤْمِنُوْنَ غَائِبِیْنَ عَنْكُمْ یعنی تم سے غائب ہونے کی حالت میں بھی تصدیق کرتے ہیں، منافقین کی طرح نہیں کہ مومنوں کی موجودگی میں ایمان کا اظہار اور علیحدگی میں تکذیب کرتے ہیں۔ یا غیب سے مراد مُؤمَنٌ بِهٖ ہے یعنی جس پر ایمان لایا جاتا ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت محمد ﷺ کا معاملہ اس شخص کے لئے واضح تھا جس نے آپ کو ظاہر نظروں سے دیکھا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، کسی کا ایمان افضل نہیں اس سے جو بن دیکھے ایمان لایا پھر یہ آیت پڑھی الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ الی قولہ الْمُفْلِحُوْنَ۔(2)

3۔ یعنی جو نماز کی حدود، شرائط، ارکان، اس کی ظاہری صفات یعنی سنن و آداب، باطنی صفات خشوع اور توجہ کی پابندی کرتے ہیں۔ یہ اَقَامَ الْعُوْدَ سے مشتق ہے، جس کا مطلب ہے لکڑی کو بالکل سیدھا کرنا، یا اس کا مطلب ہے وہ اپنی نماز کو ہمیشہ قائم کرتے ہیں۔ اس وقت یہ قَامَتِ السُّوْقُ سے مشتق ہوگا جس کا مطلب ہے "بازار گرم ہے، بازار بارونق ہے" تو نماز کو قائم اس وقت کرے گا جب تو اس کو آداب و سنن اور خشوع و خضوع کے ساتھ بارونق بنائے گا۔

الصلوٰۃ: اس کا اصل معنی دعاء ہے۔ نماز کو صلوٰۃ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بھی دعا ہوتی ہے۔

قرأت: ورش صاد، طاء، ظاء کے بعد لام کو پُر پڑھتے ہیں۔ جب یہ فتحہ کے ساتھ متحرک ہو جیسے اَلصَّلٰوةُ، مُصَلًّى، اَظْلَمَ، اَلطَّلَاقُ، مُعَطَّلَةٌ وَبَطَلَ وغیرہ۔ باقی قراء سوائے اسم جلالۃ اللّٰه کے لام کو باریک پڑھتے ہیں۔ جب اس کا ماقبل مفتوح یا مضموم ہو تو تمام پُر پڑھتے ہیں۔

4۔ رزق کا لغوی معنی حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (اس کی بے پایاں برکتوں سے) تم نے یہی نصیب بنالیا ہے کہ تم اس کو جھٹلاتے رہو گے)۔ اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس سے حیوان نفع اٹھاتا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 29 (قدیمی) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 60 (العلمیہ)

الانفاق: اس کا اصل معنی قبضہ اور ملکیت سے نکالنا ہے، اسی سے نِفَاقُ السُّوْقِ ہے کیونکہ بازار سے سامان نکلتا ہے، یہاں مراد نیکی کے راستہ میں مال خرچ کرنا ہے۔

یہ آیت کریمہ مشرکین عرب میں سے جو لوگ ایمان لائے تھے ان کے حق میں نازل ہوئی۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

"اور وہ جو ایمان لائے ہیں اس پر (اے حبیب ﷺ) جو اتارا گیا ہے آپ ﷺ پر اور جو اتارا گیا آپ ﷺ سے پہلے[1] اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں [2]"

[1] بِمَآ اُنْزِلَ سے مراد قرآن کریم اور وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ سے مراد تورات، انجیل اور وہ تمام کتابیں اور صحیفے ہیں جو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام پر نازل کئے گئے تھے اور اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ سے مراد اہل کتاب ہیں جو قرآن کریم اور پہلی تمام کتب پر ایمان لائے تھے۔ ابن جریر نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی قول نقل کیا ہے، اس صورت میں یہ دونوں آیات متقین کی تفصیل ہوں گی۔ یا اس سے مراد وہی پہلے لوگ ہیں جو اس ایمان کے حامل ہیں جو عقل سے ثابت ہے اور شریعتوں میں آیا ہے اور اس ایمان سے بھی متصف ہیں جس کا ادراک صرف نقل اور سماع پر منحصر ہے۔ اور یہ عطف ایسے ہے جیسے اس شعر میں ہے: اِلَى الْمَلِكِ الْقَرْمِ وَابْنِ الْهُمَامِ وَلَيْثِ الْكَتِيْبَةِ فِي الْمُزْدَحَمِ...... یعنی تغایر بالصفات کو تغایر بالذات کے قائم مقام کر دیا۔ یا یہ عَطْفُ الْخَاصِ عَلَى الْعَامِّ کے قبیل سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا (اترتے ہیں فرشتے اور روح (القدس) اس میں) اور عام پر خاص کا عطف عظمت شان کے اظہار کے لئے ہوتا ہے۔

شیخین نے ابو موسیٰ الاشعری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں کے لئے دوہرا اجر ہے۔ ان میں ایک وہ جو اہل کتاب میں سے اپنے نبی پر بھی ایمان لایا اور محمد ﷺ پر بھی ایمان لایا۔(1)

انزال:۔ انزال کا مطلب بلندی سے نیچے کی طرف کسی چیز کا منتقل کرنا ہے۔ (انزال کے لفظ کا اطلاق معانی پر نہیں ہو سکتا کیونکہ انزال جسم کا خاصہ ہے اور معانی کا جسم نہیں ہوتا) لیکن ان ذوات کے واسطہ سے معانی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو ان معانی کو منتقل کر کے لاتی ہیں جیسے جبرئیل۔ یا رتبہ میں علو اور سفل مراد لیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے علم سے انسان کے علم کی طرف اتارا گیا۔

قرأت: ابو جعفر، ابن کثیر، یعقوب اور السوسی ہر مد کو جو دو کلموں کے درمیان واقع ہو اس کو چھوٹا کرتے ہیں، قالون اور الدوری مد اور قصر دونوں طرح پڑھتے ہیں اسی وجہ سے اس مد کو مد منفصل جائز کہتے ہیں بخلاف مد متصل کے جو ایک کلمہ میں واقع ہوتی ہے جیسے السمآء اسی مد پر تمام قراء کا اتفاق ہے اور اس کو مد واجب کہتے ہیں لیکن قراء کا مد متصل اور منفصل کی مقدار میں اختلاف ہے۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور قالون تین حرکات کی مقدار پر لمبا کرتے ہیں۔ ابن عامر، الکسائی چار حرکات کی مقدار پر، عاصم پانچ حرکات کی مقدار پر، ورش اور حمزہ چھ حرکات کی مقدار پر لمبا کرتے ہیں۔ یہ حکم اس مد کے بارے ہے جس کے بعد ہمزہ ہو۔ مگر جس کے بعد حرف ساکن ہو جیسے وَلَا الضَّآلِّيْنَ اور الٓمّٓ تو تمام قراء کا اتفاق ہے کہ چھ حرکات کی مقدار لمبا کیا جائے، اس کو مد لازم کہتے ہیں لیکن جب ساکن وقف کے عارض کی وجہ سے ہو تو قاری کو اختیار ہے چاہے دو حرکات کی مقدار یا چار حرکات کی مقدار یا چھ حرکات کی مقدار لمبا کرے، اس پر بھی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 422 (روایت بالمعنی) (وزارت تعلیم)۔

تمام قراء کا اتفاق ہے۔ اور جہاں اصل میں ساکن مضموم ہو جیسے تَسْتَوِيْنَ تو سات (۱) حرکات کی مقدار لمبا کرتے ہیں۔

۲ یعنی دار آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ دنیا کو اس کے قرب کی وجہ سے دنیا کہتے ہیں اور آخرت کو اس کے تأخر کی وجہ سے آخرت کہتے ہیں۔ یہ اصل میں صفت کے صیغے ہیں، مگر ان پر اسمیت غالب آ گئی ہے، اس لئے اب یہ دونوں اسم بن گئے ہیں۔

ایقان سے مراد وہ علم کی پختگی ہے جس میں نظر و فکر اور استدلال کے ذریعے شک و شبہ کی نفی کی گئی ہو۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو موقن نہیں کہا جاتا (کیونکہ موقن وہ ہوگا جو یقین کے لئے استدلال کے ذریعے شکوک و شبہات کو دور کرے اور اللہ تعالیٰ اس کمزوری سے پاک ہے)۔

قرأت: ورش نے بالاٰخرۃ کو ہمزہ کی حرکت لام کی طرف نقل کرنے اور ہمزہ کو حذف کرنے کے ساتھ پڑھا ہے اور ہر جگہ اسی طرح کرتے ہیں جہاں ہمزہ کلمہ کی ابتداء میں واقع ہو اور اس سے پہلے والے کلمہ کے آخر میں حرف ساکن غیر مد ولین ہو۔ یعنی ہمزہ کی حرکت نقل کر کے ماقبل کو دیتے ہیں اور ہمزہ کو حذف کر دیتے ہیں خواہ پہلا ساکن نون تنوین ہو یا لام تعریف ہو یا کوئی اور لفظ جیسے مِنْ شَیْءٍ اِذْ کَانُوْا، مُبِیْنٌ انُ اعْبُدُوا، کُفُوًا اَحَدٌ، وبالاخرۃ، الارض، الاولی۔ اصحاب یعقوب نے ورش سے کِتٰبِیَہْ اِنِّیْ ظَنَنْتُ کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ روایت کیا ہے اور قراء نے آلئٰنَ میں دونوں جگہ پر اور عَادَنِ الْاُوْلٰی میں اختلاف کیا ہے، پھر ورش اس مد میں قصر، متوسط اور طویل مد کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر مد میں تینوں صورتوں کو جائز کرتے ہیں جو ہمزہ کے بعد واقع ہو خواہ ہمزہ ثابتہ ہو جیسے آمن، اُوْحِیَ اور اِیْمَانًا خواہ ہمزہ حرکت نقل کرنے کے بعد محذوفہ ہو جیسے بالاخرۃ، وقل اُوْحِیَ، ومَنْ اٰمن خواہ ہمزہ تبدیل شدہ ہو جیسے هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً۔ ورش هؤلاء اٰلِهة ہمزہ کے ابدال اور مد کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یا ہمزہ مسہلہ ہو جیسے جَآءَ اٰلَ، اِلا یاء اسرآئیل مگر بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ کیا ہے اس میں تین مدات سے اجتناب کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ بعض قراء ورش کی طرح ہمزہ ثابتہ کے علاوہ میں مد نہیں کرتے۔ حمزہ نے خلف کی روایت سے لام پر سکتہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح ہر ساکن غیر مدہ پر جو آخر کلمہ میں واقع ہو اور اس کے بعد ہمزہ ہو تو اس پر سانس کو کاٹے بغیر لطیف سا سکتہ کیا جاتا ہے، جیسے مَنْ اٰمَنَ، وَهَلْ اَتٰکَ، وَعَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ، ابْنَیْ اٰدَمَ، وَخَلَوْا اِلٰی شَيٰطِيْنِهِمْ، الْاٰخِرَةُ، الْاَرْضِ اور حمزہ سے لام تعریف، شَیْءٌ اور شَيْئًا پر سکتہ مروی ہے، کسی اور جگہ نہیں۔

یہاں ہم ضمیر کو حصر کے لئے مقدم کیا گیا ہے، یعنی صرف یہی لوگ ہی آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اہل کتاب آخرت پر ایمان نہیں رکھتے کیونکہ ان کا عقیدہ واقع کے مطابق نہیں ہے، جیسا کہ وہ اپنے خیال فاسد سے کہتے تھے لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی۔ اسی طرح ان کے دوسرے بھی چند غلط قسم کے اقوال و خیالات تھے۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

"وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب (کی توفیق) سے ۱ اور وہی دونوں جہان میں کامیاب ہیں ۲"

۱ اگر ایک اسم موصول کو متقین سے جدا کیا جائے تو یہ جملہ محل رفع میں ہوگا گویا صفات مذکورہ سے متصل احکام کا یہ نتیجہ ہے اور اسم اشارہ کے ذکر میں یہ حکمت ہے کہ گویا موصوف کو اپنی تمام صفات کے ساتھ دوبارہ ذکر کیا گیا ہے، اس آیت میں یہ بھی تنبیہ ہے کہ مذکورہ

(۱) مضموم اور غیر مضموم کا قراء کے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے۔

صفات اس کامیابی وکامرانی کا موجب ہیں۔ اور یہاں "علی" کے کلمہ کے ذکر میں یہ اشارہ ہے کہ وہ ہدایت پر متمکن اور پوری طرح غالب ہیں۔ ھدی کو نکرہ ذکر کیا تاکہ ہدایت کی عظمت اور بلندی ظاہر ہو اور پھر اس عظمت کو مزید مؤکد فرمایا کہ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی توفیق اور عطا سے ہے۔

۲۔ فلح اور ہر وہ لفظ جس کا فاء اور عین کلمہ اس جیسا ہو جیسے فلق، فلی، فلد پھٹنے اور کاٹنے کے معنی پر دلالت کرتا ہے، گویا مفلح دوسرے سے جدا ہو گیا اور ان کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہو گیا۔ یا اس کا یہ مطلب ہے کہ دنیا و آخرت میں ان کی کامیابی یقینی اور قطعی ہے۔ اسم اشارہ "اولئک" کا تکرار اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے ہے کہ ان کا ان صفات مذکورہ سے متصف ہونا دونوں اثروں (ہدایت یافتہ ہونا اور کامیابی حاصل کرنا) میں سے ہر ایک کا مقتضی ہے، اور دونوں جملوں کے درمیان حرف عطف کا ذکر ان کے مفہوم کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے بخلاف، اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (الاعراف:179)۔ ترجمہ: وہ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ یہی لوگ تو غافل (و بے خبر) ہیں۔ (یہاں دونوں جملوں کے درمیان حرف عطف ذکر نہیں کیا کیونکہ ان کے درمیان مفہوم کے اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں ہے)۔

ھم ضمیر ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کا مابعد صفت نہیں خبر ہے۔ یہ مبتدا اور خبر کے درمیان کی نسبت کو مؤکد کرتی ہے اور خبر کو مبتدا کے ساتھ خاص کرنے کا فائدہ دیتی ہے۔ یا یہ ضمیر "ھم" مبتدا ہے اور المفلحون خبر ہے پھر جملہ اولئک کی خبر ہے۔

معتزلہ نے اس آیت سے دلیل پکڑی ہے کہ کلام میں حصر اور تخصیص گناہ کبیرہ کے مرتکب کے دائمی دوزخی ہونے پر دلالت کرتی ہے مگر ان کا رد اس طرح کیا گیا ہے کہ یہاں فلاح سے کامل فلاح مراد ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جن کے پاس فلاح کامل نہیں وہ ان کی مثل نہیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے پاس مطلقاً فلاح ہی نہیں ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس کے ذکر کے ضمن میں اپنے فرمانبردار اور اطاعت شعار بندوں کا ذکر کیا۔ یا مستقلاً ان کا ذکر کیا ہے (جب اسم موصول کو متقین سے جدا کیا جائے) تو اب سرکش اور نافرمانوں کا ذکر شروع کیا جا رہا ہے۔ سیاق کے اختلاف کے سبب درمیان میں حرف عطف ذکر نہیں فرمایا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۶

"بے شک جنہوں نے کفر اختیار کر لیا[۱] ہے یکساں ہے[۲] ان کے لئے چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں[۳] وہ ایمان نہیں لائیں گے[۴]"

۱۔ لغت میں کفر نعمت کے چھپانے کو کہتے ہیں اور شریعت میں ایمان کی ضد اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کو چھپانے کو کہتے ہیں۔

۲۔ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ یہ جملہ اِنَّ کی خبر ہے۔ سواء اسم ہے جو استواء کے معنی میں ہے بطور صفت استعمال ہوا ہے جیسے مصادر کو نعت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کا مابعد فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے گویا عبارت یوں ہے مُسْتَوٍ عَلَيْهِمْ اِنْذَارُكَ وَعَدَمُهٗ۔

یا سواءٌ خبر ہے اور اس کا مابعد مبتدا ہے اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا ان پر برابر ہے، اور یہاں فعل کو مبتدا بنایا گیا ہے مجازاً اپنے ضمنی معنی کی وجہ سے جو الحدث ہے، مصدر کی جگہ فعل کی طرف عدول تجدد اور حدوث پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔

؂ ءانذرتهم میں ہمزہ معنی استفہام سے خالی ہے بصرف استواء کے معنی کی تاکید اور تقریر کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

انذار کا مطلب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانا ہے۔ یہاں صرف انذار پر اکتفا کیا گیا ہے (تبشیر کا ذکر نہیں کیا) کیونکہ نقصان کا دور کرنا، فائدہ کے حصول سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

قرأت: ورش نے دوسرے ہمزہ کو الف سے بدل کر پڑھا ہے۔ قالون، ابن کثیر اور ابوعمرو دوسرے ہمزہ میں بین بین تسہیل کرتے ہیں لیکن قالون تسہیل کے ساتھ دونوں ہمزوں کے درمیان الف کو بھی داخل کرتے ہیں۔ ہشام بغیر تسہیل کے درمیان میں الف داخل کرتے ہیں اور باقی قراء الف داخل کرنے کے بغیر دونوں ہمزوں کو ثابت رکھتے ہیں۔ ہر وہ جگہ جہاں دو مفتوح ہمزے ایک کلمہ میں جمع ہوں تو یہی اختلاف ہے۔ اقتصیر میں ہشام کا مذہب قالون کے مطابق ذکر کیا گیا ہے۔

اگر دونوں ہمزے ایک کلمہ میں ہوں مگر اعراب میں فتحہ اور کسرہ کے ساتھ مختلف ہوں جیسے ءاِذَا کُنَّا تُرٰبًا۔ تو جرمی دونوں اور ابوعمرو دوسرے ہمزہ میں تسہیل کرتے ہیں۔ قالون اور ابوعمرو دوسرے ہمزہ سے پہلے الف داخل کرتے ہیں، باقی قراء دونوں ہمزے ثابت رکھتے ہیں۔ ہشام سے درمیان میں الف داخل کرنے کی روایت میں اختلاف ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ مطلقاً دو ہمزوں کے درمیان الف داخل کرتے ہیں اور ایک روایت میں ہے کہ وہ سوائے سات مواقع کے الف داخل نہیں کرتے۔ وہ سات مواقع یہ ہیں أءِ نکم (اعراف اور فصلت) أءِنَّ لَنَا لَاَ جراً (اعراف اور شعراء) أءِ ذَا مَامِتُّ (مریم) أءِ نَکَ وأءِفکاً (الصافات)۔ اور دونوں ہمزے ایک کلمہ میں ہوں اور اعراب میں فتحہ اور ضمہ کے ساتھ مختلف ہوں تو جرمی دونوں اور ابوعمرو دوسرے ہمزہ میں تسہیل کرتے ہیں قالون درمیان میں الف داخل کرتے ہیں۔ ہشام أ أنزل علیه (ص) أ ألقِیَ (القمر) میں قالون کے ساتھ ہیں اور قُلْ أءُ نَبِّئُکم (آل عمران) میں جمہور کے ساتھ ہیں۔ باقی قراء دونوں ہمزوں کو ثابت رکھتے ہیں۔ ان چار مثالوں کے علاوہ اور کوئی مثال نہیں۔

؂ یہ جملہ پہلے جملے جس میں استواء کا ذکر ہے، کی تفسیر ہے۔ ترکیبی لحاظ سے اس کا کوئی محل نہیں ہے، یا حال مؤکدہ ہے یا پہلے جملہ کا بدل ہے، یا اِنَّ کی خبر ہے اور اس سے پہلے والی کلام حکم کی علت کی وجہ سے جملہ معترضہ ہے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

" مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر؂ اور ان کے کانوں پر؂ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے؂ اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے؂ "

؂ مہر لگنے کی وجہ سے ان کے دل نیکی اور بھلائی کو محفوظ نہیں کرتے۔

قلب کا معنی گوشت کا ٹکڑا ہے۔ کبھی اس کا اطلاق معرفت اور عقل پر بھی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لئے جو دل (بینا) رکھتا ہو)۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء خواہ وہ جواہر ہوں یا اعراض تمام کا خالق ہے اور یہ اسباب، اسباب عادیہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان اسباب کے بعد مسببات پیدا فرماتا ہے۔ پس آنکھ، کان اور دوسرے حواس کے استعمال کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ محسوسات کا علم پیدا فرماتا ہے۔ دو مقدموں کی ترتیب میں ذہن کے استعمال کے بعد اللہ تعالیٰ نتیجہ کا علم پیدا فرماتا ہے۔ یہ اس کی عادت کریمہ ہے،

اگر وہ چاہے تو کچھ بھی پیدا نہ فرمائے، حواس کو معطل کر دے اور ذہن کو ناکارہ بنا دے۔ اگر وہ چاہے تو محسوس چیز کا علم حاصل ہو لیکن وہ علم دل میں اثر نہ کرے، یہ بھی اس کی قدرت سے بعید نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام بنی آدم کے دل رحمن کی انگلیوں سے دو انگلیوں کے درمیان ایک دل کی مانند ہیں جس کیفیت پر انہیں چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یوں دعا فرمائی اے اللہ! اے دلوں کو پھیرنے والے! ہمارے دل اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے۔(1)

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے کفار کے دلوں کی طہارت و پاکیزگی کا ارادہ نہ فرمایا تو ان کو آیات میں غور و فکر کر کے روشنی حاصل کرنے سے پھیر دیا اور ان کے دلوں میں آیات و معجزات کو دیکھنے کے بعد ایمان و یقین کی روشنی کو پیدا نہ فرمایا۔ اسی عدم قبولیت کو مجازاً ختم، طبع اغفال، اقساء اور غشاوہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یا ان کے قلوب اور حواس کو ایسی اشیاء سے تشبیہ دی ہے جن پر پردہ پڑا ہوا ہے، یا یہاں ختم سے مراد وہ دلوں کی سیاہی ہے جو گناہوں اور معصیتوں کے ارتکاب کے بعد اللہ تعالیٰ دلوں پر پیدا فرما دیتا ہے۔

امام بغوی حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے، اگر وہ گناہ سے توبہ کرے اور استغفار کرے تو وہ سیاہی دل سے ہٹ جاتی ہے اگر مزید گناہ کرے تو وہ سیاہ نکتہ بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ پورے دل کو گھیر لیتا ہے یہ وہ دین ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے:۔ كَلَّا بَلْ ٜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (نہیں نہیں درحقیقت زنگ چڑھ گیا ہے ان کے دلوں پر ان کرتوتوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے)۔(2)

میں کہتا ہوں اسی قلب کی سیاہی کو فساد قلب سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے حدیث میں گزر چکا ہے، کہ جب یہ قلب کا لوتھڑا خراب ہو تو پورا جسم خراب ہوتا ہے، یہ فساد دل کی صلاح کی ضد ہے۔ جب یہ کیفیت ایک گناہ گار مومن کی ہے تو کافر کا کیا حال ہوگا (جس کے دل میں ایمان کی روشنی کی ایک کرن بھی نہیں ہے) اسی کیفیت کے پیدا ہونے کو طبع، اغفال، اقساء سے تعبیر فرمایا ہے۔ ختم کا لغت میں پہلا معنی چھپانا اور پوشیدہ کرنا ہے، دوسرا معنی مہر لگا کر کسی چیز پر اعتماد کرنا ہے اور تیسرا معنی کسی چیز کے آخر تک پہنچنا ہے کیونکہ کسی چیز کی حفاظت میں آخری فعل مہر لگانا ہوتا ہے اسی لئے اسے ختم سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ یعنی ان کے کانوں پر مہر لگا دی۔ یہاں سمع کو التباس کا اندیشہ نہ ہونے کی وجہ سے مفرد ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سمع اصل میں مصدر ہے اور مصادر کی جمع نہیں ہوتی۔ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ پر اس کا عطف ہے کیونکہ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (اور مہر لگا دی اس کے کانوں اور دل پر اور ڈال دیا ہے اس کی آنکھوں پر پردہ) کان اور دل تمام اطراف اور جہات سے علم حاصل کرتے ہیں اس لئے ان کے روکنے کے لئے ایک ہی جنس یعنی ختم کا ذکر فرمایا۔ بخلاف آنکھ کے کہ وہ سامنے والی سمت کے ساتھ مختص ہے۔ اس لئے اس کو روکنے کے لئے غشاوة (پردہ) ذکر فرمایا جو سامنے والی جہت کے ساتھ خاص ہے۔

۳۔ ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 335 (قدیمی)

2۔ مسند احمد، جلد 2 صفحہ 297، مطبوعہ دار صادر بیروت

ابصار، بصر کی جمع ہے، جس کا مطلب آنکھ کا ادراک ہے اور مجازاً قوت باصرہ (دیکھنے کی قوت) اور دیکھنے والے عضو پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، اسی طرح سمع کا لفظ بھی ان تین معانی میں مستعمل ہوتا ہے۔

قرأت:۔ ابوعمرو اور الدوری نے کسائی سے ہر وہ الف جس کے بعد راء مجرور لفظ کے لام کلمہ میں ہو تو اس میں امالہ روایت کیا ہے جیسے علی ابصارھم خواہ وصل ہو یا وقف، جیسے الدارھم، النار، الغار، بقنطار، بدینار، والابرار۔ ابوالحارث نے ان دونوں قراء کی متابعت کی ہے جہاں راء مکرر ہو جیسے الاضرار، الابرار۔ ورش نے بین بین کیا ہے۔ حمزہ اس کی متابعت کرتے ہیں اس جگہ جہاں راء مکرر ہو، مثلاً القہار کے قول میں، جہاں بھی واقع ہے اور دارالبوار میں جو صرف ایک جگہ آیا ہے۔ ابن ذکوان نے حمارک اور الحمار: جو سورۂ بقرہ اور جمعہ میں آئے ہیں، میں امالہ کیا ہے۔

غشاوۃ:۔ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو گھیرے میں لئے ہوئے ہو۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ مبتدا ہے اور مرفوع ہے یا ظرف کا فاعل ہے۔

ہے ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے، آخرت میں۔

عذاب:۔ اعذب الشیءَ سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے روکنا، کیونکہ سزا مجرم کو دوبارہ جرم کرنے سے روک دیتی ہے اس لئے اسے عذاب کہتے ہیں۔ پھر اس میں وسعت پیدا ہوگئی اور ہر تکلیف کے لئے استعمال ہونے لگا خواہ وہ سزا نہ بھی ہو۔ بعض علماء کے نزدیک تعذیب سے مشتق ہے جس کا معنی ہے کسی اچھائی اور عمدگی کو دور کرنا۔

عظیم:۔ یہ حقیر کی ضد ہے، ہر اس شے کو عظیم کہتے ہیں جس کے مقابلہ میں اس کی جنس کا ہر فرد کوتاہ اور گھٹیا نظر آئے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸

"اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر [1] حالانکہ وہ مومن نہیں [2]"

[1] ابوعمرو سے الناس کے فتحہ کا امالہ مروی ہے جہاں مجرور واقع ہو مگر وصل اور وقف میں ایسا نہیں ہوگا۔

یوم آخر سے مراد قیامت کا دن ہے۔ یہ آیت عبداللہ بن ابی بن سلول، معتب بن قشیر اور جد بن قیس اور ان کے ہمنوا یہودی منافقین کے حق میں نازل ہوئی۔

الناس اصل میں اُناس تھا، ہمزہ کو حذف کر کے اس کے عوض الف لام تعریف کا لگا دیا گیا۔ اسی لئے ہمزہ اور الف لام تعریف جمع نہیں ہوتے۔ اس کی صرفی تحقیق اس طرح ہے کہ الناس، انسان کی جمع ہے۔ بعض کے نزدیک یہ اسم جمع ہے کیونکہ فُعال جمع کا وزن نہیں ہے، اس کا مادۂ اشتقاق انس ہے جس کا معنی محبت کرنا ہے۔ کیونکہ انسان آپس میں محبت کرتے ہیں اس لئے انہیں الناس کہا جاتا ہے، یا یہ آنَسَ سے مشتق ہے جس کا معنی ظاہر ہونا ہے، کیونکہ انسان ظاہر ہوتے ہیں اور نظر آتے ہیں اس لئے انہیں الناس کہتے ہیں۔ جس طرح جنوں کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے انہیں جن کہا جاتا ہے۔ نحوی تحقیق اس طرح ہے کہ الناس پر الف لام جنس کا ہے اور مَن موصوفہ ہے کیونکہ کوئی افراد معینہ مراد نہیں ہیں۔

بعض کے نزدیک الناس پر الف لام عہدی ہے، یعنی وہ کافر مراد ہیں جن کا ذکر الذین کفروا میں گزرا ہے، یا مَنْ موصولہ ہے اور اس سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس جیسے کچھ لوگ ہیں جو ان کفار میں داخل ہو گئے تھے جن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی تھی اور دھوکا جیسی

مزید خباثت کے باعث مخصوص ہو گئے تھے۔ یہاں صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا ذکر فرمایا کیونکہ یہی دو چیزیں ایمان کا مقصود اعظم ہیں۔

۷ؔ وہ ایمان لانے والے نہیں آیت کے اس حصہ میں منافقین کے دعویٰ ایمان کی تردید ہو رہی ہے یہ اصل میں وَمَا اٰمَنُوْا ہونا چاہیے تھا تاکہ ان کے صریح قول آمَنَّا کے ساتھ مطابقت ہو جاتی لیکن یہاں ان کی تردید میں مبالغہ کرنے کے لئے کلام کا اسلوب بدل دیا۔ اس اسلوب کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مومنین کے گروہ سے ہی خارج ہیں۔ کیونکہ زمانہ ماضی میں ان کے ایمان کی نفی کی بنسبت ان کو مومنین کی صف سے ہی خارج کر دینا زیادہ بلیغ ہے اسی تاکید اور اخراج میں مبالغہ کرنے کے لئے باء کے ساتھ نفی کو مؤکد فرمایا۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

"فریب دیا چاہتے ہیں ۱ؔ اللہ کو اور ایمان والوں کو اور (حقیقت میں) نہیں فریب دے رہے مگر اپنے آپ کو ۲ؔ (اور اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے ہیں"

۱ؔ الخدع کا معنی کسی دوسرے کے سامنے اپنے مخفی مکروہ ارادہ کے خلاف کسی چیز کا اظہار کرنا ہے۔ عربوں کا قول ہے خَدَعَ الضَّبُّ (گوہ نے شکاری کو دھوکا دیا) جب وہ اپنے بل میں چھپ جاتی ہے (تو وہ شکاری کو دھوکا دے کر دوسرے سوراخ سے نکل جاتی ہے) اس کا اصل معنی چھپانا ہے۔

ان کا اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کا مطلب اس کے رسول کو دھوکا دینا ہے اور یہاں مضاف محذوف ہے، یعنی اصل میں رسول اللہ تھا۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا رسول مکرم ﷺ کے ساتھ دھوکا آمیز معاملہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، کیونکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور قائم مقام ہیں۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (جس نے اطاعت کی رسول کی تو یقیناً اس نے اطاعت کی اللہ کی)۔ ایک اور جگہ فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (بے شک جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں وہ حقیقت وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے)۔

یہاں يُخٰدِعُوْنَ بمعنی يَخْدَعُوْنَ ہے۔ باب مفاعلہ کا صیغہ مبالغہ کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ مقابلہ کا فعل زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ یا یہ حقیقی معنی میں ہے اس کی صورت یہ ہوگی کہ انہوں نے کفر کو چھپا کر اسلام کو ظاہر کر کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو معاملہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اسلام کے احکام جاری فرمائے حالانکہ وہ کفار سے بھی زیادہ خبیث تھے پھر رسول اللہ ﷺ اور مومنین نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی میں ان کے حالات کو مخفی رکھا اور ان پر تمام اسلامی احکامات جاری فرمائے۔ تو اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ یہ معاملہ بھی ان کے معاملہ جیسا تھا اس لئے مفاعلہ کا صیغہ ذکر فرمایا جو اشتراک کا خاصہ رکھتا ہے۔

نحوی تحقیق:۔ یا تو یہ جملہ یقول کا بیان ہے یا نئی کلام ہے جو مخصوص غرض کے لئے ذکر کی گئی ہے۔

۲ؔ اور نہیں فریب دے رہے۔

قرأت:۔ حرمی قراء اور ابو عمرو نے اسے وَمَا يُخٰدِعُوْنَ پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں اور وہ مومنین کو بھی دھوکہ نہیں دے سکتے

کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں منافقین کی کارستانیوں سے آگاہ فرما دیتا ہے۔ وہ اپنے نفسوں کو اس لئے دھوکہ دے رہے ہیں کیونکہ انہوں نے خیال کر رکھا ہے کہ وہ عذاب اور دائمی رسوائی سے مامون اور محفوظ ہیں (حالانکہ ایسا نہیں) پس اس دھوکا کا وبال ان کے اپنے اوپر پڑے گا کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگڑے گا۔

۲؎ وہ شعور نہیں رکھتے یعنی وہ اپنی غفلت کی انتہا کو پہنچنے کی وجہ سے کچھ احساس نہیں رکھتے۔ حواس کے ذریعے کسی چیز کا ادراک کرنے کو الشعور کہتے ہیں مطلب یہ کہ اس دھوکا کا نقصان بالکل محسوس چیز کی طرح ظاہر اور واضح ہے مگر ان کے حواس ماؤف ہو چکے ہیں، وہ اس کو بھی نہیں سمجھ رہے کہ اس نقصان کا وبال ہمیں ہی پہنچ رہا ہے۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿١٠﴾

"ان کے دلوں میں بیماری ہے ۱؎ پھر بڑھا دی اللہ نے ان کی بیماری ۲؎ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے ۳؎"

۱؎ یہاں مرض سے مراد وہ مرض نہیں جو بدن کو لاحق ہوتی اور اسے اعتدال سے خارج کر دیتی ہے اور کمزور کر کے ہلاکت تک پہنچا دیتی ہے، اور مرض کا اطلاق مجازاً عوارض نفسانیہ پر بھی ہوتا ہے جیسے جہالت، حسد، کفر، بدعقیدگی وغیرہ کیونکہ یہ تمام امراض فضائل و کمالات کے حصول سے مانع ہیں اور ابدی ہلاکت تک پہنچانے والی ہیں۔ وہ ان امراض میں سے انتہائی اخبث مرض میں مبتلا تھے وہ اپنی ریاست و سیاست کا سورج ڈوبتا دیکھ کر اور مومنین کی شان کو بلند ہوتا دیکھ کر انتہائی کرب محسوس کرتے تھے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو سیاہ کرنے اور کانوں اور دلوں پر مہر لگانے اور قرآنی آیات کو نازل فرمانے کے ساتھ ان کے ان امراض خبیثہ کو بڑھاتا ہے۔ یا رسول اللہ ﷺ کی مدد کرنے اور منافقین کو رسوا کرنے کے ساتھ ان کے مرض میں اضافہ فرماتا ہے۔

حمزہ نے زاد کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح جاءَ، شاءَ، رَانَ، خافَ، خابَ، طابَ، حاقَ جہاں بھی آتا ہے، زاغ سورۂ نجم میں زاغُوا (صرف سورۃ الصف میں) کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے خواہ یہ افعال ضمیر کے ساتھ متصل ہوں یا نہ ہوں مگر یہ شرط ہے کہ ثلاثی ہوں اور ماضی ہوں۔ ابن ذکوان نے حمزہ کی اتباع کرتے ہوئے جاء اور شاء جہاں آئے ہیں امالہ سے پڑھا ہے اور صرف اسی جگہ زاد میں امالہ کیا ہے بعض نے فرمایا ہے کہ ہر جگہ امالہ کیا ہے۔

۳؎ الیم کو مبالغہ پیدا کرنے کے لئے عذاب کی صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

ما مصدریہ ہے، یکذبون کو کوفیوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی وہ اپنے قول امنا میں جھوٹے ہونے کی وجہ سے دردناک عذاب کے مستحق ہیں۔ اور باقی قراء نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی علیحدگی میں رسول کریم کو جھٹلانے کی وجہ سے دردناک عذاب کے حقدار ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿١١﴾

"اور جب کہا جائے انہیں کہ مت فساد پھیلاؤ زمین میں ۱؎ تو کہتے ہیں ہم ہی تو سنوارنے والے ہیں ۲؎"

۱؎ فساد، صلاح کی ضد ہے، فساد ہر نقصان اور صلاح ہر فائدہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ منافقین کا زمین میں فساد یہ تھا کہ وہ

مسلمانوں کو دھوکا دے کر جنگ کی آگ بھڑکاتے، کفار پر مسلمانوں کے راز افشاء کرتے، لوگوں کو محمد ﷺ اور قرآن پر ایمان لانے سے منع کرتے۔

قرأت: ۔الکسائی اور ہشام نے قِیْلَ، غِیْضَ، جِیْءَ، حِیْلَ، سِیْقَ، سِیْئَتْ، سِیْءَ کو اشمام کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر نے آخری چار میں ان کی موافقت کی ہے۔ نافع نے آخری دو میں موافقت کی ہے یہاں اشمام سے مراد فاء کلمہ کے کسرہ کو ضمہ کی طرف اور یاء کو واؤ کی طرف جھکانا ہے۔ بعض فرماتے ہیں فاء کے ضمہ کو اشباع کے ساتھ پڑھنا ہے اور بعض فرماتے ہیں اختلاس کے ساتھ پڑھنا ہے۔ بعض فرماتے ہیں: اشمام کا مطلب یہ ہے کہ دونوں ہونٹوں کے ساتھ کسرہ کے اظہار کے باوجود ضمہ مقدرہ کی طرف اشارہ کرنا ہے، مگر پہلی تعریف اصح ہے، باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

ے (جب منافقین کو ان کی کارستانیوں اور سازشوں پر تنبیہ کی جاتی تو وہ کہتے ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں) حالانکہ وہ جھوٹے تھے۔ انما کا کلمہ حصر کے لئے آتا ہے یعنی جس چیز پر داخل ہوتا ہے اس کو دوسری چیز کے ساتھ خاص کر دیتا ہے، تو وہ اس جملہ سے ناصحین کا زوردار انداز میں رد کرتے کہ ہم بھی تو خالص اصلاح کرنے والے لوگ ہیں یا وہ اپنے درمیان فساد کو اصلاح تصور کرتے تھے (کیونکہ ان کے دل مردہ ہو چکے تھے آنکھوں پر حسد و عناد کی پٹی بندھی ہوئی تھی) تو وہ برائی کو بھی خوبی اور اچھائی سمجھتے تھے۔

أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ﴿١٢﴾

"ہوشیار! وہی فسادی ہیں لیکن سمجھتے نہیں ے"

ے وہ جو بزبان خود میاں مٹھو بنتے تھے اور اپنے مصلح ہونے کا بلند بانگ دعویٰ کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعویٰ کو بلیغ ترین اسلوب سے رد کیا ہے، اور انہوں نے اپنے انداز کلام میں مومنین پر فسادی ہونے کا اشارہ کیا تھا اس کی بھی اللہ تعالیٰ نے نفی فرما دی ہے، وجوہ بلاغت یہ ہیں:۔

ابتداء میں حرف تنبیہ الا ذکر فرمایا جو تحقیق اور ثبوت کا فائدہ دیتا ہے، إنَّ کا کلمہ ذکر فرمایا یہ تحقیق اور تاکید کے لئے آتا ہے۔ خبر کو معرفہ ذکر فرما کر مبتدا اور خبر کے درمیان ضمیر فصل ذکر فرما دی جو خبر کو مبتدا کے ساتھ خاص کرنے کا فائدہ دیتی ہے، اور لَا يَشْعُرُوْنَ کے ساتھ احساس کی نفی فرما کر ان کے تمام دعاوی کا رد فرما دیا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾

"اور جب کہا جائے انہیں ایمان لاؤ جیسے ایمان لائے اور لوگ ے تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بیوقوف ے خبردار بے شک وہی احمق ہیں ے مگر وہ جانتے نہیں ے"

ے یعنی جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ تم مہاجرین و انصار کی طرح ایمان لاؤ یا یہود میں سے جو لوگ سچے دل سے مشرف باسلام ہوئے ہیں ان کی طرح ایمان (۱) لاؤ جیسے عبداللہ بن سلام (تو وہ کہتے ہیں ہم ان نادانوں جیسا ایمان نہیں لاتے) یہ جملہ بھی سابقہ نصیحت کا حصہ

(۱) ابن عباس سے مروی ہے۔ جیسا کہ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم ایمان لائے ہیں۔

ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم ان لوگوں کی طرح ایمان لاؤ جو انسانیت کے درجۂ کمال پر فائز تھے۔ الناس پر الف لام مہاجرین وانصار کے ہر ہر فرد کے انسان کامل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ انسانیت کا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے فساد و شر انگیزی سے اجتناب کرے اور ایمان کے تمام تقاضے کامل طور پر ادا کرے۔ كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ مصدریت کی بناء پر محل نصب میں ہے (یعنی ک مثل کے معنی میں ہے اور مصدر محذوف کی صفت ہے عبارت یوں ہوگی "اٰمِنُوْٓا اِيْمَانًا مِثْلَ اِيْمَانِ النَّاسِ" ما مصدریہ ہے یا کافہ ہے جیسے رُبَّمَا میں ہوتا ہے۔

[2] السفہ، خفت عقل کو کہتے ہیں اور اس کی ضد حلم ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں سفیہ وہ ہے جو جان بوجھ کر جھوٹ بولے۔ وہ منافق مسلمانوں کو، ان کی تحقیر شان کے لئے بیوقوف کہتے تھے یا اپنی فاسد رائے اور غلط خیال کی وجہ سے انہیں بیوقوف کہتے تھے۔

[3] یعنی جنہوں نے معجزات کو عیاں دیکھا تھا، تورات میں نبی آخر الزمان ﷺ کی نشانیاں پڑھ چکے تھے لیکن پھر بھی اپنی عقل کو ہدایت اور قبول اسلام کے لئے استعمال نہ کیا اور عظیم معجزات کو دیکھنے کے باوجود بھی رسول مکرم ﷺ کا انکار کیا (تو یہ قرائن ان لوگوں کے احمق ہونے پر واضح ثبوت ہیں) یہ نادان آگ کے عذاب پر کتنا صبر کرنے والے ہیں۔ اس حصہ آیہ میں بھی سابقہ جملہ کی طرح بھرپور اور زوردار انداز میں انکار کیا گیا ہے۔

قرأت: دونوں حرمی قراء اور ابو عمرو نے السفہاء الآ میں دوسرے ہمزہ کو تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح ہر اس جگہ جہاں دو کلموں میں ہمزے اکٹھے ہوں اور ان کی حرکات مختلف ہوں تو تسہیل سے پڑھتے ہیں جیسے مِنَ السَّمَآءِ اَوْ مِمَّا، شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ، مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ، جَآءَ اُمَّةً۔

تسہیل کا حکم

ہمزہ کو اس کے مخرج اور اس حرف کے مخرج کے درمیان تلفظ کرنا جس کے مناسب ہمزہ کی حرکت ہے۔ مگر یہ حکم اس صورت میں ہے جب ہمزہ کا ما قبل مفتوح، مکسور یا مضموم نہ ہو کیونکہ ما قبل کسرہ ہو تو ہمزہ یاء مفتوحہ سے اور ما قبل ضمہ ہو تو واؤ مفتوحہ سے اور ہمزہ مکسور ہو اور اس کا ما قبل مضموم ہو تو واؤ مکسورہ سے بدل جاتا ہے۔ باقی قراء دونوں ہمزوں کو باقی رکھتے ہیں۔

[4] یہاں اللہ تعالیٰ نے لَا يَعْلَمُوْنَ فرمایا جبکہ اس سے پہلی آیت میں لَا يَشْعُرُوْنَ فرمایا ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ امور دین کو سمجھنے کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے (اور ان کے پاس تو غور و فکر کی صلاحیت کا عنصر یعنی علم ہی نہیں ہے یعنی جب علم ہی نہیں ہے تو دین میں غور و خوض کر کے اس کی حقیقت اور اس کی سرمدی برکات تک کیسے پہنچیں گے)۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

"اور جب ملتے ہیں ایمان والوں سے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں [1] اور جب اکیلے ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس [2] تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں [3] ہم تو صرف (ان کا) مذاق اڑا رہے تھے [4]"

[1] منافقین کا جو مومنین اور کفار کے ساتھ معاملہ تھا اس کا اظہار ہو رہا ہے کہ جب مسلمانوں سے ملتے تو کہتے ہم بالکل تمہارے ایمان کی طرح ایمان رکھتے ہیں۔ جس بات سے منافقین کے قصہ کو شروع کیا گیا تھا اب اس کا بیان ہو رہا ہے اور ان کے حقیقی مذہب اور نفاق کی تمہید کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔

سے خَلَوْا یہ خلوت بفلان اور خلوت الیہ سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے میں نے دوسرے کے ساتھ خلوت کی، علیحدگی اختیار کی۔ یا یہ خَلَاکَ ذَمٌّ سے مشتق ہے جس کا مطلب گزرنا تجاوز کرنا ہے، اسی سے قرون خالیہ (گزشتہ صدیاں) ہے۔ یہاں شیاطین سے مراد ان کے رؤسا ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ پانچ آدمی تھے جن کا تعلق یہود سے تھا: 1۔ کعب بن اشرف مدینہ میں، 2۔ ابو بردہ بنو سلم میں، 3۔ عبدالدار جہینہ میں، 4۔ عوف بن عامر بنو اسد میں، 5۔ عبداللہ بن سوداء شام میں۔

شیطان انسانوں اور جنوں میں سے نافرمان اور سرکش کو کہتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔ ایک اور جگہ فرمایا مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ یا یہاں کاہن مراد ہیں کیونکہ ہر کاہن کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے جو اس کی اتباع کرتا ہے۔

الشیطان:۔ شطن سے مشتق ہے جس کا مطلب دور ہونا ہے، جیسے کہا جاتا ہے بِئْرٌ شَطُوْنٌ (انتہائی گہرا کنواں) شیطان کا نام اس لئے دیا کیونکہ وہ شر میں مگن ہوتا ہے اور بھلائی سے بہت دور ہوتا ہے۔ یا یہ شَاطَ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے بطل، شیطان کے اسماء میں سے ایک اسم الباطل بھی ہے۔ اس اشتقاق کے تسلیم کرنے کی صورت میں نون زائدہ ہوگا۔

سے جب اپنے سرداروں سے ملتے تو کہتے: دین اور اعتقاد میں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ کفار سے اظہار عقیدت کے لئے انہوں نے جملہ اسمیہ استعمال کیا جو اِنَّ سے مؤکد بھی ہے، یہ دلیل ہے کہ وہ کفر پر مستحکم تھے۔

سے یہ ماقبل کلام کی تاکید ہے، کیونکہ مُسْتَهْزِءٌ بِالشَّيْءِ سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو کسی چیز کو حقیر سمجھتا ہے اور اس کی مخالف چیز پر مصر ہوتا ہے، یا یہ ماقبل جملہ سے بدل ہے، کیونکہ جو اسلام کی تحقیر کرتا ہے وہ یقیناً کفر کی تعظیم کرتا ہے، یا اس کا ماقبل کلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ گویا کہ جب انہوں نے کہا ہم تمہارے ساتھ ہیں تو شیاطین نے کہا اگر تم سچے ہو تو پھر مسلمانوں کے سامنے ایمان کا دعویٰ کیوں کرتے ہو؟ جواباً کہا ہم ان لوگوں سے استہزاء کرتے ہیں۔

الاستہزاء کا مطلب مزاح کرنا، حقیر سمجھنا ہے هَزَأْتُ وَاسْتَهْزَأْتُ دونوں کا ایک ہی معنی ہے حقیر سمجھنا جیسے اَجَبْتُ اور اِسْتَجَبْتُ کا ایک معنی ہے، استہزاء کا اصل معنی خفت ہے جیسے نَاقَةٌ تَهْزَءُ (تیز رو اونٹنی) ابوجعفر نے مُسْتَهْزِءُوْنَ، يَسْتَهْزِءُوْنَ، اِسْتَهْزِءُوْا، اور لِيُطْفِئُوْا، لِيُوَاطِئُوْا، يَسْتَنْبِئُوْنَكَ، خَاطِئُوْنَ، خَاطِئِيْنَ، مُتَّكِئُوْنَ، مُتَّكِئِيْنَ، فَمَالِئُوْنَ، اور اَلْمُنْشِئُوْنَ کو بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑮

"اللہ سزا دے رہا ہے لے انہیں ان مذاق کی اور ڈھیل دیتا ہے انہیں ہے تاکہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں سے"

لے اللہ تعالیٰ انہیں اس استہزاء پر سزا دے گا، (یہاں مقابلہ کے قاعدہ کے تحت) استہزاء کی سزا کو بھی استہزاء سے تعبیر فرمایا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ان کے ساتھ استہزاء یہ ہوگا کہ ان (منافقین) کے لئے پہلے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا پھر جب وہ داخل ہونے کے لئے اس دروازہ کے قریب جائیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا اور دوبارہ دوزخ کی آگ کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے۔

بعض علماء فرماتے ہیں، مومنین کے ساتھ ایک نور ہوگا جس کے ذریعے وہ پل صراط پر چلیں گے، جب منافقین اس نور کے قریب پہنچیں گے تو منافقین اور مومنین کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ" (پس کھڑی کر دی جائے گی ان کے اور اہل ایمان کے درمیان ایک دیوار جس کا ایک دروازہ ہوگا)۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ

عنہ نے فرمایا: یہاں استہزاء کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا نفاق ظاہر فرما دے گا۔(1)

ابن ابی الدنیا نے کتاب الصمت میں حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ منافقین کے ساتھ استہزاء یہ ہوگا کہ ان میں سے ایک شخص کے لئے پہلے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا پھر اسے بلایا جائے گا جب وہ قریب پہنچے گا تو دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ ہمیشہ اسی طرح ہوتا رہے گا۔ الحدیث، یہ حدیث مرسل ہے اور اس کی سند جید ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے کلام کو نئے سرے سے شروع فرمایا ہے، ماقبل کلام پر اس کا عطف نہیں فرمایا۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان منافقین کو جزا دینے کے لئے کافی ہے۔ مسلمانوں کو ان سے تعرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے کلام کی طرح استہزاء کے لئے اسم کا صیغہ ذکر نہیں فرمایا یعنی اللہ مستھزء انہیں فرمایا، اس تبدیلی کی غرض یہ ہے کہ ان کے لئے سزا تجدد، حدوث کے ساتھ ہوگی یعنی وہ متواتر اور بار بار اور نئے سے نئے انداز میں ہوگی۔ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ (کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں ہر سال ایک بار یا دو بار)۔

2۔ اللہ تعالیٰ انہیں ڈھیل دیتا ہے اور مہلت دیتا ہے یہ مدالجیش سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے لشکر میں اضافہ کر کے اسے زیادہ اور طاقتور بنا دیا، مدّ اور امداد دونوں ہم معنی ہیں مگر مدّ شر کے لئے اور امداد خیر کے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَمَدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ (ہم نے قوت دی تمہیں مال اور بیٹوں سے)

طغیان کا مطلب حد سے بڑھنا ہے اور یہاں کفر اور نافرمانی میں حد سے تجاوز کرنا ہے، الکسائی نے ہر جگہ امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

3۔ یعمھون سے مراد بصیرت کے اعتبار سے اندھا ہونا ہے جیسے عمی سے مراد بصر کے اعتبار سے اندھا ہوتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾

"(یہ) وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے بدلے لیکن نفع بخش نہ ہوئی ان کی (یہ) تجارت 1 اور وہ صحیح راہ نہ جانتے تھے 2"

1 اس آیت کریمہ میں اشتروا بمعنی استبدلوا ہے یعنی انہوں نے بدل ڈالا۔ الضلالة سے مراد کفر ہے اور بالھدی سے مراد ایمان ہے۔ تجارت کا مطلب نفع کو طلب کرنا ہے یعنی خرید و فروخت کر کے راس المال (اصل مال) پر زیادتی چاہنا ہے، یہاں نفع کی نسبت تجارت کی طرف مجازی ہے کیونکہ تجارت کرنے والا تجارت کر کے منافع حاصل کرتا ہے اس لئے نفع کی نسبت اس کی طرف کر دی۔ یا نفع کی نسبت تجارت کی طرف اس لئے کی کہ وہ نفع کا سبب ہوتی ہے، جس طرح تجارت کرنے والا نفع کا سبب ہوتا ہے۔

2۔ کیونکہ تجارت سے مقصود راس مال کی سلامتی کے ساتھ ساتھ نفع کا حصول ہوتا ہے۔ یہ وہ بدبخت ہیں کہ راس مال (فطرت) بھی ضائع کر چکے ہیں۔ اس لئے حق کا ادراک اور کمال کے حصول کا منافع بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 30 مطبوعہ المکتبۃ التجاریہ الکبری مصر

''ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی پھر جب جگمگا اٹھا اس کا آس پاس تو لے گیا اللہ ان کا نور اور چھوڑ دیا انہیں گھپ اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے ''

۱ مَثَلٌ، مِثْلٌ مَثِیْلٌ ان تمام کا معنی نظیر ہے۔ پھر اس کا اطلاق اس مشہور و معروف قول کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کو اس کے اصل مورد کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہوتی ہے، اور اس میں کوئی غرابت اور اچنبھا بھی ہو پھر یہ ہر عجیب و غریب حالت کے لئے استعمال ہونے لگا۔

۲ یہاں الذی بمعنی الذین ہے، جیسے خُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوْا میں الذی بمعنی الذین ہے۔ یہ کلام عرب میں جائز ہے۔ مگر القائم کو القائمین کی جگہ استعمال کرنا جائز نہیں کیونکہ اسم موصول الذی وغیرہ مقصود بالوصف نہیں ہوتا بلکہ مقصود وہ جملہ ہوتا ہے جو اس کا صلہ ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ الذی اسم تام نہیں بلکہ اسم تام کا جز ہے اس لئے حق یہ ہے کہ اس کی جمع نہ ہو اور الذین اس کی جمع نہیں ہے۔ الفاظ کی زیادتی کے ذریعے معنی کی زیادتی مقصود ہوتی ہے، یہاں بھی اسی طرح الذی میں معنی کی زیادتی پر دلالت کرنے کے لئے الذین بنا دیا گیا ہے۔ الذین اگر اس کی جمع ہوتی تو حالت رفعی میں الذون استعمال ہوتا حالانکہ یہ ہمیشہ الذین یعنی یاء کے ساتھ ہی استعمال ہوتا ہے۔ یہ بھی دلیل ہے کہ یہ الذی کی جمع نہیں ہے۔

۳ اضاءت کا فاعل النار (آگ) ہے ما حولہ، ضمیر کا مرجع مستوقد یعنی آگ جلانے والا ہے۔

۴ یہ لما کا جواب ہے۔ پیچھے نار کا ذکر تھا یہاں بھی بنارھم ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں فرمایا کیونکہ آگ سے مقصود نور ہی ہوتا ہے اس لئے اس کا ذکر فرمایا۔ یہاں نور کے لے جانے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے (اس کی کئی وجوہ ہیں) 1۔ تمام افعال اس کی تخلیق ہیں، 2۔ آگ کا بجھنا ایک خفی سبب سے تھا یا کسی سماوی سبب سے تھا۔ اور جس کا سبب معلوم نہ ہو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے، 3۔ یا کلام میں مبالغہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی گئی (کیونکہ فاعل جتنا قوی ہو فعل میں اتنی ہی زیادہ قوت ہوتی ہے)۔ یا لما کا جواب اختصار اور عدم التباس کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''وَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ '' اس کا جواب بھی محذوف ہے۔

یاذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ، جملہ مستانفہ ہے ماقبل کلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور سائل کا جواب ہے جو کہتا ہے ان لوگوں کا پھر کیا حال ہوگا جن کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس نے آگ روشن کی اور پھر اس کی آگ بجھ گئی۔

یا یہ جملہ تمثیلیہ کا بدل ہے جو بیان کی غرض سے ذکر کیا گیا ہے ان آخری دو صورتوں میں ضمیر کا مرجع منافقین ہوں گے۔

۵ ظلم کا لفظ جمع اور نکرہ ذکر فرما کر اس کا وصف ذکر فرمایا کہ وہ ایسی تاریکی ہے جس میں کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسا انداز تاریکی کی شدت کو بیان کرنے کے لئے ذکر فرمایا ہے گویا تہہ در تہہ تاریکی ہے۔ ترک فعل اپنے ضمن میں صَیَّرَ کا معنی رکھتا ہے اس لئے اسے افعال قلوب کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

لا یبصرون کا مفعول ذکر نہیں فرمایا، اور اسے فعل لازم کی طرح بنا دیا ہے۔ گویا ان کی کسی چیز پر نظر ہی نہیں پڑتی۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت کے مفہوم کی وضاحت اور ثبوت کے لئے اس آیت میں مثال بیان فرمائی ان لوگوں کے لئے جنہوں نے زبان کے اقرار کو بھی باطنی کفر کی وجہ سے ضائع کر دیا۔ یا اس میں ان کے ایمان کو آگ کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اس کے بجھ جانے کو آخرت میں ان کی

ہلاکت کے ساتھ یا دنیا میں ان کے حالات افشاء کرنے کو اللہ کے آگ کو بجھانے کے ساتھ تشبیہ دی ہے، اس طرح کہ انہوں نے ظاہراً اسلام قبول کر کے اپنے مال، خون محفوظ کر لئے، مسلمانوں کے ساتھ غنیموں اور احکام میں شریک ہو گئے (لیکن تمام چیزوں کے حصول کے بعد بھی حقیقی نفع سے محروم ہو گئے)۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

"یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں ۱؎ سو وہ نہیں پھریں گے ۲؎"

۱؎ اصل میں هُمْ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْیٌ ہے، یعنی جنہوں نے آگ روشن کی۔ جب اللہ تعالیٰ ان کا نور لے گیا اور وہ ایسی تاریکیوں میں ہو گئے جنہوں نے انہیں مدہوش کر دیا اور ان کے حواس مختل ہو گئے، اس صورت میں کلام حقیقت پر مبنی ہے۔ اگر ہنوز هم کی ہم ضمیر کا مرجع منافقین ہوں تو مفہوم یہ ہوگا کہ جب انہوں نے حق کو دل سے قبول نہ کیا، اور حق کا زبانی بھی اقرار نہ کیا اور آیات میں غور و فکر کو بھی چھوڑ دیا تو وہ گویا یوں ہو گئے کہ ان کے مشاعر و قوی ہیں ہی نہیں۔ (کیونکہ جب کوئی چیز اپنی منفعت کھو دیتی ہے تو اس کو معدوم تصور کیا جاتا ہے) اور یہ آیت تمثیل ہے استعارہ نہیں ہے کیونکہ استعارہ کے لئے شرط ہوتی ہے کہ مستعار لہ کا ذکر بالکل نہ ہو۔ یہاں اگرچہ مستعار لہ هُمْ لفظاً موجود نہیں۔ مگر حکماً منطوق ہے، پس جب استعارہ کی شرط نہ پائی گئی تو نتیجۃً تمثیل ہوا۔

۲؎ یعنی وہ ایسے متحیر و ششدر ہیں کہ انہیں پتہ ہی نہیں چل رہا کہ وہ کیسے اس جگہ واپس جائیں جہاں سے چلے تھے۔ یا اس کا مطلب ہے کہ وہ گمراہی سے ہدایت کی طرف نہیں لوٹیں گے جس کو انہوں نے ضائع کر دیا ہے۔

اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَ اللّٰهُ مُحِیْطٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾

"یا پھر جیسے زور کا مینہ برس رہا ہو بادل سے ۱؎ جس میں اندھیرے ہوں اور گرج اور چمک ہو ۲؎ ٹھونستے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے باعث موت کے ڈر سے ۳؎ اور اللہ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو ۴؎"

۱؎ صیّب سے پہلے اصحاب مضاف محذوف ہے، یعنی منافقین بارش میں چلنے والوں کی طرح ہیں۔ صَیِّب یہ فیعَل کے وزن پر صوب سے مشتق ہے جس کا معنی اترنا اور بہنا ہے بارش کو صیب اس کے اترنے اور بہنے کی وجہ سے کہتے ہیں۔ صیّب کے صیغہ میں مبالغہ ہے، کیونکہ صوب کا معنی زور سے برسنا اور بہنا ہے پھر مبالغہ کا صیغہ ذکر فرمانے سے بارش کی تیزی ظاہر کرنا مقصود ہے، اور اس کا نکرہ ذکر کرنا اس کی شدت اور زیادتی کے اظہار کے لئے ہے۔

او: یہ دونوں اطراف میں شک کی برابری پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن پھر اس کے معنی میں وسعت کر دی گئی کہ دو چیزوں کے درمیان مطلقاً برابری پر دلالت کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے مطلب یہ کہ منافقین کو دونوں قصوں میں سے کسی ایک کے ساتھ تشبیہ دینا برابر ہے۔ اے مخاطب! تجھے اختیار ہے کہ منافقین کو آگ جلانے والوں کے ساتھ یا بارش والوں کے ساتھ تشبیہ دے دے۔ جیسے کہا جاتا ہے تجھے کفارہ دینے میں اختیار ہے۔

السماء کو معرف باللام ذکر کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ وہ بادل آسمان کی تمام اطراف کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے ہر افق کو سماء کہا جاتا

ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں سماء کا مطلب بادل ہے، اور ہر وہ چیز جو تجھ سے اوپر ہو وہ سماء سے تعبیر کی جاتی ہے، اس صورت میں السماء پر الف لام جنس کا ہوگا لیکن ظاہر ارشادات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے جیسے ارشاد ہے: وَّاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا۔ اور جگہ فرمایا وَ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ۔ ابن حبان نے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا بارش آسمان سے آتی ہے یا بادل سے؟ تو انہوں نے فرمایا آسمان سے، اور بادل اس کی نشانی ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے خالد بن معدان سے روایت کیا ہے کہ بارش عرش کے نیچے سے آتی ہے، پھر یکے بعد دیگرے ہر آسمان پر آتی ہے، حتیٰ کہ آسمان دنیا میں جمع ہو جاتی ہے اور جس جگہ جمع ہوتی ہے اسے الابرم کہا جاتا ہے۔ پھر سیاہ بادل اس جگہ داخل ہو کر وہ بارش پی لیتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ جہاں چاہتا ہے اسے وہاں پہنچا دیتا ہے۔ ان دونوں مصنفین نے حضرت عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ بارش ساتویں آسمان سے نازل ہوتی ہے۔(1)

ع فیہ کی ضمیر کا مرجع الصیب یا السماء ہے۔ السماء کا لفظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مذکر کی مثال السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ہے اور دوسری جگہ انفطرت واحد مؤنث کا صیغہ السماء کے لئے استعمال ہوا ہے۔

ظلمات سے مراد پے در پے بارش، بادل اور رات کی تاریکیاں ہیں۔

رعد سے مراد وہ کڑک ہے جو بارش کے وقت سنائی دیتی ہے۔

برق وہ آگ اور چمک ہے جو بادل سے نکلتی ہے، رعد اور برق یہ دونوں مصدر ہیں اس لئے ان کی جمع نہیں بنائی گئی۔ حضرت علی، ابن عباس اور اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ رعد اس فرشتے کا نام ہے جو بادل کو ہانکتا ہے اور برق (چمک) یہ فرشتہ کے کوڑے کی چمک ہے جو آگ سے بنا ہوا ہے اور اس کے ذریعے وہ بادل کو ہانکتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا یہ بادل کو جھڑکنے کی آواز ہے، بعض کی رائے ہے یہ اس فرشتہ کی تسبیح ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ رعد فرشتہ کا نام ہے اور اس کی آواز کو بھی کہا جاتا ہے، بارش کو برق اور رعد کا مکان بنایا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں اس کے برسنے کے وقت ہوتی ہیں۔ ظلمت، رعد، برق پر رفع ظرف "فیہ" کی وجہ سے ہے۔

ع یجعلون کی ضمیر کا مرجع اصحاب صیب ہیں کیونکہ معنی ان کی نیت کی گئی ہے الکسائی نے آذَانِهِمْ، آذَانِنَا اور طُغْيَانِهِمْ کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی قرآن کریم میں ان ذکر ہوا ہے۔ یہاں کلام میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے انگلیوں کے پوروں کی جگہ مکمل انگلیوں کے داخل کرنے کا ذکر فرمایا۔ ترکیبی لحاظ سے یہ جملہ مستانفہ ہے اور یہ ایک سوال کا جواب ہے وہ یہ کہ اس شدید اور خوفناک حالت میں ان کی کیا کیفیت تھی؟ (تو فرمایا وہ ڈر کے مارے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہیں)۔

من الصواعق میں من تعلیلیہ یا سببیہ ہے اور یہ جار مجرور یجعلون کے متعلق ہیں۔

الصعق:۔ اس سخت اور شدید آواز کو کہتے ہیں کہ جو سنے وہ مر جائے یا اس پر غشی طاری ہو جائے اور مجازاً اس کا اطلاق موت اور غشی پر بھی ہوتا ہے جو اس کڑک کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ (پھر غش کھا کر گر پڑے گا جو آسمانوں میں ہے)

الصواعق، صاعقة کی جمع ہے اور اس کے آخر میں ۃ مبالغہ کے لئے ہے (جیسے علامہ کے آخر میں ہے) یا یہ ۃ مصدر کی ہے

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 73، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

(جیسے عافیۃ)۔ ہر مہلک اور خوفناک عذاب کو صاعقہ کہا جاتا ہے اور یہاں مراد ایسی ہولناک کڑک ہے جس کے ساتھ آگ ہو، اور جس چیز پر پڑے اسے ہلاک کر دے۔ یا یہاں صاعقہ سے مراد صرف کڑک ہے۔

حذر الموت:۔ یجعلون کا مفعول لہ ہے۔

[۳] یعنی کافر اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے باہر نہیں ہوں گے۔ جیسے محاط بہ (جس کو گھیرا گیا ہو) محیط سے باہر نہیں ہوتا۔ یعنی وہ اپنے دھوکہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کبھی نہیں بچ سکیں گے۔ ابو عمرو اور کسائی دوری کی بروایت سے کافرین کی کاف کے فتحہ میں امالہ کرتے ہیں جب راء کے بعد یاء ہو، صرف یہاں نہیں بلکہ جہاں بھی اسی طرح واقع ہوا ہے۔ ورش نے اسے بین بین پڑھا ہے۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَ اِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾

"قریب ہے کہ بجلی اچک لے ان کی بینائی [۱] جب چمکتی ہے ان کے لئے تو چلنے لگتے ہیں اس کی (روشنی) میں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے ان پر تو کھڑے رہ جاتے ہیں [۲] اور اگر چاہے اللہ تو لے جائے ان کے سننے کی قوت اور ان کی بینائی [۳] بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے [۴]"

[۱] یہ جملہ مستانفہ ہے اور ایک مقدر سوال کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ اس ہولناک اور خوفناک کڑک کے وقت ان کی کیا حالت تھی۔ کاد، یہ خبر کے وجود کے قریب واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ وقوع کا سبب موجود ہوتا ہے لیکن شرط کے مفقود ہونے یا کسی مانع کے پائے جانے کے باعث وہ خبر وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ یہ محض خبر ہے جبکہ عسیٰ، رجاء اور انشاء کا معنی رکھتا ہے۔ الخطف:۔ تیزی سے کسی چیز کو اچک لینا۔

[۲] کلما کا لفظ اسم کے تکرار کے لئے آتا ہے۔

اضاء:۔ فعل لازم ہے اور لمع کے معنی میں ہے یا یہ متعدی ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہوگی نُوْرَ لَهُمْ مَمْشٰی (راستہ ان کے لئے روشن ہو گیا) مشوا فیہ یعنی چلنے کے بہت حریص تھے جب روشنی ہوتی تو چل پڑتے، اسی لئے اضاء کے ساتھ کلما کا ذکر کیا مگر اظلم کے ساتھ اذا کا ذکر کیا۔ اظلم فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

[۳] اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو کڑک کی گرج کے ساتھ ان کی قوت سماعت اور بجلی کی چمک سے ان کی آنکھیں ختم کر دیتا۔ یہاں شاء کے مفعول کو حذف کر دیا کیونکہ جواب شرط اس پر دلالت کر رہا ہے۔ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ۔ قوت سماعت اور قوت بصارت کے ضائع ہونے کا ظاہری سبب گرج اور چمک موجود ہیں مگر حقیقت میں تمام اسباب کی تاثیر مشیت الٰہی پر منحصر ہے۔ سبب حقیقی اللہ تعالیٰ کی چاہت اور مشیت ہے۔ جواہر، اعراض اور بندوں کے تمام افعال اللہ کی مخلوق ہیں اور اس کی مشیت پر مرتب ہوتے ہیں۔

[۴] سابقہ تمام مفہومات کی تقریر اور تصریح کے لئے "اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" کا جملہ ذکر کیا گیا ہے۔ الشی مصدر ہے جو اسم فاعل (اَلشَّاءِی) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس معنی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے جیسے فرمایا قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ۔ (آپ پوچھئے کونسی چیز بڑی (معتبر) ہے گواہی کے لحاظ سے آپ ہی بتایئے اللہ)۔ مفعول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے

جس کا وجود چاہا جائے۔ یعنی ممکن چیز۔ اس معنی میں یہ ارشاد ہے خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ۔ پس یہ اپنے عموم پر ہے۔ حمزہ شیءٍ اور شیئا کو وصل کی صورت میں یاء پر سکوت کرتے ہیں۔ قدرۃ کا معنی ہے کسی چیز کے وجود پر قادر ہونا۔ قادر وہ ہوتا ہے جو کرنا چاہے تو کرے۔ اگر چاہے تو نہ کرے (۱)۔ قدیر میں مبالغہ ہے، یہ صیغہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے بہت کم استعمال ہوتا ہے۔

یہ ایک تمثیل ہے جس میں حیرت اور شدت میں منافقین کی حالت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو تیرگی شب، کالی گھٹا، اور بادلوں کی گرج چمک میں گھرا ہوا ہو۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں منافقین کو بارش میں پھنسنے والے اشخاص سے تشبیہ دی گئی ہے دین اور قرآن کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے۔ فرمایا فیہ ظلمٰتٌ یعنی اس بارش میں تاریکیاں ہیں جو انہیں چلنے سے روکے ہوئے ہیں اور تاریکیاں عبادات، جہاد اور شہوات کے ترک کی محنت اور مشقت ہے۔

امام مسلم، امام احمد، اور امام ترمذی رحمہم اللّٰہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت کا احاطہ مشقتوں سے اور دوزخ کا احاطہ شہوات سے کر دیا گیا ہے (1) اور امام ترمذی، ابوداؤد اور امام نسائی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا فرمایا تو جبرئیل کو کہا جا میری جنت کا نظارہ کر، جبرئیل امین نے حکم کی تعمیل کی اور جنت اور اس کی ابدی نعمتوں کا مشاہدہ کیا۔ واپس آئے تو کہا اے میرے رب تیری عزت کی قسم جنت کے متعلق جو سنے گا وہ اس میں ضرور داخل ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جنت کے اردگرد مشکلات کی خاردار باڑ لگا دی پھر فرمایا اے جبرئیل اب پھر اسے جا کر دیکھ، جبرئیل گئے، دیکھا، واپس آئے تو کہنے لگے اے میرے رب تیری عزت کی قسم اب تو مجھے خوف ہو رہا ہے کہ کوئی بھی اس میں داخل نہ ہو سکے گا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ کو پیدا فرمایا تو جبرئیل سے کہا جاؤ میری دوزخ کا مشاہدہ کرو۔ فرمایا: جبرئیل گئے اور اسے دیکھا، واپس آ کر عرض کی اے میرے رب تیری عزت کی قسم اس کی ہولناکی سن کر تو کوئی بھی اس میں داخل نہ ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو شہوات و لذات سے گھیر دیا پھر فرمایا جبرئیل اب دوبارہ جا کر دیکھ۔ جبرئیل گئے، دیکھا پھر عرض کی اے میرے رب تیری عزت کی قسم اب تو مجھے یہ خدشہ ہو رہا ہے کہ کوئی بھی اس سے بچ نہ سکے گا۔ (2)

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ۔ (بے شک نماز بھاری ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر بھاری نہیں) وَّ رَعْدٌ یعنی اس قرآن میں ایسی آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے والی ہیں" وبرق " یعنی اس دین اور قرآن میں ایسی فتوحات اور غنیمتیں ہیں جنہیں وہ حاصل کرتے ہیں۔ ان فتوحات اور غنیموں کی چمک کی وجہ سے راستے پر چلنا ان کے لئے آسان ہے، اور مصائب و تکالیف کی سختیاں اس روشنی کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں۔ یا برق سے مراد وہ واضح دلائل اور روشن تعلیمات ہیں جو صراط مستقیم پر چلنے کے لئے برانگیختہ کرتی ہیں اور سختیوں اور شدتوں کے کانوں کو گل و گلزار بنا دیتی ہیں۔ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ یعنی منافق ان خوف دلانے والی آیات کو نہ سننے کے لئے اپنی انگلیاں کانوں میں ڈالتے ہیں یہ کہتے ہوئے لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا

(۱) بہتر یہ ہے کہ عبارت یوں ہونی چاہیے اگر نہ چاہے تو نہ کرے (وَاِنْ لَمْ يَشَاْ لَمْ يَفْعَلْ) کیونکہ عدم فعل مشیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس میں عدم مشیت کافی ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 378، جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 80 (قدیمی)

2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 80 (وزارت تعلیم)

الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔ (مت سنا کرو اس قرآن کو اور شوروغل مچا دیا کرو اس کی تلاوت کے درمیان شاید تم (اس طرح) غالب آجاؤ)۔

حذر الموت:۔ ایمان لانے کی تکالیف اور مشقتوں کے ڈر سے اور میدانِ جہاد میں قتال کے خوف سے کان بند کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بزدلانہ کیفیت کو بیان کیا ہے فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَیْتَهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ تَدُوْرُ اَعْیُنُهُمْ كَالَّذِیْ یُغْشٰی عَلَیْهِ مِنَ الْمَوْتِ۔ (وہ آپ کی طرف یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ انکی آنکھیں چکرا رہی ہوتی ہیں اس شخص کی مانند جس پر موت کی غشی طاری ہو)۔ یا وہ کانوں میں انگلیاں اس لئے ڈالتے ہیں کہ آیاتِ عذاب کو نہ سننے سے شاید وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جائیں گے جیسا کہ ایک احمق شخص کڑک اور گرج کے خوف سے اپنے کانوں کو بند کر لیتا ہے حالانکہ کانوں کو بند کر لینے سے اس کی خلاصی تو نہیں ہوتی، اسی طرح ایک دوسری مثال ہے کہ خرگوش جب شکاری کو آتا ہوا دیکھتا ہے اور اس سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتا تو اس گمان سے آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ شکاری کو نہ دیکھنا اسے قتل اور موت سے بچا لے گا۔ وَاللّٰهُ مُحِیْطٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جو ان کے لئے دنیا میں گوناں گوں سزائیں اور رسوائیاں مقدر کر رکھی ہیں ان سے وہ کبھی نہ بچ سکیں گے اور آخرت کا جو ابدی اور دائمی عذاب مقرر کیا ہے اس سے کوئی حیلہ اور سازش انہیں محفوظ نہ رکھ سکے گی۔ یا مطلب یہ ہے کہ عذاب کے وقوع سے خوف دلانے والی آیات سے کانوں کا بند کر لینا انہیں کچھ فائدہ نہ دے گا جس طرح خرگوش کا شکاری کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینا اسے کچھ مفید نہیں ہوتا بلکہ یہ چیز تو اس کی موت اور ہلاکت میں اس کی معاون ہوتی ہے۔ یَكَادُ الْبَرْقُ یعنی دنیا کے بہت حریص اور لالچی ہیں اسلام کی شوکت، غنیموں کا ملنا اور اسلامی فتوحات کو دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔ یا برق سے مراد دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ ہیں۔ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ کہ ان کی آنکھیں ماؤف اور آرام طلبی ہیں کیونکہ وہ باطل کو حق اور حق کو باطل سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ۔ (آراستہ کر دیئے ہیں ان کے لئے شیطان نے ان کے (یہ مشرکانہ) اعمال پس اس نے روک دیا ہے انہیں (سیدھے) راستہ سے)۔ مگر جونہی فتوحات اور کامیابی و کامرانی دیکھتے ہیں تو حق انہیں حق دکھائی دیتا ہے اور باطل انہیں باطل نظر آتا ہے، پھر وہ ایمان لاتے ہیں۔ پھر جب روشنی ہوتی ہے، فتح نصیب ہوتی ہے اور مسلمانوں کی عظمت کا علم بلند ہوتا ہے اور اسلام کی واضح برتری دیکھتے ہیں تو وہ اس اسلام کی شاہراہ مستقیم پر چلنے لگتے ہیں۔ پھر وَاِذَآ اَظْلَمَ الْبَرْقُ جب کبھی فتح نہیں ہوتی اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ اسلام کی ساری سعادتوں اور برکتوں کو بھول جاتے ہیں اور اسلام کے راہ راست پر چلنے سے رک جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس کیفیت کو ایک اور جگہ یوں بیان فرمایا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَیْرُ ﹰاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ﹰانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ الخ اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی کنارہ پر (کھڑے کھڑے) پھر اگر پہنچے اسے بھلائی (اس عبادت سے) تو مطمئن ہو جاتا ہے اس سے اور اگر پہنچا اسے کوئی آزمائش تو فوراً (دین) سے منہ موڑ لیتا ہے۔

"وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ" یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں جو ماؤف ہو چکی تھیں ان کو بجلی کی کڑک کے ساتھ ختم فرما دیتا اور انہیں صحیح وسلامت کان اور آنکھیں عطا فرماتا۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے "وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ۔ الخ۔ (اور اگر ہم چاہتے تو دے دیتے ہر شخص کو اس کی ہدایت لیکن یہ بات طے ہو چکی ہے میری طرف سے کہ میں ضرور بھروں گا جہنم کو)۔

ن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے السدی الکبیری کی سند سے حضرت ابن مسعود اور ان کے علاوہ کئی صحابہ کرام سے روایت کیا ہے کہ مدینہ طیبہ کے دو منافق رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر مشرکین کی طرف بھاگ گئے۔ انہیں راستہ میں وہ بارش آ گئی جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے، اس بارش میں سخت گرج چمک تھی۔ تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں اس خوف سے کہ کہیں کڑک ان کے کانوں میں داخل ہو کر قتل نہ کر دے۔ جب بجلی چمکتی تو وہ اس کی روشنی میں چل پڑتے اور جب نہ چمکتی تو انہیں کچھ نظر نہ آتا۔ اپنی جگہ کی طرف آ رہے تھے تو کہہ رہے تھے کہ کاش صبح ہو اور ہم محمد ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوں، اور آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ پس وہ صبح آپ ﷺ کی بارگاہ میں پہنچے، اسلام قبول کیا، آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور آپ ﷺ نے ان کے اسلام کی تعریف کی۔

اللہ تعالیٰ نے ان بھاگنے والے منافقین کی مثال بیان فرمائی ہے ان منافقین کے لئے جو مدینہ میں رہتے تھے۔ منافقین جب نبی کریم ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتے تو اپنی انگلیاں کانوں میں ڈال لیتے تھے، اس خوف سے کہ کہیں ان کے بارے حضور پر کلام نازل نہ ہو جائے، یا کہیں وہ ایسی بات نہ ذکر کر دیں جو ان کے قتل کا باعث ہو جیسا کہ وہ بھاگنے والے منافقین اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالتے تھے۔ یعنی جب ان کے اموال و اولاد کی کثرت ہو گئی اور انہیں کثرت سے مال غنیمت ملا یا فتح نصیب ہوئی تو اس میں چل پڑے اور کہنے لگے دین محمدی ﷺ سچا ہے اور اس پر مضبوط و مستحکم ہو گئے جیسے وہ دونوں منافقین چلتے تھے جب ان کے لئے بجلی چمکتی تھی۔

جب ان کے اموال اور اولاد ہلاک ہو گئے اور انہیں مصیبت پہنچی تو کہنے لگے یہ تکلیف دین محمد ﷺ کی وجہ سے ہمیں پہنچی ہے پس وہ دوبارہ کفر میں داخل ہو گئے۔ جیسے وہ دونوں منافق ٹھہر جاتے تھے جب تاریکی چھا جاتی تھی (1)۔ ابن جریر کی روایت یہاں ختم ہوئی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں اس توجیہ کا بھی احتمال ہے کہ ظلمات سے مراد وہ آیات متشابہات ہوں جن کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ اور برق سے مراد وہ محکمات آیات ہوں عقل جن کا ادراک کر سکتی ہے۔ اہل سنت کہتے ہیں اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ (ہم ایمان لائے ساتھ اس کے سب ہمارے رب کے پاس سے ہے) اور جن کے دلوں میں کجی ہے تو وہ " ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ " کی وعید سننے سے اپنے کانوں کو بند کر لیتے ہیں موت کے ڈر سے اور وہ قول جو ان کی آراء اور ان کے مذہب کے موافق نہیں ہوتا اسے وہ موت سمجھتے ہیں اور قرآن کو اپنی فاسد آراء کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فَكُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ (پس روشنی ہوتی ہے) جب ان کی عقول جس مفہوم کو سمجھ سکتی ہیں تو (مَّشَوْا فِیْهِ) اس پر ایمان لاتے ہیں اور جب وَ اِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ۔ ان کی ناقص عقول اس مفہوم کو سمجھ نہیں سکتیں تو ایمان لانے سے رک جاتے ہیں اور وہاں کھڑے رہ جاتے ہیں اور اپنی آراء فاسدہ کے مطابق اس کی تاویلات تلاش کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے کچھ وہ ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہر موجود جسم ہوتا ہے اور ہر چیز کا مثل ہوتا ہے اور جب ان کی عقل یہ نہ سمجھ سکی کہ کوئی موجود غیر جسم بھی ہوتا ہے اور بے مثل بھی ہوتا ہے تو انہوں نے تنزیہ باری تعالیٰ کا انکار کر دیا، یہ فرقہ مجسمہ ہے۔ کچھ وہ ہیں جو رؤیت کے منکر ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو کلام اللہ غیر مخلوق کے منکر ہیں۔ پس اس طرح امت مسلمہ 73 فرقوں میں بٹ گئی ہے۔ روافض، خوارج، معتزلہ، مجسمہ اس طرح کے اور فرقے جو خود کہتے ہیں کہ ہم بعض کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں " وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ

1۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 119، مطبعۃ الکبری الامیریہ مصر

لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ " اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں ختم کر دیتا کیونکہ انہوں نے کتاب اللہ کو اپنی آراء کے تابع بنایا۔ اسی تقدیر پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد " وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ " ہے۔ یہ قول اہل ہواء کے تمام فرقوں کو شامل (1) ہے۔ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (جنہوں نے پارہ پارہ کر دیا اپنے دین کو اور خود گروہ گروہ ہو گئے ہر گروہ جو اس کے پاس ہے اس پر خوش ہیں)۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت پر ایمان لائے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ یعنی وہ اس تمام پر ایمان نہیں لاتے جو نبی کریم ﷺ لیکر آئے اور جو اللہ تعالیٰ نے کتاب میں نازل کیا اور جو تواتر کے ساتھ احادیث میں ثابت ہے۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وہ نصوص میں غلط تاویلات کر کے اللہ تعالیٰ اور مومنین کو دھوکا دیتے ہیں۔ حالانکہ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔ وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور اس کا شعور نہیں رکھتے۔ " بَلْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ. (بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی دین پر ہیں خبردار وہی جھوٹے ہیں۔) اور (فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّزَيْغٌ) ان کے دلوں میں مرض اور کجی ہے۔ پس (فزادهم الله مرضا وزيغا) اللہ نے ان کے مرض اور کجی کو بڑھا دیا۔ شیطان نے ان کے دلوں میں فاسد تاویلات القاء کیں۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ان غلط اندیشوں اور غلط ظنوں کے لئے دردناک عذاب ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹ بولتے تھے اور نصوص کے ظاہر کو جھٹلاتے تھے۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ کلمات میں تحریف اور دین میں کجی پیدا کر کے زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو وہ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کہتے ہیں ہم ہی تو مصلح ہیں۔ " اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (خبردار یہ لوگ فسادی ہیں لیکن شعور نہیں رکھتے۔) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ (جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسے صحابہ کرام، اہل بیت اطہار اور جمہور لوگ ایمان لائے ہیں۔) کیونکہ یہی اہل سنت و جماعت ہیں اور یہی کثیر ہیں۔ اکثر کا حکم کل کا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے۔ يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ (1) یہ ترمذی نے ابن عباس سے مرفوع روایت کی ہے۔ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ (تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جیسے بیوقوف لوگ ایمان لائے ہیں۔) یہ بات اس لئے کہتے کہ صحابہ کرام کے عقائد حقہ ان کی فاسد آراء کے موافق نہ تھے۔ وہ صحابہ کرام کی شان میں صراحۃً یہ بکتے تھے جیسے روافض اور خوارج صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار کی طرف بے وقوفی اور کفر کی نسبت کرتے ہیں۔ یا یہ بات انہوں نے اس لئے کہی کہ وہ ان کے مخالف تھے اور وہ ان کے عقائد کو غیر معقول سمجھتے تھے۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (یعنی جب وہ مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 39 (ابواب الفتن) وزارت تعلیم

(1) یہ قول اگرچہ تمام فرقوں کو شامل ہے لیکن اس کے بعض معطوفات مثلاً واذا لقوا الذين امنوا وغیرہ اس قول کو اس گروہ کے ساتھ خاص کرتے ہیں جن کے عقیدہ میں تقیہ کرنا شامل ہے۔ ان کو یہ قول شامل نہیں جو جبراً اپنے عقائد کا اظہار کرتے ہیں اس لئے تمام فرقوں کو یہ قول شامل نہیں ہے۔ تمام فرقوں کو بعض معطوفات کا شامل نہ ہونا اہل ہواء کے حق میں آیات کے نزول کے منافی نہیں ہے جیسا کہ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ طلاق رجعی اور بائنہ والی تمام عورتوں کو شامل ہے لیکن وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ رجعیات کے ساتھ مختص ہے۔ بعض فرقوں کے ساتھ مختص کرنے والا تقیہ کا وجوب ہے۔ لیکن مخالفین کے غلبہ اور قتل کے خوف کے وقت تقیہ کا جواز غیر مختص ہے کیونکہ ایسی صورت میں تقیہ اہل سنت کے نزدیک بھی جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۔ اسی طرح ارشاد ہے مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل حق اہل سنت و جماعت کو ممالک اسلامیہ میں غلبہ عطا فرمایا ہے اور بدعتی لوگوں کو مغلوب و مقہور کیا ہے وہ ہر وقت اپنے جان و مال پر خطرہ محسوس کرتے ہیں اور اہل سنت کے سامنے اہل سنت کے عقائد کی صداقت کا اظہار کرتے ہیں۔

لائے۔) اس آیت میں ان کے مذہب کا بیان ہے کہ وہ تقیہ کرتے ہیں اور ان لوگوں سے ڈرتے ہوئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمین میں خلیفہ بنایا ہے اور انہیں اس دین کے قیام کی قدرت دی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے اپنے وعدہ کے مطابق۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا۔ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ منافقین اور اہل ہواء کی مثال ہو اور اہل ہواء کا ایمان اور اس کے نور کی چمک فقط دنیا میں ہے۔ یہاں تو وہ باطل کو حق کے ساتھ ملتبس کر لیتے ہیں مگر جب مریں گے" ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمْ" تو اللہ تعالیٰ ان کا نور لے جائے گا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مثال صرف منافقین کے لئے ہو اور اصحاب صیب یعنی بارش والوں کی مثال اہل ہواء کے لئے ہو اور اَوْ کا کلمہ تقسیم اور توزیع کے لئے ہو جیسے اَنْ يُّقَتَّلُوْۤا اَوْ يُصَلَّبُوْۤا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ۔ (چن چن کر) قتل کیا جائے یا سولی دیا جائے یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں مختلف طرفوں سے یا جلاوطن کر دیے جائیں)۔

اگر کوئی سائل سوال کرے کہ یہ مثال اہل ہواء پر کیسے چسپاں ہو سکتی ہے جبکہ ایسے لوگ حضور ﷺ کے زمانہ میں تھے ہی نہیں۔ میں (مفسر) کہوں گا اس پر اجماع ہے کہ قرآن کے خطابات عام ہیں جو موجود تھے ان کے لئے بھی اور جو قیامت تک آنے والے ہیں ان کے لئے بھی۔ کیا یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ اہل ہواء کے بارے میں نہیں ہے (یقیناً ہے) اگر یہ کہا جائے کہ ان آیات کا نزول منافقین کے حق میں تھا۔ جیسا کہ احادیث اور خلف صالحین کی تفاسیر سے ثابت ہے، تو میں (مفسر) کہوں گا ہاں ایسا ہی ہے مگر مورد کا خصوص لفظ کے عموم کی تخصیص کا مقتضی نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہ آیات منافقین کے حق میں نازل ہوئیں مگر ان کے الفاظ کا عموم اہل ہواء کو بھی شامل ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ﴿۲۱﴾

"اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا فرمایا تمہیں اور جو تم سے پہلے تھے ۱؎ تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ ۲؎"

۱؎ یہ خطاب تمام لوگوں کو شامل ہے جو خطاب کی اہلیت رکھتے ہیں جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے یا قیامت تک آنے والے ہیں۔ بعد میں آنے والے لوگوں کو موجود لوگوں کے قائم مقام رکھ کر تمام کو خطاب فرمایا کیونکہ آپ ﷺ کا دین تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور دین کے احکام اور خطابات قیامت تک کے تمام لوگوں کو شامل ہیں۔ اسی طرح ہر جمع اور اسم جمع جو معرف باللام ہو، اس میں تمام لوگ شامل ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام کا استدلال بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ تمام احکام کو عموم پر محمول فرماتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ۔ اہل مکہ کو خطاب ہے اور يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اہل مدینہ کو خطاب ہے، چونکہ اہل مکہ میں اکثر کافر تھے اور مومن بالکل تھوڑے تھے، اس لئے ایسے لفظ سے خطاب فرمایا جو دونوں قبیلوں کو شامل ہے، اور اہل مدینہ اکثر مومن تھے اس لئے انہیں ایمان کے عنوان سے خطاب فرمایا تاکہ ان کی شرافت وعظمت کا اظہار ہو جائے۔

اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ میں اللہ تعالیٰ نے رب کا لفظ ذکر فرمایا کیونکہ تربیت، عبادت اور منعم کے شکر کا باعث ہوتی ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے بھی عبادت کا مستحق ہے۔ وجوب عبادت کا خطاب مومنین اور کفار دونوں کو شامل ہے۔ کفار کو حکم ہے کہ ایمان لانے کے بعد عبادت کریں جو عبادت کی قبولیت کی شرط اولین ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا قرآن حکیم میں جہاں

عبادت کا حکم وارد ہے اس کا مطلب توحید کا اقرار ہے۔ کفار کو توحید کے اقرار کا حکم ہو رہا ہے اور مومنین کو اس پر ثابت قدم رہنے کا حکم کیا جا رہا ہے۔

موصول معہ صلہ "ربکم" کی صفت ہے، جو رب کی تعظیم اور تعلیل کے لئے ذکر کی گئی ہے۔ "الخلق" بغیر کسی سابقہ مثال کے کسی چیز کو ایجاد کرنا۔ یہ ان تمام چیزوں کو شامل ہے جو انسان سے پہلے گزر چکی ہیں۔ چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کا خود اعتراف کرتے تھے۔ اس لئے یہ جملہ ایک ثابت شدہ چیز کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔ (اگر ان سے تو پوچھے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق کون ہے تو وہ ضرور کہیں گے اللہ!) یا اس کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس میں تھوڑا سا غور و فکر کر کے اپنے رب کو پہچان سکتے ہیں۔

یہ جملہ اعبدوا کے فاعل سے حال ہے، معنی یہ ہوگا کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، عذاب الٰہی سے بچنے کی امید کرتے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم تمہارے سامنے ہے، وہ جیسے چاہتا ہے کرتا ہے اور ایمان خوف و امید کا تقاضا کرتا ہے، یا یہ معنی ہوگا کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس امید سے کہ تم متقین کے گروہ میں داخل ہو جاؤ کیونکہ تقویٰ محرمات سے اجتناب اور واجبات کی ادائیگی کا نام ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے برأت کرنے کا نام تقویٰ ہے۔

یا یہ خلقکم کی مفعول ضمیر سے حال ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اس نے تمہیں پیدا فرمایا ایسی کیفیت میں کہ تم سے تقویٰ کی امید کی جاسکتی ہے، کیونکہ تقویٰ کے دواعی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا یہ تعلیل کے لئے ہے، معنی یہ ہوگا تا کہ تم تقویٰ اختیار کرو۔ میں (مفسر) کہتا ہوں اگر یہ توجیہ کی جائے تو تمام لوگوں (۱) سے تقویٰ کا وجود لازم آئے گا حالانکہ تمام متقی نہیں ہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ یہ معنی کیا جائے کہ اس نے تمہیں پیدا فرمایا ایسی حالت میں کہ تم سے تقویٰ کا صدور واجب ہے اگرچہ بعض لوگوں سے ہو۔

اس آیت کریمہ میں عبادت کی علت سابقہ نعمتوں کو بتایا جو اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ عبادت پر ثواب اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے ورنہ عبادت کی وجہ سے استحقاق ثابت نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی مزدور کام کرنے سے پہلے اجرت وصول کر لیتا ہے۔ (تو اسے کام کرنے کے بعد دوبارہ اجرت کا مستحق نہیں سمجھا جاتا)۔ دوسرا نکتہ اس آیت میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت کا راستہ اس کی صنعتوں اور کرشمہ سازیوں میں غور و فکر کرنا ہے اور اس کی ذات کی معرفت توقیفی امر وہبی ہے۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

(۱) لعل کو وجوب کے لئے تسلیم کرنے پر تمام لوگوں سے تقویٰ کا وجوب لازمی ماننا پڑے گا لیکن دو امور کی بناء پر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، میں کہتا ہوں عبادت کی تعریف یہ ہے کہ واجبات و مستحبات میں سے خضوع پر دلالت کرنے والے امور کو کرنا اور تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ جن امور سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ان سے پرہیز کرنا اور عبادت و تقویٰ ایک دوسرے سے مختلف ہیں جیسا کہ عبادت پر تقویٰ کا مرتب کرنا دلالت کرتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان تلازم نہیں ہے کیونکہ بعض لوگ عبادت میں افراط سے کام لیتے ہیں حتیٰ کہ زہد کے مرتبہ تک پہنچ جاتے ہیں لیکن جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اس سے کلیۃً اجتناب نہیں کرتے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا الخ پس تمام عبادت گزاروں سے تقویٰ کے وجود کا تلازم ممنوع ہے۔ جیسا کہ آپ بعض جاہل صوفیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ عبادات تو کرتے ہیں لیکن جمعہ اور جماعتیں چھوڑ دیتے ہیں۔

فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

"وہ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے کچھ پھل تمہارے کھانے کے لئے۱ پس نہ ٹھہراؤ اللہ کے لئے مدمقابل اور تم جانتے ہو۲"

۱ یہاں جعل بمعنی صیّر ہے لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا۔ زمین کو تمہارے لئے نرم بچھونا بنایا جس پر متمکن ہونا تمہارے لئے ممکن ہے۔ یہ ترکیبی اعتبار سے ربکم کی دوسری صفت ہے، یا یہ بطور مدح منصوب ہے (اور اس سے پہلے اَمْدَحُ فعل محذوف ہے) یا بطور مدح مرفوع ہے (ھو ضمیر کی خبر ہے) یا یہ مبتدا ہے اور فلا تجعلوا کا جملہ اس کی خبر ہے۔ والسماء ۔ اسم جنس ہے جو واحد اور جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بِنَاءً مصدر ہے، ہر تعمیر شدہ چیز پر بولا جاتا ہے یعنی قُبَّةً مَضْرُوْبَةً عَلَيْكُمْ۔ یعنی تم پر قبہ کی صورت بنایا گیا ہے۔

وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: ۔ بارش کے اترنے کی نسبت آسمان کی طرف کی کیونکہ بارش آسمان سے بادل کی طرف اور بادل سے زمین کی طرف اترتی ہے۔ اس کا جعل پر عطف ہے۔

فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ: پھلوں کا پیدا ہونا قدرت الٰہی سے ہوتا ہے لیکن پانی اس کا ظاہری اور عادی سبب ہے اس لئے یہاں پھلوں کے پیدا ہونے کی نسبت اس پانی کی طرف کر دی جو مٹی کے ساتھ ملایا گیا ہوتا ہے۔ مِنْ تبعیضیہ یا بیانیہ ہے، رِزْقًا بمعنی مرزوق ترکیب کلام میں مفعول بہ ہے اور لکم اس کی صفت ہے یا رزق مصدر ہے تعلیل کے لئے ذکر کیا گیا ہے اور لکم رزقا کا مفعول ہے یعنی رِزْقًا اِيَّاكُمْ۔

۲ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا: ۔ کا معنی یہ ہے ان کو ایسی امثال نہ سمجھو جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرح۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کا مدمقابل نہ بناؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر مثل اور ضد سے پاک ہے۔

یہ جملہ اعبدوا کے متعلق ہے۔ فعل نہی ہے اور اس کا عطف اعبدوا پر ہے یا یہ فعل نفی ہے اور امر کا جواب ہے اور اَنْ مضمرہ کے ساتھ منصوب ہے یا لعل کے جواب میں ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں لعل کے جواب میں ہونے کی وجہ سے فعل مضارع منصوب ہے۔ لَعَلِّیْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ (میں ان راہوں تک پہنچ جاؤں یعنی آسمان کی راہوں تک پھر جھانک کر دیکھوں)۔ مطلب یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کے مدمقابل بنانے سے بچو۔ یہ جملہ الذی جعل کے متعلق ہے۔ اگر یہ جملہ مستانفہ ہو تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ یہ نہی ہے مَقُوْلٌ فِيْهِ لَا تَجْعَلُوْا کی تاویل پر خبر واقع ہے، یا اس سے پہلے فاء سببیہ ہے، اور خبر پر داخل ہوئی ہے کیونکہ مبتدا میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے، مفہوم یہ ہوگا کہ جس نے تمہارے لئے ایسی نعمتیں بنائی ہیں اس کا شریک بنانا مناسب نہیں۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کا جملہ تجعلوا کی ضمیر سے حال ہے اور تعلمون کا مفعول ترک کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری حالت یہ کہ تم اہل علم اور اہل رائے ہو۔ اگر تم تھوڑا سا غور و فکر کرتے تو کبھی اس کا شریک نہ بناتے۔ اس سے مقصود توبیخ کرنا ہے مقید کرنا نہیں۔ یا تعلمون کا مفعول محذوف ہے۔ مطلب یہ کہ تم جانتے ہو کہ ان اشیاء کا خالق ایک ہے اور تم خود اس کا اعتراف بھی کرتے ہو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔

(جب پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کی معرفت کا طریقہ بتایا کہ میری صنعتوں اور کاریگریوں میں غور و فکر کرو) اب نبی کریم ﷺ کی

رسالت کی معرفت کا طریق اور قرآن کی حقانیت بیان کی جا رہی ہے جو قرآن تمام ایمانیات پر مشتمل ہے۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۳﴾

"اور اگر تمہیں شک ہو اس میں جو ہم نے نازل کیا[1] اپنے (برگزیدہ) بندے[2] پر تو لے آؤ ایک سورۃ اس جیسی[3] اور بلالو اپنے حمایتیوں کو اللہ کے سوا[4] اگر تم سچے ہو۔"

[1] اس شک کا موجب یہ تھا کہ وہ اسے شعراء کے کلام پر قیاس کرتے تھے۔ کہتے کہ اس قرآن کو یکبارگی کیوں نہ اتارا گیا۔ اس لئے ان کو چیلنج کرنا بھی اسی کلام کے ساتھ واجب تھا تاکہ تمام شبہات دور ہو جائیں اور حجت بھی ان پر لازم ہو جائے (کہ اگر تمہیں اس کلام کے کلام الٰہی ہونے میں شک ہے تو اس کی مثل ایک چھوٹی سی سورت بنالاؤ)

[2] علی عبدنا:۔ یعنی محمد ﷺ پر۔ آپ ﷺ کی عظمت شان بیان کرنے اور اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے کہ آپ ﷺ اللہ کے کامل بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی پیروی کرنے والے ہیں، آپ ﷺ کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف کی (کہ جو اتارا ہم نے اپنے مقبول بندے پر حالانکہ بندے تو تمام اللہ کے ہیں۔ مگر جو تعلق اور نسبت میرے محبوب کو میرے ساتھ ہے اور کسی کو نہیں)

[3] فاتوا "لے آؤ" (اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ ہرگز قرآن کی مثال پیش نہ کر سکیں گے) مگر لانے کا حکم صرف ان کے عجز کو ظاہر کرنے کے لئے تھا۔

بسورۃ:۔ سورہ قرآن حکیم کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس کا اول و آخر معلوم ہو اور یہ سُوْرُ الْمَدِیْنَۃِ (شہر کی فصیل) سے منقول ہے، چونکہ سورت بھی فصیل کی طرح قرآن کے ایک حصہ کا احاطہ کرنے والی ہوتی ہے اس لئے اسے سورہ کہتے ہیں۔ یا یہ سورۃ سے مشتق ہے جس کا معنی رتبہ اور مرتبہ ہوتا ہے، ایک سورت کو پڑھنے سے قاری ایک رتبہ اور شرف حاصل کر لیتا ہے اس لئے اس کو سورہ کہتے ہیں (سورۃ کے آخر میں تنوین تقلیل کے لئے ہے) اس لئے یہاں مختصر ترین سورت مراد ہے جس کی چھوٹی تین آیات ہوں۔ من مثلہ۔ یہ جار مجرور ظرف سورۃ کی صفت ہے، اَیْ بِكَائِنَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ اور مثلہ میں ضمیر کا مرجع مَا نَزَّلْنَا ہے۔

مِنْ:۔ تبعیضیہ ہے یا زائدہ ہے یعنی جو بلاغت اور حسن نظم میں اس قرآن کی مثل ہو وہ پیش کرو۔ یا ضمیر کا مرجع عبدنا ہے، اس صورت میں من ابتدائیہ ہوگا مطلب یہ ہوگا تم بھی اس امی (ناخواندہ) شخص کی مثل سے ایسا کلام پیش کرو۔ یا یہ جار مجرور فاتوا فعل کے متعلق ہے۔ پہلا قول اولیٰ ہے تاکہ یہ شبہ ہی پیدا نہ ہو کہ کوئی پڑھا لکھا شخص تو ایسا کلام پیش کر سکتا ہے، اور ان پڑھ اس جیسا کلام نہیں لاسکتا، بلکہ قرآن حکیم بذات خود معجزہ ہے، کوئی بھی اس کی مثل لانے پر قادر نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا۔ (اگر اکٹھے ہو جائیں سارے انسان اور سارے جن اس بات پر کہ لے آئیں اس قرآن کی مثل تو ہرگز نہ لاسکیں گے اس کی مثل اگرچہ ہو جائیں ایک دوسرے کے مددگار)۔ (اس آیت کریمہ میں صراحۃً ضمیر کا مرجع ھذا القران پہلے قول کی تائید کر رہا ہے)۔

[4] جن معبودوں کی تم عبادت کرتے ہو اور ان کے متعلق یہ گمان کرتے ہو کہ قیامت کے روز وہ تمہاری شہادت دیں گے ان سے بھی مدد

طلب کرو (قرآن کے مقابلہ کے لئے) یا اس کا مطلب ہے کہ جو موجود لوگ ہیں ان کو بھی قرآن کے مقابلہ کے لئے بلا لو۔ من دون اللہ :۔ یہاں اسم جلالت سے پہلے اولیاء کا لفظ محذوف ہے یعنی فصحاء عرب اور بلغاء عرب کو بلاؤ جو یہ گواہی دیں کہ جو تم نے پیش کیا ہے وہ واقعی قرآن کی مثل ہے عقل مند شخص کبھی اس کی صحت کا اقرار نہ کرے گا جس کا فساد و بگاڑ ظاہر و باہر ہو۔

ھے تمہارا یہ دعویٰ کہ یہ کسی انسان کا کلام ہے اگر اس دعویٰ میں تم سچے ہو تو اس کے مقابلہ میں کوئی سورت بنا کر لاؤ۔ یہ جملہ شرط ہے مگر اس کا جواب محذوف ہے، جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہا ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۴﴾

"پھر اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے۔ لے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں ہے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے ہے"

لے فان لم تفعلوا :۔ گزشتہ زمانہ میں تم اس کی مثل نہ پیش کر سکے اور ولن تفعلوا کا جملہ شرط اور جزاء کے درمیان معترضہ ہے اور اس میں غیب کی خبر ہے (کہ تم کبھی بھی اس کی مثل نہ لا سکو گے) اور ایک دوسرا اعجاز بھی ہے (کہ پہلے ہی قرآن نے ان کی حالت بیان فرما دی)۔

ٹے جب ظاہر ہو گیا کہ قرآن معجزہ ہے (اس کی مثل پیش کرنا تمہارے لئے ممکن نہیں ہے) تو تم اس پر ایمان لے آؤ اور اس پر ایمان لا کر اپنے آپ کو بچا لو اس آگ سے جس کا ایندھن (انسان اور پتھر ہیں)۔ وقود ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ آگ جلائی جائے۔ الناس والحجارة سے پہلے مضاف محذوف ہے تقدیر کلام یوں ہوگی وَقُوْدُهَا اِحْتِرَاقُ النَّاسِ وَالْحِجَارَةِ عبدالرزاق، سعید بن منصور، ابن جریر، ابن المنذر، الحاکم (انہوں نے اس کو صحیح بھی کہا ہے) اور امام البیہقی وغیرہم نے حضرت ابن مسعود سے، ابن جریر نے ابن عباس سے، اسی طرح ابن ابی حاتم نے مجاہد اور ابو جعفر سے روایت کیا ہے کہ یہاں حجارة سے مراد گندھک کا سیاہ پتھر ہے (1)۔ اور صدر اول میں اس کے متعلق کوئی اختلاف حکایت نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد تمام پتھر ہیں تا کہ آگ کی بڑائی پر دلالت ہو۔ بعض نے فرمایا حجارة سے مراد کفار کے بت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کلام کے شروع میں لفظ "اِنْ" ذکر فرمایا ہے جو شک کا معنی دینے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ مگر یہاں اذا ہونا چاہئے تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ شکوک وشبہات کے عیب سے پاک ہے۔ فرماتے ہیں ان سے استہزاء کے طور پر یہ انداز اختیار فرمایا ہے یا ان سے ان کے گمان اور زعم کے مطابق خطاب فرمایا، کیونکہ ان کے نزدیک غور و فکر سے پہلے عجز متحقق نہ تھا۔

سے یہ جملہ مستانفہ ہے، النار سے حال ہے اور اعدت سے پہلے قد مضمر ہے، وقودها کی ضمیر سے حال نہیں ہے، خبر کی وجہ سے درمیان میں فاصلہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تمہاری آگ جہنم کی آگ کا سترواں جز ہے (بخاری، مسلم) (2)۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دوزخیوں میں سے آسان عذاب والا وہ ہوگا جس کی جوتیاں اور تسمے آگ کے ہوں گے اور ان کی وجہ سے اس کا دماغ ابل رہا ہوگا جیسے ہنڈیا ابلتی ہے، وہ یہ خیال کرے گا

1۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 131 مطبوعہ المکتبۃ الامیریہ مصر　　2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 462 (وزارت تعلیم)

کہ سب سے شدید عذاب اسے ہو رہا ہے حالانکہ سب سے ہلکا عذاب اسے دیا جا رہا ہے(1) (متفق علیہ)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آگ کو ہزار سال جلایا گیا حتیٰ کہ وہ سرخ ہو گئی پھر ہزار سال مزید اسے جلایا گیا حتیٰ کہ سفید ہو گئی پھر ہزار سال مزید اسے جلایا گیا یہاں تک کہ سیاہ ہو گئی، اب وہ سیاہ اور تاریک ہے، اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میں تمہیں آگ سے ڈراتا ہوں، میں تمہیں آگ سے ڈراتا ہوں(3) آپ یہی جملہ بار بار دہراتے رہے حتیٰ کہ اگر آپ ﷺ میری جگہ ہوتے تو بازار والے سن لیتے۔ اور اس جوش سے آپ یہ کلمہ دہراتے رہے حتیٰ کہ آپ ﷺ کی چادر مبارک قدموں پر گر پڑی۔ اس آیت اور ان احادیث میں دلیل ہے کہ دوزخ اب بھی موجود ہے۔

وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵

"اور خوشخبری دیجئے انہیں جو ایمان لائے [1] اور کئے نیک عمل [2] کہ یقیناً ان کے لئے باغات ہیں بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں [3] جب کھلایا جائے گا انہیں ان باغوں سے کوئی پھل (تو صورت دیکھ کر) کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے کھلایا گیا تھا۔ اور دیا گیا انہیں پھل (صورت میں) ملتا جلتا [4] اور ان کے لئے جنت میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے [5]"

[1] سابقہ جملہ پر معطوف ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادت مطہرہ ہے کہ ترغیب و ترہیب کو اکٹھا ذکر فرماتے ہیں، کہیں پہلے ترغیب ہے اور بعد میں ترہیب کہیں اس کے برعکس ترہیب پہلے اور بعد میں ترغیب کا ذکر ہے۔ یہاں ترکیبی لحاظ سے فعل کا فعل پر عطف نہیں بلکہ مجموعی صورت کا دوسری مجموعی کیفیت پر عطف ہے، اس لئے مناسبت کی بھی ضرورت نہیں۔ یا اس کا عطف فاتقوا پر ہے یعنی ایمان لاؤ اور آگ سے بچو اور تمہیں جنت کی بشارت ہو۔ جس طرح منافقین کو صراحۃً وعید اور سزا سنائی اس طرح مومنین کو صراحۃً خوشخبری نہیں سنائی بلکہ کسی اور کے واسطہ سے خوشخبری سنائی، یہ انداز مومنین کی عظمت شان کے بیان کے لئے ہے کیونکہ انہوں نے ایمان اور تقویٰ اختیار فرمایا تھا اور اس اسلوب کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ بشارت اور مبارک کے حقدار ہیں۔

البشارۃ:۔ خوش کن خبر کو کہتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (انہیں عذاب الیم کی خوشخبری دو) یہ بطور استہزاء اور طنز ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ خوش کن خبر کے لئے مخصوص نہیں بلکہ خیر و شر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر خیر میں زیادہ اور شر میں کم مستعمل ہوتا ہے۔ الصالحٰت:۔ جمع ہے صالحۃ کی اور صالحۃ ان صفات میں سے ہے جو بطور اسم استعمال ہوتی ہیں (اس لئے اس کا موصوف ذکر نہیں کیا جاتا)۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 115 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 83 (وزارت تعلیم)
3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 78 (العلمیہ)

1۔ الاعمال الصالحۃ:۔ نیک اعمال وہ ہوتے ہیں جنہیں شرع پسند کرے۔ الصالحت کی تانیث اَلْخَصْلَۃُ کی تاویل کی وجہ سے ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت معاذ نے فرمایا عمل صالح وہ ہے جس میں یہ چار چیزیں موجود ہوں علم، نیت، صبر اور اخلاص (1)۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا مطلب ہے انہوں نے ریاء سے پاک اعمال کئے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اعمال، ایمان کی ذات سے خارج ہیں (کیونکہ ان کو معطوف اور معطوف علیہ کی شکل میں ذکر فرمایا ہے) دوسرا یہ کہ اس بشارت کے مستحق ہونے کا سبب تام، ایمان اور عمل صالح دونوں کا مجموعہ ہے۔

2۔ اَنَّ لَهُمْ:۔ یا تو حرف جر کے حذف کے ساتھ منصوب ہے اور بلا واسطہ فعل اس کی طرف متعدی کیا گیا ہے یا حرف جر کے اعتبار کے ساتھ مجرور ہے۔

جنّٰت:۔ یہ جنّۃ کی جمع ہے جس کا مطلب باغ ہے، باغ کو جنت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ درختوں کے ساتھ ڈھکا ہوا ہوتا ہے۔ جنت کے درختوں اور جنت کے محلوں کے نیچے نہریں چلتی ہیں۔ الانھار سے پہلے ماء (پانی) کا لفظ مضمر ہے یا مجازاً بہنے کی نسبت نہر کی طرف کی گئی ہے (کیونکہ پانی بہتا ہے نہر نہیں بہتی اس کو بلاغت میں یوں کہتے ہیں کہ محل بول کر حال مراد لیا گیا ہے) حدیث شریف میں ہے جنت کی نہریں بغیر کھائیوں کے چلتی ہیں (2)۔ اس حدیث کو ابن مبارک، ابن جریر اور بیہقی نے نقل کیا ہے الانھار پر الف لام جنس کا ہے۔

3۔ کلما رزقوا کا جملہ ترکیبی لحاظ سے جنت کی دوسری صفت ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے، جو ھم ضمیر ہے، یا یہ جملہ مستانفہ ہے، جو ایک مقدر سوال کا جواب ہوتا ہے کہ انہیں جب جنت کا پھل ملے گا تو وہ کیا کہیں گے، یعنی جنت کے پھلوں کو دیکھ کر جو حالت ہوگی اس کو یہ جملہ بیان کر رہا ہے۔ کلما ہقالوا کی ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور رزقا مفعول بہ ہے۔ اور دونوں مِنْ ابتدائیہ ہیں یا پہلا ابتدائیہ اور دوسرا بیانیہ ہے اور دونوں رزقا بمعنی مرزوق سے حال ہیں۔ یعنی جب وہ رزق کھائیں گے جس کی ابتداء جنت سے ہوگی اور پھلوں سے ہوگی۔ پہلا ذو الحال رزقا اور دوسرا ذو الحال وہ ضمیر ہوگی جو پہلے حال میں پوشیدہ ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ جو انہیں رزق دیا جائے گا وہ متواتر ہوگا اپنے افراد کے پے در پے آنے کے ساتھ۔ یا خبر میں مضاف محذوف ہے یعنی مِثْلُ الَّذِیْ رُزِقْنَا:۔ مثل کو حذف کیا گیا، تاکہ یہ ظاہر ہو کہ صورت میں جنت کے پھل بعینہٖ دنیا کے پھلوں جیسے ہوں گے۔ من قبل:۔ یعنی اس سے پہلے دنیا میں (جمیں ایسا رزق دیا گیا ہے) جنت کے پھلوں کو دنیا کے پھلوں کے ساتھ مشابہت اس لئے دی گئی ہے تاکہ غیر مانوس ہونے کی وجہ سے طبیعت متنفر نہ ہو اور جب ذائقہ چکھیں تو فضیلت ظاہر ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں جنت کے پھل رنگ میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے مگر ذائقہ میں مختلف ہوں گے۔ بار بار یہ قول وہ خوشی کی وجہ سے کہیں گے کیونکہ وہ ان پھلوں کو صورت میں ایک دوسرے کے بالکل مشابہ پائیں گے مگر لذت میں بالکل مختلف۔ واتوا بہ: ضمیر کا مرجع رزق ہے۔ متشابھا، ملتا جلتا: پہلے معنی کی صورت میں (یعنی شکل میں ملتا جلتا) ضمیر کا مرجع وہ رزق ہوگا جو انہیں دارین میں دیا گیا۔ یہ جملہ معترضہ ہے جو سابقہ کلام کی تاکید و تقریر کے لئے ہے۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے فرمایا رنگ میں متشابہ اور ذائقہ میں مختلف ہوں گے۔ حضرت حسن اور قتادہ نے فرمایا جنت کے پھل جودت اور عمدگی میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے کیونکہ ان میں کوئی گھٹیا پھل نہ ہوگا (3)۔ امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر بن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 134 مکتبہ التجاریہ الکبری مصر
2۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 132 الکبری الامیریہ مصر
3۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 134 الکبری الامیریہ مصر

عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت کھائیں گے پئیں گے (مگر) پیشاب اور پاخانہ نہ کریں گے، نہ وہ ناک صاف کریں گے، نہ وہ تھوکیں گے ان کو حمد اور تسبیح کا اس طرح الہام ہوگا جیسے سانس آتا جاتا ہے۔ ان کا کھانا ڈکار کی شکل میں تحلیل ہو جائے گا، پسینہ مشک کی طرح ہوگا (1)۔ اس آیت کریمہ کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہوسکتا ہے وہ یہ کہ اس سے مراد وہ ثواب ہوگا جو انہیں ان کے اعمال اور معارف پر دیا جائے گا۔ اس کی مثال وعید میں یوں ہے ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ تم چکھو جو تم کرتے تھے۔ امام ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت کی مٹی پاکیزہ ہے، پانی میٹھا ہے اور یاد رکھو جنت بالکل ہموار میدان ہے، اس کے درخت۔ سبحان اللّٰه، الحمد للّٰه اور اللّٰه اکبر ہیں (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا :۔ ان کو جو رزق دیا گیا ان کی معارف اور طاعات کے شرف اور فضیلت کے مقابل ہے مگر ان کے اعمال کے تفاوت کے اعتبار سے مختلف ہے۔ امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں سو درجات ہیں ہر دو درجات کے درمیان سو سال کی مسافت ہے (3)۔ حضرت عبادہ بن الصامت سے بھی اسی طرح مروی ہے اور ان کی حدیث میں اس طرح ہے کہ دو درجات کے درمیان اتنی مسافت ہے جتنی زمین و آسمان کے درمیان ہے۔ یہ حدیث صاحب المصابیح نے الصحاح میں ذکر کی ہے اور امام ترمذی نے بھی روایت کی ہے (3)

وَلَهُمْ فِيْهَآ:۔ ھا ضمیر کا مرجع جنتیں ہیں، ازواج ایسی بیویاں ہوں گی جو حوریں ہیں۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا یہی تمہاری بوڑھیاں معیوب اور کوتاہ چشم بیویاں دنیا کی ہر آلائش سے پاک ہونگی، مطھرۃ پیشاب، پاخانہ، حیض، تھوک، رینٹھ، منی اور ہر قسم کی ناپسندیدہ چیز سے پاک ہونگی اور ہر قسم کی بداخلاقی سے بھی منزہ اور مبرا ہونگی۔ تطہیر کا مادہ اجسام، افعال اور اخلاق تمام کے لئے استعمال ہوتا ہے مطھر کا لفظ طاھرۃ اور مطھرۃ سے زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ مطھرۃ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر جسمانی اور اخلاقی آلائش سے پاک فرمایا ہے، زوج کا لفظ مذکر، مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور اصل میں ہر اس چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کا دوسرا فرد اس کی جنس سے موجود ہو۔ جیسے "زوج الخف" (موزہ کا جوڑا)۔

وھم فیھا میں ھا ضمیر کا مرجع جنتیں ہے، خالدون یعنی وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، نہ انہیں موت آئے گی اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے نعمتوں کا ذکر فرمایا تو پھر ان سے زوال کا خوف بھی زائل کر دیا۔ کیونکہ اگر نعمت کے زائل ہونے کا خدشہ ہو تو ان نعمت کا مزہ مکدر ہو جاتا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہوگا وہ چودھویں کے چاند کی طرح ہوگا، پھر جو ان کے بعد داخل ہوں گے وہ آسمان کے چمکدار ستارے سے بھی زیادہ روشن ہوں گے، نہ وہ پیشاب کریں گے، نہ پاخانہ کریں گے، نہ تھوکیں گے اور نہ ناک صاف کریں گے، ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی اور ان کا پسینہ نری مشک ہوگا، ان کی انگیٹھیوں میں عود کی لکڑی سلگتی ہوگی، ان کی بیویاں حوریں خوبصورت آنکھوں والیاں ہوں گی، ان کے اخلاق ایک جیسے ہوں گے، ان کا قد اپنے باپ آدم کی صورت پر آسمان میں ساٹھ گز لمبا ہوگا (4)۔ (متفق علیہ) حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہوگا ان کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح چمکدار ہوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 35 المکتبۃ التجاریہ مصر 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 182 (الفاظ مختلف) (وزارت تعلیم)
3۔ ایضاً جلد 2 صفحہ 76 4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 379 (قدیمی)

گے، دوسرے گروہ کے لوگ آسمان میں خوبصورت ستارے کی طرح ہوں گے۔ ہر مرد کی دو بیویاں ہوں گی، ہر بیوی پر ستر لباس ہوں گے۔ ان کی پنڈلیوں کا گودا ان کے گوشت، خون اور لباسوں کے اندر سے نظر آئے گا۔(1) (ترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر جنت کی عورتوں میں سے کوئی ایک زمین پر جھانکے تو زمین و آسمان کے درمیان جو کچھ ہے وہ روشن ہو جائے اور اس کی خوشبو سے بھر جائے اور اس کے سر کا دوپٹہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے(2)۔ حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: غور سے سنو، کوئی جنت کے لئے تیار ہے، جنت ایسی چیز ہے جس کا خیال کسی دل میں نہیں کھٹکا، یہ جنت، رب کعبہ کی قسم نور ہے جو چمک رہا ہے، خوشبو ہے جو مہک رہی ہے، بلند و بالا پختہ محل ہے، رواں نہریں ہیں، پکا ہوا پھل ہے، خوبصورت حسین سیرت زوجہ ہے، بے شمار مختلف لباس ہیں، سلامتی والے گھر میں ہمیشہ رہنا ہے، پھل ہے اور سبزہ ہے، لباس ہے اور خوش کن بلند و بالا نعمتیں ہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم اس کے لئے تیار ہیں آپ ﷺ نے فرمایا، کہو ان شاء اللہ(3)۔ اس حدیث کو امام بغوی نے روایت کیا ہے حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت بے ریش اور سرگیں آنکھوں والے ہوں گے، نہ ان کی جوانی فنا ہوگی اور نہ ان کے کپڑے پرانے ہوں گے(4)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح روایت کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنت میں ایک بازار ہے جس میں خرید و فروخت نہیں مگر مردوں اور عورتوں کی صورتیں ہیں جب کوئی جنتی شخص کسی صورت کا شوق دل میں لائے گا تو وہ صورت آجائے گی، جنت میں حوریں اور موٹی موٹی آنکھوں والیاں جمع ہیں وہ ایک ایسی آواز سے پکاریں گی کہ مخلوق نے ایسی آواز پہلے نہ سنی ہوگی۔ وہ کہیں گی ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں، ہم کبھی فنا نہ ہوں گی، ہم نرم جسم اور نرم خو ہیں، ہم کبھی سخت اور تند خو نہ ہوں گی۔ ہم ہمیشہ خوش رہنے والیاں ہیں، ہم کبھی ناراض نہ ہوں گی، مبارک ہو انہیں جو ہمارے لئے ہیں اور ہم ان کے لئے ہیں(5)۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع نقل کی ہے۔ احمد بن منیع نے ابو معاویہ سے اسی طرح مرفوع نقل کی ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں ایک بازار ہے جس میں جنتی ہر جمعہ کو آئیں گے، شمال کی طرف سے ہوا چلے گی جو ان کے چہروں اور کپڑوں کو لگے گی تو ان کے حسن و جمال میں اضافہ ہو جائے گا۔ وہ اپنے اہل کی طرف لوٹیں گے تو ان کے حسن و جمال میں بھی اضافہ ہو چکا ہوگا۔ ان کے اہل انہیں کہیں گے قسم بخدا تمہارے تو حسن و جمال میں اضافہ ہو چکا ہے وہ کہیں گے قسم بخدا تمہارے بھی حسن و جمال میں اضافہ ہو چکا ہے۔(6)

میں (مفسر) کہتا ہوں چونکہ اہل دنیا فقط دنیا کی نعمتوں، مکانات، ماکولات اور نکاح کو ہی جانتے اور سمجھتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اور اس کے پیارے نبی ﷺ نے ایسی ہی چیزوں کو جنت کے تعارف میں ذکر فرمایا ہے، حالانکہ اہل جنت کے لئے بہت بڑی نعمتیں تیار ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لئے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جنہیں نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ کسی کان نے ان کے متعلق سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا تصور آیا ہے، اگر تم چاہو تو یہ آیت کریمہ پڑھو: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ (کوئی نفس نہیں جانتا کہ کونسی چیز ان کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 35۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبری مصر
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 972 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 35 المکتبۃ التجاریۃ الکبری مصر
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 77
5۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 35 (التجاریۃ)
6۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 379 (قدیمی)

آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے مخفی رکھی ہوئی ہے)(1) (متفق علیہ)۔ حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جنت میں لاٹھی رکھنے کی جگہ دنیا وما فیہا سے بہتر ہے (متفق علیہ)۔ حضرت ابوسعید سے مرفوعاً مروی ہے اللہ تعالیٰ جنتیوں کو فرمائے گا میں تم پر اپنی رضا کا اظہار کرتا ہوں، اس کے بعد کبھی تم پر ناراض نہیں ہوں گا(2) (متفق علیہ)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حجاب اٹھائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے، اللہ تعالیٰ کے دیدار سے کوئی چیز زیادہ محبوب نہ ہوگی۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ (ان کے لئے جنہوں نے نیک عمل کئے نیک جزاء ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ)۔(3)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں کم ترین درجہ پر وہ ہوگا جو اپنے باغات، ازواج، نعمتوں، خدام اور پلنگوں کو ہزار سال کی مسافت سے دیکھے گا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز ترین وہ شخص ہوگا جو صبح وشام اللہ تعالیٰ کا دیدار کرے گا۔ پھر یہ آیت پڑھی: وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ۝ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ (کئی چہرے اس روز تر وتازہ ہوں گے اور اپنے رب کے (انوار جمال) کی طرف دیکھ رہے ہوں گے)(4)۔

ابن جریر نے السدی سے کئی اسناد کے ذریعے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں مثالیں منافقین کے لئے بیان فرمائی ہیں یعنی مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا اور أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ منافقین ان مثالوں کو سن کر کہنے لگے اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ اس قسم کی مثالیں بیان فرمائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ۝

"بے شک اللہ حیا نہیں فرماتا اس سے کہ ذکر کرے کوئی مثال مچھر کی ہو یا اس سے بھی حقیر چیز کی ۱؎ تو جو ایمان لائے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ مثال حق ہے ان کے رب کی طرف سے (اتری ہے) ۲؎ اور جنہوں نے کفر کیا سو وہ کہتے ہیں کیا قصد کیا اللہ نے اس مثال کے ذکر سے۔ گمراہ کرتا ہے اللہ اس سے بہتیروں کو اور ہدایت دیتا ہے اس سے بہتیروں کو ۳؎ اور نہیں گمراہ کرتا اس سے مگر نافرمانوں کو ۴؎"

۱؎ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اللہ نے مشرکین کے معبودوں کا ذکر کیا تو فرمایا وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا، ان کے مکروفریب کا ذکر کیا تو فرمایا لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوتِ مشرکین یہ سن کر کہنے لگے دیکھا ان کا خدا مکھی اور مکڑیوں کا ذکر کرتا ہے(5) اس قول کو الواحدی نے عبدالغنی عن ابن عباس کے طریق سے نقل کیا ہے جبکہ عبدالغنی انتہائی کمزور راوی ہے۔ اس قول کے صحیح نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ آیت مدنی ہے اور مشرکین سے معارضہ مکہ میں ہوا تھا۔ پہلا قول معنی اور سند کے اعتبار سے اصح ہے۔ حیا کا مطلب ہے مذمت کے خوف سے کسی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 460 (وزارت تعلیم)　2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 461-460 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 100 (قدیمی)　4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 78 (وزارت تعلیم)
5۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 88 (العلمیہ)

قبیح فعل سے نفس کا رک جانا اور حیاء وقاحت اور تجل کی درمیانی کیفیت کا نام ہے وقاحت کا مطلب برائی اور قباحت کی جرأت کرنا اور برائی کی پرواہ نہ کرنا ہے اور تجل کا مطلب ہے مطلقاً کسی فعل سے نفس کا رک جانا (خواہ اچھا ہی ہو) جب اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ حیاء کا لفظ استعمال ہو تو حیاء سے مراد ترک کرنا اور چھوڑنا ہوتا ہے۔ جو انقباض کا نتیجہ اور لازم ہوتا ہے، مثلاً حدیث شریف میں ہے: اللہ تعالیٰ مسلمان بوڑھے کو عذاب دینے سے حیا فرماتا ہے(1)۔ اس حدیث کو امام بیہقی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے اور ابن ابی الدنیا نے حضرت سلمان سے روایت کیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

إِنَّ اللّٰهَ حَيِيٌّ كَرِيمٌ إِذَا رَفَعَ إِلَيْهِ الْعَبْدُ يَدَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا

بیشک اللہ تعالیٰ حیاء فرمانے والا اور کریم ہے جب بندہ اس کی جناب میں ہاتھ اٹھاتا ہے تو انہیں خالی لوٹانے سے اسے حیاء آتی ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے(2) اور حاکم نے حضرت سلمان سے اسے صحیح کہا ہے۔

یہاں حیاء کا لفظ استعمال ہوا ہے حالانکہ حیاء کا معنی قبیح چیز کو ترک کرنا ہے اور مثال بیان کرنا تو قبیح نہیں ہے (تو پھر حیاء کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا)۔ کفار کے کلام میں حیاء کا لفظ تھا اور ان کے ذہنوں میں یہ لفظ قرار پذیر تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے کلام کے رد میں وہی لفظ استعمال کیا جو انہوں نے استعمال کیا تھا۔ اس قسم کی ترکیب قرآن حکیم میں دوسرے مقامات پر بھی وارد ہے جیسے وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (برائی کی جزاء برائی کی مثل برائی ہے)، (حالانکہ برائی کی جزاء برائی نہیں عین انصاف ہوتا ہے) ضرب المثل کا مطلب ہے مثال بیان کرنا اور اس کی اصل کسی چیز کا دوسری چیز پر واقع ہونا ہے۔ خلیل نحوی کے نزدیک "اَنْ يَّضْرِبَ" "اَنْ" اپنے صلہ کے ساتھ مل کر من مضمرہ کے ساتھ مجرور ہے۔ اور سیبویہ کے نزدیک من محذوف ہے اور فعل بلا واسطہ اس کی طرف متعدی کیا گیا ہے اس لئے یہ منصوب ہے۔ ما ابہامیہ ہے جو نکرہ کے ابہام کو زیادہ کرتا ہے اور ہر قسم کی تقیید کے راستہ کو بند کر دیتا ہے، یا یہ ما زائدہ ہے، جو اس لئے وضع کیا گیا ہے کہ دوسرے لفظ کے ساتھ ذکر کیا جائے اور اسے لفظاً یا معنیً قوت عطا کرے۔

البعوض کا وزن فعول ہے جو بعض سے مشتق ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ مگر اب چھوٹے مچھروں کے لئے استعمال ہوتا ہے، مطلب یہ ہوا کہ کوئی ایک مچھر۔ اس کے آخر میں ۃ وحدت کے لئے ہے اور یہ مَثَلًا کا عطف بیان ہے یا يَضْرِبُ کا مفعول اور مَثَلًا حال ہے یا مَثَلًا اور بَعُوضَةً دونوں يَضْرِبُ کے مفعول ہیں یہ اس لئے کہ يَضْرِبُ میں جعل کا معنی پایا جاتا ہے۔ فَمَا فَوْقَهَا کا عطف بَعُوضَةً پر ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ وہ چیز جو جثہ میں مچھر سے زائد ہو جیسے مکھی، مکڑی وغیرہ۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے مچھر کی مثال کو ترک نہیں فرمایا چہ جائیکہ کوئی چیز اس سے بڑی ہو۔ یا اس کا مطلب ہے کہ وہ چیز حقارت میں مچھر سے زائد ہو یعنی جثہ میں اس سے کم ہو۔

پس مومنین جانتے ہیں کہ یہ مثال یا مثال دینا حق ہے۔ حق کا مطلب کسی چیز کا اس طرح ہونا کہ اس کا انکار ممکن نہ ہو جیسے کہا جاتا ہے ثَوْبٌ مُحَقَّقٌ ایسا کپڑا جس کی بناوٹ مستحکم اور پختہ ہو۔ (مومنین جانتے ہیں کہ یہ حق ہے کیونکہ مثال سے مقصود مشبہ کے اخفاء کو دور کرنا ہوتا ہے، اس میں کوئی اعتراض والی بات نہیں ہے مثال کے لئے صرف یہ شرط ہوتی ہے کہ) حقیر چیز کو حقیر چیز کے ساتھ اور عظیم کو عظیم کے ساتھ تشبیہ دی جائے۔ اگرچہ مثال دینے والا کتنا ہی عظیم المرتبت اور عظیم الشان ہو۔

1۔ کنز العمال، جلد 15 صفحہ 666 مؤسسۃ الرسالۃ بیروت　　2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 195 (وزارت تعلیم)

ے مگر کافر اپنی انتہائی جہالت کی وجہ سے اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ وہ کہتے ہیں اللہ اس مثال سے کیا ارادہ فرماتا ہے۔ اس کلام میں ما استفہامیہ مبتدا ہے اور ذا بمعنی الذی اپنے صلہ کے ساتھ مل کر اس کی خبر ہے۔ یا ماذا ایک اسم ہے جو ای شیء کے معنی میں مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ الارادۃ۔ یہ ایک صفت ہے جو دو تقدیروں میں سے ایک کو ترجیح دیتی ہے۔ ھذا کے لفظ میں استحقار ہے اور مَثَلاً تمیز یا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یہ جملہ ماذا کا جواب ہے اصل میں اضلال کثیر و اھداء کثیر کی تقدیر میں ہے، یہاں ہر گروہ کو کثیر کہا گیا ہے۔ کیونکہ ہر گروہ اپنی ذات کے اعتبار سے کثیر تھا۔ مصدر کی جگہ فعل اس لئے ذکر کیا تا کہ تجدد اور حدوث پر دلالت کرے۔ یعنی جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی ہے تو ایک قوم اس پر ایمان لاتی ہے اور ہدایت حاصل کرتی ہے جبکہ دوسری قوم اس کا انکار کرتی ہے اور گمراہ ہوتی ہے۔

ے فاسقین سے مراد وہ لوگ جو ایمان کی حد اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے خارج ہونے والے ہیں۔ فسقت الرطبۃ اس وقت بولا جاتا ہے جب سبزی اپنے چھلکے سے باہر آ جائے۔ اصطلاح شرع میں فسق گناہ کبیرہ کے ارتکاب کو کہتے ہیں۔ اس کے تین درجات ہیں؛ پہلا درجہ اس چیز کا انکار کرنا ہے جس پر ایمان لانا واجب تھا، کفر تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے، قرآن حکیم میں اکثر مقامات پر فسق سے کفر مراد ہے، دوسرا درجہ کبیرہ گناہوں میں منہمک ہونا ہے اور تیسرا درجہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب اور گناہ صغیرہ کو برا سمجھ کر اس پر اصرار کرنا ہے۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

”وہ جو توڑتے رہتے ہیں عہد خداوندی کو اسے پختہ باندھنے کے بعدا اور کاٹتے رہتے ہیں اسے، حکم فرمایا اللہ نے جس کے جوڑنے کا ۲ اور فساد مچاتے رہتے ہیں زمین میں ۳ وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں ۴“

ا الَّذِيْنَ۔ اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر فاسقین کی صفت ہے جس کا مقصود فسق کی تقریر اور مذمت ہے، اگر الفاسقین سے مراد کفار اور گناہ گار سے عام مفہوم ہو تو یہ موصول اپنے صلہ سے مل کر فاسقین کی صفت بطور تقیید ہوگا۔ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ۔ یہاں عہد سے مراد وہ وعدہ ہے جو بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے تورات میں لیا تھا کہ وہ محمد ﷺ پر خلوص دل سے ایمان لائیں، آپ ﷺ کی صفات عالیہ کو لوگوں کے سامنے بیان کریں اور آپ کی عظمت و رفعت کو چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ یا اس عہد سے مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ فرما کر تمام روحوں سے اپنی ربوبیت کا اعتراف طلب کیا تھا اور جواباً تمام نے بلٰی کہہ کر اس کی ربوبیت کو تسلیم کیا۔ النقض کا معنی رسی کی ترکیب کو جدا جدا کرنا ہے، عہد کے ابطال کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ عہد کے لئے رسی کو استعارۃً استعمال کیا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ معاہدہ کرنے والوں کے درمیان بھی رسی کے اجزاء کی طرح ربط ہوتا ہے۔ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ کی ضمیر کا مرجع عہد ہے اور میثاق وثوق کے معنی میں مصدر ہے یا یہ اسم ہے اس کا جس کے ذریعے عہد کو پختہ کیا جائے جیسے آیات اور کتب۔ اور من ابتدائیہ ہے کیونکہ نقض کی ابتداء میثاق کے بعد ہوتی ہے۔

۲ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ۔ بہ کی ضمیر مجرور سے ان یوصل بدل ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء پر ایمان لانے کے اتصال کا حکم دیا ہے (جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا) لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے) مگر وہ توڑتے ہیں جس کا اللہ تعالیٰ نے ملانے کا حکم دیا ہے اور کہتے ہیں ہم بعض کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ یا اس

قطع سے مراد رشتہ داری اور صلہ رحمی کا قطع کرنا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ملانے کا حکم دیا ہے۔

؎ بدکاریاں کر کے اور قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کا انکار کر کے زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، کھیتیوں کو اجاڑ کر اور انسانوں کو قتل کر کے فساد کی آگ بھڑکاتے ہیں۔

؎ یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں کیوں کہ انہوں نے صلاح کی بجائے فساد کو اختیار کیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے کفار کے اوصاف اور ان کی لایعنی اور بیہودہ گفتگو کا ذکر کر لیا تو التفات کے طریقہ پر ان کی اس حالت کے متعلق استفہام انکاری کے ذریعے ان سے خطاب فرمایا جس حالت پر کفر واقع ہے کیونکہ ہر حالت جو بھی انہیں لاحق ہوئی مثلاً عدم، وجود، موت اور پھر زندگی یہ تمام حادثات ہیں جو واجب الوجود ذات سے صادر ہوئے ہیں اور یہ تمام حالات وحادثات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہیں، یہ تقاضا کرتے ہیں کہ اس پر ایمان لایا جائے اور اس کا دل وجان سے شکر ادا کیا جائے، نہ کہ اس کا کفر اور انکار کیا جائے۔ اس آیت کریمہ کے اسلوب میں ان کے کفر پر بلیغ طریقہ سے زجر وتوبیخ کی گئی ہے، فرمایا:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

"کیونکر تم انکار کرتے ہو اللہ کا حالانکہ تم مردہ تھے ؎ اس نے تمہیں زندہ کیا ؎ پھر تمہیں مارے گا ؎ پھر تمہیں زندہ کرے گا ؎ پھر اس کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے ؎"

؎ تم اللہ تعالیٰ کا کیوں انکار کرتے ہو جبکہ اس کے وجود پر ان گنت دلائل موجود ہیں وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا اور تم فقط عناصر، غذائیں، ملا جلا پانی، نطفے، جما ہوا خون، گوشت کے لوتھڑے اور بغیر روحوں کے اجسام تھے (اس نے روح پھونک کر تمہیں زندگی عطا فرمائی) اگرچہ انسان دس اجزاء سے مرکب ہے، جن میں سے پانچ کا تعلق عالم خلق سے ہے مثلاً عناصر اربعہ اور نفس حیوانی جو ان عناصر سے پیدا ہوتا ہے، اور پانچ کا تعلق عالم امر سے ہے، مثلاً قلب، روح، سر، خفی، اخفی جیسا کہ فراست اسلامیہ سے ظاہر ہوا ہے، اس آیت میں دلیل ہے کہ ان دس عناصر میں بنیادی اور عمدہ چار عناصر ہیں خصوصاً مٹی کا عنصر۔ اس لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ اور کافر یعنی شیطان کہے گا يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا۔ کاش میں مٹی ہوتا۔ اسی وجہ سے انسان اللہ کی رؤیت کے ساتھ مختص ہے جبکہ لوگ مشاہدہ قلبیہ کو بے فائدہ چیز سمجھتے ہیں۔

؎ فاحیاکم:۔ اس نے تمہیں ارواح خمسہ سے مرکب کر کے پیدا فرمایا۔ فاء کے ذریعے عطف فرمایا کیونکہ احیاء اور موت جو عناصر کو لازم ہیں، کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔

؎ ثم یمیتکم:۔ پھر وہ تمہیں موت دے گا جب تمہاری مقدر زندگی کی مدت اختتام کو پہنچ جائے گی۔ پہلی موت کو نعمتوں میں شمار کیا کیونکہ عدم کے بعد وجود سراپا نعمت اور خیر ہے۔ پس موجود حقیقی کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے یہ نعمت ہے اور دوسری موت کو اس لئے نعمت شمار کیا کیونکہ وہ حیات ابدی کا وسیلہ ہے۔

؎ ثم یحییکم:۔ پھر جب صور پھونکا جائے گا تو وہ تمہیں زندہ کرے گا، مگر قبر میں انسان زندہ نہیں ہوتا کیونکہ زندگی اجزاء عشرہ کی ترکیب سے عبارت ہے اور یہ چیز قبور میں نہیں ہوتی، لیکن اجزاء عشرہ کی ترکیب کا نہ ہونا قبر میں ثواب وعذاب کے منافی نہیں ہے کیونکہ

عذاب وثواب اجزاء کے بسائط پر ہوتا ہے۔ ایماندار کے لئے عذاب قبر اور ثواب قبر کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ (ہر چیز اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے) اسی طرح ارشاد فرمایا: أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ (کیا تم ملاحظہ نہیں کر رہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہی سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے نیز آفتاب، مہتاب، ستارے، پہاڑ، درخت اور چوپائے اور بہت سے انسان بھی (اسی کو سجدہ کرتے ہیں)

اسی طرح حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ إِنَّ الْجَبَلَ يُنَادِي الْجَبَلَ بِاسْمِهِ، پہاڑ کو پہاڑ نام لیکر پکارتا ہے کیا تیرے پاس سے کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا گزرا ہے؟ جب وہ کہتا ہے ہاں تو وہ خوش ہوتا ہے، اس حدیث کو طبرانی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔

ایک اور ارشاد ہے: إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا (ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے (کہ وہ اس کی ذمہ داری اٹھائیں) تو انہوں نے انکار کر دیا اس کے اٹھانے سے اور وہ ڈر گئے اس سے۔)

یہاں دلالت حال کی تسبیح وسجود مراد نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے اس طرح دوسرا ارشاد: وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ بھی اس کا انکار کرتا ہے۔

ؔ پھر حشر کے بعد تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے اور وہ تمہیں اپنے اعمال کی جزا دے گا۔ یعقوب نے تمام قرآن میں ترجعون کو تاء اور یاء کے فتحہ کے ساتھ معروف پڑھا ہے۔ یہ آیت کریمہ مدنی ہے اور خطاب کفار اور یہودی منافقین سے ہے جو قیامت کے بارے میں جانتے تھے۔ اگر خطاب قیامت کے منکرین کو ہو تو اس اسلوب کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلائل کے قیام کے بعد قیامت کا علم ان کے ذہنوں میں آچکا تھا اور اس پر انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ جو ابتداءً ان کے احیاء پر قادر تھا وہ انہیں وہ دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾

"وہی تو ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب [1] پھر توجہ فرمائی اوپر کی طرف [2] تو ٹھیک ٹھیک بنا دیا انہیں سات آسمان [3] اور وہ سب کچھ خوب جانتا ہے [4]۔"

[1] یعنی دنیا کی تمام اشیاء تمہارے فائدہ کے لئے ہیں، بعض سے تم بالواسطہ اور بعض سے بلا واسطہ نفع حاصل کرتے ہو اور ان میں تمہارا دینی فائدہ بھی ہے کہ تم ان اشیاء میں غور وفکر کر کے (توحید، رسالت اور قیامت پر ایمان پختہ کر سکتے ہو) مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ یہ آیت کریمہ دوسری نعمت کا بیان ہے جو پہلی نعمت پر مرتب ہے۔

[2] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین نے فرمایا کہ اس کا مطلب "اِرْتَفَعَ اِلَى السَّمَاءِ" ہے(1) (یعنی وہ آسمان کی طرف بلند ہوا) یہ جملہ متشابہات میں سے ہے جیسے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" (وہ بے حد مہربان فرمانروائی کے تخت پر متمکن ہوا)۔

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 91، دار الکتب العلمیہ بیروت

ابن کیسان، الفراء اور نحوی علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس کا معنی ہے وہ آسمان کی تخلیق کی طرف متوجہ ہوا اور اس کا قصد کیا۔ یہ عربوں کے قول اِسْتَوٰی اِلَیْهِ كَالسَّهْمِ الْمُرْسَلِ سے مشتق ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص سیدھا کسی چیز کا ارادہ کرے اور اس سے ذرا برابر بھی ادھر ادھر نہ ہو۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں یہاں ثم کا کلمہ زمین اور آسمان کی تخلیق کے درمیان فرق اور زمین کی تخلیق پر آسمان کی تخلیق کی فضیلت بیان کرنے کے لئے آیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ کے ذکر کے بعد ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ذکر فرما کر ایمان کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ثم اپنے حقیقی معنی تراخی وقت کے لئے نہیں ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا کے مخالف ہو گا۔ کیونکہ "وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا" کا قول زمین کے پھیلاؤ کے تاخر پر دلالت کرتا ہے اور آسمان کی تخلیق اور تسویہ کے مقدم ہونے پر دلالت ہے، جبکہ یہاں زمین کی تخلیق کا آسمان کی تخلیق سے مقدم ہونے کا ذکر ہے(1)۔ امام بغوی نے وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین کو آسمان سے پہلے تمام صلاحیتوں کے ساتھ پیدا فرمایا مگر اس کا پھیلاؤ آسمان سے مؤخر فرمایا تھا۔ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔ پھر آسمانوں کو پیدا فرمایا اس کے بعد زمین کو پھیلایا۔ بعض علماء نے فرمایا یہاں بعد بمعنی مع ہے یعنی زمین کو آسمان کی تخلیق کے ساتھ پھیلایا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے فرمان عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (اکھڑ مزاج ہے اس کے علاوہ بد اصل ہے) میں بعد بمعنی مع ہے، امام بغوی نے سورۂ حم السجدہ میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو اتوار اور سوموار کے دو دنوں میں پیدا فرمایا۔ منگل اور بدھ کے دو دنوں میں اس کی تمام خوراک اور صلاحیت اس میں پیدا فرمائی، پس کل چار ہو گئے فرمایا وَ قَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ۔ پھر جمعرات اور جمعہ کے دو دنوں میں آسمانوں کو پیدا فرمایا۔ اس لئے زمین کے ذکر کے بعد فرمایا فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔ سلف صالحین کے اقوال سے یہی مستفاد ہے جبکہ حقیقت اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ھن ضمیر السماء کے لئے ہے، اگر السماء سے مراد اجرام فلکیہ ہوں کیونکہ وہ جمع ہیں یا السماء جمع کے معنی میں ہے اس لئے ھن کی ضمیر لوٹانا صحیح ہے۔ اور سبع سموات ھن ضمیر سے بدل ہے یا ھن ضمیر مبہم ہے اور اس کا مابعد اس کی تفسیر ہے جیسے عربوں کے قول ربه رجلاً میں ہ ضمیر مبہم ہے اور رجلاً تفسیر ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ علماء فلکیات نے نو افلاک کا اثبات کیا ہے۔ فلک اطلس جو فلک افلاک ہے اور فلک ثوابت نواں فلک ہے ان دونوں کا جزء نہیں ہے، اور انہوں نے افلاک سبعہ کے اجزاء ثابت کئے ہیں ایک وہ جو مرکز سے خارج تین افلاک سے مرکب اور اس میں ستارا ہے۔ ایک متمم حاوی اور ایک متمم محوی ہے۔ ایک وہ جو پانچ افلاک سے مرکب ہے، ایک مرکز خارج اور دو متمم حاوی اور دو متمم محوی اور دوسرے افلاک جو ٹھوس ہیں جن میں ستارے مرتکز ہیں، اہل ہیئت اس کو فلک التدویر کہتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں انہوں نے افلاک کی تعداد ستاروں کی حرکات کی تعداد کے اعتبار سے ثابت کی ہے۔ جب علماء فلکیات نے تمام ستاروں اور سورج کو ایک دن اور ایک رات میں گردش کرتے دیکھا تو فلک الافلاک کو انہوں نے ثابت کیا کہ یہ تمام افلاک کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر ایک کو مشرق سے مغرب کی طرف حرکت قسریہ دینے والا ہے۔ پھر جب انہوں نے سات

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 60، آیت نمبر 29، تحت، ایم سعید کمپنی ملتان

ستاروں کے سوا باقی تمام ستاروں کی حرکت کو ایک طریق پر دیکھا اور حرکات سبعہ کو سرعت اور سستی میں مختلف طرق پر دیکھا اور عرض میں بروج شمالیہ سے بروج جنوبیہ کی طرف دیکھا اور اس کا برعکس دیکھا تو افلاک کی تعداد کو ان کی حرکات کے اعتبار سے ثابت کیا اور جب سورج کے علاوہ بقیہ سیارات کی حرکت کو کبھی تیز اور کبھی کمزور اور کبھی مشرق کی طرف، کبھی مغرب کی طرف اور کبھی ٹھہرا ہوا دیکھا تو ان کو تحیرہ کا نام دیا، اور انہوں نے تدویرات متعددہ کو ثابت کیا ہے۔ پس اس طرح افلاک کی تعداد تیس کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ جو شخص مکمل معلومات حاصل کرنا چاہے تو علم ہیئت کی طرف رجوع کرے۔ اثبات الافلاک ستاروں کی حرکات کے اعتبار سے باطل ہے کیونکہ یہ امور باطلہ پر مبنی ہے مثلاً ماہرین فلکیات کے نزدیک اجرام فلکیہ پر خرق والتیام ممتنع ہے، دوسرا یہ کہ تمام افلاک ایک دوسرے سے متصل ہیں جس طرح پیاز کے چھلکے ایک دوسرے کے اوپر جڑے ہوتے ہیں اور یہ چیز اس بات کو مستلزم ہے کہ فلک الافلاک کی حرکت کے ساتھ تمام افلاک کی حرکت ہوتی ہے، یہ تمام مفروضے باطل ہیں کیونکہ آسمان کا پھٹنا عقلاً جائز ہے اور نقلاً اس کا تسلیم کرنا واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (جب آسمان پھٹ جائے گا)۔ اسی طرح آسمانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ متصل نہ ہونا اور ہر دو آسمان کے درمیان بعد اور مسافت کا ثبوت بھی شرعاً موجود ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تشریف فرما تھے، کہ ان کے اوپر ایک بادل نمودار ہوا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تمہیں معلوم ہے یہ کیا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) بہتر جانتے ہیں فرمایا یہ بادل ہے، اللہ تعالیٰ اسے اس قوم کی طرف لے جا رہا ہے جو اس کا شکر ادا نہیں کرتی اور اس سے دعا نہیں مانگتی۔ پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو تمہارے اوپر کیا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا یہ آسمان محفوظ چھت اور ایک موج ہے جو رکی ہوئی ہے۔ پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو تمہارے درمیان اور اس سے پہلے آسمان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ پھر فرمایا تمہیں معلوم ہے اس آسمان کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اوپر دو آسمان ہیں جن کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے پھر اسی طرح آپ ﷺ نے سات آسمانوں کا ذکر کیا اور ہر دو آسمانوں کے درمیان زمین اور پہلے آسمان جتنی مسافت ذکر فرمائی۔ پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو ان ساتوں آسمانوں کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں فرمایا ان کے اوپر عرش ہے اور (فرمایا) عرش اور آسمان کے درمیان ہر دو آسمانوں کے درمیان جتنی مسافت ہے۔ پھر فرمایا تمہیں معلوم ہے تمہارے نیچے کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا وہ زمین ہے۔ پھر فرمایا اس زمین کے نیچے کیا ہے کچھ معلوم ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا اس زمین کے نیچے ایک اور زمین ہے اور ان دونوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے سات زمینوں کا ذکر فرمایا اور ہر دو زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت کو بیان فرمایا پھر فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے اگر تم نچلی زمین کی طرف ایک رسی کو لٹکاؤ تو وہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر گرے گی پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ (وہی اول ہے، وہی آخر

ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے اور وہی ہر چیز کو جاننے والا ہے)(1)۔ (رواہ الترمذی واحمد رحمہما اللہ تعالیٰ)۔

امام ترمذی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا یہ آیت تلاوت کرنا دلیل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت اور بادشاہی میں گرے گی۔ اور اللہ تعالیٰ کا علم ہر جگہ میں ہے۔ مگر وہ عرش پر ہے جیسا کہ اس نے خود اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں حضور ﷺ کا ارشاد لَهَبِطَ عَلَى اللّٰهِ متشابہات میں سے ہے جیسا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى متشابہات میں سے ہے۔ شاید حضور ﷺ کی مراد یوں ہو کہ وہ اسی عرش پر گرے گا اور عرش کا لفظ محذوف ہو۔ یہ دلیل ہے کہ عرش موجود ہے، اسی طرح عرش اور اس میں ساتوں آسمان کروی شکل میں ہیں اور زمین کی تمام جہات کو گھیرے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر تم نچلی زمین کی طرف ایک رسی کو لٹکاؤ تو ساتوں زمینوں پر اور اللہ تعالیٰ کے عرش پر گرے گی۔ عالی مرتبت صوفیاء کرام اسی طرح معیت کو ثابت کرتے ہیں مگر اس کی کوئی کیفیت نہیں اور اللہ کی خاص تجلیات جو بندۂ مومن کے دل پر ہوتی ہیں ان کو بھی ثابت کیا ہے اور بندۂ مومن کا دل عالم صغیر میں اللہ تعالیٰ کا عرش ہے، اسی طرح انہوں نے کعبہ پر مخصوص تجلی کو ثابت کیا ہے اور وہ تجلی اللہ کے گھر کے ساتھ خاص ہے، اس طرح انہوں نے عرش پر بھی اللہ تعالیٰ کی ایک مخصوص تجلی کو ثابت کیا ہے اور عرش عالم کبیر کا دل ہے۔ یہی وہ تجلی ہے جس کی طرف اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے مجازاً لهبط علی اللّٰه فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یَسَعُنِیْ قَلْبُ عَبْدِی الْمُؤْمِنِ: بندۂ مومن کا دل مجھے سما سکتا ہے۔ امام ترمذی اور ابوداؤد نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے، اس میں ہے کہ زمین و آسمان کے درمیان مسافت اکہتر، بہتر یا تہتر سال کی ہے، اسی طرح اوپر والا آسمان اسی مسافت پر ہے حتیٰ کہ آپ نے سات آسمانوں کا ذکر فرمایا۔ پھر ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کے اوپر اور نیچے والے حصوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا دو آسمانوں کے درمیان ہے۔ اس کے اوپر آٹھ فرشتے پہاڑی بکروں کی مانند ہیں جن کے سموں اور سرینوں کے درمیان دونوں آسمانوں کے درمیان کا فاصلہ ہے اور ان کی پیٹھوں پر عرش ہے، اس کے اوپر اور نیچے والے حصہ کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا دو آسمانوں کے درمیان ہے پھر اس کے اوپر اللہ جل شانہ کی ذات ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں مسافت کے متعلق جو احادیث میں اختلاف وارد ہے وہ یا تو چلنے والوں کے اعتبار سے ہے یا مطلقاً بعد اور مسافت کی کثرت بیان کرنا مراد ہے تعیین مقصود نہیں اور اکہتر، بہتر، تہتر کا ذکر راوی کے شک کی وجہ سے ہے۔ واللّٰه اعلم۔ کلام طویل ہو چکی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علم ہیئت اساساً اور بناءً باطل ہے اور یہ چیز عقلاً اور شرعاً ثابت ہے کہ تمام ستارے آسمان دنیا میں مرتکز ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ (اور بے شک ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں سے آراستہ کر دیا)۔ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (سب (سیارے اپنے اپنے) فلک میں تیر رہے ہیں) یعنی تمام کواکب و سیارے اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق تیز اور سست اور اپنی اپنی سمت کی طرف گردش کر رہے ہیں جیسے مچھلی پانی میں تیرتی ہے، آسمانوں کو کوئی حرکت نہیں ہوتی۔

یہ پہلے ذکر فرمایا کہ وہ تمام اشیاء کی حقیقت اور کنہ کو جانتا ہے۔ جس چیز کو بھی اس نے پیدا فرمایا ہے کامل اور نفع بخش طریقہ پر پیدا فرمایا ہے تو یہ جملہ پہلے کلام کی علت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، ابوجعفر، ابوعمرو، الکسائی اور قالون نے وَهُوَ کو ھاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے جب ھاء سے پہلے واؤ ہو جیسا کہ یہاں ہے اسی طرح وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ یا ھاء سے پہلے فاء یا لام ہو جیسے فَهُوَ وَلِيُّهُمُ۔ اِنْ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 182 (وزارت تعلیم)

اللّٰہ لَهُوَ الْوَلِیُّ ۔ فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ. لَهِیَ الْحَیَوَانُ۔ الکسائی اور قالون ثم کے بعد بھی سکون کے ساتھ پڑھتے ہیں جیسے ثُمَّ هُوَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں الکسائی اور قالون نے اَنْ یُّمِلَّ هُوَ میں بھی ہاء کو ساکن کر کے پڑھا ہے لیکن جمہور قراء کے نزدیک عدم سکون مشہور ہے، اسی طرح الشاطبی نے بھی لکھا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝

"اور یاد کرو جب فرمایا تمہارے رب نے فرشتوں سے[1] میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب[2] کہنے لگے کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا اس میں اور خون ریزیاں کرے گا حالانکہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ اور پاکی بیان کرتے ہیں تیرے لئے[3] فرمایا بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو"

[1]. اذ سے پہلے اُذْكُرْ فعل محذوف ہے۔ اللہ تعالیٰ تیسری نعمت کو بیان فرما رہے ہیں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کی تخلیق اور فرشتوں پر ان کو فضیلت دینا یہ ایک ایسی نعمت ہے جو صرف آدم علیہ السلام کے لئے ہی نہیں بلکہ آپ کی اولاد کو بھی شامل ہے، نیز اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ادا کرنے اور منہیات سے رکنے پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آسمان، زمین، ملائکہ اور جنوں کو پیدا فرمایا تو ملائکہ کو آسمان پر ٹھہرایا اور جنوں کو زمین پر۔ پس جن ایک طویل عرصہ زمین پر ٹھہرے رہے پھر ان کے درمیان حسد اور بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی انہوں نے فساد اور ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکوبی کے لئے فرشتوں کا ایک لشکر بھیجا جنہیں جن کہا جاتا تھا، یہ جنت کے داروغے تھے اس لئے ان کے لئے جن کا نام مشتق کیا گیا۔ ان کا امیر اور سردار ابلیس تھا۔ یہ ان کا سردار، مرشد اور ان تمام سے علم میں زیادہ تھا۔ وہ فرشتے زمین پر اترے اور جنوں کو پہاڑوں کی وادیوں، سمندروں کے جزائر کی طرف بھگا دیا اور خود زمین پر رہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت میں بھی تخفیف فرما دی۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو زمین، آسمان اور جنت کی بادشاہی عطا فرمائی۔ وہ کبھی زمین پر کبھی آسمان پر اور کبھی جنت میں عبادت کرتا تھا۔ اس عطا پر وہ فخر کرنے لگا۔ دل میں خیال کرنے لگا، یہ بادشاہی مجھے اللہ تعالیٰ نے اس لئے عطا فرمائی ہے کیونکہ میں تمام فرشتوں سے زیادہ اس کے نزدیک معزز ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس اور اس کے لشکر کو فرمایا اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ میں زمین میں ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔

امام بغوی کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابلیس ملائکہ سے تھا جیسا کہ استثناء کا ظاہر بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا فرمایا اور اس میں پہاڑ اتوار کے دن پیدا فرمائے، درخت سوموار کے دن، ناپسندیدہ چیزوں کو منگل کے دن، نور کو بدھ کے دن اور اس میں جمعرات کے روز جانور پھیلائے۔ اور جمعہ کے دن عصر کے بعد تمام مخلوق سے آخر میں آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور دن کی آخری گھڑی عصر سے رات تک ہے(1)۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق ساتویں دن زمین کی تخلیق کے بعد

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 371 (قدیمی)۔

ہوئی۔ پھر یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ جن ایک طویل زمانہ زمین میں رہے پھر ابلیس اور اس کے لشکر نے انہیں بھگا دیا۔ پھر وہ خود اس میں طویل زمانہ ٹھہرے رہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ میں (مفسر) کہتا ہوں حدیث میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہاں جمعہ سے مراد وہ پہلا جمعہ ہے جو زمین کی تخلیق کے بعد آیا تھا۔ شاید یہ جمعہ کثیر زمانہ گزرنے کے بعد کا ہو۔ اگر یہ تاویل نہ کی جائے تو زمین و آسمان کی تخلیق سات ایام میں لازم آتی ہے جبکہ قرآن میں ان کی تخلیق چھ دن میں بیان ہوئی ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

؎ یہاں خلیفہ سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ وہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے قیام، اس کے فیصلوں کے نفاذ، بندوں کی راہنمائی، اللہ تعالیٰ کی طرف ان کو لے جانے اور اللہ کے قرب کے مراتب ان کو عطا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کو خلیفہ بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی بلکہ بندے اس کا فیض بغیر واسطہ کے قبول کرنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے اس لئے اس نے خلیفہ (واسطہ) مقرر فرمایا۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کے بعد ہر نبی اللہ کا خلیفہ ہے۔

؎ فرشتے از روئے تعجب اور اس معاملہ پر آگاہی حاصل کرنے کے لئے کہنے لگے اَتَجْعَلُ فِيْهَا الخ کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا۔ ان کا یہ قول بطور اعتراض اور بندوں سے حسد کی بناء پر نہ تھا کیونکہ فرشتے اس کے مکرم بندے ہیں (اور وہ ایسی غلاظتوں سے پاک ہیں)۔

من یفسد سے مراد اولاد آدم ہے۔ فرشتوں کو انسان کے فساد اور خونریزی کا علم اللہ تعالیٰ کے بتانے سے ہوا۔

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ:۔ یہ جملہ اشکال جہت کے لئے حال مقررہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تو نافرمانوں کو خلیفہ بناتا ہے جبکہ ہم معصوم اور خلافت کے حقدار ہیں۔ تسبیح کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کو ہر نقص اور عیب سے مبرا کرنا۔ یہ سَبَحَ فِى الْاَرْضِ وَالْمَاءِ سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ بہت دور چلا گیا۔ اور بحمدک ترکیب میں حال ہے یعنی جو تو نے ہمیں توفیق دی ہم اس کے مطابق تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں۔

تقدیس کا معنی بھی تسبیح ہے۔ کہا جاتا ہے قَدَّسَ جب کوئی ہر قسم کی آلائش سے بہت دور ہو۔ لک پر لام زائدہ ہے۔ یا لام تعلیل کے لئے ہے۔ مطلب یہ کہ ہم اپنے نفوس کو تیری خاطر گناہوں سے پاک رکھتے ہیں۔ گویا فساد جس کی تفسیر شرک سے بیان کی گئی اس کو انہوں نے تسبیح کے مقابلہ میں رکھا اور سفک الدماء کو تقدیس کے مقابلہ میں رکھا۔ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا حضور ﷺ کونسا کلام افضل ہے؟ فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے لئے منتخب فرمایا تھا یعنی سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ۔ اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں ابوذر سے روایت کیا ہے (1)۔ یہ مخلوق کی صلوۃ ہے اور اسی کی وجہ سے انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ اسے ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ (2)

؎ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے اِنِّىْ کی یاء کو فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے بتانے سے جان لیا تھا کہ انسانوں میں، نیک، نافرمان اور کافر بھی ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے یہ گمان کیا کہ فرشتے انسانوں سے افضل ہیں، کیونکہ وہ تمام کے تمام معصوم ہیں۔ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔ اس لئے ان کو خلیفہ بنانا اولیٰ ہے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 351 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 38 (التجاریہ)

اور انسان کو خلیفہ بنانا فساد کا موجب ہے۔ جیسا کہ ان کے شریروں سے فساد واقع ہوا ہے، مگر فرشتوں کو یہ معلوم نہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کے دلوں میں اپنی ذات کی محبت رکھی ہے جو معیت ذاتی اور خالص محبوبیت کا موجب ہے جیسا کہ محبوبوں کے سردار ﷺ نے فرمایا اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ(1)۔ انسان اس کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے۔ اس حدیث کو، بخاری اور مسلم نے حضرت ابن مسعود اور حضرت انس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حدیث قدسی میں ہے بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ (الحدیث) ان کو ایسا قرب اور منزلت میسر آتی ہے جو کسی غیر کے لئے متصور بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے اللہ کے بندوں کا قرب اللہ تعالیٰ کے قرب کا موجب ہوتا ہے۔

حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا اے ابن آدم میں مریض تھا تو نے میری عیادت نہیں کی۔ بندہ کہے گا اے میرے پروردگار! میں کیسے تیری عیادت کرتا جبکہ تو رب العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ مریض تھا اور تو نے اس کی عیادت نہ کی تھی، تجھے معلوم نہیں اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا تھا(2)۔ (الحدیث) اکابر صوفیاء کے نزدیک مسلم ہے کہ سورج کی تپش کو جس طرح زمین برداشت کرتی ہے اس طرح کوئی دوسری چیز برداشت نہیں کر سکتی، کیونکہ زمین جتنی کثیف ہے دوسری مخلوق اتنی کثیف نہیں۔ اسی طرح تجلی ذات کو بھی صرف مٹی کا عنصر ہی برداشت کر سکتا ہے اور کوئی چیز برداشت نہیں کر سکتی۔ دوسری تمام اشیاء اپنی کثافت کے اعتبار سے صفاتی تجلیات برداشت کر سکتی ہیں۔ اور عالم امر کے لطائف کے لئے صرف تجلیات ظلیہ کا حصہ ہے اور انسان چونکہ لطائف عشرہ سے مرکب ہے جو عالم کبیر کے اجزاء ہیں۔ اور انسان کے علاوہ کسی چیز میں یہ اجزاء مجتمع نہیں ہیں اس لئے انسان ہی خلافت کا اہل اور اس امانت کو اٹھانے کے قابل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس بوجھ کو اٹھانے سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا، بے شک وہ بڑا ظالم و جاہل ہے۔ ظالم اس لئے کہ ایسی چیز کو اٹھایا ہے جس کو کسی دوسرے نے نہیں اٹھایا اور جاہل اس لئے کہ اس بار امانت کی عظمت کو نہ پہچانا۔

انسان کو صورت کے اعتبار سے عالم صغیر اور معنی کے اعتبار سے عالم کبیر کہا جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے نہ میری زمین اور نہ میرا آسمان سما سکتا ہے مگر بندۂ مومن کا دل مجھے سما سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو زمین کی سطح سے پیدا فرمایا اس طرح کہ تمام زمین سے ہر رنگ کی مٹی لی، پھر اسے مختلف پانیوں کے ساتھ گوندھا۔ پھر اسے برابر کیا اس کے بعد اس میں اپنی روح پھونکی۔ احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن جریر، ابن منذر، ابن مردویہ اور الحاکم نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ترمذی اور حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے۔ امام بیہقی حضرت موسیٰ الاشعری سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی کی مٹھی سے پیدا فرمایا جو اس نے تمام زمین سے لی تھی۔ اسی لئے آپ کی اولاد میں کچھ لوگ سرخ، کچھ سفید اور کچھ گندمی

1۔ کنز العمال جامع الترمذی، جلد 2، صفحہ 61 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 318 (قدیمی)

رنگ کے ہیں اور کچھ طبعاً نرم مزاج اور کچھ اکھڑ مزاج، کچھ خبیث اور کچھ پاک طینت ہیں۔(1) میرے نزدیک اس میں حکمت یہ تھی کہ انسان میں تمام قسم کی صلاحیت جمع ہو جائے۔

امام بغوی فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے کہا ہمارا رب جو چاہے گا پیدا کرے گا مگر ہم سے معزز مخلوق ہرگز پیدا نہ کرے گا۔ اگر کوئی ہوگا تو بھی ہم اس سے زیادہ علم والے ہوں گے کیونکہ ہماری تخلیق اس سے پہلے کی ہے اور جو کچھ ہم نے دیکھا ہے وہ اس نے نہیں دیکھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت ان پر ظاہر فرما دی۔(2)

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓىٕكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾

"اور اللہ نے سکھا دیئے آدم کو تمام اشیاء کے نام[1] پھر پیش کیا انہیں فرشتوں کے سامنے، اور فرمایا بتاؤ تو مجھے نام ان چیزوں کے اگر تم (اپنے اس خیال میں) سچے ہو"۔

[1] علماء تفسیر فرماتے ہیں اسماء سے مراد اسماء الخلائق ہیں۔ حضرت امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ہر چیز کا نام سکھایا حتیٰ کہ پیالے اور پلیٹ کا بھی(3) بعض علماء نے فرمایا وہ تمام سکھا دیا جو ہو چکا تھا اور جو قیامت تک ہوگا۔ ربیع بن انس فرماتے ہیں اسماء سے ملائکہ کے اسماء مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا آپ کی ذریت کے اسماء مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا ہر چیز کی صنعت سکھا دی۔ اہل تاویل نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام لغات سکھا دیں۔ پھر آپ کی اولاد نے ہر لغت کے ساتھ کلام کیا۔ میں کہتا ہوں میرے نزدیک یہ تمام اقوال غیر پسندیدہ ہیں کیونکہ فضیلت کا مدار کثرت ثواب اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے مرتبہ پر ہوتا ہے نہ ان امور پر جو مفسرین نے لکھے ہیں۔ اگر ان امور کو فضیلت کا معیار بنایا جائے تو پھر حضرت آدم علیہ السلام کی خاتم النبیین ﷺ پر بھی فضیلت لازم آئے گی کیونکہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو ارشاد فرمایا تھا دنیا کے امور تم بہتر جانتے ہو۔ دوسرا یہ کہ آپ ﷺ تمام لغات کو نہ جانتے تھے۔ میرے نزدیک یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اسماء الٰہیہ سکھا دیئے۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اسماء الٰہیہ تو غیر متناہی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ (اگر سمندر میرے رب کے کلمات لکھنے کے لئے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا پیشتر اس کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں)۔ دوسری جگہ فرمایا وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (اگر روئے زمین کے درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائے اور اس کے بعد سات سمندر اور اس کے علاوہ سات سمندر اسے مزید سیاہی مہیا کریں تو پھر بھی ختم نہیں ہوں گی اللہ کی باتیں۔) جب اسماء الٰہیہ غیر متناہی ہیں تو پھر انسانی علم جو ممکن اور متناہی ہے اس کا احاطہ کیسے کر سکتا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی اَسْاَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ سَمَّیْتَ بِهَا نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَكَ(4)۔ اس حدیث کو ابن حبان، حاکم، ابن ابی شیبہ، الطبرانی اور امام احمد نے ابن مسعود اور ابو موسیٰ الاشعری سے روایت کیا ہے۔ یہ تمام دلائل ثابت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بعض اسماء اپنے پاس رکھے ہیں ان کا علم کسی کو عطا نہیں فرمایا۔

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 98 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 40 (التجاریہ) 3۔ ایضاً، مکتبہ التجاریہ الکبریٰ مصر 4۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 391-452 (ملخصاً) (صادر)

میں کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اسماء کا علم اجمالی طور پر عطا فرمایا تھا پھر جب انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ معیت حاصل ہوگئی تو انہیں اللہ تعالیٰ کے ہر اسم اور ہر صفت کے ساتھ مناسبت تامہ حاصل ہوگئی اس طرح کہ جب بھی کسی اسم یا صفت کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ اسم یا صفت آپ کے لئے روشن ہو جاتی جیسے کسی شخص کو کسی علم کا ملکہ حاصل ہوتا ہے تو وہ جب کسی مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ مسئلہ بالکل اس کے ذہن میں حاضر ہو جاتا ہے۔ علم تفصیلی میری مراد نہیں ہے تاکہ کوئی اعتراض وارد ہو۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ آپ نے یہ ایسی تفسیر بیان کی ہے جو اور کسی مفسر نے بیان نہیں کی۔ کیا یہ قرآن میں اپنی رائے کا اظہار نہیں ہے جو کہ جائز نہیں ہے، امام بغوی نے حضرت ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قرآن میں آپ کی رائے کو دخل دیا یا دوسری روایت میں ہے جس نے قرآن پر بغیر علم کے بحث کی اسے اپنا ٹھکانا آگ میں تلاش کرنا چاہئے (1)۔ میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ امام بغوی فرماتے ہیں ہمارے شیخ الامام نے فرمایا: یہ وعید اس شخص کے متعلق ہے جس نے بغیر علم یا اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر بیان کی۔ اور یہ اسباب نزول، شان نزول کے متعلق حکم ہے۔ کیونکہ آیت کا شان نزول سماع کے بغیر بیان کرنا جائز نہیں ہے جو بطریق نقل ثابت ہے۔

تفسیر کی اصل تفسرۃ ہے ہے، جس کا معنی وہ دلیل ہے جو اس پانی (قارورۃ بول) سے حاصل ہوتی ہے جس میں ایک طبیب غور و فکر کر کے مریض کی بیماری کی تشخیص کرتا ہے۔ اسی طرح مفسر بھی آیت کا شان نزول اور اس کا قصہ بیان کرتا ہے اور تاویل کا مطلب ہے آیت کے معنی کو استنباط کے ذریعے کسی ایسے معنی پر محمول کرنا جو ماقبل اور مابعد کلام کے موافق ہو اور کتاب وسنت کے مخالف نہ ہو۔ اس کی اہل علم کو رخصت ہے تاویل، اَلْاَوْلُ سے مشتق ہے جس کا معنی لوٹنا اور رجوع کرنا ہے مثلاً کہا جاتا ہے اَوَّلْتُهٗ فَاٰلَ یعنی میں نے اس کو پھیرا تو وہ پھر گیا۔ امام بغوی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن سات قرأتوں پر نازل ہوا ہے، ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے اور ہر آیت کی ایک حد اور مطلع ہے (2)۔ الطبرانی نے ابن مسعود سے یہی حدیث اس طرح روایت کی ہے کہ قرآن سات قرأتوں پر نازل ہوا ہر حرف کا ظاہر اور باطن ہے اور ہر حرف کی ایک حد ہے اور ہر حد کا ایک مطلع ہے، امام بغوی فرماتے ہیں لِكُلِّ حَدٍّ مَطْلَعٌ کا مطلب یہ ہے کہ جس تک انسان اپنے علم کی معرفت کے ذریعے بلند ہوتا ہے، کہا جاتا ہے اَلْمَطْلَعُ اَلْفَهْمُ کبھی اللہ تعالیٰ تاویل اور معانی میں غور و فکر کرنے والے پر ایسے اسرار و رموز کو منکشف فرماتا ہے جو دوسروں پر ظاہر نہیں فرماتا: وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (3)

میں (مفسر) کہتا ہوں مفسرین کے جو اقوال پہلے نقل ہو چکے ہیں ان میں سے کوئی بھی مرفوع نہیں اور کوئی ایسا بھی نہیں جس میں رائے کی گنجائش نہ ہو تاکہ یہ کہا جائے کہ یہ مرفوع کے حکم میں ہے بلکہ تمام اقوال اسماء کے معنی کی تاویلات ہیں جو علماء نے اپنی رائے سے لکھی ہیں۔ اسی وجہ سے تو تمام اقوال ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ میں نے جو اسماء کا معنی بیان کیا ہے وہ بھی ایک تاویل ہے، اسی طرح حضرت ابن عباس کا قول کہ ہر چیز کا اسم اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سکھایا حتیٰ کہ پلیٹ اور پیالہ کا اسم بھی۔ جنہوں نے فرمایا کہ ما کان اور ما یکون کا علم عطا فرمایا یا اپنی اولاد کے اسماء سکھائے، یا ہر چیز کی صفت سکھائی، یہ تمام اقوال میرے قول کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسمائے الٰہیہ سکھائے کے منافی نہیں ہیں بلکہ میرا یہ قول ما کان اور ما یکون کے قول سے افضل ہے، وہ اول ہے جس سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 11 (التجاریہ) 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 12 3۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 13 المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر

پہلے کوئی نہیں، وہ آخر ہے جس کے بعد کوئی نہیں، وہ ظاہر ہے اس سے اوپر کوئی نہیں، وہ باطن ہے جس کے نیچے کوئی نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ممکنات کے اسماء کے ذکر پر اکتفاء کیا کیونکہ عوام اسی تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور اکابر کی شان بھی یہی ہے کہ وہ لوگوں کی عقل کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ۔ مفسرین کے قول کے مطابق ضمیر کا مرجع مسمیات ہیں جن کا کلام کے ضمن میں ذکر موجود ہے، کیونکہ اصل عبارت اسماء المسمیات تھی۔ مضاف الیہ کو حذف کیا گیا ہے اور اس کے عوض مضاف پر الف، لام ذکر کیا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا۔ (اور بالکل سفید ہو گیا ہے (میرا) سر بڑھاپے کی وجہ سے)۔

1۔ ھم ضمیر کو مذکر فرمایا کیونکہ مسمیات میں عقلاء بھی شامل تھے اس لئے ان کا اعتبار کیا اور میرے قول کے مطابق ضمیر کا مرجع آدم علیہ السلام ہیں اور ان کے لئے جمع کی ضمیر ان کی تعظیم کے لئے ہے یا آدم سے مراد آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد ہے جیسے کہا جاتا ہے ربیعہ اور مضر (یہ قبیلہ کے سرداروں کے نام ہیں، جب یہ بولے جاتے ہیں تو پورا قبیلہ مراد ہوتا ہے) جیسا کہ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے: عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ کی تفسیر میں لکھا ہے، شاید اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر حضرت آدم اور آپ کی اولاد میں سے انبیاء کرام کی روحوں کو پیش کیا ہو، جب انہیں حضرت آدم کی پیٹھ سے نکالا تھا اور ان سے اپنے محبوب کی تائید و نصرت کا پختہ وعدہ لیا تھا اور انہیں اپنی ذاتوں پر خود گواہ کیا تھا اور نبیوں سے محمد ﷺ، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ بن مریم علیہم الصلوۃ والسلام سے پختہ وعدہ لیا تھا۔ مسمیات کی طرف ضمیر لوٹانے سے یہ قول زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ مسمیات ماقبل کلام میں موجود نہیں ہیں، اور ضمیر کو عقلاء کے لئے ماننا بھی تکلف سے خالی نہیں۔ ابی بن کعب رحمۃ اللہ علیہ نے عَرَضَهَا اور ابن مسعود رحمۃ اللہ علیہ نے عَرَضَهُنَّ پڑھا ہے۔ ان دونوں قرأتوں کی بناء پر ضمیر کا مرجع اسماء کا لفظ ہوگا۔

2۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خاموش کرنے اور خلافت کی عدم صلاحیت پر آگاہ کرنے کے لئے فرمایا مجھے ان کے اسماء بتاؤ۔ ھؤلاء کا مشارٌ الیہ مفسرین کے قول پر مسمیات ہیں اور میرے قول کے مطابق مشارٌ الیہ آدم اور آپ کی اولاد ہے، یہاں اضافت انتہائی مناسبت کی وجہ سے ہے، یعنی وہ اسماء جو میں نے ان کو سکھائے ہیں۔ كُنْتُ نَبِيًّا وَّآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ (میں اس وقت نبی تھا جب آدم علیہ السلام روح اور جسد کے درمیان تھے)۔ اس حدیث کو الطبرانی نے ابن عباس سے ابو نعیم نے الحلیہ میں اور ابن سعد نے ابو الجدعاء سے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو سکھایا جو سکھایا اور آپ ﷺ کو، نبی ہونے کی حیثیت سے تجلیات ذاتیہ کے ساتھ مخصوص فرمایا جو اصالۃ انبیاء کرام کے ساتھ خاص ہیں، جبکہ آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسد سے ترکیب پا رہے تھے (1)۔ چونکہ تجلیات ذاتیہ جسد ترابی کے ساتھ مشروط ہیں جب حضرت آدم کا جسد تیار ہو گیا اور ان کی اولاد کی روحوں کو ان کی پیٹھ میں رکھ دیا تو وہ تجلیات ذاتیہ کے اہل ہو گئے۔

3۔ اگر تم سچے ہو اس بات میں کہ میں کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کروں گا جو تم سے زیادہ معزز، افضل اور علم والی ہو۔ قرأت قنبل اور ورش ھؤلاء ان كنتم میں دوسرے ہمزہ کو یاء ساکنہ سے بدل دیتے ہیں۔ قالون اور البزی پہلے ہمزہ کو یاء مکسورہ سے بدل دیتے ہیں۔ ابو عمرو پہلے ہمزہ کو گرا دیتے ہیں۔ باقی قراء یہاں بھی اور ہر اس جگہ جہاں دو ہمزے دو کلموں میں جمع ہوں تو دونوں ہمزوں کو ثابت رکھتے ہیں۔ اور ورش سے ایک روایت یہ ہے کہ یہاں بھی اور سورۂ نور الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا میں دوسرے ہمزہ کو یاء مکسورہ سے بدل لیتے

1۔ جامع الاحادیث الکبیر، جلد 6 صفحہ 463، مطبوعہ دار الفکر بیروت

ہیں۔ ان دو جگہوں کے علاوہ ورش قنبل کے ساتھ ہیں۔ مگر جب دو کلموں میں دو ہمزے مفتوح جمع ہوں تو ورش اور قنبل دوسرے ہمزہ کو مد بناتے ہیں جیسے ہمزہ مکسورہ میں کرتے ہیں۔ قالون، البزی اور ابوعمرو پہلے ہمزہ کو ساقط کرتے ہیں باقی قراء دونوں ہمزوں کو ثابت کرتے ہیں۔ مگر جب دو کلموں میں دو ہمزے مضموم جمع ہوں تو ان کا حکم مکسورہ ہمزوں والا ہے یہ صرف سورۂ احقاف میں ایک جگہ ہیں اولیاءُ اُولٰئِک۔ ورش اور قنبل دوسرے ہمزہ کو واؤ ساکنہ کے ساتھ بدلتے ہیں۔ قالون اور البزی پہلے ہمزہ کو واؤ مضمومہ سے بدلتے ہیں ابوعمرو پہلے ہمزہ کو ساقط کرتے ہیں اور باقی قراء دونوں ہمزوں کو ثابت کرتے ہیں۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾

"عرض کرنے لگے ہر عیب سے پاک تو ہی ہے کچھ علم نہیں ہمیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھا دیا[1]۔ بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے[2]۔"

[1] فرشتے اپنے عجز کا اقرار اور بشر کی فضیلت اور اس کے خلافت کا مستحق ہونے کے اعتراف اور ان کی تخلیق میں جو حکمت تھی اس سے پردہ سرکانے پر شکر کے اظہار کے طور پر کہنے لگے ہم تیری تسبیح کرتے ہیں یعنی ہم تیرے افعال کو حکمت سے خالی ہونے سے بہت بعید سمجھتے ہیں۔

لا علم لنا: ہم تیرے علم کے بحر بے پایاں کے ایک قطرہ کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔

[2] تو اپنی تخلیق کو خوب جانتا ہے، حکیم کے دو معانی ہیں 1۔ عدل قاضی، 2۔ اپنے معاملہ کو اتنا پختہ اور محکم کرنے والا کہ وہاں فساد کا گزر نہ ہو۔ جب فرشتوں نے اپنے عجز کا اعتراف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر انعام فرمایا۔

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

"فرمایا اے آدم! بتا دو انہیں ان چیزوں کے نام[1]۔ پھر جب آدم نے بتا دیئے فرشتوں کو ان کے نام تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا نہیں کہا تھا میں نے تم سے کہ میں خوب جانتا ہوں سب چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں اور زمین کی اور[2] میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو[3]۔"

[1] قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ: مفسرین کے قول کے مطابق باسمائهم کی ضمیر کا مرجع مسمیات ہیں اور میرے قول کے مطابق ضمیر کا مرجع ملائکہ ہیں۔ یعنی فرشتوں کو ان اسماء کی خبر دو جن کے جاننے کی انہیں وسعت ہے یا جن کا جاننا ان کے لئے ہم نے مقدر فرمایا ہے۔ باسماء کم نہیں فرمایا کیونکہ تمام اسماء کا جاننا جن کے ذریعے ذات قدسیہ تک پہنچنا ہوتا ہے، فرشتوں کے لئے سیکھنا ممکن ہی نہیں ہے مگر اجمالی طور پر سیکھے جا سکتے ہیں۔ تمام اسماء کا اجمالاً جاننا بھی بشر کے ساتھ مختص ہے، ملائکہ کو یہ عظمت میسر نہیں۔

[2] اس کلام کے ذریعے اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی حقیقت یاد کرائی جا رہی ہے، حرمیان اور ابوعمرو نے اِنِّی کی یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح ہر یاء کو فتحہ دیتے ہیں جس کے بعد الف قطعی مفتوح ہو مگر چند حروف میں ایسا نہیں کرتے جن کا ذکر ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گا۔ نافع اور ابوعمرو یاء کے بعد الف مقصورہ کے وقت بھی یاء کو فتحہ دیتے ہیں مگر چند حروف میں ایسا نہیں کرتے جن کا ذکر

آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ باقی قراء فتحہ نہیں دیتے مگر چند حروف میں جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

؎ حضرت حسن بصری اور قتادہ فرماتے ہیں مَا تُبْدُوْنَ سے مراد اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا کا قول ہے۔ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ سے مراد حضرت حسن اور قتادہ کے قول کے مطابق فرشتوں کا وہ قول ہے جو انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ ہم سے زیادہ معزز مخلوق پیدا نہیں فرمائے گا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ابلیس حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کے اوپر سے گزرا جبکہ آپ مکہ اور طائف کے درمیان تھے اور اس وقت آپ کے جسم میں روح نہیں تھی۔ ابلیس نے کہا یہ کسی خاص امر کے لئے پیدا کیا گیا ہے، پھر ابلیس آپ کے منہ سے داخل ہوا اور دبر سے نکل گیا۔ پھر کہنے لگا یہ ایک مخلوق ہے جس میں تماسک نہیں کیونکہ یہ اندر سے خالی ہے پھر فرشتوں سے مخاطب ہو کر کہا جو اس کے ساتھ موجود تھے اگر اسے تم پر فضیلت دی جائے اور تمہیں اس کی اطاعت کا حکم دیا جائے تو تم کیا کرو گے فرشتوں نے کہا ہم تو اپنے رب کے حکم کی اطاعت کریں گے۔ ابلیس نے اپنے دل میں کہا اگر میں اس پر مسلط ہوا تو میں اسے ہلاک کر دوں گا اور اس کو مجھ پر غالب کیا گیا تو میں اس کی نافرمانی کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ یعنی میں جانتا ہوں جو فرشتوں نے اطاعت کا اظہار کیا۔ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ یعنی میں وہ بھی جانتا ہوں جو ابلیس نے معصیت دل میں چھپا رکھی تھی (1)۔

اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ خواص البشر (یعنی انبیاء کرام) خواص الملائکہ (یعنی پیغام رسانی والے) فرشتوں سے افضل ہیں جیسا کہ اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے۔ اور علماء کا یہ قول کہ عوام البشر یعنی اولیاء کرام عوام الملائکہ سے افضل ہیں، یہ بھی سنت سے ثابت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَلْمُؤْمِنُ اَكْرَمُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ بَعْضِ مَلٰٓئِكَتِهٖ (2) اللہ کے نزدیک مومن بعض ملائکہ سے افضل ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے آدم اور آپ کی اولاد کو پیدا فرمایا تو فرشتوں نے کہا اے ہمارے رب تو نے ان کو پیدا فرمایا ہے کہ یہ کھاتے، پیتے، نکاح کرتے اور سوار ہوتے ہیں، پس ان کے لئے دنیا کر دے اور ہمارے لئے آخرت کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں اس کو، جسے میں نے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا پھر اس میں اپنی روح پھونکی، اس جیسا نہیں کروں گا جسے میں نے کُنْ کہہ کر پیدا فرمایا ہے، اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے (3) جنت میں رؤیت الٰہی کے شرف سے مخصوص ہونا بھی اولیاء کی افضلیت کی دلیل ہے، جبکہ فرشتوں کو رؤیت کا شرف نصیب نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ جنت میں رؤیت الٰہی اولیاء کرام کے ساتھ مختص نہیں بلکہ یہ تمام مومنین کو حاصل ہو گی اگرچہ درجات کے تفاوت کے اعتبار سے ہو گی۔ بعض کو صبح شام یہ سعادت میسر ہو گی۔ بعض کو ہر جمعہ کے روز، بعض کو سال بعد اسی طرح ہر ایک کو مرتبہ کے مطابق رؤیت الٰہی کا شرف ملے گا۔ اس حدیث سے تو یہ لازم آتا ہے کہ تمام مومنین اگرچہ فاسق بھی ہوں عوام الملائکہ سے افضل ہیں۔ کیونکہ تمام مومنین جنت میں داخل ہو جائیں گے اگرچہ کئی عذاب کے بعد داخل ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (جو ذرہ برابر نیکی کرے وہ اسے دیکھ لے گا۔) اس طرح حضور ﷺ کا ارشاد ہے وہ شخص آگ سے نکلے گا جس نے بھی لا الہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں ذرہ برابر نیکی یا ذرہ برابر ایمان ہو گا (4)۔ (متفق علیہ)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے کلمہ طیبہ پڑھا پھر اسی پر اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 40 مطبوعہ المکتبہ التجاریہ الکبریٰ مصر　2۔ سنن ابن ماجہ: 3947، جلد 4 صفحہ 366 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

3۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 172 حدیث نمبر 149، دار الکتب العلمیہ بیروت

4۔ صحیح مسلم: 325، جلد 3 صفحہ 51 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 11 (وزارت تعلیم)

کی وفات ہوئی تو وہ جنت میں داخل ہوگا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو یہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ کہا۔ آخری مرتبہ فرمایا ابوذر کے نہ چاہنے کے باوجود وہ جنت میں داخل ہوگا (مسلم)۔(1)

دوسرا یہ کہ معصومین پر فاسقین کو فضیلت دینا عقلاً اور شرعاً ناجائز ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ (کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں جیسا بنائیں گے)۔ میں (مفسر) کہتا ہوں فاسق لوگ مغفرت کے بعد جنت میں داخل ہوں گے خواہ مغفرت دنیا کے مصائب کے ذریعے عتاب دینے کے بعد ہو خواہ عذاب قبر کے بعد ہو یا دوزخ کے عذاب کے بعد ہو، یا بغیر کسی عذاب کے توبہ کے ساتھ ہو یا بغیر توبہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ ہو۔ مغفرت کے بعد فسق اور معصیت کا کوئی دھبہ نہ ہوگا اس لئے وہ اولیاء متقین صالحین کے ساتھ لاحق ہو جائیں گے اگرچہ اولیاء کے مراتب اعلیٰ اور اجل ہوں گے۔ اس وقت ان مومنین کا ملائکہ سے افضل ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے، واللہ اعلم۔

اس آیت کریمہ میں یہ بھی دلیل ہے کہ فرشتوں کے علوم وکمالات زیادتی کو قبول کرتے ہیں اور فرشتے انسان سے استفادہ کرتے ہیں۔ رہا یہ قول وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (اور فرشتے کہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کے لئے مقام متعین ہے) اس کا مطلب ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ترقی نہ کرنا ہے۔ یعنی اسماء وصفات کے مقام سے ذات کے مقام کی طرف ترقی نہ کرنا ہے۔ کیونکہ فرشتوں کا مقام ذات تک پہنچنا جائز نہیں ہے، بخلاف انسان کے کہ اسے یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ انسان حجب و حرمان کے مقام سے مقام ظلال تک ترقی کرتا ہے پھر مقام صفات واسماء اور شیونات تک ترقی کرتا ہے پھر ذات کے وصول تک ترقی کرتا ہے پھر اس وصول ذات میں کئی درجات واعتبارات ہیں، جس پر کلام کی گنجائش نہیں۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ٭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

"اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب 1 نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اس نے 2 انکار کیا اور تکبر کیا 3 اور داخل ہو گیا وہ کفار (کے ٹولہ) میں 4"

1 ابوجعفر نے ملائکۃ کی تاء کو اسجدوا کے ہمزہ وصلی کی حرکت دے کر مضموم پڑھا ہے، اسی طرح قل رب احکم کو باء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ دوسرے قراء نے باء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ السجود کا لغوی معنی تذلل ہے اور شرعی معنی عبادت کے ارادہ سے زمین پر پیشانی رکھنا ہے۔ فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا جو حکم تھا اگر وہ شرعی معنی کے اعتبار سے ہو تو مسجود لہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہوگا اور آدم علیہ السلام بطور قبلہ بنائے گئے۔ ان کی عظمت شان کے اظہار کے لئے جس کا ابتداء میں انہوں نے انکار کیا تھا، ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ مسلم شریف کی ایک حدیث بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ شرعی معنی کے اعتبار سے سجدہ کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں: جب ابن آدم آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ کرتا ہے تو شیطان اس سے جدا ہو کر رونے لگتا ہے اور کہتا ہے ہائے افسوس ابن آدم کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کیا پھر وہ جنت کا مستحق ہو گیا۔ مجھے سجدہ کا حکم ملا تو میں نے انکار کیا پس میں دوزخ کا مستحق ہو گیا(2)۔ اس صورت میں آدم سے پہلے لام، الی کے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 66 (قدیمی)
2۔ مشکوۃ المصابیح: 895، جلد 1 صفحہ 271 مطبوعہ دار الفکر بیروت

معنی میں ہے۔ جیسے حضرت حسان نے سیدنا صدیق اکبر کی مدح میں لام بمعنی الی استعمال کیا ہے اَلَيْسَ اَوَّلَ مَنْ صَلّٰى لِقِبْلَتِكُمْ۔ وَاَعْرَفَ النَّاسِ بِالْقُرْاٰنِ وَالسُّنَنِ۔ کیا وہ پہلا شخص نہیں جس نے تمہارے قبلہ کی طرف نماز پڑھی اور قرآن وسنت کو تمام لوگوں سے زیادہ جاننے والا ہے، یا آدم علیہ السلام فرشتوں کے سجدہ کے وجوب کا سبب بنائے گئے تھے اور یہ توبہ کے طور پر تھا، اس کلام کے لئے جو بصورت اعتراض ان سے صادر ہوئی تھی۔ اس صورت میں لام سببیہ ہوگا جیسے صَلِّ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ میں لام سبب کے لئے ہے، یا فرشتوں کو لغوی معنی کے اعتبار سے سجدہ کا حکم تھا یعنی آدم کو سلام کرنے اور تعظیم بجالانے کے لئے اپنے عجز وانکساری کا اظہار کرنا۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپ کو سجدۂ تعظیمی کیا تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ قول اصح ہے۔ فرماتے ہیں وہ سجدہ زمین پر پیشانی رکھنا نہیں تھا صرف اور صرف جھک کر آداب بجالانا تھا۔ جب اسلام آیا تو یہ بھی اسلام کے ساتھ منسوخ ہو گیا۔ میں (مفسر) کہتا ہوں فرشتوں کو حضرت آدم کی تعظیم کا حکم بطور شکر اور حق کی ادائیگی کے لئے تھا کیونکہ انہوں نے ان کو تعلیم دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر گزار نہیں ہوتا۔ اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ (1)

لے۔ فَسَجَدُوْٓا: ۔ تمام ملائکہ نے سجدہ کیا" اِلَّآ اِبْلِيْسَ" سوائے ابلیس کے۔ یہ استثناء دلیل ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول گزر چکا ہے، ابلیس کو فرشتوں سے تسلیم کیا جائے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تمام فرشتے معصوم نہیں ہیں بلکہ اکثر ان میں معصوم ہیں مگر کچھ غیر معصوم ہیں جیسے بعض انسان بھی معصوم ہیں مگر اکثریت غیر معصوم ہے۔

بعض علماء نے فرمایا ابلیس جن تھا مگر فرشتوں کے درمیان اس نے پرورش پائی تھی اور کئی ہزار سال فرشتوں کی معیت میں رہا اس لئے ان کو اس پر غلبہ دیا گیا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ جنوں کو بھی فرشتوں کے ساتھ سجدہ کرنے کا حکم تھا لیکن فرشتوں کا ذکر فرما کر ان کے ذکر کی ضرورت محسوس نہ کی گئی کیونکہ اکابر کو جب سجدہ کا حکم تھا تو اصاغر کو بدرجہ اولیٰ حکم ہوگا۔ شاید فرشتوں کی ایک قسم ایسی ہو جو ہیئت اور جنس کے اعتبار سے شیاطین سے متحد ہو اور عوارض کے اعتبار سے مختلف ہو۔ امام مسلم کی روایت جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ فرشتے نور سے پیدا کئے گئے ہیں اور جن آگ کے شعلے سے اور انسان اس چیز سے جس کا تمہارے سامنے بیان ہو چکا ہے۔(2) یہ احتمال رکھتی ہے کہ بعض فرشتوں کی حقیقت جنوں کی حقیقت سے مختلف ہو اور بعض کی حقیقت جنوں سے مختلف نہ ہو۔ ان فرشتوں کو جن کی حقیقت مختلف ہے، مذکر، مؤنث سے موصوف نہیں کیا جاتا اور نہ وہ اولاد جنتے ہیں۔ یا یہ کہا جائے گا کہ آگ اور نور حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں مگر تہذیب اور صفائی کے اعتبار سے ان میں فرق ہوتا ہے۔ اسی قول کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (ان مشرکوں نے اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان نسب کا رشتہ بنایا) یعنی انہوں نے ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہا تھا۔ یہ قول دلیل ہے کہ فرشتوں اور جنوں کی حقیقت ایک ہے۔ واللہ اعلم۔

لے اس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا اور حضرت آدم کی تعظیم کرنے سے تکبر کیا یا اس نے آدم علیہ السلام کو اپنے رب کی عبادت کا واسطہ بنانے سے تکبر کیا۔

لے اللہ کے علم میں تھا یا وہ ہو گیا کافروں میں سے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس نے اسے قبیح سمجھا

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 17 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 413 (قدیمی)

تو وہ کافروں میں سے ہو گیا۔ اس کے کفر کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے یہ اعتقاد رکھا تھا کہ میں آدم علیہ السلام سے افضل ہوں۔ جیسا کہ قرآن نے اس کا قول نقل کیا ہے اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ (میں اس سے بہتر ہوں) صرف واجب کو ترک کرنے کی وجہ سے کافر نہیں ہوا تھا (جیسا کہ خوارج کا نظریہ ہے کہ ہر گناہ کفر ہے)۔

وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

"اور ہم نے فرمایا اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی اس جنت [1] میں اور دونوں کھاؤ اس سے جتنا چاہو جہاں سے چاہو اور مت [2] نزدیک جانا اس درخت کے ورنہ ہو جاؤ گے اپنا حق تلف کرنے والوں سے [3]"

[1] امام بغوی فرماتے ہیں حضرت آدم کا جنت میں کوئی مونس و ہم جنس نہ تھا تو آپ سو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی بائیں طرف سے حضرت حواء کو پیدا فرمایا جب وہ بیدار ہوئے تو انہوں نے حضرت حواء کو اپنے سر کے قریب انتہائی خوبصورت شکل میں بیٹھا ہوا پایا، پوچھا تو کون ہے حضرت حواء نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرے لئے پیدا فرمایا ہے تو مجھ سے سکون حاصل کرے گا اور میں تجھ سے۔ اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں حضرت حواء کا ساتھ ذکر نہیں فرمایا بلکہ حضرت آدم کو خطاب فرمایا کیونکہ حکم میں مقصود آپ تھے۔

[2] رغداً، اکلاً مصدر محذوف کی صفت ہے مطلب یہ کہ کھلا اور کثیر کھاؤ (تم سے کوئی سوال نہ ہوگا) حیث شئتما: جہاں سے چاہو۔

[3] اس جملہ میں درخت کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے۔ کھانے سے منع کرنے میں مبالغہ کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار فرمایا ہے۔ کیونکہ کسی چیز کا قرب اس چیز کی طرف میلان اور رجحان کا باعث بنتا ہے اور پھر اس چیز کی محبت شرع اور عقل کے تقاضوں سے غافل کر دیتی ہے۔ ہر اس کام کا ارتکاب جو معصیت اور گناہ تک پہنچائے وہ کام بھی مکروہ ہوتا ہے۔ شجرۃ سے مراد حضرت ابن عباس اور محمد بن کعب کے قول کے مطابق گندم کا خوشہ ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک انگور ہے۔ ابن جریج کے نزدیک انجیر ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک کافور ہے اور حضرت قتادہ فرماتے ہیں علم کا درخت ہے اور اس میں ہر چیز کا کچھ حصہ ہے، بعض علماء نے فرمایا نہی جنس شجرہ پر تھی اور بعض نے فرمایا کوئی مخصوص درخت تھا۔ الظالمین بمعنی الضارین ہے یعنی معصیت کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔ الظلم کا اصل معنی کسی چیز کو غیر موضوع جگہ پر رکھنا ہے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

"پھر پھسلا دیا انہیں شیطان نے اس درخت کے باعث [1] اور نکلوا دیا ان دونوں کو وہاں سے جہاں وہ [2] تھے اور ہم نے فرمایا اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اور اب [3] تمہارا زمین میں ٹھکانا ہے اور فائدہ اٹھانا ہے وقت مقررہ تک [4]"

[1] عنہا میں ھا ضمیر کا مرجع شجرہ ہے اور عن سبب کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی وجہ سے پھسلا دیا۔ یا اَزَلَّ بمعنی اَبْعَدَ ہے اور ھا ضمیر کا مرجع جنت ہے۔ یعنی شیطان نے جنت سے ان دونوں کو دور کر دیا۔ حضرت حمزہ کی

قرأت اسی معنی کی تائید کرتی ہے فَاَزَالَهُمَا، یعنی نَحَاهُمَا۔ الشیطان، شَطَنَ سے مشتق ہے جس کا معنی دور ہونا ہے، کیونکہ ابلیس ہر خیر اور رحمت سے دور ہے اس لئے اسے شیطان کہا جاتا ہے علماء کا اختلاف ہے کہ جب ابلیس جنت سے نکال دیا گیا تھا تو پھر جنت میں اس نے حضرت آدم سے ملاقات کیسے کی؟ امام بغوی فرماتے ہیں، ابلیس نے حضرت آدم اور حضرت حواء کے دل میں وسوسہ ڈالنے کے لئے جنت میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو جنت کے فرشتوں نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔ ایک سانپ آیا جو ابلیس کا دوست تھا وہ بڑا خوبصورت جانور تھا اور اس کی اونٹ کی طرح چار ٹانگیں تھیں اور وہ بھی جنت کے داروغوں میں سے تھا، ابلیس نے اسے کہا کہ مجھے اپنے منہ میں داخل کر لے تو وہ اسے اپنے منہ میں داخل کر کے جنت کے داروغوں کے پاس سے گزر گیا مگر انہیں پتہ نہ چلا۔ تو وہ اس طرح جنت میں داخل ہو گیا(1)۔ یہ روایت حضرت ابن جریر نے حضرت ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم، ابی العالیہ، وہب بن منبہ اور محمد بن قیس سے نقل کی ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں اس نے انہیں جنت کے دروازے پر دیکھا کیونکہ وہ وہاں سے نکلنے والے تھے۔ امام بغوی فرماتے ہیں: جب آدم علیہ السلام جنت میں داخل ہوئے تو کہا کاش وہ اس جنت میں ہمیشہ رہتے۔ جب شیطان جنت میں داخل ہوا تو وہ حضرت آدم اور حضرت حواء کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ یہ شیطان ہے۔ اس نے رونا شروع کر دیا، اور خوب نوحہ کر کے انہیں بھی غمزدہ کر دیا۔ سب سے پہلا نوحہ کرنے والا شیطان تھا۔ حضرت آدم و حواء نے پوچھا تو کیوں اتنا رو رہا ہے؟ اس نے کہا میں اس لئے رو رہا ہوں کہ تم دونوں مر جاؤ گے اور جو نعمتیں اب تم استعمال کر رہے ہو ان سے محروم ہو جاؤ گے۔ یہ بات ان کے نفسوں میں اثر کر گئی اور وہ مغموم ہو گئے۔ ابلیس نے کہا: هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ (میں تمہاری ہمیشہ کی زندگی عطا کرنے والے درخت کی طرف راہنمائی نہ کر دوں؟) حضرت آدم نے یہ بات قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر کہا میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ تو وہ دونوں اس کے دھوکہ میں آ گئے، وہ یہ گمان ہی نہ رکھتے تھے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کے نام سے جھوٹی قسم اٹھا سکتا ہے۔ تو حضرت حواء نے اس درخت کو کھانے کے لئے جلدی کی۔ اس کے بعد حضرت آدم نے بھی وہ کھا لیا (جس سے منع کیا گیا تھا) حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں قسم بخدا حضرت آدم نے ہوش و حواس کی حالت میں درخت کو نہیں کھایا تھا لیکن حضرت حواء نے انہیں شراب پلائی جب وہ مدہوش ہو گئے تو انہیں اس درخت کے پاس لے گئیں تو انہوں نے وہ درخت کھا لیا۔(2)

لے اس نے ان دونوں کو ان نعمتوں سے نکلوا دیا جن میں وہ تھے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو فرمایا میں نے تمہیں اس وسیع جنت میں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی منع تو کیا تھا لیکن میرا یہ گمان نہیں تھا کہ کوئی جھوٹی قسم بھی کھا سکتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے پوچھا تو نے ایسا کیوں کیا تو انہوں نے کہا حواء نے میرے لئے اس کام کو مزین کر کے پیش کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں اسے سزا دیتا ہوں کہ یہ حاملہ ہو گی تو تکلیف کے ساتھ، بچہ جنے گی تو بھی تکلیف کے ساتھ، ایک مہینہ میں دو مرتبہ اسے خون آئے گا، حضرت حواء یہ سن کر رونے لگی، تو کہا گیا تمہیں اور تمہاری بیٹیوں کے لئے رونا ہو گا۔

سے یعنی زمین کی طرف اتر و۔ یہاں آدم، حواء، ابلیس اور سانپ تمام کو یہ حکم ملا تھا۔ بعضکم لبعض عدو: کا جملہ ترکیب کے اعتبار سے حال ہے اور ضمیر کی وجہ سے واؤ حالیہ ذکر نہیں کی گئی۔ یعنی تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ امام بغوی حضرت عکرمہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 42، مکتبہ التجاریہ الکبریٰ مصر

2۔ ایضاً جلد 1، صفحہ 42۔

ابن عباس سے روایت کرتے ہیں۔ اس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا مگر یہ کہ حدیث مرفوع ہے کہ آپ ﷺ سانپوں کو قتل کرنے کا حکم دیتے تھے۔ جس نے سانپوں کو ڈر کی وجہ سے چھوڑ دیا یا فرمایا ان کے غضبناک ہونے کے خوف سے انہیں چھوڑ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے جب سے ہماری ان سے جنگ ہوئی ہے تو ہماری ان سے صلح نہیں ہوئی۔ حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ مدینہ کے جن مسلمان ہو گئے ہیں جب تم انہیں دیکھو تو تین دن تک انہیں نکل جانے کا حکم کرو، اگر اس کے بعد بھی ظاہر ہوں تو انہیں قتل کر دو بیشک وہ شیطان ہیں۔

۲؎ مستقر اسم ظرف یا مصدر میمی ہے یعنی زمین تمہارے ٹھہرنے کی جگہ ہے یا تمہارے لئے اس میں ٹھہرنا ہے۔ متاع بمعنی تمتع ہے، الی حین یعنی تمہاری زندگی پوری ہونے تک (تمہیں یہاں ٹھہرنا ہے)۔

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۳۷﴾

''پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے چند کلمے ۱؎ اللہ نے اس کی توبہ قبول کی۔ بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم فرمانے والا ۲؎''

۱؎ ابن کثیر نے آدم پر نصب اور کلمٰت پر رفع پڑھا ہے یعنی کلمات آدم کے پاس ان کے رب کی طرف سے آئے اور وہی کلمات ان کی توبہ کا سبب بنے۔ باقی قراء نے آدم پر رفع اور کلمات پر نصب پڑھی ہے۔ یعنی آدم نے اپنے رب سے کلمات سیکھے۔ وہ کلمات کیا تھے؟ حضرت سعید بن جبیر، مجاہد اور حسن نے فرمایا وہ کلمات یہ تھے ربنا ظلمنا انفسنا الآیۃ۔ بعض علماء نے دعا، استغفار اور تضرع کے دوسرے کلمات ذکر فرمائے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت آدم اور حواء اس حادثہ کے بعد دو سو سال تک روتے رہے اور چالیس دن نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ اور ایک سال حضرت آدم حضرت حواء کے قریب نہ آئے۔ حضرت یونس بن حباب اور علقمہ بن مرثد سے روایت ہے کہ اگر تمام اہل زمین کے آنسو جمع کئے جائیں تب بھی حضرت داؤد علیہ السلام کے آنسو زیادہ ہوں گے جو انہوں نے اپنی خطا پر افسوس کرتے ہوئے بہائے تھے۔ اگر تمام اہل زمین اور حضرت داؤد علیہ السلام کے آنسو جمع کئے جائیں تو ان کے مقابلہ میں آدم علیہ السلام کے آنسو پھر بھی زیادہ ہوں گے جو انہوں نے اپنی خطا پر بہائے تھے۔ حضرت شہر بن حوشب فرماتے ہیں: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تین سو سال کی مدت میں آپ نے اللہ تعالیٰ سے حیاء کی وجہ سے سر اوپر نہ اٹھایا۔

۲؎ اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ قبول فرمائی۔ توبہ کا مفہوم یہ ہے کہ گناہ کا اعتراف کرنا، اس پر شرمندگی کا اظہار کرنا اور دوبارہ اس گناہ کی طرف نہ لوٹنے کا عزم کرنا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف آدم علیہ السلام کی توبہ کی قبولیت کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ حضرت حواء حکم میں آپ علیہ السلام کی تبع تھیں اسی لئے قرآن حکیم اور احادیث طیبہ میں عورتوں کا ذکر مردوں کے احکام کے ضمن میں ہوتا ہے، صراحۃً ان کو خطاب نہیں ہوتا۔

التواب کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں پر بہت زیادہ مغفرت کے ساتھ توجہ فرمانے والا ہے۔ توبہ کا اصل معنی رجوع کرنا اور لوٹنا ہے، بندے کی توبہ کا مطلب، گناہ سے رجوع کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کا مطلب سزا کو ترک فرما کر مغفرت کی طرف رجوع کرنا ہے۔ الرحیم کا معنی رحمت میں زیادتی فرمانے والا ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ

عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

"ہم نے حکم دیا اتر جاؤ اس جنت سے سب کے سب ۱؎ پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے (پیغام) ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی ۲؎ انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۳؎"

۱؎ پہلے جو اترنے کا حکم تھا وہ جنت سے اترنے کا تھا یہ حکم آسمان سے زمین کی طرف اترنے کا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ حکم دوبارہ تاکید کے لئے ہے۔ یا مقصود مختلف تھا اس لئے دوبارہ حکم دیا کیونکہ پہلے سے مقصود معصیت پر سزا دینا اور دوسرے سے مقصود مکلف بنانا ہے۔ جمیعًا لفظاً حال ہے اور معنیً تاکید ہے۔ یہاں تمام کے یکبارگی اترنے کا تقاضا نہیں کرتا۔

۲؎ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی:۔ فاء عاطفہ ہے اور ان حرف شرط ہے ما زائدہ ہے جو اِنْ کی تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے فعل کو نون کے ساتھ مؤکد کرنا بہتر ہے اگرچہ اس میں طلب کا معنی نہ بھی ہو۔ یعنی اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے، یعنی رسول اور کتاب۔ یہاں خطاب اولاد آدم کو ہے۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ یہ جملہ شرطیہ پہلے فعل شرط کی جزاء ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان حرف شرط ذکر فرمایا ہے جو شک کا فائدہ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہدایت فی نفسہ عقلاً واجب نہیں بلکہ محتمل ہے۔ الکسائی نے هُدَایَ، مَثْوَایَ اور مَحْیَایَ جہاں بھی آیا اسے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اور سورۂ یوسف کی ابتداء میں رُؤْیَاکَ میں خاص طور پر امالہ کے ساتھ پڑھا ہے، ابو عمرو اور ورش نے رُؤْیَاکَ میں بین بین پڑھا ہے، امام بیضاوی فرماتے ہیں لفظ هُدًی کو دوبارہ ذکر کیا، ضمیر ذکر نہیں فرمائی کیونکہ دوسری ہدایت پہلی ہدایت سے عام ہے۔ ان سے مراد وہ ہدایت ہے جو رسول لیکر آئے اور عقل جس کا تقاضا کرتی ہے (1) یعنی جس نے اس ہدایت کی اتباع کی جس میں نقل بھی متفق ہے۔

۳؎ انہیں مستقبل کا کوئی خوف نہیں ہے نہ وہ امر واقع پر مغموم ہیں۔ کیونکہ خوف متوقع پر اور حزن واقع ہونے والے کے لئے بولا جاتا ہے، یا اس کا مطلب ہے کہ انہیں آخرت میں نہ کسی مکروہ اور ناپسندیدہ حالات کے وقوع کا خوف ہوگا اور نہ آخرت میں کسی محبوب چیز کے فوت ہونے کا انہیں حزن ہوگا۔ عذاب کی ان سے نفی فرمائی اور ثواب کو ثابت فرمایا اور بلیغ ترین وجوہ کے ساتھ ثابت فرمایا ہے، یعقوب نے لا نفی جنس کو عمل کراتے ہوئے لَا خَوْفَ پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے مرفوع اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

"اور جنہوں نے کفر کیا اور ۱؎ جھٹلایا ہماری آیتوں کو ۲؎ تو وہ دوزخی ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۳؎"

۱؎ یہ تبع پر معطوف ہے۔ گویا اس طرح ہے کہ جنہوں نے میری ہدایت کی اتباع نہ کی بلکہ اس کا انکار کیا۔

۲؎ قرآنی آیات یا دوسری کتب کو جھٹلایا۔

۳؎ قیامت کے روز وہ دوزخ میں جائیں گے۔ وہ اس سے کبھی نہ نکلیں گے اور نہ اس میں مریں گے۔ اس قصہ میں یہ دلیل ہے کہ جنت تخلیق ہو چکی ہے اور بلند جہت میں ہے۔ اور دوزخ کا عذاب کفار کو ہمیشہ ہمیشہ ملتا رہے گا۔

حشویہ فرقہ نے اس قصہ سے انبیاء کرام کے معصوم نہ ہونے پر دلیل پکڑی ہے۔ وہ کہتے ہیں حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے اور انہوں نے شجر ممنوع کھایا تھا۔ اہل سنت کی طرف سے یہ جواب دیئے گئے ہیں:۔

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 117، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

(1) حضرت آدم علیہ السلام اس وقت نبی نہ تھے۔ جوان کی نبوت کا مدعی ہے اس سے دلیل کا مطالبہ کیا جائے گا۔ (2) یا درخت سے نہی، نہی تنزیہی مراد تھی۔ (3) آدم علیہ السلام کی طرف ظلم، خسران کی نسبت کی گئی ہے کیونکہ وہ ترکِ اولیٰ کی وجہ سے اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے اور نعمتوں سے محروم ہو گئے تھے۔ (4) آدم علیہ السلام سے یہ فعل بھول کر سرزد ہوا تھا۔ جیسا کہ خود ہی قرآن نے گواہی دی۔ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ:115) (وہ بھول گئے تھے اور ہم نے ان کا اس پر عزم نہ دیکھا)۔ (5) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شیطان نے انہیں بہکانے پھسلانے کی کوشش کی اور قسمیں اٹھا کر اپنے ناصح اور خیر خواہ ہونے کا یقین دلایا تو یہ چیز قلبی میلان کا باعث بنی مگر ابتداءً آدم علیہ السلام نے اپنے نفس کو روک لیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے قریب نہ جانے کا حکم فرمایا تھا۔ یہاں تک کہ آپ بھول گئے تھے۔ اور شراب پینے کی وجہ سے شعور زائل ہو گیا، تو طبیعت اس کی طرف مائل ہو گئی۔ اور (6) عتاب اس لئے فرمایا گیا کیونکہ انہوں نے نسیان کے اسباب سے تحفظ نہیں کیا تھا۔ (7) یہ بھی ہو سکتا ہے امت سے نسیان معاف ہو لیکن انبیاء سے معاف نہ ہو کیونکہ ان کی قدر و منزلت بہت بلند ہے۔ (8) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نسیان و خطا کی معافی فقط امت محمدیہ کے ساتھ خاص ہو۔ (9) یہ بھی احتمال ہے کہ اجتہاد میں خطا کے سبب آپ نے یہ فعل کیا ہو۔ آپ نے سمجھا کہ یہ نہی، نہی تنزیہی ہے، یا یہ سمجھا کہ اسی ایک مخصوص درخت سے منع کیا گیا ہے، اور آپ نے اس نوع کے کسی دوسرے درخت سے پھل کھا لیا تھا۔ جبکہ نہی اس درخت کی پوری نوع سے تھی۔ (10) یہ سب کچھ جو آپ علیہ السلام پر جاری ہوا یہ مؤاخذہ کے طور پر نہ تھا بلکہ یہ سبب کے طریق سے تھا۔ یعنی جب کسی چیز کا سبب پایا جاتا ہے تو مسبب بھی پایا جاتا ہے، جیسے کوئی شخص بھول کر بھی زہر کھا لے تو وہ اپنا اثر دکھاتی ہے اور انسان کو موت تک پہنچا دیتی ہے۔

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے دلائل توحید اور نبوت کا ذکر فرمایا اور عام لوگوں کو خطاب فرمایا اور اپنے انعامات عامہ کو شمار کیا ہے تو اب بنی اسرائیل کو خصوصی خطاب فرمایا ہے اور ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جو بنی اسرائیل کے ساتھ خاص ہیں کیونکہ یہ سورت مدنی ہے اور مدینہ طیبہ میں اکثر خطاب یہود سے ہوا ہے کیونکہ وہ اہل علم تھے اور لوگ ان کی اتباع کرتے تھے۔ اگر وہ نبوت کا اعتراف کریں گے تو دوسرے لوگ بھی ان کی تقلید میں اعتراف کریں گے کیونکہ ان کا اعتراف دوسرے لوگوں کے لئے حجت بھی تھا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝

"اے اولاد یعقوب ¹ دل یاد کرو ² میرا وہ احسان جو کیا میں نے تم پر اور ³ پورا کرو تم میرے (ساتھ کئے ہوئے) وعدہ کو میں پورا کروں گا تمہارے (ساتھ کئے ہوئے) وعدہ ⁴ کو اور صرف مجھی سے ڈرا کرو ⁵"

¹ اے اولاد یعقوب، ابن بناء سے مشتق ہے کیونکہ وہ اپنے باپ کی نسل کی بقا کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح مصنوع کو صانع کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہا جاتا ہے ابو حرب، بنت فکر (کسی کی سوچ کا نتیجہ)۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ اور عبرانی زبان میں اس کا معنی عبداللہ ہے، ایل بمعنی اللہ ہے، بعض نے فرمایا اس کا معانی صَفْوَةُ اللّٰهِ ہے، ابو جعفر نے اسرائیل کو بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔

² ذکر دل کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور زبان کے ساتھ بھی۔ یہ دل کے ذکر پر دلیل ہے۔ بعض نے فرمایا یہاں اذکروا، اشکروا کے معنی میں ہے یعنی شکر کرو کیونکہ شکر میں بھی ذکر ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں نعمت کا ذکر اس کا شکر ہے۔ نعمتی: لفظاً مفرد ہے مگر

معنی جمع ہے۔ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ۔ میں نعمت کو ان کے ساتھ مقید فرمایا تا کہ یہ چیز انہیں رضا اور شکر پر برانگیختہ کرے کیوں کہ دوسروں پر جو نعمت ہوتی ہے وہ غیرت اور حسد کا موجب بن جاتی ہے، بنی اسرائیل مندرجہ ذیل نعمتوں کے ساتھ مخصوص تھے۔ سمندر کا پھٹنا، فرعونیوں سے نجات، فرعونیوں کا غرق، صحرا تیہ میں بادلوں کا سایہ کرنا، من وسلویٰ کا نزول، ان میں انبیاء کی بعثت، بادشاہت کی عطاء، تورات اور دوسری کتب کا انزال وغیرہ۔ کئی دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ وہ تمام نعمتیں مراد ہیں جو بندوں پر ہوتی ہیں۔

ے ایمان واطاعت کا میرے ساتھ جو وعدہ کیا تھا تم اسے پورا کرو۔ میں تمہیں ثواب دینے کا عہد پورا کروں گا۔ عہد کا لفظ اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ شاید پہلا عہد اسم فاعل کے معنی میں اور دوسرا اسم مفعول کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان سے ایمان کا عہد لیا تھا اور ثواب دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ یا دونوں عہد مفعول کے معنی میں ہیں۔ یعنی پورا کردہ عہد جو تم نے کیا تھا، میں پورا کروں گا وہ عہد جو میں نے تم سے کیا تھا۔ ابن جریر نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ کا مطلب ہے کہ تم محمد ﷺ کی اتباع کا وعدہ پورا کرو اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ میں تم سے مشکل احکام کی زنجیریں اور بیڑیاں اٹھالوں گا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت الکلبی نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے یہ پیغام دیا تھا کہ میں بنی اسماعیل میں ایک امی نبی مبعوث کرنے والا ہوں پس جو اس کی اتباع کرے گا اور جو نور وہ لیکر آئے گا، اس کی تصدیق کرے گا تو میں اس کے گناہ بخش دوں گا اور اسے جنت میں داخل کروں گا اور اسے دو اجر عطا کروں گا۔ اس عہد کا ذکر قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے محمد ﷺ کے معاملہ میں عہد لیا۔)(1) میں (مفسر) کہتا ہوں یہ وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں فرمایا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِیَّایَ الٰی قَوْلِهٖ تَعَالٰی اِنَّا هُدْنَآ اِلَیْكَ۔ اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا: عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ میں اپنا عذاب پہنچاتا ہوں اسے جسے چاہتا ہوں اور میری رحمت کشادہ ہے ہر چیز پر، سو میں لکھوں گا اس کو ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور ادا کرتے ہیں زکوٰۃ اور وہ جو ہماری نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں۔ (یہ وہ ہیں) جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے جس (کے ذکر) کو وہ پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس تورات اور انجیل میں۔

حضرت قتادہ اور مجاہد فرماتے ہیں، اس عہد سے مراد وہ ہے جس کا ذکر سورۂ مائدہ میں ہے: وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا الٰی قَوْلِهٖ تَعَالٰی لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ الآیہ حضرت حسن فرماتے ہیں وہ عہد یہ ہے: وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ یعنی تورات کی شریعت۔ میں (مفسر) کہتا ہوں یہ دونوں اقوال حضرت ابن عباس اور الکلبی کے قول کی طرف راجع ہیں کیونکہ پہلے قول میں ہے "اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ" اسی طرح تورات کی شریعت بھی محمد ﷺ پر ایمان لانے کا فیصلہ دیتی ہے، ورنہ تو یہ منسوخ ہے۔

ے وَاِیَّایَ:۔ فعل مقدر کے ساتھ منصوب ہے جس کی تفسیر مابعد فعل کر رہا ہے۔ فَارْهَبُوْنِ عہد کے توڑنے میں اور ہر فعل کے کرنے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 44 مطبوعہ المکتبہ التجاریۃ الکبریٰ مصر

نہ کرنے میں مجھ سے ڈرو۔ رھبۃ: ایسا خوف جس کے ساتھ اجتناب بھی ہو۔ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ تخصیص کا فائدہ دیتے میں إِيَّاكَ نَعْبُدُ سے زیادہ مؤکد ہے کیونکہ اس میں مفعول کی تقدیم کے ساتھ اس کی تکریر بھی ہے اور فعل کی تکریر لفظاً ہے یا تقدیراً۔ فاء جزائیہ ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے إِنْ كُنْتُمْ رَاهِبِينَ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِي۔ اگر تم ڈرتے ہو تو مجھ سے ہی ڈرو۔ اس آیت کریمہ میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔ یہ شکر کے وجوب اور ایفائے عہد کے وجوب پر دلالت کرتی ہے، پس مومن کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ قرأت: یعقوب نے فارھبون، فاتقون واخشون وغیرہ میں یائے محذوفہ کو لکھنے میں ثابت رکھا ہے اور یہ کل اکہتر مقامات پر ہے۔ نافع نے ورش کی روایت میں وصل کی صورت میں سینتالیس مقامات پر یاء کو ثابت رکھا ہے، قالون سے سورۂ غافر میں دو مقامات پر اختلاف مروی ہے۔ وہ مقامات یہ ہیں التلاق اور التناد۔ ابن کثیر نے وصل اور وقف میں اکیس مقامات پر یاء کو ثابت رکھا ہے، چھ مقامات پر ان سے اختلاف مروی ہے: سورۂ ابراہیم میں تقبل دعاء، سورۂ القمر میں یدع الداع، بالواد، اکرمن واھانن سورۂ فجر میں۔ البزی نے پانچ مقامات پر دونوں حالتوں (وصل ووقف) میں یاء کو ثابت رکھا ہے اور قنبل نے سورۂ یوسف میں انہ من یتق میں دونوں حالتوں میں یاء کو ثابت رکھا ہے اور سورۃ الفجر میں صرف وصل کی حالت میں واؤ کے ساتھ پڑھا ہے، اس میں ان سے اختلاف مروی ہے۔ ابو عمرو نے وصل کی حالت میں چونتالیس مقامات پر یاء کو ثابت رکھا اور اکرمن اور اھانن میں اختیار دیا ہے۔ الکسائی نے یوم یات (ھود)، وما کنا نبغ (سورۂ کہف) میں دونوں مقامات پر یاء کو ثابت رکھا ہے۔ ان دو مقامات کے علاوہ اور کسی جگہ یاء کو ثابت نہیں رکھا۔ حمزہ نے صرف وصل کی صورت میں تقبل دعاء میں یاء کو ثابت رکھا ہے اور صرف سورۂ نمل میں اتمدونن میں وصل اور وقف کی حالت میں یاء کو ثابت رکھا ہے۔ عاصم نے تمام مقامات پر یاء کو حذف کیا ہے۔ سورۂ نمل میں دونوں یاء کے بارے میں ان سے اختلاف مروی ہے۔ فما آتانِ اللہ حفص نے وصل میں اس کو فتحہ دیا ہے اور وقف میں ساکن یاء کو ثابت رکھا ہے اور سورۂ زخرف میں یعباد لا خوف میں ابوبکر نے وصل میں یاء کو فتح دیا اور وقف میں یاء کو ساکن کیا ہے اور شعبہ نے پہلی یاء کو حذف کیا ہے اور دوسری میں ان کا مذہب حفص کی طرح ہے۔ ابن عامر نے ہشام کی روایت میں ثم کیدون کو سورۂ اعراف میں اور ابن ذکوان کی روایت میں فلا تسئلنی کو سورۂ کہف میں یاء کے ثبوت کے ساتھ لکھا ہے، مزید اختلافات کا ذکر ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے اپنے مقامات پر آئے گا۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۠ وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ

"اور ایمان لاؤ اس (کتاب) پر جو نازل کی ہے میں نے [1] یہ سچا ثابت کرنے والی ہے [2] اس کو جو تمہارے پاس [3] ہے اور نہ بن جاؤ تم سب سے پہلے انکار کرنے والے اس کے [4] اور نہ خرید و تم میری آیتوں کے عوض تھوڑی سی قیمت [5] اور صرف مجھی سے ڈرا کرو [6]"

[1] یعنی قرآن پر ایمان لاؤ۔ اوفوا پر اس کا عطف تفسیری ہے یا تعمیم کے بعد تخصیص ہے، کیونکہ عہد کی وفا میں بھی مدار ایمان ہے۔

[2] مصدقا کا مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن، قصص، نبی کی بعثت، آپ کی صفات کے بیان، وعدہ، وعید، توحید کی دعوت، بلا تفریق انبیاء پر ایمان لانے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کتابوں پر ایمان لانے، اوامر کی پیروی کرنے اور مناہی سے رو کنے تک کے تمام احکام

میں سابقہ کتب کے موافق ہے، یا مصدقاً کا یہ معنی ہے کہ یہ قرآن ان کتب کے من جانب اللہ ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

۳؎ کتب الٰہیہ، تورات وغیرہا جو ان کے پاس تھیں۔ ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مُصَدِّقًا کو حال بنانے کی صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ ان کتب کی اتباع قرآن پر ایمان لانے کا موجب ہے۔

۴؎ پہلے تم اس قرآن کا انکار کرنے والے نہ ہو بلکہ تم اس پر ایمان لانے والے ہو۔ جیسا کہ ورقہ بن نوفل تورات کا عالم تھا تو وہ پہلے ایمان لایا تھا۔ یہاں کلام میں تعریض ہے، حقیقت مراد نہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے میں جاہل نہیں ہوں۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں عالم ہوں۔ اسی طرح یہاں بھی ہے۔

پس یہ اعتراض دور ہو گیا کہ اہل کتاب کو تقدم فی الکفر سے کیوں منع کیا گیا جبکہ مشرکین مکہ تو ان سے پہلے کفر کر چکے تھے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اہل کتاب میں سے تم پہلے کفر کرنے والے نہ ہو جاؤ۔ یا یہ مطلب ہے کہ جو تمہارے پاس ہے اس کا انکار کرنے میں پہل نہ کرو۔ کیونکہ قرآن کا انکار پہلی کتب کا انکار ہے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں یہاں اولیت سے اولیت ذات مراد ہے۔ یعنی ان کا کفر دوسروں کے کفر کا سبب ہے، کیونکہ علماء، مشائخ، رؤساء کا ایمان لانا دوسروں کے ایمان لانے کا سبب ہے اور ان کا کفر کرنا دوسروں کے کفر کا سبب ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خبردار شریروں میں سے شریر ترین علماء سوء ہیں اور نیک لوگوں سے نیک ترین علماء خیر ہیں(1)۔ اس حدیث کو دارمی نے احوص بن حکیم عن ابیہ کی سند سے نقل کیا ہے، مطلب یہ کہ تم اپنے پیروکاروں کے کفر کا سبب نہ بنو ورنہ ان کا گناہ بھی تم پر ہوگا۔ اَوَّلَ ضمیر جمع سے خبر ہے کیونکہ یہ اَوَّلَ فَرِیْقٍ کی تاویل میں ہے یا یہ تاویل ہوگی لَا یَکُنْ کُلُّ وَاحِدٍ مِّنْکُمْ اَوَّلَ کَافِرٍ۔ یعنی تم میں سے ہر ایک پہلا کفر کرنے والا نہ ہو جیسے کہا جاتا ہے کَسَانَا حُلَّةً: اس نے ہم میں سے ہر ایک کو ایک جوڑا پہنایا۔ اَوَّل افعل کے وزن پر ہے اور اس کا لفظاً کوئی فعل نہیں ہے۔ بعض نے فرمایا اس کی اصل اَوْءَلُ ہے اور وَاَلَ سے مشتق ہے اور سائل کے وزن پر ہے اور ہمزہ کو خلاف قیاس واؤ سے بدل دیا گیا ہے یا اس کی اصل اَوْوَلُ ہے اَوَلَ سے مشتق ہے، ہمزہ کو پہلے واؤ سے بدلا پھر واؤ کو واؤ میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں: یہ آیت کریمہ کعب بن اشرف اور اس جیسے دوسرے علماء یہود کے حق میں نازل ہوئی ہے۔(2)

۵؎ یعنی قرآن پر ایمان لانے کے عوض دنیا کا سامان طلب نہ کرو۔ دنیا کی ثمن کو قلیل فرمایا کیونکہ دنیا کا سامان اگرچہ بہت زیادہ ہی کیوں نہ ہو وہ آخرت کے حصص کی نسبت قلیل اور رذیل ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود کے علماء و رؤساء کو جاہل اور احمق لوگوں کی طرف سے خوراک ملتی تھی۔ وہ ہر سال ان کی کھیتیوں، مویشیوں اور نقدیوں سے ایک خاص حصہ وصول کرتے تھے۔ اب انہیں یہ خوف لاحق ہوا کہ اگر ہم حضور ﷺ کی صفات عالیہ کو بیان کریں گے تو لوگ آپ ﷺ کی اتباع شروع کر دیں گے۔ اس لئے انہوں نے آیات قرآنی میں تحریف شروع کر دی تھی۔ دنیا کو آخرت پر پسند کیا اور نبی کریم ﷺ کی صفات عظمت کو تبدیل کر دیا اور آپ ﷺ کا اسم مبارک چھپا دیا۔

۶؎ اور ایمان لانے اور دنیا پر آخرت کو اختیار کرنے میں مجھ سے ڈرو۔ یہ فَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنَ کی طرح ہے مگر سابقہ آیت میں خطاب عوام بنی اسرائیل کو تھا اس لئے وہاں رھبۃ کا ذکر فرمایا جو تقویٰ کا مقدمہ ہے اور اس آیت میں خطاب بنی اسرائیل کے علماء سے تھا اس لئے

1۔ سنن دارمی، جلد 1 صفحہ 87 (دار المحاسن قاہرہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 45 (التجاریہ)

تقویٰ کا ذکر فرمایا جو انسان کی منازل سلوک کی انتہاء ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۴۲﴾

"اور مت ملایا کرو حق کو باطل کے ساتھ ۱؎ اور مت چھپاؤ حق کو حالانکہ تم (اسے) جانتے ہو۔ ۲؎"

۱؎ حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو۔ اللبس کا مطلب خلط ملط کرنا ہے۔ کبھی کسی شئ کو دوسری شئ کے مشابہ کرنا اللبس کو لازم ہوتا ہے یعنی وہ حق جو محمد ﷺ کی صفت میں سے اللہ تعالیٰ نے تم پر نازل کیا ہے اسے اس باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو جو تم اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہو حتیٰ کہ حق و باطل کے درمیان تمیز ہی نہیں ہوتی۔ مقاتل فرماتے ہیں کہ یہود حضور نبی کریم ﷺ کی بعض صفات کا اقرار کرتے تھے اور بعض کو چھپاتے تھے تاکہ ان کی تصدیق نہ کی جائے پس حق ان کا اقرار اور بیان تھا اور باطل ان کا صفات محمدیہ کو چھپانا تھا۔

۲؎ یہ نہی کے حکم کے تحت داخل ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے یعنی لا تکتموا ہے یا واؤ کے بعد اَنْ مضمرہ کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی حق و باطل کے خلط ملط اور کتمان حق کو جمع نہ کرو۔ درآں حالیکہ تم جانتے ہو کہ آپ ﷺ نبی مرسل ہیں پھر بھی ان کی صفات کو چھپاتے ہو یہ فعل انتہائی قبیح ہے، کیونکہ کسی جاہل کا تو عذر قبول کیا جاتا ہے (مگر عالم کا نہیں)۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿۴۳﴾

"اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ ۱؎ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ ۲؎"

۱؎ یعنی مسلمانوں جیسی نماز پڑھو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ کفار بھی فروع اسلام کے مخاطب ہیں۔ زکوٰۃ زکا الزرع سے مشتق ہے جس کا مطلب بڑھنا ہے، یا یہ تزکّی سے مشتق ہے جس کا مطلب پاک ہونا ہے کیونکہ زکوٰۃ میں مال کی تطہیر اور اس کی بڑھوتری ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

۲؎ یعنی محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب کی طرح نماز پڑھو نماز کو رکوع کے لفظ سے تعبیر فرمایا جو ارکان نماز میں سے ایک رکن ہے کیونکہ یہود کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔ اس آیت کریمہ میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے پر برانگیختہ کرنا ہے۔

مسئلہ: داؤد کے نزدیک جماعت رکن ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں فریضہ ہے رکن نہیں۔ جمہور کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے جو واجب کے قریب ہے۔ صبح کی جماعت کے فوت ہونے کا خوف ہو تو فجر کی سنتوں کو ترک کیا جاتا ہے، حالانکہ فجر کی سنتیں تمام سنتوں سے مؤکد ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا اکیلے نماز پڑھنے سے 27 درجے افضل ہے (1)۔ بخاری و مسلم نے یہ حدیث ابن عمر سے روایت کی ہے۔

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۴۴﴾

"کیا تم حکم کرتے ہو دوسرے لوگوں کو نیکی کا ۱؎ اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو حالانکہ تم پڑھتے ہو کتاب ۱؎ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ۲؎"

۱؎ کیا تم لوگوں کو اطاعت کا حکم دیتے ہو لیکن تمہارا اپنا عمل اس کے مخالف ہے، اس کلام میں استفہام تقریر، توبیخ اور تعجیب کے لئے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 89 (وزارت تعلیم)

ہے، البر کا مطلب خیر میں وسعت ہے، یہ البر سے مشتق ہے جس کا معنی کھلی فضا ہے اور یہ ہر خیر و بھلائی کو شامل ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ یہودی علماء کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ جب کوئی قریبی شخص ان سے حضور ﷺ کے متعلق پوچھتا تو وہ اپنے قریبی یا حلیف کو کہتے تم ان کے دین پر ثابت قدم رہو، ان کی نبوت حق ہے اور ان کا قول سچا ہے۔ الواحدی نے حضرت ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ خطاب یہود کے مشائخ کو ہے کیونکہ وہ لوگوں کو تورات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے مگر خود اس پر عمل نہ کرتے اور محمد ﷺ کی صفات جو تورات میں موجود تھیں انہیں تبدیل کر دیتے۔(1)

؎ نیکیوں کو خود بالکل بھلا دیتے۔ حالانکہ تم تورات کی تلاوت بھی کرتے ہو اس میں حضور نبی کریم ﷺ کی نعوت و صفات کا بیان ہے، اس آیت کریمہ میں عناد اور قول و عمل میں تضاد اور نیکی کے ترک پر وعید ہے۔

؎ کیا تمہیں اپنے غلط فعل کا ادراک نہیں یا تمہارے پاس سمجھنے کی قوت نہیں جو تمہیں اس بری حرکت سے روکے جس کا نتیجہ انتہائی قبیح ہے۔ عقل اصل میں حبس (روکنا) کو کہتے ہیں، اسی سے عِقَالُ الدَّابَّۃِ ہے، جانور کو باندھنے کی رسی، چونکہ عقل بھی انسان کو ہر اس فعل سے روکتی ہے جو اس کی دنیا و آخرت کے لئے مضر ہوتا ہے اس لئے اسے عقل کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو جو تمہارے علم و عقل کے مخالف ہے۔ امام بغوی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے معراج کی رات ایسے اشخاص دکھائے گئے جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے میں نے ان کے متعلق جبرئیل سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا یہ آپ ﷺ کی امت کے خطباء ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے تھے مگر خود اس پر عمل پیرا نہ ہوتے تھے، حالانکہ یہ کتاب پڑھتے تھے۔ حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائے گا پھر اسے دوزخ میں پھینک دیا جائے گا آگ میں اس کی انتڑیاں اور اوجھ نکل پڑے گا وہ اس گدھے کی طرح گھومے گا جو چکی کے گرد گھومتا ہے دوزخی اس کے پاس جمع ہو کر پوچھیں گے اے شخص تجھے کیا ہوا تو وہی نہیں ہے جو ہمیں نیکی کا حکم کرتا تھا اور برائی سے منع کرتا تھا وہ کہے گا میں تمہیں نیکی کا حکم کرتا تھا اور خود نیکی نہیں کرتا تھا۔ تمہیں برائی سے منع کرتا تھا مگر خود اس سے نہیں رکتا تھا(2)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس آیت کریمہ میں واعظ کو اپنے نفس کے تزکیہ اور اس کی تکمیل پر برانگیختہ کیا جا رہا ہے۔ فاسق کو وعظ سے منع کرنا مقصود نہیں ہے، کیونکہ دو امر واجب ہوں تو ایک میں کوتاہی دوسرے کے خلل کا باعث نہیں ہوتی(3)۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ عالم کی معصیت، جاہل کی معصیت سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اس کا نیکی کا حکم کرنا ناراضگی کا باعث ہے۔

پہلے جب اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا حکم دیا جو ان پر شاق تھے مثلاً ریاست کا ترک کرنا، دنیا کے مال و متاع کو چھوڑنا وغیرہ تو اب انہیں ایسی چیز کی ترغیب دی جا رہی ہے جو ان مشکل احکام پر ان کی معاونت کرے گی اور حوائج میں کامیابی کے لئے کافی ہوگی۔ فرمایا:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝

"اور مدد لو[1] صبر اور نماز سے[2] بے شک نماز ضرور بھاری[3] ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر بھاری نہیں[4]"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 46 مطبوعہ المکتبہ التجاریہ الکبری مصر
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 46 مطبوعہ المکتبہ التجاریہ الکبری مصر
3۔ تفسیر بیضاوی، جلد 1 صفحہ 175 ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

لے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے خوشی اور کامیابی کے منتظر رہنے کے ساتھ صبر سے مدد حاصل کرو اور صبر کا مفہوم یہ ہے کہ جزع فزع سے نفس کو روکنا کیونکہ آہ وفغاں تقدیر میں کچھ تبدیلی نہیں کر سکتے۔ نفس کو گناہوں سے روکنا اور طاعات پر نفس کو پابند کرنا بھی صبر کے معنی میں شامل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (اور جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچتی ہے)۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں صبر سے مراد روزہ ہے۔ اسی وجہ سے رمضان کے مہینہ کو شهر الصبر کہا جاتا ہے، روزہ دنیا سے بے رغبتی دلاتا ہے اور نماز آخرت کی طرف راغب کرتی ہے۔

۲ بعض علماء نے لکھا ہے کہ و الصلوٰۃ میں واؤ بمعنی علیٰ ہے یعنی نماز پر صبر کے ساتھ مدد طلب کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا اپنے اہل کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس پر مواظبت اختیار کیجئے۔ یا واؤ اپنے معنی میں ہی ہے کیونکہ نماز بھی غموں کو دور کرتی ہے اور حوائج وخواہشات پورا کرنے میں مدد دیتی ہے۔ امام احمد، ابوداؤد اور ابن جریر حضرت حذیفہ بن الیمان کے بھائی عبدالعزیز سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر جب کوئی مشکل کام آ جاتا تو آپ ﷺ نماز کی طرف متوجہ ہوتے(1)۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ الصلوٰۃ سے مراد دعا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جسے اللہ تعالیٰ یا کسی بندے سے کام ہو تو وہ وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے۔ پھر دو رکعت نماز ادا کرے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرے اور نبی کریم ﷺ پر درود بھیجے۔ اس کے بعد یوں دعا مانگے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ اَسْئَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَّالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ لَا تَدَعْ لِيْ ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ وَلَا حَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًا اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ(2)۔ (ترجمہ):۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو بڑا ہی بردبار اور کرم فرمانے والا ہے، ہر عیب سے پاک ہے اللہ جو عرش عظیم کا رب ہے، سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لئے ہیں اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیری رحمت کو واجب کر دینے والے اسباب کا اور تیری مغفرت کو پختہ کر دینے والی خصلتوں کا اور ہر نیکی کی نعمت کا اور ہر گناہ سے حفاظت کا اور ہر نافرمانی سے سلامتی کا۔ اے اللہ میرے ہر گناہ کو بخش دے، میری ہر فکر و پریشانی کو دور فرما دے اور میری ہر حاجت جو تیری رضا کے مطابق ہو اس کو پورا فرما دے، اے ارحم الراحمین۔ اس حدیث کو ترمذی نے عبداللہ بن اوفی سے روایت کیا ہے اور الحاکم نے مستدرک میں اسی طرح روایت کی ہے۔

۳ انها کی ها ضمیر کا مرجع نماز اور صبر دونوں سے استعانت ہے یا یہ معنی کہ جملہ اوامر ونواہی پر عمل کرنا مشکل ہے۔ اس صورت میں ها ضمیر کا مرجع تمام اوامر ونواہی ہوں گے یا ہر ایک خصلت مراد ہے، (یعنی نماز یا صبر) جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا یعنی كُلُّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُمَا۔ یا ها ضمیر کا مرجع صرف الصلوٰۃ ہے اگر و الصلوٰۃ میں واؤ بمعنی علیٰ ہو۔ بعض علماء نے فرمایا ضمیر کا صرف الصلوٰۃ کی طرف لوٹانا اس کی عظمت شان کو ظاہر کرنا ہے یا اس لئے کہ نماز صبر کی متعدد اقسام کی جامع ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ، (اللہ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ حق دار ہیں کہ وہ اسے راضی کریں)۔ یہاں بھی ہ ضمیر ذکر کی ہے حالانکہ کلام کا تقاضا تھا کہ هما ضمیر ہوتی۔ مگر چونکہ رسول اللہ ﷺ کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا میں داخل ہے اس لئے ضمیر مفرد ذکر فرمائی۔ بعض علماء نے فرمایا اس کا اصل معنی یہ ہے، صبر سے مدد طلب کرو وہ بڑا بھاری کام ہے اور نماز سے مدد طلب کرو یہ بڑی بھاری

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 131 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 63 (وزارت تعلیم)

ہے، مگر ایک کو اختصاراً حذف کیا گیا ہے۔

ؔ الخشوع کا معنی سکون ہے۔ اسی سے الخشعۃ ہے جس کا مطلب ریتلا اور ہموار ٹیلا ہے۔ یہ آواز اور آنکھ کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ (خاموش ہو جائیں سب آوازیں رحمن کے خوف سے)۔ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ (ندامت سے جھکی ہوں گی ان کی آنکھیں)۔ الخضوع کا معنی نرمی اور اطاعت کرنا ہے، اسی لئے خشوع جوارح کے ساتھ اور خضوع دل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ نماز بھاری نہیں ان مومنین پر جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف مائل ہیں اور ڈرنے والے اور عاجزی کرنے والے ہیں۔

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

"جو یقین کرتے ہیں ؎ کہ وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب سے ؔ اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ؎"

؎ جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی توقع رکھتے ہیں، یا ظن بمعنی یقین ہے، یعنی جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا یقین رکھتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں الظن کا لفظ اضداد میں سے ہے یعنی شک اور یقین دونوں کے درمیان مشترک ہے (1)۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ یقین پر ظن کا اطلاق مجازاً ہے کیونکہ رجحان میں اس کے مشابہ ہے۔

میں کہتا ہوں: یہاں ظن کے لفظ کا ذکر کرنا اور علم و یقین کے الفاظ کا ذکر نہ کرنا یہ شعور دیتا ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا اور اعمال صالحہ پر اللہ تعالیٰ کے جزاء عطا کرنے کا غالب گمان ہوگا تو عقل سلیم، اطاعت پر صبر کو اس کے لئے آسان بنادے گا اور نقصان کے خوف سے اسے معصیت سے روک لے گا۔ جیسا کہ ایک شخص کو اگر غالب گمان ہو کہ پیالے کے اندر زہریلا پانی ہے تو وہ پیاس کی مشقت برداشت کرے گا اور وہ پانی کا پیالہ استعمال نہ کرے گا۔ اسی طرح جس کا غالب گمان ہو کہ پیالے کا پانی شفا اور قوت کا باعث ہے تو وہ اس کے کڑوا ہونے کے باوجود اس کو پیتا رہے گا۔ پس جو اللہ تعالیٰ اور اعمال کی جزاء پر ایمان رکھتا ہے، وہ اپنے رب کی رضا کے حصول اور عظیم اجر وصول کرنے کے لئے مشقت کو کیسے حقیر سمجھے گا بلکہ وہ تو محبوب کے حکم کی پیروی اور محبوب کی ملاقات کی توقع میں لذت محسوس کرے گا۔ اسی لئے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ (نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے)۔

ؔ یعنی آخرت میں وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔ نماز مومن کی معراج ہے۔ یہ نماز اللہ تعالیٰ کے دیدار اور رویت کے لئے بندۂ مومن کا وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (اور رات کے بعض حصہ میں (اٹھو) اور نماز تہجد ادا کرو (تلاوت قرآن کے ساتھ) (یہ نماز) زائد ہے آپ کے لئے یقیناً فائز فرمائے گا آپ کو آپ کا رب مقام محمود پر)۔

حضرت ربیعہ بن کعب سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس رات گزارتا تھا۔ میں نے آپ ﷺ کو وضو کرایا تو آپ ﷺ نے مجھے فرمایا مانگو۔ میں نے عرض کی حضور ﷺ! میں جنت میں آپ ﷺ کی سنگت و مرافقت کا آپ ﷺ سے سوال کرتا ہوں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کیا اس کے علاوہ بھی کوئی خواہش ہے تو عرض کی حضور! ﷺ صرف یہی خواہش ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کثرت سجود کے ساتھ اپنے نفس پر میری اعانت کرو (مسلم) (2)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 47 مطبوعہ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 193 (قدیمی)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بندہ سجدہ کی حالت میں اپنے رب کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔(مسلم)(1)۔ بعض علماء نے فرمایا لقاء سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔

؎ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے والے ہیں اور وہ انہیں انکے اعمال کی جزا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اگر پیش نظر ہو تو ہر مشکل پر صبر کرنا آسان ہوتا ہے اسی لئے مصیبت زدہ کے لئے إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کہنا سنت ہے۔

يٰبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِينَ ﴿٤٧﴾

"اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور (یہ کہ) میں نے فضیلت دی تھی تمہیں سارے جہان والوں پر ۱؎"

۱؎ بطور تاکید دوبارہ اذْكُرُوا ذکر فرمایا ہے، اور فضیلت یاد دلائی ہے جو کہ تمام نعمتوں سے بڑی نعمت ہے اور ساتھ ہی وعید شدید کا ذکر فرمایا ہے اور وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ میں ان کے ان آباء و اجداد کی فضیلت مراد ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھے یا جو آپ کے زمانہ کے بعد تھے جنہوں نے اپنے دین میں تبدیلی نہیں کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت، کتاب، ایمان، علم، اعمال صالحہ، بادشاہی، عدالت اور انبیاء کی نصرت کی توفیق عطا فرما کر فضیلت عطا فرمائی تھی۔ مراد آباء ہیں مگر نعمت کو جتایا ان پر جا رہا ہے۔ اس لئے کہ آباء کی فضیلت، اولاد میں شرف کا موجب ہوتی ہے۔ اس کلام میں انہیں برانگیختہ کیا جا رہا ہے کہ تم بھی اپنے آباء جیسی فضیلت حاصل کرنے کی کوشش کرو اور ان کے آباء کو یہ فضیلت وحی اور انبیاء کی اتباع کی وجہ سے نصیب ہوئی تھی۔ پس ان کے لئے بھی فضیلت تب ممکن ہے جبکہ یہ محمد ﷺ اور قرآن کی اتباع کریں۔ کیونکہ اس میں موسیٰ علیہ السلام اور تورات کی اتباع بھی ہے۔ عالمین سے مراد ان کے زمانہ کے عالم ہیں۔ ابن جریر نے مجاہد، ابی العالیہ اور قتادہ سے یہی قول نقل کیا ہے(2) یا یہ مطلب کہ انہیں عالمین سے ان لوگوں پر فضیلت تھی جن میں یہ فضائل جمع نہ تھے۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٨﴾

"اور ڈرو اس دن سے جب نہ بدلہ دے سکے گا کوئی شخص کسی کا کچھ بھی ۱؎ اور نہ قبول کی جائے گی اس کے لئے سفارش اور نہ لیا جائے گا اس سے کوئی معاوضہ اور نہ وہ مدد کئے جائیں گے۔ ۲؎"

۱؎ یہاں نفس سے نفس کافرہ مراد ہے کیونکہ آیات و احادیث اہل کبائر کی شفاعت پر دلالت کرتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس پر اجماع ہے کہ اہل کبائر کی شفاعت ہوگی۔ شیئاً مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب یا مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے، بعض علماء نے فرمایا کوئی نفس کسی نفس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نفس کسی نفس کو تکالیف و شدائد سے کفایت نہیں کرے گا۔ اس جملہ میں ضمیر عائد محذوف ہے، تقدیر یوں ہے لَا تَجْزِي فِيهِ۔ اور جمہور علماء نے مجرور ضمیر عائد کو حذف کرنا جائز قرار نہیں دیا۔ وہ فرماتے ہیں اس میں وسعت پیدا کی گئی ہے پہلے حرف جر کو حذف کیا گیا پھر ضمیر کو مفعول بہ کے قائم مقام رکھا پھر اسے بھی حذف کر دیا گیا (کیونکہ مفعول بہ ضمیر کو حذف کرنا جائز ہے)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 191 (قدیمی) 2۔ تفسیر طبری، جلد 1، صفحہ 208-209 مطبوعہ الکبریٰ الامیریہ مصر

۲؎ فَلَا يُقْبَلُ کو ابن کثیر، ابوعمرو اور یعقوب نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے جس میں تذکیر و تانیث جائز ہوتی ہے۔ منھا میں ھا ضمیر کا مرجع نفس عاصیہ ہے یا شفاعت کرنے والا ہے۔ بعض نے فرمایا یہاں عدل کا معنی بدل ہے، اگرچہ عدل کا اصل معنی برابری کرنا ہے اور وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ میں هم ضمیر کا مرجع نفس ثانیہ ہے، چونکہ وہ نفی کے سیاق میں ہے اس لئے کثرت اور عموم پر دلالت کرتا ہے، آیت کریمہ میں کفار کے ہر شخص سے ہر اعتبار سے عذاب کے دور کرنے کی نفی کی گئی ہے کیونکہ عذاب کا دور کرنا جبر اور قہر سے ہوتا ہے، اس کو نصرت کہتے ہیں، ان کی اللہ تعالیٰ نے نفی فرمادی ہے یا بلاجبر و قہر عذاب کو دور کیا جاتا ہے یعنی سفارش کے ذریعے عذاب دور کیا جاتا ہے۔ یا اس کی طرف سے کوئی دوسرا حقوق ادا کرے، اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی نفی کردی۔ یہ آیت کریمہ یہود کے زعم باطل کے رد میں نازل ہوئی ہے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہمارے آباء و اجداد ہماری شفاعت کریں گے۔

وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾

"اور یاد کرو جب نجات بخشی ہم نے تمہیں فرعونیوں سے ۱؎ جو پہنچاتے تھے تمہیں سخت عذاب ۲؎ (یعنی) ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رہنے دیتے تھے تمہاری عورتوں (بیٹیوں) کو ۳؎ اور اس میں بڑی بھاری آزمائش تھی ۴؎ تمہارے رب کی طرف سے ۵؎"

۱؎ اور یاد کرو کہ ہم نے تمہارے اسلاف کو نجات عطا فرمائی۔ یہ آیت کریمہ ان نعمتوں کے اجمال کی تفصیل ہے جن کا ذکر پہلے ہوا ہے، اس کا نعمتی پر عطف ہے، جیسے خاص کا عطف عام پر ہوتا ہے، موجودہ اسرائیلیوں پر بھی احسان کا جتلانا مقصود ہے کیونکہ آباء کی نجات کے ساتھ ان کو بھی نجات حاصل ہوئی تھی۔ آل کی اصل اهل ہے کیونکہ اس کی تصغیر اُهَيل آتی ہے۔ انبیاء اور ملوک جیسے عظیم لوگوں کی اولاد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ فرعون عمالقہ کے بادشاہ کا لقب ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون ولید بن مصعب بن الریان تھا۔ اس کی عمر چار سو سال سے زیادہ تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون ریان تھا۔ ان کے درمیان چار سو سال سے زیادہ کی مدت ہے۔

۲؎ وہ تمہیں تکلیف دیتے ہیں اور وہ تمہیں عذاب چکھاتے ہیں۔ سوم کی اصل کسی شئ کی طلب میں نکل جانا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں مختلف قسم کے عذابوں میں گھماتے رہتے ہیں جیسے صحراء میں چلنے والا اونٹ ہے، فرعون بنی اسرائیل کو مختلف اعمال پر لگائے رکھتا۔ وہ مکان تعمیر کرتے، زمین میں ہل چلاتے، بوجھ اٹھاتے، ٹیکس ادا کرتے اور ان کی عورتیں سوت کاتنے کا کام کرتی تھی۔ سوء العذاب: یہ ساء یسوء کا مصدر ہے اور يَسُوْمُوْنَكُمْ کا مفعول ہے۔ یہ پورا جملہ نَجَّيْنٰكُمْ کی ضمیر سے حال ہے، یا آل فرعون سے حال ہے یا دونوں سے حال ہے۔

۳؎ یہ یسومونکم کا بیان ہے (یعنی وہ تکلیف یہ دیتے تھے کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتے تھے)۔ اس لئے درمیان میں حرف عطف ذکر نہیں فرمایا بلکہ بدل کی شکل میں ذکر فرمایا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں فرعون نے خواب دیکھا کہ ایک آگ بیت المقدس میں آئی ہے اور اس نے پورے مصر کو گھیر لیا ہے، اور ہر قبطی کو جلا دیا ہے مگر بنی اسرائیل کو نہیں جلایا ہے۔ پس وہ اس

سے خوفزدہ ہوا اور اس نے کاہنوں سے اس کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے کہا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری ہلاکت اور تیری بادشاہی کا زوال ہوگا(1)۔ اسی طرح ابن جریر نے السدی سے روایت کیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں فرعون نے بنی اسرائیل کے ہر پیدا ہونے والے بچے کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ اس نے دایہ کا پیشہ کرنے والی عورتوں کو جمع کیا اور کہا بنی اسرائیل کا ہر پیدا ہونے والا بچہ قتل کر دیا جائے اور بچی زندہ چھوڑ دی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کی طلب میں بارہ ہزار بچے قتل کروا دیے۔ حضرت وہب فرماتے ہیں اس نے 90 ہزار قتل کروائے تھے۔ پھر بنی اسرائیل کے بوڑھوں میں موت واقع ہونے لگی، تو قبطیوں کے ایک سردار نے فرعون کو کہا بنی اسرائیل میں موت واقع ہو گئی ہے۔ اگر ان کے بچے ذبح کیے گئے اور بوڑھے مرتے گئے تو محنت و مشقت کے تمام کام ہمیں خود کرنے پڑیں گے۔ فرعون نے دوسرا حکم نامہ جاری کیا کہ ایک سال بچے ذبح کیے جائیں اور ایک سال ذبح نہ کیے جائیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس میں انہوں نے بچے ذبح نہیں کرنے تھے۔ اور موسیٰ علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس میں وہ بچوں کو ذبح کر رہے تھے(2) (مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قدرت کاملہ سے بچالیا)۔

؎ بلاء کا معنی اختبار ہے یعنی آزمانا، کبھی آزمائش شدت و عذاب کے ساتھ ہوتی ہے۔ یعنی مصیبتوں پر صبر کرنے کی آزمائش ہوتی ہے۔ کبھی آزمائش نعمت کے ساتھ ہوتی ہے نعمتوں کے شکر کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۔ (اور ہم خوب آزماتے ہیں تمہیں برے اور اچھے حالات سے دوچار کر کے) پس نعمتوں کے وقت شکر اور تکلیفوں کے وقت صبر کرنا واجب ہے۔ ذالکم کا مشار الیہ اگر فرعونیوں سے نجات دینا ہے تو بلاءٌ کا یہاں دوسرا معنی مراد ہوگا اگر سخت عذاب سے دوچار کرنا ہو تو بلاءٌ کا پہلا معنی مراد ہوگا۔

؎ یعنی فرعون کو مسلط کرنے کے ساتھ، یا موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے ساتھ اور انہیں تمہاری خلاصی کی توفیق بخشنے کے ساتھ، تمہیں تمہارے رب نے آزمایا ہے، عظیمٌ یہ بلاءٌ کی صفت ہے۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝

"اور جب پھاڑ دیا ہم نے تمہارے لئے سمندر کو پھر ہم نے بچالیا تم کو اور ڈبو دیا فرعونیوں کو اور تم کنارے پر کھڑے دیکھ رہے تھے"

ل ہم نے تمہارے داخل ہونے کی وجہ سے سمندر کو پھاڑ دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں بکم بمعنی لکم ہے یعنی ہم نے تمہاری خاطر سمندر کو پھاڑ دیا۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ جب فرعون کی ہلاکت قریب ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو رات کے وقت نکال کر لے جاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو رات کے وقت چلنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا اپنے گھوڑوں پر زینیں بھی گھروں میں کسو۔ اللہ تعالیٰ نے قبطیوں میں جو بنی اسرائیل کی طرف سے ولد زنا تھے ان کو قبطیوں کی طرف نکال دیا، اسی طرح اس کے برعکس بھی یعنی جو بنی اسرائیل میں قبطیوں کی طرف سے ولد الزنا تھے انہیں بنی اسرائیل کی طرف نکال دیا۔ قبطیوں پر موت طاری ہو گئی۔ وہ انہیں دفن کرنے میں مشغول ہو گئے حتیٰ کہ صبح ہو گئی سورج طلوع ہوا اور موسیٰ علیہ السلام چھ لاکھ یا اس سے بھی زائد تعداد کے ساتھ نکلے حالانکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ مصر میں صرف 72 آدمی داخل ہوئے تھے۔ جب بنی اسرائیل نے رات کے وقت چلنے کا ارادہ کیا تو تیہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 48 مطبوعہ المکتبہ التجاریۃ الکبریٰ مصر　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 48 ایضاً

کے صحراء میں وہ گم ہو گئے انہیں راستہ کا پتہ ہی نہ چلتا تھا، آپ نے بنی اسرائیل کے بزرگوں سے پوچھا تو کہنے لگے حضرت یوسف علیہ السلام پر جب وقت وصال آیا تو انہوں نے اپنے بھائیوں سے عہد لیا تھا کہ وہ جب مصر سے نکلیں تو مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ کی قبر کے متعلق پوچھا تو کسی کو بھی علم نہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بلند آواز سے خدا سے دعا کی کہ جسے حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر کے بارے علم ہو وہ مجھے بتائے اور جسے خبر نہ ہو اس کے کان میری بات کو نہ سنیں۔ تو آپ کی آواز کو صرف ایک بوڑھی عورت نے سنا۔ اس بوڑھی عورت نے کہا اگر میں قبر تک تیری راہنمائی کروں تو تم مجھے وہ عطا کرو گے جو میں سوال کروں گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انکار کر دیا اور فرمایا میں ایسا نہیں کر سکتا یہاں تک کہ اپنے رب سے پوچھ لوں۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بوڑھی عورت کی شرط ماننے کا حکم دے دیا۔ بوڑھی عورت نے کہا میں چل نہیں سکتی مجھے مصر سے نکال کر لے جائیں دوسرا یہ کہ آخرت میں، تم جنت کے جس بالا خانہ میں اترو میں بھی تمہارے ساتھ اتروں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تمہاری شرط قبول ہے۔ بوڑھی عورت نے کہا وہ دریائے نیل کے درمیان میں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قبر کو ظاہر فرما دیا آپ نے انہیں ایک صندوق میں نکالا اور اٹھا کر شام لے گئے اور وہاں دفن فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے پچھلے حصہ کے ساتھ تھے اور ہارون علیہ السلام قافلہ کے مقدمہ کے ساتھ تھے۔ ادھر فرعون کو جب بنی اسرائیل کے نکل جانے کی خبر پہنچی تو اس نے کہا صبح سویرے مرغ کے اذان دینے کے ساتھ ہی بنی اسرائیل کی تلاش میں نکلنا ہے، قسم بخدا اس رات مرغ نے سویرے اذان ہی نہ دی۔ فرعون نکلا تو ہامان تقریباً ایک کروڑ سات لاکھ آدمی ساتھ لیکر آگے نکلا اور ان میں ستر ہزار سیاہ گھوڑے بھی تھے۔ بنی اسرائیل چلتے رہے یہاں تک کہ سمندر کے کنارے پہنچ گئے، سمندر میں پانی بہت زیادہ تھا۔ اشراق کے وقت انہوں نے فرعونیوں کو پیچھے آتے دیکھا تو بہت پریشان ہوئے۔ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو اصحاب موسیٰ نے کہا ہم تو پکڑے گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہرگز نہیں بیشک میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ میری یقیناً راہنمائی فرمائے گا)۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی: اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ (کہ ضرب لگاؤ اپنے عصا سے سمندر کو تو سمندر پھٹ گیا اور ہو گیا پانی کا ہر حصہ بڑے پہاڑ کی مانند)۔ پس سمندر میں ان کے قبیلوں کی تعداد کے برابر بارہ راستے بن گئے اور ہر دو راستوں کے درمیان پانی پہاڑ کی مانند بلند ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا اور سورج کو سمندر کی گہرائی پر چلایا حتیٰ کہ راستے خشک ہو گئے اور ہر قبیلہ اپنے اپنے راستہ پر چلنے لگا۔ مگر درمیان میں پانی کے پردہ کی وجہ سے ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے تو وہ اپنے بھائیوں پر غرق ہونے کا اندیشہ کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے پانی اکٹھا ہو گیا اور وہ ایک دوسرے کو نظر آنے لگے اور ایک دوسرے کی آوازوں کو بھی سننے لگے حتیٰ کہ وہ صحیح وسلامت سمندر عبور کر گئے۔

پھر فرعون نے جب دیکھا کہ سمندر پھٹا ہوا ہے خشک وصاف راستہ بنا ہوا ہے تو کہنے لگا یہ میری ہیبت کی وجہ سے پھٹ گیا ہے تا کہ میں اپنے بھاگے ہوئے غلاموں کو پکڑ لوں۔ فرعون سیاہ گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے گھوڑوں میں کوئی مادہ نہ تھی، اچانک جبرئیل ایک گھوڑی پر سوار ہو کر آئے تو وہ سمندر میں داخل ہو گئے۔ فرعون کے سیاہ گھوڑے نے جب مادہ کی بو محسوس کی تو وہ بھی سمندر میں اس کے پیچھے داخل ہو گیا۔ دوسرے فرعونیوں کو اب وہ نظر نہ آتا تھا اور فرعون بھی اب بے بس ہو چکا تھا۔ بقیہ تمام فرعونیوں نے اس کے پیچھے اپنے گھوڑے سمندر میں ڈال دیئے۔ میکائیل ایک گھوڑے پر سوار ہو کر فرعونیوں کے گھوڑوں کو ہانکنے لگے اور فرمانے لگے تم بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل جاؤ حتیٰ کہ تمام سمندر میں داخل ہو گئے۔ سمندر کے دونوں کناروں کے درمیان چار فرسخ کا فاصلہ تھا۔ یہ فارس کے سمندروں

سے بحر قلزم ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں یہ مصر کے پیچھے ایک سمندر ہے جسے اساف کہا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ بنی اسرائیل کنارے پر کھڑے دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وانتم تنظرون : تم ان کے ڈوبنے کو دیکھ رہے تھے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۵۱

”اور یاد کرو جب ہم نے وعدہ ۱؎ فرمایا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم نے بنا لیا تم نے بچھڑے کو معبود ان کے بعد اور تم سخت ظالم تھے“

۱؎ ابو جعفر اور ابو عمرو نے ہر جگہ وَعَدْنَا، وَعَدْنَاکُمْ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے الف ساکن کے ساتھ واعدنا پڑھا ہے، دونوں کا معنی ایک ہے جیسے عَاقَبْتُ اللِّصَّ اور عَقَبْتُ کا معنی ایک ہے، الزجاج فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم تھا اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے قبول کرنا تھا۔ اسی وجہ سے باب مفاعلہ المواعدۃ ذکر فرمایا ہے، بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے وحی عطا کرنے کا وعدہ فرمایا اور موسیٰ علیہ السلام نے طور پر آنے کا وعدہ فرمایا تھا۔

قراءاتِ موسٰی :۔ حمزہ اور الکسائی نے موسیٰ اور ہر فعل اور اسم کو جس کے آخر میں ی ہو اس کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسے عیسیٰ، یحییٰ، الموتیٰ، طوبیٰ، اخریٰ، یخشیٰ، اساریٰ، کسالیٰ، فرادیٰ، نصاریٰ، والایامیٰ، الحوایا، بشریٰ، ذکریٰ، ضیزیٰ اور ان کے مشابہ الفاظ جن کے آخر میں الف ثابت ہو، اسی طرح العمیٰ، الھدیٰ، والضحیٰ، الرؤیا، ماواہ، ماواکم، مثواکم، مثواہ اور ان کی شکل جس میں الف مقصورہ ہو اور اسی طرح الادنیٰ، ازکیٰ، اولیٰ، اعلیٰ اسی طرح ان کے مشابہ صفات ہیں۔ اسی طرح اتیٰ، سعیٰ، زکیٰ، فسوّیٰ، یخشیٰ، یرضیٰ، یھویٰ اور ان کے مشابہ الفاظ جن کا الف یاء سے بدل کر آیا ہوتا ہے، اسی طرح حمزہ اور الکسائی نے انّی جو کیف کے معنی میں ہے اس میں امالہ کیا ہے جیسے انّیٰ شئتم وانّیٰ لک، اسی طرح متیٰ، بلیٰ اور عسیٰ جہاں بھی آتے ہیں امالہ کے ساتھ پڑھا ہے، اسی طرح ان کے مشابہ الفاظ جو یاء کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ سوائے پانچ الفاظ کے۔ وہ یہ ہیں حتّیٰ، لدیٰ، علیٰ، الیٰ اور مازکیٰ یہ اجماعاً مفتوح پڑھے جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ اسماء اور افعال جن کے آخر میں اصلاً واؤ ہو بالاجماع مفتوح ہوتے ہیں جیسے الصفا، سنا برقہ، بدا، دنا، عفا، علا اور اس کے مشابہ الفاظ جو سورتوں کے آخر میں یاء والے الفاظ کے درمیان واقع نہ ہوں یا ان کو کوئی زیادتی لاحق ہو جیسے تدعیٰ، تبلیٰ، فمن اعتدیٰ، من استعلیٰ، انجاکم، نجاکم، زکّٰھا اور ان کے مشابہ الفاظ یہ زیادتی کے لاحق ہونے کی وجہ سے یاء والے الفاظ کے ساتھ لاحق ہوگئے۔ ابو عمرو نے مذکورہ الفاظ جن میں راء کے بعد یاء ہے امالہ سے پڑھا ہے اور وہ لفظ جو سورت کی آیت کی ابتداء میں ہو یا آخر میں ہوں اور یاء پر یا ھاء پر ختم ہوتے ہوں، یا الف پر ختم ہوتے ہوں، یا جو فَعْلیٰ، فِعلیٰ یا فُعلیٰ کے وزن پر ہوں اور اس میں راء نہ ہو تو دونوں لفظوں کے درمیان پڑھتے ہیں، ان کے علاوہ پر فتحہ پڑھتے ہیں۔ ورش نے تمام الفاظ کو بین بین پڑھا ہے مگر جو الفاظ سورتوں کے آواخر میں ہیں اور ان کے آخر میں ھاء یا الف ہے اس پر انہوں نے خالص فتحہ پڑھا ہے ابو بکر رمیٰ کو سورۂ انفال میں اور اعمیٰ کو سورۂ سبحان میں دونوں جگہ امالہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ابو عمرو نے پہلے اعمیٰ کے امالہ میں ورش کی متابعت کی ہے اور ان کے علاوہ الفاظ کو فتحہ دیا ہے۔ حفص نے سورۂ ہود میں صرف مجریھا میں امالہ کیا ہے، ابو عمرو سے

یاویلتٰی، یحسرتٰی اوراَنّٰی جب استفہامیہ ہو، کو دو لفظوں کے درمیان پڑھنا مروی ہے اور یا سفٰی کو فتحہ کے ساتھ پڑھنا مروی ہے، جب وہ الف جس میں امالہ کیا گیا ہوا جتماع ساکنین کی وجہ سے وصل کلام میں گر جائے تو اس میں امالہ نہ ہوگا اور حالت وقف میں امالہ ہوگا جیسے ھدی للمتقین، وموسٰی الکتب، ھدی اور موسٰی پر وقف کے وقت امالہ ہوگا مگر وصل کی صورت میں نہ ہوگا۔ الیزیدی نے ابوعمرو سے ساکن حرف کے ساتھ وصلاً راء کا امالہ روایت کیا ہے، جیسے یری، وَیَرَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، وَالنَّصٰرٰی المسیح والکبری اذھب والقری التی اور ان کے مشابہ الفاظ اور الکسائی، اَحْیَا، فَاَحْیَابِہٖ اور اَحْیَاھَا جہاں بھی آیا ہے، امالہ کرنے میں منفرد ہیں، خَطٰیٰکُمْ، رُءْیَاہ، رُءْیَایَ، مَرْضَاتِ اللّٰہِ، مَرْضَاتِیْ جہاں بھی آیا ہے اس میں امالہ پڑھا ہے، آل عمران میں حَقَّ تُقٰتِہٖ، میں قَدْھَدٰانِ سورۃ انعام میں، من عَصَانِیْ سورۃ ابراہیم میں، وَمَآ اَنْسٰنِیْہُ سورۃ کہف میں، اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ سورۃ مریم میں، فَمَآ اٰتٰنِیَ اللّٰہُ سورۃ النمل میں، مَحْیَاھُمْ سورۃ جاثیہ میں، دَحٰھَا سورۃ النازعات میں، تَلٰھَا وطَحٰھَا سورۃ شمس میں، سَجٰی سورۃ الضحٰی میں امالہ کے ساتھ پڑھا ہے، الکسائی نے تُجٰی وَلَاتَحْیٰی، وَلَاتَحْیٰی وَاَحْیَا جب واؤ سے متصل ہوں تو امالہ کے ساتھ پڑھنے میں حمزہ سے اتفاق کیا ہے۔ اسی طرح اَلدُّنْیَا، اَلْعُلْیَا، اَلْحَوَایَا، اَلضُّحٰی، ضُحٰھَا، اَلرِّبٰوا، اِنَّنِیْ، ھَدٰنِیْ اٰتٰنِیْ سورۃ ہود میں، لَوْاَنَّ اللّٰہَ ھَدٰنِیْ، مِنْھُمْ تُقٰۃً، مُزْجٰۃٍ میں امالہ پڑھا ہے، اور ہشام نے اَتَاہُ کے لفظ کے امالہ میں حمزہ اور الکسائی کی پیروی کی ہے۔ جبکہ باقی قراء نے تمام کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

ے یہ تیس راتیں ذی القعدہ کی اور دس راتیں ذی الحجہ کی تھیں۔ جب فرعون کے ہلاک ہونے کے بعد بنی اسرائیل مصر لوٹے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا، تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ۔ میں اپنے رب کی بارگاہ میں جا رہا ہوں اور ان سے چالیس راتوں کا وعدہ فرمایا اور حضرت ہارون کو اپنا نائب بنایا۔ حضرت جبرئیل حیوۃ کے گھوڑے پر آئے جو جس چیز کو مس کرتا وہ زندہ ہو جاتی تھی۔ جبرئیل اس لئے آئے تھے تاکہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنے رب کے پاس لے جائیں۔ جب السامری نے گھوڑے کی جگہ دیکھی تو وہ سبز ہو چکی تھی۔ یہ سامری ایک سنار تھا جو اہل باجری سے تھا۔ بعض نے فرمایا اہل کرمان سے تھا، اصل میں منافق تھا مگر اسلام کا اظہار کرتا تھا۔ یہ اس قوم کا فرد تھا جو گائے کی پوجا کرتے تھے۔ اس نے جبرئیل امین کے گھوڑے کے سم کی مٹی سے ایک مٹھی بھر لی۔ بنو اسرائیل نے فرعونیوں سے شادی کی غرض سے عاریتہً زیورات لئے تھے، جب انہوں نے مصر سے نکلنے کا ارادہ کیا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرعون کو ہلاک کر دیا اور زیورات بنی اسرائیل کے پاس رہ گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام چلے گئے تو السامری نے کہا وہ زیورات جو تم نے فرعونیوں سے عاریتہً لئے تھے وہ مال غنیمت ہیں، وہ تمہارے لئے حلال نہیں ہیں، ایک گڑھا کھودو اور اس میں انہیں دفن کر دو۔ حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام واپس تشریف لائیں اور اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔ حضرت السدی فرماتے ہیں: یہ مشورہ انہیں حضرت ہارون نے دیا تھا۔ سامری نے ان زیورات سے تین دنوں میں ایک بچھڑا بنا دیا اور اس میں وہ مٹی ڈال دی جو اس نے جبرئیل کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے لی تھی، تو وہ سونے سے بنا ہوا، موتیوں سے مزین بچھڑا ڈکارتا ہوا باہر نکل آیا اور چلنے لگا۔ السامری نے کہا یہ ہے تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا۔ وہ تو بھول گئے ہیں۔ بنی اسرائیل دن اور رات کو دو دن شمار کرتے تھے جب اس طرح بیس دن گزر گئے اور موسیٰ علیہ السلام نہ آئے تو کہنے لگے موسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں۔ پس اس بچھڑے کو دیکھنے کے ساتھ فتنہ میں مبتلا ہو گئے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے

تیس دن کا وعدہ کیا تھا پھر دس دن زیادہ ہو گئے تو وہ فتنہ میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت ہارون اور بارہ ہزار دوسرے مردوں کے سوا تمام نے بچھڑے کی عبادت کرنی شروع کر دی۔

۲؎ ابن کثیر اور حفص ذال کو اخذتم، اتخذتم اور اس جیسے الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں جبکہ باقی قراء ادغام کرتے ہیں۔ من بعدہ سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد ہے۔ وانتم ظالمون کا مطلب یہ ہے کہ تم خود اپنے نفسوں کو نقصان پہنچانے والے تھے اور عبادت کو اپنے مقام پر رکھنے والے نہیں تھے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝۵۲

"پھر بھی درگزر فرمایا ہم نے تم سے اس (ظلم عظیم) کے بعد شاید کہ تم شکر گزار بن جاؤ ۱؎"

۱؎ یعنی بچھڑے کو معبود بنانے کے بعد جب تم نے توبہ کی تو ہم نے تمہیں معاف کر دیا۔ العفو کا معنی جرم کو مٹا دینا ہے اور یہ عفا سے مشتق ہے جس کا معنی کسی چیز کو بار بار روندنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا شکر طاعت کا نام ہے جو دل، زبان اور اعضاء ظاہری سے ہوتا ہے، حضرت حسن فرماتے ہیں نعمت کا شکر، نعمت کو یاد کرنا ہے، سید الطائفہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نعمت کا شکر یہ ہے کہ اس نعمت کو منعم کی رضا میں صرف کیا جائے۔ بعض علماء نے فرمایا شکر کی حقیقت، شکر سے عجز ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام سے حکایت ہے کہ انہوں نے عرض کی الٰہی تو نے مجھے کمل نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور پھر مجھے ان نعمتوں کے شکر کا حکم دیا ہے، میرا شکر تو فقط یہ ہے کہ یہ تمام نعمتیں تیری عطا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ تجھے ایسا علم ملا ہے جس سے بلند کوئی علم نہیں ہے۔ میرے بندے کے لئے یہی کافی ہے کہ اسے جو نعمت بھی ملے وہ یقین رکھے کہ یہ میری طرف سے ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا: پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی نعمتوں کے شکر سے بندے کے عجز کے اعتراف کو شکر شمار فرمایا۔ جیسا کہ معرفت سے عجز کے اعتراف کو معرفت شمار فرمایا۔(1)

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۝۵۳

"جب عطا فرمائی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق و باطل میں تمیز کی قوت ۱؎ تاکہ تم سیدھی راہ پر چلنے لگو ۲؎"

۱؎ الکتاب سے مراد تورات ہے اور والفرقان کے متعلق بعض علماء فرماتے ہیں یہ بھی تورات کا دوسرا نام ہے۔ دونوں اسموں کے ساتھ تورات کا ذکر فرمایا ہے، الکسائی فرماتے ہیں الفرقان الکتاب کی صفت ہے اور واؤ زائدہ ہے، یعنی حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی کتاب۔ بعض علماء نے فرمایا الفرقان سے وہ معجزات مراد ہیں جو حق کے علمبردار اور باطل کے پرستار کے درمیان فرق ظاہر کرنے والے تھے۔ یا شریعت مراد ہے جو حلال و حرام کے درمیان فرق کرنے والی تھی۔

۲؎ تاکہ تم کتاب میں غور و فکر کر کے ہدایت پاؤ۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِىٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۝۵۴

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 51 مطبوعہ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر

"اور یاد کرو جب کہا موسیٰ (علیہ السلام نے) اپنی قوم سے اے میری قوم! بے شک تم نے ظلم ڈھایا اپنے آپ پر بچھڑے کو خدا بنا کر پس چاہیے کہ توبہ کرو اپنے خالق کے حضور ۱؎ سو قتل کرو اپنوں کو (جنہوں نے شرک کیا) ۲؎ یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک ۳؎ پھر حق تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کر لی بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۴؎"

۱؎ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اس قوم کو فرمایا جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنایا تھا۔ اے میری قوم تم نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا ہے۔ بچھڑے کو معبود بنا کر، پس اب لوٹو اس کی طرف جس نے تمہیں ہر تفاوت سے مبرا پیدا فرمایا اور پھر صورت اور ہیئت میں ایک دوسرے سے ممتاز فرمایا۔ ب، ر، ء کا مادہ کسی چیز کو دوسری چیز سے بالکل جدا کر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ کسی تنگی سے نکالنے کے طریقہ پر ہو جیسے مریض نے مرض سے اور مقروض نے قرض سے نجات حاصل کی یا انشاء کے طور پر ہو جیسے بَرَءَ اللّٰهُ آدَمَ مِنَ الطِّيْنِ۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا۔

قرأت: ابو عمرو نے دونوں حرفوں میں اور یا مُرُكُم، یا مُرُهُم، ینصُرُكم اور یشعِرُكم کو اعراب کی حرکت کے اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض نے فرمایا انہوں نے ساکن کر کے پڑھا ہے، اس طرح حمزہ ان کے مذہب کے مطابق یاء سے بدل جائے گا۔ باقی قراء نے مکمل حرکت کے ساتھ پڑھا ہے۔ الکسائی نے بارئکم میں دونوں جگہ امالہ کیا ہے۔ الباری جس کا معنی المصورُ (تصویر بنانے والا) ہے، سارعوا، یسارعون اور یسارع جہاں بھی آیا ہے والجار کو دو مقامات پر، جبارین کو دو مقامات پر الجوار کو سورۂ شوریٰ میں، رحمٰن اور کورت میں مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ کو دونوں جگہ میں، کمشکوٰۃ کو سورۂ نور میں امالہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور ورش نے الجار اور الجبارین کو بین بین پڑھا ہے۔

۲؎ اپنی توبہ کی تکمیل کے لئے بری، مجرم کو قتل کرے یہ بھی جائز ہے کہ فَتُوْبُوْا کی تفسیر کے لئے ہو، یعنی اپنے نفسوں کو قتل کرو یہی تمہاری توبہ ہے۔ یہ کام تمہارے لئے شرک سے طہارت، اور حیات ابدی اور فرحت سرمدی کا ذریعہ ہے، جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کو قتل کا حکم دیا تو انہوں نے کہا ہم اللہ کے امر پر صبر کریں گے، وہ اپنے گھروں کے صحنوں میں چوکڑی مار کر بیٹھ گئے، اور کہا گیا، جو کھڑا ہوا یا اپنے قاتل کو دیکھا یا اپنے ہاتھ یا پاؤں سے اس کو دور کیا وہ ملعون ہوگا اور اس کی توبہ قبول نہ ہوگی، قوم نے جب ان پر خنجر سونتے تو آگے ہر شخص نے اپنے بیٹے، باپ، بھائی یا قریبی یار دوست کو پایا، تو قرابت کے رشتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی حضور ہم یہ حکم کیسے بجا لائیں تو اللہ تعالیٰ نے زمین سے اٹھنے والے غبار سے کہر کا پردہ بنا دیا یا سیاہ بادل بھیج دیا، اب انہیں اپنے رشتہ دار دکھائی نہ دیتے تھے، انہوں نے قتل کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ شام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب بہت زیادہ قتل ہو گئے تو موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے دعا مانگی، تضرع و زاری کی اور عرض کی اے ہمارے رب بنو اسرائیل ہلاک ہو گئے ہیں۔ تو بادل فوراً چھٹ گیا اور اللہ تعالیٰ نے قتل سے رکنے کا حکم فرما دیا۔ اس وقت تک ہزاروں آدمی قتل ہو چکے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مقتولوں کی تعداد ستر ہزار تھی، موسیٰ علیہ السلام پر یہ صورت حال انتہائی شاق گزری۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی اے موسیٰ کلیم! کیا تجھے یہ پسند نہیں کہ میں قاتل اور مقتول دونوں کو جنت عطا کر دوں گا۔ جو قتل ہوگا وہ شہید ہوگا اور جو باقی رہے گا اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔

۲؎ اس نے تم سے درگزر فرمایا۔ یہ محذوف کلام کے متعلق ہے اگر یہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہو تو تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: اِنْ فَعَلْتُمُ الْقَتْلَ فَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ: یعنی اگر تم قتل کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر نظر کرم فرمائے گا، اور اگر یہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام نہ ہو تو غیبت سے خطاب کی طرف التفات کے طریقہ پر تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فَفَعَلْتُمْ مَا اُمِرْتُمْ بِهٖ فَتَابَ عَلَيْكُمْ تم نے وہ کیا جو تمہیں حکم دیا گیا ہے تو اس نے تم پر نظر رحمت فرمائی۔

۳؎ اور وہ کثرت سے توبہ قبول فرمانے والا ہے یا کثرت سے توبہ کی توفیق عطا فرمانے والا ہے اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴿۵۵﴾

"اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تجھ پر جب تک ہم نہ دیکھ لیں اللہ کو ظاہر ۱؎ پس (اس گستاخی پر) آلیا تم کو بجلی کی کڑک ۲؎ نے اور تم دیکھ رہے تھے ۳؎"

۱؎ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے چند لوگ لے آؤ جو بچھڑے کی عبادت کرنے پر میری بارگاہ میں معذرت کریں۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا۔ آپ نے انہیں فرمایا، روزہ رکھو، غسل کرو اور پاک کپڑے پہنو، انہوں نے جب تیاری کر لی تو آپ طور سینا کی طرف انہیں لے کر چل پڑے۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کرو کہ ہم بھی اپنے رب تعالیٰ کے کلام کو سن سکیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام پہاڑ کے قریب پہنچے تو بادل ستون کی شکل میں آیا اور اس نے پورے پہاڑ کو گھیر لیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس بادل میں داخل ہو گئے اور وہ بھی داخل ہوئے اور انہیں داخل ہونے کے وقت فرمایا سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤ۔ جب موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام شروع فرمائی تو ان کے چہرے پر ایک نور چھا گیا۔ حتیٰ کہ کوئی شخص آپ کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان اصحاب موسیٰ کے سامنے پردہ تھا مگر وہ سن رہے تھے کہ وہ کلام کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں کچھ اوامر دے رہے ہیں اور کچھ چیزوں سے منع کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بھی سنایا کہ میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ میں نے تمہیں مصر کی زمین سے سخت قبضے کے باوجود نجات دلائی ہے۔ پس تم میری عبادت کرو، کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو۔ جب موسیٰ علیہ السلام کلام سے فارغ ہوئے تو بادل چھٹ گئے۔ آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ کہنے لگے: اے موسیٰ ہم تیری بات کی وجہ سے ایمان نہیں لائیں گے یا ہم ہرگز اقرار نہیں کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے تورات عطا فرمائی ہے یا تجھ سے کلام فرمائی ہے یا تو نبی ہے، یہاں تک کہ ہم اللہ تعالیٰ کو عیاں دیکھ لیں۔ جهرة اصل میں جهرت بالقراۃ کا مصدر ہے، استعارةً معاینہ کے لئے استعمال ہوا ہے اور اس پر نصب مصدر ہونے کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ رویت کی ہی ایک نوع ہے، یا یہ ضمیر فاعل سے حال ہے یا اسم جلالت سے حال ہے۔

۲؎ یعنی تم پر موت طاری ہو گئی، بعض علماء نے فرمایا یہ ایک آگ تھی جو آسمان سے نازل ہوئی اور ان تمام کو جلا کر راکھ کر دیا۔

۳؎ یعنی تم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ انہیں مصیبت پہنچ رہی ہے یا اس کا اثر ظاہر ہو رہا ہے۔ جب وہ ہلاک ہو گئے تو موسیٰ علیہ السلام نے تضرع وزاری شروع کر دی اور کہا اے اللہ میں بنی اسرائیل سے کیا کہوں گا، تو نے ان کے نیک لوگ ہلاک کر دیئے ہیں۔ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاۗءُ مِنَّا (اگر تو چاہتا تو ہلاک کر دیتا انہیں اس سے پہلے اور مجھے بھی۔ کیا تو

ہلاک کرتا ہے ہمیں بوجہ اس (غلطی) کے جو کی (چند) احمقوں نے ہم میں سے)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے انہیں ایک دن اور ایک رات مرا پڑا رہنے کے بعد یکے بعد دیگرے زندہ فرما دیا، ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ کیسے زندہ ہو رہے ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

"پھر ہم نے جلا اٹھایا تمہیں تمہارے مرجانے کے [1] بعد کہ کہیں تم شکر گزار ہو [2]"

[1] البعث، کسی چیز کو اپنی جگہ سے ابھارنا اور اٹھانا ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ فرمایا تا کہ وہ اپنی بقیہ عمریں اور رزق پورا کریں۔ اور اگر وہ اپنی عمریں پوری کر کے مرتے تو قیامت تک کبھی زندہ نہ ہوتے۔

[2] تا کہ تم دوبارہ زندہ کئے جانے کی نعمت پر شکر ادا کرو اور اس نعمت کا شکریہ ادا کرو جس کا تم نے انکار کیا ہے کیونکہ اب تم نے صاعقہ کے ذریعے اللہ کا عذاب دیکھ لیا ہے۔ (وہ نعمت ایمان تھی جس پر پہلے وہ تھے۔ پھر انہوں نے لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً کہہ کر اس نعمت کا انکار کیا تھا)۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

"اور ہم نے سایہ کر دیا تم پر بادل کا [1] اور اتارا تم پر من و سلویٰ [2] کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں [3] اور انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر زیادتی کرتے رہتے تھے۔ [4]"

[1] الغمام، غم سے مشتق ہے جس کا معنی ڈھانپنا ہے۔ سورج کی تمازت اور دھوپ سے جو چیز محفوظ کر لے اسے غمام کہتے ہیں۔ جب سورج کی تپش سے بچنے کے لئے کوئی چیز موجود نہ تھی تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک سفید باریک بادل بھیج دیا جو بارش کے بادل سے صاف تھا۔ جو بنی اسرائیل پر سایہ کئے رکھتا تھا۔ رات کو اگر چاند نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے ایک نور کا ستون بھیجتے جس سے وہ روشنی حاصل کرتے تھے۔

[2] ہم نے صحرائے تیہ میں تم پر ترنجبین نازل کی۔ بعض علماء نے مَنّ سے نرم روٹیاں مراد لی ہیں، لیکن اکثر علماء نے ترنجبین لکھا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ گوند کی مانند کوئی چیز تھی (1) جو درختوں پر گرتی تھی، اس کا ذائقہ شہد جیسا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے ہمیں تو اس ترنجبین کی مٹھاس نے مار دیا ہے، دعا فرمایئے اپنے رب سے کہ ہمیں گوشت کھلائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے سلویٰ نازل فرمایا۔ یہ ایک پرندہ ہے جو بٹیر یا بٹیر سے بڑا ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا اللہ تعالیٰ ایک بادل بھیجتا جو (آسمانی) پرندوں کی بارش برساتا ایک میل چوڑائی میں اور ایک نیزہ آسمان کی طرف لمبائی میں، وہ تہہ در تہہ جمع ہو جاتے۔ من و سلویٰ ہر روز صبح کے طلوع ہونے سے سورج کے طلوع ہونے تک اترتا رہتا، ہر شخص اپنے ایک دن اور ایک رات کی ضرورت جتنا لے لیتا جب جمعہ کا دن ہوتا تو دونوں کا لے لیتے کیونکہ ہفتہ کے دن من و سلویٰ نہیں اترتا تھا۔

[3] اور ہم نے حکم دیا کہ کھاؤ لذیذ اور حلال چیزوں میں سے۔ جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں، اس کو کل کے لئے ذخیرہ نہ کرو۔ منع کرنے

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 137 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

کے باوجود انہوں نے ذخیرہ کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے وہ نعمت سلب کر لی اور جو انہوں نے ذخیرہ کیا تھا اسے بھی خراب کر دیا۔ امام احمد اور شیخین نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر بنو اسرائیل نہ ہوتے تو کبھی کھانا خراب نہ ہوتا اور کبھی گوشت بدبودار نہ ہوتا اور اگر حواء نہ ہوتی تو کوئی عورت اپنے خاوند سے خیانت نہ کرتی۔(1)

ے۔ اس کلام میں اختصار ہے، اصل میں یوں ہے فَظَلَمُوْا بِكُفْرَانِ النِّعْمَةِ وَمَا ظَلَمُوْنَا یعنی انہوں نے نعمت کی ناشکری کر کے ظلم کیا اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا۔ لیکن انہوں نے میرے عذاب کو قبول کر کے اور اس رزق کا سلسلہ ختم کر کے جو دنیا میں بغیر کسی مشقت کے ملتا تھا اور جس کا آخرت میں بھی ان سے حساب نہیں لیا جانا تھا اپنے اوپر خود ظلم کیا تھا۔

وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰیٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۸﴾

"اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا داخل ہو جاؤ اس بستی ۱ میں پھر کھاؤ اس میں جہاں سے چاہو اور جتنا چاہو ۲ اور داخل ہونا دروازہ سے سر جھکائے ہوئے ۳ اور کہتے جانا بخش دے (ہمیں) ۴ ہم بخش دیں گے ۵ تمہاری خطائیں ۶ اور ہم زیادہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو بہت"

۱ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں یہ اریحا کی بستی تھی (2) یہ جابر لوگوں کا ایک قصبہ تھا اس میں قوم عاد کے بقیہ لوگ رہتے تھے۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ بیت المقدس ہے بعض نے فرمایا ایلیا اور بعض نے شام مراد لیا ہے۔

۲ رغداً پر نصب مصدر کی بناء پر ہے۔ یا کلوا کی واؤ ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ معنی یہ کہ تم پر وسعت و کشادگی کر دی گئی ہے۔ (جو چاہو جہاں سے چاہو جتنا چاہو کھا سکتے ہو)۔

۳ اس شہر کے سات دروازے تھے۔ پھر فرمایا ایک دروازے سے داخل ہو جاؤ، جھکتے ہوئے اور انکساری کرتے ہوئے۔ حضرت وہب نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ جب تم داخل ہو تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کرو۔

۴ ہم اپنے گناہوں کی معافی اور انہیں مٹا دیئے جانے کا سوال کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کا مطلب تھا لا الہ الا اللہ کہو۔ کیونکہ یہ گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔(3)

۵ یہ غفر سے ماخوذ ہے جس کا معنی ڈھانپنا ہے، نافع نے یُغْفَرْ یاء کے ضمہ اور فاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر نے تاء مضموم کے ساتھ پڑھا ہے۔ سورۂ اعراف میں نافع، ابن عامر اور یعقوب نے تاء مضموم کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے یہاں بھی اور سورۂ اعراف میں نون مفتوح اور فاء مکسور کے ساتھ پڑھا ہے۔

۶ خطایا ذبایح کے وزن پر اصل میں خطایء تھا۔ یاء زائدہ کو ہمزہ سے بدلا گیا، دو ہمزے جمع ہو گئے تو دوسرے ہمزہ کو یاء سے بدل دیا گیا۔ یہ تعلیل سیبویہ کے نزدیک ہے اور خلیل کے نزدیک پہلے ہمزہ کو "یاء" سے مقدم کیا گیا تو خطاءی بن گیا۔ دونوں تقدیروں میں یاء کو الف سے بدلا گیا اور ہمزہ جو دو الفوں کے درمیان ہے اسے یاء سے بدلا گیا۔

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 109 ایضاً
2۔ الجامع لاحکام القرآن، جلد 1 صفحہ 409 مطبوعہ دار الکتب المصریہ
3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 138 دار الکتب العلمیہ بیروت

ے احکام الٰہیہ کی پیروی کو مجرم کے لئے توبہ بنایا اور محسنین کے لئے ثواب کی زیادتی کا باعث بنایا۔ یہاں امر کے جواب میں آنے کی وجہ سے مزید کی بجائے نزد ہونا چاہئے تھا لیکن یہاں جواب کی صورت میں ذکر نہیں فرمایا یہ شعور دلانے کے لئے کہ محسن احکام الٰہیہ کی یقیناً پیروی کرنے والا ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴿۵۹﴾

"پس بدل ڈالا ان ظالموں نے اور بات سے جو کہا گیا تھا انہیں ۱؎ تو ہم نے اتارا ان ستم پیشہ لوگوں پر عذاب آسمان سے ۲؎ بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ ۳؎"

۱؎ اس آیت کریمہ کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تمام بنی اسرائیل نے تبدیلی نہیں کی تھی بلکہ بعض لوگوں نے توبہ واستغفار کے بدلے دنیا کا مال ومتاع طلب کیا تھا امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ بخاری کے طریق سے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل کو کہا گیا: اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ (دروازے سے داخل ہو جاؤ سر جھکاتے ہوئے اور کہتے جانا ہمیں بخش دے)۔ تو انہوں نے اس کو بدل دیا وہ دروازے میں داخل ہوئے تو اپنی سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور حطۃ کی جگہ حَبَّةٌ فِيْ شَعِيْرَةٍ (جو کا دانہ) کہتے ہوئے داخل ہوئے۔(1)

۲؎ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا دوبارہ ذکر فرمایا ان کے معاملہ کی قباحت میں مبالغہ کا اظہار کرنے کے لئے اور یہ شعور دلانے کے لئے کہ ان پر عذاب کا سبب ان کا اپنا ظلم تھا جو انہوں نے مامور بہ کو غیر مامور بہ کی جگہ رکھ کر اپنی جانوں پر کیا تھا۔ اور انہوں نے ایسا کام کیا تھا جو ہلاکت کا موجب تھا۔ میں (مفسر) کہتا ہوں شاید دوبارہ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا کا ذکر اس لئے ہو کہ یہ عذاب ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے جنہوں نے ظلم کیا ہے، دوسرے لوگوں پر یہ عذاب نہیں ہے۔

۳؎ ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ قرآن کریم میں رجز سے مراد عذاب ہے(2)۔ رجز اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جس سے نفرت کی جائے اور طبیعت اس کو ناپسند کرے، اسی طرح رجس ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر طاعون کی بیماری نازل فرمائی تھی۔ ایک ساعت میں ستر ہزار آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ ابن جریر نے ابن زید سے روایت کیا ہے کہ طاعون رجز ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلے ان لوگوں پر نازل فرمایا تھا جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتے تھے۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴿۶۰﴾

"اور یاد کرو جب پانی کی دعا مانگی موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے ۱؎ تو ہم نے فرمایا مارو اپنا عصا فلاں چٹان پر ۲؎ تو فوراً بہہ نکلے اس چٹان سے بارہ چشمے پہچان لیا ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ کھاؤ اور پیو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے ۳؎ اور نہ پھرو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 54، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر

2۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 242 مطبوعہ الکبریٰ الامیریہ مصر

زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے[4]"

[1] جب بنی اسرائیل تیہ کے صحراء میں پیاس محسوس کرنے لگے تو موسیٰ علیہ السلام سے پانی کا مطالبہ کیا۔

[2] یہ عصا جنت کے ایک درخت سے تھا اس کی لمبائی موسیٰ علیہ السلام کے قد کے مطابق دس ہاتھ تھی۔ اس کی دو شاخیں تھیں جو تاریکی میں چمکتی تھیں۔ یہ آدم علیہ السلام جنت سے لیکر آئے تھے۔ پھر وراثت در وراثت حضرت شعیب علیہ السلام تک پہنچا تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ الحجر پر الف لام عہدی ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں یہ پتھر مربع شکل میں انسانی سر کی مثل تھا جو آپ اپنے توبرے میں رکھتے تھے۔ حضرت عطا فرماتے ہیں اس پتھر کی چار اطراف تھیں اور ہر طرف سے تین چشمے نکلتے تھے اور ہر قبیلہ کے لئے ایک چشمہ متعین تھا۔ حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں یہ وہ پتھر تھا جس پر آپ نے کپڑے اتار کر رکھے تھے تاکہ غسل کرلیں، تو وہ پتھر کپڑے لیکر ان بنی اسرائیل کی طرف بھاگ گیا تھا جو آپ پر نامرد ہونے کی تہمت لگاتے تھے۔ جب پتھر رک گیا تو حضرت جبرئیل آئے اور کہا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے موسیٰ اس پتھر کو اٹھالے اس میں سے میری ایک قدرت اور تیرے لئے ایک معجزہ کا اظہار ہوگا۔ آپ نے وہ پتھر اٹھا کر اپنے توبرے میں رکھ لیا۔ پتھر کے بھاگنے کا ذکر صحیحین میں ہے مگر اس میں یہ نہیں کہ جب وہ پتھر رک گیا جبرئیل آگئے الیٰ آخرہ۔ عبد ابن حمید نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ وہ پتھر طور کا تھا جو وہ خود اٹھا کر لائے تھے(1)۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ پتھر مرمر کا تھا بعض نے فرمایا وہ الکدان سے تھا۔ اس میں بارہ گڑھے تھے اور ہر گڑھے سے ایک میٹھا چشمہ نکلتا تھا۔ جب بنی اسرائیل اپنی پیاس بجھا لیتے اور موسیٰ علیہ السلام اسے اٹھانے کا ارادہ فرماتے تو دوبارہ عصا مارتے اور اس کا پانی خشک ہو جاتا۔ ہر روز اس پتھر سے چھ لاکھ افراد پانی پیتے تھے۔ یا الحجر کا الف لام جنس کا ہے جیسا کہ وہب نے لکھا ہے کہ وہ معین پتھر نہ تھا بلکہ موسیٰ علیہ السلام جس پتھر پر عصا مارتے اسی سے چشمے ابلنے لگتے۔ حضرت عطاء فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پتھر پر بارہ ضربیں لگاتے اور ہر ضرب سے عورت کے پستان کی مثل جگہ ابھر آتی، پھر اس سے پانی نکلنا شروع ہو جاتا، پھر نہر کی شکل میں چلتا، پھر زیادہ ہو کر باہر بھی بہنے لگتا۔

[3] یہ محذوف کلام سے متعلق ہے، اصل میں عبارت یوں ہے فَاِنْ ضَرَبْتَ فَانْفَجَرَتْ یا فَضَرَبَ فَانْفَجَرَتْ۔" اکثر مفسرین فرماتے ہیں: انبجست اور انفجرت دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی پھوٹ پڑنا، نکلنا۔ ابو عمرو فرماتے ہیں انبجست کا معنی تھوڑا تھوڑا رسنا ہے اور انفجرت کا معنی بہنا ہے۔ ان کے قبیلوں کی تعداد کے مطابق بارہ چشمے جاری ہوئے۔ ہر قبیلہ نے اپنے پینے کی جگہ کو پہچان لیا۔ اور کوئی قبیلہ دوسرے کے گھاٹ میں داخل نہ ہوتا تھا۔ پھر ہم نے انہیں حکم دیا کھاؤ مَنّ و سلوٰی اور پیو پانی یہ تمام اللہ تعالیٰ کی بخشش اور عطاء ہے جو تمہیں بغیر محنت و مشقت سے میسر ہے۔

[4] العثی کا معنی فساد پھیلانے میں شدت اختیار کرنا ہے۔ مفسدین لا تعثوا کی ضمیر سے حال مؤکدہ ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں لا تعثوا کے بعد مفسدین کو حال کے طور پر اس لئے ذکر فرمایا کہ عثی اگرچہ ہمیشہ فساد پھیلانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر کبھی اس مفہوم کے لئے بھی آتا ہے جہاں فساد نہیں ہوتا۔ جس طرح کسی ظالم کا مقابلہ کرنا، یا کوئی ایسا کام جس میں ظاہراً فساد ہو مگر اس کے ضمن میں صلاح راجح ہو جیسے حضرت خضر علیہ السلام کا بچے کو قتل کرنا، کشتی کو توڑنا وغیرہ(2)۔ میں (مفسر) کہتا ہوں ممکن ہے کہ یہاں

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 140 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 18، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

غنی بمعنی تبذیر ہو جیسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور نبی کریم ﷺ سے عرض کی حضور قیصر و کسریٰ تو فضول خرچی کرتے ہیں مگر آپ ﷺ اس درویشانہ حیثیت میں رہتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: کِسْریٰ وَ قَیْصَرُ یَعْثِیَانِ فِیْمَا یَعْثِیَانِ وَاَنْتَ هٰکَذَا۔ اگر عثی کا معنی تبذیر ہو تو مفسدین پھر حال ہوگا (اور کوئی سوال بھی وارد نہ ہوگا)

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآىِٕهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

"اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم صبر نہیں کر سکتے ایک ہی طرح کے کھانے پر[1] سو آپ دعا کیجئے ہمارے لئے اپنے پروردگار سے[2] کہ نکالے ہمارے لئے[3] وہ جن کو زمین اگاتی ہے[4] (مثلاً) ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز[5] موسیٰ نے کہا کیا تم لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو عمدہ ہے (اچھا) جا رہو کسی شہر میں تمہیں مل جائے گا جو تم نے مانگا[6] اور مسلط کر دی گئی ان پر ذلت اور غربت[7] اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے۔ یہ (سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ انکار کرتے رہتے تھے اللہ کی آیتوں[8] کا اور قتل کرتے تھے انبیاء کو ناحق[9]۔ یہ (سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے بڑھ جایا کرتے تھے[10]"

[1] تیہ میں جو من و سلویٰ انہیں عطا کیا گیا تھا اس کے بارے انہوں نے کہا ہم ہمیشہ ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اس لئے اپنے پروردگار سے ہمارے لئے سوال کیجئے۔

[2] یخرج فعل مضارع اُدْعُ کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔

[3] یہاں مِنْ بعضیہ ہے۔ یہاں اگانے کی نسبت مجازاً زمین کی طرف کی گئی ہے۔ اثر قبول کرنے والی چیز کو فاعل کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

[4] وہ سبزیاں جو زمین اگاتی ہے۔

[5] حضرت ابن عباس فرماتے ہیں الفُوم سے مراد الخبز (یعنی روٹی) حضرت عطا فرماتے ہیں: اس سے مراد الحنطة (گندم) ہے۔ من بقلها سے و بصلها تک ظرف ہے جو حال واقع ہو رہی ہے یا حرف جر کے اعادہ کے ساتھ بدل ہے۔

[6] اللہ تعالیٰ نے یا موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرمایا کیا تم وہ چیز لینا چاہتے ہو جو گھٹیا اور خسیس ہے۔ الدنو کا اصل معنی مکان کے اعتبار سے قریب ہونا ہے مگر استعارةً خست کے لئے استعمال ہوتا ہے جس طرح بُعد، شرف و رفعت کے معنی میں استعارةً استعمال ہوتا ہے۔ یعنی من و سلویٰ جو بغیر کسی محنت کے تمہیں دنیا میں میسر ہے اور آخرت میں بھی تم سے اس کا حساب نہ ہوگا۔ اور تمہارے بدن کی نشوونما کے لئے بھی زیادہ نفع بخش ہے۔ اگر ضرور تم نے ساگ پات کھانے کا پروگرام طے کر لیا ہے تو تیہ سے نکلو اور کسی شہر میں جا

پہنچو۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں مصر سے مراد فرعون کا شہر ہے اور یہ منصرف ہے کیونکہ درمیان والا حرف ساکن ہے۔
ے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی وجہ سے ان پر ذلت و فقر مسلط کردیا گیا تھا۔ ان کو ذلت و غربت میں یوں گھیر آ گیا تھا جیسے کسی کے اردگرد خندق بنا دیا جائے، یا اس کا مطلب ہے کہ ذلت و غربت ان پر یوں چپکا دی گئی تھی جیسے مٹی دیوار پر لیپ دی جاتی ہے۔ الذلة: کا معنی رسوائی اور اہانت ہے۔ والمسکنة: کا معنی غربت و فقر ہے کیونکہ فقر انسان کو حرکت سے روک دیتا ہے اور اسے ساکن کر دیتا ہے۔ آپ یہود کا مشاہدہ کریں اگر چہ وہ دولت مند بھی ہوں پھر بھی ذلت کے لباس کی وجہ سے یوں دکھائی دیں گے جیسے فقیر و محتاج ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس فقر سے مراد دل کا فقر ہے اور مال کا لالچ ہے۔

۵ بَاؤُ ذَا یہ بوءٌ سے مشتق ہے جو شر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ کے غضب کے مستحق بن گئے کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات، یعنی انجیل، قرآن اور تورات کی وہ آیات جن میں محمد ﷺ کی صفات تھیں، ان کا انکار کرتے تھے۔ اور انبیاء کرام کو قتل کرتے تھے۔ حضرت نافع نے اَلنَّبِیْئِیْنَ، اَلنَّبِیْءُ، اَلْاَنْبِیَاءُ، اَلنُّبُوْءَةُ کو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قالون نے دو مکسور ہمزوں کے اصل قاعدہ کی بناء پر سورۂ احزاب میں لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ، اور بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ کو وصل کی صورت میں بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ جب یہ مہموز ہو تو اس کا معنی خبر دینے والا ہوتا ہے اور یہ اَنْبَاَ یُنْبِیُٔ اور نَبَاَ یَنْبَاُ سے مشتق ہوگا۔ باقی تمام قراء نے بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ اور ہمزہ کا ترک یا تو کثرتِ استعمال کی وجہ سے یا تخفیف کے لئے ہوگا۔ اس کا معنی بلند مرتبہ ہے اور یہ نبوۃ سے مشتق ہے جس کا معنی بلند جگہ ہے۔

۹ یعنی انبیاء کو قتل کرنے کے جواز کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے مگر خواہش نفس کی اتباع اور دنیا کے لالچ میں آ کر ایسا شنیع فعل کرتے تھے۔ میں نے یہ مفہوم اس لئے بیان کیا ہے کہ نبی کا قتل ہمیشہ ناحق ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ یہود نے ایک دن میں صبح سویرے ہی ستر انبیاء کرام کو قتل کر دیا تھا۔

۱۰ ذالک سے مراد کفر اور قتل ہے، مگر اسم اشارہ مفرد ہے کیونکہ مشارٌ الیہ مَا ذُکِرَ کی تاویل میں ہے، اور یہ ویسے بھی درست ہے کیونکہ مضمرات، مبہمات کا تثنیہ اور جمع نہیں ہوتا۔ اس لئے یہاں ذالک کا لفظ جمع کے معنی میں ہے۔ اسی لئے الذی بھی جمع الذین کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی گناہوں اور نافرمانیوں کی کثرت نے انہیں انبیاء کے قتل اور آیات کے کفر تک پہنچا دیا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ذالک کے تکرار کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح وہ کفر کے سبب غضب الٰہی کے سزاوار ہوئے تھے اسی طرح معاصی اور حدود اللہ سے تجاوز کے سبب بھی غضب الٰہی کے مستحق ہوئے تھے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝۶۲

"یقین کرو اسلام کے پیروکار ہوں ۱، یا یہودی ۲، عیسائی ۳، ہوں یا صابی ۴، جو کوئی بھی ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت ۵ پر اور نیک عمل کرے تو ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے ہاں اور نہیں کوئی اندیشہ ان کے لئے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۶"

۱ بیشک وہ لوگ جو محمد ﷺ پر اپنی زبانوں کے ساتھ ایمان لائے۔ یہ عام ہے خواہ وہ دلوں کے ساتھ ایمان لائے ہوں یا نہ لائے ہوں، اس میں منافقین بھی داخل ہیں۔

۲؎ جو یہودی ہیں۔ جب کوئی یہودیت میں داخل ہو جائے تو کہتے ہیں ھَادَ یَھُوْدُ یا یہ عربی لفظ ہے اور ھاد سے مشتق ہے جس کا معنی تاب ہے (یعنی توبہ کرنا، رجوع کرنا) ان کو یہودی اس لئے کہا جاتا تھا کہ انہوں نے بچھڑے کی عبادت سے توبہ کر لی تھی۔ یا اس لئے انہیں یہودی کہا جاتا کہ انہوں نے کہا تھا اِنَّا ھُدْنَآ اِلَیْکَ یا یہ عربی لفظ نہیں بلکہ عربی میں اسے داخل کیا گیا ہے۔ چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے کا نام یہود تھا اس لئے انہیں یہودی کہا جاتا ہے۔

۳؎ یہ نصران کی جمع ہے جیسے ندمان کی جمع ندامیٰ ہے اور نصرانی کے آخر میں یاء مبالغہ کے لئے ہے جیسے احمری کے آخر میں ہے۔ ان کو نصاریٰ اس لئے کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی مدد کی تھی یا اس لئے کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ ایسے شہر میں اترے تھے جسے ناصرہ یا نصران کہا جاتا تھا۔

۴؎ اہل مدینہ اسے بغیر ہمزہ کے اور باقی قراء ہمزہ کے ساتھ پڑھتے ہیں اس کا اصل معنی نکلنا ہے۔ جب کوئی شخص ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین میں چلا جائے تو صَبَأَ فُلَانٌ کہتے ہیں، صَبَأَ نَابُ الْبَعِیْرِ اونٹ کے دانت نکل آئے۔ یہ لوگ ہر دین کو چھوڑ گئے تھے۔ حضرت عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں یہ اہل کتاب کی ایک قوم ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ان کا ذبیحہ حلال ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ان کا نہ ذبیحہ حلال ہے، نہ ان سے نکاح حلال ہے (1)۔ الکلبی فرماتے ہیں: یہ یہود و نصاریٰ کے درمیان ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں یہ زبور پڑھتے تھے اور ملائکہ کی عبادت کرتے تھے اور کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور ہر دین سے کچھ نہ کچھ حصہ لیتے تھے۔ (2)

۵؎ جو ایمان لائے ان میں سے محمد ﷺ پر زبان اور دل سے ایمان لانے کے ساتھ اللہ اور قیامت کے دن پر بھی ایمان لائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد امت محمد ﷺ کے مخلص لوگ ہیں۔ بعض نے فرمایا گزشتہ امتوں کے مومن لوگ مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا بعثت سے پہلے والے مومن مراد ہیں جو دین حنیف کے متلاشی تھے۔ مثلاً حبیب النجار، قس بن ساعدہ، زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل، البراء الشنی، ابی ذر الغفاری، سلمان الفارسی، بحیرا الراہب اور وفد النجاشی۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے آپ ﷺ کا دور پایا اور آپ ﷺ کی اتباع کی ہے اور بعض لوگ آپ ﷺ کے اعلان نبوت سے پہلے ہی رحلت فرما گئے تھے۔ الخطیب نے لکھا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے اور وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو منسوخ ہونے سے پہلے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے دین پر تھے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے مَنْ اٰمَنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان میں سے حالت ایمان پر مر چکے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ مَنْ اٰمَنَ سے مراد وہ صوفیاء کرام ہوں جو تصفیہ قلب، تزکیہ نفس اور طہارت قالب کی وجہ سے کامل ایمان رکھتے ہیں۔ جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (3)۔ وہ شخص کامل ایمان نہیں رکھتا حتیٰ کہ میں اس کے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ اسے محبوب ہو جاؤں۔ اس حدیث پاک کو شیخین، احمد، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت انس سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اسی طرح دوسری حدیث ہے: لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ (4)۔ تم میں کوئی کامل ایماندار نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند کرے جو

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 145، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 146
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 7۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 49 (وزارت تعلیم) 4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 6 (وزارت تعلیم)

وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ اس حدیث پاک کو شیخین، احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے لَا یَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِیْقَةَ الْاِیْمَانِ حَتّٰی یَخْزُنَ مِنْ لِّسَانِہٖ۔ بندہ ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچتا جب تک وہ اپنے الفاظ پر غمگین نہ ہو۔ اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ بھی جائز ہے کہ واؤ مضمر ہو یعنی وَمَنْ آمَنَ بَعْدَکَ۔

۳؎ اللہ کے حکم کے مطابق عمل کیا تو ان کے لئے وہ اجر ہے جس کا ان کے رب نے وعدہ فرمایا ہے یعنی تمام مومنین کے لئے جنت اور مراتب، قرب، تسنیم، اور وہ چشمہ جس سے مقربین و کاملین پئیں گے۔ اور ان پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے جب کہ کفار عتاب سستی اور کاہلی کے مرتکب ہونے اور اپنی عمر کے ضیاع اور درجات کے فوت ہونے پر غمگین ہوں گے۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے مَنْ مبتدا ہے اور فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ خبر ہے۔ پھر پورا جملہ اِنَّ کی خبر ہے یا اِنَّ کے اسم سے بدل ہے اور فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ خبر ہے، خبر پر فاء اس لئے ہے کہ کیونکہ مسند الیہ کے ضمن میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔ سیبویہ اِنَّ کی خبر پر فاء لگانے سے منع کرتے ہیں مگر ان کے اس قول کا رد یہ آیت کریمہ ہے جس میں اِنَّ کی خبر پر فاء آئی ہوئی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

"اور یاد کرو جب ہم نے لیا تم سے پختہ وعدہ ۱؎ اور بلند کیا تم پر طور کو ۲؎ (اور حکم دیا) پکڑ لو جو ہم نے تم کو دیا مضبوطی سے اور یاد رکھنا وہ احکام جو اس میں درج ہیں شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ ۳؎"

۱؎ اور یاد کرو جب ہم نے تم سے موسیٰ علیہ السلام کی اتباع اور تورات پر عمل پیرا ہونے کا پختہ عہد لیا۔

۲؎ طور سریانی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات کو نازل فرمایا تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تورات قبول کرنے اور اس کے احکامات پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیا تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے ہی انکار کر دیا کیونکہ اس میں سخت احکام تھے اور وہ شریعت بڑی تنگی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو حکم دیا۔ جبرئیل نے ان کے لشکر کی مقدار پہاڑ کو اکھیڑا جو ایک فرسخ لمبا اور ایک فرسخ چوڑا تھا، پھر بنی اسرائیل کے سروں پر سائبان کی طرح آدمی کے قد کی مقدار اوپر رکھا۔ اور فرمایا تورات قبول کرو ورنہ میں اس پہاڑ کو تمہارے اوپر چھوڑ دوں گا (1)۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح نقل کیا ہے، حضرت عطاء حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سروں کے اوپر پہاڑ بلند کیا، سامنے کی طرف سے آگ کو بھیجا، ان کے پیچھے کی طرف سے نمکین سمندر بھیجا (2)۔

۳؎ ہم نے پھر حکم دیا کہ تورات کو مضبوطی سے پکڑ لو اور اس کے احکام کو یاد رکھو تا کہ تم معاصی سے بچو یا تم سے امید کی جائے کہ تم متقی بن جاؤ گے، یا یہ مفہوم ہے تا کہ تم دنیا میں ہلاکت سے اور آخرت میں عذاب سے بچ جاؤ۔ جب بنی اسرائیل نے دیکھا کہ اب کوئی مفر نہیں تو قبول کیا اور سجدہ میں گر گئے۔ اور سجدہ کی حالت میں پہاڑ کو بھی دیکھ رہے تھے۔ پس نصف پیشانی کا سجدہ یہود میں سنت بن گیا۔ وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 57 المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 57

نصف پیشانی پر سجدہ کرتے اور کہتے اسی سجدہ کی وجہ سے ہمارا عذاب دور ہوا تھا۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

"پھر منہ موڑ لیا تم نے پختہ وعدہ کرنے کے بعد تو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں میں لے"

لے یعنی اگر اللہ تعالیٰ تمہیں مہلت نہ دیتے اور عذاب میں تاخیر نہ فرماتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر محمد ﷺ جو رحمۃ للعالمین ہیں ان کو بھیج کر تم پر فضل نہ فرماتے تو تم خسارہ پانے والوں میں سے ہوتے۔ مگر حضور نبی رحمت ﷺ کے وجود مسعود سے کفار کو مہلت مل عذاب میں تاخیر کی گئی اور مسخ اور خسف کے عذاب سے بچ گئے۔ جس طرح کہ اگر اللہ کے احکام کو قبول نہ کرتے تو طور گرا کر انہیں ہلاک کیا جاتا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِى السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾

"اور تم خوب جانتے ہو انہیں جنہوں نے نافرمانی کی تھی تم میں سے سبت کے قانون کی تو ہم نے حکم دیا انہیں کہ بن جاؤ بندر پھٹکارے ہوئے لے"

لے قد سے پہلے لام قسم کا شعور دیتا ہے۔ السبت: اصل میں اس کا معنی کاٹنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسی دن اپنی مخلوق کی تخلیق کا سلسلہ ختم کیا تھا یا اس لئے کہ اسی دن یہودیوں کو دنیا کے تمام دھندے چھوڑ کر صرف اور صرف عبادت الٰہی میں مصروف ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ ان کا قصہ یوں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ تھا۔ بنی اسرائیل تقریباً ستر ہزار کی تعداد میں تھے اور سمندر کے ساحل پر ایلہ شہر میں رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن ان پر مچھلیوں کا شکار کرنا حرام قرار دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمائش میں یوں مبتلا کیا کہ جب ہفتہ کا دن ہوتا تو تمام مچھلیاں پانی سے اپنے خرطوم نکالے وہاں جمع ہو جاتیں اور اتنی کثرت سے ہوتیں کہ پانی بھی نظر نہ آتا تھا اور جب ہفتہ کا دن گزر جاتا تو کوئی مچھلی وہاں نہ ہوتی۔ تو انہوں نے شکار کا حیلہ سوچا۔ انہوں نے دریا کے اردگرد حوض کھودے اور چھوٹی چھوٹی نالیاں بنالیں جب ہفتہ کا دن آتا تو مچھلیاں پانی کی موجوں کے ساتھ ان حوضوں میں پہنچ جاتیں اور حوضوں کے گہرا ہونے کی وجہ سے نکل نہ سکتی تھیں۔ پس وہ اتوار کے دن انہیں پکڑ لیتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ جمعہ کے دن جال اور کانٹے لگا دیتے تھے پھر اتوار کے دن انہیں نکال لیتے تھے۔ شہر کے لوگ تین حصوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک وہ جو اس جرم سے خود بھی رکے ہوئے تھے اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے۔ دوسرے وہ جو خود تو اس جرم کا ارتکاب نہ کرتے تھے مگر دوسروں کو منع نہ کرتے تھے۔ تیسرے وہ جو اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی علی الاعلان نافرمانی کرتے تھے۔ منع کرنے والے بارہ ہزار تھے۔ جب مجرموں نے ان کی نصیحتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو حضرت داؤد علیہ السلام نے ان پر لعنت فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا غضب نازل فرمایا۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

"پس ہم نے بنادیا اس سزا کو عبرت لے ان کے لئے جو اس زمانہ میں موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے ۲ تھے اور

(اسے) نصیحت بنا دیا پرہیزگاروں کے لئے ۳ ؎ "

۱؎ ہم نے اس سزا کو عبرت بنایا جو عبرت حاصل کرنے والے کو اس جرم سے روکتی ہے۔ اسی سے النکل ہے جس کا معنی ہے، بیڑی۔
۲؎ جو لوگ اس زمانہ میں تھے اور جو ان کے بعد آنے والے تھے۔ ما بمعنی من ہے یا اس کا معنی یہ ہوگا کہ ان کے پہلے اور پچھلے گناہوں کی وجہ سے یہ سزا دی گئی ہے، بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، اصل عبارت اس طرح ہے: فَجَعَلْنَا هَا وَمَا خَلْفَهَا یعنی ہم نے آخرت میں ان کے لئے عذاب تیار کر رکھا ہے ان گناہوں کی وجہ سے جو انہوں نے پہلے کئے ہیں۔
۳؎ اور امت محمد ﷺ میں سے جو مومنین ہیں ان کے لئے یہ واقعہ نصیحت ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً ۖ قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٦٧﴾

" اور یاد کرو جب کہا موسیٰ (علیہ السلام نے) اپنی قوم سے کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے تمہیں کہ تم ذبح کرو ایک گائے ۱؎ وہ بولے کیا آپ ہمارا مذاق اڑاتے ۲؎ ہیں آپ نے کہا میں پناہ مانگتا ہوں خدا سے کہ میں شامل ہو جاؤں جاہلوں (کے گروہ) میں ۳؎ "

۱؎ اس قصہ کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا سے ہے، مگر اس کلام کو اس پر مقدم فرمایا تا کہ ان کے دوسرے جرموں پر دلالت کرے۔ جو ایک مستقل نوع ہیں۔ مثلاً احکام الٰہی سے استہزاء کرنا، سوالات کی کثرت، احکام کی نافرمانی وغیرہ۔ اس کا مکمل قصہ اس طرح ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک مالدار شخص تھا جس کا نام عامیل تھا اور اس کا ایک چچازاد بھائی تھا جو فقیر تھا اور وہی اس کا وارث تھا۔ جب اس شخص کی عمر لمبی ہوگئی تو اس کے چچازاد بھائی نے اسے قتل کر دیا تا کہ وراثت حاصل کرے۔ قتل کرنے کے بعد اسے اٹھا کر دوسرے شہر کے قریب پھینک دیا۔ پھر صبح اس کا بدلہ طلب کرنے لگا اور چند لوگوں پر اس نے قتل کا دعویٰ کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پوچھا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ اس صورت حال میں موسیٰ علیہ السلام کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا، دعا کرو کہ معاملہ واضح ہو جائے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ بقرۃ بقر سے مشتق ہے جس کا معنی الشق (پھاڑنا) ہے چونکہ گائے زمین کو پھاڑتی ہے کاشتکاری کے لئے اس لئے اسے بقرۃ کہتے ہیں۔
۲؎ موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ انہیں پیغام پہنچایا اسے حقیقت سے بہت دور اور اسے درخور اعتناء نہ سمجھتے ہوئے کہنے لگے کیا تم ہمارے ساتھ مذاق کرتے ہو۔ ھزواً مصدر ہے جو مَهْزُوًّا بِنَا کے معنی میں ہے یا مبالغہ کے لئے مصدر ذکر فرمایا ہے، یا مضاف محذوف ہے اصل میں اَهْلَ هُزُوٍ تھا۔
قرأت: حضرت حفص نے ھزواً اور کفواً کو زاء اور فاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مگر ہمزہ نہیں پڑھا اور حضرت حمزہ نے زاء اور فاء کے سکون ساتھ پڑھا ہے اور ہمزہ کے ساتھ وصلاً پڑھا ہے اور جب وقف کرتے ہیں تو ہمزہ کو واؤ سے بدل دیتے ہیں۔ باقی قراء نے ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔
۳؎ موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں سے ہو جاؤں۔ استہزاء کرنا ایسے سنجیدہ موقع پر جاہلوں کی

عادت ہے۔ اگرچہ یہاں جواب سوال کے موافق نہیں لگتا مگر آپ نے ایسی کلام فرمائی کہ آپ نے اپنے اوپر لگائی گئی تہمت کو بھی دور فرما دیا اور ساتھ ہی اس کی دلیل بھی بیان فرما دی۔ استعاذہ (پناہ مانگنا) کی صورت میں کلام ذکر فرمائی۔ اس سے فعل کو بہت قبیح ظاہر کرنا مقصود ہے۔ جب بنی اسرائیل کے لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ گائے ذبح کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور حصول مقصد کے لئے گائے کا ذبح کرنا ان کے نزدیک بڑا مستبعد امر تھا اور وہ یہ گمان کرتے تھے کہ ایسی گائے تو بڑی عظیم الشان ہو گی اس لئے انہوں نے اس گائے کے اوصاف طلب کرنے شروع کر دیئے...... یہ بار بار سوال ان کی حماقت کی وجہ سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اگر وہ کوئی گائے ذبح کر دیتے تو ان کا مقصود حاصل ہو جاتا مگر انہوں نے اپنے اوپر خود سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی فرما دی(1)۔ اس حدیث کو سعید بن منصور نے حضرت عکرمہ سے مرسلاً اور ابن جریر نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے موقوفاً روایت کیا ہے۔

اس گائے کے ذبح کرنے میں بھی ایک حکمت تھی۔ واقعہ اس طرح ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک نیک شخص تھا جس کا صرف ایک ہی لڑکا تھا اور ایک اس کی گائے کی بچھڑی تھی۔ وہ اسے ایک جنگل میں لے آیا اور کہا اے اللہ میں یہ گائے کی بچھڑی تیرے پاس اپنے بیٹے کے لئے ودیعت رکھتا ہوں حتیٰ کہ یہ بڑا ہو جائے۔ وہ شخص مر گیا اور وہ بچھڑی جنگل میں جوان ہو گئی۔ جب بھی وہ کسی شخص کو دیکھتی تو بھاگ جاتی۔ جب بچہ بڑا ہوا۔ تو وہ اپنی والدہ کا بہت اطاعت گزار تھا۔ اس نے رات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا ایک حصہ میں نوافل پڑھتا، ایک حصہ سوتا اور ایک حصہ اپنی والدہ کے سرہانے بیٹھتا۔ جب صبح ہوتی تو لکڑیاں کاٹنے چلا جاتا اپنی پیٹھ پر لکڑیاں اٹھا کر بازار میں فروخت کرتا پھر کل رقم کا ایک حصہ کھاتا، ایک حصہ صدقہ کرتا اور ایک حصہ اپنی والدہ کو پیش کرتا۔ ایک دن اسے ماں نے بتایا کہ تیرے باپ نے تیرے لئے فلاں جنگل میں ایک گائے اللہ تعالیٰ کے سپرد کی تھی۔ وہاں جا کر حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہم السلام کے خدا کو پکار وہ گائے تمہیں واپس کر دے گا اور اس کی علامت یہ ہے کہ جب تو اسے دیکھے گا تو یوں محسوس ہو گا کہ اس کی جلد سے سورج کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔ اس گائے کی خوبصورتی اور سنہری رنگ کی وجہ سے اسے "مُذہبہ" کہا جاتا تھا۔ وہ نوجوان جنگل میں آیا، اس نے دیکھا کہ گائے چر رہی ہے۔ اس نے آواز دی اور کہا میں حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے خدا کے ذریعے تیرا طلب گار ہوں، تو وہ گائے دوڑ کر آئی اور اس نوجوان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کی گردن سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔ وہ گائے اللہ تعالیٰ کے اذن سے کلام کرنے لگی۔ کہا اے اپنی والدہ کے اطاعت شعار بیٹے تو مجھ پر سوار ہو جا۔ تیرے لئے آسانی ہو گی۔ نوجوان نے کہا میری ماں نے مجھے سوار ہونے کا حکم نہیں دیا ہے، اس نے مجھے گردن سے پکڑنے کا حکم دیا تھا۔ گائے نے کہا اگر تو مجھ پر سوار ہو جاتا تو کبھی مجھ پر قادر نہ ہوتا۔ تو چل اگر تو پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھڑنے اور ساتھ چلنے کو کہے تو وہ ایسا کرے گا۔ یہ عظمت تجھے اپنی ماں کی اطاعت کی وجہ سے ملی ہے، نوجوان اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا ماں نے اسے کہا بیٹا تو ایک فقیر آدمی ہے تیرے پاس کوئی مال نہیں ہے۔ دن کے وقت لکڑیاں بیچنا اور رات کے وقت قیام کرنا تیرے لئے بہت دشوار ہے۔ اس لئے تو اس گائے کو منڈی میں بیچ دے نوجوان نے کہا کتنے میں بیچوں۔ ماں نے کہا تین دینار میں مگر میرے مشورہ کے بغیر نہ بیچنا۔ اس وقت اس گائے کی قیمت تین دینار تھی۔ نوجوان گائے کو لیکر بازار میں پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ انسانی شکل میں اس کے پاس بھیجا تا کہ اس کا اپنی ماں سے اطاعت شعاری کے جذبہ کو آزمایا جائے جبکہ وہ مالک الملک سب کچھ جانتا ہے۔ اس فرشتہ نے کہا کتنے میں بیچو گے نوجوان نے کہا تین دینار میں مگر اپنی والدہ کی رضا پہلے معلوم کروں گا۔ فرشتہ نے کہا یہ چھ دینار لے لو مگر

1۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 268-269 مطبوعہ الکبری الامیریہ مصر

والدہ سے مشورہ نہ کرو، نوجوان نے کہا اگر تم مجھے اس گائے کے وزن کے برابر بھی سونا دو تو پھر بھی میں اپنی ماں کی رضا کے بغیر نہیں بیچوں گا۔ وہ ماں کے پاس گیا اور اسے اس سودے کی خبر دی۔ ماں نے کہا جاؤ اور چھ دینار میں بیچو مگر میری رضا کی شرط کے ساتھ۔ نوجوان پھر منڈی میں آیا، وہ فرشتہ بھی آ گیا فرشتہ نے کہا ماں سے مشورہ کر لیا ہے، نوجوان نے کہا ماں نے مجھے چھ دینار میں فروخت کرنے کا حکم دیا ہے مگر اس کی رضا اور مشورہ پھر ضروری ہے، فرشتہ نے کہا میں تجھے بارہ دینار دیتا ہوں مگر ماں سے مشورہ کی شرط کے بغیر، نوجوان نے انکار کر دیا۔ وہ پھر اپنی ماں کی طرف گیا اور اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ ماں نے کہا بیٹا وہ فرشتہ ہے جو انسانی شکل میں تیرے پاس آتا ہے تاکہ تیرا امتحان لے۔ اب جب تیرے پاس وہ فرشتہ آئے تو اس سے پوچھنا کہ میں گائے فروخت کروں یا نہ کروں۔ فرشتہ آیا تو اس نے پوچھا۔ فرشتہ نے کہا اپنی ماں کو کہہ کہ یہ گائے اپنے پاس رکھے، موسیٰ بن عمران تم سے یہ گائے ایک مقتول کے لئے خریدے گا جو بنی اسرائیل میں قتل ہوگا اور اسے فروخت نہ کرنا مگر اس کے بدلے اس کی کھال بھر کر سونا لینا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اس گائے کے ذبح کرنے کو مقدر فرما دیا۔ بنی اسرائیل اس کا وصف پوچھتے رہے حتیٰ کہ یہی گائے متعین ہو گئی۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اس نوجوان کو اپنی ماں کی اطاعت شعاری اور حسن سلوک کی وجہ سے بدلہ عطا فرمایا۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۖ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾

"بولے دعا کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے کہ وہ بتائے ہمیں کہ کیسی ہے[1] وہ گائے موسیٰ نے کہا اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے ہے جو نہ بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچی ہو (بلکہ) درمیانی عمر کی ہو تو بجا لاؤ جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے[2]"

[1] یعنی اس کی حالت کیا ہے۔ حق تو یہ تھا کہ اَیُّ بَقَرَۃٍ ہوتا یا کَیْفَ ھِیَ ہوتا۔ کیونکہ ما کے ساتھ سوال غالباً جنس کے متعلق ہوتا ہے۔ جب انہوں نے کسی فرد گائے کے ذبح کرنے سے قتل کے ظہور کو مستبعد سمجھا اور یہ گمان کیا کہ وہ گائے دوسری گائیوں سے انتہائی جدا ہوگی گویا کہ وہ کوئی دوسری جنس ہے، تو انہوں نے اسے ایسی چیز تصور کیا جس کی حقیقت کو وہ نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے ما کے ساتھ سوال کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ضمیر کا گائے کی طرف لوٹنا یہ دلیل ہے کہ وہ گائے متعین تھی اور خطاب کے وقت سے بیان کا مؤخر ہونا بھی لازم آتا ہے۔ میں کہوں گا خطاب کے وقت سے بیان کی تاخیر جائز ہے مگر حاجت کے وقت بیان کی تاخیر جائز نہیں ہے ضمیر کا لوٹنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ابتداء سے ہی گائے متعین تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ مطلق، اطلاق پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں تقیید کی کوئی دلیل نہیں ہے، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر بنی اسرائیل کوئی گائے ذبح کرتے تو جائز ہو جاتی یعنی مقصود حاصل ہو جاتا۔ لیکن مامور مطلق اطلاق پر جاری ہونے کے بعد تقیید کے جواز پر دلالت کرتا ہے اور تقیید نسخ کے حکم میں ہوتی ہے اگر تقیید اطلاق سے مؤخر ہو۔ جیسا کہ ہمارے مسئلہ میں ہے، اور نسخ مامور بہ کے ادا کرنے سے پہلے بھی جائز ہے۔ جیسا کہ اسراء کی رات پچاس نمازیں واجب ہوئیں (پھر پانچ نمازیں ہو گئیں) اگر تقیید اطلاق سے مؤخر نہ ہو تو تخصیص ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے کفارہ یمین کے متعلق فرمایا فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ (جمہور کی قرأت کے مطابق) اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت کے مطابق ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ مُتَتَابِعَاتٍ ہے۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جائے گا جب وہ علیحدہ علیحدہ واقعات میں وارد ہوں جیسے اللہ تعالیٰ کا کفارہ ظہار کے متعلق ارشاد ہے۔ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ اور کفارہ قتل کے متعلق فرمایا رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ۔ اسی طرح جب دونوں ایک واقعہ میں ہوں اور اطلاق اور

تقیید ایک سبب میں ہوں جیسے اَدُّوْا عَنْ کُلِّ حُرٍّ وَّ عَبْدٍ کہ ہر آزاد اور غلام کے بدلے صدقۂ فطر ادا کرو۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا اَدُّوْا عَنْ کُلِّ حُرٍّ وَّ عَبْدٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ ہر آزاد اور غلام مسلمان کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرو۔ پس ہمارے نزدیک دونوں حدیثوں کی وجہ سے مسلم غلام کی طرف سے صدقۂ فطر واجب ہے۔ جبکہ کافر غلام کا صدقہ صرف پہلی حدیث کی وجہ سے واجب ہے، لیکن اگر دونوں (اطلاق اور تقیید) ایک حکم میں اور ایک واقعہ میں ہوں تو ضرور مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا کیونکہ اس کے علاوہ جمع کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اور مطلق تقیید کا احتمال رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے کفارۂ یمین میں روزہ میں تتابع کے وجوب کا قول کیا ہے۔ ابن جریر حضرت ابوہریرہ سے روایت فرماتے ہیں کہ جب آیت کریمہ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ نازل ہوئی تو عکاشہ بن محصن نے عرض کی حضور ﷺ! کیا ہر سال حج فرض ہے تو آپ ﷺ نے اس کے سوال سے اعراض فرمایا۔ حتیٰ کہ حضرت عکاشہ نے تین مرتبہ یہی سوال دہرایا تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ پھر فرمایا اگر میں "ہاں" کہہ دیتا تو ہر سال حج واجب ہو جاتا اور اگر ہر سال واجب ہوتا تو تم اس کی طاقت نہ رکھتے۔ یہ حدیث طیبہ دلیل ہے کہ مطلق، تقیید پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ اتنی عمر رسیدہ کہ بچہ جننے کے قابل نہ رہی ہو۔ عرب کہتے ہیں فَرَضَتِ الْبَقَرَةُ فُرُوْضًا۔ یہ فرض سے مشتق ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ گویا کہ گائے نے اپنی عمر کاٹ لی۔

۳۔ اتنی چھوٹی جو بچہ جننے کے قابل نہ ہو۔ البکر کی ترکیب اولیت کے لئے استعمال ہوتی ہے، اسی سے الباکورة (اگتی جوانی) ہے۔ یہ الفاظ مؤنث کے ساتھ خاص ہیں اس لئے آخر میں ۃ کو حذف کر دیا گیا ہے جیسے حائض مؤنث کے لئے ہی استعمال ہوتا ہے۔

۴۔ درمیانی عمر کی ہو۔ حضرت اخفش فرماتے ہیں: وہ مؤنث جس نے کئی بچے جنے ہوں۔ عرب کہتے ہیں عونت المرأة۔ جب وہ تیس سال سے زائد عمر کو پہنچ جائے۔ ذالک کا مشار الیہ مَا ذُکِرَ ہے۔ یہ تاویل اس لئے کی گئی ہے کہ بین تثنیہ یا جمع کی طرف مضاف ہوتا ہے (مفرد کی طرف مضاف نہیں ہوتا، اس لئے یہاں ذالک کا مشار الیہ مفرد نہیں بلکہ تثنیہ ہوگا)۔

۵۔ یہاں ما موصولہ ہے اور تؤمرون بمعنی تؤمرون بہ ہے، یا ما مصدریہ ہے اور اَمْرُکُمْ کے معنی میں ہے، اور امرکم بمعنی مَاْمُوْرُکُمْ ہے، یعنی مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ اس آیت کریمہ میں امتثال اور پیروی پر برانگیختہ کرنا اور بار بار سوال کرنے پر زجر و توبیخ کرنا مقصود ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾

"کہنے لگے دعا کرو ہمارے لئے اپنے رب سے کہ بتائے ہمیں کیسا رنگ ہو اس کا موسیٰ نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ایسی گائے جس کی رنگت خوب گہری زرد ہو جو فرحت بخشے دیکھنے والوں کو۔"

۱۔ فاقع تاکید ہے صفرۃ کی اور لونھا فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی گہرا زرد رنگ ہے۔ حضرت الحسن نے فرمایا الصفراء کا معنی سیاہ ہے لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ فقوع خالص صفرۃ کو کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے صفراء کی صفت فاقع سے لگائی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے اَصْفَرُ فَاقِعٌ جیسے کہا جاتا ہے اَسْوَدُ حَالِكٌ: بالکل سیاہ، اَحْمَرُ قَانِئٌ: خالص سرخ، اَخْضَرُ نَاضِرٌ: خالص سبز، اَبْيَضُ يَقَقٌ: خالص سفید۔ یہ مبالغہ پیدا کرنے کے لئے صفات لگائی جاتی ہیں۔ السرور

اس خوشی کو کہتے ہیں جو دل میں کسی نفع کے حصول یا کسی نفع کی توقع کے وقت ہوتی ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ۙ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا ۖ وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾

" کہنے لگے پوچھو ہمارے لئے اپنے رب سے کہ کھول کر بیان کرے ہمارے لئے کہ گائے کیسی ہو بے شک گائے مشتبہ ہو گئی ہے ہم پر ۱؎ اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور اس کو تلاش کر لیں گے ۲؎ "

۱؎ پہلے سوال کو دوہرایا گیا ہے اور مزید صورت حال منکشف کرنے کے لئے عرض کی گئی ہے تاکہ وہ عذر پیش نہ کر سکیں۔ جو گائے کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، یہ تو بہت گائیوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہم پر معاملہ مشتبہ ہو گیا ہے۔ یہاں تشابہت نہیں فرمایا مذکر کا صیغہ تشابہ فرمایا ہے کیونکہ لفظ البقر مذکر ہے۔

۲؎ ہمارے اصحاب اہل سنت و جماعت نے اسی آیت سے حجت پکڑی ہے کہ تمام حادثات اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہوتے ہیں اور معتزلہ اور کرامیہ نے اللہ کے ارادہ کے حادث ہونے پر اسی آیت سے دلیل پکڑی ہے۔ ان کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تعلیق تعلق کے اعتبار سے حادث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو قیامت تک گائے واضح نہ ہوتی۔ اس حدیث کو امام بغوی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے(1) اور ابن جریر نے معضل روایت کی ہے۔

قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾

" موسیٰ بولے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ گائے جس سے خدمت نہ لی گئی ہو کہ ہل چلائے زمین میں اور نہ پانی دے کھیتی کو بے عیب بے داغ ۱؎ (عاجز ہو کر) کہنے لگے اب آپ لائے ٹھیک پتہ پھر انہوں نے ذبح کیا اسے اور ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے ۲؎ "

۱؎ یہاں لا زائدہ ہے اور دونوں فعل (تثیر اور تسقی) ذلول کی صفت ہیں یعنی لا ذَلُوْلٌ مُثِيْرَةٌ وَّ سَاقِيَةٌ، مُسَلَّمَةٌ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے عیوب سے پاک پیدا فرمایا ہو۔ یا اس کے مالکوں نے اسے کام سے محفوظ رکھا ہو۔ لَا شِيَةَ فِيْهَا۔ یعنی کوئی رنگ اس کی جلد کے مخالف نہ ہو۔ شیۃ، عدۃ کے وزن پر مصدر ہے وَشِيٌ يَشِيُ کا۔ جب ایک رنگ دوسرے رنگ سے خلط ملط ہو جائے تو عرب یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ الجزری فرماتے ہیں الوشی کا معنی النقش ہے۔

۲؎ کہنے لگے اب آپ گائے کا حقیقی وصف اور مکمل بیان لائے ہیں۔ ان اوصاف سے متصف صرف اسی نوجوان کی گائے تھی۔ انہوں نے اس کی کھال بھر کر سونا دینے کے ساتھ اسے خرید لیا۔ اس کلام میں اختصار ہے، اصل یوں ہے فَحَصَلُوْا الْبَقَرَةَ فَذَبَحُوْهَا۔ انہوں نے گائے حاصل کی پھر اسے ذبح کیا۔ لیکن وہ ذبح کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ بار بار سوال کرتے تھے، یا اس لئے کہ ان کا آپس میں اختلاف تھا۔ یا انہیں قاتل کے ظہور سے رسوائی کا خدشہ تھا یا ایسی صفات سے متصف گائے انہیں ملتی نہیں تھی یا اس کی قیمت بہت زیادہ تھی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 61، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾

"اور یاد کرو جب قتل کر ڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر تم ایک دوسرے پر قتل کا الزام لگانے لگے [1] اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا جو تم چھپا رہے تھے [2]"

[1] اس قصہ کی ابتداء یہاں سے ہے۔ فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا اصل میں تَدَارَءْتُمْ تھا۔ ایک دوسرے سے دفاع کرنا اور اپنے اوپر سے الزام کو دور کرنا۔ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ اللہ تعالیٰ ظاہر فرمانے والا ہے۔ مخرج کو عمل کرایا گیا ہے کیونکہ یہ مستقبل کی حکایت کر رہا ہے جیسے بَاسِطٌ ذِرَاعَیْهِ عمل کر رہا کیونکہ حالت ماضیہ کی حکایت کر رہا ہے۔

[2] کیونکہ قاتل قتل کو چھپا تا تھا اس لئے فرمایا اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر فرمانے والا ہے۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰی ۙ وَ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

"تو ہم نے فرمایا کہ مارو اس مقتول کو گائے کے کسی ٹکڑے [1] سے (دیکھا) یوں زندہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ مردوں کو اور دکھاتا [2] ہے تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں شاید تم سمجھ جاؤ [3]"

[1] اِذْ اَدّٰرَءْتُمْ پر اس کا عطف ہے اور درمیان میں کلام جملہ معترضہ ہے۔ نفس کو شخص کی تاویل میں کر کے مذکر ضمیر لوٹائی گئی ہے۔ ببعضها میں ها کا مرجع گائے ہے۔ یعنی اس کا کوئی حصہ اس مقتول کو مارو۔ اس کلام میں اختصار ہے۔ اصل میں کلام اس طرح ہے فَضُرِبَ فَحَیِیَ:۔ مقتول کو گائے کا ٹکڑا مارا گیا تو وہ زندہ ہو گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اسے وہ ہڈی ماری گئی جو پٹھے سے ملی ہوتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ریڑھ کی ہڈی ماری گئی۔ بعض نے فرمایا زبان ماری گئی۔ بعض نے فرمایا دائیں ران ماری گئی۔ پس وہ ٹکڑا لگتے ہی مقتول اللہ تعالیٰ کے اذن سے زندہ ہو گیا۔ درآں حالیکہ اس کی رگوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے بتا دیا کہ مجھے فلاں شخص نے قتل کیا ہے، پھر وہ فوراً مردہ ہو کر گر گیا۔ پس اس وقت سے قاتل کے لئے میراث حرام کر دی گئی۔ حدیث شریف میں ہے صاحب البقرۃ کے بعد کوئی قاتل وارث نہیں ہوا۔

[2] اس مقتول کے زندہ کرنے کی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرتا ہے، یہ خطاب ان لوگوں کو ہے جو مقتول کے زندہ ہونے کے وقت موجود تھے یا جو لوگ آیت کے نزول کے وقت موجود تھے۔ پہلا قول ظاہر ہے۔ آگے ارشاد ہے:۔

[3] وہ تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے شاید تم سمجھ جاؤ۔ اے بنی اسرائیل کے نادانو! ایک نفس کے زندہ کرنے پر قدرت رکھنے والا تمام نفوس کے زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابتداءً میت کو زندہ نہیں فرمایا (حالانکہ وہ اس پر بھی قادر تھا) اور اس کے زندہ کرنے کے لئے شرائط مقرر فرمائیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام اشیاء کو اسباب ظاہرہ کے ساتھ متعلق فرمایا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ اس سے پتہ چل رہا ہے کہ تقرب کا طریقہ اور واجب کی ادائیگی کا ثمرہ کیا ہے، اس طریقہ سے یتیم کو نفع بھی پہنچا ہے، یہ بھی ایک حکمت مضمر ہے کہ طالب طریقت کو چاہئے کہ وہ مقصود تک پہنچنے کے لئے قربانی پیش کرے اور متقرب کو چاہئے کہ بہتر، مہنگی اور قیمتی قربانی پیش کرے۔ حضرت ابوداؤد نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک اونٹنی قربانی دی تھی جو انہوں نے تین سو دینار میں خریدی تھی۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝

"پھر سخت ہو گئے تمہارے دل [1] یہ منظر دیکھنے کے بعد بھی وہ تو پتھر کی طرح (سخت) ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت [2]

(کیونکہ) کئی پتھر ایسے بھی ہیں جن سے بہہ نکلتی ہیں نہریں اور کئی ایسے بھی ہیں کہ جو پھٹتے ہیں تو ان سے پانی نکلنے لگتا ہے

اور کئی ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں خوف الٰہی سے [3] اور اللہ بے خبر نہیں ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو [4]"

[1] قساوۃ:۔ ایسی موٹائی جس میں سختی بھی ہو۔ یہاں مراد دلوں سے رحمت، نرمی اور بھلائی کا نکلنا ہے، سخت دل پر لمبی امیدیں، یاد الٰہی سے محرومی اور خواہشات نفسانی کی اتباع مرتب ہوتی ہے۔ ثم کا کلمہ نرمی اور رقت کے اسباب کے بعد قساوت کی انتہا پر دلالت کرتا ہے۔

[2] مقتول کے زندہ کرنے یا تمام آیات اور قدرت کی نشانیاں دیکھنے کے بعد (ان کے دل سخت ہو گئے)۔ الکلبی فرماتے ہیں اس کے بعد بھی (یعنی مقتول کے خود بتانے کے بعد بھی) انہوں نے کہا ہم نے قتل نہیں کیا۔ ان کی قساوتِ قلبی پتھر کی مانند ہے بلکہ از روئے سختی پتھر سے بھی زیادہ ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ وہ قساوت پتھروں کی مثل ہے بلکہ اس چیز کی مثل ہیں جو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے۔ یہاں مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے اَشَدُّ قَسْوَةً میں اَقْسٰی کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے، او تشبیہ میں تخییر کے لئے ہے یا تردید کے لئے ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو ان کی حالت کو جانتا ہے وہ چاہے تو انہیں پتھروں سے تشبیہ دے یا اس سے بھی زیادہ سخت چیز سے تشبیہ دے۔ ضمیر منفصل ذکر نہیں کی کیونکہ کوئی التباس نہیں ہے، حجارۃ (پتھر) کا ذکر کیا لوہے یا تانبے کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ لوہا آگ سے نرم ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پتھروں میں جو وجہ خیر ہے اس کو بیان کیا جبکہ ان کے دل ایسی خیر سے خالی تھے۔

[3] یہاں الانہار سے مراد عیون (چشمے) ہیں، ان چشموں سے اللہ کے بندے نفع اٹھاتے ہیں جبکہ کفار کے دلوں میں اللہ کے بندوں کے لئے کوئی منفعت نہیں ہے۔ خوف الٰہی کی وجہ سے کچھ پتھر پہاڑ کی بلندی سے گر پڑتے ہیں۔ جبکہ تمہارے دل نہ نرم ہوتے ہیں نہ جھکتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پتھر تو جماد ہیں، ان میں خشیت کیسے متصور ہو سکتی ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں مجازاً اوامر تکوینیہ کی پیروی کرنا مراد ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ جواب درست نہیں ہے۔ اوامر تکوینیہ کا انقیاد اور پیروی تو کفار کے دلوں میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ انہوں نے ختم کی پیروی کی ہے، اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے: وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا (اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں رہتے ہیں اور جو زمین میں رہتے ہیں خوشی سے اور مجبور ہو کر)۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام اولاد آدم کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں میں ایک دل کی مانند ہیں، وہ جیسے چاہتا ہے انہیں پھیرتا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ، اے دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر پھیر دے، (مسلم)(1)۔ تحقیق وہ ہے جو امام بغوی نے لکھا ہے۔ اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 335 قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی

ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جمادات اور تمام حیوانات کا علم ہے، جن وانس کو ان کا علم نہیں ہے۔ تمام جمادات وحیوانات کے لئے دعا، تسبیح اور خشیت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ (اس کائنات میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں مگر وہ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اس کی حمد کرتے ہوئے)، وَالطَّیۡرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ کُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسۡبِیۡحَهٗ (اور پرندے پر پھیلائے ہوئے، ہر ایک جانتا ہے اپنی (مخصوص) دعا اور تسبیح کو)(1)۔ پہلے اس کے متعلق عذاب قبر کے ذکر میں "ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ" کے تحت کلام گزر چکی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ثبیر پہاڑ پر تھے اور کفار آپ ﷺ کو تلاش کر رہے تھے۔ پہاڑ نے آپ ﷺ سے عرض کی حضور ﷺ! مجھ سے اتر جائیں مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں آپ ﷺ میرے اوپر سے پکڑے گئے تو مجھے اللہ تعالیٰ سزا دیں گے۔ جبل حراء نے آپ ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میری طرف تشریف لائیے، میری طرف تشریف لائیے(2)۔ امام بغوی اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اس پتھر کو جانتا ہوں جو مکہ میں میری بعثت سے پہلے مجھے سلام کرتا تھا میں اسے اب بھی پہچانتا ہوں۔ یہ حدیث صحیح ہے اور امام مسلم نے تخریج کی ہے(3) اور حضرت انس سے صحت کے ساتھ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جبل احد کے سامنے تشریف لائے تو فرمایا یہ احد پہاڑ ہے، یہ ہم سے محبت کرتا ہے، ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔(4)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز فجر پڑھائی، پھر آپ ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ایک شخص گائے ہانک کر لے جا رہا تھا، تھک کر اس پر سوار ہو گیا پھر اسے مارنے لگا۔ گائے بولی مجھے سواری کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، ہماری تخلیق تو زمین میں ہل چلانے کے لئے کی گئی ہے۔ لوگوں نے کہا سبحان اللہ گائے کلام کرنے لگی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں، ابو بکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس واقعہ کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس وقت حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما موجود نہ تھے(5)۔ اور فرمایا ایک شخص بکریاں چرا رہا تھا، اچانک ایک بھیڑیے نے ایک بکری پر حملہ کر دیا۔ چرواہا پہنچا اور بکری کو بھیڑیے سے چھڑا لیا۔ بھیڑیا بولا جس دن درندوں کا تسلط ہوگا اور ان بکریوں کا میرے سوا کوئی چرواہا نہ ہوگا اس دن ان بکریوں کا کون محافظ ہوگا؟ لوگوں نے کہا سبحان اللہ بھیڑیا بھی بولتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں، ابو بکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ دونوں وہاں موجود نہ تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ، ابو بکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم حراء پہاڑ پر چڑھے تو چٹان لرزنے لگی، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ٹھہر جا تیرے اوپر سوائے نبی، صدیق اور شہید کے اور کوئی نہیں ہے(6)۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ میں تھے۔ ہم مکہ کے باہر پہاڑوں اور درختوں کے درمیان چل رہے تھے۔ ہم جس پہاڑ یا درخت سے گزرتے وہ کہتا: اَلسَّلَامُ عَلَیۡکَ یَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ(7)۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں کھجور کے ستون کے ساتھ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوتے تھے جب آپ ﷺ کے لئے منبر بنایا گیا تو آپ ﷺ خطبہ ارشاد فرمانے کے لئے اس پر کھڑے ہو گئے، وہ کھجور کا تنا حضور ﷺ کی جدائی میں یوں رونے لگا جیسے اونٹنی کا بچہ ماں کی جدائی میں روتا ہے۔ حتیٰ کہ تمام اہل مسجد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 63 المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر 2۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 63 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 245 قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی
4۔ تفسیر خازن مع حاشیہ بغوی، جلد 1 صفحہ 63 5۔ تفسیر خازن مع حاشیہ بغوی، جلد 1 صفحہ 63 (التجاریہ)
6۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 282 قدیمی کتب خانہ کراچی 7۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 63

سے اس تنے کے رونے کی آواز سنی۔ حضور ﷺ منبر شریف سے اترے اور اس ستون کو گلے لگا لیا۔ تو وہ فوراً خاموش ہو گیا(1)۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں ہر پتھر اوپر سے نیچے اللہ تعالیٰ کے خوف سے گرتا ہے (ان واقعات سے ظاہر ہے کہ جمادات وحیوانات کو علم ہے)۔

3 یہ جملہ بطور وعید ذکر کیا گیا ہے۔ ابن کثیر نے یعملون کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

"اے مسلمانو! کیا تم یہ امید رکھتے ہو کہ (یہ یہودی) ایمان لائیں گے تمہارے کہنے سے حالانکہ ایک گروہ ان میں ایسا تھا جو سنتا تھا کلام الٰہی کو پھر بدل دیتے تھے اسے خوب سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر 1"

1 مومنین اور رسول کریم ﷺ کو خطاب ہے۔ یعنی کیا تم امید رکھتے ہو کہ یہود تمہاری دعوت پر ایمان لائیں گے یا تمہاری تصدیق کریں گے۔ حالانکہ ان کا ایک گروہ اللہ کے کلام تورات کو سنتا ہے۔ پھر وہ جان بوجھ کر بغیر کسی شک وشبہ کے اس کلام کو بدل دیتا ہے۔ جیسے انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے کمالات واوصاف کو چھپایا اور آیت رجم میں تحریف کی۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ہم جھوٹے ہیں۔ یہ مجاہد، قتادہ، عکرمہ، سدی اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ سے مراد ان کے اسلاف کا گروہ تھا جنہوں نے کلام الٰہی کو سنا تھا پھر اس میں تحریف کی تھی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان ستر آدمیوں کے حق میں نازل ہوئی جنہیں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے وعدہ نبھانے کے لئے چنا تھا۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سن کر اپنی قوم کے پاس واپس آئے، تو جو اُن میں سے سچے تھے انہوں نے تو جو سنا تھا وہی بیان کر دیا مگر ان کا ایک گروہ کہنے لگا، ہم نے اللہ تعالیٰ سے آخر میں یہ بھی سنا تھا کہ اگر تمہیں ان احکام پر عمل کی استطاعت ہو تو کر لینا، اگر عمل کرنا نہ چاہو تو نہ کرنا۔ یہی ان کی تحریف ہے حالانکہ وہ حق کو جانتے تھے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

"اور جب ملتے ہیں 1 ایمان والوں 2 سے تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب تنہا ملتے ہیں ایک دوسرے 3 سے تو کہتے ہیں (ارے) کیا بیان کرتے ہو ان سے جو کھولا ہے اللہ نے تم پر یوں تو وہ دلیل قائم کریں گے تم پر ان باتوں سے تمہارے رب کے سامنے 4 کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے 5"

1 یعنی یہود جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور اپنے آپ کو بھولے ہوئے تھے (اس سے پہلے بھی ان کا ذکر گزر چکا ہے)۔

2 اس سے مراد اہل مدینہ ہیں جب انہوں نے یہود کو نبی کریم ﷺ کی اتباع کا مشورہ دیا تو وہ کہنے لگے ہم تو دل وجان سے تصدیق کرتے ہیں کہ تمہارا رسول مکرم ﷺ وہ ہے جس کی تورات میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ اس کی اتباع کرو اور اس پر ایمان لاؤ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ان سے مراد یہود میں سے منافقین ہیں۔ جب وہ مومنین سے ملتے تو کہتے ہم ایمان لائے ہیں جیسے تم ایمان لائے ہو۔

3 اور جب کعب بن اشرف، وہب بن یہودا یا دوسرے رؤساء یہود سے ملتے ہیں تو وہ انہیں ملامت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کیا تم بیان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 63 (التجاریہ)

کرتے ہو مسلمانوں سے وہ جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں علم عطا کیا ہے، اور جو کچھ اس نے تورات میں بیان فرمایا ہے۔

تا کہ وہ قیامت کے روز اس کے ذریعے تمہارے رب کی بارگاہ میں تم پر حجت قائم کریں گے کہ یہ لوگ محمد ﷺ کی سچائی کو جانتے تھے اور ہمیں اس سید عالم ﷺ کی پیروی کی تلقین بھی کرتے تھے لیکن خود علانیہ یا سراً اس ذات کریمہ کا انکار کرتے تھے۔ امام بیضاوی نے اس بیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے: قِيْلَ عِنْدَ رَبِّكُمْ فِيْ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَفِيْهِ نَظَرٌ اِذِ الْاِخْفَاءُ لَا يَدْفَعُهَا(1)۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ قیامت کے دن تمہارے رب کے حضور جھگڑیں گے۔ مگر اس قول میں نظر ہے کیونکہ اس گھناؤنی سازش کو چھپانا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی فائدہ مند نہیں ہے (کیونکہ وہ تو علیم بذات الصدور ہے) وہ دلوں کے بھید جانتا ہے، میں (مفسر) کہتا ہوں اگر چہ یہ اخفاء اور چھپانا فائدہ بخش نہ تھا مگر انہوں نے یہ اپنی انتہائی حماقت اور نادانی کی وجہ سے کہا تھا (کہ شاید چھپانے سے بات چھپ جائے گی) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ایک اور قول اس جیسی حماقت کے بیان کے لئے نقل فرمایا ہے: قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ، (وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کچھ نہیں اتارا) حالانکہ خود وہ دعویٰ کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر کتاب نازل فرمائی ہے۔ اس سے پہلے ان یہود کے واقعہ میں ایسے افعال اور اقوال کا ذکر گزر چکا ہے جو ایک پاگل آدمی سے سرزد ہو سکتے ہیں حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کے ان گنت معجزات دیکھ چکے تھے۔ اسی طرح بیان ہو چکا ہے کہ وہ (اصحاب الصیب) بارش میں پھسلنے والے انسانوں کی طرح موت کے ڈر سے کڑک کی وجہ سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہیں حالانکہ کانوں میں انگلیاں ٹھونسا انہیں کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتا تھا۔ (تو یہ سب کچھ وہ حماقت اور اپنی نادانی کی وجہ سے کرتے تھے)۔ ہماری اس تفسیر کی تائید آیت کا آخری جملہ " اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ " بھی کرتا ہے یا لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ سے مراد یہ ہے کہ اصحاب محمد ﷺ تم پر حجت پکڑیں ان آیات کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے تم پر نازل کی ہیں۔ اللہ کی کتاب اور اللہ کے حکم کے ساتھ حجت پکڑنے کو مجازاً عِنْدَ رَبِّكُمْ (اللہ کی بارگاہ میں) سے تعبیر فرمایا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے عِنْدَ اللّٰهِ كَذَا اللہ کے نزدیک اس طرح ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اس طرح ہے یا اس کا حکم اس طرح ہے۔ یا یہاں مضاف محذوف ہے اصل میں عِنْدَ كِتَابِ رَبِّكُمْ یا عِنْدَ رَسُوْلِ رَبِّكُمْ تھا۔ امام بیضاوی نے ان تاویلات کو پسند فرمایا ہے اور آیت کو منافقین کے کلام پر محمول کیا ہے جو صراحۃً خود کفر کرتے تھے، لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور اپنے آپ کو بھولے ہوئے تھے، یہود کی کلام پر محمول نہیں فرمایا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ تمام تاویلات تکلفات کی وجہ سے قابل اعتراض ہیں کیونکہ مومنین کا دنیا میں منافقین سے جھگڑنا متصور ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ظاہراً بڑے مطیع و فرمانبردار تھے۔ ان سے خصومت صرف اور صرف آخرت میں ہی متصور ہو سکتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ جب انہوں نے مومنین کو بتایا کہ ہمیں فلاں فلاں کرتوتوں پر اللہ تعالیٰ نے عذاب دیا ہے، تو بعض نے انہیں کہا تم کیوں اس عذاب کا ذکر کرتے ہو جو اللہ نے تم پر نازل کیا ہے، تا کہ وہ تم سے تمہارے رب کی بارگاہ میں اپنے آپ کو معزز سمجھیں۔ (فتح بمعنی اَنْزَلَ قرآن کریم میں وارد ہوا ہے) جیسے ارشاد ہے لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ (ہم نے ان پر آسمان سے برکتیں نازل کیں)۔

ۗ اے نادان یہودیو! تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ مومنین کا تم پر اللہ کی بارگاہ میں حجت پکڑنا، دنیا میں تمہارے بتانے پر موقوف نہیں ہے۔ یا یہ خطاب مومنین کو ہے اور اس کا تعلق اَفَتَطْمَعُوْنَ کے ساتھ ہے۔ اس وقت معنی یہ ہو گا اے مومنو! تم ان سے ایمان کی توقع رکھتے ہو

1۔ تفسیر بیضاوی، جلد 1 صفحہ 89، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

حالانکہ یہ نازل شدہ کتابوں میں تحریف سے بھی گریز نہیں کرتے۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ان کو دعوت حق دینا بے کار اور بے سود ہے یا یہ ملامت کرنے والوں کی کلام کا حصہ ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تم مسلمانوں سے اپنے راز خود ہی افشاء کرتے ہو تم اتنا بھی عقل نہیں کرتے کہ وہ تم سے جھگڑیں گے اور حجت قائم کریں گے۔

أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝

"کیا وہ (یہ) نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں[1]"

[1] کیا یہ ملامت کرنے والے جانتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی صفات وکمالات کو چھپانا ان سے احتجاج کو دور نہیں کرتا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یعلمون کی ضمیر کا مرجع منافقین ہوں۔ ان کے نفاق کو اگرچہ (ان کے گمان کے مطابق) نبی کریم ﷺ اور مومنین نہیں جانتے مگر کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ تو ان کے نفاق سے آگاہ ہے اور انہیں اس بدکرتوت پر ضرور سزا دے گا۔ یا ضمیر کا مرجع تمام یہود ہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ کیا یہود یہ جانتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو بھی جانتا ہے جو اپنے کفر کو چھپاتے ہیں اور ان کو بھی جانتا ہے جو اعلانیہ کفر کرتے ہیں، اور کمالات محمدیہ اور صفات احمدیہ کا چھپانا، آیات میں تحریف کرنا اور وہ تمام اعمال بد جو غضب الٰہی کا موجب ہیں، جنہیں وہ علانیہ کرتے ہیں یا چھپا کر کرتے ہیں تمام کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝

"ان میں سے کچھ ان پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو بجز جھوٹی امیدوں کے[1] اور وہ تو محض وہم وگمان ہی کرتے رہتے ہیں[2]"

[1] یعنی ان میں سے جاہل تورات کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی امیدوں کے۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ الامانی امنیۃ کی جمع ہے، حقیقت میں اس آرزو کو کہتے ہیں جسے انسان اپنے دل میں سوچتا ہے اور یہ منی سے مشتق ہے اور اس سے مراد وہ جھوٹی امیدیں ہیں جو ان کے علماء خود گھڑتے تھے۔ حضرت مجاہد اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ حضرت فراء نے بھی یہی کہا ہے کہ امانی سے مراد جھوٹی آرزوئیں اور من گھڑت امیدیں ہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا قول بھی اسی معنی میں موجود ہے۔ مَا تَمَنَّيْتُ مُنْذُ أَسْلَمْتُ جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ یا امانی سے مراد وہ باتیں ہیں جو انہوں نے بغیر حجت ودلیل دل میں سوچ رکھی تھیں۔ مثلاً وہ کہتے: لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ کہ جنت میں یہود یا نصاریٰ کے علاوہ کوئی نہیں جائے گا۔ یا وہ کہتے: لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ہمیں آگ نہ چھوئے گی مگر چند دن۔ حضرت حسن اور ابوالعالیہ کا یہی قول ہے، یا یہ معنی ہے کہ وہ تورات کے صرف الفاظ جانتے ہیں معانی کے سمجھنے سے بالکل کورے ہیں، جیسا کہ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ یعنی جب وہ پڑھتا ہے تو شیطان اس کے پڑھنے میں اپنی طرف سے القاء کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے امنیۃ کا یہی معنی بیان فرمایا ہے۔ ابوجعفر نے امانی کو پورے قرآن میں یاء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ دوسرے قراء نے یاء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

[2] مگر یہ ایسی قوم ہے جو فقط وہم وگمان ہی کرتی ہے۔ یہ صرف اندھے مقلد ہیں، ان کے پاس اپنا کوئی علم نہیں۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

"پس ہلاکت ہو ان کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب خود اپنے ہاتھوں سے [1] پھر کہتے ہیں یہ نوشتہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ حاصل کرلیں اس کے عوض تھوڑے دام سو ہلاکت ہو ان کے لئے بوجہ اس کے جو لکھا ان کے ہاتھوں نے اور ہلاکت ہو ان کے لئے بوجہ اس مال کے جو وہ (یوں) کماتے ہیں [2]"

[1] زجاج فرماتے ہیں ویل کا لفظ ہر ہلاکت و تباہی کے گڑھے میں گرنے والا کہتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس کا مطلب عذاب کی شدت اور سختی ہے حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں یہ ایک جہنم کی وادی کا نام ہے اگر اس میں پہاڑ بھی ڈالے جائیں تو وہ بھی اس کی گرمی اور شدت سے پگھل کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ امام بغوی اپنی سند سے حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں اور وہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ویل جہنم کی ایک وادی ہے جس میں کافر اس کی گہرائی تک پہنچنے سے پہلے چالیس برس گرتا چلا جائے گا۔ صعود جہنم کے ایک پہاڑ کا نام ہے جس پر کافر ستر برس چڑھتا جائے گا پھر اسی مدت میں نیچے آئے گا(1)۔ یہ سزا ان کے لئے ہے جو خود محرف شدہ تحریر لکھتے ہیں۔ ایدیھم کے الفاظ تاکید کے لئے ہیں کیونکہ (لکھا تو جاتا ہی ہاتھ سے ہے) جیسے کوئی عربی کہتا ہے کَتَبْتُ بِیَمِیْنِیْ: میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھا۔

[2] وہ آیات میں تبدیلی اس لئے کرتے تاکہ اس کے بدلے دنیا کا مال و متاع خریدیں۔ دنیا کے سیم و زر کو قلیل کہا ہے کیونکہ وہ جتنا بھی زیادہ ہو وہ اس عذاب کی نسبت قلیل ہے جس کے وہ مستحق ہو چکے ہیں۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ جب حضور نبی رحمت ﷺ نے اعلان نبوت فرمایا تو یہودی علماء کو اپنی آمدنیوں اور رشوتوں پر زد پڑتی نظر آئی۔ تو انہوں نے تورات میں آپ ﷺ کی صفات کو دیکھا وہاں آپ ﷺ کی یہ صفات تھیں، آپ ﷺ کی جمیل صورت ہے، حسین زلفیں ہیں، سرمگیں آنکھیں ہیں، قد و قامت معتدل ہے، انہوں نے ان صفات کو اپنے ہاتھ سے بدل دیا، اور یہ لکھ دیا کہ وہ نبی لمبے قد والا اور نیلی آنکھوں والا ہے۔ جب ان پڑھ جاہل یہود سے پوچھتے کہ تورات میں آنے والے نبی کی کیا صفات لکھی ہوئی ہیں۔ وہ تبدیل شدہ صفات پڑھ دیتے۔ وہ جب حضور ﷺ میں وہ صفات نہ دیکھتے تو انکار کر دیتے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾

"اور انہوں نے کہا ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں (دوزخ کی) آگ بجز گنتی کے چند دن [1] آپ فرمائیے کیا لے رکھا ہے تم نے اللہ سے کوئی وعدہ [2] تب تو خلاف ورزی نہ کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی [3] یا (یونہی) بہتان باندھتے ہو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں [4]"

[1] یہود نے کہا کہ ہمیں آگ ہرگز نہ چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔ المس کا مطلب یہ ہے جسم تک کسی چیز کا اس طرح پہنچانا کہ حاسہ محسوس کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہود کہتے تھے دنیا کی مدت سات ہزار سال ہے اور ہمیں ہر ہزار سال کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 65 مکتبہ التجاریہ الکبریٰ مصر

بدلے ایک دن عذاب دیا جائے گا۔(1) حضرت قتادہ اور عطاء فرماتے ہیں وہ کہتے تھے صرف چالیس دن عذاب ہوگا جن میں ہم نے بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ حضرت حسن اور ابوالعالیہ نے فرمایا وہ کہتے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک حکم میں عتاب فرمایا اور قسم اٹھائی کہ وہ ہمیں چالیس دن عذاب دے گا تو وہ اپنی قسم کو پورا کرنے کے لئے ہمیں صرف چالیس دن عذاب دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ان یاوہ گوئیوں کا رد کرتے ہوئے فرمایا: قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا..... الخ۔

ع اَتَّخَذْتُمْ: یہ استفہام انکاری ہے۔ ابن کثیر اور حفص نے اَتَّخَذْتُمْ اور اخذتم اور جو ان کی مثل الفاظ ہیں تمام کو ذال کے اظہار کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ادغام کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اے محمد ﷺ ان نادانوں سے پوچھئے کیا اللہ نے تم سے کوئی عہد کیا ہے کہ وہ تمہیں صرف یہی مقدار عذاب میں مبتلا رکھے گا۔

ع یہ جملہ شرط محذوف کا جواب ہے۔ اصل میں اس طرح کلام تھی اگر تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد کر رکھا ہے تو پھر وہ ہرگز وعدہ خلافی نہیں فرمائے گا اس آیت میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ میں خلف (خلاف ورزی) محال ہے اور وعدہ خلافی رذیل ترین عمل ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں عهد سے مراد توحید کا عہد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا اسی کی تائید کرتا ہے کیونکہ اس آیت میں عهد سے مراد لا اله الا اللّٰه کہنا ہے۔ یعنی تم نے لا اله الا اللّٰه نہیں کہا کہ تمہارا کوئی اللہ تعالیٰ سے عہد ہو۔

ع یا تم اللہ تعالیٰ کے متعلق جھوٹی بات کہتے ہو۔ ام متصلہ بھی ہو سکتا ہے اور منقطعہ بھی۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

"ہاں (ہمارا قانون یہ ہے) جس نے جان کر برائی کی لے اور گھیر لیا اس کو اس کی خطا ع نے تو وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ع"

لے یہود جو آگ کے چھونے کی نفی کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے بلیٰ فرما کر اس عذاب کو ثابت فرما دیا ہے۔ الکسب کا اصل استعمال نفع کے حصول کے لئے ہے، اور یہاں سیئة کے ساتھ اس کا ذکر بطور استہزاء ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے بشارت کے لفظ کو عذاب الیم کے ساتھ بطور استہزاء ذکر فرمایا ہے۔ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ انکو دردناک عذاب کی خوشخبری دو۔

ع اور جس کو اس برائی نے گھیر لیا، اور مکمل طور پر اس پر غالب آ گئی حتیٰ کہ کوئی جانب بھی خالی نہیں ہے مکمل برائی کا غلبہ یا برائی کا احاطہ صرف کفار پر ہوتا ہے۔ اس شخص پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا جس کے دل میں ایمان کا ایک ذرہ بھی موجود ہے۔ حضرت ابن عباس، الضحاک، ابوالعالیہ، الربیع اور دیگر علماء نے فرمایا خطیئة سے مراد شرک ہے جس پر انسان مر جائے۔ معتزلہ اور خوارج اس آیت کریمہ سے گناہ کبیرہ کے مرتکب کے ہمیشہ دوزخ میں رہنے پر استدلال کرتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔

قرأت: اہل مدینہ نے خطیئاته جمع پڑھا ہے جبکہ دوسرے قراء نے مفرد پڑھا ہے، حمزہ وقف کی حالت میں ہمزہ کو یاء کے ساتھ بدل کر ادغام کر کے پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ہر جگہ جہاں ہمزہ متحرک درمیان میں ہو اور اس کا ماقبل یاء ساکن زائدہ ہو تو ہمزہ کو یاء سے بدلتے ہیں اور پھر یاء کو یاء میں ادغام کر کے پڑھتے ہیں۔ جیسے هنيئا، مريئا، بريئا، بريئون، خطيئة، خطيئتكم اور ان کے

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 163 المطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

مشابہ الفاظ۔ اگر ہمزہ سے پہلے یاء کے علاوہ کوئی ساکن ہو پھر اگر وہ الف نہیں تو ہمزہ کی حرکت ماقبل لفظ کو دے کر ہمزہ کو ساقط کر دیتے ہیں۔ جیسے شیئاً، خطئاً، المشئمة، تجئرون، یسئلون، وسئل، والظمئان، القرء ان، مذءوماً، مسئولاً، سیئت اور اَلْمَوْءُ وْدَةُ۔ اور اگر ہمزہ سے پہلے الف ہو تو خواہ وہ بدلا ہوا ہو یا زائدہ ہو تو ہمزہ کو بین بین پڑھتے ہیں۔ اور الف پر مد پڑھنے اور قصر کرنے میں اختیار ہے۔ جیسے نِساء کم وابنائکم، ماۤء، غثاۤء، سواۤء، آباۤءکم، هاؤم اقرءوا، ومن آباء هم، ملائکته۔

اور جب ہمزہ سے پہلے ہمزہ مفتوح ہو اور اس کا ماقبل مکسور یا مضموم ہو تو کسرہ کے بعد یاء سے اور ضمہ کے بعد واؤ سے بدل دیتے ہیں۔ جیسے نُبِّئُكم، ان شانئک، لُؤلُؤ، اور ویُؤدہ۔ اگر ہمزہ یاء کی صورت میں نہ ہو تو بین بین پڑھتے ہیں۔ جیسے الهنکم، سنقرءک، اس کو یاء مضمومہ کے ساتھ بدل دو اگر یاء کی صورت میں ہو۔ جب ہمزہ وسط میں ہو اور ساکن ہو تو تسہیل کی حالت میں خالص حرف سے بدل جائے گا جیسے المؤمنون، یؤفکون، والرءیا۔

ع جس طرح دنیا میں انہوں نے آگ کے اسباب کو لازم پکڑے رکھا۔ اسی طرح وہ اس دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۠ (۸۲)

”اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہی جنتی ہیں وہ اس جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔“

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ۫ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۸۳)

”اور یاد کرو جب لیا تھا ہم نے پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے (اس بات کا) کہ نہ عبادت کرنا بجز اللہ کے [1] اور ماں باپ سے اچھا سلوک کرنا نیز رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے بھی (مہربانی کرنا) [2] اور کہنا لوگوں سے اچھی باتیں [3] اور صحیح ادا کرنا نماز اور دیتے رہنا زکوٰۃ پھر منہ موڑ لیا تم نے مگر چند آدمی تم سے (ثابت قدم رہے) اور تم روگردانی کرنے والے ہو [4]“

[1] جب ہم نے تورات میں پختہ عہد لیا۔ بنی اسرائیل سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ ابن کثیر، حمزہ اور الکسائی نے لا یعبدون یعنی یاء کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ نہی کے معنی میں خبر ہے جیسے وَلَا یُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ میں خبر بمعنی نہی ہے۔ اسی وجہ سے اس پر احسنوا اور قولوا کا عطف صحیح ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس کا مطلب ان لا تعبدوا ہے، جب اَنْ حذف کیا گیا تو فعل مرفوع ہو گیا۔ اس تقدیر پر لا تعبدون میثاق کا یا تو بدل ہوگا یا حرف جر کے حذف کے ساتھ اس کا معمول ہوگا۔ ابی بن کعب نے لا تعبدوا نہی کا صیغہ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جواب قسم ہے، جس پر معنی دلالت کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان سے قسم لی کہ وہ کسی غیر کی عبادت نہ کریں۔

[2] یہ محذوف کلام کے متعلق ہے یعنی تُحْسِنُوْنَ بِالْوَالِدَیْنِ یا اَحْسِنُوْا بِالْوَالِدَیْنِ ہے، اس صورت میں لا تعبدون پر معطوف ہوگا۔ یا اصل عبارت یہ ہوگی وَوَصَّیْنَا هُمْ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا، اس صورت میں اخذنا پر عطف ہوگا۔

والدین سے نیکی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے حسن سلوک سے پیش آئے، ان سے نرمی کا برتاؤ کرے اور ان کے ہر اس حکم کی اطاعت کرے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مخالف نہ ہو۔ ذی القربیٰ کا والدین پر عطف ہے قربیٰ حسنیٰ کی طرح مصدر ہے اور الیتٰمٰی یتیم کی جمع ہے، اس سے مراد وہ بچہ ہوتا ہے جس کا باپ مر چکا ہو اور المساکین جمع ہے مسکین کی اور یہ سکون سے مشتق ہے گویا فقر و تنگ دستی نے اسے بٹھا دیا ہے۔ یتیموں، مسکینوں اور قریبی رشتہ داروں سے حسن سلوک یہ ہے کہ ان سے رحمت و رافت سے برتاؤ کرے اور ان کے حقوق ادا کرے۔

۳؎ یہ بھی احسنوا کے متعلق ہے یا تقدیر عبارت یوں ہے قُلْنَا لَهُمْ قُوْلُوْا ہم نے انہیں حکم دیا کہ لوگوں سے اچھی بات کرو، اس صورت میں اخذنا پر اس کا عطف ہوگا۔ یہ قولاً مصدر کی صفت ہے۔ حمزہ، الکسائی، یعقوب نے حاء اور سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ صفت ہے اور باقی قراء نے مصدر کی بناء پر حاء مضموم اور سین ساکنہ کے ساتھ پڑھا ہے اور مبالغہ کے طور پر بطور صفت ذکر کیا گیا ہے جیسے زَیْدٌ عَدْلٌ کہا جاتا ہے۔ یہ کلام ہر اس اچھی کلام کو شامل ہے جو شان مصطفیٰ اور نعت مجتبیٰ ﷺ میں کہی ہو، جیسا کہ حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ یا اس سے مراد نهي عن المنكر اور امر بالمعروف یعنی برائی سے منع کرنا اور نیکی کا حکم دینا ہے جیسا کہ الثوری کا قول ہے۔ یا اس سے مراد معاشرت میں نرم گفتگو کرنا ہے یا حق کی گواہی دینا مراد ہے یا ہر ایسا قول ہے جس پر ثواب دیا جاتا ہے۔

۴؎ ثم تولیتم میں غائب سے خطاب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے غیب کے صیغے استعمال کئے گئے مگر اب خطاب کا صیغہ استعمال فرمایا ہے اور یہاں حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ اور آپ ﷺ سے پہلے والے یہودیوں کو خطاب کیا گیا ہے اور موجود لوگوں کو غلبہ دیا گیا ہے۔ اس لئے صیغہ ان کے مطابق استعمال ہوا ہے یعنی جو تم میں سے ایمان لائے وہ تھوڑے تھے جیسے عبد اللہ بن سلام وغیرہ۔ آخر میں فرمایا وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ یعنی تم قوم ہی ایسی ہو جس کی عادت ہی وعدہ خلافی ہے یا یہ معنی ہے کہ پھر تمہارے آباء نے منہ موڑا مگر ان میں سے چند نے اسلام قبول کیا۔ مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے اور فعل کو بھی اسی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تم بھی اپنے آباء و اجداد کی طرح اعراض کرنے والے ہو۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۝

"اور یاد کرو جب لیا ہم نے تم سے پختہ وعدہ کہ تم اپنوں کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہیں نکالو گے اپنوں کو اپنے وطن ۱؎ سے پھر تم نے (اس وعدہ پر ثابت رہنے کا) اقرار بھی کیا اور تم خود اس کے گواہ ہو ۲؎۔"

۱؎ اس جملہ میں وہ تمام ترکیبی احتمالات پائے جاتے ہیں جو لا تعبدون کے ضمن میں گزر چکے ہیں۔ یعنی ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم ایک دوسرے کو قتل نہ کرنا اور جلا وطن نہ کرنا۔ یہاں ایک دوسرے کو قتل کرنے اور جلا وطن کرنے کو اپنے آپ کو قتل کرنے اور اپنے آپ کو جلا وطن کرنے سے تعبیر فرمایا ہے کیونکہ تمام یہودی نسب اور دین میں ایک تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ عرب محاورات میں ایسا استعمال کرتے رہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ایسے افعال کا ارتکاب نہ کرو کہ تمہارا خون بہانا مباح ہو جائے اور تمہیں گھروں سے نکالنا مباح ہو جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لا تخرجون کا مطلب یہ ہے کہ اپنے پڑوسیوں سے برا سلوک نہ کرو کہ وہ

تمہاری برائی کی وجہ سے کسی دوسری جگہ پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں۔

۲ے پھر تم نے اس عہد کا اقرار بھی کیا اور تم خود ہی اپنے اس عہد پر گواہ بنے۔ یہ جملہ تاکید کے لئے ہے یا یہ مطلب ہے کہ اے موجود لوگو! تم اپنے اسلاف کے عہد پر گواہی دیتے ہو۔ اس معنی کے اعتبار سے موجود لوگوں کی طرف فعل کی نسبت مجازی ہے۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِیَارِهِمْ٘ تَظٰهَرُوْنَ عَلَیْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِؕ وَ اِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْكُمْ اِخْرَاجُهُمْؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَاۚ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝۸۵

" پھر تم وہی ہو نا (جنہوں نے یہ وعدے کئے) کہ اب قتل کر رہے ہو اپنوں کو اور نکال باہر کرتے ہو اپنے گروہ کو ان کے وطن سے ۱ے نیز مدد دیتے ہو ان کے خلاف (دشمنوں کو) گناہ اور ظلم سے اور اگر آئیں تمہارے پاس قیدی بن کر (تو بڑے پاکباز بن کر) ان کا فدیہ ادا کرتے ہو ۲ے حالانکہ حرام کیا گیا تھا تم پر ان کا گھروں ۳ے سے نکالنا تو کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصہ پر اور انکار کرتے ہو کچھ حصہ کا ۴ے (تم خود ہی کہو) کیا سزا ہے ایسے نابکار کی تم میں سے سوائے اس کے کہ رسوا رہے دنیا کی زندگی میں ۵ے اور قیامت کے دن تو انہیں پھینک دیا جائے گا سخت ترین عذاب میں اور اللہ بے خبر نہیں ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو ۶ے "

۱ے یہاں ثم پختہ عہد کے بعد جو انہوں نے وعدہ خلافی کی تھی اس کے بُعد کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ انتم مبتدا ہے اور ھؤلاء اس کی خبر ہے۔ معنی یہ ہے کہ تم ہی وہ ہو جو عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑنے والے ہو۔ جیسے کہتے ہیں تو وہ شخص ہے جس نے ایسا کیا۔ (موضوع اور محمول میں تغایر ضروری ہوتا ہے مگر یہاں موضوع اور محمول دونوں سے ایک ذات مراد ہے، تو پھر یہ مبتدا خبر کیسے بن سکتے ہیں) یہاں صفت کی تبدیلی اور تغیر کو ذات کی تبدیلی کے قائم مقام سمجھا گیا ہے۔ اور بعد والا جملہ حال ہے اور اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے یا انتم، ھؤلاء کا بیان ہے، یا یہ کہا جائے گا کہ انتم مبتدا ہے اور ھؤلاء تاکید ہے اور مابعد جملہ خبر ہے یا ھؤلاء بمعنی الذی ہے اور مابعد جملہ اس کا صلہ ہے پھر صلہ موصول مل کر انتم کی خبر ہے، یا اَنْتُمْ یا ھٰؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ ہے۔ (یعنی ھؤلاء سے پہلے حرف ندا یا مقدر ہے)۔

۲ے قرأت: حضرت عاصم اور حمزہ نے یہاں بھی اور سورۃ التحریم میں بھی تاء تفاعل کو حذف کر کے ظاء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے مگر باقی قراء نے تاء کو ظاء میں ادغام کر کے پڑھا ہے، التظاھر کا معنی تعاون ہے اور یہ ظھر سے مشتق ہے، یخرجون کے فاعل سے حال ہے یا اس کے مفعول سے حال ہے۔ یا دونوں سے حال ہے اساریٰ کو حمزہ نے اَسْرٰی پڑھا ہے اَسْرٰی اور اُساری دونوں اسیر کی جمع ہیں۔ تُفٰدُوْھُمْ۔ تم ان سے تبادلہ کرتے ہو یعنی قیدیوں کا قیدیوں سے تبادلہ کرتے ہو۔ ابن کثیر، ابوعمرو، ابن عامر، حمزہ اور ابوجعفر نے تفدوھم تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ان کے بدلے مال دیتے ہو اور انہیں چھڑا لیتے ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں

دونوں قرأتوں کا معنی ایک ہے۔

حضرت السدی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے تورات میں یہ عہد لیا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل نہ کریں۔ ایک دوسرے کو شہروں سے نہ نکالیں۔ اور بنی اسرائیل میں سے کوئی لونڈی یا غلام پائیں تو اسے قیمت ادا کر کے خریدیں اور پھر اسے آزاد کر دیں۔ ہوا یہ کہ بنو قریظہ اوس کے حلیف بن گئے اور بنو نضیر خزرج کے حلیف بن گئے۔ بنو قریظہ، بنو نضیر اور ان کے حلیف سخت جنگ لڑتے تھے۔ اور جب غالب آ جاتے تو ان کے گھروں کو تباہ و برباد کرتے اور انہیں اپنے گھروں سے نکال دیتے اور دونوں فریقوں میں سے کوئی ایک اگر قیدی ہو جاتا تو اس کے لئے مل کر فدیہ اکٹھا کرتے اگرچہ قیدی دشمن گروہ سے بھی ہوتا۔ عرب انہیں اس دورنگی پر شرم دلاتے کہ تم جنگ بھی کرتے ہو اور فدیہ بھی خود دیتے ہو تمہارا عجیب معاملہ ہے۔ وہ کہتے ہمیں فدیہ دینے کا حکم دیا گیا ہے، پھر انہیں عرب کہتے تم ان سے لڑتے کیوں ہو تو کہتے ہمیں اس بات سے بھی شرم آتی ہے کہ ہمارے حلیف ذلیل ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ کے الفاظ سے عار دلائی ہے (1) انہوں نے اللہ تعالیٰ کے چار احکام میں سے تین کی نافرمانی کی اور ایک کی پیروی کی، مثلاً وہ قتال بھی کرتے، ایک دوسرے کو گھروں سے بھی نکالتے، اور برائی اور گناہ پر ایک دوسرے کی معاونت بھی کرتے حالانکہ انہیں ان تینوں کاموں سے منع کیا گیا تھا۔ صرف ایک فدیہ کے حکم پر عمل کرتے تھے۔

۲ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ میں هو ضمیر شان ہے یا اس کا مرجع وہ مصدر ہے جس پر یخرجون دلالت کر رہا ہے۔ یا محذوف اسم کی طرف راجع ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ مَعَ مَا صَدَرَ مِنْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ دونوں تقدیروں پر اخراجهم تاکید ہے یا یہ ضمیر مبہم ہے، اخراجهم اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔ اس جملہ کی ماقبل سے متصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جب فدیہ کے حکم کی پیروی کی اور اخراج جو ان پر حرام تھا اس کا ارتکاب کیا تو معلوم ہو گیا کہ ان کی اطاعت معصیت سے خالی نہیں ہے۔ پھر خالص معصیت کی حالت کیا ہو گی۔ اس وضاحت سے اخراج کی حرمت کو دوبارہ ذکر کرنے کی وجہ ظاہر ہو گئی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ جملہ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ سے متعلق ہے، اور درمیان کلام معترض ہے (2)۔ اس صورت میں اخراج کی حرمت کے ذکر کی تخصیص کی وجہ ظاہر نہ ہو گی و اللہ اعلم۔

۳ یعنی تم فدیہ کے حکم پر ایمان رکھتے ہو اور حرمت قتل اور اخراج کا انکار کرتے ہو۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں طرفہ تماشا ہے کہ دوسروں سے انہیں چھڑاتے ہو اور خود انہیں قتل کرتے ہو۔

۵ یعنی جو بعض کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ ان کی جزاء اور کیا ہو سکتی ہے سوائے ذلت و رسوائی کے۔ خزی ایسی ذلت کو کہتے ہیں جس سے انسان شرم محسوس کرے۔ قریظہ کی دنیا میں ذلت اور رسوائی یہ ہوئی کہ وہ قتل بھی ہوئے اور قیدی بھی اور نضیر کی ذلت اذرعات، اریحا کی طرف جلا وطنی کی صورت میں ظاہر ہوئی اور وہاں ان پر اور دوسرے لوگوں پر ٹیکس لگایا گیا۔

۶ ابن کثیر، نافع اور ابو بکر نے یعملون پڑھا ہے۔ اس صورت میں ضمیر کا مرجع مَنْ ہوگا، اور باقی قراء نے خطاب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ

1۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 315 مطبوعہ الکبری الامیریہ مصر

2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 93 مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی

لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾

"یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے مول لے لی ہے دنیا کی زندگی آخرت کے عوض تو نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی۔[1]"

[1] یہاں اشتری کا معنی استبدل ہے یعنی جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کو چاہا۔ نہ ان پر آسان کیا جائے گا عذاب اور نہ وہ اللہ کے عذاب کو روک سکیں گے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

"اور بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ کو کتاب اور ہم نے پے در پے ان کے پیچھے پیغمبر بھیجے[1] اور دیں ہم نے عیسیٰ بن مریم کو روشن نشانیاں[2] اور ہم نے تقویت دی انہیں جبرئیل[3] سے تو کیا جب بھی لے آیا تمہارے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم جسے تمہارے نفس پسند نہ کرتے تو تم اکڑ گئے بعض[4] کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو قتل کرنے لگے[5]"

[1] یہاں کتاب سے مراد تورات ہے۔ من بعدہ، قفینا کے معنی کی تاکید ہے کیونکہ اس میں بعدیت کا معنی پایا جاتا ہے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع، اشموئیل، داؤد، سلیمان، ایوب، شعیا، ارمیا، عزیر، حزقیل، الیسع، یونس، زکریا، یحییٰ اور الیاس وغیرہم صلوات اللہ علیہم اجمعین تشریف لائے۔

[2] وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ۔ اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح دلائل عطا فرمائے مثلاً مادر زاد اندھوں اور کوڑھی کے مرض والوں کو شفا دینا، مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ، یا البینت سے مراد انجیل ہے۔

[3] ابن کثیر نے القدس کو دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الروح سے مراد جبرئیل امین ہے یا روح سے مراد وہ روح ہے جو عیسیٰ علیہ السلام میں پھونکی گئی تھی۔ القدس کا معنی طہارت ہے، یہ مصدر ہے اور اسم فاعل کے معنی میں ہے یعنی طاہر ہے۔ اور قدس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تکریماً اپنی طرف نسبت فرمائی ہے۔ جیسے تعظیماً فرمایا بیت اللہ (اللہ کا گھر)، ناقۃ اللہ۔ اس کی مثال ایک اور جگہ بھی ہے فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا یا روح کی القدس کی طرف اضافت ایسی ہے جیسے حاتم الجود کی اضافت ہے یعنی موصوف کو صفت کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ اس صورت میں القدس روح کی صفت ہو گی۔ جبرئیل اور عیسیٰ علیہما السلام کو طہارت سے اس لئے موصوف فرمایا کہ وہ دونوں گناہوں سے پاک ہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام شیطان کے چھونے سے پاک رہے تھے۔ انہیں طہارت و پاکیزگی سے متصف فرمایا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اسے چھوتا ہے اور شیطان کے چھونے کی وجہ سے وہ بچہ رونے لگتا ہے۔ سوائے حضرت مریم اور آپ کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کہ وہ شیطان کے چھونے سے محفوظ رہے(1)۔ (متفق علیہ) دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کے اصلاب اور حیض والے رحموں سے محفوظ رہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جبرئیل

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 388 مطبوعہ وزارت تعلیم اسلام آباد

کے ذریعے تائید اس طرح ہوئی کہ جبرئیل امین کو ان کے ساتھ چلنے کا حکم دیا گیا حتیٰ کہ وہ انہیں آسمان پر لے گئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں روح سے مراد وہ اسم اعظم ہے جس کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردے زندہ کرتے تھے اور لوگوں کو معجزات دکھاتے تھے۔ بعض نے فرمایا اس سے مراد انجیل ہے۔ اس کی مثال قرآن کریم میں موجود ہے اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا کتاب انجیل کو روح سے تعبیر فرمایا کیونکہ کتاب اللہ بھی دلوں کی زندگی کا سبب ہوتی ہے جس طرح روح بدن کی زندگی کا سبب ہوتی ہے۔ ان آخری دو تاویلوں کی صورت میں روح کی اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت اور طہارت کے ساتھ اس کو موصوف کرنا ظاہر ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں جب یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر سنا تو کہنے لگے اے محمد (ﷺ) آپ ﷺ نہ تو عیسیٰ علیہ السلام کی مثل عمل کر کے دکھاتے ہیں اور نہ دوسرے انبیاء کرام کی طرح معجزات دکھاتے ہیں۔ جیسا کہ آپ ﷺ خود ان کے معجزات بیان کرتے ہیں اگر آپ ﷺ سچے نبی ہیں تو عیسیٰ علیہ السلام کی طرح معجزات ظاہر کرو۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی۔(1)

ؕ یہاں بھی خطاب یہود کو ہے۔ ھوی واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہو تو معنی محبت کرنا اور واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہو تو معنی گرنا ہوتا ہے۔ یہ کلام بھی پہلے جملوں پر معطوف ہے۔ فاء اور اس کے متعلق کلام کے درمیان ہمزہ زجر و توبیخ کے لئے ہے اس بات پر کہ انہوں نے الٹا نتیجہ نکالنا شروع کر دیا ہے اور ہمزہ کی دوسری وجہ ان پر اظہار تعجب کرنا ہے۔ یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ بالکل نئی کلام ہو۔ اور فاء کلام مقدر پر معطوف کرنے کے لئے ہے گویا سائل کہتا ہے انہوں نے انبیاء کرام کے ساتھ کیا کیا تھا تو جواب دیا کہ انہوں نے انبیاء کا انکار کیا اور زجر و توبیخ کرتے ہوئے فرمایا اَكَفَرۡتُمۡ بِهِمۡ فَكُلَّمَا جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ۔ کیا تم نے کفر کیا جب تمہارے پاس نبی ایسی چیز لایا جس کو تمہارے نفس پسند نہیں کرتے تھے۔

ۃ تم ایمان لانے اور رسولوں کی اتباع کرنے سے تکبر کرنے لگے تم نے بعض انبیاء کو جھٹلایا جیسے عیسیٰ علیہ السلام، محمد ﷺ وغیرھما علیہم صلوات اللہ۔ فریقًا پر فاء سببیت یا تفصیل کے لئے ہے۔ یعنی بعض انبیاء کرام کو تم نے قتل کیا جیسے حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت شعیا وغیرہم (علیہم الصلوات والتسلیم)۔ یہاں مضارع کا صیغہ حال ماضیہ کی حکایت کے لئے ذکر فرمایا ہے تاکہ معاملہ ذہنوں میں حاضر ہو جائے (حالانکہ قتل تو انہوں نے زمانہ ماضی میں کئے تھے) کیونکہ معاملہ بہت خوفناک تھا۔ یا اس لئے مضارع کا صیغہ ذکر فرمایا تاکہ آیات کے فواصل برابر ہو جائیں۔ یا اس لئے کہ پہلے بھی تم انبیاء کو قتل کرتے تھے اور اب بھی تم محمد ﷺ کو قتل کرنے کے درپے ہو جیسا کہ تم نے انہیں زہر کھلائی، تم ان سے جنگیں کرتے ہو تاکہ انہیں تم قتل کر دو۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں حضور نبی کریم ﷺ پر جادو کیا گیا حتیٰ کہ آپ ﷺ یہ خیال کرتے کہ کوئی کام کر لیا ہے حالانکہ آپ ﷺ نے وہ کام کیا نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن آپ ﷺ نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا قبول فرمائی۔ پھر ارشاد فرمایا اے عائشہ تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جس بات کا سوال کیا تھا وہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دی ہے۔ میرے پاس دو آدمی آئے ایک میرے سر کے پاس اور دوسرا پائنتی کی طرف بیٹھ گیا پھر ایک نے اپنے ساتھی سے پوچھا ان کو کیا تکلیف ہے؟ دوسرے نے کہا ان پر جادو کیا گیا ہے۔ پھر پوچھا ان پر کس نے جادو کیا ہے؟ دوسرے نے کہا لبید بن الاعصم یہودی نے کیا ہے، پھر پوچھا کس چیز میں کیا ہے؟ دوسرے نے کہا کنگھی، بال اور نر کھجور کے خوشہ کے غلاف میں کیا ہے، پوچھا وہ کہاں رکھا ہے؟ فرمایا ذی اروان کے کنویں میں۔ حضور نبی کریم ﷺ چند صحابہ کرام کو ساتھ لیکر اس کنویں پر پہنچے۔ فرمایا یہی کنواں مجھے دکھایا گیا ہے۔ فرمایا اے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 69 (دار الفکر بیروت)

عائشہ اس کنویں کا پانی مہندی کے پانی کی مانند تھا، اس کی کھجوریں شیطان کے سروں کی مثل تھیں۔ پھر آپ ﷺ نے وہ جادو باہر نکالا۔ (متفق علیہ)۔(1) میں کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ تقتلون استقبال کے معنی میں ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ تم زمانہ مستقبل میں ایک فریق کو قتل کرنے کی کوشش کرو گے۔ یعنی محمد ﷺ کو قتل کرنے کی ناکام کوشش کرو گے۔ آپ ﷺ نے زہر آلود بکری کا گوشت کھانے کی وجہ سے شہادت پائی تھی جو خیبر کی یہودیہ نے بطور ہدیہ بھیجی تھی۔ اس تقریر پر پہلے انبیاء کرام کا ذکر متروک ہوگا یا ان کا ذکر مقدر ہوگا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی۔ فَرِيقًا قَتَلْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک خیبر کی یہودیہ عورت نے زہر آلودہ بھونی ہوئی بکری بھیجی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا بازو لیا اور اس سے کچھ کھالیا اور آپ ﷺ کے ساتھ جو صحابہ کرام تھے انہوں نے بھی کھالیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھانے سے ہاتھ اٹھالو۔ پھر اس یہودن کو بلا بھیجا۔ جب وہ آئی تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا تو نے بکری میں زہر ملایا تھا۔ اس نے کہا تم کو اس کی کس نے خبر دی ہے آپ ﷺ نے فرمایا اس کے بازو نے مجھے بتایا ہے۔ عورت کہنے لگی ہاں میں نے واقعی اس میں زہر ملائی تھی۔ میں نے سوچا اگر آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہوں گے تو یہ زہر آپ ﷺ پر کچھ اثر نہ کرے گی اور اگر نبی نہ ہوں گے تو ہم آپ ﷺ سے راحت پالیں گے۔ آپ ﷺ نے اسے معاف کر دیا اور اسے کوئی سزا نہ دی اور جن صحابہ کرام نے وہ گوشت کھایا تھا وہ وفات پا گئے۔ حضور ﷺ نے اس زہر آلود بکری کو کھانے کی وجہ سے اپنے کندھے پر پچھنے لگوائے (2)۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی مرض موت میں فرمایا اے عائشہ میں ہمیشہ اس خیبر کے کھانے کی وجہ سے تکلیف محسوس کرتا رہا، اب اسی زہر کی وجہ سے میری رگ جاں کٹ رہی ہے، اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے (3)۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ مقتول انبیاء کرام ان میں داخل تھے جن کو یہود نے جھٹلایا تھا تو ایک فریق کی تکذیب کی تخصیص کی وجہ کیا ہے۔ یعنی ایک فریق بنا کر ان کو علیحدہ کیوں ذکر فرمایا؟ میں کہتا ہوں: ایک فریق کی تکذیب کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کیونکہ انہوں نے بعض انبیاء کی تکذیب نہیں کی تھی مثلاً یوشع اور عزیر علیہما السلام۔ دوسری وجہ اعتراض کے دور کرنے کی یہ ہے کہ یہاں عطف واؤ سے ہے، اس لئے بعض کے دونوں فریقوں میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَل لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾

"یہودی بولے ہمارے دلوں پر تو غلاف چڑھے ہیں [1] نہیں بلکہ پھٹکار دیا ہے [2] انہیں اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے وہ بہت ہی کم ایمان رکھتے ہیں [3]"

[1] غُلْفٌ جمع ہے اغلف کی۔ اس سے مراد وہ دل ہے جس پر خلقۃً ایسا پردہ ہو کہ وہ نہ تو حق بات کو سن سکے اور نہ اس کی حقیقت کا ادراک کر سکے جو وہ خود کہہ رہا ہو۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ اسی طرح مجاہد اور قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اصل میں یہ غلف لام کے ضمہ کے ساتھ تھا مگر پھر تخفیفاً ضمہ گرا دیا گیا ہے۔ الاعرج اور ابن عباس نے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، وہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ اس صورت میں یہ غلاف کی جمع ہوگی۔ مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے دل علم کے برتن ہیں ہمیں آپ کے علم کی

1۔ صحیح مسلم جلد 2 صفحہ 221 (قدیمی)
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، جلد 1 صفحہ 264 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 637 مطبوعہ وزارت تعلیم اسلام آباد

ضرورت نہیں ہے۔ ابن عباس اور عطاء کا بھی یہی قول ہے۔ الکلبی فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ہمارے دل علم کے لئے برتن ہیں جو بات ہمارے دل سنتے ہیں اسے یاد کر لیتے ہیں۔ مگر تمہاری بات کو یہ قبول نہیں کرتے۔ اگر تمہاری بات میں بھی کوئی بھلائی ہوتی تو اسے بھی یہ ضرور یاد کرتے اور سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مفروضے کا رد فرمایا۔ یعنی ان کے دلوں پر خلقۃً کوئی پردہ نہیں ہے جیسا کہ حدیث شریف میں حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں(1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح ان کے دل علم کے برتن بھی نہیں ہیں۔

۲؎ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر خیر اور بھلائی سے دور کر دیا ہے اور انہیں ذلیل و رسوا کیا ہے ان کے کفر کی وجہ سے جیسے اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا: فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰۤى اَبْصَارَهُمْ۔ یہ کیسے علم کا دعویٰ کر رہے ہیں اور استغناء کی ڈینگیں مار رہے ہیں۔

۳؎ قلیلاً پر نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے ما مبالغہ کے لئے زیادہ ہے۔ مطلب یہ کہ ان میں سے بہت تھوڑے ایمان لاتے ہیں۔ کیونکہ مشرکین سے جو ایمان لائے تھے وہ یہود کی نسبت بہت زیادہ تھے۔ حضرت قتادہ نے اسی طرح فرمایا ہے، یا مصدر محذوف الایمانُ بہ۔ یُؤْمِنُوْنَ مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی ایمانًا قلیلاً یُؤْمِنُوْنَ۔ یا حرف جر کو محذوف کر کے اسے منصوب کیا گیا ہے یہ بِقَلِیْلٍ مَّا تھا، یعنی جن چیزوں پر ایمان لانا ہے ان میں سے بہت کم چیزوں پر ایمان لاتے ہیں۔ جیسا کہ وہ بعض کتاب اللہ پر ایمان رکھتے تھے اور بعض کو جھٹلاتے تھے۔ واقدی فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ کثیر ایمان لاتے ہیں، نہ قلیل یعنی بالکل ایمان نہیں لاتے جیسے کوئی دوسرے کو کہتا ہے تم یہ کام بہت کم کرتے ہو۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم یہ کام بالکل نہیں کرتے۔ اس صورت میں قلت سے مجازاً عدم مراد ہوگا۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

"اور جب آئی ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب ۱؎ (قرآن) جو تصدیق کرتی تھی ۲؎ اس کتاب کی جو ان کے پاس تھی ۳؎ اور وہ اس سے پہلے فتح مانگتے تھے کافروں پر (اس نبی کے وسیلہ سے) تو جب ۴؎ تشریف فرما ہوا ان کے پاس وہ نبی جسے وہ جانتے تھے تو انکار کر دیا اس کے ماننے سے سو پھٹکار ہو اللہ کی (دانستہ) کفر کرنے والوں پر ۵؎"

۱؎ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے۔

۲؎ اس سے مراد تورات ہے، پہلے لما کا جواب محذوف ہے جس پر دوسرے لما کا جواب دلالت کر رہا ہے۔

۳؎ نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے یہود آپ ﷺ کے وسیلہ سے مشرکین عرب کے خلاف اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے تھے اور یوں دعا مانگتے تھے: اَللّٰهُمَّ انْصُرْنَا عَلَيْهِمْ بِالنَّبِيِّ الْمَبْعُوْثِ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ الَّذِيْ نَجِدُ صِفَتَهٗ فِي التَّوْرَاةِ۔ اے اللہ مشرکین کے خلاف ہماری مدد فرما اس نبی مکرم کے وسیلہ سے جو آخر زمانہ میں مبعوث ہوگا جس کی صفات ہم تورات میں دیکھتے ہیں۔ یہود کی اس دعا سے اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرما دیتا۔ یہود اپنے مشرک دشمنوں کو کہتے کہ نبی کریم ﷺ کا زمانہ آنے والا ہے وہ ہماری باتوں کی تصدیق کرتے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 181 مطبوعہ وزارت تعلیم اسلام آباد

ہوئے آئیں گے پھر ہم تمہیں ان کی معیت میں قتل کریں گے جیسے عاد، ثمود اور ارم کا قتل ہوا تھا۔ یا یہ مطلب ہوگا کہ یہود مشرکین کو نبی کریم ﷺ کی صفات بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ ان میں ایک نبی مبعوث ہوگا اور اس کا زمانہ بالکل قریب ہے۔ اس صورت میں سین مبالغہ کے لئے ہوگا اور یہ شعور دلاتا ہے کہ سائل اپنے نفس سے سوال کر رہا ہے (علم بلاغت میں اس کو تجرید کہتے ہیں)۔

ے ما موصولہ ہے اور جاء کا فاعل ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے، اصل میں مَاعَرَفُوْہُ تھا۔ اور ماعرفوہ سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ تورات میں جو آپ ﷺ کی صفات تھیں ان کو وہ بالکل پہچانتے تھے۔ اور وہ صفات بعینہٖ آپ ﷺ کی ذات میں موجود تھیں۔

ے مگر جب آپ ﷺ تشریف لائے تو مال اور ریاست کے ضیاع کے خوف اور حسد کی بناء پر آپ ﷺ کا انکار کر دیا (حالانکہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے نبی ہیں)۔ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ میں الکافرین سے مراد یہودی ہیں جنہوں نے آپ ﷺ کا انکار کیا تھا چاہئے یہ تھا۔ کہ یہاں علیهم ہوتا مگر ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر فرمایا، اس بات پر دلالت کرنے کے لئے کہ لعنت کے استحقاق کا سبب ان کا کفر ہے۔ الکافرین پر الف لام عہدی ہے، الف لام جنسی بنانا بھی جائز ہے۔ تو یہ یہود ان میں بدرجہ اولیٰ داخل ہوں گے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۞

"بہت بری چیز ہے جس کے بدلے سودا چکایا انہوں نے اپنی جانوں کا لہ وہ یہ کہ کفر کرتے ہیں اس (کتاب) کے ساتھ ے جو اللہ نے نازل کی حسد کے مارے کہ نازل کرتا ہے ے اللہ تعالیٰ اپنا فضل (وحی) جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں ے سے سو وہ حقدار ہوگئے مسلسل ناراضگی کے ے اور کافروں کے لئے ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب ہے ے"

لہ ما بمعنی شیئاً جنس کے مضمر فاعل کی تمیز ہے اور اشتروا بمعنی باعوا اس کی صفت ہے اور انفسهم اشتروا کا مفعول ہے۔ بہت بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنے آخرت کے حصوں کو بیچا۔ یا یہ معنی ہے کہ بہت بری ہے وہ چیز جس کے ساتھ انہوں نے اپنے نفسوں کو خرید لیا اپنے گمان فاسد میں۔ یعنی انہوں نے اپنے نفسوں کو ریاضت کو ترک کر کے ذلت سے چھڑا لیا ہے۔

ے یہ مخصوص بالذم ہے بغیاً، یکفروا کا مفعول له ہے اشتروا کا مفعول نہیں کیونکہ درمیان میں فاصلہ ہے۔ بغی کی اصل طلب اور فساد ہے۔ یعنی یبغی بغیاً اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی کسی چیز کو طلب کرے۔ بغی الجرح اس وقت استعمال کرتے ہیں جب زخم خراب ہو جائے۔ ظالم پر باغی کا اطلاق کیا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی فساد پھیلاتا ہے۔ اسی طرح امام پر خروج کرنے والے کو بھی باغی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی فساد اور ظلم کا طلب گار ہوتا ہے۔ حاسد پر بھی باغی کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ محسود پر ظلم کرتا ہے اور اس کی نعمت کا زوال چاہتا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ حسد کی بناء پر کفر کرتے تھے، اس چیز کے مطالبہ کرنے کی وجہ سے کفر کرتے تھے جس کے وہ مستحق نہ تھے اور زمین میں فساد کی خاطر کفر کرتے تھے۔

ے اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ لام کی تقدیر کے ساتھ بغیا کے متعلق ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے ینزل کو ہر جگہ تخفیف کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے اور ہر اس لفظ کو باب افعال سے پڑھا ہے جس کا پہلا لفظ مضموم ہو، ابن کثیر نے چند مقامات کی استثناء کی ہے، اول سورۃ الحجر میں مَا نُنَزِّلُهٗ، دوم وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ، سوم حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا سورۃ اسراء میں۔ ابو عمرو نے سورۃ انعام میں اَنْ يُّنَزِّلَ کی استثناء کی

ہے، سورۃ الحجر میں مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ کو تمام نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، باقی تمام پورے قرآن میں باب تنزیل سے تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں مگر حمزہ اور کسائی نے یُنَزِّلُ الْغَیْثَ کو سورۂ لقمان اور سورۂ شوریٰ میں تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

ؔ یہ قرآن کا نزول اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جس پر چاہتا ہے کرم فرماتا ہے۔ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ۔ سے مراد محمد ﷺ کی ذات والا صفات ہے۔

ؕ وہ محمد ﷺ اور قرآن کا انکار کرنے کے سبب اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے۔ پہلے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اور انجیل کا انکار کر کے کفر کے مستحق تھے، اسی طرح تورات پر عمل ترک کر کے، بچھڑے کی عبادت کر کے، حضرت عزیر کو ابن اللہ کہہ کر اور ہفتہ کے دن احکام کی نافرمانی کر کے غضب کے مستحق ہو چکے تھے۔

ٓ یعنی کافروں کے لئے ایسا عذاب ہوگا جو ان کی ذلت و رسوائی کا باعث ہوگا جبکہ مومنین میں سے جن گنہگاروں کو عذاب ہوگا وہ ان کے گناہوں سے پاکیزگی کا باعث ہوگا۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَ یَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۱﴾

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر اور کفر کرتے ہیں اس کے علاوہ (دوسری کتابوں) کے ساتھ [1] حالانکہ وہ بھی حق ہے تصدیق کرتا ہے اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے [2] آپ فرمایئے پھر تم کیوں قتل کرتے رہے اللہ کے پیغمبروں کو اس سے [3] پہلے اگر تم (اپنی کتاب پر ہی) ایمان رکھتے تھے [4]"

[1] بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے مراد قرآن اور تمام کتب الٰہیہ ہیں۔ وَیَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ، قالوا کی ضمیر سے حال ہے۔ الوراء اصل میں مصدر ہے جو ظرف کے طور پر استعمال ہوا ہے اور فاعل کی طرف مضاف کیا گیا ہو تو مراد وہ چیز ہوتی ہے جو پیچھے ہو، اور مفعول کی طرف مضاف ہو تو وہ چیز مراد ہوتی ہے جو سامنے ہو۔ اسی لئے وراء کو اضداد میں شمار کیا گیا ہے۔ کبھی سواء کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ یعنی سِوَاءَ ذٰلِكَ۔ (جو اس کے سوا کو طلب کرے)۔

[2] ضمیر کا مرجع ما وراءہ ہے یعنی قرآن اور انجیل حق ہیں۔ اس میں ان کے کلام کا رد ہے کہ جب انہوں نے اس کتاب کا انکار کیا جو تورات کے موافق ہے تو یقیناً انہوں نے تورات کا بھی انکار کیا ہے۔

[3] فَلِمَ: اصل میں لِمَا تھا، خبریہ اور استفہامیہ میں فرق کرنے کے لئے الف کو حذف کیا گیا ہے جیسے عربوں کے کلام میں فِیْمَ، بِمَ اور عَمَّ آیا ہے۔ تقتلون بمعنی قتلتم ہے۔ اگرچہ انبیاء کرام کا قتل ان کے آباء و اجداد سے سرزد ہوا تھا مگر یہ بھی اپنے آباء کے افعال پر راضی اور خوش تھے، اس لئے قتل کی نسبت ان کی طرف کر دی ہے، دوسرا یہ خود بھی اس گھناؤنی سازش میں ملوث تھے یعنی نبی کریم ﷺ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ۔ اصل میں مِنْ قَبْلِ هٰذَا تھا۔

۳؎ اگر تم تورات پر ایمان رکھتے ہو تو تورات یہ حکم دیتی ہے۔ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ (پھر آئے تمہارے پاس کوئی رسول جو تصدیق کرتا ہو اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہو تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا)۔ وہ تورات تو تمہیں ان کی تکذیب سے منع کرتی ہے چہ جائیکہ تم ان کو قتل کرتے ہو۔ شرط کی جزاء محذوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہی ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

"اور بے شک آئے تمہارے پاس موسیٰ روشن دلیلیں لے کر ۱؎ پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو (اپنا معبود) ۲؎ اس کے بعد ۳؎ اور تم (تو عادی) جفاکار ہو ۴؎"

۱؎ قرأت: ابوعمرو، حمزہ، الکسائی اور ہشام نے قد کی دال کو جیم میں ادغام کیا ہے جہاں بھی یہ دونوں اکٹھے آئے ہیں۔ اسی طرح قد کی دال کو ذال میں ادغام کیا ہے جیسے لَقَدْ ذَرَأْنَا، زاء میں بھی ادغام کیا ہے جیسے لَقَدْ زَيَّنَّا۔ سین میں بھی جیسے قَدْ سَمِعَ، شین میں بھی جیسے قَدْ شَغَفَهَا۔ ضاد معجمہ میں جیسے قَدْ ضَلَّ، ظاء معجمہ میں جیسے فَقَدْ ظَلَمَ۔ طاء مہملہ قد کے بعد قرآن میں واقع ہی نہیں ورنہ اس میں بھی ادغام ہو جاتی۔ ہشام کے علاوہ قراء نے صاد مہملہ میں بھی ادغام کیا ہے جیسے لَقَدْ صَرَّفْنَا، ابن ذکوان نے ذال، زاء، ضاد، ظاء میں صرف ان کی اتباع کی ہے۔ ورش نے صرف آخری دو حروف میں جمہور کی اتباع کی ہے۔ ابن کثیر، عاصم اور قالون نے تمام حروف ثمانیہ میں بغیر ادغام کے پڑھا ہے۔ دال کو دال میں مدغم کرنا اجماعی مسئلہ ہے جیسے قَدْ دَّخَلُوْا۔ اسی طرح تاء میں دال کو ادغام کرنے پر بھی اجماع ہے جیسے قَدْ تَّبَيَّنَ مگر الحسین نے نافع سے تاء میں اظہار روایت کیا ہے۔ بَيِّنٰت سے مراد نبوت کی نوشانیاں ہیں اور دوسرے معجزات ہیں۔

۲؎ اتخذتم کا دوسرا مفعول الٰھا محذوف ہے۔

۳؎ موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد یا طور کی طرف جانے کے بعد۔

۴؎ یہ حال ہے معنی یہ کہ تم نے گائے کے بچے کو معبود بنایا درآں حالیکہ تم ظالم تھے۔ یا یہ جملہ معترضہ ہے، اس وقت معنی یہ ہوگا کہ تمہاری عادت ہی ظلم کرنا ہے۔ آیت کا سیاق وسباق ان کے قول نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا کا رد ہے۔ اس امر پر تنبیہ کرنا ہے کہ ان کا معاملہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ وہی تھا جو ان کے آباؤ کا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ اس میں قصہ کا تکرار نہیں ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

"اور یاد کرو جب ہم نے لیا تم سے پختہ وعدہ اور بلند کیا تمہارے سروں پر کوہ طور (اور تمہیں حکم دیا) کہ پکڑ لو جو ہم نے تمہیں دیا مضبوطی سے اور (خوب غور سے) سنو تو انہوں نے زبان سے کہا ہم نے سن لیا اور (دل میں کہا) نہیں مانا ۱؎ سیراب ہو چکے تھے ان کے دل بچھڑے (کے عشق) سے بوجہ ان کے پیہم انکار کی نحوست ۲؎ تم فرمایئے بہت برا ہے جس

کا حکم کرتا ہے تمہیں (یہ) تمہارا (عجیب وغریب) ایمان اگر تم ایماندار ہو ۔"

ا۔ طاعت اور استجابت کو سمعاً سے تعبیر فرمایا۔ گویا مسبب پر سبب کا اطلاق کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہم نے آپ کا قول سنا اور آپ کے حکم کی نافرمانی کی۔ اہل معانی فرماتے ہیں انہوں نے اپنی زبانوں سے ایسا نہیں کہا تھا لیکن انہوں نے جب فعلاً نافرمانی شروع کر دی تو قول کی طرف نسبت کر دی گئی۔ میں کہتا ہوں یہی ظاہر ہے اگر انہوں نے زبان سے کہا ہوتا تو طور ان پہ دوبارہ گرایا جاتا۔

۲۔ یعنی بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں ان کے کفر کے سبب یوں داخل ہو گئی جیسے کپڑے میں رنگ داخل ہو جاتا ہے۔ وہ مجسمہ یا حلولیہ عقیدہ رکھتے تھے۔ اس سے پہلے ایسا خوبصورت جسم انہوں نے دیکھا نہیں تھا۔ پس جب سامری نے اسے مزین کر کے پیش کیا تو اس کی محبت ان کے دل میں رچ بس گئی۔

۳۔ تورات پر تمہارا ایمان تمہیں بہت برا حکم دیتا ہے۔ مخصوص بالذم ھٰذَا الْاَمْرُ محذوف ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ تورات پر ایمان لانا تمہیں ایسی قبیح حرکات کا حکم دیتا ہے جو تم کرتے ہو جن کی قباحت کا ذکر مذکورہ تینوں آیات میں ہے۔

۴۔ ان کے دعویٰ ایمان کو جرح وقدح سے مزید واضح کیا جارہا ہے۔ اس شرط کا جواب محذوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہا ہے تقدیر کلام یوں ہے اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ بِالتَّوْرٰىةِ فَبِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖ اِيْمَانُكُمْ بِهَا۔ یعنی اگر تم تورات پر ایمان رکھتے ہو تو بہت برا ہے جس کا حکم تمہیں تمہارا ایمان بالتوراۃ دیتا ہے، کیونکہ مومن کوئی ایسا فعل نہیں کرتا مگر جس کا ایمان تقاضا کرتا ہے لیکن ایمان ایسے قبیح افعال کا حکم نہیں دیتا۔ پس ثابت ہو گیا کہ تم تورات پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ یہ معنی ہے کہ اگر تم تورات پر ایمان رکھتے ہوتے تو کبھی ایسی قبیح حرکات نہ کرتے۔ لیکن تمہارا ایسا قبیح حرکات کرنا دلیل ہے کہ تم ایمان نہیں رکھتے۔

جب یہود نے باطل دعوے کئے مثلاً لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (ہمیں آگ ہرگز نہ چھوئے گی مگر چند دن)، لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (جنت میں صرف اور صرف یہود یا نصاریٰ داخل ہوں گے)۔ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں)۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذیل کے ارشاد کے ساتھ ان کا رد فرمادیا۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝

" آپ فرمایئے اگر تمہارے لئے ہی دار آخرت (کی راحتیں) اللہ کے ہاں مخصوص ہیں تمام لوگوں کو چھوڑ کر ا۔ تو بھلا آرزو تو کرو موت کی اگر تم سچ کہتے ہو ۲۔ اور وہ ہرگز کبھی بھی اس کی تمنا نہ کریں گے اپنی کارستانیوں کے خوف سے ۳۔ اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو ۴۔"

ا۔ لکم کان کی خبر ہے اور عند اللہ خبر ہے۔ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ کان کا اسم ہے اور خالصۃً الدَّارُ الْاٰخِرَةُ سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ الناس سے تمام لوگ مراد ہیں۔ الف، لام، استغراق کے لئے ہے یا جنس کے لئے ہے، یا الناس سے مراد مسلمان ہیں اور الف لام عہدی ہے۔

ج یعنی موت کا سوال کرو کیونکہ جسے جنتی ہونے کا یقین ہو اور اللہ کے محبوب ہونے کا ایقان ہو وہ تو آلائشوں بھرے گھر کو چھوڑ کر جنت کی تمنا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لقاء کا اشتیاق رکھتا ہے، ابن المبارک الزہد میں اور البیہقی نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ(1)۔ مومن کا تحفہ موت ہے۔ الدیلمی نے حضرت جابر سے اسی کی مثل روایت کی ہے۔ حسین بن علی سے مرفوعاً اس طرح مروی ہے اَلْمَوْتُ رَيْحَانَةُ الْمُؤْمِنِ(2)۔ موت مومن کا پھول ہے۔ حبان بن اسود نے فرمایا اَلْمَوْتُ جِسْرٌ يُوصِلُ الْحَبِيبَ اِلَى الْحَبِيبِ۔ موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے۔ یہ آیات اور احادیث دلالت کرتی ہیں کہ قبر آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل ہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عثمان سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ بلا کیف اللہ تعالیٰ کا وصال قیامت سے پہلے موت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ وہ دنیا کے وصال سے بہت بلند ہے، اگر وصال الٰہی کا مزہ موت کے بعد زیادہ نہ ہوتا تو موت کی تمنا کا کوئی فائدہ نہ ہوتا اور موت محبوب سے محبوب کو ملانے والا پل نہ ہوتا۔ بعض نے فرمایا آیت کا معنی یہ ہے کہ اس جھوٹی جدائی سے خلاصی کے لئے موت کو پکارو۔ یہ آیت آیت مباہلہ کی مثل ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر وہ موت کی تمنا کرتے تو ان میں سے ہر انسان اپنی تھوک میں مر جاتا اور سطح زمین پر کوئی یہودی باقی نہ رہتا(3)۔ اس حدیث کو بیہقی نے الدلائل میں نقل کیا۔ اسی طرح بخاری اور ترمذی نے مرفوعاً لَوْ تَمَنَّوُا الْمَوْتَ لَمَاتُوْا کے الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے ابن عباس سے موقوفاً اسی طرح روایت کی ہے، اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (اگر تم اپنے دعاوی میں سچے ہو)۔ یہ شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہی ہے۔

فصل: کیا موت کی تمنا کرنا یا موت کی دعا کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی مصیبت کے آنے پر موت کی تمنا کرے، جو مال یا جسم یا اہل و اولاد میں نازل ہوئی ہو، تو پھر جائز نہیں ہے کیونکہ حضرت انس کی حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ لِضُرٍّ نَزَلَ بِهٖ۔ کسی مصیبت کے آنے کی وجہ سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے۔ اگر کوئی مجبوری ہو تو یوں کہے اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّيْ وَتَوَفَّنِيْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ۔ اے اللہ جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے تو مجھے زندہ رکھ۔ اور اگر میرے لئے وفات بہتر ہے تو مجھے موت دے دے، (متفق علیہ)(4)۔ ایک دوسری روایت میں ہے اِذَا مَاتَ اَحَدُكُمُ انْقَطَعَ عَمَلُهٗ وَاِنَّهٗ لَا يَزِيْدُ عُمْرُهٗ اِلَّا خَيْرًا۔ جب تم میں سے کوئی مر جاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے اور اس کی عمر بھلائی میں اضافہ کرتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً مروی ہے تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے، اگر وہ محسن ہو گا تو اعمال میں زیادتی کرے گا، اگر برا ہو گا تو ہو سکتا ہے توبہ کر لے(5)۔ اس کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے تم میں سے کوئی موت کی تمنا اور دعا اس کے آنے سے پہلے نہ کرے کیونکہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے اور مومن کی عمر مومن میں بھلائی کا اضافہ کرتی ہے(6)۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ موت کی تمنا کی نہی احمد، البزار اور البیہقی نے حضرت جابر سے روایت کی ہے اور المروزی نے قاسم مولی معاویہ سے اور ابن عباس سے روایت کی ہے۔ امام احمد، ابو یعلی، الحاکم اور الطبرانی نے ام الفضل سے

1۔ شعب الایمان، جلد 7 صفحہ 181 حدیث نمبر 9884 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

2۔ الفردوس بماثور الخطاب (الدیلمی) جلد 4 صفحہ 339 حدیث نمبر 6718

3۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 336-37 مطبوعہ الکبری الامیریہ مصر

4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 342 (قدیمی)

5۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 342 وزارت تعلیم اسلام آباد

6۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 342 (قدیمی)

اور احمد نے ابو ہریرہ سے اور تمام نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے۔ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ زبان سے موت کی تمنا اور سوال منع ہے، دل سے تمنا اور رغبت کرنا ممنوع نہیں ہے کیونکہ دل کے خیالات پر ضبط ممکن نہیں اور ان کے روکنے پر انسان مکلف بھی نہیں۔

اگر دین میں فتنہ کے خوف سے موت کی تمنا کرے تو کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ مالک اور البزار نے حضرت ثوبان سے آپ ﷺ کی دعا میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں، وَاِذَا اَرَدْتَ بِالنَّاسِ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِي اِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ۔ جب تو لوگوں کو آزمانے کا ارادہ فرمائے تو مجھے بغیر کسی فتنہ کے اپنی طرف بلا لے۔ حضرت مالک نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے یوں دعا مانگی اے اللہ میری قوت کمزور ہوگئی میری عمر زیادہ ہوگئی اور میری رعیت پھیل گئی ہے اب مجھے صحیح وسلامت بغیر کسی حق کے ضائع کرنے اور بغیر کسی کوتاہی کے اپنی بارگاہ میں بلا لے۔ اس دعا کے بعد آپ صرف ایک مہینہ زندہ رہے، الطبرانی نے عمرو بن عنبسہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے۔ اگر عمل کے درست رہنے کا وثوق نہ ہو تو موت کی تمنا جائز ہے۔ اگر اسلام میں چھ خصال پائی جائیں تو موت کی تمنا کرو۔ اگر تمہارا نفس تمہارے ہاتھ میں ہو تو اس کو چھوڑ دو۔ (1) خون کا ضیاع، (2) بچوں کی حکمرانی، (3) شرط کی کثرت، (4) احمقوں کی امارت، (5) فیصلوں کی بیع، (6) قرآن کو ساز سے پڑھنے والے۔ ابن عبدالبر نے التمہید میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمرو بن عنبسہ نے موت کی تمنا کی تو لوگوں نے پوچھا آپ موت کی تمنا کر رہے ہیں حالانکہ حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، تو آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ چھ چیزوں کے پائے جانے کی وجہ سے موت کی طرف جلدی کرو (1) بیوقوفوں کی امارت، (2) شرط کی کثرت، (3) فیصلوں کی بیع، (4) خون بہانے کا جرم عظیم نہ سمجھا جانا، (5) رشتہ داری کو قطع کرنا، (6) ایسی جماعت جو قرآن مزامیر سے پڑھے۔ الحاکم نے ابن عمر سے اور ابن سعد نے ابو ہریرہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور بعض سلف نے بھی فتنہ کے خوف سے موت کی تمنا کی تھی۔ اس قسم کا مفہوم ابن سعد خالد بن معدان سے ابن عساکر اور ابونعیم نے خالد بن معدان سے اور مکحول سے اور ابن ابی الدنیا نے ابودرداء سے، ابن ابی شیبہ اور ابن ابی الدنیا نے ابوجحیفہ سے، ابن ابی الدنیا، الخطیب اور ابن عساکر نے ابی بکرہ سے، ابن ابی شیبہ اور البیہقی نے ابو ہریرہ سے اور الطبرانی اور ابن عساکر نے عرباض بن ساریہ سے نقل کیا ہے۔ اگر موت کی تمنا اللہ تعالیٰ کے لقاء کے شوق میں ہو تو یہ محمود ہے، ابن عساکر نے ذوالنون المصری سے روایت کیا ہے کہ شوق اعلیٰ مقام ہے اور بلند درجہ ہے، جب بندہ اس تک پہنچتا ہے تو اپنے رب کے اشتیاق اور اس کی ملاقات کی محبت میں اور اس کے دیدار کی خاطر مہلت کی تمنا کرتا ہے اور موت کی تاخیر سے پریشان ہوتا ہے۔ شعر: میں تجھے دیکھنے کا ارادہ کرتا ہوں جبکہ زمانہ بڑا طویل ہے۔ تیر اندازی کے بغیر کتنے خون بہہ چکے ہیں۔

میں کہتا ہوں یہود سے موت کی تمنا اسی مفہوم میں تھی۔ ارشاد فرمایا اگر آخرت کا گھر خالصۃً تمہارے لئے ہے تو شوق الٰہی میں موت کی تمنا کرو اگر تم ایماندار ہو۔ ابن سعد، بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں میں سنتی تھی کہ ہر نبی کو موت سے قبل دنیا اور آخرت کے درمیان اختیار دیا جاتا ہے۔ فرماتی ہیں جب حضور نبی کریم ﷺ کو تکلیف شدید ہونے لگی تو میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی) میں نے سمجھ لیا کہ آپ ﷺ کو اختیار دیا گیا ہے(1)۔ نسائی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ

ﷺ پر جب بے ہوشی طاری ہوئی تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میری گود میں لیٹے تھے اور میں آپ پر ہاتھ پھیرتی اور یہ کلمات کہتی اذهب الباس رب الناس۔ اے لوگوں کے پروردگار تکلیف دور فرما۔ جب آپ ﷺ کو افاقہ ہوا تو اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکال لیا اور فرمایا نہیں، میں تو اللہ تعالیٰ سے الرفیق الاعلیٰ کا سوال کرتا ہوں۔(2)

الطبرانی نے نقل کیا ہے کہ ملک الموت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روح قبض کرنے کے لئے آئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اے ملک الموت کیا خلیل اپنے خلیل کی روح قبض کرتا ہے! ملک الموت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول سنایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے خلیل کو کہو کیا خلیل اپنے خلیل کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ ملک الموت واپس آئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد سنایا۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا اسی وقت میری روح قبض کرلو۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے دعا مانگی: تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ مجھے اسلام کی حالت میں موت دے اور صالحین میں ملا دے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا مجھے کوئی پرواہ نہیں موت مجھ پر گر جائے یا میں موت پر گر جاؤں۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں اس کو نقل کیا ہے۔ حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صفین میں کہا تھا ابھی میں محمد ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب سے ملنے والا ہوں۔ اس قول کو الطبرانی نے الکبیر میں اور ابونعیم نے الدلائل میں نقل کیا ہے۔ حضرت حذیفہ پر جب موت کا وقت آیا تو کہا ضرورت کے وقت محبوب آیا ہے۔ جو ایسے وقت میں شرمندہ ہو وہ کبھی کامیاب نہ ہو، اس قول کو ابن سعد نے الحسن سے روایت کیا ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ امام احمد نے ابی امامہ سے روایت کیا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھے آپ ﷺ نے ہمیں وعظ فرمایا۔ ہمارے دل اس وعظ کو سن کر پسیج گئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص بہت زور زور سے رونے لگے اور کہا کاش میں مر چکا ہوتا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے سعد کیا میرے پاس موت کی تمنا کر رہے ہو؟ آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ جملہ دہرایا۔ پھر فرمایا اے سعد اگر تو جنت کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو تیری عمر کا طویل ہونا اور عمل کا اچھا ہونا تیرے لئے بہتر ہے(3)۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ موت کی تمنا جائز نہیں ہے اگرچہ کسی مصیبت کے آنے کی وجہ سے نہ بھی ہو کیونکہ حضرت سعد کا موت کی تمنا کرنا کسی مصیبت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے خوف کی وجہ سے تھا۔ میں کہتا ہوں یہ بات درست ہے کہ آپ کی تمنا عذاب الٰہی کے خوف سے تھی مگر موت اللہ کے عذاب سے نہیں بچاتی۔ بلکہ عذاب الٰہی سے بچنے کے لئے استغفار اور نیک اعمال کی طرف جلدی کرنا اور گناہوں سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ نے موت کی تمنا سے منع فرمایا ہے۔

اس میں تحقیق یہ ہے کہ معصیت کے خوف یا اطاعت میں کوتاہی کے اندیشہ سے موت کی تمنا کرنا قطعاً جائز ہے مگر اس کے علاوہ شوق ملاقات محبوب کے لئے بھی موت کی تمنا کرنا جائز ہے۔ بعض سلف سے مروی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ سے، حضرت خلیل علیہ السلام، سے حضرت عمار سے اور حضرت حذیفہ وغیرہم سے ہم نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے مرض موت کے وقت موت کی تمنا کی تھی، اعمال میں زیادتی کی خواہش باقی نہ رہی تو انہوں نے اللہ جل شانہ کی ملاقات کی تمنا کی۔

حضرت عبادہ بن الصامت سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند فرماتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے(4)۔ حضرت عائشہ یا کسی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 638 وزارت تعلیم اسلام آباد — 2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، جلد 2 صفحہ 293-294 (مفصلاً) دار الکتب العلمیہ بیروت
3۔ مسند احمد، جلد 5 صفحہ 267 دار صادر بیروت — 4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 963 وزارت تعلیم اسلام آباد

دوسری زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی حضور! ﷺ ہم تو موت کو پسند نہیں کرتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس کا یہ مطلب نہیں بلکہ مومن جب قریب الموت ہوتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی رضا اور کرامت کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ تو اس کے نزدیک اس کرامت و بشارت سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی۔ پس وہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور کافر جب قریب الموت ہوتا ہے تو اسے اللہ کے عذاب و عتاب کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے نزدیک کوئی چیز اتنی مکروہ نہیں ہوتی جتنا کہ سامنے دکھائی دینے والا عذاب اور عتاب ہوتا ہے۔ پس وہ اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے، اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ صحت کی حالت میں موت کی تمنا سوائے فتنہ کے خوف اور اعمال میں کوتاہی کے، سلف صالحین سے روایت نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کو بھی اسی معنی پر یا غلبۂ حال پر محمول کیا جائے گا۔ غلبۂ حال صرف اولیاء میں ہوتا ہے۔ انبیاء کرام اور ان جیسے اصحاب صحو اور صدیقین میں غلبۂ حال نہیں ہوتا۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے لقاء کا اشتیاق رکھتے ہیں مگر نیکیوں کی زیادتی کو بھی غنیمت سمجھتے ہیں

فَاِنِّیْ فِی الْوِصَالِ عُبَیْدُ نَفْسِیْ ۔۔۔ وَفِی الْھِجْرَانِ مَوْلَی لِلْمَوَالِیْ

وصال میں اپنے نفس کا غلام ہوتا ہوں ۔۔۔ اور ہجر میں غلاموں کا غلام ہوتا ہوں

رہے یہود تو انتہائی جہالت وعناد کی وجہ سے دعویٰ کرتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں اور انہیں اعمال کی ضرورت نہیں، تو انہیں کہا گیا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو چونکہ وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرماتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا:

ع یہ جملہ غیب کی خبر ہے اور یہود پر بطور معجزہ پیش کیا گیا ہے۔ یعنی آگ کا باعث بننے والے اعمال کی وجہ سے وہ موت کی ہرگز تمنا نہیں کریں گے جیسے محمد ﷺ کا انکار، قرآن کا انکار، تورات میں تحریف وغیرہ۔ ہاتھ انسان کے لئے کام کرنے کا آلہ ہے اور اکثر کام اسی ہاتھ سے کئے جاتے ہیں اس لئے نفس کو ہاتھ سے تعبیر فرمایا جاتا ہے اور کبھی ہاتھ سے قدرت مراد لیتے ہیں۔

ے یہ اس بات پر تنبیہ اور تہدید ہے کہ تم اپنے دعویٰ میں ظالم ہو۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

”اور آپ یقیناً پائیں گے انہیں سب لوگوں سے زیادہ ہوس رکھنے والے لہ زندگی کی حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی ع (زیادہ جینے پر حریص ہیں) چاہتا ہے ہر ایک ان میں سے کہ زندہ رہنے دیا جائے ہزار سال ع اور نہیں بچا سکتا اس کو عذاب سے (اتنی مدت) جیتے رہنا اور ع اللہ ہر وقت دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں ھ“

لہ لام قسمیہ ہے اور نون قسم کی تاکید کے لئے ہے اور تجد افعال قلوب سے ہے، اس کا پہلا مفعول ضمیر غائب ہے اور دوسرا مفعول احرص ہے۔ حیٰوۃ کو نکرہ ذکر فرما کر حیات کا کوئی فرد مراد لیا ہے اس سے مراد لمبی عمر ہے۔

ع معنی کے اعتبار سے الناس پر اس کا عطف ہے جیسے گویا عبارت یوں ہے اَحْرَصَ مِنَ النَّاسِ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا یا احرص پر عطف ہے اور محذوف احرص کے متعلق ہوگا جس پر ما قبل احرص دلالت کر رہا ہے۔ عبارت یوں ہوگی احرص من

الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا۔ مشرکین پہلے بھی الناس کے لفظ میں شامل تھے مگر کلام میں مبالغہ اور اہتمام کے لئے ان کا علیحدہ ذکر فرمایا ہے جیسے جبرئیل کا ملائکہ پر عطف فرمایا۔ مشرکین زندگی کے زیادہ حریص تھے کیونکہ وہ دنیوی حیات کے علاوہ کسی اور زندگی کا تصور بھی نہ رکھتے تھے اور یہود کا زندگی کے لئے زیادہ حریص ہونا اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ وہ آخرت سے بالکل اعراض کر چکے تھے حالانکہ وہ جزا و سزا کا عقیدہ بھی رکھتے تھے، بخلاف مشرکین کے کہ وہ یہ عقیدہ ہی نہیں رکھتے تھے، یہود کا دنیوی زندگی پر حریص ہونا دلیل ہے ان کے آگ پر صبر کرنے کی اور دوزخ سے بے پرواہ ہونے کی۔ اس صورت میں اس میں زیادہ توبیخ ہے۔

لو مصدریہ ہے اور ان کے قائم مقام ہے مگر یہ فعل مضارع کو نصب نہیں دیتا اور یہ یود کا مفعول ہے امام بیضاوی فرماتے ہیں لو بمعنی لیت ہے اور اس کی اصل لو اُعَمَّرُ تھی لیکن یود کا اعتبار کرتے ہوئے غیب کا صیغہ استعمال کیا گیا۔ جیسے تو کہتا ہے حلف باللّٰہ لَیَفْعَلَنَّ۔ اس صورت میں لو کا کلمہ ان کی خواہش کی حکایت کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ یود کا مفعول محذوف ہے جس پر مابعد کلام دلالت کرتی ہے۔ نئی اور مستقل کلام کے طور پر ان کی شدید حرص کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یود مبتدا محذوف کی صفت ہو اور ظرف مستقر مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا اس کی خبر ہو۔ اس صورت میں تقدیر عبارت یوں ہوگی وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا اُنَاسٌ یَّوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ۔ اور من الذین اشرکوا سے مراد یہود ہیں جو عزیر ابن اللہ کہتے تھے۔ ابوالعالیہ اور الربیع فرماتے ہیں الذین اشرکوا سے مراد مجوس ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کو سلام کے طور پر یہ کہتے تھے زی ھزار سال ہزار سال زندہ رہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہود تمام لوگوں سے زیادہ زندگی کے حریص ہیں، مجوس سے بھی زیادہ حریص ہیں اور مجوس ہزار سال زندہ رہنے کی خواہش کرتے تھے۔ سنة کی اصل سنوة ہے کیونکہ اس کی جمع سنوات آتی ہے بعض نے فرمایا اس کی اصل سنهة ہے۔

ھو ضمیر کا مرجع احدهم ہے اور ان یعمر مزحزحه کا فاعل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا نہیں ہے جس کو عذاب سے اس کی لمبی عمر بچالے۔ یا ضمیر کا مرجع یعمر کا مصدر ہے اور یعمر اس کا بدل ہے یا ضمیر مبہم ہے اور ان یعمر اس کی تفسیر ہے۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ دنیا میں عمر کا لمبا ہونا اخروی عذاب سے یقیناً دور رکھتا ہے تو پھر یہاں کیونکر نفی کا حکم لگایا گیا ہے؟ میں کہتا ہوں جب ہزار سال بلکہ دنیا کی تمام عمر بھی آخرت کی ابدی زندگی کی نسبت ایک لمحہ یا آنکھ جھپکنے کے برابر ہے۔ اس لئے ہزار سال زندہ سے بھی عذاب سے دور رہنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ عذاب سے بچنے کی نفی عمل صالح کے اعتبار سے ہے۔ اس کلام میں توبیخ ہے کہ عمر کا لمبا ہونا بھی عذاب کے اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

وہ ان کو ضرور ان کے کرتوتوں کی جزا دے گا۔ یعقوب نے تاء کے ساتھ یعنی خطاب کے صیغہ کے ساتھ "تعملون" پڑھا ہے اور باقی قراء نے غیب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اسحٰق بن راہویہ نے اپنی مسند میں اور ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے الشعبی کے طرق سے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہود کے پاس آ کر تورات سنتے تھے اور خوش ہوتے کہ کیسے یہ قرآن کی تصدیق کرتی ہے؟ فرماتے ہیں ایک دن رسول اللہ ﷺ ان کے پاس سے گزرے۔ میں نے کہا میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کیا تم رسول اللہ ﷺ کو جانتے ہو؟ ان کے عالم نے کہا ہاں، ہم جانتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ میں نے کہا پھر تم ان کی اتباع کیوں نہیں کرتے؟ انہوں نے کہا: ہم نے ان سے پوچھا کہ تمہارے پاس وحی کون لاتا ہے تو انہوں نے ہمارے دشمن جبرئیل کا نام لیا۔ وہ ہمیشہ سختی، شدت، جنگ اور ہلاکت کے پیغام لاتا

ہے؟ میں نے کہا تمہاری ملائکہ میں سے کسی کے ساتھ صلح ہے انہوں نے کہا میکائیل سے جو بارش اور رحمت نازل کرتا ہے۔ میں نے کہا ان دونوں کا رب کے ہاں کیا مقام ہے؟ انہوں نے کہا ایک اللہ تعالیٰ کے دائیں جانب ہے اور دوسرا بائیں جانب ہے۔ میں نے کہا پھر تو جبرئیل کے لئے مناسب نہیں کہ وہ میکائیل سے دشمنی کرے اور میکائیل کے لئے مناسب نہیں کہ وہ جبرئیل سے دشمنی کرے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ جبرئیل اور میکائیل اور ان کا رب ان سے صلح رکھتے ہیں جو ان سے صلح رکھے اور ان سے دشمنی رکھتے ہیں جو ان سے دشمنی رکھے۔ پھر میں نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، میں نے یہود کے ساتھ ہونے والی بات چیت بیان کرنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے پہلے ہی فرمادیا۔ اے عمر میں تمہیں ان آیات کی خبر نہ دوں جو مجھ پر ابھی نازل ہوئی ہیں۔ تو آپ ﷺ نے ذیل کی آیات الکافرین[1] تک تلاوت فرمائیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾

" آپ فرمایئے جو دشمن ہو جبرئیل کا (اسے معلوم ہونا چاہئے) کہ اس نے اتارا قرآن آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے یہ تصدیق کرنے والا ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے اتریں اور سراپا ہدایت اور خوشخبری ہے ایمان والوں کے لئے ہے"

[1] جب آپ الکافرین تک پہنچے تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ خدا کی قسم میں ابھی یہود کے پاس سے اٹھ کر آیا ہوں تاکہ ان کے ساتھ ہونے والی گفتگو آپ ﷺ سے عرض کروں مگر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو پہلے ہی ان کی خبر دے دی ہے، اس حدیث کی سند شعبی تک صحیح ہے مگر آگے شعبی نے حضرت عمر سے ملاقات نہیں کی ہے اس کے بعض طرق بعض کی تائید کرتے ہیں۔ ابن جریر نے السدی کے طریق سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اور قتادہ کے طریق نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے مگر یہ دونوں حدیثیں بھی منقطع ہیں۔ ابن ابی حاتم نے ایک دوسرے طریق سے عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ سے روایت کی ہے کہ ایک یہودی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ملا اور کہا تمہارا نبی جس جبرئیل فرشتہ کا ذکر کرتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ۔ جو اللہ تعالیٰ، فرشتوں، رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہے اللہ تعالیٰ اس کا دشمن ہے۔ فرمایا یہ حضرت عمر کی زبان پر نازل ہوئی ہے۔ ابن جریر نے اجماع نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب یہی واقعہ ہے۔

امام بخاری نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن سلام نے حضور ﷺ کی آمد کی خبر اس وقت سنی جبکہ وہ اپنی زمین میں کام کر رہے تھے۔ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی حضور ﷺ! میں آپ ﷺ سے تین چیزوں کے متعلق پوچھتا ہوں جنہیں نبی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا (1) قیامت کی پہلی نشانی کیا ہے، (2) جنتیوں کا پہلا کھانا کونسا ہے، (3) بچہ باپ اور کبھی ماں کا ہم شکل کیوں ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ان تین چیزوں کی خبر ابھی ابھی مجھے جبرئیل نے دی ہے۔ عبداللہ بن سلام نے کہا وہ تو یہود کا دشمن ہے، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ الشیخ بن حجر فرماتے ہیں سیاق کا تقاضا یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہود کے قول کے رد میں یہ آیت تلاوت فرمائی تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ اس وقت نازل ہوئی تھی اور یہی بات معتمد ہے۔

احمد، ترمذی اور نسائی نے بکیر بن شہاب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس سے روایت کی ہے کہ یہود نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں

حاضر ہوئے اور کہا اے ابوالقاسم ہم آپ ﷺ سے پانچ چیزوں کے متعلق پوچھتے ہیں اگر آپ ﷺ نے ان کے متعلق صحیح بتادیا تو ہم جان لیں گے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ پھر آگے مکمل حدیث مذکور بیان کی۔ اس میں ہے کہ انہوں نے پوچھا حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر کونسی چیز حرام کی تھی۔ نبی کی علامت کیا ہے، کڑک اور اس کی آواز کیا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ عورت کبھی بچہ جنتی ہے اور کبھی بچی۔ آسمان کی خبر کون لاتا ہے آخر میں کہا تمہارا ساتھی کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جبرئیل۔ کہنے لگے وہ تو ہمیشہ جنگ وجدل اور عذاب لے کر آتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے، اگر آپ میکائیل کا نام لیتے تو پھر بات ہوتی، کیونکہ وہ رحمت، بارش اور سبزیاں لاتا ہے۔

امام بغوی نے بغیر سند کے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ یہود کا ایک عالم جسے عبداللہ بن صوریا کہا جاتا تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ سے کہنے لگا آپ ﷺ کے پاس کون وحی لاتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جبرئیل، اس نے کہا وہ تو فرشتوں میں سے ہمارا دشمن ہے، اگر میکائیل ہوتا تو ہم آپ پر ایمان لاتے، کیونکہ جبرئیل نے تو ہمارے ساتھ کئی مرتبہ دشمنی کا اظہار کیا ہے۔ وہ ہمارے نبی کے پاس آیا اور کہا کہ بیت المقدس ایک شخص کے ہاتھوں برباد ہوگا جس کا نام بخت نصر ہے اور اس کا وقت بھی ہمیں بتایا۔ ہم نے بخت نصر کو قتل کرنے کے لئے ایک شخص بھیجا بخت نصر اس وقت بابل میں مسکین غلام تھا، تو جبرئیل نے بخت نصر کا دفاع کیا تھا۔ بخت نصر بڑا ہو گیا اور اس نے بیت المقدس کو تباہ کیا(1)۔ حضرت مقاتل فرماتے ہیں کہ یہود نے کہا جبرئیل ہمارا دشمن ہے کیونکہ اسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ ہمیں نبوت عطا کرے لیکن اس نے دوسرے لوگوں کو عطا کردی(2)۔

میں کہتا ہوں شاید دونوں قصے نزول آیت سے پہلے اکٹھے واقع ہوئے ہوں، کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی یہود سے ملے ہوں اور گفتگو ہوئی ہو اور یہود بھی اسی وقت حضور ﷺ سے ملے ہوں اور کلام ہوئی ہو اور اس وقت آیت نازل ہوئی ہو۔

قرأت: ابن کثیر نے دونوں جگہ یہاں بھی اور سورۂ تحریم میں جبرئیل کو جیم کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے ابوبکر نے جیم اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہمزہ مکسورہ کے ساتھ بغیر یاء کے پڑھا ہے، حمزہ اور الکسائی نے اسی طرح پڑھا ہے مگر انہوں نے ہمزہ کے بعد یاء کو ذکر کیا ہے۔ اور باقی قراء نے جیم اور راء کے کسرہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ فَاِنَّهٗ میں ضمیر کا مرجع جبرئیل ہے۔ نَزَّلَهٗ یہاں ہ ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ مرجع کے ذکر کے بغیر ضمیر لوٹانا عظمت شان کے اظہار کے لئے ہے اور چونکہ ذہن فوراً اسی کی طرف جاتا ہے گویا پہلے ذکر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ عَلٰى قَلْبِكَ میں کَ خطاب سے نبی کریم ﷺ کی ذات مراد ہے۔ قلب کا ذکر فرمایا کیونکہ اولاً دل ہی وحی کو قبول کرتا ہے، چاہئے یہ تھا کہ یہاں قلبی ہوتا مگر کلام الٰہی کی حکایت کے طور پر قلبک فرمایا ہے۔ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ یہ نزل کے فاعل سے حال ہے۔

ط یہ نزلہ کی ہ ضمیر سے تینوں حال ہیں اور ظاہراً جواب شرط فانہ نزلہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو جبرئیل کا دشمن ہے اس نے اپنی گردن سے انصاف کا پٹہ اتار دیا ہے اور جو وہ کتاب لائے ہیں اس کا انکار کیا ہے، کیونکہ جبرئیل قرآن لائے ہیں جو پہلی کتاب کی تصدیق کرتا ہے۔ پس یہاں جواب شرط حذف کیا گیا اور اس کی علت کو اس کے قائم مقام کردیا۔ معنی یہ ہے کہ جس نے دشمنی کی جبرئیل سے پس اس کی دشمنی کا سبب آپ ﷺ پر نزول قرآن ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جواب شرط محذوف ہے اور وہ یہ ہے فَلْيَمُتْ غَيْظًا اسے غصے سے مرجانا چاہئے۔ یا یہ ہے فَهُوَ عَدُوِّيْ وَاَنَا عَدُوُّهٗ۔ وہ میرا دشمن ہے اور میں اس کا دشمن ہوں۔ اس پر مابعد کلام یعنی فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ دلالت کرتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 124 مطبوعہ دار الفکر بیروت
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 124 (دار الفکر)

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

''جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کا لے تو اللہ بھی دشمن ہے (ان) کافروں کا ۲ ''

لے عموم کے بعد خصوصیت کے ساتھ جبرئیل و میکائیل کا ذکر ان کے اظہار شرف کے لئے ہے۔ گویا وہ ایک دوسری جنس سے ہیں۔ یا اس لئے علیحدہ ذکر فرمایا کہ کلام ان کے متعلق ہو رہی تھی۔ یا اس لئے کہ ظاہر ہو جائے کہ ایک سے دشمنی یا سب سے دشمنی اللہ تعالیٰ کی دشمنی میں برابر ہیں۔ حفص، یعقوب اور ابو عمرو نے میکال کو بغیر ہمزہ اور بغیر یاء کے پڑھا ہے لیکن نافع نے بغیر یاء کے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ اور یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲ یہاں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو ذکر کیا گیا ہے تاکہ دلیل ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے کفر کی وجہ سے دشمنی کرتا ہے اور اس پر بھی دلیل ہو جائے کہ ملائکہ اور رسولوں کی دشمنی بھی کفر ہے۔

ابن ابی حاتم نے سعید اور عکرمہ کے طریق سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ابن صوریا نے کہا آپ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں لائے جسے ہم جانتے ہوں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

''اور یقیناً ہم نے اتارے ہیں آپ پر روشن نشان اور کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ان کا بجز نافرمانوں کے لے ''

لے الفاسقون سے مراد کفر میں حد سے بڑھنے والے اور سرکش لوگ ہیں کیونکہ فسق جب کسی خاص معصیت کے لئے استعمال ہو تو وہ اس کی زیادتی اور بڑائی پر دلالت کرتا ہے۔ گویا وہ اس برائی میں حد سے تجاوز کر چکا ہے۔ الف لام جنس کا ہے یا عہدی ہے اور یہود مراد ہیں۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے جب یہودیوں سے لئے گئے عہد کا ذکر کیا اور جو دین محمدی ﷺ کے بارے میں ان سے عہد لیا گیا تھا اس کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے قسم بخدا ہم سے تو محمد ﷺ کے متعلق کوئی عہد نہیں لیا گیا۔ ہم سے تو کوئی عہد و پیمان نہیں ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔(2)

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''کیا (یوں نہیں) کہ جب بھی انہوں نے وعدہ کیا تو توڑ پھینکا اسے انہیں میں سے ایک گروہ نے بلکہ ان کی اکثریت تو (سرے سے) ایمان ہی نہیں لاتی لے ''

لے ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے اور واؤ عاطفہ ہے اور معطوف علیہ محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اَكَفَرُوْا بِالْاٰيٰتِ وَكُلَّمَا عٰهَدُوْا۔ یہود نے پختہ عہد کیا کہ اگر محمد ﷺ تشریف لائیں گے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے۔ اسی پر ابو الرجاء العطاردی کی قرات اَوْ كُلَّمَا عُوْهِدُوْا دلالت کرتی ہے۔ حضرت عطاء فرماتے ہیں یہ وہ عہود تھے جو حضور ﷺ اور یہود کے درمیان طے ہوئے تھے کہ جنگ کی صورت میں مشرکین کی معاونت نہ کریں گے۔ لیکن انہوں نے بنو قریظہ اور نضیر کی طرح عہد کو توڑ ڈالا۔ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ (وہ جن سے (کئی بار) آپ نے معاہدہ کیا پھر وہ توڑتے رہے اپنا عہد)۔ یہ آیت مذکورہ آیت کی

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 181 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 181 (العلمیہ)

تفسیر ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام نے عہد نہیں توڑا۔ پھر اس سے وہم پیدا ہوا کہ عہد توڑنے والے تھوڑے تھے تو اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا: اکثر اللہ تعالیٰ یا توراۃ پر ایمان نہیں رکھتے اور وعدہ کو توڑنے کو گناہ ہی نہیں سمجھتے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾

"جب آیا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تو پھینک دیا ایک جماعت نے اہل کتاب سے اللہ کی کتاب کو اپنی پشتوں کے پیچھے [1] جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہیں [2]۔"

[1] یعنی جب عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ تشریف لائے مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ میں ما معھم سے مراد توراۃ ہے اور کتاب سے مراد بھی توراۃ ہے، وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے کتاب پر عمل نہ کیا، اگر وہ عمل کرتے تو ہر نبی پر ایمان لاتے۔ ان کے اعراض اور توراۃ کے احکام (مثلاً ایمان لانا اور مدد کرنا اس نبی کی جو توراۃ کے بعد آئے) کی طرف عدم التفات کو اس شخص کے اعراض سے تشبیہ دی گئی ہے جو کسی چیز کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیتا ہے اور اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

[2] گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ یا جو کچھ اس میں احکام ہیں ان کو جانتے ہی نہیں۔ لیکن وہ عناد کی وجہ سے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے تھے۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٢﴾

"اور پیروی کرنے لگے [1] اس کی جو پڑھا کرتے تھے شیطان [2] سلیمان کے عہد حکومت میں [3] حالانکہ سلیمان نے کوئی کفر نہیں [4] کیا بلکہ شیطانوں نے ہی کفر کیا [5] سکھایا کرتے تھے لوگوں کو جادو [6] نیز وہ بھی جو اتارا گیا دو فرشتوں پر بابل (شہر) میں (جن کے نام) ہاروت و ماروت [7] تھے اور کچھ نہ سکھاتے تھے وہ دونوں کسی کو جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری آزمائش ہیں (ان پر عمل کر کے) کفر مت کرنا (اس کے باوجود) لوگ سیکھتے رہے ان دونوں [9] سے وہ منتر جس سے جدائی ڈالتے تھے خاوند اور اس کی بیوی میں [10] اور وہ ضرر نہیں پہنچا سکتے اپنے جادو منتر سے کسی کو بغیر اللہ کے ارادہ کے [11] اور وہ سیکھتے ہیں وہ چیز جو ضرر رساں ہے ان کے لئے اور نہیں نفع پہنچا سکتی انہیں [12] اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس نے اس کا سودا کیا اس کے لئے آخرت میں (رحمت الٰہی سے) کوئی حصہ نہیں [13] اور بہت بری ہے وہ چیز بیچا ہے انہوں نے جس کے عوض اپنی جانوں (کی فلاح کو) کاش وہ کچھ جانتے [14]۔"

1۔ یہود نے جادو پر عمل کیا، اسے بیان کیا اور ایک دوسرے کو سکھایا اس کا عطف نَبَذَ پر ہے مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور جادو اور شعبدہ کی کتابوں کے پیچھے پڑ گئے۔ بلکہ اس کا عطف جملہ شرطیہ پر ہے کیونکہ اتباع کو رسول کی آمد کے ساتھ مقید کرنا بظاہر صحیح نہیں ہے۔

2۔ یہ حالت ماضیہ کی حکایت ہے، یعنی لفظ مضارع ہے مگر معنی ماضی ہے، اور عرب مضارع کو ماضی اور ماضی کو مضارع کی جگہ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ تتلو یا تو تلاوت سے مشتق ہے جس کا معنی پڑھنا ہے یا تلو سے مشتق ہے جس کا معنی پیروی کرنا ہے۔ یعنی یہود ان جادو کی کتابوں کی پیروی کرتے تھے جو جن وانس کے شیطان ان پر پڑھتے تھے اور جن کی وہ پیروی کرتے تھے اور ان کے مطابق عمل کرتے تھے۔

3۔ یہ تتلو کے متعلق ہے کیونکہ تتلو کے ضمن میں افتراء کا معنی پایا جا رہا ہے۔ مطلب ہوگا کہ شیطان ان کتابوں کو پڑھتے تھے یہ الزام تراشی کرتے ہوئے کہ حضرت سلیمان کی بادشاہی اسی جادو کی وجہ سے قائم ہے، اس صورت میں مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ کے جملہ کے ساتھ اس کا مکمل ربط ہوگا یا علیٰ بمعنی فی ہے یعنی وہ حضرت سلیمان کے عہد سلطنت میں جادو کی کتابوں کی تلاوت کرتے تھے۔

امام بغوی لکھتے ہیں السدی نے فرمایا ہے کہ شیاطین آسمان کی طرف چڑھ جاتے تھے اور زمین میں ہونے والے واقعات کے متعلق (مثلاً کسی کی موت وغیرہ) فرشتوں کی کلام سن لیتے پھر کاہنوں کے پاس آتے، جو کچھ سنا ہوتا اس میں ستر جھوٹ اور ملاتے اور کاہنوں کو بتا دیتے۔ لوگ اسے لکھ لیتے۔ یہ بات بنی اسرائیل میں عام تھی کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس غلط عقیدہ کو ختم کرنے کے لئے تمام کتب جمع کر کے ایک صندوق میں رکھ دیں اور انہیں اپنی کرسی کے نیچے دفن کر دیا اور یہ اعلان کروا دیا کہ اگر میں نے آئندہ کسی کو یہ کہتے سنا کہ شیطان غیب جانتے ہیں تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا وصال ہو گیا اور وہ تمام علماء بھی چل بسے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے معاملہ اور کتب کے دفن کو جانتے تھے۔ تو پیچھے برے جانشین آ گئے۔ شیطان انسانی شکل میں آیا اور بنی اسرائیل کو ناصح کی حیثیت سے کہنے لگا میں تمہاری ایسے خزانہ پر آگاہی نہ کروں جو تم کبھی کھا نہ سکو۔ انہوں نے کرسی کے نیچے سے زمین کو کھودا۔ اس نے مکان کی نشاندہی کی اور خود دور کھڑا ہو گیا، کیونکہ جو شیطان کرسی کے پاس جاتا تھا وہ جل جاتا تھا۔ انہوں نے زمین کھود کر تمام کتب نکال لیں، شیطان کہنے لگا حضرت سلیمان علیہ السلام جنوں، انسانوں، شیطانوں اور پرندوں پر حکومت اسی جادو کے بل بوتے پر کرتے تھے۔ پھر شیطان غائب ہو گیا اور لوگوں میں یہ بات پھیل گئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جادوگر تھے (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ الْقَوْلِ) بنو اسرائیل نے ان کتب کفر کو پڑھنا اور ان پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر جادو یہود میں پایا جاتا ہے، جب نبی مکرم محمد ﷺ تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی قرآن کے ذریعے برأت کا اظہار فرما دیا (1)۔

میرا خیال یہ ہے کہ حضرت سلیمان نے وہ جادو کی کتابیں دفن کی تھیں۔ وہ جو شیطان روزمرہ کے واقعات کاہنوں کو بتاتے تھے وہ دفن نہیں کئے تھے کیونکہ حضرت سلیمان کے وصال کے بعد انہوں نے ان کتابوں کو جب نکالا تھا، اس وقت وہ کتابیں ان کے لئے کچھ مفید نہ تھیں۔ الکلبی فرماتے ہیں شیاطین نے جادو اور شعبدہ کی کتابیں آصف بن برخیا کی زبانی لکھیں تھیں، اور پھر انہوں نے انہیں حضرت سلیمان کے تخت کے نیچے دفن کر دیا تھا اور اس بات کا حضرت سلیمان کو علم نہ تھا۔ یہ سب کچھ اس وقت کیا جب اللہ تعالیٰ نے انہیں شاہی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 128 مطبوعہ دارالفکر بیروت

فرمان جاری کرنے سے روک دیا تھا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا وصال ہوا تو شیطانوں نے وہ کتابیں نکال لیں اور لوگوں کو کہا حضرت سلیمان تم پر اس جادو کے زور سے حکومت کرتے تھے بنی اسرائیل کے علماء اور صالحین نے تو اس علم کا حضرت سلیمان کی طرف نسبت کرنے سے انکار کر دیا اور واقعی یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم نہ تھا۔ مگر نادان، احمق لوگوں نے شیطانوں کی باتوں کو سچ سمجھ کر یہ کہنا شروع کر دیا واقعی حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جادو کا علم تھا۔ یہی جاہل لوگ ان کتابوں کے سیکھنے اور سکھانے کے در پے ہو گئے اور انبیاء کرام کی الہامی کتب کو پس پشت ڈال دیا، تو اس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں ملامت پھیل گئی، حتیٰ کہ قرآن کریم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے آپ کی برأت کا اظہار فرمایا۔(1)

؎ یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام نے جادو نہیں کیا، یہاں سحر کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے تاکہ یہ دلیل بن جائے کہ جادو کفر ہے، جو شخص منصب نبوت پر فائز ہوتا ہے وہ کفر سے معصوم ہوتا ہے۔

؎ ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے لکن کی نون کو تخفیف کے ساتھ اور الشیاطین کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے لکن کی نون کو مشدد اور الشیاطین کو منصوب پڑھا ہے۔ اس طرح لکن البر اور سورۂ انفال میں وَلٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَهُمْ اور وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى میں اختلاف ہے۔

؎ یہ جملہ کفروا کی ضمیر سے حال ہے۔ سحر یعنی جادو ایسے الفاظ اور اعمال کا علم ہے جس کے ذریعے انسان شیاطین کا قرب حاصل کرتا ہے۔ شیطان اس کے تابع ہو جاتے ہیں اور اس کی مرضی کے مطابق اس کی مدد کرتے ہیں اور یہ الفاظ اور اعمال، نفوس اور ابدان میں امراض، موت اور جنون کا اثر پیدا کر دیتے ہیں، کان اور آنکھیں ایسی چیزیں سنتے اور دیکھتے ہیں جو ہوتی نہیں ہیں یا اصل میں چیزیں کچھ ہوتی ہیں اور دکھائی کچھ دیتی ہیں۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فرعون کے جادوگروں نے رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو موسیٰ علیہ السلام اور تماشائیوں نے انہیں دوڑتے ہوئے دیکھا۔ جادو کے عمل میں یہ تاثیر اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے طور پر پیدا فرمادی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں، جادو اشیاء کی ذوات کو بھی بدل دیتا ہے یعنی انسان کو گدھا اور گدھے کو کتا بنا دیتا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں اہل سنت کے نزدیک جادو کا وجود حق ہے لیکن اس پر عمل کرنا کفر ہے(2) شیخ ابو منصور فرماتے ہیں کہ مطلقاً یہ کہنا کہ جادو کفر ہے خطا اور غلطی ہے(3) بلکہ اس کی حقیقت سے بحث کرنا ضروری ہے۔ اگر جادو میں کوئی ایسا عمل ہو جس سے شریعت تابتہ کا رد لازم آتا ہو تو وہ کفر ہے ورنہ نہیں۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں امام شافعی سے حکایت کیا گیا ہے کہ جادو کے ذریعے ہوتا کچھ ہے دکھائی کچھ دیتا ہے، انسان کو مریض بھی کیا جاتا ہے، کسی کو قتل بھی کیا جاتا ہے، جس نے کسی کو جادو کے ذریعے قتل کیا تو اس پر قصاص واجب ہے۔ یہ شیطانی عمل ہے جو جادوگر شیطان سے سیکھتا ہے۔ جب وہ سیکھ لیتا ہے تو دوسروں پر اس کو استعمال کرتا ہے(4)۔ امام شافعی کا قول اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ بعض جادو کفر ہے اور بعض کفر نہیں۔ اسی طرح تفسیر مدارک میں لکھا ہے وہ جادو جو کفر ہے، اسے سکھانے والے مرد کو قتل کیا جائے گا مگر عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ احناف کے نزدیک مرتد کا حکم ہے۔ اور جو جادو کفر نہیں ہے اگر اس سے کسی نفس کو ہلاک کیا جاتا ہے تو اس کا حکم ڈاکو جیسا ہے یعنی اس میں مرد و عورت برابر ہیں۔ جادوگر توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی، اگرچہ اس کا جادو کفر بھی ہو اور جو کہتے ہیں کہ جادوگری کی توبہ قبول نہیں ہے تو وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ فرعون کے جادوگر

1۔ تفسیر خازن مع حاشیہ بغوی، جلد 1 صفحہ 74 مطبوعہ مکتبہ التجاریہ مصر 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 129 مطبوعہ دار الفکر بیروت
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ محی الدین شیخ زادہ، جلد 2 صفحہ 195 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 129 مطبوعہ دار الفکر بیروت

کافر تھے مگر پھر بھی ان کی توبہ قبول کی گئی تھی(1)۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کا جادو کو کفر سے تعبیر کرنا اس ارشاد باری کی طرح ہے: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (حالانکہ سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے ہی کفر کیا، سکھایا کرتے تھے لوگوں کو جادو) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس نے اس کا سودا کیا اس کے لئے آخرت میں (رحمت الٰہی سے) کوئی حصہ نہیں اور بہت بری ہے وہ چیز بیچا ہے انہوں نے جس کے عوض اپنی جانوں کو، کاش! وہ کچھ جانتے)۔ یہ تمام ارشاد دلیل ہیں کہ جادو کے الفاظ اور اعمال تمام کے تمام کفر کا موجب ہیں اور ایمان کی شرائط کے منافی ہیں۔ ہونا بھی اسی طرح چاہئے کہ شیطان انسان سے کفر سے نیچے راضی ہی نہیں ہوتا اور اس کا قرب اس کے بغیر متصور ہی نہیں ہے، اور شیطان کی تسخیر کفر کے بغیر ہوتی ہی نہیں ہے نعوذ باللہ منہ۔ امام شافعی اور شیخ ابو منصور کے اقوال احتمال عقلی پر مبنی ہیں (یعنی ہو سکتا ہے جادو کوئی ایسا بھی ہو جو کفر نہ ہو)۔

فائدہ: یہ جان لو کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو سیف (تلوار) دعا یا اسماء جلالیہ سے قتل کرے جس کا قتل حلال نہیں تھا، یا اس کی کوئی مالی یا بدنی نعمت سلب کرلے۔ وہ اگرچہ کافر نہیں مگر وہ فاسق یقینی ہے اور اس کا حکم ڈاکو ون والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا (اور جو لوگ دل دکھاتے ہیں مومن مردوں اور مومن عورتوں کا بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی (معیوب) کام کیا ہو تو انہوں نے اٹھالیا (اپنے سر پر) بہتان باندھنے اور کھلے گناہ کا بوجھ) اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ (متفق علیہ)(2)۔ اسی قبیل سے بلعم بن باعور کی موسیٰ علیہ السلام کے لئے بددعا کرنا ہے، اس کا قصہ ان شاء اللہ سورۂ اعراف میں وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا الآیۃ کی تفسیر میں آئے گا۔

یہ اس کا عطف السحر پر یا ما تتلوا پر ہے، معطوف اور معطوف علیہ کا مفہوم ایک ہے۔ عطف تغایر اعتباری کی وجہ سے ہے یا یہ کوئی دوسری نوع ہے جو پہلی سے زیادہ قوی ہے، ببابل ظرف ہے یا ملکین سے حال ہے یا انزل کی ضمیر سے حال ہے۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں بابل کوفہ کی زمین ہے(3) بعض نے فرمایا یہ دماوند کا پہاڑ ہے۔ یہ دلیل ہے کہ جادو بھی علوم آسمانیہ میں سے ہے جو انسانوں کی آزمائش کے لئے اتارا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہدایت دینے والی اور گمراہ کرنے والی ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ وہ ماموربہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کے ذریعے انسانوں کو آزمایا، جو بدبخت تھا اس نے جادو کو ان فرشتوں سے سیکھا اور اللہ تعالیٰ سے کفر کیا اور جو سعادت مند تھا اس نے اسے نہ سیکھا اور ایمان پر ثابت قدم رہا۔ فرشتے جادو کے بطلان کو بیان بھی کرتے تھے کہ یہ چیز بری ہے اور اس سے اجتناب کرو، واللہ اعلم۔ بعض علماء فرماتے ہیں ما نافیہ ہے۔ یہود کہتے تھے کہ جادو آسمانی علوم میں سے ہے جو فرشتوں پر نازل ہوا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہود کا رد کرتے ہوئے فرمایا وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ۔ یہ عطف ہے وما کفر سلیمان پر۔ اس معنی کی صورت میں ببابل، يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ کے متعلق ہوگا۔

ھٰ پہلی تقدیر کی صورت میں یہ ملکین سے عطف بیان ہوگا جیسا کہ ظاہر ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ شیاطین سے بدل بعض ہے، جبکہ ما کو نافیہ بنایا جائے۔

1۔ روح المعانی، جلد 1 صفحہ 339 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 12، حدیث نمبر 65، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 132 مطبوعہ دار الفکر بیروت

9۔ اس کے فاعل ضمیر کا مرجع ہاروت و ماروت ہیں۔ من احدٍ: میں من زائدہ ہے، احداً مفعول ہے، یعنی وہ فرشتے نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش اور امتحان ہیں۔ عطاء اور سدی کہتے ہیں اگر کوئی شخص اس جادو کے سیکھنے کا اصرار کرتا تو اسے فرشتے کہتے اس راکھ پر پیشاب کر، جب وہ پیشاب کرتا تو اس سے ایک نور نکلتا جو آسمان کی طرف بلند ہو جاتا۔ یہ اس کا ایمان اور معرفت (نور عرفان) ہوتا تھا۔ دھوئیں کی مانند کوئی سیاہ چیز نیچے آتی جو اس کے کانوں کے ذریعے اندر داخل ہو جاتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا غضب ہوتا تھا(1)۔ ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ دوسری تقدیر پر معنی یہ ہوگا کہ وہ اسے نہیں سکھاتے تھے مگر اسے بتا دیتے کہ ہم آزمائش میں ڈالے گئے ہیں، تم ہماری طرح نہ ہو جاؤ۔ میں کہتا ہوں یہ قول نصیحت ہے شیطان کا کسی کو نصیحت کرنا بعید ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے پہلے قول کو ظاہر قول کہا تھا۔ فیتعلمون کے فعل کی ھم ضمیر کا مرجع احد ہے۔ منھما میں ھما ضمیر سے مراد ہاروت و ماروت ہیں اور یہ جملہ ایک مقدر کلام پر معطوف ہے جس کی تقدیر یہ ہے فَیَأْبُوْنَ فَیَتَعَلَّمُوْنَ۔ یا یہ یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ پر معطوف ہے یعنی وہ ان کو سکھاتے تھے اور یہ سیکھتے تھے۔

10۔ یعنی اس جادو کے ذریعے وہ میاں بیوی کے درمیان نفرت پیدا کر دیتے تھے۔ وماھم میں ھم ضمیر سے جادوگر یا شیاطین مراد ہیں۔ بضارین بہ میں ہ کا مرجع سحر ہے۔ من احدٍ میں من زائدہ ہے۔

11۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی قضا، قدرت اور مشیت کے بغیر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ تمام کے تمام اسباب، ظاہری اور عادی بالذات غیر مؤثر اسباب ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی یہ عادت مطہرہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو اسباب کے پائے جانے کے وقت تاثیر پیدا فرما دیتا ہے۔

12۔ اس کلام میں اشارہ ہے کہ ایسے علوم جو نفع بخش نہیں ہیں ان کا سیکھنا مکروہ ہے جیسے علوم طبعیہ اور علوم ریاضی وغیرہ۔ کیونکہ ان میں وقت کا ضیاع ہے، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ یہ دعا مانگتے تھے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لَّا یَنْفَعُ: اے اللہ میں ایسے علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نفع مند نہیں ہے۔ اس حدیث کو حاکم نے مستدرک میں ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔(2)

فائدہ: ۔ علم غیر نافع کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو کسی شخص کے لئے بھی فائدہ بخش نہیں ہے یعنی اس سے انتفاع متصور ہی نہیں ہے جیسے علوم طبعیہ وغیرہ۔ دوسری قسم وہ ہے جس سے عالم نفع نہیں اٹھاتا جب وہ اس پر عمل نہیں کرتا۔ وہ علوم جو نقصان دہ ہیں ان کی حرمت میں ذرا شک نہیں ہے جیسے سحر، شعبدہ اور الٰہیات فلاسفہ۔ مگر جب ان علوم کے سیکھنے میں نیت نیک ہو تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔

علامہ بغوی نے ابن عباس، الکلبی اور قتادہ سے ہاروت و ماروت کا قصہ نقل کیا ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ ملائکہ جب بنی آدم کے برے اعمال کو آسمان کی طرف چڑھتے ہوئے دیکھتے تو فرشتے انسانوں کو طعن کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر میں تمہیں بھی زمین پر اتاروں اور تمہیں بھی انہیں استعدادات اور قوتوں سے مرکب کروں جن سے میں نے انہیں مرکب کیا ہے تو تم بھی ایسے ہی افعال کا ارتکاب کرو گے، فرشتے کہنے لگے اے اللہ! پاک ہے تیری ذات، یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم تیری نافرمانی کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا تم اپنے میں سے چند نیک فرشتے منتخب کرو، پس فرشتوں نے ہاروت و ماروت اور عزرائیل کو منتخب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں شہوت پیدا فرما دی اور انہیں زمین پر اتار دیا پھر انہیں حکم دیا کہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کرنا۔ شرک، قتل، زنا اور شراب نوشی سے اجتناب کرنا۔ عزرائیل کے دل میں شہوت پیدا ہوئی تو انہوں نے فوراً توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سوال کیا کہ مجھے آسمان کی طرف اٹھا لے۔ اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 132 مطبوعہ دار الفکر بیروت

2۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 717 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ وہ چالیس سال سجدہ میں پڑے رہے۔ اب بھی ندامت کی وجہ سے سر نہیں اٹھاتے۔ دوسرے دونوں لوگوں کے درمیان دن کے وقت فیصلے کرتے رہتے اور شام کو اسم اعظم پڑھ کر آسمان کی طرف بلند ہو جاتے۔ ایک مہینہ نہیں گزرا تھا کہ آزمائش کی گھڑی آپہنچی۔ وہ اس طرح کہ زہرہ نامی ایک عورت اور اس کے خاوند کا جھگڑا ان کے سامنے پیش ہوا اور یہ زہرہ اہل فارس کی ملکہ تھی اور انتہائی خوبصورت تھی۔ فرشتے اسے دیکھتے ہی اس پر عاشق ہو گئے اور اسے مطلب براری کے لئے پھسلانا شروع کیا۔ اس نے ان کی خواہش پوری کرنے کے لئے یہ شرائط عائد کر دیں کہ بت کی پوجا کرو، اس کے خاوند کو قتل کرو اور شراب پیو۔ اس عورت نے انہیں پہلے شراب پیش کی تو انہوں نے شراب پی لی، پھر زنا کیا، زنا کرتے اس کے خاوند نے انہیں دیکھ لیا، انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے زہرہ کو مسخ کر کے شہاب بنا دیا۔ جب شام ہوئی تو ہاروت و ماروت نے گناہ کے ارتکاب کے بعد آسمان کی طرف بلند ہونا چاہا تو ان کے پر ان کی مدد کرنے سے عاجز تھے۔ دونوں حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس دوڑے ہوئے آئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سفارش کرنے کے لئے عرض کی۔ پس حضرت ادریس علیہ السلام کی سفارش پر اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا اور آخرت کے عذاب میں اختیار دیا، تو انہوں نے دنیا کے عذاب کو اختیار کیا کیونکہ یہ ختم ہونے والا ہے[1] چنانچہ اب تک وہ بابل میں ایک آگ کے کنویں میں لٹکے ہوئے ہیں۔ ابن راہویہ اور ابن مردویہ نے حضرت علی سے حضور ﷺ کا یہ ارشاد روایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ زہرہ پر لعنت کرے، اس نے دو فرشتوں ہاروت و ماروت کو آزمائش میں ڈالا تھا۔

یہ قصہ اخبار آحاد میں سے ہے بلکہ روایات ضعیفہ شاذہ میں سے ہے۔ قرآن حکیم میں اس قسم کے قصہ کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔ بعض روایات جو اس قصہ کے متعلق وارد ہیں اُن میں کچھ ایسی باتیں بھی موجود ہیں جن کا عقل اور نقل دونوں انکار کرتے ہیں۔ مثلاً ربیع بن انس سے مروی ہے کہ زہرہ کو اللہ تعالیٰ نے مسخ کر کے ستارہ بنا دیا اور وہ اسم اعظم سیکھ کر آسمان پر چڑھ گئی اور فرشتے آسمان کی طرف بلند نہ ہو سکے، حالانکہ وہی فرشتے زہرہ کو اسم اعظم سکھانے والے تھے۔ دوسرا یہ کہ معصیت کے ارتکاب میں زہرہ اور فرشتے برابر تھے، بلکہ فرشتوں کا کفر زہرہ کے کفر سے کم تھا کیونکہ انہوں نے تو یہ تمام کارروائی نشہ کی حالت میں کی تھی (اور زہرہ اس سارے حادثہ کی اصل تھی۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ فرشتے تو عذاب میں مبتلا کئے جائیں اور زہرہ آسمان پر چڑھ جائے)۔ محمد بن یوسف الصالحی سبیل الرشاد میں لکھتے ہیں کہ شیخ کمال الدین نے فرمایا ہے کہ ائمہ نقل نے اس قصہ کو صحیح قرار نہیں دیا اور حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے اس کی روایت کو ثابت نہیں کیا۔ العاصی نے لکھا ہے کہ اس قصہ کے متعلق حضور نبی کریم ﷺ سے نہ تو صحیح اور نہ کوئی سقیم روایت مروی ہے۔ یہ یہود کا افتراء اور من گھڑت قصہ ہے۔ الصالحی فرماتے ہیں مفسرین نے اس آیت کی یہ تاویل ذکر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو فرشتوں کے ذریعے آزمایا کیونکہ جادو کا دور دورہ تھا، جادو اور معجزہ میں فرق بھی انہیں نظر نہیں آتا تو اسی فرق کو واضح کرنے کے لئے دو فرشتے نازل فرمائے جو لوگوں کو جادو کی حقیقت سکھاتے اور اس کے معاملہ کی وضاحت کرتے تھے تاکہ لوگ جادو، معجزہ اور کرامات کے درمیان فرق کر سکیں۔ جو بھی ان فرشتوں کے پاس جادو سیکھنے آتا تو وہ دونوں اسے اس کے انجام سے ڈراتے اور اسے بتاتے کہ ہم جادو کی تعلیم دینے کے لئے بطور امتحان و آزمائش اتارے گئے ہیں۔ پس جو معجزہ اور جادو کے درمیان فرق کرنے اور جادو سے بچنے کے لئے سیکھتا تو وہ پسندیدہ اور مقبول ہوتا اور جو کسی دوسرے مقصد کے لئے سیکھتا تو وہ اسے کفر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 130-131 مطبوعہ دارالفکر بیروت

تک پہنچا دیتا۔ اسی وجہ سے فرشتے پہلے ہی کہہ دیتے کہ ہم تو نری آزمائش ہیں، تم کفر نہ کرو پھر اسے بتاتے کہ جب جادوگر اس طرح کا عمل کرتا ہے تو میاں، بیوی کے درمیان جدائی پیدا ہو جاتی ہے، اس تاویل پر فرشتوں کا عمل عین اطاعتِ الٰہی ہوگا اور فرشتوں کی عصمت کے منافی نہ ہوگا، امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ قصہ یہود کا بیان کردہ ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بزرگوں کے رموز سے ہو اور اس کا حل ارباب بصیرت پر مخفی نہیں (1)۔

میں کہتا ہوں اس کا حل اس طرح ہے کہ ملکین سے مراد قلب وروح اور دوسرے عالمِ امر کے لطائف ہیں۔ صرف دو کا ذکر فرمایا حالانکہ یہ پانچ ہیں صرف ان کا متعدد ہونا بیان کرنا مقصود ہے، معین تعداد کا بیان مقصود نہیں ہے، یا اس لئے صرف دو کا ذکر کیا کیونکہ اکثر سالکین پر صرف دو لطائف قلب اور روح ہی منکشف ہوتے ہیں۔ پس جو منکشف ہوا اس کا ذکر فرما دیا۔ اور اس عورت سے مراد وہ نفس ہے جو عناصر سے پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح عورت نے فرشتوں کو گناہ پر آمادہ کیا۔ اس طرح یہ نفس بھی انسان کو برائی کا حکم کرتا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے لطائفِ عالمِ امر کو نفس کے ساتھ ملا دیا اور ان کے درمیان آپس میں محبت فرما دی تو وہ دونوں لطائف نفس پر عاشق ہو گئے اور اپنے خالق کے ارشاد کو بھول گئے اور وہ لطائف اسی تاریک قالب میں اوندھے اور محبوس کر دیے گئے جو آگ سے بھرا ہوا ہے۔ بابل میں آگ سے بھرے ہوئے کنویں سے یہی مراد ہے، پھر جب انسان مر جائے گا اور قیامت قائم ہوگی اگر اس میں کچھ نورِ ایمان باقی ہوگا تو اسے اس قید سے رحمتِ الٰہی نجات عطا فرمائے گی پس وہ نفس جو نیک آدمی کے قالب میں ہوگا۔ عالمِ امر کے لطاف کی مجاورت اور ریاضاتِ ماموره پر عمل کرنے اور اسمِ اعظم کے ذکر کرنے کی وجہ سے آسمان کی طرف بلند ہوگا اور یوں روشن ہوگا جیسے چمکتا ہوا سفید ستارہ حتیٰ کہ یہ ارشاد ہوگا: ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ اے نفس مطمئنہ واپس چلو اپنے رب کی طرف۔ اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی، پس شامل ہو جاؤ میرے (خاص) بندوں میں اور داخل ہو جاؤ میری جنت میں۔ اگرچہ ہدایت سے پہلے نفس ابتداء میں خبیث اور شریر تھا لیکن قوتِ استعدادیہ جو اس کی خاکدان میں رکھی گئی ہے اس کی وجہ سے وہ تمام عالمِ امر کے لطائف پر فوقیت لے گیا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو دورِ جاہلیت میں بہتر تھے دورِ اسلام میں بھی بہتر ہیں جب وہ دین کی سمجھ حاصل کریں۔ اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔(2)

[3] یقیناً یہود کو علم تھا کہ جس نے اللہ کی کتاب کے عوض شیطانوں کی کتابوں اور باتوں کو لیا ہے ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ لمن اشتراه میں لام ابتدائیہ ہے اس وجہ سے علموا کو عمل سے معلق کر دیا ہے (یعنی لفظاً عامل نہیں مگر معنی اس کا مفعول ہے)۔

[4] لو کا جواب محذوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہی ہے۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ پہلے تاکید قسمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودی جانتے ہیں پھر آخر میں فرمایا کاش وہ اس حقیقت کو سمجھتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ بعض علماء فرماتے ہیں چونکہ انہوں نے اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کیا۔ اس لئے فرمایا گویا انہیں علم ہی نہیں ہے، بعض علماء فرماتے ہیں: جس علم کا ثبوت ہے وہ فطری علم اور اجمالی علم ہے جو کسی فعل کے قبیح ہونے اور سزا کے مرتب ہونے کا ہر کسی کو ہوتا ہے اور جس علم کی نفی کی گئی ہے وہ حقیقتہً عذاب کے لاحق ہونے کا علم ہے۔ میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہے جس کا تعلق ظاہر قلب کے ساتھ ہوتا ہے، وہ عمل کا تقاضا

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 248 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2378، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

نہیں کرتا۔ یہودیوں کا علم اسی قبیل سے تھا۔ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وہ (نبی کریم) ﷺ کو جانتے تھے جیسے وہ اپنے بیٹوں کو جانتے تھے۔ لیکن اس معرفت نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔ ان کی مثال قرآن حکیم نے خود بیان فرمائی ہے: كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ان (یہود) کی مثال ایسے ہے جیسے گدھا کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ دوسرا علم وہ ہے جو دل کو روشن کرنے کے بعد دل کی گہرائیوں میں پہنچ جائے پھر نفس کا احاطہ کر لے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا کا یہی معنی ہے، اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ يُحِبُّهُمْ اَهْلُ السَّمَاءِ وَيَسْتَغْفِرُ لَهُمُ الْحِيْتَانُ فِي الْبَحْرِ اِذَا مَا تُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ(1)۔ علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں، ان سے آسمان والے محبت کرتے ہیں، قیامت تک ان کے مرنے کے بعد ان کے لئے سمندر کی مچھلیاں استغفار کرتی رہیں گی۔ اس حدیث کو ابن النجار نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ان دونوں علموں کی طرف نبی کریم ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے: بہترین لوگ نیک علماء ہیں اور بدترین لوگ بد علماء ہیں(2)۔ اس حدیث کو دارمی نے احواص بن حکیم سے روایت کیا ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو دل میں ہوتا ہے، وہ علم نافع ہے۔ ایک زبان کا علم ہے، وہ ابن آدم پر اللہ کی حجت ہے۔ اس حدیث کو بھی دارمی نے روایت کیا ہے۔(3)

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

"اور اگر وہ ایمان لاتے[1] اور پرہیزگار بنتے تو (اس کا) ثواب[2] اللہ کے ہاں بہت اچھا ہوتا[3] کاش وہ کچھ جانتے[4]"

1۔ اور اگر وہ محمد ﷺ اور قرآن پر ایمان لاتے گناہوں اور جادو کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچتے۔

2۔ مثوبة کو نکرہ ذکر فرما کر یہ اشارہ کیا کہ تھوڑا سا ثواب بھی دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ جزاء کو ثواب اور مثوبة کہا گیا ہے، کیونکہ نیکی کرنے والا بدلہ اور ثواب کی طرف لوٹتا ہے۔

3۔ یہ لو کا جواب ہے، اصل میں لَاُثِيْبُوْا مَثُوْبَةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّمَّا شَرَوْا اَنْفُسَهُمْ تھا۔ یا اسی مفہوم کی کوئی اور عبارت بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں فعل کو حذف کیا گیا اور کلام کو جملہ اسمیہ کی شکل میں رکھا گیا تاکہ بدلہ کے ثبات اور استمرار پر دلالت کرے، اور مفضل علیہ کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ مفضل اتنا عظیم ہے کہ کوئی چیز ان کی طرف منسوب ہی نہیں کی جا سکتی۔ یہ عموم کے لئے ہے اور تخصیص نہ کر کے ہر چیز سے فضیلت ظاہر کرنا مقصود ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ لو تمنی کے لئے ہے اور لمثوبة علیحدہ کلام ہے۔

4۔ کاش وہ جان لیتے کہ اللہ تعالیٰ کا ثواب بہتر ہے، اس لو کے بارے میں بھی علماء نے سابقہ لو کی طرح کلام کی ہے۔

ابن المنذر نے نقل کیا ہے کہ مسلمان کہتے رَاعِنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اور مراعاۃ سے اشتقاق کرتے مطلب یہ ہوتا: یا رسول اللہ ﷺ ہماری کلام سننے کے لئے ہماری رعایت فرمائیں(4)۔ یہ کہا جاتا ہے رَاعٰى اِلَى الشَّيْءِ وَاَرْعَاهُ وَرَاعَاهُ، جب کوئی شخص غور سے کسی بات کو سنے۔ یا صحابہ کرام کے اس لفظ کا معنی یہ ہوتا کہ حضور ﷺ اپنے ارشادات آہستہ آہستہ بیان فرمائیں تاکہ ہم پوری طرح سمجھ لیں الرعی کا معنی ہے کسی کی مصلحت کے لئے اس کی حفاظت کرنا مگر یہودی زبان میں یہ قبیح گالی کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ بعض نے

1۔ کنز العمال، حدیث نمبر 1679 مطبوعہ مکتبہ التراث الاسلامی
2۔ سنن دارمی، جلد 187 (تقدیم و تاخیر کے ساتھ) مطبوعہ دار المحاسن قاہرہ
3۔ سنن دارمی، جلد 1 صفحہ 86 مطبوعہ دار المحاسن قاہرہ
4۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 196

لکھا ہے کہ ان کی لغت میں اس کا معنی یہ ہے سنو تم کبھی نہ سنو۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی یا احمق ہے اور رعونت سے مشتق کرتے۔ یہود نے صحابہ کرام سے یہ کلمہ سنا تو انہوں نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے گالی کی نیت سے حضور ﷺ کو اسی کلمہ سے خطاب کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر آپس میں اس پر ہنستے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت فرمائے۔ حضرت سعد بن معاذ ان کی اس خباثت کو سمجھ گئے۔ فرمایا آئندہ اگر اس کلمہ سے میں نے تمہیں حضور ﷺ کو خطاب کرتے سنا تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ یہود کہنے لگے آپ لوگ بھی تو یہی کلمہ کہتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

"اے ایمان والو (میرے حبیب سے کلام کرتے وقت) مت کہا کرو راعنا بلکہ کہو انظرنا [1] اور (ان کی بات پہلے ہی) غور سے سنا کرو [2] اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے [3]"

[1] اے ایمان والو تم راعنا نہ کہا کرو بلکہ انظرنا کہا کرو۔ جس کا مطلب ہے حضور ہماری طرف نظر عنایت فرمایئے، ہماری گزارش سماعت فرمایئے یا ہمارا انتظار فرمایئے، تھوڑا توقف فرمایئے تاکہ ہم آپ کا کلام سمجھ لیں۔

[2] جن احکام کا تمہیں حکم دیا جائے انہیں غور سے سنو اور اطاعت کیا کرو یا یہ معنی ہے کہ تم پہلے ہی ہمہ تن گوش ہو کر سنا کرو تاکہ تمہیں رعایت طلب کرنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔

[3] کافرین سے یہود مراد ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بری نیت سے راعنا کہا تھا۔ (اللہ تعالیٰ یہود پر لعنت کرے)۔ یہاں الیم بمعنی مولم ہے دردناک عذاب ہے۔

مسلمان اپنے یہود حلیفوں سے کہتے کہ تم محمد ﷺ پر صدق دل سے ایمان لے آؤ تو وہ کہتے تم ہمیں جس دین کی طرف بلاتے ہو وہ ہمارے دین سے اگر بہتر ہوتا تو ہم ضرور اسے پسند کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

"نہیں پسند کرتے [1] وہ لوگ جو کافر ہیں اہل کتاب سے اور نہ مشرک کہ اتاری جائے تم پر کچھ بھلائی تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص فرما لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا فضل (فرمانے) والا ہے [2]"

[1] ود کا مطلب کسی چیز کی تمنا کے ساتھ اس سے محبت کرنا ہے۔ اس لئے یہ محبت اور تمنا ہر ایک معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ من بیانیہ ہے اور لا زائدہ ہے۔ اہل کتاب پر اس کا عطف ہے۔

[2] یہ یود کا مفعول ہے۔ پہلا من زائدہ استغراق کے لئے ہے اور دوسرا ابتداء کے لئے ہے اور خیر سے مراد وحی ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ تم سے حسد کرتے ہیں اور یہ پسند نہیں کرتے کہ تم پر وحی کا نزول ہو۔ اس آیت میں رحمت سے مراد نبوت ہے۔ ابتداءً احسان

کرنے کو فضل کہتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ بغیر کسی وجہ کے جسے چاہتا ہے منصب نبوت عطا فرمادیتا ہے۔

جب مشرکین نے کہا کہ محمد ﷺ اپنے صحابہ کو پہلے ایک حکم دیتے ہیں پھر اس سے روک دیتے ہیں اور اس کے مخالف حکم دے دیتے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ اپنی طرف سے بیان کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۰۶﴾

"جو آیت ہم منسوخ کر دیتے [1] ہیں یا فراموش کرا دیتے ہیں [2] تو لاتے ہیں (دوسری) بہتر اس سے یا (کم از کم) اس جیسی کیا تجھے علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے۔"

[1] من بیانیہ ہے۔ نسخ کے دو معانی ہیں: (1) نقل کرنا اور کسی چیز کا تبدیل کرنا اور پھیرنا، اسی سے نسخ الکتاب ہے، یعنی کتاب کو نقل کرنا۔ (2) انتہا دینا اور زائل کرنا، کہا جاتا ہے نسخت الشمس الظل سورج نے سایہ کو زائل کر دیا۔ یہاں دوسرا معنی مراد ہے۔ حقیقت میں نسخ کا معنی کسی آیت کی قرأت کی انتہاء کو بیان کرنا ہے جبکہ اس کا حکم باقی رہے جیسے آیت رجم یا اس آیت کے حکم کی انتہاء بیان کرنا جبکہ اس کی قرأت باقی رہے جیسے قریبی رشتہ داروں کی وصیت کی آیت اور وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو چکا ہو اس کی عدت ایک سال بیان کرنے والی آیت۔ یا قرأت اور حکم دونوں کی انتہاء بیان کرنا جیسے کہا جاتا ہے کہ سورۂ احزاب سورۂ بقرہ کی طرح طویل تھی مگر اس کے اکثر حصہ کی تلاوت اور اس کا حکم اٹھا لیا گیا۔ پھر بعض منسوخ احکام ایسے ہوتے ہیں جن کے قائم مقام دوسرے احکام عطا کئے جاتے ہیں جیسے قریبی رشتہ داروں کے لئے وصیت کی آیت منسوخ ہوئی تو آیت میراث اس کی ناسخ آ گئی۔ اسی طرح وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو چکا ہو اس کی عدت ایک سال ایک آیت نے بیان کی تھی پھر وہ چار ماہ دس دن والی آیت کے ساتھ منسوخ ہو گئی۔ کچھ منسوخ احکام ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا قائم مقام نہیں آتا جیسے عورتوں کا امتحان۔ نسخ اوامر اور نواہی کو لاحق ہوتا ہے، اخبار میں نسخ جاری نہیں ہوتا۔ جمہور علماء نے ننسخ کو نون اور سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی نسخ بمعنی رفع سے مشتق کیا ہے مگر ابن عامر نے نون کے ضمہ اور سین کے کسرہ سے باب افعال الانساخ سے مشتق کیا ہے۔ یعنی ہم تجھے یا جبرئیل کو ان کے منسوخ کرنے کا حکم دیتے ہیں یا وجدان کے خاصہ کا اعتبار کرتے ہوئے مطلب یہ ہو گا کہ ہم انہیں منسوخ پاتے ہیں، ما شرطیہ جازمہ ہے جو ننسخ کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

[2] ابن کثیر اور ابو عمرو نے نون کے فتح، سین اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے، نساء سے مشتق کیا ہے جس کا مطلب ہو گا کہ ہم ان کو مؤخر کرتے ہیں یعنی ہم ان کے احکام کو باقی رکھتے ہیں اور تلاوت کو اٹھا لیتے ہیں جیسے آیت رجم کے ساتھ کیا۔ اس صورت میں پہلا نسخ بمعنی رفع التلاوۃ والحکم ہو گا یعنی تلاوت اور حکم دونوں کو ہم اٹھا دیتے ہیں۔ یا یہ معنی ہو گا کہ ہم اسے لوح محفوظ میں مؤخر کرتے ہیں یعنی آپ پر نازل نہیں کرتے۔ اس صورت میں نسخ کا معنی انزال کے بعد اٹھانا ہو گا اور نساء کا معنی بالکل نازل نہ کرنا ہو گا۔ باقی قراء نے ننسها کو نون کے ضمہ اور سین کے کسرہ سے الانساء اور نسیان سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ نسیان کا معنی حفظ کی ضد ہے، مطلب یہ ہو گا کہ ہم آپ کے دل سے ان احکام و آیات کو محو کر دیتے ہیں۔ حضرت ابی امامہ بن سہل بن حنیف سے مروی ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت نے رات کو ایک سورت پڑھنے کا ارادہ کیا مگر سوائے بسم اللہ کے کسی کو کچھ بھی یاد نہ تھا۔ صبح یہ واقعہ بارگاہ رسالت میں پیش کیا

گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس سورت کی تلاوت اور احکام اٹھا لئے گئے ہیں (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے متروک ہے ہم فراموش کر دیتے ہیں جیسے ارشاد ہے نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (انہوں نے اللہ تعالیٰ کو فراموش کیا تو اللہ نے انہیں فراموش کر دیا) لیکن نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ کے ارشاد کے ساتھ یہ معنی درست نہیں لگتا۔ کیونکہ یہ ارشاد اس کے ازالہ پر دلالت کرتا ہے۔

۳؎ ہم اس کے بدلہ میں بندوں کے نفع کے اعتبار سے بہتر لاتے ہیں، یا اس کے بدلے آسان حکم لاتے ہیں، یا ثواب کے اعتبار سے بہتر لاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک آیت دوسری آیت سے بہتر ہوتی ہے کیونکہ تمام کا تمام اللہ کا کلام ہے اور سارے کا سارا بہتر ہے۔

۴؎ یہ استفہام تقریری ہے مطلب یہ کہ آپ جانتے ہیں۔ بعض علماء نے اس آیت کریمہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ بغیر بدل کے یا بدل کا حکم مشکل ہو یا سنت کے ساتھ کتاب کا نسخ ہو، یہ سب جائز نہیں ہیں۔ مگر ان کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ کسی منسوخ کا بدل نہ ہونا بھی خیر ہوتا ہے۔ اسی طرح مشکل بدل ثواب کے اعتبار سے بہتر ہوتا ہے۔ حدیث نبوی ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کیونکہ اس نے اپنے محبوب کو اس کی تعلیم دی ہے اس لئے حدیث سے قرآن کا نسخ ہو سکتا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

"کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی ۱؎ اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی یار و مددگار نہیں ۲؎ "

۱؎ زمین آسمان کی بادشاہی اسی کے پاس ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے، جو ارادہ فرماتا ہے اس کے مطابق حکم کرتا ہے۔ یہ جملہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کی دلیل کی طرح ہے، دوسرا یہ نسخ کے جواز کی بھی دلیل ہے اسی وجہ سے درمیان میں حرف عطف ذکر نہیں فرمایا۔

۲؎ ولیّ کا معنی قریب ہے۔ ولی بھی مدد کرنے سے قاصر ہوتا ہے اور نصیر بھی منصور سے اجنبی ہوتا ہے۔ ولی اور نصیر کے درمیان عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن ابی حاتم نے سعید اور عکرمہ کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رافع بن حرملہ اور وہب بن زید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ہمارے پاس ایسی کتاب لائیں جو آپ ہم پر آسمان سے اتار لائیں جسے ہم پڑھیں یا ہمارے لئے زمین سے چشمے رواں کریں تاکہ ہم آپ کی اتباع کریں اور آپ کی تصدیق کریں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2)۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

"کیا تم (یہ) چاہتے ہو کہ پوچھو اپنے رسول سے ۱؎ (ایسے سوال) جیسے پوچھے گئے موسیٰ سے اس سے پہلے ۲؎ اور جو بدل لیتا ہے کفر کو ایمان سے وہ (قسمت کا مارا) تو بھٹک گیا سیدھے راستے سے ۳؎ "

۱؎ امام بغوی فرماتے ہیں یہ یہود کے حق میں نازل ہوئی جب انہوں نے آپ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ تم بھی ایک مرتبہ اکٹھی کتاب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 136 مطبوعہ دار الفکر بیروت 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 201 (العلمیہ)

ہمارے پاس لاؤ جیسے موسیٰ علیہ السلام لائے تھے(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مشرکین کے حق میں نازل ہوئی۔ جب انہوں نے کہا تھا: لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ (بلکہ ہم تو اس پر بھی ایمان نہ لائیں گے کہ آپ آسمان پر چڑھیں یہاں تک کہ اتار لائیں ہم پر ایک کتاب جسے ہم پڑھیں)ابن جریر نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ قریش نے محمد ﷺ سے سوال کیا کہ صفا پہاڑ کو ہمارے لئے سونا بنا دو۔ آپ ﷺ نے فرمایا ٹھیک ہے اور یہ تمہارے لئے بنی اسرائیل کے دستر خوان کی طرح ہوگا اگر تم نے ناشکری کی۔ یہ سن کر انہوں نے اپنے مطالبہ سے رجوع کر لیا۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(2)۔ اسی طرح بغوی نے لکھا ہے کہ انہوں نے یہ مطالبہ کیا تھا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے......... حتیٰ کہ آپ اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں کو (بے نقاب کر کے) ہمارے سامنے لے آئیں)(3)۔ السدی نے ابو عالیہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کاش ہمارے کفارات بھی بنی اسرائیل کے کفارات کی طرح ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں عطا فرمایا ہے وہ بہتر ہے۔ بنو اسرائیل کے کسی شخص سے اگر کوئی غلطی سرزد ہوتی تو وہ غلطی اور اس کا کفارہ اس کے دروازے پر لکھا جاتا تھا۔ اگر وہ کفارہ ادا کرتا تو اس کے لئے دنیا میں رسوائی ہوتی اور اگر کفارہ ادا نہ کرتا تو آخرت میں رسوائی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس سے بہتر عطا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (جو شخص کر بیٹھے برا کام یا ظلم کرے اپنے آپ پر پھر مغفرت مانگے اللہ تعالیٰ سے تو پائے گا اللہ تعالیٰ کو بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا)۔ پھر پانچ نمازیں اور جمعہ سے اگلے جمعہ تک درمیان میں جو گناہ ہوتے ہیں یہ نمازیں اور جمعہ کفارہ بن جاتے ہیں و پس اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ پر یہ آیت نازل فرمائی(4)۔ ام منقطعہ ہے اور اس کا معنی بل اتریدون ہے اور مراد سوال نہ کرنے کی وصیت ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ام بمعنی ہمزہ ہے یعنی اتریدون اور ام زائدہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی بَلْ تُرِيْدُوْنَ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ام متصل ہو جو دو جملوں کے درمیان تسویہ کے لئے جملہ پر داخل ہوا ہو اور اس ہمزہ پر معطوف ہو جو الم تعلم کے ارشاد میں گزر چکا ہے۔ اور یہاں اگرچہ خطاب خصوصیت کے ساتھ نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن مراد آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت اجابت یا امت دعوت ہے کیونکہ ارشاد ہے وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ اور خطاب صرف نبی کریم ﷺ کو کرنے میں یہ حکمت ہے کہ آپ ﷺ تمام افراد انسان سے زیادہ عالم ہیں اور تمام لوگوں کے علم کا مبدا آپ ﷺ کی ذات اطہر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی اَلَمْ تَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یعنی کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے آسمان اور زمین کی بادشاہی اور وہ تمام اشیاء پر قادر ہے، حکم دیتا ہے اپنی منشا کے مطابق اور منع کرتا ہے اپنی حکمت بالغہ کے باعث جیسے چاہتا ہے۔ یا تم جانتے ہو یہ کچھ، اور پھر سوال کرنے کی جرأت کرتے ہو جیسا کہ یہود نے موسیٰ علیہ السلام پر اپنی تجویزیں اور سوالات پیش کئے تھے۔ یہ معنی تب درست ہوگا جب ان دونوں آیتوں کا نزول یکبارگی ایک واقعہ کے متعلق ہو۔ لیکن شان نزول کے اختلاف کی صورت میں یہ معنی درست نہ ہوگا۔ کسائی نے ام متصلہ بنانے سے منع کیا ہے اور فرمایا ام متصلہ کی نشانی یہ ہے کہ اس کے بعد مفرد ہوتا ہے اور منقطعہ کی علامت یہ ہے کہ اس کے بعد جملہ ہوتا ہے۔

کے موسیٰ علیہ السلام سے قوم نے یہ سوال کیا تھا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (ہمیں اللہ تعالیٰ دکھا ظاہر)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 137 (الفکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 201 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 137 مطبوعہ دار الفکر بیروت
4۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 201 (العلمیہ)

۳؎ یعنی جس نے ایمان کے بدلے کفر کو چاہا۔ یعنی آیات بینات پر اعتماد و یقین نہ کیا اور ان کے بارے شکوک وشبہات میں مبتلا ہوا اور اپنی طرف سے تجاویز پیش کیں تو وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔ مطلب یہ ہے کہ بے جا سوال نہ کرو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔

امام بغوی لکھتے ہیں یہود کے ایک گروہ نے حذیفہ بن الیمان اور عمار بن یاسر کو جنگ احد کے بعد کہا اگر تم حق پر ہوتے تو تمہیں کبھی شکست کا سامنا نہ کرنا پڑتا اس لئے تم دونوں ہمارے دین کی طرف لوٹ آؤ کیونکہ ہم تم سے زیادہ ہدایت کے راستہ پر ہیں۔ تو یہ مندرجہ ذیل آیت کریمہ نازل ہوئی۔(1)

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾

"دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب[1] کہ کسی طرح پھیر[2] کر بنا دیں تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر (ان کی یہ آرزو) بوجہ اس حسد کے ہے جو ان کے دلوں میں ہے[3] (یہ سب کچھ) اس کے بعد جبکہ خوب واضح ہو چکا ہے ان پر حق[4] پس (اے غلامان مصطفیٰ) معاف کرتے رہو اور درگزر کرتے رہو[5] یہاں تک کہ بھیج دے اللہ (ان کے بارے میں) اپنا حکم[6] بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے[7]"

۱؎ ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ حیی اور ابو یاسر بن اخطب یہودیوں کے بارے نازل ہوئی یہ دونوں یہودی عربوں سے بہت حسد کرتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے رسول کا شرف عطا فرمایا اور یہ دونوں افراد اپنی پوری صلاحیتیں صرف کرتے کہ لوگ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں۔(2)

۲؎ لو مصدریہ ہے معنی میں اِنْ کے قائم مقام ہوتا ہے لیکن عمل میں نہیں۔ یہ وَدَّ کا مفعول ہے یا یہ لیت کے معنی میں ہے اور کفار کی خواہش کا بیان اور حکایت ہے۔ کفاراً مخاطبین کی ضمیر سے حال ہے، حسداً: یہ وَدَّ کی علت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی یحسدونکم حسداً۔

۳؎ من عند انفسھم وَدَّ کے متعلق ہے یعنی ان کی یہ خواہش ان کے خبث باطن سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ حکم نہیں دیا ہے یا یہ حسداً کے متعلق ہے یعنی ایسا حسد جو ان کے باطن سے پیدا ہوا ہے۔

۴؎ حق سے مراد معجزات اور تورات میں آپ کی مذکورہ صفات ہیں۔

۵؎ یہ حکم کفار سے جنگ کرنے کے حکم سے پہلے کا ہے۔

۶؎ وہ امر قتال کی اجازت، ٹیکس (جزیہ) لگانا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قریظہ کا قتل اور بنی نضیر کا جلاوطن کرنا ہے۔

۷؎ اللہ تعالیٰ ان سے انتقام لینے پر قادر ہے۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 82، مطبوعہ مکتبہ التجاریہ مصر
2۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 201

اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

"اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ [1] اور جو کچھ آگے بھیجو گے اپنے لئے نیکیوں سے ضرور پاؤ گے اس کا ثمر اللہ کے ہاں یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب دیکھ رہا ہے [2]"

[1] اس کا عطف فاعفوا پر ہے یعنی ان کو چھوڑ دو اور تم عبادت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھک کر ان کی مخالفت کرو۔

[2] نماز، روزہ اور اس کے علاوہ نیکیوں میں سے جو کچھ تم آگے بھیجو گے تو اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پاؤ گے وہ ہمہ بین اور ہمہ داں سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾

"انہوں نے کہا نہیں داخل ہوگا جنت میں (کوئی بھی) بغیر ان کے جو یہودی ہیں یا عیسائی [1] یہ ان کی من گھڑت باتیں ہیں [2] آپ (انہیں) فرمائیے لاؤ اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو [3]"

[1] قالوا کا فاعل یہود و نصاریٰ ہیں جو اہل کتاب ہیں۔ سامع کی فہم پر اعتماد کرتے ہوئے دونوں فریقوں کے قولوں کو اکٹھا ذکر کیا گیا۔ یعنی یہود نے کہا جنت میں کوئی داخل نہ ہوگا سوائے یہود کے اور یہودیت کے سوا کوئی دین نہیں ہے۔ نصاریٰ نے کہا جنت میں صرف نصرانی داخل ہوں گے اور نصرانیت کے سوا کوئی دین نہیں ہے۔ جب نجران کے نصرانیوں کا وفد رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں یہود سے ملا تو وہ ایک دوسرے کی تکذیب کرنے لگے۔ فراء کہتے ہیں ھودا بمعنی یھوذا ہے یاء زائدہ کو حذف کیا گیا ہے۔ الاخفش کہتے ہیں ھود جمع ہے ھاد کی جیسے عود جمع ہے عائد کی۔ کان کے اسم کے لئے ضمیر واحد اور خبر جمع ذکر کی گئی ہے۔ اس میں لفظ کا اعتبار کیا ہے اور خبر میں معنی کا اعتبار کیا ہے۔

[2] یعنی ان کی یہ خواہش کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے بھلائی نہ ہو اس پر یہ ارشادات مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ دلیل ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے سوا کوئی دوسرا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ یا مضاف یہاں محذوف ہے ای اَمْثَالُ تِلْكَ الْاُمْنِيَّةِ ان خواہشوں کی امثال۔ یعنی جنت میں صرف وہی داخل ہوں گے۔ امانی سے مراد باطل شہوات و خواہشات ہیں۔ یہ امنیۃ کی جمع ہے۔ اس کا وزن افعولۃ ہے اور یہ التمنی سے مشتق ہے جیسے اُضْحُوْكَةٌ، اُعْجُوْبَةٌ اور تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ کا جملہ معترضہ ہے۔

[3] یہ اصل میں اٰتُوْا ہے۔ ہمزہ کو ھاء سے بدلا گیا ہے۔ یعنی دخول جنت تمہارے ساتھ خاص ہے تو دلیل پیش کرو۔ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو، کیونکہ کسی مستقبل کے امر کا دعویٰ بغیر دلیل کے باطل اور جھوٹا ہوتا ہے۔ اس شرط کا جواب محذوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہی ہے۔

بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

"ہاں[1] جس نے بھی جھکا دیا اپنے آپ کو اللہ کے لئے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس کے لئے اس کا اجر ہے[2] اپنے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے"

[1] یعنی جو انہوں نے کہا ایسا نہیں بلکہ جس نے اپنے نفس کو جھکا دیا یا جس نے ہر کام سے اللہ کی رضا کا ارادہ کیا یعنی وہ اخلاص کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کرتا ہو گویا اس کی یہ کیفیت ہو کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ احسان کی تفسیر میں متفق علیہ حدیث گزر چکی ہے جس میں جبرئیل کی تعلیم کا ذکر ہے۔

[2] یعنی اللہ تعالیٰ نے عمل پر جس ثواب کا وعدہ کیا ہے وہ اس کے رب کے پاس موجود ہے۔ یہ جملہ من کا جواب ہے اگر یہ شرطیہ ہو۔ اور اگر موصول بنایا جائے تو یہ جملہ خبر ہوگا۔ اور خبر پر فاء اس لئے ہے کہ مبتداء کے ضمن میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔ اور بلیٰ پر وقف ہوگا اور اس کے ساتھ ان کا رد مکمل ہوگا اگر من شرطیہ ہو۔ اور اسی طرح کا احتمال ہوگا اگر من موصول ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موصول اپنے صلہ کے ساتھ فعل محذوف کا فاعل ہو یعنی بلٰی یدخلها من اسلم۔ یعنی ہاں جو بھی اخلاص کے ساتھ عبادت کرے گا۔ اس ترکیب کی صورت میں فله اجره۔ علیحدہ جملہ ہوگا اور سابقہ جملوں پر معطوف ہوگا۔

ابن ابی حاتم نے سعید اور عکرمہ کے طریق سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب نجران کے نصرانیوں کا وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو یہود کے علماء بھی پہنچ گئے۔ یہ دونوں گروہ آپس میں لڑنے لگے۔ رافع بن حریملہ نے کہا تم کسی دین پر نہیں ہو اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کیا۔ پھر نصرانیوں کا ایک آدمی اٹھا اور اس نے کہا تم کسی دین پر نہیں ہو اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام اور تورات کی تکذیب شروع کر دی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔(1)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۗ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

"اور کہتے ہیں یہودی کہ نہیں ہیں عیسائی سیدھی راہ پر اور کہتے ہیں عیسائی نہیں ہیں یہودی سیدھی راہ[1] پر حالانکہ وہ سب پڑھتے ہیں (آسمانی) کتاب[2] اسی طرح کہی ان لوگوں نے جو کچھ نہیں جانتے ان کی سی بات[3] تو (اب) اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جن باتوں میں وہ جھگڑتے رہتے تھے[4]"

[1] یعنی کسی ایسے دین و مذہب پر نہیں جو صحیح ہو اور جو معتبر ہو۔

[2] یہ جملہ حال ہے۔ اور کتاب سے مراد تورات ہے (جس کی عیسیٰ علیہ السلام تصدیق کرتے تھے) اور انجیل ہے۔ یا انجیل مراد ہے (جس کی موسیٰ علیہ السلام تصدیق کرتے تھے) اور تورات۔

[3] یہ کہنے والے سب بے علم عرب کے مشرکین اور دوسرے بت پرست، مجوسی اور گزشتہ امتوں کے کفار ہیں۔ کیونکہ ہر طائفہ دوسرے طائفہ کو جھٹلاتا اگرچہ وہ حق پر ہوتے تھے۔

[4] یعنی ان دو فریقوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا۔ وہ بھی ان کی تکذیب کرے گا اور انہیں دوزخ میں

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 203 (العلمیہ)

داخل کرے گا اور اہل حق کی تصدیق کرے گا اور انہیں جنت میں داخل کرے گا۔

ابن جریر نے عبد الرحمن بن زید سے روایت کیا ہے کہ مشرکین مکہ نے جب نبی کریم ﷺ کو حدیبیہ کے روز روک لیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

"اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو روک دے اللہ کی مسجدوں سے کہ ذکر کیا جائے ان میں اس کے نام (پاک) [1] کا اور کوشاں ہو ان کی ویرانی میں [2] انہیں مناسب نہیں تھا کہ داخل ہوتے مسجدوں میں مگر ڈرتے ڈرتے [3] ان کے لئے دنیا میں (بھی بڑی) ذلت ہے اور ان کے لئے آخرت میں (بھی) بڑا عذاب ہے [4]"

[1] من استفہامیہ مبتدا ہے اور اظلم خبر ہے معنی یہ ہے۔ کہ کوئی زیادہ ظالم نہیں اس سے جو اللہ کی مسجدوں سے روکے۔ مساجد ذکر فرمایا حالانکہ جس مسجد سے روکا گیا تھا وہ صرف ایک تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکم عام ہے اگرچہ مورد خاص تھا۔ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ۔ یہ منع کا مفعول ثانی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ۔ اَنْ یُّذْکَرَ سے پہلے حرف جر محذوف ہے، اصل میں مِنْ اَنْ یُّذْکَرَ تھا۔ یا یہ علت کی وجہ سے منصوب ہے یعنی کَرَاهَةَ اَنْ یُّذْکَرَ۔

[2] یعنی جو اللہ کے ذکر سے منع کر کے انہیں خراب کرتا ہے۔ کیونکہ جب انہوں نے ان لوگوں کو منع کیا جو ذکر الٰہی سے انہیں آباد کرنا چاہتے تھے تو یقیناً انہوں نے اس مسجد کی خرابی کی کوشش کی۔ بغوی نے قتادہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ قتادہ اور سدی سے مروی ہے کہ مَنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ سے مراد طیطوس بن اسبیانوس رومی اور اس کے ساتھی ہیں۔ ان کو یہود کی دشمنی اور بغض نے بخت نصر البابلی المجوسی کی معاونت پر برانگیختہ کیا(2) تو انہوں نے یہود کے ساتھ جنگ کی، ان کو قتل کیا اور ان کی اولاد کو قیدی بنالیا۔ نیز انہوں نے تورات کو جلا دیا اور بیت المقدس کو ویران کر دیا، اس میں خنزیروں کو ذبح کیا اور اس میں مردار ڈال دیے۔ بیت المقدس نصاریٰ کے لئے مقام حج اور زیارت گاہ تھا میں کہتا ہوں۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن میں نصاریٰ کو عار دلانے کے لئے کیا ہے کہ ان کے آباء نے یہ فعل بد کیا تھا اور یہ اس پر خوش ہیں۔ جیسا کہ یہود کے بزرگوں سے جو کچھ (بچھڑے کی عبادت وغیرہ) افعال صادر ہوئے تھے ان کے ذکر سے مقصود موجودہ یہودیوں کو شرم دلانا ہے۔

[3] اللہ تعالیٰ کے علم اور قضاء میں تھا کہ وہ مساجد میں داخل نہ ہوں گے مگر ڈرتے ڈرتے۔ اس میں مومنین کے لئے نصرت اور ان بدبختوں سے مساجد کی خلاصی کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ پورا فرمایا جب مکہ مکرمہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے فتح کیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا تھا کہ منادی کر دو کہ اس کے بعد بیت اللہ کا کوئی مشرک حج نہ کرے(3)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں روم فتح ہوا اور اس وقت بیت المقدس ویران و تباہ پڑا تھا۔ مسلمانوں نے اس کو نئے سرے سے بنایا اور صاف و آباد کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ خبر کا صیغہ ہے مگر مراد امر یا نہی ہے یعنی ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ان مشرکوں میں سے کوئی بھی مساجد میں داخل نہ

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 204 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 142 (الفکر) 3۔ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 84، (التجاریہ)

ہو کر ڈرتے ہوئے کہ کہیں قتل نہ ہو جاؤں اور قیدی نہ بن جاؤں۔ یا یہ معنی کہ انہیں مساجد میں دخول کی قدرت ہی نہ دو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے لئے مناسب نہیں تھا کہ وہ مساجد میں داخل ہوں مگر خشوع و خضوع کے ساتھ، چہ جائیکہ وہ ان کی خرابی کا سامان مہیا کریں۔ اس معنی کے اعتبار سے یہ جملہ منع اور سعی کے فاعل سے حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا۔

۲؎ یعنی قتل و قید اور ٹیکس کی ذلت سے دنیا میں دوچار ہوں گے اور آخرت میں دائمی آگ کے سزاوار ہوں گے کیونکہ انہوں نے کفر کیا اور ظلم کیا۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

"اور مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی ۱؎ سو جدھر بھی تم رخ کرو وہیں ذات خداوندی ہے ۲؎ بیشک اللہ تعالیٰ فراخ رحمت والا خوب جاننے والا ہے ۳؎"

۱؎ پوری زمین یعنی اس کا مشرق و مغرب ملک اور تخلیق کے اعتبار سے اللہ کے لئے ہے اور مخلوقات کا ہر جلوہ اس کے وجود کا مظہر ہے اور اس کے نور کا عکس ہے۔ وہی زمین و آسمان کا نور ہے اور تمام اشیاء کا مالک ہے۔ کوئی جگہ اس کے تصرف سے باہر نہیں۔ قبلہ کا حکم امر تعبدی ہے اور تکلیف طاقت کے مطابق دی جاتی ہے۔ پس جب تم دشمن کی وجہ سے فرائض میں قبلہ شریف کی طرف منہ نہ کر سکو یا قبلہ تم پر مشتبہ ہو جائے اور تم اس میں تحری کر لو اور پھر بھی غلطی کر جاؤ (تو تمہاری نماز قبول کی جائے گی) یا سفر میں سواریوں سے اتر کر اور چلنے سے رک کر نوافل کو پڑھنے میں تنگی محسوس کرو تو اس نے فرائض کے حکم سے نوافل کے لئے آسانی فرما دی ہے (جدھر تمہاری سواری کا رخ ہو نفل پڑھ لو)

۲؎ اینما اسم شرط ہے اور تولوا اس کی وجہ سے مجزوم ہے اور فثم وَجْهُ اللّٰهِ جزاء ہے، یعنی جس جہت میں بھی تم اپنے چہرے اس طرف کر لو وہ تمہارے لئے جہت مامورہ ہے یعنی قبلہ ہے۔ حضرت حسن، مجاہد، قتادہ اور مقاتل سے اسی طرح مروی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وجہ اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت متشابہات سے ہے جیسے ارشاد ہے۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ، وَيَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔ مسلم، ترمذی اور نسائی نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سواری کے اوپر نفلی نماز ادا فرماتے خواہ اس کا منہ کسی سمت بھی ہوتا۔ خواہ وہ مکہ سے مدینہ کی طرف سفر کر رہے ہوتے۔ پھر حضرت ابن عمر نے یہ آیت پڑھی وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (1)۔ حاکم نے روایت کیا ہے کہ اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کی آیت نازل ہوئی تاکہ آپ نفلی نماز ادا فرمائیں خواہ آپ ﷺ کی سواری کا منہ کسی جانب بھی ہو۔ امام حاکم فرماتے ہیں یہ حدیث مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس آیت کا نزول تحویل قبلہ کے وقت ہوا۔ جب انہوں نے کہا تھا مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا اس حدیث کی سند قوی ہے۔ میں کہتا ہوں پہلی حدیث سنداً اور معنیً صحیح ہے کیونکہ ان کے اس اعتراض (مَا وَلّٰىهُمْ) کا جواب یہ آیا تھا: قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ اس آیت کے شان نزول کے متعلق اور بھی روایات ضعیفہ موجود ہیں۔ ایک ان میں سے حدیث ربیعہ ہے جسے ترمذی، ابن ماجہ اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ راوی فرماتے ہیں ہم ایک تاریک رات میں نبی کریم ﷺ کی معیت میں سفر کر رہے تھے کہ ہمیں قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو سکی ہر شخص نے اپنے گمان کے مطابق نماز

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، حدیث نمبر 295، (العلمیہ)

پڑھ لی۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے یہ واقعہ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں پیش کیا اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(1)۔ دار قطنی اور بیہقی نے حضرت جابر کی حدیث نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک لشکر روانہ فرمایا اس میں میں بھی شامل تھا۔ دوران سفر تاریکی میں ہم نے نماز پڑھی۔ تاریکی اتنی تھی کہ قبلہ کی سمت ہمیں معلوم نہ ہو سکی۔ راوی فرماتے ہیں تمام نے نماز پڑھ کر سمت پر لکیریں لگالیں جب صبح کو دیکھا تو وہ لکیریں غلط سمت پر تھیں۔ جب ہم سفر سے واپس آئے تو ہم نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔ پس اسی وقت اللہ تعالیٰ نے لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ کا ارشاد نازل فرمایا(2)۔ ابن مردویہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ سخت قسم کی کہر (دھند) چھا گئی جس کی وجہ سے قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو سکی۔ ایک روایت یہ بھی ہے جو ابن جریر نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ جب اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ (مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا) کا ارشاد نازل ہوا تو پوچھا کس تو طرف ہے تو یہ آیت نازل ہوئی(3)۔

؎ اپنے نور سے اس نے تمام اشیاء کا خواہ وہ مشرق میں ہے خواہ وہ مغرب میں ہے تمام کا احاطہ کیا ہوا ہے لیکن یہ احاطہ غیر متکیف ہے جس کی حقیقت کا ادراک نہیں ہو سکتا حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کی حقیقت میں فرمایا یہ وسعت ذاتیہ ہے جو بلا کیف ہے اس کی حقیقت کا ادراک نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بندوں کے عذروں اور ان کی مصلحتوں کو جاننے والا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

"اور یہ کہتے ہیں کہ بنالیا ہے اللہ نے (اپنا) ایک بیٹا ل پاک ہے وہ ؎ (اس تہمت سے) بلکہ اسی کی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور زمین ؎ میں سب اسی کے فرمانبردار ہیں ؎"

ل یہ آیت کریمہ مدینہ کے یہود، نصاریٰ اور مشرکین کی تردید میں نازل ہوئی۔ انہوں نے عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہا اور نجران کے نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بیٹا کہا مشرکین عرب نے ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہا۔ ابن عامر نے واؤ کے بغیر قالوا پڑھا ہے اس اعتبار سے کہ یہ نئی کلام اور دوسرا واقعہ ہے اور جمہور نے قالت الیہود یا منع یا اظلم کے مفہوم پر عطف کرتے ہوئے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔

؎ یہ اصل میں اُسَبِّحُهٗ سُبْحَانًا ہے یعنی میں اس کی پاکی بیان کرتا ہوں اور اس کو ہر نقص سے پاک سمجھتا ہوں کیونکہ تولید تشبہ اور تجزی کا تقاضا کرتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابن آدم نے مجھے جھٹلایا حالانکہ اس کی طرف سے یہ نہیں ہونا چاہئے تھا اور اس نے مجھے گالی دی حالانکہ یہ اس کی طرف سے نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ میں اس کو دوبارہ پہلی کیفیت پر لوٹانے پر قادر نہیں ہوں اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ میرا بیٹا ہے حالانکہ میری ذات پاک ہے اس سے کہ میں بیوی یا بیٹا بناؤں(4)۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے حضرت ابوہریرہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اس میں ہے کہ اس کا میری تکذیب کرنا یہ ہے کہ کہتا ہے کہ وہ دوبارہ نہیں لوٹائے گا جیسے اس نے مجھے ابتداءً

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 120 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 271 (محاسن) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 143 (فکر)
4۔ صحیح بخاری: 4212 (ابن کثیر)

پیدا کیا تھا حالانکہ اعادہ سے ابتداء آسان نہیں۔ اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے اللہ نے بیٹا بنایا حالانکہ میں احد، الصمد ہوں، میں نے نہ کسی کو جنا ہے اور نہ جنا گیا ہوں اور نہ میرا کوئی ہمسر ہے۔

۳ بلکہ تخلیق وملکیت آسمانوں اور زمین میں اسی کی ہے، پھر تو الد کیسے متصور ہو سکتا ہے کیونکہ مخلوق ممکن جو اپنے وجود میں بھی غیر کی محتاج ہے اور ہلاک وفنا ہونے والی ہے، اس کے درمیان اور خالق وواجب، غنی، قیوم اور وہ جس کا وجود ذاتی ہے اس کے درمیان مجانست کیسے ہو سکتی ہے۔

۴ یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس کی توحید کی شہادت دیتا ہے اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے کیونکہ ممکن یہ گواہی دیتا ہے کہ وہ عبد ہے اور محتاج ہے اس خالق وواجب کا جس کا مقابل ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے: وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل:44) (اس کائنات میں) کوئی بھی ایسی چیز نہیں مگر وہ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اس کی حمد کرتے ہوئے کائنات کی اشیاء کی تسبیح وتہلیل اور شہادت کو صرف ارباب قلوب اپنے قلوب کے مشاعر سے جانتے ہیں جن کے ذریعے ان کی حیات کا ادراک ہوتا ہے، یا ان کی تسبیح کے مشاعر سے جانتے ہیں جن کے ذریعے ان کی حیات کا ادراک ہوتا ہے، یا ان کی تسبیح کو ارباب عقول جانتے ہیں جو ان کی ذوات اور احتیاج سے استدلال کرتے ہیں قنوت کا اصل معنی قیام ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اَفْضَلُ الصَّلٰوۃِ طُوْلُ الْقُنُوْتِ(۱)۔ افضل نماز وہ ہے جس میں قیام طویل ہو، اس حدیث کو مسلم، احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ یا قانتون کا معنی ہے کہ وہ اطاعت کرنے والے ہیں۔ حضرت امام احمد نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ قرآن کے ہر حرف میں قنوت کا ذکر ہے اور وہ طاعت ہے۔ میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام اشیاء اس کی مشیت اور تکوین سے انحراف نہیں کرتیں۔ اور جس کی یہ شان ہو وہ واجب کی ہم جنس کیسے ہو سکتی ہے۔ پہلے اشیاء کا ذکر ما کے ساتھ فرمایا کیونکہ غیر ذوی العقول بھی شامل تھے اور پھر قانتون ذکر فرمایا ذوی العقول کو غلبہ دیتے ہوئے۔ یا اس لئے کہ جب غیر ذوالعقول کے لئے ارباب عقول کی ہیئت پر طاعت ثابت ہے تو ان کی جمع ذوی العقول کے قاعدے پر ذکر فرمادی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام، عزیر علیہ السلام اور ملائکہ کو الٰہ تصور کیا ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے طاعت شعار اور اس کی عبودیت کا اظہار واقرار کرنے والے ہیں تو یہ حجت کے قیام کے بعد الزام کے طور پر ہے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

"موجد ہے آسمانوں اور زمین کا ۱ اور جب ارادہ فرماتا ۲ ہے کسی کام کا تو صرف اتنا حکم دیتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے ۳"

۱ یعنی وہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا اور ایجاد کرنے والا ہے اور وہ جس طرح آسمانوں اور زمین میں ہر چیز کا خالق ہے اسی طرح وہ ہر چیز کا مالک ہے، یا اس کا معنی ہے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔

۲ القضاء کا اصل معنی الفراغ ہے اور اس کا اطلاق کسی چیز کے اتمام پر ہوتا ہے، خواہ وہ قولاً ہو جیسے فرمایا وَقَضٰى رَبُّكَ یا فعلاً ہو جیسے فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔ اور اس کا اطلاق کسی چیز کے وجود کے متعلق ارادہ الٰہیہ کا اس حیثیت سے متعلق ہونے پر بھی ہوتا کہ وہ

1۔ صحیح مسلم:164 (علیہ)

چیز پائی جائے۔

کن یہاں کان تامہ ہے کیونکہ اس کی خبر نہیں ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ حکم فرماتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ رہا اس شی کا صفت سے موصوف ہونا تو اس آیت میں اس کی کوئی دلالت نہیں ہے۔ جمہور نے تمام مقامات پر یقول پر عطف یا مستقل کلام ہونے کے اعتبار سے یکون کو مرفوع پڑھا ہے۔ ابن عامر نے تمام مقامات پر منصوب پڑھا ہے سوائے سورۂ آل عمران کے، وہاں کُنْ فَيَكُوْنُ الْحَقُّ پڑھا ہے اور اسی طرح سورۂ انعام میں بھی كُنْ فَيَكُوْنُ قَوْلُهُ الْحَقُّ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور ابن عامر نصب اس لئے پڑھتے ہیں کہ جواب امر میں فاء کے بعد اَنْ مضمر ہے۔ یہاں چند اہم ابحاث علماء نے ذکر کی ہیں۔ 1۔ معدوم چیز کو خطاب جائز نہیں ہے لیکن یہاں معدوم چیز کو خطاب ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جب اس چیز کے وجود کو مقدر مانا گیا تو وہ موجود کی طرح ہو گئی اس لئے خطاب کرنا صحیح ہے۔ ابن انباری فرماتے ہیں انما یقول له کا معنی ہے لِاَجْلِ تَكْوِيْنِهٖ۔ اس صورت میں خطاب کا معنی بھی باقی نہیں رہے گا (1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں کن سے مراد امر و امتثال کی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ تمثیل ہے، جس چیز کے ساتھ ارادہ الٰہیہ متعلق ہوتا ہے، وہ بغیر کسی مہلت اور تاخیر کے حاصل ہو جاتی ہے جیسے ایک مطیع و مامور بلا توقف پیروی و اطاعت کرتا ہے۔ اس میں ابداع کے معنی کا ثبوت ہے (2)۔ یکون کو اَنْ مقدرہ کے ساتھ نصب دینا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ امر اپنے معنی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ فاء کے بعد ان مقدر کرنا تب صحیح ہو سکتا ہے جب وہ اپنے معنی میں استعمال ہو، حالانکہ آپ نے خود کہا ہے کہ یہ اپنے معنی میں نہیں بلکہ مراد کے حصول کی سرعت پر دلالت کرنے کے لئے ہے تو پھر نصب کیسے متصور ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جواب امر کو نصب فاء کے ذریعے ظاہر لفظ کے اعتبار سے ہے، اگرچہ معنی ایسا نہیں ہے۔ اَنْ مقدرہ کی شرائط میں سے ہے کہ فاء کا ماقبل اس کے مابعد کے لئے سبب ہو۔ اور اس وقت ممکن کے لئے دو کون (وجود) لازم آئیں گے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ کونِ اول سے مراد مجازاً وجوب ہے اور مسبب کا اطلاق سبب پر کیا گیا ہے کیونکہ ممکن جب تک اس کا وجوب نہ ہو وہ نہیں پایا جاتا پس تقدیر یوں ہوگی لِيَكُنْ وُجُوْبُ ذٰلِكَ الشَّيْءِ مَوْجُوْدَةً (یعنی اس شیء کا وجوب موجود ہونا چاہئے۔) میں کہتا ہوں اس کا جواب اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ کونین سے مراد ان کا دار العمل میں کونِ سبب ہے اور دار الجزاء میں کونِ مسبب ہے لیکن یہ تاویل حکم کو مکلفین کے ساتھ مختص کرنے کا تقاضا کرتی ہے حالانکہ آیت کا سیاق عموم کا تقاضا کرتی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کے جواب میں کہا جائے کہ کونین سے مراد اس کا وجود علمی کے ساتھ اعیانِ ثابتہ کے مرتبہ میں ہونا ہے اور وجود ظلی کے ساتھ خارج ظلی میں ہونا ہے، روسا صوفیاء نے اسی طرح کہا ہے۔ اس سے اعیانِ ثابتہ کے مرتبہ میں ہونے سے حدوثِ زمانی لازم نہیں آتا بلکہ حدوث ذاتی لازم آتا ہے۔ اس تاویل پر یہ آیت توحید شہودی پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے نہ کہ توحید وجودی پر دلالت کرتی ہے۔ جیسا کہ شیخ اکبر محی الدین العربی قدس سرہ نے لکھا ہے کہ ممکنات نے خارج میں وجود کی بو بھی نہیں سونگھی و اللہ اعلم۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

"اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے کہ کیوں نہیں کلام کرتا ہمارے ساتھ (خود) اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 142 (فکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 2 صفحہ 254 (علمیہ)

کوئی نشانی 1؎ اسی طرح کہی تھی ان لوگوں نے جو ان سے پہلے (گزرے) تھے ان کی سی (بے سروپا) 2؎ بات ملتے جلتے ہیں ان سب کے دل 3؎ بیشک ہم نے صاف صاف بیان کر دی ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لئے جو یقین رکھتے ہیں 4؎ ''

1؎ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ان سے مراد یہود ہیں (1) ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں رافع بن حرملہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا اگر آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں جیسا کہ آپ خود کہتے تو اللہ تعالیٰ سے کہو کہ وہ ہمارے ساتھ خود کلام کرے حتیٰ کہ ہم اس کی کلام کو سن لیں (2)۔ مجاہد کہتے ہیں ان سے مراد نصاریٰ ہیں (3)۔ ان دونوں فریقوں سے علم کی نفی ان کے تجاہل کی بناء پر کی گئی ہے قتادہ فرماتے ہیں ان بے علموں سے مراد مشرکین عرب میں سے امی اور ان پڑھ لوگ ہیں (4)۔

2؎ لولا بمعنی ھلاّ ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم میں ہر جگہ ھلاّ کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ میں اس معنی میں استعمال نہیں بلکہ یہاں فَلَوْلَمْ يَكُنْ کے معنی میں ہے۔ یعنی جیسے وہ ملائکہ سے کلام کرتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی تھی ہم سے ایسے خود کلام کیوں نہیں کرتا پس رسول کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ کیوں نہیں فرماتا کہ تم اس کے رسول ہو۔ یا کیوں نہیں کوئی ایسی نشانی آتی ہمارے پاس جو تمہاری سچائی پر حجت ہو۔ پہلی بات (لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ) انہوں نے تکبراً کہی تھی اور دوسری (اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ) عناد اور استہانت کی وجہ سے ان آیات کا انکار کرنے کے لئے کہی جو آپ ﷺ ان کے پاس لیکر آئے تھے۔

3؎ یعنی بالکل اسی طرح لایعنی گفتگو کی تھی یہود و نصاریٰ کے اسلاف نے ان کے قول کی مثل۔ انہوں نے کہا تھا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (اے موسیٰ) دکھاؤ ہمیں اللہ کھلم کھلا۔ اور کہا هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۔ (کیا یہ کر سکتا ہے تیرا رب کہ اتارے ہم پر ایک خوان آسمان سے)۔

4؎ اخلاف و اسلاف کے دل عناد اور ہٹ دھرمی میں متشابہ ہیں۔ ہم نے صاف صاف بیان کر دی ہیں اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو اس چیز کا یقین طلب کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں یقین والوں کو خاص فرمایا ہے کیونکہ آیات کا فائدہ صرف انہی کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ ان لوگوں کو جو سرکشی اور عناد کی بناء پر جھگڑا کرتے ہیں۔

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾

'' بیشک ہم نے بھیجا ہے آپ کو (اے حبیب) حق کے ساتھ (رحمت کی) خوشخبری دینے والا (عذاب سے) ڈرانے والا 1؎ اور آپ سے باز پرس نہ ہوگی 2؎ ان دوزخیوں کے متعلق 3؎ ''

1؎ ہم نے آپ کو حق کی تائید کے ساتھ بھیجا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حق سے مراد قرآن ہے (5) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ (اس آیت میں حق قرآن کے لئے استعمال ہوا ہے)۔

2؎ نافع اور یعقوب نے لا تَسْـَٔلْ کو نہی معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے نفی مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 145 (فکر) 2۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 208 (علمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 145 (فکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 145 (فکر) 5۔ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 86 (تجاریہ)

سے جحیم بہت بڑی آگ ہے۔ جمہور کی قرأت کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ آپ سے نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ ایمان کیوں نہ لائے۔ آپ پر تو صرف تبلیغ کی ذمہ داری ہے حساب ہمارے ذمہ ہے، نافع کی قرأت میں سوال سے نہی کفار کی سزا کے شدید ہونے سے کنایہ ہے (یعنی کفار کی سزا کتنی سخت ہوگی یہ نہ پوچھ) جیسے کہا جاتا ہے، فلاں کے شر کے متعلق نہ پوچھ وہ تو حساب سے بہت اوپر ہے۔ یا یہ مطلب کہ وہ عذاب بڑا سخت ہے اس کا سننا ہی برداشت سے باہر ہے۔ امام بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عطاء نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دن فرمایا کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میرے والدین کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(1)۔ عبدالرزاق فرماتے ہیں: مجھے الثوری نے موسیٰ بن عبیدہ سے اور انہوں نے محمد بن کعب القرظی سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے۔ ابن جریر نے ابن جریج کے طریق سے نقل کیا ہے کہ مجھے داؤد بن عاصم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کر کے یہی بتایا ہے اور دونوں نے اسی طرح شان نزول بیان کیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ پسندیدہ نہیں ہے اور نہ یہ قوی ہے۔ اگر یہ صحیح بھی ہو تو یہ ابن عباس کا گمان ہوگا کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا بھی جائے کہ آپ ﷺ نے ایسا فرمایا تھا کہ میرے والدین کے ساتھ کیا ہوا کاش مجھے علم ہوتا۔ اور اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ تو پھر بھی اس میں یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ اصحاب جحیم سے مراد آپ ﷺ کے والدین کریمین ہیں اور بر تقدیر تسلیم بھی یہ آیت آپ ﷺ کے والدین کے کفر پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ مومن کبھی اپنے بعض گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے اصحاب جحیم میں سے ہوتا ہے لیکن کسی شافع کی شفاعت کی وجہ سے اس کی مغفرت ہو جاتی ہے یا اس کے علاوہ کسی وجہ سے اس کی بخشش ہو جاتی ہے یا لکھا ہوا اپنی مدت کو پہنچ جاتا ہے پھر اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ سے صحت کے ساتھ مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اولاد آدم کے سب قرنوں میں بہترین اور افضل قرن میں پیدا کیا گیا(2)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا دو حصوں میں جب بھی لوگ تقسیم ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ان میں سے بہتر میں رکھا پس میں اپنے والدین کے ہاں پیدا ہوا۔ مجھے زمانہ جاہلیت کی کوئی چیز نہیں پہنچی، میں نکاح سے پیدا ہوا۔ آدم علیہ السلام سے لیکر اپنے والدین تک سفاح کے ذریعے منتقل نہیں ہوا۔ میں تم سے از روئے نفس بھی بہتر ہوں اور از روئے آباؤ واجداد کے بھی۔ امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث اور ابو نعیم نے دلائل النبوت میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث اسی طرح نقل کی ہے(3) حضرت امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے نبی کریم ﷺ کے آباء کے اسلام کے ثبوت میں رسائل لکھے ہیں۔ میں نے بھی ان رسائل سے استفادہ کر کے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں ایسی روایات نقل کی ہیں جن سے آپ ﷺ کے آباء کا اسلام ثابت ہوتا ہے، اور اس میں ان اعتراضات کے بھی شافی جوابات ہیں جو اس مسئلہ پر وارد ہیں۔ للہ الحمد (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں)۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾

''اور ہرگز خوش نہیں ہوں گے آپ سے یہودی اور نہ عیسائی یہاں تک کہ آپ پیروی کرنے لگیں ان کے دین کی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 146 (فکر) — 2۔ صحیح بخاری: 3384 (ابن کثیر) — 3۔ دلائل النبوۃ از بیہقی: 443 (العلمیہ)

آپ انہیں کہہ دیجئے کہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے [1] اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس علم کے بعد بھی جو آپ کے پاس آ چکا ہے (تو پھر) نہیں ہو گا آپ کے لئے اللہ (کی گرفت) سے بچانے والا کوئی یار اور نہ کوئی مددگار [2]"

[1] ملت سے مراد وہ طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اپنے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زبانوں کے ذریعے مقرر فرمایا ہے۔ یہ اَمْلَلْتُ الْكِتَابَ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے لکھوانا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہود اور نصاریٰ نے صلح کا سوال کیا اور یہ طمع دلائی کہ آپ مہلت دیں تو وہ ایمان لے آئیں گے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ الثعلبی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ مدینہ کے یہود اور نجران کے عیسائی اس وقت تک تو اس امید پر رہے جب تک آپ ان کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے لیکن جب قبلہ کعبہ کو بنایا گیا تو وہ مایوس ہو گئے (1) پس اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت کریمہ میں اہل کتاب کے ایمان لانے کی امید سے نبی کریم ﷺ کو مایوس کرنے کے لئے مبالغہ فرمایا ہے۔ یعنی وہ یہ ارادہ کرتے ہیں کہ آپ ان کے دین کی اتباع کریں (آپ نے تو کبھی ایسا کرنا نہیں ہے) تو پھر یہ آپ کی کیسے اتباع کریں گے۔ شاید انہوں نے اپنے دین کو ہدایت کا سرچشمہ کہا ہو اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو جواب کی تلقین فرماتے ہوئے فرمایا۔

[2] آپ کہہ دیجئے کہ حق دین اسلام ہے نہ کہ وہ جس کی طرف تم لوگ بلاتے ہیں۔

[3] ھواء ایسی رائے کو کہتے ہیں جو خواہش کے تابع ہو۔ علم سے مراد وحی یا وہ دین ہے جس کی صحت معروف اور معلوم ہو۔ یعنی بفرض محال اگر آپ پیروی کریں گے ان کی خواہشات کی تو تمہارا کوئی ایسا مددگار نہ ہو گا جو اللہ کی گرفت سے تمہیں بچا لے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٢١﴾

"جن کو ہم نے کتاب دی [1] وہ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں [2] وہی ایمان لاتے ہیں اس کے ساتھ اور جو کوئی انکار کرتا ہے اس کا تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں [3]"

[1] الکتاب سے مراد قرآن ہے۔ حضرت قتادہ اور حضرت عکرمہ فرماتے ہیں اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ سے مراد محمد ﷺ کے صحابہ ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں عام مومنین ہیں (2) یا اہل کتاب میں سے مومنین ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ اہل سفینہ والوں کے حق میں نازل ہوئی جو حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ آئے تھے۔ یہ کل چالیس افراد تھے، بتیس حبشہ کے تھے اور آٹھ شام کے راہب تھے۔ جن میں بحیرا بھی تھا۔ الضحاک فرماتے ہیں یہود میں سے جو ایمان لائے تھے وہ مراد ہیں ان میں (1) عبداللہ بن سلام، (2) سعید بن عمرو، (3) تمام بن یہودا، (4) اُسَید، (5) اَسَد جو کعب بن یامین کے بیٹے ہیں، (6) عبداللہ بن صوریا (3)۔ اس تقدیر پر اسم موصول عہدی ہو گا۔

[2] ہ ضمیر کا مرجع الکتاب ہے یعنی وہ اس کتاب حکیم کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں الفاظ کو تبدیلی سے بچا کر تجوید کے ساتھ صحیح مخارج کا لحاظ کرتے ہیں اور اس کے معنی میں غور و فکر کرتے ہیں اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ الکلبی کہتے ہیں ہ ضمیر کا مرجع محمد ﷺ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 147 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 148 (فکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 147 (فکر)

ہیں۔ اس تقدیر پر معنی یہ ہوگا کہ جب کوئی ان سے آپ ﷺ کے متعلق سوال کرتا ہے تو وہ آپ ﷺ کی صفات کو پورے جمال و کمال کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ (1) یا اس تقدیر پر ہے جب اسم موصول سے مراد اہل کتاب کے مومنین ہوں۔ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ حال مقدرہ ہے اور مابعد کلام خبر ہے یا یہ خبر ہے اور اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ دوسری خبر ہے۔ بِهٖ میں ہ ضمیر کا مرجع کتاب یا محمد ﷺ ہیں اور وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ میں ہ ضمیر کا مرجع کتاب ہے یعنی جو کتاب میں تحریف کر کے اس کا انکار کرتا ہے یا جو اس کی تصدیق کرتی ہے اس کا انکار کرتا ہے۔ یا محمد ﷺ کا انکار کرتے ہیں۔

ے چونکہ انہوں نے ایمان کے عوض کفر کو اختیار کیا ہے اس لئے وہ خسارہ پانے والے ہیں۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾

"اے بنی اسرائیل یاد کرو میری وہ نعمت جو میں نے تم پر فرمائی اور (خصوصاً یہ کہ) میں نے تم کو فضیلت دی (اس زمانہ کے سب لوگوں پر)"

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

"اور ڈرو اس دن سے کہ نہ بچا سکے گا کوئی آدمی کسی کے عوض اور نہ قبول کیا جائے گا اس سے مالی تاوان اور نہ نفع دے گی اسے کوئی سفارش اور نہ ہی ان کی امداد کی جائے گی ل"

ل بنی اسرائیل کے قصہ کی ابتداء نعمت کے ذکر، اس کے حقوق کی ادائیگی، نعمت کے ضیاع سے احتیاط، قیامت کے خوف اور اس کی ہولناکیوں کے بیان سے فرمائی تھی تو اب دوبارہ ذکر فرمایا اور انہی ابتدائی چیزوں کو ذکر فرما کر کلام کا اختتام فرمایا۔ اس اسلوب کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انہیں نصیحت کرنے میں مبالغہ مقصود ہے اور دوسری وجہ یہ کہ گویا یہ احکامات پورے قصہ کا نتیجہ اور مقصود ہیں۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

"اور یاد کرو جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں سے ل تو انہیں پورے طور پر بجا لایا ے اللہ (تعالیٰ) نے فرمایا بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا سے عرض کی میری اولاد سے بھی ہے فرمایا نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں تک ہے"

ل ہشام نے ابراہیم کو اس سورت میں ابراھام پڑھا ہے اور یہ اس سورت میں پندرہ مرتبہ آیا ہے۔ نساء میں تین مرتبہ آیا ہے اور آخری مقام پر ابراھام پڑھا ہے، سورۂ انعام میں آخری مرتبہ کو، سورۂ توبہ میں آخری دو کو، سورۂ ابراہیم میں ایک مقام پر، سورۂ نحل میں دو مقام پر، سورۂ مریم میں تین مقامات پر، عنکبوت میں ایک مقام پر، شوریٰ میں بھی ایک جگہ، ذاریات میں بھی ایک مقام پر، نجم میں بھی ایک جگہ پر، حدید میں بھی ایک جگہ پر اور ممتحنہ میں بھی ایک جگہ پر، ان کل تینتیس مقامات پر ہشام نے ابراھام پڑھا ہے اور پورے قرآن میں یہ لفظ انہتر مرتبہ آیا ہے۔ ابن ذکوان نے خاص سورۂ بقرہ میں دو طرح پڑھا ہے۔ باقی قراء نے تمام مقامات پر یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 148 (فکر)

الابتلاء کا اصل معنی کسی مشکل امر کا مکلف بنانا ہے۔ اور یہ البلاء سے مشتق ہے اور یہ آزمانے کو لازم ہے۔ اس لئے ابتلاء اور اختبار کو مترادف سمجھا گیا ہے، اور کلمات سے مراد کلمات کے مدلولات ہیں اور وہ اوامر و نواہی ہیں۔ حضرت عکرمہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ یہ تیس خصائل ہیں جو شرائع اسلام ہیں۔ کسی نے ان تمام خصائل پر مکمل طور پر عمل نہ کیا سوائے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے۔ اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے لئے براءت لکھ دی اور فرمایا وَ اِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤى (ابراہیم علیہ السلام جو پوری طرح احکام بجالائے)۔

ان خصائل میں سے دس کا ذکر سورۂ براءت میں ہے: اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآىِٕحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ توبہ کرنے والے، عبادت گزار، حمد کرنے والے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم کرنے والے، برائی سے روکنے والے، اللہ تعالیٰ کی حدود کی حفاظت کرنے والے، اور مومنین کو بشارت دو۔ اور دس خصائل سورۂ احزاب میں ہیں۔ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ سے وَّ الذّٰكِرٰتِ تک۔ ترجمہ: بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں، خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والیاں، اور کثرت سے اللہ کو یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں۔ اور دس خصائل سورۂ مومنون اور سائل میں ہیں۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے یُحَافِظُوْنَ تک پہلی نو آیتیں ہیں۔ (جن کا ترجمہ یہ ہے) بیشک دونوں جہاں میں بامراد ہو گئے ایمان والے، وہ ایمان والے جو اپنی نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں اور وہ جو ہر بیہودہ امر سے منہ پھیرے ہوتے ہیں اور وہ جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے اور ان کنیزوں کے جو ان کے ہاتھوں کی ملکیت ہیں تو بیشک انہیں ملامت نہ کی جائے گی اور جس نے خواہش کی ان دو کے ماسوا تو یہی لوگ حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے والے ہیں نیز وہ (مومن بامراد ہیں) جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی پاسداری کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی نمازوں کی پوری حفاظت کرتے ہیں۔(1)

سورۂ سائل میں ان خصلتوں کا ذکر آیت نمبر 23 سے آیت نمبر 34 تک ہے۔ (جن کا ترجمہ یہ ہے) جو اپنی نماز پر پابندی کرتے ہیں اور وہ جن کے مالوں میں مقررہ حق ہے سائل کے لئے اور محروم کے لئے اور جو تصدیق کرتے ہیں روز جزا کی اور جو اپنے رب کے عذاب سے ہمیشہ ڈرنے والے ہیں بے شک ان کے رب کا عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے یا اپنی کنیزوں کے تو ان پر کوئی ملامت نہیں البتہ جو خواہش کریں گے ان کے علاوہ تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی پاسداری کرتے ہیں اور جو لوگ اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں اور جو لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

طاؤس فرماتے ہیں جن دس چیزوں سے آزمایا تھا وہ فطرت ہیں پانچ کا تعلق سر سے ہے:۔ (1) مونچھوں کا کاٹنا، (2)۔ کلی کرنا، (3)۔ ناک صاف کرنا یعنی ناک میں پانی ڈالنا، (4)۔ مسواک کرنا، (5) مانگ نکالنا۔ اور پانچ کا تعلق بدن سے ہے۔ (1) ناخن کاٹنا،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 149 (فر)

(2) بغل کے بال اتارنا، (3)۔ زیر ناف بال صاف کرنا، (4) ختنہ کرنا، (5) پانی کے ساتھ استنجاء کرنا (1)۔ ربیع اور قتادہ نے فرمایا کلمات سے مراد مناسک حج ہیں (2) حضرت حسن نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سات اشیاء سے آزمایا:۔ (1) ستارا، (2) چاند، (3) سورج۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو بنظر غائر دیکھا تو جان لیا کہ میرا رب کریم ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا ہے اس پر زوال طاری نہیں ہوتا، (4) آگ۔ حضرت ابراہیم نے اس پر بھی صبر کیا، (5) ہجرت، (6) بیٹے کا ذبح کرنا، (7) ختنہ کرنا (3)۔

سعید بن جبیر فرماتے ہیں کلمات سے مراد حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا ہے جو انہوں نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کے وقت مانگی تھی رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا پس بیت اللہ شریف کو انہوں نے سبحان اللہ، الحمد للہ اور لا الہ الا اللہ واللہ اکبر سے بلند کیا تھا (4) یمان بن رباب کہتے ہیں کلمات سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم سے مناظرہ کرنا ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ سے وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ۔ بعض علماء نے فرمایا کلمات سے مراد یہ آیتیں ہیں۔ اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ (5)۔ بعض فرماتے ہیں کلمات سے مراد آگے آنے والی آیتوں کا مفہوم ہے۔ میں کہتا ہوں ان تمام اقوال کو جمع کرنا اولیٰ ہے اور کلمات سے مراد وہ تمام اوامر و نواہی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو آزمایا تھا پس تیس، دس اور سات تمام اس میں شامل ہیں۔

ے حضرت ابراہیم نے ان تمام کو مکمل طور پر ادا فرمایا اور ان کے پورے حقوق ادا فرمائے۔

ے قال فعل ہے اور اِنِّیْ جَاعِلُكَ ظرف مقدم اس کے متعلق ہے اور ماقبل پر معطوف ہے اور اگر ظرف اِذْ کو فعل محذوف کے متعلق ہو تو یہ جملہ مستانفہ ہوگا۔ گویا پوچھا گیا کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے ان کلمات کو مکمل کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا؟ تو اس جملہ کے ساتھ جواب دیا گیا۔ یا ابتلی کے قول کا بیان ہے۔ پس کلمات سے مراد امامت، تطہیر البیت، رفع قواعد اور اسلام ہے۔ جاعل یہ اس جعل سے مشتق ہے جس کے دو مفعول ہوتے ہیں۔ اور امامت سے مراد نبوت ہے یا اس سے اعم مفہوم ہے یعنی جس کی اقتداء کی جائے اور اس کی اطاعت واجب ہے۔ اس سے مراد سلطنت یا امامت بالمعنی الاخص نہیں ہے جو امامیہ نے اختراع کیا۔ شریعت اور لغت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو امامت عامہ عطا فرمائی تھی حتیٰ کہ سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فرمایا اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا۔

ے ومن ذُرِّيَّتِیْ یہ ک پر معطوف ہے۔ یعنی بعض ذریتی کے معنی میں ہے۔ ذریۃ انسان کی نسل کو کہتے ہیں فُعْلِيَّةٌ او فُعُّولَةٌ کا وزن ہے، تیسری راء کو یاء سے بدلا گیا ہے جیسے دہنیا میں ہوا ہے۔ یہ الذر سے مشتق جس کا معنی ہے التفرق (جدا جدا ہونا) یا یہ فعولہ یا فعلیۃ کے وزن پر الذرء سے مشتق ہے جس کا معنی الخلق ہے ہمزہ کو یاء سے بدلا گیا ہے۔

ے عہد سے مراد امامت ہے، حفص اور حمزہ نے یاء کے اسکان کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الظالمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو آپ کی اولاد میں سے ظالم ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا جواب دیا ہے اور اس عظمت کو متقین کے ساتھ خاص کیا ہے۔ ظالم سے مراد فاسق ہے اگر امامت سے مراد نبوت ہو کیونکہ عصمت نبوت میں شرط ہے اور اس پر اجماع ہے، یا الظالمین سے مراد کافر ہیں اگر امامت سے مراد نبوت سے عام مفہوم ہو یعنی جس کی اقتداء کی جائے کیونکہ کافر کو امیر بنانا یا مطاع بنانا جائز نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا، (اور ہرگز نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 149 (فکر) — 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 149 (فکر) — 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 149 (فکر)

4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 149 (فکر) — 5۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 149 (فکر)

بنانے گا اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مسلمانوں پر (غالب آنے کا) راستہ) ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (نہ کہنا ماننے ان میں سے کسی بدکار یا احسان فراموش کا) اگر ہم کہیں کہ امامت سے مراد مطاع ہونا ہے اور ظالم سے مراد فاسق تو اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ فاسق اگرچہ امیر بھی ہو تو ظلم اور معصیت میں اس کی اطاعت جائز نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔ خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہے (1) اس حدیث کو امام مالک اور احمد نے حضرت عمران اور الحکیم بن عمرو الغفاری سے روایت کیا ہے۔ امام بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مندرجہ ذیل الفاظ میں روایت کی ہے لَا طَاعَةَ لِاَحَدٍ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ (2) اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں ہے، اطاعت تو صرف نیکی میں ہے، اولوالامر کی اطاعت پر نصوص بھی وارد ہیں ارشاد ربانی ہے اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو (اپنے ذیشان) رسول کی اور حاکموں کی جو تم میں سے ہوں)۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے اِسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَلَوْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا كَاَنَّ رَاْسَهٗ زَبِيْبَةٌ (3) سنو اور اطاعت کرو اگرچہ امیر حبشی غلام بھی ہو اور اس کا سر چھوٹا سا بھی ہو۔ یہ حکم اس وقت تک ہے جبکہ ان امراء کا حکم شارع کے حکم کے مخالف نہ ہو۔ ارشاد ہے: فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ (پھر اگر جھگڑنے لگو تم کسی چیز میں تو لوٹا دو اسے اللہ اور (اپنے) رسول (کے فرمان) کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور روز قیامت پر)۔ اس آیت کریمہ میں روافض کے لئے اس بات پر کوئی حجت نہیں ہے کہ امامت میں عصمت شرط ہے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝

"اور یاد کرو جب ہم نے بنایا اس گھر (خانہ کعبہ) [1] کو مرکز لوگوں کے لئے [2] اور امن کی جگہ [3] اور (انہیں حکم دیا کہ) بنالو ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو جائے نماز [4] اور ہم نے تاکید کردی ابراہیم اور اسماعیل کو کہ خوب صاف ستھرا رکھنا میرا گھر طواف کرنے والوں، اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے [5]"

[1] ظرف اذ کو فعل محذوف سے متعلق ہے۔ ابوعمرو اور ہشام نے ہر جگہ ذال کو جیم میں ادغام کر کے پڑھا ہے اور اسی طرح ذال کو زاء میں بھی ادغام کیا ہے جیسے اذزین اور ذال کو سین، شین میں بھی ادغام کرتے ہیں جیسے اذ شمعتموہ۔ اور صاد میں بھی جیسے اذ صرفنا۔ تاء میں بھی جیسے اذتبرآ۔ دال میں بھی جیسے اذ دخلوا۔ ابن ذکوان نے صرف دال میں ذال کو ادغام کیا ہے۔ اور خلف دال اور تاء میں ذال کو ادغام کرتے ہیں۔ خلاد اور کسائی ذال کے بعد جیم ہو تو اظہار کرتے ہیں۔ نافع، ابن کثیر اور عاصم ہر جگہ ذال کو ظاہر کرتے ہیں۔ البیت سے مراد کعبہ ہے جس طرح نجم کا لفظ ثریا کے لئے غلبہ حاصل کر چکا ہے، اسی طرح البیت کا لفظ کعبہ کے لئے معروف ہو چکا ہے۔

[2] یعنی لوگوں کے لئے لوٹنے کی جگہ بنایا ہے، لوگ ہر طرف سے اس کی جانب لوٹ کر آتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ حج، عمرہ اور اس میں نماز پڑھنے کی وجہ سے لوگوں کے لئے اس کو ثواب کی جگہ بنایا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مسجد حرام کی نماز کا ثواب لاکھ نمازوں کے

1۔ کنز العمال: 14875 (التراث الاسلامی) 2۔ کنز العمال: 14874 (التراث الاسلامی) 3۔ کنز العمال: 14789 (التراث الاسلامی)

برابر ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔(1)

ے جس میں لوگ مشرکین کی اذیتوں سے پناہ لیتے ہیں کیونکہ مشرکین اہل مکہ کو نہیں چھیڑتے تھے اور کہتے یہ اہل اللہ ہیں۔ اور جو اردگرد کے لوگ تھے ان پر ڈاکے ڈالتے اور شب خون مارتے تھے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ کیا انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا کہ ہم نے بنا دیا حرم کو امن والا حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کو ان کے آس پاس سے۔ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ شہر، اس کو اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی تخلیق کے دن حرمت والا بنایا اور قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت کی وجہ سے حرام ہے، اس میں قتال کسی کے لئے حلال نہ ہوگا اور میرے لئے بھی حلال نہ ہوا، مگر دن کی ایک گھڑی میں۔ یہ اللہ کی حرمت کی وجہ سے قیامت تک حرام ہے، نہ اس کا کانٹا توڑا جائے گا، نہ اس کا شکار بھگایا جائے گا اور نہ اس کا لقطہ (گری پڑی چیز) اٹھایا جائے گا، مگر وہ اٹھالے جو اس کا اعلان کرائے اور نہ اس کا گھاس کاٹا جائے گا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ اذخر کی استثناء فرمائیں کیونکہ گھروں میں اور لوہاروں کے کام آتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا اِلَّا الْاِذْخَرَ۔ یعنی اذخر (گھاس) کی استثناء فرمادی(2) یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ مروی ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

ے طواف کے بعد کی دو رکعتیں مراد ہیں۔ یعنی طواف کے بعد مقام ابراہیم پر دو رکعتیں ادا کرو۔ حضرت امام مسلم نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے، اس میں ہے کہ جب ہم آپ کے ساتھ کعبہ کے قریب پہنچے تو پہلے آپ ﷺ نے حجر اسود کو استلام کیا۔ پھر طواف کے تین چکروں میں رمل کیا اور چار چکر چل کر لگائے۔ پھر آپ مقام ابراہیم کی طرف بڑھے اور پڑھا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى۔ پس آپ نے بیت اللہ شریف اور مقام ابراہیم کے درمیان کو مصلی بنایا و اللہ اعلم(3) من کا کلمہ تبعیضیہ ہے۔ اگر مقام ابراہیم سے مراد مکمل حرم ہو جیسا کہ ابراہیم النخعی نے کہا ہے یا اگر مسجد مراد ہو(4) یا مشاہد حج یعنی عرفہ، مزدلفہ وغیرہا مراد ہوں، جیسا کہ بعض علماء نے کہا ہے۔ اگر مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہو جو مسجد میں ہے جس کی طرف ائمہ نماز پڑھتے ہیں تو من ابتدائیہ ہوگا۔ یہ وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے بیت اللہ شریف کو تعمیر کیا تھا اور اس پر ابراہیم علیہ السلام کی انگلیوں کے نشان بالکل واضح تھے لیکن کثرت سے ہاتھ لگنے کی وجہ سے نشان مدہم پڑ گئے ہیں۔ یہی قول اصح ہے۔ اس پر مذکورہ حدیث جابر بھی دلالت کرتی ہے۔ تقدیر یوں ہوگی وَاتَّخِذُوْا مُصَلًّى قَرِيْبًا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ۔ یعنی مسجد یا حرم میں مقام ابراہیم کے قریب کو جائے نماز بناؤ۔ نافع اور ابن عامر نے جعلنا پر عطف کر کے خاء کے فتحہ کے ساتھ ماضی کا صیغہ پڑھا ہے، اور دوسرے قراء نے امر کا صیغہ خاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی جعلنا پر معطوف ہے اور تقدیر یوں ہے قلنا اتخذوا یا یہ مقدر فعل پر معطوف ہے جو اذ کا عامل ہے یعنی اذکر۔ یا یہ معترضہ ہے اور مقدر پر معطوف ہے جس کی تقدیر اس طرح ہوگی تُوْبُوْا اِلَيْهِ وَاتَّخِذُوْا۔ اس کی جناب میں توبہ کرو اور مقام ابراہیم کو جائے نماز بنالو۔ آخری دونوں تقدیروں میں خطاب محمد ﷺ کی امت کو ہوگا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے تین مقامات پر اپنے رب کی موافقت کی ہے اور میرے رب نے تین مقامات پر میری موافقت فرمائی ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ مقام

1۔ سنن ابن ماجہ: 1413 (علمیہ)　2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 437-438 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 395 (وزارت تعلیم)　4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 151 (فکر)

ابراہیم کو جائے نماز بنالیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى -(اور (انہیں حکم دیا کہ) بنالو ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو جائے نماز) نازل فرمادیا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ کے پاس نیک و بد ہر قسم کے لوگ آتے ہیں اگر آپ ﷺ امہات المومنین کو پردے کا حکم فرمادیں (تو یہ اچھا ہے) اللہ تعالیٰ نے آیت حجاب نازل فرمادی۔ مجھے خبر پہنچی کہ بعض ازواج مطہرات نے نبی کریم ﷺ سے عتاب آمیز گفتگو کی ہے۔ تو میں ازواج مطہرات کے پاس گیا اور کہا باز آجاؤ ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو تم سے بہتر بیویاں عطا فرمادے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ الآیہ۔ اس حدیث کو امام بخاری نے نقل فرمایا ہے(1) یہ آیت کریمہ واتخذوا الایۃ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے قول کی حجت ہے کہ طواف کے بعد دو رکعت پڑھنا واجب ہے۔ کیونکہ امر وجوب کے لئے ہوتا ہے اور اگر ماضی کا صیغہ ہو تو ثبوت اور وجوب پر زیادہ دلالت کرتا ہے چاہئے تو یہ تھا کہ نص قطعی کی وجہ سے دو رکعتیں فرض ہوتیں لیکن جب آیت کا ورود اس نماز کے بارے میں احادیث آحاد کے ساتھ ثابت ہے تو ہم نے فرض کی بجائے وجوب کا قول کیا۔ طواف کے بعد کی دو رکعتوں کے وجوب کا ثبوت نبی کریم ﷺ کی ان پر مواظبت اختیار کرنے سے بھی ہوتا ہے، آپ ﷺ نے کبھی ان کو ترک نہیں فرمایا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کا ارشاد ہے خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِكَكُمْ مجھ سے اپنے دین کے طریقے سیکھو۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب حج یا عمرہ کا طواف فرماتے تو سب سے پہلے تین چکروں میں تیز چلتے آخری چار چکر آہستہ وقار کے ساتھ چلتے پھر آپ دو رکعتیں ادا فرماتے، اس کے بعد صفا و مروہ کے درمیان چکر لگاتے۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے(2)۔ بخاری میں تعلیقاً یعنی بغیر سند کے مروی ہے۔ اسماعیل بن امیہ کہتے ہیں میں نے زہری سے پوچھا کہ عطاء کہتے ہیں فرضی نماز ان طواف کی دو رکعتوں کے قائم مقام ہو جاتی ہے، زہری نے کہا سنت پر عمل کرنا افضل ہے، نبی کریم ﷺ نے جب بھی طواف فرمایا اس کے بعد دو رکعتیں ادا فرمائیں۔ عبدالرزاق نے زہری سے روایت کر کے متصل ذکر کی ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے بھی زہری سے بایں الفاظ متصل نقل کی ہے مَضَتِ السُّنَّةُ اَنَّ مَعَ اُسْبُوْعٍ رَكْعَتَيْنِ۔ یعنی سنت قائم ہو چکی ہے کہ سات چکروں کے بعد دو رکعتیں ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا ان دو رکعتوں کا پڑھنا مستحب ہے۔ امام مالک سے بھی یہی مروی ہے اور امام الشافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں۔ اور امر کو استحباب پر محمول کرنا ناجائز ہے کیونکہ استحباب امر کا مجازی معنی ہے۔ ہاں جب وجوب کا تصور نہ ہو سکے تو استحباب پر محمول کرنا درست ہے۔ اور طواف کی دو رکعتیں مسجد کے اندر کسی جگہ پر بلکہ مسجد سے باہر بھی ادا کرنی اجماعاً جائز ہیں۔ صحیحین میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے آپ ﷺ نے فرمایا جب صبح کی نماز کھڑی ہو جائے تو اپنے اونٹ پر طواف کر جبکہ لوگ نماز پڑھ رہے ہوں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے ایسا کیا اور طواف کے بعد نماز نہ پڑھی حتیٰ کہ مسجد سے یا مکہ سے باہر نکل آئی(3) امام بخاری نے تعلیقاً (بلاسند) روایت لکھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طواف کی دو رکعتیں حرم سے باہر وادی طویٰ میں پڑھیں۔ اس حدیث کو امام مالک نے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ اس لئے فرمایا کیونکہ نماز کو معین جگہ کے ساتھ مقید کیا جاتا تو حرج (تکلیف) لازم آتی۔ دیکھو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کے ہر ہر جزء کے ساتھ اخلاص اور نیت متصل نہ ہو تو ان کی ادائیگی جائز ہی نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 644 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 219 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 220 (وزارت تعلیم)

کے لئے خالص کرتے ہوئے دین کو)۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ(1) (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے) لیکن اگر ایسا ہوتا تو مخلوق خدا تنگی اور حرج میں مبتلا ہو جاتی۔ اس لئے احرام کے وقت نیت کے موجود ہونے کو نماز و حج کے جواز کے لئے کافی سمجھا گیا ہے اور مال زکوٰۃ سے واجب مال کو علیحدہ کرنے کے وقت نیت کے وجود کو کافی تصور کیا گیا ہے۔ اس طرح روزے کی نیت کے لئے اگر طلوع فجر کے وقت کو شرط قرار دیا جاتا تو حرج واقع ہوتا کیونکہ عموماً یہ نیند اور غفلت کا وقت ہے۔ اس لئے شریعت مطہرہ نے رات کی نیت کو جائز قرار دیا ہے بلکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے روزے کی نیت کو چاشت تک جائز قرار دیا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح قیاس تو یہ تھا کہ طواف کی دو رکعتیں مقام ابراہیم پر ادا کی جائیں کیونکہ آیت کا ظاہر اسی کا متقضی ہے، لیکن پورے حرم میں ان کی ادائیگی صحیح فرما دی کیونکہ طواف کرنے والوں کی کثرت کی وجہ سے مصلّٰی کی تعیین میں حرج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پورے حرم کو مسجد قرار دیا ہے کیونکہ ارشاد فرمایا: وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِیْهِ وَالْبَادِ ؕ الآیہ۔ مسجد حرام جسے ہم نے (بلا امتیاز) سب لوگوں کے لئے (مرکز ہدایت) بنایا ہے یکساں ہیں اس میں وہاں کے رہنے والے اور پردیسی۔ ایک اور جگہ فرمایا۔ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ یَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ (یہ رعایت ان کے لئے ہے جن کے گھر والے مسجد حرام کے قریب نہ ہوں)۔ رہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نماز طواف کا مسئلہ کہ انہوں نے تو حرم سے باہر وادی طویٰ میں جا کر ادا کی (حالانکہ حرم کے اندر ادائیگی ضروری تھی) گویا انہوں نے ضرورۃً واجب کی قضا فرمائی تھی۔ یا ہم کہیں گے کہ مقام ابراہیم کی قید اتفاقی ہے کہ جب بھیڑ نہ ہو تو عموماً اسی جگہ پر ادا کی جائے۔ مقام کا ذکر تعیین و تکلیف کے لئے نہیں ہے جیسا کہ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ میں فِیْ حُجُوْرِكُمْ۔ ترجمہ: (اور جو تمہاری بیویوں کو بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پا رہی) ہیں) کی قید اتفاقی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سات چکروں کی انتہاء حجر اسود پر مقام ابراہیم کے قریب ہوتی ہے اور کوئی مانع موجود نہ ہو تو اسی جگہ نماز ادا کی جاتی ہے۔ جیسا کہ عموماً ربائب خاوندوں کی پرورش میں ہوتی ہیں۔

امام بغوی فرماتے ہیں سعید بن جبیر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت فرمایا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل اور ہاجرہ کو ساتھ لائے اور انہیں مکہ میں ٹھہرایا تو ایک مدت گزرنے کے بعد جرہم قبیلے کے لوگ یہاں آ کر اترے۔ حضرت اسماعیل نے ان کی ایک عورت سے نکاح کر لیا۔ جب حضرت ہاجرہ کا وصال ہو گیا تو پھر ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ سے حضرت ہاجرہ کے پاس جانے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے اجازت دی مگر شرط لگا دی کہ وہ ان کے پاس اتریں گے نہیں۔ حضرت ابراہیم آئے تو حضرت ہاجرہ کا وصال ہو چکا تھا۔ آپ حضرت اسماعیل کے گھر آئے۔ ان کی بیوی سے پوچھا تمہارا خاوند کہاں ہے؟ بیوی نے کہا وہ شکار کرنے گئے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام حرم سے باہر شکار کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے اپنی بہو سے پوچھا تمہارے پاس مہمان کی ضیافت کے لئے کچھ ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر آپ نے اس سے معاشی حالت پوچھی تو اس نے کہا جناب ہم بہت تنگی اور تکلیف میں ہیں۔ حضرت ابراہیم نے اس کی یہ بے صبری کی گفتگو سن کر فرمایا جب تمہارا خاوند آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور اسے مزید یہ کہنا کہ اپنے دروازے کی دہلیز بدل دو۔ حضرت ابراہیم چلے گئے۔ حضرت اسماعیل واپس آئے تو انہیں اپنے والد گرامی کی خوشبو محسوس ہوئی۔ بیوی سے پوچھا کیا کوئی مہمان آیا تھا؟ اس نے کہا ایک اس شکل شباہت کا بوڑھا شخص آیا تھا۔ بیوی نے حضرت ابراہیم کا ذکر حقیر صفات میں کیا۔ حضرت اسماعیل نے پوچھا اس نے تجھے کیا کہا تھا؟ بیوی نے بتایا اس نے مجھے کہا کہ اپنے خاوند کو میرا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 2 (وزارت تعلیم)

سلام کہنا اور اسے کہنا کہ اپنے دروازے کی دہلیز بدل دو۔ حضرت اسماعیل نے فرمایا وہ میرے والد صاحب تھے، انہوں نے مجھے اس جملہ سے حکم دیا ہے کہ میں تجھے جدا کر دوں تو اپنے اہل (گھر والوں) کے پاس چلی جا۔ آپ نے اسے طلاق دے دی اور جرہم قبیلہ کی ایک دوسری عورت سے نکاح کر لیا۔ حضرت ابراہیم نے کچھ مدت گزرنے کے بعد حضرت سارہ سے پھر اجازت طلب کی تاکہ حضرت اسماعیل سے ملاقات کر آئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دروازے پر پہنچے تو ان کی بیوی سے پوچھا سرتاج کہاں ہیں؟ بیوی نے کہا وہ شکار کرنے گئے ہیں، وہ ان شاء اللہ ابھی آ جائیں گے، تشریف رکھئے، اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت فرمائے، پھر حضرت ابراہیم نے اپنی بہو سے پوچھا کیا مہمان نوازی کے لئے کچھ ہے؟ نیک بخت بہو نے کہا ہاں ہے فوراً دودھ اور گوشت حاضر کر دیا۔ حضرت ابراہیم نے معاشی حالت دریافت کی تو بتایا ہم بخیر و خوبی اور خوشحال ہیں۔ حضرت ابراہیم نے دونوں چیزوں کے لئے برکت کی دعا فرمائی۔ اگر اس دن حضرت اسماعیل کی زوجہ محترمہ گندم کی روٹی، جو اور کھجور پیش کرتیں تو اللہ تعالیٰ کی زمین میں گندم، جو اور کھجوریں کثرت سے ہوتیں۔ بہو نے کہا تشریف رکھیے، میں آپ کا سر مبارک دھو دوں۔ لیکن آپ اپنی سواری سے نہ اترے۔ وہ ایک پتھر (مقامِ ابراہیم والا) لائیں اور حضرت ابراہیم کی سواری کی دائیں جانب رکھا آپ علیہ السلام نے اپنا قدم مبارک اس پتھر پر رکھا پھر بہو نے آپ کے سر کی دائیں جانب دھوئی پھر اسی پتھر کو سواری کی بائیں جانب رکھا اور آپ کے سر کی بائیں طرف دھوئی۔ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نشان اس پتھر پر راسخ ہو گیا۔ حضرت ابراہیم نے واپسی پر فرمایا جب تمہارا خاوند آئے تو میرا سلام کہنا اور یہ پیغام دینا کہ تمہارے دروازے کی دہلیز درست اور مستقیم ہے اسے مضبوط رکھنا۔ جب اسماعیل علیہ السلام آئے تو اپنے باپ کی خوشبو کو محسوس کیا۔ بیوی سے پوچھا کیا کوئی مہمان آیا تھا؟ بیوی نے کہا ہاں، ایک خوبصورت اور پاکیزہ خوشبو والا بوڑھا آیا تھا اور اس نے مجھے یہ یہ کہا، اور میں نے اسے یہ یہ کہا اور میں نے اس کا سر بھی دھویا تھا اور یہ ان کے قدم رکھنے کی جگہ ہے، حضرت اسماعیل نے فرمایا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اور دروازے کی دہلیز سے مراد تو ہے، انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اپنے پاس روکے رکھوں(1)

کچھ عرصہ بعد حضرت ابراہیم پھر تشریف لائے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام زمزم کے قریب ایک درخت کے نیچے تیروں کو تراش رہے تھے۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام نے آپ کو آتے ہوئے دیکھا تو کھڑے ہو کر آداب بجا لائے۔ پھر دونوں نے یوں اظہارِ محبت کیا جیسے باپ بیٹے سے اور بیٹا باپ سے کرتا ہے۔ پھر فرمایا اے اسماعیل اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک حکم دیا ہے، کیا تو اس میں میری اعانت کرے گا؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا ہاں ضرور مدد کروں گا۔ فرمایا مجھے میرے رب نے یہ حکم دیا ہے کہ میں ایک گھر بناؤں، تو اس وقت دونوں نے بیت اللہ شریف کی بنیادیں کھڑی کرنا شروع کر دیں۔ حضرت اسماعیل پتھر اٹھا کر لاتے اور ابراہیم علیہ السلام تعمیر فرماتے۔ جب دیواریں بلند ہو گئیں تو یہی پتھر (مقامِ ابراہیم) حضرت اسماعیل اٹھا کر لائے۔ حضرت ابراہیم اس پر کھڑے ہو کر تعمیر فرماتے رہے اور اسماعیل علیہ السلام پتھر لاتے رہے اور دونوں زبان سے یہ پڑھتے رہے رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (اے ہمارے پروردگار! قبول فرما ہم سے (یہ عمل) بیشک تو ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے)۔ حدیث شریف میں ہے رکن اور مقام جنت کے یاقوتوں میں سے دو یاقوت ہیں۔ اس حدیث کو امام مالک نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ رکن اور مقام جنت کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 151 (فکر)

یاقوت سے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا نور ختم کر دیا ہے اگر ان کا نور اور چمک ختم نہ فرماتا تو یہ مشرق و مغرب کو روشن کر دیتے(1) اس حدیث کو ترمذی نے ذکر کیا ہے۔ امام بغوی نے بھی یہی حدیث نقل کی ہے (جس کے الفاظ میں اختلاف ہے مگر معنی یہی ہے)(2)۔ نگاہِ عبرت و بصیرت رکھنے والوں نے یہاں سے استنباط کیا ہے کہ کسی جگہ اللہ کا نیک بندہ کچھ وقت قیام فرماتا ہے تو وہاں آسمان سے سکینہ اور برکات کا نزول ہوتا ہے۔ جس سے دل اللہ تعالیٰ کی طرف راغب ہو جاتے ہیں اور وہاں نیکیوں کا اجر بھی کئی گنا ہو جاتا ہے اور اسی طرح اگر وہاں گناہ کیا جائے تو اس کی سزا بھی کئی گنا ملتی ہے واللہ اعلم۔

ؒ ان طہرا:۔ اصل میں بِاَنْ طَهِّرَا ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اَنْ مفسرہ ہو کیونکہ عہد کے ضمن میں قول کا معنی پایا جاتا ہے۔ بیتی میں اپنی طرف نسبت فضیلت عطا کرنے کے لئے ہے یعنی طہارت اور توحید پر بناؤ۔ سعید بن جبیر اور عطاء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ بتوں اور جھوٹ کی غلاظت سے پاک کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ اس میں خوشبو سلگاؤ اور خوب صاف رکھو۔ نافع، ہشام اور حفص نے یہاں اور سورۃ الحج میں بیتی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ طائفین سے مراد طواف کرنے والے۔ رکع اور سجود، راکع اور ساجد کی جمع ہے مراد نمازی ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

"اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے رب بنا دے اس شہر کو امن والا[1] اور روزی دے اس کے باشندوں کو طرح طرح کے پھلوں سے[2] (یعنی) جو ان میں سے ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر[3] اللہ نے فرمایا (ان میں سے) جس نے کفر کیا اسے بھی فائدہ اٹھانے دوں گا چند روز[4] پھر مجبور کروں گا اسے دوزخ کے عذاب کی طرف اور یہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے"[5]۔

[1] حضرت ابراہیم نے دعا کی اے میرے رب اس شہر (مکہ) کو امن والا بنا۔ جیسے عِيْشَةٌ رَاضِيَةٌ سے مراد ذاتُ رِضْيَةٍ ہے اسی طرح آمنًا بمعنی ذَا اَمْنٍ ہے۔ یا آمِنًا مَنْ فِيْهِ کے معنی میں ہے جیسے کہا جاتا ہے لَيْلٌ نَائِمٌ تو مراد رات سونے والی نہیں بلکہ رات میں سونے والے ہوتے ہیں اسی طرح اس کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ اس شہر والوں کو امن والا بنا۔

[2] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھلوں سے رزق ملنے کی دعا فرمائی کیونکہ وہ وادی غیر آباد تھی۔ القصص میں ہے کہ الطائف شام کے شہروں میں سے اردن کے قریب تھا۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو حکم دیا اس نے الطائف کو جڑ سے اکھیڑا اور بیت اللہ کے اردگرد سات مرتبہ گھمایا پھر وہاں ہی رکھ دیا۔ اکثر مکہ کے پھل اسی شہر سے آتے ہیں۔

[3] مَنْ آمَنَ ترکیب نحوی کے اعتبار سے من اهله سے بدل بعض ہے دعا میں ابراہیم علیہ السلام نے مومنین کو خاص فرمایا تاکہ میری یہ دعا کفار کے کفر پر اعانت نہ بنے۔ وَمَنْ كَفَرَ کا من آمن پر عطف ہے۔ معنی یہ ہوگا وَارْزُقْ مَنْ كَفَرَ اور جس نے کفر کیا اسے بھی رزق عطا فرما۔ یہاں پر کلام مکمل ہو گئی۔ اس میں اس بات پر آگاہی ہے کہ رزق اللہ تعالیٰ کی دنیوی رحمت ہے جو مومن و کافر کے لئے

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، 878 (علمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 153 (فکر)

عام ہے۔ اسی وجہ سے رحمٰن الدنیا و رحیم الاخرۃ کہا جاتا ہے۔ بخلاف نبوت کے اور دینی راہنمائی کے یہ صرف مومنین کا ہی نصیبہ ہیں۔ یا من کفر مبتدا ہے جو اپنے ضمن میں شرط کا معنی لئے ہوئے ہے اور اس کی خبر فَاُمَتِّعُهٗ ہے۔ ابن عامر نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور دونوں کا معنی ایک ہے۔

؎ قلیلاً مصدر متاعاً کی صفت ہے۔ چونکہ دنیا کا مال و متاع آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں کم ہے اس لئے قلیل سے تعبیر فرمایا یا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ دنیا کا مال و متاع کم مرتبہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی وقعت رکھتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو اس سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا(1) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔ اسی طرح سہل بن سعد سے بھی مروی ہے۔ یا قلیلاً زماناً کی صفت ہے یعنی ان کی عمر کے عرصہ تک ہم انہیں لطف اندوز کریں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کفر تمتع کا سبب نہیں ہوتا تو پھر یہاں کیسے خبر پر فاء داخل کی گئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کفر تمتع کی تقلیل کا سبب ہے کیونکہ دنیا کی نعمتیں جلدی ملنے والے حصول پر مقصور ہیں اور آخرت کے درجات کے حصول کا وسیلہ بننے سے مانع ہیں بخلاف مومن کے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو نعمت کے شکر اور اس کے صحیح استعمال کی وجہ سے نعمتیں عطا فرمائیں ہیں وہ دائمی آخرت کے درجات کے حصول کا سبب ہیں۔ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ دنیوی زندگی کا مال و متاع اللہ تعالیٰ کے نزدیک خبیث اور ملعون ہے اس لئے ممکن ہے کہ کفر اس کے حصول کا سبب ہو۔ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملاحظہ نہیں فرمایا: ”وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ۝ وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا“ (الزخرف: 33-35) (اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک امت بن جائیں گے تو ہم بنا دیتے ان کے لئے جو انکار کرتے ہیں رحمٰن کا ان کے مکانوں کے لئے چھتیں چاندی کی اور سیڑھیاں جن پر وہ چڑھتے ہیں (وہ بھی چاندی کی) اور ان کے گھروں کے دروازے بھی چاندی کے اور وہ تخت جن پر وہ تکیہ لگائے ہیں وہ بھی چاندی اور سونے کے اور یہ سب (سنہری روپہلی) چیزیں دنیوی زندگی کا سامان ہے)۔ یعنی کفر کا مقتضی اصلی تو دنیا کا مال و متاع ہے، اگر لوگوں کے ایک امت ہونے کا مانع نہ ہوتا تو کفر کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان کے گھر اور دروازے اور ان کے پلنگ چاندی اور سونے کے ہوں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اَلدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ وَمَلْعُوْنٌ مَا فِيْهَا اِلَّا ذِكْرَ اللّٰهِ وَمَا وَالَاهُ وَعَالِمًا وَمُتَعَلِّمًا یعنی دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے سب ملعون ہے سوائے اللہ کے ذکر اور اس کے متعلقات کے اور عالم اور متعلم کے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے(2) اور الطبرانی نے صحیح سند کے ساتھ الاوسط میں اور الکبیر میں صحیح سند کے ساتھ ابو الدرداء سے بایں الفاظ روایت کی ہے اِلَّا مَا ابْتُغِيَ بِهٖ وَجْهُ اللّٰهِ۔ یعنی سب ملعون ہے سوائے ان چیزوں کے جس میں رضا الٰہی مطلوب و مقصود ہو۔

؎ پھر میں اسے اس کے کفر اور مال کو رب کی رضا کے بغیر صرف کرنے کی وجہ سے دوزخ کی طرف مجبور شخص کی طرح لے جاؤں گا اضطرہ کا عطف فامتعہ پر ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں مقام کے پاس یہ لکھا ہوا تھا کہ میں اللہ مکہ کا مالک ہوں، میں نے اسے سورج اور چاند کی تخلیق کے دن بنایا ہے اور زمین و آسمان کی تخلیق کے دن سے اس کو حرمت والا بنایا ہے اور میں نے اسے سات فرشتوں کے ذریعے گھیر رکھا ہے، اس کا رزق تین راستوں سے آتا ہے، اس کے دودھ اور گوشت میں برکت رکھی گئی ہے۔(3)

1۔ عارضۃ الاحوذی:2320 (علمیہ)　　2۔ سنن ابن ماجہ:4112 (علمیہ)　　3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، 154 (فکر)

وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّاؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴿۱۲۷﴾

"اور یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیم (علیہ السلام) بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل (علیہ السلام) [1] بھی اے ہمارے پروردگار قبول فرما ہم سے (یہ عمل) بیشک تو ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے"

[1] حالت ماضیہ کی حکایت ہے۔ قواعد جمع ہے قاعدہ کی جس کا معنی بنیاد ہے۔ یہ قعود بمعنی ثبات سے صفت غالبہ ہے، اور یہ اس قعود سے مجازاً مشتق کیا گیا ہے جو قیام کی ضد ہے۔ رفعها سے مراد بنیاد پر تعمیر کرنا ہے کیونکہ دیوار کا ہر ردا ہستی سے بلندی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ کسائی فرماتے ہیں قواعد سے مراد دیواریں ہیں اور ہر دیوار اپنے مافوق کے لئے قاعدہ ہے اور رفع سے مراد تعمیر کرنا ہے۔ و اسماعیل کا عطف ابراھیم پر ہے اور معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان فاصلہ کا سبب مفعول کا مقدم کرنا ہے۔ بانی اور معمار صرف ابراہیم علیہ السلام تھے، اسی وجہ سے پہلے ان کا علیحدہ ذکر فرمایا اور اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا کر لاتے تھے اور ان کا بھی اس تعمیر میں حصہ تھا اس لئے ان کا بعد میں عطف فرما دیا۔ امام بغوی فرماتے ہیں راویوں نے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی جگہ کو زمین سے دو ہزار سال پہلے بنایا اور یہ سفید جھاگ کی طرح پانی پر تھی، پھر اس کے نیچے سے زمین کو پھیلایا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا تو آپ خوفزدہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کے یاقوتوں سے تیار شدہ بیت المعمور کو اتارا، جس کے دو دروازے سبز زمرد کے تھے۔ ایک مشرقی دروازہ اور ایک مغربی دروازہ تھا اسے بیت اللہ شریف کی جگہ رکھ دیا اور فرمایا اے آدم میں نے تیرے لئے ایک گھر اتارا ہے جس کا تو طواف کیا کر جیسے عرش کے اردگرد طواف کیا جاتا ہے اور تو اس کے پاس نماز پڑھ جیسے میرے عرش کے پاس نماز پڑھی جاتی ہے، حجر اسود کو اتارا، یہ بالکل سفید تھا۔ زمانہ جاہلیت کی حیض والی عورتوں کے چھونے کی وجہ سے سیاہ ہو گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام ہند کی زمین سے پیدل مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ ایک فرشتہ متعین فرمایا تھا جو آپ کی بیت اللہ شریف کی طرف راہنمائی کرتا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے حج کیا اور تمام مناسک ادا کئے۔ جب فارغ ہوئے تو فرشتوں نے آپ سے ملاقات کی اور کہا اے آدم آپ کا حج قبول ہوا ہے۔ ہم نے تجھ سے پہلے اس گھر کا حج کیا ہے۔ ابن عباس نے فرمایا آدم علیہ السلام نے ہند سے مکہ تک پیدل چل کر چالیس حج کئے۔ یہ طوفان کے دنوں تک اسی طرح باقی رہا پھر اسے اللہ تعالیٰ نے چوتھے آسمان کی طرف اٹھا لیا اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے زیارت کے لئے داخل ہوتے جنہیں پھر دوبارہ یہ موقع میسر نہیں آتا پھر اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو بھیجا تاکہ وہ حجر اسود کو جبل ابی قبیس میں چھپا لیں تاکہ غرق ہونے سے بچ جائے۔ پس خانہ کعبہ کی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک خالی رہی پھر حضرت اسماعیل اور اسحق علیہما السلام کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ بیت اللہ شریف تعمیر کریں جس میں (میرا) ذکر کیا جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کس جگہ بناؤں؟ اللہ تعالیٰ نے جگہ اور مقام کا تعین کرنے کے لئے سکینہ بھیجی جو ایک تیز ہوا تھی جس کے سانپ کی طرح دو سر تھے۔ حکم ہوا جہاں یہ سکینہ ٹھہرے وہاں بیت اللہ تعمیر کرنا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے یہاں تک کہ دونوں مکہ مکرمہ پہنچ گئے پھر وہ چڑے کی ڈھال کی طرح لپٹ گئی۔ یہ حضرت علی اور حسن کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی مقدار ایک بادل کا ٹکڑا بھیجا وہ چلتا رہا اور حضرت ابراہیم اس کے سایہ میں چلتے رہے یہاں تک کہ وہ مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ وہ بادل کا ٹکڑا بیت اللہ شریف کی

جگہ پر آکر رک گیا پھر اس ٹکڑے سے آواز آئی اے ابراہیم اس کے سایہ کی جگہ بیت اللہ بناؤ اور اس سے کم یا زیادہ نہ ہو۔ بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ بیت اللہ شریف کی جگہ کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو بھیجا تھا، اسی قول کی طرف یہ ارشاد اشارہ کرتا ہے وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ۔ اور یاد کرو جب ہم نے مقرر کردی ابراہیم کے لئے اس گھر کے (تعمیر کرنے) کی جگہ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کرتے اور اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا کر لاتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے کہ بیت اللہ شریف پانچ پہاڑوں سے بنایا گیا: طور سینا، طور زیتا اور لبنان یہ شام کا پہاڑ ہے، جودی یہ جزیرہ کا پہاڑ ہے اور بیت اللہ کی بنیادیں حراء کے پہاڑ سے بنائیں گئیں، یہ پہاڑ مکہ میں ہے، جب حجر اسود تک جگہ کی تعمیر پہنچ گئی تو حضرت ابراہیم نے اسماعیل علیہما السلام کو فرمایا ایک خوبصورت پتھر لاؤ جو لوگوں کے لئے علامت اور نشانی ہو۔ آپ ایک پتھر اٹھا لائے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کوئی خوبصورت پتھر لاؤ۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام تلاش کے لئے نکلے تو جبل ابوقبیس نے آواز دی اے ابراہیم میرے پاس تیری امانت ہے وہ لے جاؤ۔ حضرت ابراہیم نے حجر اسود اٹھایا اور اسی جگہ نصب کر دیا(1) بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آسمان میں ایک گھر "بیت المعمور" بنایا جسے ضراح کہا جاتا ہے۔ اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے سامنے اس کی مقدار اور اس کی شکل زمین میں کعبہ بناؤ۔ بعض علماء فرماتے ہیں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا تھا پھر طوفان نوح کے زمانہ میں ختم ہوگیا تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ظاہر فرمایا حتیٰ کہ آپ نے دوبارہ تعمیر فرمایا۔

ﷺ اے ہمارے رب ہماری طرف سے یہ خدمت قبول فرما بیشک تو ہماری گزارشات کو سننے والا ہے اور ہماری نیتوں کو جاننے والا ہے۔

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۝

"اے ہمارے رب بنا دے ہم کو فرماں بردار اپنا لے اور ہماری اولاد سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا جو تیری فرمانبردار ہو ئے اور بتا دے ہمیں ہماری عبادت کے طریقے ئے اور توجہ فرما ہم پر (اپنی رحمت سے) بیشک تو ہی بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۵"

لے اے ہمارے پروردگار ہمیں ظاہراً اور باطناً اپنے تمام امور کا مددگار بنا دے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں(2)۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے کوئی نافرمانی صادر نہیں ہوتی پس وہ خود اللہ کے عذاب سے محفوظ رہتا ہے اور دوسرے مسلمان بھی اس کی اذیت سے یا اس کی بری صحبت سے محفوظ رہتے ہیں یہی اسلام کامل ہے جس کو اسلام حقیقی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ اطمینان نفس کے بعد متصور ہوتا ہے۔

ئے من تبعیضیہ ہے باپ ہونے کی شفقت کے سبب اپنی اولاد کے لئے دعا فرمائی۔ اور دعا میں بعض اولاد کو خاص فرمایا کیونکہ پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ بعض لوگ آپ کی اولاد میں کافر ہوں گے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ من بیانیہ ہو اور عطف معطوف کے درمیان اس کے ساتھ فاصلہ کیا گیا ہو جیسے اس ارشاد میں کیا گیا ہے: خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (اس نے سات آسمان پیدا فرمائے اور زمین کو بھی انہی کی مثل)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 154 (فکر)   2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 12 حدیث نمبر 65 (العلمیہ)

3۔ اس کی اصل اَرْاِنا بروزن اَکْفِنا ہے، ابن کثیر اور ابو شعیب نے اَرْنا و اَرْنِیْ تخفیف کے لئے ہر مقام پر راء کو ساکن کر کے اور ہمزہ کو کسرہ سمیت حذف کر کے پڑھا ہے۔ ابو عمرو نے اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ کی بعض حرکت یا کل حرکت راء کی طرف نقل کرنے کے بعد ہمزہ کو حذف کر کے راء مکسور کے ساتھ پڑھا ہے۔

4۔ مناسکنا سے مراد ہمارے دین کی شرائع اور ہمارے حج کی نشانیاں ہیں۔ نسک اصل میں غایت عبادت کو کہتے ہیں لیکن حج میں عموی کلفت و مشقت کی وجہ سے حج کے لئے استعمال ہونے لگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور جبرئیل کو بھیجا تاکہ نویں ذی الحجہ کے دن مناسک کی طرف ان دونوں کی راہنمائی کریں جب دونوں عرفات پہنچے تو جبرئیل نے پوچھا اے ابراہیم پہنچ گئے ہو؟ آپ نے کہا ہاں۔ اس لئے اس جگہ اور مکان کو عرفہ کہا گیا۔(1)

5۔ نبی گناہ سے پاک ہوتا ہے لیکن یہاں دونوں پیغمبروں نے یہ دعا اپنے نفس کو روند نے کے لئے اور اپنی اولاد کی راہنمائی کے لئے فرمائی اگرچہ خود گناہ سے پاک تھے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

"اے ہمارے رب بھیج ان میں ایک برگزیدہ رسول انہیں میں سے 1۔ تاکہ پڑھ کر سنائے انہیں تیری آیتیں اور سکھائے انہیں یہ کتاب اور دانائی کی باتیں اور پاک صاف کر دے انہیں 2۔ بیشک تو ہی بہت زبردست (اور) حکمت والا ہے 3۔"

1۔ منہم سے مراد من انفسہم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا کو قبول فرمایا اور محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ حضرت عرباض بن ساریہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا میں اللہ کی بارگاہ میں خاتم النبیین لکھا ہوا تھا جبکہ آدم علیہ السلام اپنی مٹی میں گوندھے ہوئے تھے۔ میں تمہیں اپنے معاملہ کی خبر دیتا ہوں میں دعاء ابراہیم، بشارت عیسیٰ اور اپنی ماں کا وہ خواب ہوں جو انہوں نے میری ولادت کے وقت دیکھا تھا۔ ان سے ایک نور خارج ہوا تھا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے تھے(2) اس حدیث کو بغوی نے شرح السنۃ میں نقل کی ہے اور امام احمد نے ابی امامہ سے مَا اُخْبِرُكُمْ (میں تمہیں خبر دیتا ہوں) سے آخر تک روایت کی ہے۔

2۔ جو ان پر توحید و نبوت کے دلائل تلاوت کرے اور قرآن کی انہیں تعلیم دے اور ایسے احکام و معارف سکھائے جو ان کے نفوس کی تکمیل کریں۔ بعض علماء فرماتے ہیں حکمت سے مراد سنت ہے۔ بعض نے فرمایا القضاء (فیصلہ) ہے۔ بعض نے فرمایا فقہ ہے۔ اور اس رسول کی تیسری شان یہ ہو کہ وہ انہیں شرک اور گناہوں کی آلائش سے پاک کرے۔ بعض فرماتے ہیں یزکیہم کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے مالوں کی زکوٰۃ وصول کرے۔ ابن کیسان کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ قیامت کے روز آپ ان کی عدالت کے ساتھ گواہی دیں گے۔

3۔ ابن عباس فرماتے ہیں عزیز وہ ہوتا ہے جس کی مثل نہ ہو۔ الکلبی کہتے ہیں اس کا معنی منتقم یعنی انتقام لینے والا ہے۔ بعض فرماتے ہیں جو ایسا محفوظ ہو جس تک نہ ہاتھ پہنچیں نہ کوئی اور چیز(3) بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ایسا غالب جس پر کوئی غالب نہ ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 156 (فکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 157 (فکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 158 (فکر)

حکیم کا معنی ہے حکمت بالغہ کا مالک ہو واللہ اعلم۔ ابن عساکر نے لکھا ہے روایت ہے کہ عبداللہ بن سلام نے اپنے بھتیجوں سلمہ اور مہاجر کو اسلام کی دعوت دی۔ آپ نے انہیں فرمایا یقیناً تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں فرمایا ہے کہ میں حضرت اسماعیل کی اولاد سے ایک نبی مبعوث کرنے والا ہوں جس کا نام احمد ہوگا۔ پس جو اس پر ایمان لائے گا وہ ہدایت یافتہ ہوگا اور جو اس پر ایمان نہیں لائے گا وہ ملعون ہوگا۔ یہ سن کر سلمہ نے اسلام قبول کر لیا اور مہاجر نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت کریمہ نازل فرمائی۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

"اور کون روگردانی کر سکتا ہے دین ابراہیم سے[1] بجز اس شخص کے جس نے احمق بنا دیا ہوا اپنے آپ کو[2]۔ اور بیشک ہم نے چن لیا ابراہیم کو دنیا میں اور بلاشبہ وہ قیامت کے دن نیکو کاروں میں ہوں گے[3]"

1۔ یہاں ملت غرّاء سے اعراض کو مستبعد سمجھنے اور اس سے انکار کے لئے استفہام کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ یعنی کوئی بھی ملت غراء بیضاء سے اعراض نہیں کرتا۔ رغبة جب الی کے ساتھ متعدی ہو تو مراد ارادہ کرنا ہوتا ہے اور اگر عن سے متعدی ہو تو مراد ترک اور اعراض ہوتا ہے۔

2۔ السفه اصل میں خفت اور گھٹیا پن کو کہتے ہیں۔ جو شخص خواہشات کی اتباع میں بغیر تدبر و تفکر کے کاموں میں جلدی کرتا ہو اور کام کے نفع اور نقصان کا خیال نہ رکھتا ہو تو اسے خفیف اور سفیہ کہتے ہیں۔ اس کی ضد حلیم ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے سفه کو شخص کی ذات اور اس کی رائے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہا جاتا ہے۔ زَيْدٌ سَفِيْهٌ وَسَفِهَ نَفْسُهٗ وَسَفِهَ رَأْيُهٗ یعنی اس کا نفس خفیف ہے پس وہ امور کو عقل کے تقاضا کے خلاف کرتا ہے اور اس کی رائے کمزور ہے۔ اس صورت میں مفعول کی طرف متعدی نہیں ہوتا اور کبھی یہ حرف جر کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، کہتے ہیں سَفِهَ زَيْدٌ فِيْ نَفْسِهٖ وَرَأْيِهٖ۔ جب سفه اور خفة نفس کی اہانت اور نفس کی ہلاکت کو مستلزم ہے اور خفة الرای جہالت کو مستلزم ہے تو استعارۃً اهانت اور اهلاک کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے سَفِهَ نَفْسَهٗ یعنی اس نے اپنے نفس کی اہانت کی یا اس کو ہلاک کیا یا جھل بنایا۔ اس صورت میں مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ یا کہا جاتا کہ یہ مفعول کی طرف اس لئے متعدی ہوتا ہے کہ اس کے ضمن میں اهلاک یا اهان یا جهل کا معنی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے سَفِهَ نَفْسَهٗ اَيْ جَعَلَهَا مُهَانًا وَذَلِيْلًا۔ یعنی اس نے اپنے نفس کو ذلیل کیا اور اسے رسوا کیا کیونکہ اس نے اپنے خالق کی مخالفت کی اور اپنے جیسی مخلوق کی عبادت کی۔ ابوعبیدہ فرماتے ہیں اَهْلَكَ نَفْسَهٗ یعنی اس نے اپنے نفس کو ہلاک کیا۔ اخفش کہتے ہیں اصل میں سَفِهَ فِيْ نَفْسِهٖ تھا۔ حرف جر کو حذف کر کے فعل کو مفعول تک پہنچایا گیا۔ فراء کہتے ہیں اصل سَفِهَ نَفْسُهٗ (بالرفع) ہے[1] جب فعل کو اس نفس کے مالک کی طرف منسوب کیا گیا تو نفس کو بطور تمییز نصب دی گئی جیسے کہا جاتا ہے ضقت به ذرعاً وطاب زيد نفساً۔ ان کا اصل مفہوم ضاق ذرعي و طاب نفس زيد ہے۔ ابن کیسان اور زجاج کہتے ہیں اس کا معنی ہے جهل نفسه اس نے اپنے نفس کو جاهل بنایا[2] کیونکہ جس نے غیر اللہ کی عبادت کی یقیناً اس نے اپنے نفس کو جاهل بنایا کیونکہ اس نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 159 (فکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 159 (فکر)

اللہ کو جو اس کا خالق ہے، نہیں پہچانا۔ یہ قول ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ (1) میں کہتا ہوں مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کا معنی یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کی حقیقت کو پہچان لیا کہ یہ ممکن ہے اس کی ذات وجود اور بقاء کا تقاضا نہیں کرتی اور اس کی ذات میں وجود، قیام اور بقاء کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کو حمل اولی پر محمول کرنا جائز نہیں ہے جیسے زید زید ہے۔ مگر اس کے بعد کہ اس کی نسبت ہو ایسے واجب الوجود قائم بنفسہ کی طرف جو دوسروں کو قیام بخشنے والا ہے اگر وہ نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا وہ سایہ کے لئے اصل کی طرح ہے وہ زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے اشیاء کو قائم کرنے والا ہے، اشیاء کی اپنی ذاتوں سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اشیاء کو اپنی ذاتوں پر محمول کرنا جائز نہیں مگر اس ذات کی طرف نسبت کے بعد تو یقیناً اس نے اپنے رب کو پہچان لیا کہ وہ واجب ہے یکتا ہے، قیوم ہے اور نور مبین ہے اور جس نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا اس نے اپنے رب کو بھی نہیں پہچانا۔ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو وحی فرمائی۔ اپنے آپ کو پہچان اور مجھے پہچان۔ داؤد علیہ السلام نے عرض کی اے میرے پروردگار میں اپنے آپ کو کیسے پہچانوں اور تجھے کیسے پہچانوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے آپ کو ضعف، عجز اور فناء کے ساتھ اور مجھے قوت، قدرت اور بقاء کے ساتھ پہچان۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہالت اس علم کی ضد ہے جو اعتقاد جازم واقع کے مطابق ہوتا ہے اور اس نسبت حکمیہ کے متعلق ہوتا ہے جو قضیہ کے درمیان ہوتی ہے پس وہ علم دو مفعولوں کا تقاضا کرتا ہے اور وہ علم جو بداهة یا استدلال سے یا وحی سے یا الہام کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور اس کی ضد جهل ہے جو عدم اصلی ہے، ان اشیاء کے مشہور ہونے کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اس معرفت کی ضد ہوتا ہے جو ایک مفعول کا تقاضا کرتی ہے اور یہ تصورات کے باب سے ہے اور معرفت بداہت کے ساتھ یا اس بصیرت کے ساتھ حاصل ہوتی ہے جو ارباب قلوب (دل والوں) کو عطا کی جاتی ہے اور صفة سے مراد دوسرے معنی کے اعتبار سے جہالت ہے کیونکہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہے یعنی وہ اپنے نفس کو بصیرت کے ذریعے نہیں جانتا۔

ج الصلاح فساد کی ضد ہے جو قلبی یا جسمانی گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے اور صلاح کمال عصمت ہے۔ اس کے بغیر کچھ نہیں ہے اور یہاں صلاح سے مراد صلاح کا کمال ہے۔ اس آیت کریمہ میں سابق مفہوم کی حجت اور بیان ہے۔ پس جس کی یہ شان ہو اس کی اتباع سے کوئی روگردانی نہیں کرے گا مگر وہی جو سفیہ، جاهل اور ضعیف العقل ہوگا۔

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۙ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٣١﴾

"اور یاد کرو جب فرمایا اس کو اس کے رب نے (اے ابراہیم) گردن جھکا دو۔ عرض کی میں نے اپنی گردن جھکا دی سارے جہانوں کے پروردگار کے سامنے ؎"

ل اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے خم کر دے اور اپنے تمام امور اس کے سپرد کر دے۔ عطاء نے یہی تفسیر لکھی ہے (2) کلبی کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ تو اپنے دین اور عبادت کو خالص اس کے لئے ادا کر (3) ابن عباس فرماتے ہیں یہ ارشاد اس وقت ہوا تھا جب ابراہیم علیہ السلام سرنگ سے باہر نکلے تھے (4) ظرف اصطفینا کے متعلق ہے اور اس کی علت ہے یا اذکر مضمر کے ساتھ منصوب ہے گویا یوں کہا گیا ہے اس وقت کو یاد کرو تا کہ معلوم ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مقرب اور برگزیدہ بندہ ہے۔

1۔ الاسرار المرفوعہ: 506 (المکتب)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 59 (فکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 159 (فکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 159 (فکر)

ے حضرت ابراہیم نے عرض کی میں نے اپنے سارے کام تمام جہانوں کے پالنے والے کے سپرد کر دیے۔ اس تسلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب آپ کو منجنیق کے ساتھ باندھ کر نار نمرود میں ڈالا گیا تو جبریل نے کہا ابراہیم! کوئی حاجت ہے؟ فرمایا تجھ سے تو نہیں۔ جبریل نے مشورہ دیا اپنے رب سے بچانے کا سوال کرلو فرمایا میرے سوال سے اس کا علم میرے حال کے متعلق کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتماد اور سپردگی امور کی وجہ سے آگ کو ایک گلزار میں بدل دیا آپ کی بیڑیوں کے سوا آپ کا کچھ بھی نہ جلا۔

وَ وَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ

" اور وصیت کی اسی دین کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو لے اور یعقوب ے نے اے میرے بچو! ے بیشک اللہ نے پسند فرمایا ہے تمہارے لئے یہی دین سو تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو ے "

لے شام اور مدینہ کے قراء نے اوصی باب افعال سے پڑھا ہے اور ان کے مصاحف میں بھی اسی طرح ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے وصی پڑھا ہے جیسے نزل اور انزل ہے۔ توصیۃ کا معنی ہے کسی دوسرے کی طرف ایسے فعل کے ساتھ بڑھنا جس فعل میں اس دوسرے کے لئے صلاح اور فلاح ہو۔ اس کا اصل معنی وصلۃ یعنی ملانا ہے کہا جاتا ہے وصاہ جب کوئی ملائے اور فصاہ جب کوئی جدا کرے۔ گویا موصی اپنے فعل کو موصی کے فعل کے ساتھ ملاتا ہے۔ بہا میں ہا ضمیر کا مرجع ملت ہے یا اسلمت کا قول ہے جو الکلمہ کی تاویل پر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آٹھ بیٹے تھے۔ حضرت اسماعیل کی والدہ حضرت ہاجرہ القبطیہ تھیں اور حضرت اسحٰق کی والدہ حضرت سارہ تھیں اور بقیہ چھ کی والدہ قطورا بنت یقطن کنعانیہ تھیں جن سے حضرت ابراہیم نے حضرت سارہ کی وفات کے بعد نکاح کیا تھا۔

ے اس کا عطف ابراھیم پر ہے، یعنی حضرت یعقوب نے بھی اپنے بارہ بیٹوں کو یہی وصیت کی تھی۔

ے یہ بصریوں کے نزدیک قال مضمر کا مفعول ہے اور کوفیوں کے نزدیک وصی کا مفعول ہے کیونکہ وصیت قول کی ہی نوع ہے۔

ے یعنی تم ایسی حالت میں مرنا کہ تم خالص مومن ہو اور اپنے امور اپنے رب کے سپرد کر چکے ہو۔ یہاں ظاہراً نہی موت پر واقع ہوئی ہے لیکن حقیقت میں اسلام کے چھوڑنے سے منع کیا جا رہا ہے کہ تم کسی وقت بھی اسلام کی پیروی کو ترک نہ کرنا تاکہ اس وقت میں تم پر موت نہ آجائے۔ اور اسلام کے علاوہ کسی دین پر موت میں کوئی بھلائی اور خیر نہیں ہے۔ پس ایسی موت تم پر نہیں آنی چاہئے۔ یہودیوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا کیا آپ جانتے نہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے جس دن وصال فرمایا تھا اس دن آپ نے اپنے بیٹوں کو یہودیت کی وصیت کی تھی۔ تو یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

" بھلا کیا تم (اس وقت) موجود تھے جب آ پہنچی یعقوب کو موت لے جب کہ پوچھا اس نے اپنے بیٹوں سے کہ تم کس

کی عبادت کرو گے میرے (انتقال کر جانے کے) بعد ؟ انہوں نے عرض کی ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے بزرگوں ابراہیم و اسماعیل اور اسحٰق کے خدا کی جو خدائے وحدہٗ لاشریک ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے۔"

ا۔ ام منقطعہ ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے لَيْسَ الْاَمْرُ كَمَا قُلْتُمْ اَيُّهَا الْيَهُوْدُ بَلْ كُنْتُمْ الخ۔ اے یہودیو! جس طرح تم کہتے ہو بات اس طرح نہیں ہے بلکہ کیا تم حاضر تھے۔ یعنی تم تو حاضر ہی نہ تھے اس وقت تو پھر یہ باطل دعوے کیوں کرتے ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ خطاب مومنین کو ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ تم اس وقت موجود نہ تھے، تمہیں تو صرف وحی کے ذریعے اب بات کا علم ہوا ہے۔ اذ قال لبنيه، اذ حضر سے بدل ہے۔

۲۔ اس سوال سے آپ کا مقصود انہیں توحید اور اسلام پر پختہ کرنا تھا اور ان سے یہ عہد لینا تھا۔ عطاء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی روح قبض نہیں فرمائی یہاں تک کہ پہلے اسے موت وحیات کے درمیان اختیار دیا گیا۔ جب یعقوب علیہ السلام کو یہ اختیار ملا تو آپ نے کہا مجھے تھوڑی سی مہلت ہوتا کہ میں اپنی اولاد سے یہ سوال پوچھ لوں اور انہیں وصیت کرلوں۔ آپ کو یہ مہلت ملی تو آپ نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو جمع فرمایا اور کہا میری موت کا پیام آچکا ہے تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے۔

۳۔ انہوں نے عرض کی ہم عبادت کریں گے، آپ کے خدا کی اور آپ کے بزرگوں کے خدا کی۔ ابراہیم، اسماعیل اور اسحٰق، آباء ک سے عطف بیان ہے۔ اسماعیل علیہ السلام اگرچہ ان کے چچا تھے لیکن عرب چچا کو بھی اب کہہ دیتے ہیں جیسے خالہ کو ماں کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے عَمُّ الرَّجُلِ صِنْوُ اَبِيْهِ انسان کا چچا باپ کی مثل ہے(۱) اس حدیث کو ترمذی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے الطبرانی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، ترمذی نے اسے صحیح بھی کہا ہے، اسی طرح آپ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق فرمایا تھا میرے باپ کو میرے پاس لے آؤ۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں قریش آپ کے ساتھ وہی معاملہ نہ کریں جو ثقیف نے عروہ بن مسعود سے کیا تھا۔ ثقیف نے عروہ بن مسعود کو قتل کر دیا تھا۔

۴۔ یہ الهك واله آباء ك میں جو مضاف ہے اس سے بدل ہے، اس تکرار کا فائدہ توحید باری تعالیٰ کی تصریح ہے اور ضمیر مجرور (ک) پر بغیر الہ کے ذکر کے عطف مشکل تھا تو دوبارہ الہ کے ذکر سے جو وہم پیدا ہوتا تھا (کہ حضرت یعقوب کا الہ اور ہے اور ان کے آباء کا الہ اور ہے) اسے دور کرنا مقصود ہے، یا یہ فعل مقدر کے ساتھ منصوب ہے۔ یعنی ہم الهك واله اباء ك سے ایک خدا ہی مراد لیتے ہیں۔

۵۔ یہ نعبد کے فاعل یا مفعول یا دونوں سے حال ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جملہ معترضہ ہو۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

"یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی انہیں فائدہ دے گا جو (نیک عمل) انہوں نے کمایا اور تمہیں نفع دیں گے جو (نیک اعمال) تم نے کمائے اور نہ پوچھے جاؤ گے تم اس سے جو وہ کیا کرتے تھے ۱۔"

۱۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 3758-3760 (علیہ)

لے امت سے مراد ابراہیم، یعقوب اور ان کے بیٹے ہیں اور امة کا اصل معنی مقصود ہے۔ جماعت کو امة اسی لئے کہتے ہیں کہ مختلف گروہ اس کا قصد کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی نیکیاں تمہیں نفع نہ دیں گی، نسبت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا جب تک تم ان نیک اعمال میں ان کی موافقت و پیروی نہ کرو گے۔ جو وہ کرتے تھے اس کا تم سے مؤاخذہ نہ ہوگا بلکہ ہر ایک سے اپنے عمل کے متعلق سوال ہوگا۔ دوسروں کے عمل کے متعلق سوال نہ ہوگا۔

ابن ابی حاتم نے سعید اور عکرمہ کے طریق سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ابن صوریا نے نبی کریم ﷺ سے کہا ہدایت کا راستہ تو صرف وہی ہے جس پر ہم گامزن ہیں، اے محمد ﷺ آپ ﷺ بھی ہماری پیروی کریں تو ہدایت پا جائیں گے۔ نصاریٰ نے بھی اسی طرح کہا(1) امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا کہ مدینہ کے یہودی رئیس کعب بن اشرف، مالک بن الضیف، وہب بن یہودا، ابی یاسر بن اخطب اور اہل نجران کے نصاریٰ السید اور العاقب اور ان دونوں کے ساتھی مسلمانوں سے دین کے متعلق جھگڑنے لگے۔ ہر گروہ کہتا کہ ان کا دین حق ہے یہود نے کہا ہمارے نبی موسیٰ علیہ السلام تمام انبیاء سے افضل ہیں اور ہماری کتاب تمام کتب سے برتر ہے اور ہمارا دین تمام ادیان سے افضل ہے اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام، انجیل، محمد ﷺ اور قرآن کا انکار کیا۔ نصاریٰ نے کہا ہمارے نبی عیسیٰ علیہ السلام تمام نبیوں سے افضل ہیں ہماری کتاب انجیل تمام کتب سے افضل ہے اور ہمارا دین تمام دینوں سے افضل ہے۔ انہوں نے بھی محمد ﷺ اور قرآن کا انکار کیا۔ دونوں فریق مسلمانوں کو کہتے کہ تم ہمارے دین پر آ جاؤ، ہمارے دین کے علاوہ تو کوئی دین ہے ہی نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی(2)۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

"اور (یہودی کہتے ہیں) یہودی بن جاؤ، (عیسائی کہتے ہیں) عیسائی بن جاؤ (تب) ہدایت پالو گے، آپ فرمائیے میرا دین تو دین ابراہیم ہے جو باطل سے منہ موڑنے والا حق پسند تھا اور وہ نہیں تھا شرک کرنے والوں سے لے"

لے او کا کلمہ تنویع کے لئے ہے یعنی ان کی بات علیحدہ علیحدہ تھی اور تهتدوا یہ امر کا جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے پیارے محمد ﷺ فرما دیجئے یعنی ہم نہ یہودی بنیں گے نہ نصاریٰ بنیں گے، بلکہ ہم تو ملت ابراہیمی کے پیروکار ہیں۔ یا علی حرف جر کو حذف کر کے ملة کو منصوب پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا ہم ملت ابراہیمی پر ہیں یا یہ معنی کہ بلکہ ہم ملت ابراہیمی کی اتباع کرتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ اے یہود و نصاریٰ تم بھی ملت ابراہیمی کی اتباع کرو۔ حنیفا الحنف سے مشتق ہے جس کا معنی راستے سے ہٹ جانا ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام تمام ادیان کو چھوڑ کر اسلام کی طرف مائل تھے۔ مضاف سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی باطل سے مائل ہونے والی ملت یا یہ مضاف الیہ سے حال ہے، یعنی ابراہیم علیہ السلام باطل سے منہ موڑ کر اسلام کی طرف مائل تھے۔ قرآن کریم میں ایک اور جگہ بھی مضاف الیہ سے حال بنایا گیا ہے مثلاً وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا (اور ہم نکال دیں گے جو کچھ ان کے سینوں میں ہے اور وہ بھائی بھائی بن جائیں گے)۔ یہاں هم سے اخوانا حال ہے اور کوفیوں کے نزدیک حنیفا منصوب علی القطع ہے یعنی اصل میں اِبْرَاهِيْمَ الْحَنِيْفَ، تھا اَلْحَنِيْفَ، اِبْرَاهِيْمَ کی صفت تھا۔ لیکن جب الف لام ساقط ہو گیا تو نکرہ معرفہ کی

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 257 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 162 (العلمیہ)

صفت نہیں بن سکتا تھا۔ اس لئے اعراب میں علیحدہ کردیا اور اسے نصب دے دی گئی۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کے الفاظ میں یہود ونصاریٰ کو اشارہ کرنا ہے کہ تم دعویٰ تو ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کا کرتے ہو جبکہ تم مشرک ہو (اور وہ شرک سے کوسوں دور تھے)۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

"کہہ دو ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا ہماری طرف اور جو اتارا گیا ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اور جو عطا کیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو عنایت کیا گیا [1] دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے ہم فرق نہیں کرتے ان میں کسی پر ایمان لانے میں [2] اور ہم تو اللہ کے فرمانبردار ہیں [3]"

[1] قرآن کو مقدم فرمایا کیونکہ دوسری کتب پر ایمان لانے کا سبب ہمارا قرآن ہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل کئے گئے۔ حضرت ابراہیم اور آپ کے بیٹے پوتے ان صحیفوں کے مکلف تھے۔ اس لئے ان کی طرف نزول کی نسبت صحیح ہے۔ جیسا کہ قرآن کے انزال کی نسبت ہماری طرف کی گئی ہے کیونکہ محمد ﷺ کی متابعت کرتے ہیں۔ الاسباط سے مراد بنی اسرائیل کی جماعات ہیں جیسے عربوں کے قبائل اور عجمیوں کے شعوب ہوتے ہیں۔ بنو اسرائیل کی بارہ جماعتیں تھیں۔ ہر جماعت یعقوب علیہ السلام کے ایک بیٹے کی اولاد تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسباط سے مراد یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہیں۔ ان کو سبط اس لئے کہا جاتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کی اولاد ایک جماعت تھی۔ سبط الرجل ان کے نواسے اور پوتے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کو سبط رسول اللہ ﷺ کہا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے۔ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى سے مراد تورات اور انجیل ہے۔ وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ سے مراد وہ ہے جو تمام انبیاء پر نازل ہوا ہے۔

[2] ہم کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے جیسے یہود و نصاریٰ تفریق کرتے تھے۔ ان میں سے ہر گروہ بعض پر ایمان لاتا تھا اور بعض کو جھٹلاتا تھا۔

[3] اسلام ہی ابراہیم الحنیف کی ملت تھا اور ہر نبی کا دین تھا اور محمد ﷺ کا دین ہے۔ یہودی اور نصاریٰ جو خیال اور عقیدہ رکھتے ہیں وہ دین نہیں شرک ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں دنیا و آخرت میں عیسیٰ علیہ السلام کا زیادہ قریبی ہوں، انبیاء باپ کی طرف سے بھائی تھے اور ان کی مائیں مختلف تھیں اور ان کا دین ایک تھا اور ہمارے درمیان (یعنی میرے اور عیسیٰ علیہ السلام) کوئی نبی نہیں ہے (1) یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ میں کہتا ہوں حضور علیہ السلام کے ارشاد اَلْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ مِنْ عِلَّاتٍ وَاُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ کا معنی یہ ہے کہ ان کی اصل ایک ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی اور ان کی استعدادات مختلف ہیں۔ انہی استعدادات کے اختلاف کی وجہ سے جو بمنزلہ امہات ہیں، ان کی شریعتوں کی فروعات میں اختلاف تھا اور ان کا دین ایک تھا اور وہ اللہ کے اوامر کی اتباع اور خواہشات کے ترک پر نواہی کی اتباع، اس کی ذات و صفات پر ایمان اور مبدا و معاد کے متعلق اخبار و احکام پر ایمان ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ اہل کتاب تورات عبرانی میں پڑھتے تھے اور اس کی تفسیر اہل اسلام کے لئے عربی

1۔ صحیح بخاری: 3259 (ابن کثیر)

میں کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اہل کتاب کی تصدیق نہ کرو اور نہ ان کی تکذیب کرو بلکہ کہو امنا باللہ (الآیۃ) اس حدیث کو بخاری نے نقل فرمایا ہے۔(1)

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾

"تو اگر یہ بھی ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو جب تو وہ ہدایت پا گئے ۱؎ اور اگر وہ منہ پھیریں تو (معلوم ہو گیا کہ) وہی مخالفت پر کمربستہ ہیں ۲؎ تو کافی ہو جائے گا آپ کو ان کے مقابلہ میں اللہ اور وہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے ۳؎"

۱؎ یہاں باء زائدہ ہے جیسے اس قول میں زائدہ ہے جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا۔ یا لفظ مثل مقحم ہے جیسے اس ارشاد میں مقحم (زائد) ہے وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ۔ اس قول کی تائید ابن عباس کی قرأت سے بھی ہوتی ہے فَإِنْ آمَنُوا بِمَا آمَنتُم بِهِ (یعنی انہوں نے مثل کے لفظ کے بغیر پڑھا ہے)۔

۲؎ اگر وہ اس سے اعراض کریں تو حق کے خلاف ہیں یعنی ایسی شق پر ہیں جو حق کی شق کے خلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں شقاق کا معنی عداوت ہے۔

۳؎ یہ مومنین کو نصرت اور حفاظت کا وعدہ دیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وعدہ کو نضیر کے جلاوطن، قریظہ کے قتل اور یہود و نصاریٰ پر جزیہ عائد کر کے پورا فرمایا۔ وہ مومنین اور کفار کی باتوں کو سننے والا ہے اور وہ ان کی نیتوں اور احوال کو خوب جانتا ہے تمام کو اپنے کیے کی جزا دے گا۔

صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿١٣٨﴾

"(ہم پر) اللہ کا رنگ (چڑھا ہے) ۱؎ اور کس کا رنگ خوبصورت ہے اللہ کے رنگ سے ۲؎ ہم تو اسی کے عبادت گزار ہیں ۳؎"

۱؎ حضرت ابن عباس سے کلبی، قتادہ اور حسن کی روایت میں صبغۃ اللہ کا معنی دین اللہ مروی ہے۔ دین کو رنگ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کپڑے پر رنگ ظاہر ہوتا ہے(2) اسی طرح متدین پر بھی دین کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ صبغۃ اللہ امنا کا مصدر موکد ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا ملۃ ابراہیم کا بدل ہونے یا اغراء کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی تم پر اللہ کا دین لازم ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں صبغۃ اللہ سے مراد ختنہ کرنا ہے۔ کیونکہ جس کا ختنہ کیا جاتا ہے وہ خون سے رنگین ہو جاتا ہے۔ پس یہ اغراء کی بناء پر منصوب ہے یعنی ختنہ کو لازم پکڑو۔ ابن عباس فرماتے ہیں نصاریٰ کے ہاں جب بچہ پیدا ہوتا اور اسے سات دن گزر جاتے تو وہ اسے پانی میں غوطہ دیتے جس کو معمودی کہا جاتا تھا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اس عمل سے بچہ پاک ہو جاتا ہے۔ وہ ختنہ کی جگہ یہ عمل کرتے تھے جب وہ بچہ کو یہ مخصوص غسل دے دیتے تو کہتے اب یہ حقیقۃً نصرانی بن گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ اس کا دین اسلام اور اس کے احکام ہیں جیسے ختنہ وغیرہ۔(3)

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 644 (وزارت تعلیم)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 165 (فکر)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 165 (فکر)

۲۔ کس کا دین اور تطہیر اللہ تعالیٰ کے دین اور تطہیر سے بہتر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے رنگ سے کسی کا رنگ اچھا نہیں۔

۳۔ یہ اشارہ ہے کہ ہم تمہارے شرک کی طرح شرک نہیں کرتے۔ یہ آمنا پر معطوف ہوگا۔ اس صورت میں جب کہ صبغة اللہ مصدر کی حیثیت سے منصوب ہو۔ ورنہ یہ صبغة اللہ پر معطوف ہوگا، یا ملة ابراہیم پر معطوف ہوگا۔ قولوا کی تقدیر کے ساتھ۔ مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کے دین کو لازم پکڑو اور کہو ہم تو اسی کے عبادت گزار ہیں۔ یا یہ معنی کہ ابراہیم علیہ السلام کی ملة کو لازم پکڑو اور کہو ہم تو اسی کے عبادت گزار ہیں۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۙ﴿۱۳۹﴾

"آپ فرمائیے کیا تم جھگڑتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک ہے اور ہمیں ہمارے اعمال اور تمہیں تمہارے اعمال (فائدہ پہنچائیں گے) ہم تو اسی کی اخلاص سے عبادت کرتے ہیں ۱۔"

۱۔ اے پیارے محمد ﷺ یہود و نصاریٰ کو فرما دو کیا تم جھگڑتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے دین کے بارے میں اور اس بات میں کہ اس نے عربوں سے نبی چن لیا ہے اور تم سے منتخب نہیں فرمایا۔ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، کسی قوم کو خصوصیت نہیں ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نبوت کے لئے چن لیتا ہے۔ تمہارے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی اپنے اپنے عمل کی جزاء ہے۔ تم تو اس کے شریک بناتے ہو اس لئے ہم نبوت کے زیادہ حق دار ہیں۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اخلاص یہ ہے کہ انسان اپنے دین کی پیروی اور اپنا ہر عمل اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرے، نہ کہ اس کے دین میں اس کے ساتھ شرک کرے اور عمل ریا کاری اور دکھاوے کے لئے کرے۔ فضیل فرماتے ہیں لوگوں کی خاطر عمل کو چھوڑنا ریا کاری ہے اور لوگوں کے لئے عمل کرنا شرک ہے اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان دونوں آلائشوں سے بچالے۔(1)

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

"کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی تھے یا عیسائی فرمائیے کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ ۱۔ اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو چھپاتا ہے گواہی جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے اور اللہ بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو ۲۔"

۱۔ ام منقطعہ ہے اور ہمزہ انکار کے لئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ام بمعنی ہمزہ ہے اور توبیخ کے لئے ہے، تقولون کو ابن عامر، حمزہ، کسائی اور حفص نے خطاب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے نہ نصرانی۔ لیکن وہ تمام ادیان کو چھوڑ کر اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے یعنی مسلمان تھے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 166 (مکہ)

بخلاف یہود ونصاریٰ کے کہ وہ مشرک ہیں۔اور جو لوگ منسوخ ہونے سے پہلے موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے دین حق پر تھے وہ دین میں حضرت ابراہیم کی اتباع کرنے والے تھے اور وہ مشرک نہ تھے۔تورات وانجیل کا نزول ہی ابراہیم علیہ السلام کے بعد ہوا ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کیسے کی ہے۔بلکہ وہ دونوں ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کرتے تھے۔یہود ونصاریٰ اس حقیقت سے آگاہ تھے لیکن انہوں نے حق کی گواہی کو چھپائے رکھا۔

لے کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو چھپاتا ہے اس گواہی کو جو تورات میں ثابت ہے۔من اللہ سے پہلے من ابتدائیہ ہے اور شہادۃ کے متعلق ہے۔مطلب یہ ہے کہ کوئی زیادہ ظالم نہیں ہے اس سے جو اس گواہی کو چھپاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے حنیف ہونے اور ان کے یہودیت اور نصرانیت سے بری ہونے اور محمد ﷺ کی نبوت کے متعلق تورات اور انجیل میں بیان فرمائی ہے۔وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (اللہ بے خبر نہیں ہے جو تم کررہے ہو)۔یہ یہود ونصاریٰ کے لئے وعید ہے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤١﴾

"وہ ایک امت تھی جو گزر چکی اسے ملے گا جو اس نے کمایا اور تمہیں ملے گا جو تم نے کمایا اور تم سے نہ پوچھا جائے گا اس سے جو وہ کیا کرتے تھے لے"

لے اس آیت کریمہ کا دوبارہ ذکر تحذیر اور زجر میں مبالغہ کرنے کیلئے ہے کہ اپنے آباء کے نیک اعمال پر فخر نہ کرو اور اس پر بھروسہ نہ کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلا خطاب یہود ونصاریٰ کو تھا اور یہ خطاب ہمارے لئے ہے۔ہمیں ڈرایا جارہا ہے کہ ہم بھی یہود ونصاریٰ کی طرح بزرگوں کی نیکیوں کو ہی باعث فخر نہ سمجھیں۔بعض فرماتے ہیں پہلی آیت سے مراد انبیاء کرام ہیں اور دوسری آیت میں یہود ونصاریٰ کے اسلاف ہیں۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٤٢﴾

"اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا ان (مسلمانوں) کو اپنے قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے لے آپ فرمائیے اللہ ہی کا ہے مشرق بھی اور مغرب بھی ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف ہے"

لے جنہوں نے تقلید اور غور وفکر سے اعراض یا عناد کی وجہ سے اپنی عقول کو خفیف اور ہلکا کردیا ہے یعنی منافقین، یہود اور مشرکین کہیں گے کہ کس چیز نے انہیں پھیر دیا ہے۔ان کو اپنے قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے۔یعنی بیت المقدس سے کیوں پھر گئے ہیں۔بیوقوفوں کی باتوں کی پہلے خبر دینے کا فائدہ نفس کو اطمینان عطا کرنا اور جواب کے لئے مسلمانوں کو تیار کرنا تھا۔قِبْلَۃ اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جس پر انسان کسی چیز کے سامنے ہوتا ہے جیسے جِلْسَۃ بیٹھنے کی حالت۔پھر یہ اس مکان کے لئے نقل کیا گیا جس کی طرف نمازی نماز میں متوجہ ہوتا ہے۔

یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین اور یہود نے بیت المقدس سے مکہ مکرمہ کی طرف تحویل قبلہ پر طعن شروع کیا تھا۔ابن

جریر نے سدی کے طریق سے کئی اسانید کے ساتھ نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو نماز کے اندر بیت المقدس سے کعبہ مشرفہ کی طرف منہ کرنے کا حکم فرمایا تو مشرکین مکہ کہنے لگے محمد ﷺ اپنے دین کے متعلق متحیر ہیں وہ اپنے قبلہ کو چھوڑ کر تمہارے قبلہ کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے تم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو امید ہے، وہ تمہارے دین میں داخل ہو جائیں گے (1)

بغوی نے ذکر کیا ہے کہ یہود کے رئیسوں نے معاذ بن جبل کو کہا کہ محمد (ﷺ) نے حسد کی بناء پر ہمارے قبلہ کو چھوڑ دیا ہے۔ (2)

۲ قبلہ کسی جہت کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک امر تعبدی ہے۔ اس میں اعتبار صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کا ہوتا ہے اس میں مکان کی خاصیت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اسے اپنے پسندیدہ راستہ کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

"اور اسی طرح ہم نے بنا دیا تمہیں (اے مسلمانو!) بہترین امت ۱ تاکہ تم گواہ ہو لوگوں پر اور (ہمارا) رسول تم پر گواہ ہو ۲ اور نہیں مقرر کیا ہم نے (بیت المقدس کو) قبلہ جس پر آپ (اب تک) رہے ۳ مگر اس لئے کہ ہم دیکھ لیں کہ کون پیروی کرتا ہے (ہمارے) رسول کی (اور) کون مڑتا ہے الٹے پاؤں ۴ بے شک یہ (حکم) بہت بھاری ہے مگر ان پر (بھاری نہیں) جنہیں اللہ نے ہدایت فرمائی ۵ اور نہیں اللہ کی یہ شان کہ ضائع کر دیں تمہارا ایمان ۶ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بہت ہی مہربان (اور) رحم فرمانے والا ہے ۷"

۱ یہ پہلی آیت کی طرف اشارہ ہے یعنی جس طرح ہم نے تمہیں صراط مستقیم کی طرف ہدایت عطا فرمائی۔ یا سابقہ کلام کی طرف اشارہ ہے یعنی جس طرح ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں چن لیا تھا اور اسے آخرت میں صالحین سے کر دیا تھا۔ اے امت محمدیہ ﷺ تمہیں ہم نے بہترین امت بنا دیا یعنی دوسرے لوگوں سے تمہیں بہتر بنایا علم وعمل اور معرفت سے تمہیں پاکیزہ کر دیا۔ وسط اصل میں اس مکان کا اسم ہے جس کی طرف ہر جانب سے لمبائی برابر ہو، پھر استعارۃً خصائل محمودہ کے لئے استعمال ہونے لگا، کیونکہ اچھے خصائل افراط وتفریط کے درمیان ہوتے ہیں، جیسے سخاوت بخل اور اسراف کی درمیانی کیفیت کا نام ہے اور شجاعت، بزدلی اور پاگل پن کے درمیان ہے۔ پھر اس شخص پر بھی وسط کا اطلاق کیا گیا جو ان متوسط خصائل سے آراستہ ہو اور یہ وسطا کا لفظ واحد تثنیہ، جمع، مذکر اور مؤنث میں برابر استعمال ہوتا ہے جیسے دوسرے اسماء جن کے ساتھ صفت بیان کی جاتی ہے، واحد تثنیہ جمع کے لئے برابر استعمال ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "قَالَ اَوْسَطُهُمْ" یعنی ان سے بہتر نے کہا۔ کلبی کہتے ہیں یہاں مضاف کو حذف کیا گیا ہے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے یعنی ایسے دین والے جو غلو اور تقصیر کے درمیان ہیں (3) اسی آیت سے اجماع کی حجیت پر دلیل پکڑی گئی ہے کیونکہ جس چیز پر ان کا اجماع ہو اس کا بطلان ان کی عدالت کے منافی ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگر مجتہد اپنے اجتہاد میں خطا کرے تو اس کی عدالت اس سے زائل نہیں ہوتی تو تمام لوگوں کے غلطی پر اتفاق سے ان کی عدالت کیوں ختم ہو جاتی ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 262 (العلمیہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 168 (فکر)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 168 (فکر)

جواباً میں کہوں گا کہ آپ نے ابھی پڑھا ہے کہ وسط کا لفظ ابتداءً خصائل حمیدہ کے لئے استعارۃً استعمال ہوا پھر اس کا اطلاق اس شخص پر ہونے لگا جو ان خصائل سے متصف ہو جیسے کہا جاتا ہے زید عدل۔ اور الکلبی کے قول کے مطابق یہ ان کے دین کی صفت ہے۔ پس امت محمدیہ ﷺ پر امت وسط کا اطلاق دلیل ہے کہ ان کے دین کے احکام اور جن خصائل پر یہ متفق ہیں وہ تمام کے تمام محمودہ ہیں۔ پس ان کے اجماع میں غلطی کے وقوع کی تقدیر پر بھی یہ فسق کے ساتھ متصف نہ ہوں گے۔ اگر چہ وہ اس غلطی میں معذور بھی ہیں۔ لیکن ان کے بعض خصائل مذموم بھی ہیں۔ پس ان کے تمام خصائل کا محمودہ ہونا متصور نہیں ہو سکتا۔ و اللّٰہ اعلم۔ حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن عصر کے بعد ہمارے درمیان کھڑے ہوئے آپ ﷺ نے قیامت کی ہر چیز کو وہاں کھڑے کھڑے بیان فرما دیا حتیٰ کہ سورج کھجوروں کے سروں پر اور دیواروں کی اطراف پر پہنچ گیا فرمایا خبردار دنیا کا اب صرف اتنا وقت باقی ہے جتنا تمہارا یہ دن باقی ہے اور دنیا اتنی گزر چکی ہے جتنا تمہارا یہ دن گزر چکا ہے۔ یہ امت ستر امتوں کا کام پورا کرتی ہے۔ یہ امت اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر اور معزز ہے(1) اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے اور ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی نے بهز بن حكيم عن ابيه عن جده کے طریق سے اسی طرح روایت کی ہے۔

لِّ تاکہ تم قیامت کے دن لوگوں پر گواہی دو کہ رسولوں نے انہیں پیغام الٰہی پہنچا دیا تھا۔ یہ ان کے عادل بنانے کی تعلیل ہے اور اس میں یہ دلیل ہے کہ عدالت شہادت کے لئے شرط ہے اور محمد ﷺ تمہاری عدالت پر گواہ ہوں گے اور وہ تمہاری عدالت اور تمہارے تزکیہ کی گواہی دیں گے۔ یہاں حرف جار "علی" استعمال ہوا ہے حالانکہ حق لام جارہ کا تھا۔ لیکن شہید رقیب کی طرح ہوتا ہے اس لئے علی کا کلمہ استعمال فرمادیا ہے۔ امام بغوی نے ذکر کیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اولین و آخرین تمام کو ایک میدان میں جمع فرمائے گا۔ پھر کفار سے پوچھے گا اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ (کیا تمہارے پاس ڈرانے والا نہیں آیا تھا) وہ کہیں گے "مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ" (ہمارے پاس تو کوئی نہ بشارت دینے والا آیا اور نہ ڈرانے والا)۔ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام سے ان کے اس دعویٰ کے متعلق پوچھیں گے۔ انبیاء کرام فرمائیں گے یہ جھوٹے ہیں، ہم نے ان کو پیغام پہنچایا تھا۔ اللہ انبیاء کرام سے اپنے قول کی صداقت کی دلیل پوچھیں گے (حالانکہ وہ جانتا ہے) تاکہ حجت قائم ہو جائے۔ پس امت محمدیہ ﷺ کو لایا جائے گا وہ انبیاء کرام کے حق میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا تھا۔ گزشتہ امتیں کہیں گی انہیں کیسے معلوم ہوا، یہ تو آئے بھی ہمارے بعد تھے۔ امت محمدیہ ﷺ سے سوال ہوگا بتاؤ تمہیں کیسے علم ہوا؟ وہ کہیں گے تو نے ہماری طرف اپنا رسول بھیجا اور تو نے اس پر کتاب نازل فرمائی، اس میں تو نے ہمیں اپنے رسولوں کی تبلیغ کے بارے خود بتایا اور تو اپنی خبر میں سچا ہے۔ پھر محمد ﷺ کو لایا جائے گا آپ ﷺ سے اپنی امت کی حالت کے متعلق پوچھا جائے گا آپ ﷺ امت کا تزکیہ فرمائیں گے اور اس کی سچائی کی گواہی بھی دیں گے(2) امام بخاری، ترمذی اور نسائی نے ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز نوح علیہ السلام کو لایا جائے گا ان سے پوچھا جائے گا کیا تو نے تبلیغ کی تھی؟ آپ عرض کریں گے ہاں یارب! پھر آپ کی امت سے سوال ہوگا کیا نوح علیہ السلام نے تمہیں تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے مَا جَآءَنَا مِنْ نَّذِيْرٍ (ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا)۔ نوح علیہ السلام سے اپنی بات پر شہادت طلب کی جائے گی تمہارے گواہ کون ہیں؟ آپ کہیں گے محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی امت میری گواہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر تمہیں لایا جائے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 168 (فکر)　2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 120 (وزارت تعلیم)

گا پس تم گواہی دو گے پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔ تم نوح علیہ السلام کی تبلیغ کی گواہی دو گے اور میں تم پر گواہی دوں گا۔ امام احمد، نسائی اور بیہقی نے حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے اس مفہوم میں روایت کی ہے قیامت کے روز ایک نبی آئے گا اس کے ساتھ ایک امتی ہوگا اور نبی آئے گا اس کے ساتھ دو شخص ہوں گے اور اس سے کچھ زیادہ ان سے سوال ہوگا کیا تم نے تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے ہاں۔ پھر قوم کو بلایا جائے گا ان سے سوال ہوگا کیا انہوں نے تمہیں تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے نہیں۔ انبیاء کرام سے پوچھا جائے گا تمہارا کون گواہ ہے کہ تم نے تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم۔ امت محمدیہ ﷺ کو بلایا جائے گا وہ گواہی دیں گے کہ انبیاء کرام نے تبلیغ کی تھی۔ امت محمدیہ ﷺ سے سوال ہوگا تمہیں کیسے پتہ چلا کہ انہوں نے تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے ہمارے پاس ہمارا نبی مکرم ﷺ کتاب لیکر آیا تھا، اس نے ہمیں بتایا تھا کہ انبیاء کرام نے تبلیغ کی تھی، پس ہم نے اس کی تصدیق کی ارشاد ہوگا تم سچے ہو۔(1)

۲۔ الجعل یا تو ایک مفعول کی طرف متعدی ہے اور موصول مع صلۃ القبلۃ کی صفت ہے اور مضاف محذوف ہے یعنی مَا جَعَلْنَا تَحْوِيْلَ الْقِبْلَةِ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا۔ ہم نے اس قبلہ کی تحویل کو نہیں بنایا جس پر آپ پہلے تھے۔ یعنی بیت المقدس یا الجعل دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوگا اور مفعول ثانی محذوف ہوگا یعنی وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا مَنْسُوْخَةً۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ القبلۃ مفعول اول ہو اور موصول مع صلۃ بمعنی جہت مفعول ثانی ہو اور موصول سے مراد بیت المقدس ہو۔ اور معنی یہ ہوگا کہ سابقہ زمانہ میں ہم نے قبلہ وہ جہت نہیں بنائی تھی جس پر آپ تھے۔ یعنی تمہارے معاملہ کی اصل تو کعبہ کی طرف منہ کرنا تھا اور بیت المقدس کو ہم نے سابقہ زمانہ میں آپ کا قبلہ نہیں بنایا تھا مگر اس غرض سے تاکہ ہم جان لیں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ کنت علیھا کا معنی اَنْتَ عَلَيْهَا الْآنَ ہو یعنی جس قبلہ پر اب آپ ﷺ ہیں، یعنی کعبہ پر مگر اس لئے تاکہ ہم جان لیں۔ بعض علماء نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ہم نے اب قبلہ نہیں بنایا اس جہت کو جس پر آپ ہجرت سے پہلے تھے۔ اور وہ قبلہ کعبہ تھا۔ اس معنی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آپ ﷺ ہجرت سے پہلے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ یہ تاویل دو مرتبہ نسخ کو مستلزم ہے اور سیقول السفھاء الایۃ کے سیاق کے مخالف ہے، کیونکہ یہاں اسم موصول سے مراد صرف بیت المقدس ہی ہے۔ قیاس تو یہ تھا کہ عبارت اس طرح ہوتی وَمَا جَعَلْنَا الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا قِبْلَةً لیکن القبلۃ کو مقدم کیا گیا۔ اہتمام کی غرض سے اسے پہلا مفعول بنایا گیا۔ یہ قلب کے باب سے ہے۔

۳۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب تحویل قبلہ ہوا تو مسلمانوں کے کچھ لوگ یہودی بن گئے اور کہا کہ محمد ﷺ اپنے آباء کے دین کی طرف لوٹ آئے ہیں(2) العلم یا تو بمعنی معرفت ہے۔ اور مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ اس کا مفعول ہے اور مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ اس کے متعلق ہے، یا یہ اس کے متعلق ہے جو مَنْ میں استفہام کا معنی ہے، یا من موصولہ مفعول اول ہے اور ممن ینقلب مفعول ثانی ہے، یعنی تاکہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی اتباع کرتا ہے ممتاز ہوتے ہوئے مرتدوں سے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے قبلہ کی تحویل کو اس کی غایت کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ اس کا جواب کئی وجوہ سے ہے (1) اہل معانی کہتے ہیں لام تعلیل کے لئے ہے، غایت کے بیان کے لئے نہیں ہے اور مضارع کا صیغہ بمعنی ماضی ہے جیسے اس ارشاد میں مضارع بمعنی ماضی استعمال ہوا ہے فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ (پھر تم کیوں قتل کرتے رہے اللہ کے پیغمبروں کو)۔ معنی یہ ہوگا کہ تحویل قبلہ اس لئے ہوا کیوں کہ ہمیں معلوم تھا کہ تحویل قبلہ ایک قوم کی

1۔ شعب الایمان، 264 (علمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 169 (الفکر)

ہدایت کا سبب ہے اور دوسری قوم کی گمراہی کا باعث ہے۔(2) علم سے مراد التمیز ہے، مسبب کو سبب کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ معنی یہ ہوگا تا کہ ہم حق کے پرستاروں اور باطل کے پجاریوں میں تمیز کر دیں۔(3) یا یہ مراد ہے کہ تا کہ ہمارا رسول اور ہمارے دوست جان لیں۔ مضاف کو حذف کیا گیا ہے اور فعل کو مجازاً اپنی طرف منسوب کر دیا ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِي میں مریض تھا تو نے میری عیادت نہیں کی۔ ایسا اسلوب اپنے بندوں کے شرف کے اظہار اور ان کے اختصاص کے لئے اختیار کیا جاتا ہے ان تاویلات میں مجاز اور تکلفات ہیں۔ تحقیق وہی ہے جو الشیخ ابو منصور الماتریدی نے لکھی ہے کہ اس کا معنی ہے تا کہ ہم موجودہ حالت میں جان لیں جس کا ہمیں پہلے سے علم ہے کہ ایسا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ازل سے عالم ہے، ہر اس چیز کا جس کے وجود کا اس نے ارادہ فرمایا کہ وہ پایا جائے گا اس وقت میں جس میں اس کا وجود وہ چاہے گا۔ یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ازل میں عالم ہے کہ یہ چیز فی الحال موجود ہے، کیونکہ وہ موجود نہیں تھی تو پھر خلاف واقع پر وہ اسے کیسے موجود جانے گا اور یہ تغیر معلوم پر ہے علم پر نہیں ہے۔ اس آیت میں اور اس کی مشابہ آیات میں یہی مراد ہوتا ہے کہ علم سے مراد اس کا تعلق حالی ہے جس پر جزاء کا دارومدار ہے۔ إِلَّا لِنَعْلَمَ کا معنی یہ ہوگا تا کہ ہمارا علم اس کے وجود کے ساتھ متعلق ہو جائے۔

۵ ان مخففہ من مثقلہ ہے اور لام ان مخففہ اور شرطیہ کے درمیان فاصلہ کے لئے ہے۔ سیبویہ کہتے ہیں ان تاکید ہے قسم کے مشابہ ہے۔ اسی وجہ سے اس کے جواب پر لام داخل ہوتا ہے۔ کوفی علماء کہتے ہیں ان نافیہ ہے اور لام بمعنی إِلَّا ہے اور ضمیر مرفوع کا مرجع ما جعلنا القبلۃ کا مدلول الجعلۃ ہے یا اس کا مرجع التحویلۃ یا القبلۃ ہے۔

۶ اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ ایمان پر تمہاری ثابت قدمی کو ضائع کر دے یا قبلہ منسوخہ پر تمہارے ایمان لانے کو ضائع کر دے۔ بعض فرماتے ہیں ایمان سے مراد نماز ہے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ حیی بن اخطب اور اس کے یہودی دوستوں نے مسلمانوں سے کہا کہ ہم کو اپنی اس نماز کے متعلق بتاؤ جو تم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ادا کی ہیں، اگر وہ ہدایت تھی تو تم نے ہدایت سے منہ پھیر لیا۔ اگر وہ گمراہی تھی تو تم نے گمراہی کے ساتھ خدا کی عبادت کی۔ اور جو تم میں سے اسی قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہوئے وصال کر گئے ان کا کیا ہوگا۔ مسلمانوں نے کہا ہدایت وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ حکم دے اور گمراہی وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ منع فرمائے۔ تمہاری ان کے بارے میں کیا گواہی ہے جو تم میں سے ہمارے قبلہ پر مرے ہیں۔ تحویل قبلہ سے پہلے اسعد بن زرارہ بنی نجار سے، البراء بن معرور بن سلمہ وصال کر گئے تھے اور یہ دونوں نقباء سے تھے اور دوسرے لوگ بھی کئی وصال کر گئے تھے۔ لوگوں کے متعلقین رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ کی طرف پھیر دیا ہے، ہمارے ان بھائیوں کا کیا بنے گا جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے وصال فرما گئے ہیں؟ ان کے اس سوال پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اَیْ صَلٰوتَكُمْ اِلٰى بَيْتِ الْمُقَدَّسِ(1) صحیحین میں براء بن عازب سے مروی ہے کہ تحویل قبلہ سے پہلے کئی افراد وصال کر گئے تھے لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہم ان کے متعلق کیا کہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(2)

۷ نافع، ابن کثیر، ابن عامر اور حفص نے لرءوف کو شکور کے وزن پر اشباع کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے فَعُلٌ کے وزن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 170 (فکر)   2۔ صحیح بخاری: 4216 (ابن کثیر)

پر اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے۔ رافعۃ میں رخمت سے زیادہ ہے لیکن رحیم پر اس کی تقدیم فواصل کی رعایت کے لئے ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

"ہم دیکھ رہے ہیں بار بار آپ کا منہ کرنا آسمان کی طرف[1] تو ہم ضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلہ کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں[2] (لو) اب پھیر لو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف (اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو پھیر لیا کرو اپنے منہ اس کی طرف[3] اور بیشک وہ جنہیں کتاب دی گئی ضرور جانتے ہیں کہ یہ حکم برحق ہے ان کے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ تعالیٰ بے خبر ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں[4]"

[1] وحی کے انتظار میں آپ کے چہرے کا آسمان کی طرف بار بار اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ نبی کریم ﷺ یہ پسند فرماتے تھے کہ قبلہ کعبہ کو بنایا جائے کیونکہ یہ آپ ﷺ کے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا اور عربوں کو ایمان کی طرف دعوت دینے کے لئے زیادہ مفید تھا۔ نیز اس میں یہود کی مخالفت بھی تھی۔ تحویل قبلہ کے واقعہ کی ابتداء یہاں سے ہوئی۔ ہجرت کے بعد سب سے پہلا جو امر شرعی منسوخ ہوا وہ قبلہ کا امر تھا۔ ہجرت سے قبل مکہ میں آپ ﷺ کے قبلہ کی کیفیت میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے آپ ﷺ مکہ میں بیت المقدس کی طرف متوجہ ہوتے تھے جبکہ کعبہ بھی آپ کے سامنے ہوتا تھا۔ اس روایت کو ابن عباس سے امام احمد نے روایت کیا ہے(1) ابن سعد نے بھی لکھی ہے اور اس کی سند جید ہے، دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ مکہ میں آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھتے تھے۔ امام بغوی فرماتے ہیں آپ ﷺ کعبہ کی طرف نماز ادا فرماتے تھے جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تو بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا(2) ابن جریر نے جید اور قوی سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کی طرف متوجہ ہونے کا حکم فرمایا(3) ابن جریج فرماتے ہیں آپ ﷺ اولاً کعبہ کی طرف نماز پڑھتے تھے پھر مکہ میں ہی بیت المقدس کی طرف متوجہ ہونے کا حکم ہوا۔ آپ ﷺ نے تین سال اسی طرح نماز پڑھی پھر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ پہلا قول اصح اور اقوی ہے۔ اور تمام احادیث کے مدلولات کو جمع کرنے کے لئے احادیث کی تاویل کی جائے گی۔

اس روایت میں اختلاف ہے کہ آپ ﷺ نے ہجرت کے بعد کتنا عرصہ بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا فرمائی۔ ابوداؤد وغیرہ نے ابن عباس سے سترہ ماہ روایت کئے ہیں۔ الطبرانی اور البزار نے عمرو بن عوف سے، ابن ابی شیبہ اور ابوداؤد وغیرھما نے ابن عباس سے، امام مالک وغیرہ نے ابن المسیب سے سولہ ماہ روایت کئے ہیں۔ بخاری نے البراء بن عازب سے سولہ یا سترہ ماہ شک کے ساتھ روایت کئے ہیں(4) حق یہ ہے کہ سولہ ماہ اور کچھ ایام تھے کیونکہ آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے سوموار کے روز پانچ ربیع الاول کو نکلے تھے اور سوموار کے روز بارہ ربیع الاول کو مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تھے۔ جبکہ تحویل قبلہ کا امر صحیح روایت کے مطابق جنگ بدر سے دو ماہ

1۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 315 (صادر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 171 (فکر)
3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 261 (علمیہ)
4۔ صحیح بخاری: 4216 (ابن کثیر)

قبل ہجرت کے دوسرے سال پندرہ رجب کو زوال کے بعد ہوا تھا۔اسی پر جمہور نے جزم کیا ہے اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ اس کو ابن عباس سے روایت کیا ہے۔اس لئے جس نے ایام کو پورا مہینہ شمار کیا اس نے سترہ ماہ ذکر کیے اور جنہوں نے اوپر والے ایام کو شمار نہیں کیا انہوں نے سولہ ماہ ذکر کیے۔اور تیرہ، انیس، اٹھارہ، دو ماہ یا دو سال کی روایات ضعیف ہیں و اللّٰہ اعلم۔

رسول اللہ ﷺ پسند فرماتے تھے کہ آپ ﷺ کا قبلہ کعبہ ہو کیونکہ یہود طعنہ دیتے تھے کہ محمد (ﷺ) دین میں ہماری مخالفت کرتا ہے اور قبلہ میں ہماری اتباع کرتا ہے۔آپ ﷺ نے جبریل سے کہا میں پسند کرتا ہوں اگر اللہ تعالیٰ مجھے کعبہ کی طرف پھیر دے کیونکہ وہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے، جبریل نے کہا حضور! میں بھی آپ ﷺ کی طرح عبد ہوں، آپ ﷺ مجھ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز ہیں، آپ ﷺ خود ہی اپنے رب کریم سے عرض کیجئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ ﷺ کا بڑا مرتبہ ہے۔آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے تھے کثرت سے آسمان کی طرف دیکھتے تھے اور حکم الٰہی کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (ہم دیکھ رہے ہیں بار بار آپ کا منہ کرنا آسمان کی طرف) کو نازل فرما دیا۔(1)

۱۔ ہم آپ ﷺ کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کی قدرت دیں گے۔یہ وَلَّيْتُهٗ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے میں نے اسے والی بنایا۔یا یہ معنی ہے کہ ہم آپ ﷺ کو ادھر کر دیں گے جو جہت آپ ﷺ کے ساتھ متصل ہے۔یا یہ معنی کہ ہم آپ ﷺ کو پھیر دیں گے ایسے قبلہ کی طرف جو آپ ﷺ کو اغراض صحیحہ اور اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اغراض کی وجہ سے پسند ہے۔

۲۔ شطر کا اصل معنی کسی چیز سے علیحدہ ہونا ہے۔یہ شطر سے مشتق ہے جس کا معنی جدا ہونا ہوتا ہے۔دارٌ شطورٌ اس گھر کو کہتے ہیں جو آبادی سے جدا ہو۔پھر یہ جانب، اور طرف کے لئے استعمال ہونے لگا اگرچہ وہ طرف اور جانب جدا نہ بھی ہو۔یہ حرف جر کو ساقط کر کے منصوب پڑھا گیا ہے یعنی الی شطر تھا۔بعض علماء فرماتے ہیں یہ ظرفیت کی وجہ سے منصوب ہے یعنی چہرے کو پھیر لو مسجد حرام کی جہت پر۔الحرام کا معنی یہ ہے کہ اس میں جنگ وجدل، شکار کرنا، درخت اور کانٹے کاٹنا وغیرہ حرام قرار دیا گیا ہے، حرم کا بھی یہی مطلب ہے۔حرم یا مسجد کا ذکر کیا ہے، کعبہ جو قبلہ تھا اس کا ذکر نہیں فرمایا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ کعبہ سے دور رہنے والے کے لئے کعبہ کی جہت اور سمت کو منہ کرنا واجب ہے، عین کعبہ کی طرف منہ کرنا واجب نہیں۔امام ترمذی حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مشرق و مغرب کے درمیان ہے وہ قبلہ ہے(2) میں کہتا ہوں مشرق سے مراد سال کے چھوٹے دنوں کا مشرق ہے اور مغرب سے مراد بھی سال کے چھوٹے دنوں کا مغرب ہے اور یہ جہت جنوب ہے جو اہل مدینہ کا قبلہ ہے، اسی طرح ہر قطر کے لوگوں کا قبلہ الگ ہے اہل ہند کا قبلہ رأس السرطان کے مغرب اور رأس الجدی کے مغرب کے درمیان ہے۔

مواہب اور سبل الرشاد میں ہے کہ آپ ﷺ بنی سلمہ میں براء بن معرور کے وصال کے بعد ام بشر بن براء بن معرور کے پاس تشریف لے گئے تو ام بشر نے آپ ﷺ کے لئے کھانا پکایا۔اسی اثناء میں ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا۔آپ ﷺ نے وہاں مسجد میں صحابہ کرام کو نماز پڑھائی۔جب آپ ﷺ دو رکعت ادا کر چکے تو جبریل امین آئے اور اشارہ کیا کہ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر لو آپ ﷺ کعبہ کی طرف پھر گئے اور آپ ﷺ نے چہرہ مبارک میزاب کی طرف کر لیا۔اس تبدیلی سے عورتیں مردوں کی جگہ اور مرد عورتوں کی جگہ آ گئے۔اسی وجہ سے اس مسجد کو مسجد قبلتین کہا جاتا ہے(3) واحدی کہتے ہیں یہ واقعہ ہمارے نزدیک اثبت ہے، آپ ﷺ نے ظہر

1۔تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 171 (فکر)
2۔جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 45 (وزارت تعلیم)
3۔سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 3 صفحہ 370 (علمیہ)

کی چار رکعتیں ادا فرمائیں دو بیت المقدس کی طرف اور دو کعبہ کی طرف۔ عباد بن بشر حضور ﷺ کے ساتھ یہ نماز پڑھ کر بنی حارثہ کے انصار کے پاس سے گزرے، وہ نماز عصر کے رکوع میں تھے، حضرت عباد نے کہا میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے، پس وہ اسی وقت بیت اللہ شریف کی طرف پھر گئے۔ صحیح بخاری میں براء بن عازب کی حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے پہلی نماز جو کعبہ کی طرف منہ کر کے ادا فرمائی وہ عصر کی نماز تھی۔ جن لوگوں نے آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تھی ان میں سے ایک شخص ایک اور مسجد میں نماز پڑھنے والوں کے پاس سے گزرا جو رکوع کی حالت میں تھے۔ اس شخص نے کہا قسم بخدا میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے وہ نمازی جس حالت میں تھے اسی حالت میں مکہ کی طرف پھر گئے(1) یہ حدیث اس بات پر محمول ہے کہ براء بن عازب کو بنی سلمہ میں پڑھی جانے والی ظہر کی نماز کا علم نہ تھا۔ یا یہ مراد ہے کہ سب سے پہلے کامل نماز جو کعبہ کی طرف ادا کی وہ عصر کی نماز تھی۔ یا یہ مطلب ہے کہ پہلی نماز جو آپ نے اپنی مسجد میں پڑھی وہ عصر کی نماز تھی۔ اہل قباء کو اس واقعہ کی خبر دوسرے دن فجر کی نماز میں ہوئی۔ جیسا کہ صحیحین میں ابن عمر سے مروی ہے کہ لوگ قبا میں صبح کی نماز ادا کر رہے تھے کہ ایک آنے والا آیا اور اس نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ ہم کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں یہ سن کر وہ اسی وقت کعبہ کی طرف پھر گئے(2) ان کے چہرے شام کی طرف تھے پھر کعبہ کی طرف گھوم گئے۔ رافع بن خدیج کہتے ہیں ہمارے پاس ایک شخص آیا ہم بنی عبد الاشہل میں نماز پڑھ رہے تھے تو اس نے کہا رسول اللہ ﷺ کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ سن کر ہمارے امام نے کعبہ کی طرف منہ کر لیا اور ہم بھی ان کے ساتھ کعبہ کی طرف پھر گئے۔

ابتداء میں خطاب خصوصیت کے ساتھ نبی کریم ﷺ کو فرمایا تا کہ آپ ﷺ کی عظمت و تعظیم کا اظہار ہو جائے۔ اس خطاب میں امت بھی شامل تھی لیکن بعد میں حکم کے عموم اور امر قبلہ کی تاکید کے لئے صراحۃ امت کو خطاب کیا گیا۔ امام بخاری ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ بیت اللہ شریف میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے اس کے تمام کونوں میں دعا فرمائی اور نماز نہ پڑھی حتیٰ کہ آپ ﷺ بیت اللہ سے باہر تشریف لے آئے۔ جب آپ ﷺ باہر آئے تو کعبہ کی طرف منہ کر کے دو رکعتیں ادا فرمائیں اور فرمایا یہ قبلہ ہے(3) صحیحین میں ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اسامہ، بلال اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم کعبہ میں داخل ہوئے کعبہ کا دروازہ بند کر لیا پھر اس میں کچھ دیر ٹھہرے رہے۔ ابن عمر فرماتے ہیں جب وہ باہر آئے تو میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا حضور نبی کریم ﷺ نے کیا عمل کیا ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بتایا دو ستون آپ ﷺ نے بائیں جانب ایک ستون دائیں جانب اور تین ستون پیچھے کی جانب رکھ کر نماز ادا فرمائی اور اس وقت بیت اللہ شریف کے چھ ستون تھے(4) میں کہتا ہوں ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

انّہ میں ہ ضمیر کا مرجع تحویل یا توجہ الی الکعبہ ہے۔ یہودی تورات کے ذریعے جان چکے تھے کہ خاتم النبیین دو قبلوں کی طرف نماز ادا کرے گا۔ انہوں نے انکار صرف ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے کیا تھا۔ ابو جعفر، ابن عامر، حمزہ اور الکسائی نے تعملون کو تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور خطاب مومنین کو ہے۔ باقی قراء نے یعملون یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ یہود کے فعل سے حکایت ہے، اس میں مومنین کے لئے وعدہ اور کافروں کے لئے وعید ہے۔ جب یہود و نصاریٰ نے کہا کہ جو تم کہتے ہو اس پر کوئی نشانی لاؤ تو اللہ تعالیٰ نے یہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 644 (وزارت تعلیم)　　2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 645 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 57 (وزارت تعلیم)　　4۔ صحیح بخاری، 483 (ابن کثیر)

آیت کریمہ نازل فرمائی۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۴۵

"اور اگر آپ لے آئیں اہل کتاب کے پاس ہر ایک دلیل (پھر بھی) نہیں پیروی کریں گے آپ کے قبلہ کی [1] اور نہ آپ پیروی کرنے والے ہیں ان کے قبلہ کی [2] اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے [3] ہیں اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس کے بعد کہ آچکا آپ کے پاس علم تو یقیناً آپ اس وقت ظالموں میں (شمار) ہوں گے [4]"

[1] یعنی اگر آپ ﷺ کعبہ کے قبلہ ہونے پر اہل کتاب کے پاس دلیل و برہان پیش بھی کر دیں۔ (لام قسم مقدر کا شعور دلانے کے لئے ہے)۔ پھر بھی یہ کعبہ کو قبلہ تسلیم نہ کریں گے ماتبعوا یہ قسم مقدر کا جواب ہے اور جواب شرط کے قائم مقام ہے یعنی انہوں نے آپ کے قبلہ سے انحراف بغض و عناد کی وجہ سے کیا ہے۔ کسی شک و شبہ کی بناء پر تو ہے نہیں کہ اس شبہ کو کسی حجت کے ساتھ دور کیا جائے۔

[2] قبلہ کا معاملہ محکم اور مستمر ہے اس میں کبھی بھی تبدیلی نہ ہوگی۔ اس جملہ میں ان کی امید و خواہش کو منقطع کرتا ہے جو وہ آپ ﷺ کے متعلق ان کے قبلہ کی طرف لوٹنے کی رکھتے تھے۔ یہود و نصاریٰ کے قبلے علیحدہ علیحدہ تھے لیکن بطلان کی جہت اور امر الٰہی کی مخالفت میں ایک تھے، اس لئے دونوں قوموں کے قبلوں کے لئے مفرد لفظ ذکر فرمایا۔

[3] یہود بیت المقدس کی طرف متوجہ ہوتے تھے جو مدینہ سے مغرب کی طرف تھا اور نصاریٰ مطلع شمس کی طرف منہ کرتے تھے۔ اس لئے فرمایا وہ آپس میں موافقت نہیں کرتے تو آپ کی موافقت کی ان سے کیسے امید کی جا سکتی ہے۔

[4] جملہ شرطیہ کا صدق اس کی دونوں اطراف کے صدق کا تقاضا نہیں کرتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ، (آپ فرمائیے (بفرض محال) اگر رحمٰن کا کوئی بچہ ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کا پجاری ہوتا) پس یہ جملہ شرطیہ عصمت نبوت کے منافی نہیں ہے۔ اور آیت سے مقصود امت کو خواہشات کی پیروی سے منع کرنا ہے جو خواہشات اس علم کے خلاف ہوں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابلغ ترین وجوہ کے ساتھ پہنچ چکا ہے۔ بلاغت کی وجوہ یہ ہیں:۔ (1) یہاں شرط کو قسم مقدر کے ساتھ مؤکد فرمایا۔ (2) لام جو قسم کا شعور دیتا ہے اس کا ذکر فرمایا۔ (3) فعل کو اِنْ کے کلمہ کے ساتھ معلق فرمایا یہ دلیل ہے کہ اتباع نفس کا کوئی جز بھی پایا جائے وہ ظلم ہے، نبی کریم ﷺ کو خطاب فرمایا حالانکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حبیب ہیں۔ جب آپ ﷺ کو منع فرمایا تو آپ ﷺ کے علاوہ کون اس تہدید کے زیادہ مستحق ہیں۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ میں اجمال کے بعد تفصیل ذکر فرمائی۔ علم کو معرف باللام ذکر فرمایا، جزاء کو اِنَّ اور لام تاکید سے مؤکد فرمایا اور جملہ اسمیہ سے مؤکد فرمایا۔ اِذًا کے ساتھ تعبیر فرمایا۔ مِن کا کلمہ ذکر فرمایا جو کلام کو بلیغ بنا دیتا ہے جیسا کہ زَيْدٌ مِّنَ الْعُلَمَاءِ زیادہ بلیغ ہے زَيْدٌ عَالِمٌ سے۔ ظالم کو معرف باللام ذکر کیا جو کمال ظلم کو مستلزم ہے، کیونکہ مطلق کامل پر محمول ہوتا ہے، ظلم کو عام فرمایا کیونکہ اس کا متعلق حذف کیا گیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

" جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ پہچانتے ہیں انہیں جیسے وہ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو۔ا اور بے شک ایک گروہ ان میں سے چھپاتا ہے حق کو جان بوجھ کر۔۲ "

۱۔ یہودیوں کے علماء محمد ﷺ کو پہچانتے تھے کہ یہ وہی ہستی ہے جن کی صفات تورات میں بیان کی گئی ہیں اور جن پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کا پختہ عہد لیا گیا ہے۔ ضمیر منصوب رسول اللہ ﷺ کے لئے ہے۔ اگرچہ آپ ﷺ کا پہلے ذکر نہیں ہے لیکن کلام کی دلالت موجود ہے۔ بعض نے فرمایا یہ علم کے لئے ہے یا قرآن کے لئے یا تحویل قبلہ کے لئے ہے۔ لیکن پہلا قول ہی اظہر ہے کیونکہ ابناء کا قرینہ اسی کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ جو بیٹا انسان کے اپنے گھر پیدا ہوتا ہے وہ ان کے ہاں دوسروں سے ملتبس نہیں ہوتا ہے۔ بعینہ اسی طرح وہ حضور ﷺ کو بھی پہچان چکے تھے، کوئی التباس نہیں تھا، لیکن جس نے بھی انکار کیا تعصب اور عناد کی وجہ سے کیا۔ اگر یعرفونہ کی ضمیر منصوب کا مرجع قرآن ہوتا تو مناسب یہ تھا کہ كَمَا يَعْرِفُوْنَ التَّوْرٰةَ فرمایا جاتا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی: اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۔ (جنہیں ہم نے دی ہے کتاب وہ پہچانتے ہیں اس نبی کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو)۔ تو یہ معرفت اور پہچان کیسے ہو سکتی ہے؟ عبداللہ بن سلام نے فرمایا اے عمر میں نے جب آپ ﷺ کو دیکھا تو میں پہچان گیا جیسے میں اپنے بیٹے کو پہچانتا ہوں اور محمد ﷺ کے متعلق میری معرفت اپنے بیٹے کی معرفت سے زیادہ قوی ہے۔ حضرت عمر نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہماری کتاب میں آپ ﷺ کی صفات بیان فرمائی ہیں لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ عورتیں کیا کچھ کرتی ہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا اے ابن سلام اللہ تعالیٰ تمہیں توفیق بخشے تو نے سچ کہا ہے۔(1)

۲۔ حق سے مراد محمد ﷺ کی صفت اور کعبہ کا امر ہے۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝

" یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے۔ا تو ہرگز نہ بن جانا شک کرنے والوں سے۔۲ "

۱۔ الحق مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی هٰذَا الْحَقُّ ۔ اور من ربک حال ہے یا دوسری خبر ہے یا یہ فعل مقدر کا فاعل ہے یعنی جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۔ یا یہ مبتدا ہے اور من ربک خبر ہے، یعنی حق جو تیرے رب کی طرف سے ثابت ہے اس حق کی طرح جس پر آپ قائم ہیں وہ حق نہیں جس پر اہل کتاب قائم نہیں۔

۲۔ اس کے رب کے طرف سے ہونے میں شک کرنے والوں سے نہ ہوں، یا اس میں شک نہ کریں کہ یہ حق جانتے ہوئے اس کو چھپاتے ہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو شک کرنے والوں سے کر دیا حالانکہ انہیں یقین تھا۔ اس آیت کریمہ میں یہ مراد نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو شک کرنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ سے تو یہ پہلے ہی غیر متوقع ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ شک میں تو اختیار ہی

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 271 (علمیہ)

نہیں ہوتا اور نہ اس کے روکنے پر انسان قادر ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ایک محقق اور ثابت شدہ امر ہے اس میں کوئی دیکھنے والا شک نہیں کرتا۔ یا یہ کہا جائے گا کہ یہ امت کو بلیغ طریقہ پر حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ عارفین کی صحبت اختیار کریں اور شک دور کرنے والے معارف کو حاصل کریں۔ نیز اس میں شک کرنے والوں کی مصاحبت و سنگت سے اجتناب کا حکم دیا جا رہا ہے کیونکہ ان کی دوستی شکوک اور وہموں کا موجب بنتی ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

''اور ہر قوم کے لئے ایک سمت (مقرر) ہے وہ اسی کی طرف منہ کرتی ہے۱؎ پس آگے بڑھ جاؤ (دوسروں سے) نیکیوں میں ۲؎ تم کہیں ہو لے آئے گا اللہ تعالیٰ تم سب کو یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ۳؎''

۱؎ کلٍّ کے آخر میں تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔ وِجْهَةٌ اسم ہے اس کا جس کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ یعنی ہر دین والوں کا ایک قبلہ ہے۔ هُوَ ضمیر کل کی طرف راجع ہے۔ اخفش کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ سے کنایہ ہے۔ مُوَلِّيْهَا اس کا ایک مفعول محذوف ہے۔ اصل میں مُوَلِّيْهَا وَجْهَهٗ ہے۔ جب کوئی کسی کی طرف متوجہ ہو تو وَلَّيْتُهٗ وَوَلَّيْتُ اِلَيْهِ بولا جاتا ہے اور جب کوئی کسی سے پیٹھ پھیر لے تو وَلَّيْتُ عَنْهُ بولا جاتا ہے۔ ابن عامر نے هُوَ مُوَلَّاهَا پڑھا ہے یعنی جس کی طرف پھیرا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہر قوم کو اپنے قبلہ کی طرف پھیرتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے لئے علیحدہ قبلہ، محمد ﷺ کے لئے علیحدہ قبلہ اور ہر نبی کے لئے علیحدہ قبلہ تھا۔ اور قبلہ کا امر تعبدی ہے، یہ عقل اور سوچ سے نہیں بنایا جاتا۔ اور اس میں جھگڑا بھی جائز نہیں ہے اور کوئی مکان قبلہ ہونے کا تقاضا نہیں کرتا کہ بعض کو بعض پر ترجیح دینے کا جھگڑا ہو۔

۲؎ یعنی جب بھی اللہ تعالیٰ کوئی ارشاد فرمائے تو جلدی جلدی اس کی اطاعت کرو اگرچہ وہ کبھی تمہیں بیت المقدس کی طرف اور کبھی کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے کیونکہ وہ جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے۔ اس لئے تم قبلہ کے معاملہ میں نہ جھگڑو۔

۳؎ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور حکم کے مطابق قبلہ کی طرف منہ کرو یا غیر پسندیدہ قبلہ کو اپناؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہاری روحوں کو قبض فرمائے گا، پھر وہ تمہیں مقام جزاء کی طرف جمع فرمائے گا اور تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق جزاء دے گا۔ اگر وہ تمہاری روح قبض فرمائے جبکہ تم نماز میں ہو یا واجب کی ادائیگی سے فارغ ہو چکے ہو تو یہ تمہارے لئے سعادت ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ مسلمانوں کی ہر قوم کے لئے کعبہ کی علیحدہ جانب ہے، وہ اس کی طرف منہ کرنے والی ہے اگر جہت معلوم ہو اور اگر جہت قبلہ مشتبہ ہو جائے تو ان کی جہت تحری ہے اور اگر نفل پڑھ رہا ہو اور شہر سے باہر سواری پر ہو تو جس طرف سواری کا منہ ہے اسی طرف منہ کر لے، اسی جانب اس کا قبلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا نیکیوں میں سبقت کرو اور نمازوں کو جلدی پڑھا کرو۔ اشتباہ قبلہ کے وقت بھی نماز کو مؤخر نہ کرو جہاں بھی تم ہو شرقاً غرباً زمین کے کسی جگہ پر ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری نمازوں کو قبلہ کی ایک جہت پر بنا دے گا گویا وہ کعبہ کے سامنے ہی پڑھی گئی ہیں۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾

"اور جہاں سے بھی آپ (باہر) نکلیں ۱؎ تو موڑ لیا کریں (نماز کے وقت) اپنا رخ مسجد حرام کی طرف ۲؎ اور بے شک یہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ تعالیٰ بے خبر جو کچھ تم کرتے ہو ۳؎"

۱؎ حیث کا کلمہ متروک الاضافت ہے اور جار مجرور خرجت کے متعلق ہے اور اس کا معطوف علیہ مقدر ہے جس میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔ اس لئے جواب پر فاء داخل کی گئی ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اَیْنَمَا کُنْتَ وَمِنْ حَیْثُ الخ۔ یعنی جس جگہ سے بھی تم نکلو تو منہ پھیر لو۔ بعض علماء فرماتے ہیں من حیث خرجت کا مجازاً معنی یہ ہے کہ تو جہاں بھی ہو اور متوجہ ہو۔ علامہ تفتازانی فرماتے ہیں حیث کا کلمہ خرجت کی طرف مضاف ہے اور جار مجرور قول کے متعلق ہے۔ ایسی صورت میں فاء کا مابعد فاء کے ماقبل کی طرح عمل کرتا ہے۔ لیکن اس ترکیب کے اعتبار سے واؤ اور فاء کا اجتماع لازم آئے گا مگر یہ کہ معطوف علیہ مقدر مانا جائے۔ تقدیر یوں ہوگی فَوَلِّ وَجْهَكَ اَیْنَ مَا كُنْتَ وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ۔

۲؎ جب تم نماز پڑھو تو منہ مسجد حرام کی طرف کرلو۔ سفر و حضر کی نماز کا حکم ایک ہے۔ اس کو بیان کرنے کے لیے حکم کو مکرر ذکر فرمایا۔ حضرت حذیفہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہمیں تین چیزوں کے ساتھ دوسرے لوگوں پر فضیلت دی ہے ہماری صفوں کو ملائکہ کی صفوں کی طرح بنایا، ہماری پوری زمین کو سجدہ گاہ بنایا اور جب ہمیں پانی نہ ملے تو ہمارے لئے مٹی کو پاک کرنے والا بنایا(1) اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور مسلم کی دوسری روایت میں ہے کہ مجھے انبیاء پر چھ چیزوں کی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے۔

۳؎ اللہ میں ہ ضمیر سے مراد ھذا الامر ہے۔ ابو عمرو نے یاء کے ساتھ اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ یعنی تعملون پڑھا ہے۔

وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِیْ ۚ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۙ

"اور جہاں سے آپ (باہر) نکلیں تو موڑ لیا کریں اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف اور (اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو تو پھیر لیا کرو اپنے منہ اس کی طرف ۱؎ تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم پر اعتراض کی گنجائش ۲؎ بجز ان لوگوں کے جو ناانصافی کریں ان سے ۳؎ سو نہ ڈرو تم ان سے (بلکہ صرف) مجھ سے ڈرا کرو ۴؎ تاکہ میں پورا کروں اپنا انعام تم پر تاکہ تم راہ راست پر ثابت قدم رہو ۵؎"

۱؎ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس حکم کا تکرار علل کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کی تین علتیں ذکر فرمائیں:۔ آپ کی رضا کے مطابق قبلہ تبدیل فرمایا تو اس میں نبی کریم ﷺ کی تعظیم کا اظہار ہے، اور یہ دستور الٰہی ہے کہ ہر اولوالعزم رسولوں کی امتوں کے لئے قبلہ بنایا جس کی طرف وہ منہ کرتے تھے۔ نیز اس میں مخالفین کے اعتراضات کو دفع کرنا ہے۔ ہر علت کے ساتھ اس کے معلول کو ملا دیا جیسے مدلول کو ہر دلیل کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ دوسری تکرار کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قبلہ کی ایک شان اور عظمت ہوتی ہے اور اس کی تنسیخ فتنہ اور شبہ کا باعث ہوتا ہے اس لئے یہی مناسب تھا کہ اس کے امر کو مؤکد کیا جائے اور اس کا ذکر تکرار کے ساتھ ہو۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 5 صفحہ 5 حدیث نمبر 4 (علمیہ)

۳؎ لِئَلَّا يَكُونَ فَوَلُّوا کی علت ہے اور لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ میں الناس سے مراد یہود اور مشرکین ہیں کیونکہ وہ تورات میں پڑھ چکے تھے کہ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے اور محمد ﷺ اسی قبلہ کی طرف پھر جائیں گے۔ اگر یہ تحویل قبلہ نہ ہوتی تو وہ تمہارے خلاف یہ بطور دلیل پیش کرتے۔ اسی طرح مشرکین مکہ ہی جانتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ کعبہ تھا اور نبی کریم ﷺ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ میں ملت ابراہیمی پر ہوں۔ اگر تحویل قبلہ نہ ہوتی تو وہ کہہ سکتے تھے کہ محمد ﷺ دعویٰ تو ملت ابراہیمی کا کرتے ہیں اور ان کے قبلہ کی مخالفت کرتے ہیں۔

۳؎ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ، الناس سے استثناء ہے یعنی معاندین کے علاوہ کسی کے لئے حجت نہ رہے لیکن ظالم لوگوں نے پھر بھی کہہ دیا کہ محمد ﷺ نے کعبہ کی طرف رجوع کر لیا ہے کیونکہ اس نے جان لیا ہے کہ ہم اس سے زیادہ ہدایت پر ہیں اور عنقریب وہ ہمارے دین کی طرف لوٹ آئے گا اور یہود میں سے ظالم لوگوں نے کہا کہ محمد ﷺ نے بیت المقدس کے قبلہ کے حق ہونے کے باوجود اس سے انحراف صرف حسد کی وجہ سے کیا ہے اور اپنی رائے پر عمل کیا ہے(1) اس کو حجت کا نام دیا گیا ہے حالانکہ یہ حجت نہیں تھی، لیکن چونکہ وہ اسے حجت کی جگہ پر بیان کرتے تھے اس لئے حجت کہا گیا جیسے ایک اور جگہ ارشاد ہے حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ (ان کی حجت بازی لغو ہے)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں حجت بمعنی احتجاج ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہاں استثناء صرف حجت کی نفی میں مبالغہ کے لئے ہے کیونکہ یہ تو معلوم ہے کہ ظالم کے لئے کوئی حجت نہیں ہوتی۔ ان تاویلات کی بناء پر اسم موصول محل جر میں الناس کا بدل ہوگا۔ بعض فرماتے ہیں یہ استثناء منقطع ہے اس کا معنی یہ ہے کہ ظالم لوگ تم سے باطل کے ساتھ جھگڑیں گے۔

۴؎ ان سے نہ ڈرو میں تمہارا ولی اور مددگار رہوں، میں تم پر حجت اور نصرت کے ذریعے ان کے خلاف حجت ظاہر کروں گا اور ان کے طعن و تشنیع کے تیر تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا ئیں گے۔ میرے حکم کی مخالفت نہ کرو۔

۵؎ لئلا پر معطوف ہے۔ عبارت اس طرح ہوگی فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ محذوف کلام پر معطوف ہو۔ یعنی کلام اس طرح ہو وَاخْشَوْنِي لَا حْفَظَكُمْ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوا۔ حضرت معاذ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نعمت کی تکمیل جنت میں داخل ہونا اور آگ سے نجات پانا ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے الادب المفرد میں اور امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نعمت کی تکمیل اسلام پر موت کا آنا ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

"جیسا کہ بھیجا ہم نے تمہارے پاس رسول تم میں سے پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تمہیں اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت ۱؎ اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ایسی باتوں کی جنہیں تم جانتے ہی نہیں تھے ۲؎"

۱؎ مخاطب قریش ہیں۔ اصل مخاطب وہ ہیں اور دوسرے لوگ ان کے تابع ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ابراہیم علیہ السلام کو ارشاد ہے۔ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ (بیشک میں بنانے والا ہوں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا عرض کی میری اولاد سے بھی) اسی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 176 (فکر)

طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے اَلنَّاسُ تَبَعٌ لِقُرَیْشٍ ،لوگ قریش کے تابع ہیں۔ یہ اتم کے متعلق ہے یعنی میں اپنی نعمت کو مکمل کروں گا جیسے تم میں سے ایک رسول کو بھیج کر میں نے نعمت کو مکمل کیا۔ محمد بن جریر کہتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دو دعائیں مانگی تھیں:۔ 1۔ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ 2۔ اور دوسری دعا یہ تھی۔ وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ(1) آیت کا معنی یہ ہے کہ تمہارے حق میں حضرت ابراہیم کی دعوت قبول کی گئی ہے کہ میں نے تمہیں اپنے دین کی ہدایت دی اور تمہیں مسلمان بنایا نیز تم پر اپنی نعمت مکمل فرمائی۔ جیسا کہ میں نے ان کی دعا کو قبول فرمایا کہ تم میں اپنا رسول مبعوث فرمایا۔ یا یہ مابعد کلام کے متعلق ہے یعنی جیسا میں نے تمہیں رسالت کے ساتھ یاد کیا ہے تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ اس ترکیب سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کو ایک دفعہ ذکر کرنا اللہ تعالیٰ کے دو ذکروں میں گھرا ہوا ہے۔ پہلا ذکر توفیق کے ذریعے اور دوسرا ذکر ثواب عطا کرنے کے ساتھ۔ رَسُولًا مِنْكُمْ سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ اس کی شرح ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں گزر چکی ہے۔ یہاں مقصود کے اعتبار سے تزکیہ کو مقدم فرمایا اور وہاں فعل کے اعتبار سے مؤخر فرمایا۔

یُعَلِّمُكُمْ کے فعل کا تکرار اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ تعلیم کسی دوسری جنس سے ہے۔ شاید اس سے مراد وہ علم لدنی ہو جو قرآن کے بطون اور نبی کریم ﷺ کے سینہ اقدس کے مشکوٰۃ سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایسا علم ہے جس کا ادراک اور حصول صرف اور صرف آفتاب قرآن کی تجلیوں اور مہر نبوت کی شعاعوں سے ہوتا ہے۔ اس کی حقیقت کا ادراک قیاس سے بعید ہے۔ رئیس الصدیقین (ابو بکر صدیق) نے فرمایا ادراک کی حقیقت سے اعتراف عجز ادراک ہے۔ حضرت حنظلہ بن ربیع الاسیدی سے مروی ہے کہ مجھے سیدنا صدیق اکبر ملے اور پوچھا حنظلہ کیسے ہو حنظلہ فرماتے ہیں میں نے کہا حنظلہ منافق ہو گیا۔ سیدنا صدیق اکبر نے فرمایا سبحان اللہ یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا ہم جب رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ہمیں جنت اور دوزخ کی نصیحتیں فرماتے ہیں تو یہ کیفیت ہوتی ہے گویا سب کچھ نظر آ رہا ہے لیکن جونہی آپ ﷺ کی مجلس سے اٹھتے ہیں، بیویوں، بچوں اور زمینوں میں یوں مشغول ہوتے ہیں تو ان باتوں کا اکثر حصہ بھول جاتے ہیں۔ سیدنا ابو بکر صدیق نے کہا قسم بخدا ہم بھی ایسی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ پھر میں اور سیدنا ابو بکر صدیق چل پڑے، یہاں تک کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! حنظلہ منافق ہو گیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا وہ کیسے؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں آپ ہمیں جنت دوزخ کے متعلق بتاتے ہیں تو یوں لگتا ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں لیکن جب آپ کی بارگاہ سے اٹھ جاتے ہیں، بیویوں، بچوں اور زمینوں میں یوں مصروف ہوتے ہیں کہ کچھ یاد نہیں رہتا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم ہمیشہ اسی کیفیت پر رہتے جس میں میرے پاس ہوتے ہو اور ذکر میں مشغول ہوتے ہو تو فرشتے تم سے تمہارے بستروں اور تمہارے راستوں پر مصافحہ کرتے۔ لیکن یہ کیفیت کبھی کبھی ہوتی ہے۔ یہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو برتن علم کے یاد کئے ایک کو میں نے تم میں پھیلا دیا ہے اور دوسرا اگر میں اسے بیان کروں تو میرا گلہ کٹ جائے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(3) بعض علماء فرماتے ہیں وہ برتن علم جس کو آپ نے بیان نہیں فرمایا وہ ایسی احادیث ہیں جن میں ظالم امراء کے نام بیان کئے گئے ہیں جیسا کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 178 (فکر)　2۔ صحیح مسلم، جلد 17 صفحہ 55-56 حدیث نمبر 12 (علمیہ)
3۔ صحیح بخاری: 120 (ابن کثیر)

آپ ﷺ کا ارشاد ہے میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں 60ھ سے اور بچوں کی حکمرانی سے۔ یہ یزید بن معاویہ کی حکمرانی کی طرف اشارہ ہے۔ میں کہتا ہوں چند جزئیات کے علم پر وعاء کا اطلاق غیر مستحسن ہے۔ ان جزئیات کو علوم شرعیہ کا قسیم یا نظیر متصور نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس سے مراد علم لدنی ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ حضرت ابو ہریرہ کے اس جملہ سے کیا مراد ہے کہ اگر میں اس کو بیان کروں تو میری گردن کٹ جائے۔ میں کہتا ہوں اس کا معنی یہ ہے کہ اگر میں اس علم کو زبان سے بیان کروں تو میرا گلہ کٹ جائے کیونکہ ان علوم و معارف کا سیکھنا یا سکھانا زبان قال سے ممکن ہی نہیں بلکہ ان کا ادراک تو فقط انعکاس اور زبان حال سے ہے۔ بھلا زبان سے ان علوم کا ادراک کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ زبان کے ساتھ علم حاصل کرنا چند امور پر موقوف ہے:۔ (1) معلوم ان چیزوں سے ہو جن کا ادراک علم حصولی کے ذریعے ہو سکتا ہو، (2) اس چیز کے مقابلہ میں کوئی لفظ وضع کیا گیا ہو، (3) اس لفظ کی وضع سامع کو معلوم بھی ہو۔ جبکہ معارف لدنیہ میں ان امور میں سے کوئی امر بھی متحقق نہیں ہے، کیونکہ ان کا ادراک علم حضوری سے ہوتا ہے جس کا ذھول ممکن نہیں ہوتا بلکہ علوم لدنیہ کے حصول کا ذریعہ علم حصولی اور علم حضوری سے بھی وراء ہے۔ یہاں الفاظ کی وضع کہاں پائی جاتی ہے۔ وضع کے ذریعے علم حاصل کرنے والوں سے یہ علم بہت دور ہے۔ اب جو بھی ان معارف پر گفتگو کرے گا اسے ضرور مجازات اور استعارات کا استعمال کرنا ہوگا جن کے ذریعے عوام کو راہنمائی حاصل نہیں کر سکتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عقول مخبوط ہو جاتے ہیں اور متکلم کی مراد سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ تو پھر ایسا کہنے والوں کو وہ فاسق کہتے ہیں یا کفر کا فتویٰ جڑ دیتے ہیں۔ جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ عوام اولیاء کرام کی مراد سمجھے بغیر اولیاء کرام پر تنقید کرتے ہیں اور یہی چیز گلہ کے کٹنے تک پہنچا دیتی ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ اگر اس علم لدنی کا حصول اور اس کی عطا بیان کے ساتھ ممکن نہیں ہے اور اس کا نتیجہ قتل و غارت ہے اور اس کا بیان گلہ کا کٹنا ہے تو پھر اس پر کلام کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ لوگوں نے بڑی بڑی کتب جیسے فصوص الحکم اور فتوحات کیوں تصنیف فرمائیں۔ اس ورق سیاہی کا فائدہ ہی کیا ہے؟ میں کہتا ہوں ان کتب کی تصنیف سے ان علوم کا دوسروں تک پہنچانا مقصود نہیں ہے اور نہ ان کتب کے مطالعہ سے قرب وولایت کی منزل حاصل ہوتی ہے بلکہ ان سے مقصود جذب وسلوک کے ذریعے ان علوم لدنیہ کو حاصل کرنے والے عارفین کو بعض تفاصیل پر آگاہ کرنا ہے، نیز مریدین کے احوال اور ان کے مواجید کو اکابر کے احوال اور مواجید سے تطبیق دینا ہے تاکہ مریدین کے احوال کی صحت ظاہر ہو جائے اور ان کے دل بھی مطمئن ہو جائیں اور اکثر مشائخ نے ان معارف کو غلبۂ حال کے وقت بیان فرمایا ہے۔ اس مسئلہ میں صراط مستقیم یہ ہے کہ عوام ان کی کتب کے مطالعہ اور ان کے کلام کے سماع کے وقت انکار نہ کریں اور ممکن ہو تو تاویلات کے ذریعے ان کو ظاہر شریعت پر محمول کریں کیونکہ ان صوفیاء کرام کا کلام رموز اور اشارات سے بھرا ہوتا ہے، یا یہ کہیں کہ ان کا علم وہ علام الغیوب جانتا ہے (جس نے یہ علم اپنے خاص بندوں کو عطا فرمایا ہے) جیسا کہ متشابہات کے متعلق کہا جاتا ہے کیونکہ ان کا کلام مجازات اور استعارات پر مشتمل ہوتا ہے اور ظاہر سے تطابق نہیں رکھتا لیکن وہ شریعت کے قطعاً مخالف نہیں ہوتا بلکہ وہ کتاب وسنت کا خلاصہ اور لب لباب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے فضل عظیم اور احسان جلیل کے واسطہ سے یہ علوم لدنیہ عطا فرمائے۔

جب ان معارف کی تحصیل کا راستہ صرف اور صرف انعکاس اور القاء ہے اور کثرت ذکر اور مراقبہ خواہ وہ ذکر کرنے والوں کے مجمع میں ہو یا تنہائی اور خلوت میں ہو اس انعکاس کی صلاحیت نفس اور قلب میں پیدا کر دیتا ہے، جو نبی کریم ﷺ کے مشکوٰۃ صدر سے بلا واسطہ یا بالواسطہ منعکس ہوتا ہے اس لئے بعد میں یہ ارشاد فرمایا:

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ۝

"سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا ۱؎ اور شکر ادا کیا کرو میرا اور میری ناشکری نہ کیا کرو ۲؎"

۱؎ فاذکرونی کو ابن کثیر نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ وَاَنَا مَعَهٗ اِذَا ذَکَرَنِیْ فَاِنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ نَفْسِهٖ ذَکَرْتُهٗ فِیْ نَفْسِیْ وَ اِنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ مَلَاءٍ ذَکَرْتُهٗ فِیْ مَلَاءٍ خَیْرٍ مِّنْهُ وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْراً تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ ذِرَاعًا وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ بَاعًا وَاِنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُهٗ هَرْوَلَةً۔ میں اپنے بندے کے مطابق اس سے سلوک کرتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، اگر وہ اپنے دل میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کا تنہائی میں ذکر کرتا ہوں، اگر وہ مجلس میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس سے بہتر مجلس میں اس کا ذکر کرتا ہوں، اگر وہ ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں، اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے تو میں دو ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ (بخاری و مسلم)(1)

امام بغوی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے ان دس انگلیوں کے پوروں کی تعداد کے برابر سنی ہے(2) عبداللہ بن شقیق سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر آدمی کے دل میں دو حصے ہوتے ہیں، ایک میں فرشتہ ہوتا ہے اور دوسرے میں شیطان ہوتا ہے۔ جب آدمی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب آدمی اللہ کا ذکر نہیں کرتا تو شیطان اس کے دل میں اپنی چونچ مارتا ہے اور وسوسہ اندازی کرتا ہے، اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مفردون سبقت لے گئے صحابہ نے پوچھا مفردون کون ہیں یا رسول اللہ ﷺ! فرمایا اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(3) اے مخاطب بھائی ذکر اس غفلت کو دور کرنے سے عبارت ہے اور غفلت قساوۃ کا موجب ہوتی ہے، ہر فعل اور قول یا غور و فکر جس میں اخلاص اور حضور کے ساتھ رضا الٰہی مقصود ہو وہ ذکر ہے اور جو کام بغیر اخلاص کے ہو وہ شرک ہے اور جو ذکر غفلت کے ساتھ ہو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ (بیشک دونوں جہانوں میں بامراد ہو گئے ایمان والے وہ ایمان والے جو اپنی نمازوں میں عجز و نیاز کرتے ہیں)۔ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ (پس خرابی ہے ایسے نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز (کی ادائیگی) سے غافل ہیں)۔ ارشاد فرمایا اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَفْضَلُ الدُّعَاءِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ، افضل ذکر لا الہ الا اللہ ہے اور افضل دعا الحمد للہ ہے(4) اس حدیث کو نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور امام مالک نے صحیح سند کے ساتھ حضرت جابر کے واسطے سے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے۔ حضرت سمرہ بن جندب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا افضل کلام چار کلمات ہیں:۔ (1) سبحان اللّٰہ، (2) الحمد للّٰہ، (3) لا الہ الا اللّٰہ، (4) اللّٰہ اکبر۔(5) اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے قرآن کے بعد یہ افضل کلمات ہیں اور یہ قرآن سے ہیں۔ اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ حدیث قدسی میں ہے جس کو قرآن نے میرے ذکر اور مجھ سے سوال کرنے سے مشغول رکھا میں اسے مانگنے والوں سے بہتر عطا کرتا ہوں اور اللہ کے کلام کی تمام کلاموں پر فضیلت ایسی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر فضیلت ہے(6)۔ اس حدیث کو ترمذی

1۔ صحیح بخاری:6970 (ابن کثیر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 179 (فکر)　3۔ صحیح مسلم، جلد 17 صفحہ 4 حدیث نمبر 4 صفحہ (علمیہ)

4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:3383 (فکر)　5۔ مشکوۃ المصابیح:2294 (فکر)　6۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:2926 (العلمیہ)

اور دارمی نے ابوسعید سے نقل کیا ہے۔ ان احادیث طیبہ کی وجہ سے صوفیاء کرام نے (لا الہ الا اللہ) کو دل کے ساتھ یا زبان کے ساتھ بلند آواز سے یا آہستہ آواز سے اختیار کیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تلاوت قرآن کریم پسندیدہ ترین وظیفہ ہے جیسا کہ ہم نے پہلے قرآن کی فضیلت میں حدیث پیش کی ہے۔ قرآن کی فضیلت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی صفت قائمہ حقیقیہ بلا واسطہ ہے۔ اس کی ایک طرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور ایک طرف ہمارے ہاتھ میں ہے۔ جو اس میں فنا ہوا پس اسے مزید کی ضرورت نہیں۔ نماز مومن کی معراج ہے لیکن یہ نفس کی فنا کے بعد ہے لیکن فنا سے پہلے مجدد صاحب کے نزدیک نفی اور اثبات پر اقتصار پسندیدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَؕ (الواقعہ: 79)، (نہیں مس کرتے مگر پاک لوگ) یعنی جو نفس کی رذائل سے پاک ہوتے ہیں۔

۲؎ میں نے جو تم پر نعمتیں کی ہیں مثلاً رسول مکرم ﷺ کو مبعوث فرمایا، نور ہدایت عطا فرمایا، جذب کی کیفیت عطا فرمائی اور سلوک وغیرہ کی توفیق بخشی۔ ان تمام پر میرا شکریہ ادا کرو۔ نعمتوں کا انکار، رسولوں کی تکذیب یا حکم کی سرتابی، وقت کا ضیاع اور ذکر سے اعراض کر کے کفر نہ کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

"اے ایمان والو! مدد طلب کیا کرو ۱؎ صبر اور نماز (کے ذریعہ) ۲؎ سے بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۳؎"

۱؎ اے ایمان والو! اپنی دینی اور دنیوی حاجات کے لئے خصوصاً درجات قرب اور معارف لدنیہ کے حصول کے لئے صبر سے مدد طلب کرو۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خواہشات نفسانی کو روکو کیونکہ دوزخ خواہشات و شہوات سے گھری ہوئی ہے، نفوس اور اموال پر سختیاں برداشت کرو کیونکہ جنت تکالیف سے گھری ہوئی ہے۔ ذکر، طاعت پر دوام اختیار کرو اور بری مجالس سے دور رہو۔ کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے مسلمان کا بہتر مال بکریاں ہیں جن کو لیکر وہ پہاڑیوں کی وادیوں میں چلا جائے اور فتنوں سے اپنے دین کو بچا کر لے جائے۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل فرمایا ہے(1)۔

۲؎ نماز کی اہمیت اور رفعت شان کی وجہ سے عموم کے بعد اس کا خصوصی ذکر فرمایا کیونکہ نماز ام العبادات، طاعات کی جامع اور مومن کی معراج ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ نماز دین کا ستون ہے۔ اس حدیث کو صاحب مسند الفردوس نے روایت کیا ہے(2) حضرت انس سے مرفوعاً مروی ہے اَلصَّلٰوةُ نُوْرُ الْمُؤْمِنِ۔ نماز مومن کا نور ہے اس کو ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عابدین کے مقامات کی انتہاء نماز کی حقیقت ہے اور یہاں سے ترقی کثرت نماز سے ہوتی ہے۔ نماز حاجت کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

۳؎ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی معیت سے مراد اس کی مدد، نصرت اور دعا کو قبول کرنا ہے، میں کہتا ہوں بلکہ یہ وہ معیت ہے جو غیر متکیف ہے اور عارفین پر واضح ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی حقیقت کا ادراک کوئی دوسرا نہیں رکھتا۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝

1۔ صحیح بخاری: 19 (ابن کثیر) 2۔ مسند الفردوس: 3795 (علمیہ)

"اور نہ کہا کرو انہیں جو قتل کیے جاتے ہیں اللہ کی راہ میں کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں[1] لیکن تم (اسے) سمجھ نہیں سکتے ہو"

[1] اموات سے پہلے "ھم" مبتدا محذوف ہے۔ یہ آیت کریمہ بدر کے مسلمان مقتولوں کے متعلق نازل ہوئی۔ یہ کل چودہ افراد تھے۔ چھ کا تعلق مہاجرین سے اور آٹھ کا رشتہ انصار سے تھا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستہ میں شہید ہو جاتا لوگ کہتے فلاں مر گیا ہے، دنیا کی نعمتیں چھوڑ گیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے راستہ کے شہید زندہ ہیں اللہ تعالیٰ ان کی روحوں کو اجساد کی قوت عطا فرماتا ہے، پھر وہ زمین، آسمان اور جنت میں جہاں چاہتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کی مدد کرتے ہیں اور اپنے دشمنوں کو تباہ و برباد بھی کرتے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اسی حیات کی وجہ سے ان کے جسموں بلکہ ان کے کفنوں کو مٹی نہیں کھاتی۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہ بعض علماء فرماتے ہیں ان کی روحیں ہر رات عرش کے نیچے رکوع و سجود کرتی ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک رہے گا(1) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا شہداء جب شہید ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایک بہتر جسد اتارتے ہیں، پھر اس شہید کی روح کو حکم ہوتا ہے اس میں داخل ہو جا۔ پھر وہ اپنے پہلے جسد کو دیکھتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے، وہ بولتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ لوگ میرا کلام سن رہے ہیں۔ وہ لوگوں کو دیکھتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ وہ اسے دیکھ رہے ہیں حتیٰ کہ آہو چشم حوریں آتی ہیں اور اسے ساتھ لے جاتی ہیں۔ اس حدیث کو ابن منذر نے مرسلاً روایت کیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود سے مرفوعاً مروی ہے کہ شہداء کی روحیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سبز پرندوں میں ہوتی ہیں، جنت میں جہاں چاہتی ہیں چلی جاتی ہیں۔ پھر عرش کے نیچے قندیل میں آرام کرتی ہیں(2) علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ زندگی شہداء کے ساتھ مختص ہے اور میرے نزدیک حق یہ ہے کہ یہ شہداء کے ساتھ خاص نہیں بلکہ انبیاء کرام کی حیات شہداء کی حیات سے قوی ہے اور خارج میں ان کی روحوں کے آثار زیادہ ظاہر ہیں، حتیٰ کہ نبی کے وصال کے بعد اس کی ازواج سے نکاح جائز نہیں ہوتا۔ جبکہ شہید کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں اور صدیقین بھی شہداء سے بلند درجہ ہیں اور صالحین اولیاء کرام شہداء کے ساتھ ملحق ہیں۔ جیسا کہ قرآن کی ترتیب دلالت کرتی ہے۔ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ اسی وجہ سے صوفیاء کرام فرماتے ہیں ہماری روحیں ہمارے جسم ہیں اور ہمارے جسم ہماری روحیں ہیں۔ بہت سے اولیاء کرام سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی اعانت کرتے ہیں، اپنے دشمنوں کو تباہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق لوگوں کو راہ ہدایت دکھاتے ہیں۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کمالات نبوت والے لوگ وراثۃً چلے آرہے ہیں۔ میں کہتا ہوں ان لوگوں کو شرع کی زبان میں صدیقین اور مقربین کہا جاتا ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وہبی وجود ملتا ہے، حاکم اور ابوداؤد کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ انبیاء کرام، شہداء اور بعض صلحاء کے اجساد کو زمین نہیں کھاتی۔ حضرت اوس بن اوس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے اجساد کا کھانا حرام کیا ہے(3) ابن ماجہ نے ابودرداء سے اسی طرح روایت کی ہے(4) مالک نے عبدالرحمٰن بن صعصعہ سے روایت کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ عمرو بن جموح اور عبداللہ بن جبیر الانصاری کی قبر سیلاب نے خراب کر دی تھی، وہ دونوں ایک ہی قبر میں مدفون تھے اور یہ دونوں جنگ احد کے دن شہید ہوئے تھے۔ ان کی قبر کھودی گئی تو ان میں کوئی تبدیلی وقوع پذیر نہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کل فوت ہوئے ہیں۔ حالانکہ اس وقت جنگ احد کو چھیالیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا(5) امام بیہقی نے نقل کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 583 (فکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 13 صفحہ 26 حدیث نمبر 121 (علمیہ)

3۔ مستدرک حاکم: 1029 (علمیہ) 4۔ سنن ابن ماجہ: 1085 (علمیہ) 5۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 470 (التراث العربی) مفصل

سے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب نہر کظامہ کھودوانے کا ارادہ کیا تو یہ منادی کرائی کہ احد میں جن کا کوئی شخص قتل ہوا ہے وہ حاضر ہو۔ لوگ اپنے مقتولوں کی طرف آئے تو کیا دیکھا کہ وہ بالکل تر و تازہ ہیں اور ان کے بال بڑھے ہوئے ہیں۔ نہر کھودتے وقت کسی کا کدال کسی میت کے پاؤں پر جالگا تو اس سے خون بہنے لگا۔ وہ جب مٹی کھودرہے تھے تو مٹی سے کستوری کی خوشبو مہکنے لگی۔ واقدی نے اپنے شیوخ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔ بیہقی نے جو حضرت جابر سے روایت نقل کی ہے اس میں ہے کہ حضرت حمزہ کے پاؤں پر کدال لگا تھا۔ الطبرانی نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ثواب کی نیت سے اذان دینے والا اس شہید کی مانند ہے جو اپنے خون میں لت پت ہوتا ہے، جب وہ موذن مرتا ہے تو اس کی قبر میں کیڑے پیدا نہیں ہوتے۔ ابن مندہ نے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب حافظ قرآن کا وصال ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ زمین کی طرف وحی فرماتے ہیں کہ اس کا گوشت نہ کھانا زمین عرض کرتی ہے اے میرے رب کریم میں اس کا گوشت کیسے کھا سکتی ہوں جبکہ اس کے پیٹ میں تیرا کلام ہے، ابن مندہ فرماتے ہیں یہ حدیث ابوہریرہ اور ابن مسعود سے بھی مروی ہے۔ میں کہتا ہوں شاید حامل قرآن سے مراد صدیق ہو کیونکہ قرآن کی برکات کا مساس صدیق کے ساتھ مختص ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ اس کو نہ چھوئیں مگر پاک لوگ۔ المروزی نے قتادہ سے روایت کیا ہے فرمایا مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ زمین اس جسم پر مسلط نہیں ہو سکتی جس نے کوئی خطا نہ کی ہو، میں کہتا ہوں ہوسکتا ہے یہ گناہ نہ کرنے والوں سے مراد اولیاء کرام ہوں جو خطاؤں سے محفوظ ہوتے ہیں اور ان کی خطائیں بخش دی گئی ہوتی ہیں حتی کہ ان کے دل اور اجساد صحیح اور درست ہو جاتے ہیں۔

۲؎ آیت کریمہ کے اس حصہ میں تنبیہ ہے کہ ان کی زندگی ایسی نہیں ہے جیسے ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ یہ ایک امر ہے جو عقل اور حس سے نہیں بلکہ وحی اور فراست سے اس کا ادراک ہوتا ہے اور فراست بھی وہی اس کا ادراک کرسکتی ہے جو وحی کے آفتاب سے مستنیر ہو۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۙ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ؕ

"اور ہم ضرور آزمائیں گے ۱؎ تمہیں کسی ایک چیز ۲؎ کے ساتھ ۳؎ یعنی خوف اور بھوک ۴؎ اور کمی کرنے سے (تمہارے) مالوں اور جانوں ۵؎ اور پھلوں میں ۶؎ اور خوشخبری سنایئے ان صبر کرنے والوں کو جو کہ جب پہنچتی ہے انہیں کوئی مصیبت تو کہتے ہیں بیشک ہم صرف اللہ ہی کے ہیں ۷؎ اور یقیناً ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ۸؎"

۱؎ اے امت محمد ﷺ! ہم ضرور تمہاری آزمائش کے لئے تمہیں مصائب میں مبتلا کریں گے کہ کیا تم مصائب کے وقت صبر کا دامن تھامے رکھتے ہو اور قضائے ربی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہو؟ تاکہ تم پر آسمان سے رحمت و برکات برسائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے وقوع سے پہلے لوگوں کو اس کی خبر دی تاکہ ان کے نفوس اس کے لئے مضبوطی اور استقامت کے ساتھ تیار ہو جائیں۔

۲؎ "بِشَیْءٍ" سے مراد قلیل شی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بچالیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ آزمائشیں قلیل ہیں اس لئے انہیں قلیل فرمایا۔ تنوین تنکیر، تقلیل کے لئے ذکر کی ہے یہ بتانے کے لئے کہ ان پر اسے آسان بنادے گا اور ان کے لئے یہ ظاہر کردے گا کہ

اس کی رحمت ان سے جدا نہیں ہے۔

[3] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ خوف سے مراد دشمن کا خوف ہے اور جوع سے مراد قحط ہے(1) وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ کا عطف شَیْءٍ یا الْخَوفِ پر ہے۔ اور اس سے مراد مال میں خسارہ اور ہلاکت کا ہونا ہے۔

[4] "وَالْاَنْفُسِ" اور جانوں میں کمی قتل اور موت کے سبب ہوگی اور یہ قول بھی ہے کہ بیماری اور بڑھاپے کے سبب کمی واقع ہوگی۔

[5] "وَالثَّمَرٰتِ" یعنی پھلوں کو جلا دینے اور خشک کرنے کے سبب۔ روایت ہے کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا الخوف سے مراد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے، الجوع سے مراد رمضان المبارک کے روزے ہیں، نقص من الاموال سے مراد زکوٰۃ اور صدقات ادا کرنا ہے۔ الانفس سے مراد بیماریاں اور الثمرات سے مراد اولاد کا مر جانا ہے(2) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کسی آدمی کا بچہ فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کیا تم نے میرے بندے کا بیٹا قبض کر لیا ہے؟ تو وہ عرض کرتے ہیں جی ہاں۔ پھر رب کریم فرماتا ہے کیا تم نے اس کے دل کا سکون (ثمرہ) چھین لیا ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں جی ہاں۔ تو پھر رب کریم فرماتا ہے تو پھر اس نے اس پر کیا کہا ہے۔ تو فرشتے عرض کرتے ہیں اے پروردگار! اس نے اس پر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا ہے، اور تیری حمد بیان کی ہے، تو یہ سن کر رب کریم فرماتے ہیں تم میرے بندے کے لئے جنت میں ایک محل بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے۔(3)

[6] غلام، ملک (بادشاہی) اور ہر وہ شے جو نعمتوں میں سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی وہ اس کی جانب سے بخشش اور عطا ہے اور اس کی جانب سے عاریۃً ودیعت کی گئی ہے۔ اس لئے ہم پر یہ حق ہے کہ ہم اس کے فیصلے پر راضی ہوں اور اس کی امانتیں واپس لوٹاتے وقت قطعاً انکار نہ کریں، کیونکہ مالک اپنی ملکیت میں جیسے چاہتا ہے تصرف کر سکتا ہے۔

[7] "وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" اور بیشک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں آخرت میں، اور اسی طرح دنیا میں بھی ذکر اور مراقبہ کے ساتھ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ پس اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو وہ ہمیں اس سے افضل و اعلیٰ عطا فرما دے گا جو اس نے ہم سے واپس لیا ہے۔ یہ خطاب حضور نبی کریم ﷺ اور ہر اس کے لئے ہے جو بشارت لاتا ہے۔ المصیبۃ سے مراد ہر وہ ناپسندیدہ اور مکروہ چیز ہے جو کسی انسان کو پہنچتی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے نعلین پاک ٹوٹے تو آپ ﷺ نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ مصیبت ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مَا اَصَابَ الْمُؤْمِنَ مِمَّا يَكْرَهُ فَهُوَ مُصِيْبَةٌ" (ناپسندیدہ اور مکروہ چیزوں میں سے جو بھی مومن کو پہنچتی ہے وہی مصیبت ہے)(4) اسے طبرانی نے کبیر میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کی شواہد مرفوع اور موقوف روایات ہیں۔ اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے شعب الایمان میں نقل کیا ہے(5) اور ایک حدیث میں ہے: جس نے مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہا" تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی مصیبت بہتر ہوگی، اس کا انجام اچھا ہوگا اور اللہ تعالیٰ اسے ایسا صالح اور اچھا بدل عطا فرمائے گا کہ وہ اس پر راضی ہو جائے گا"(6) اسے ابن ابی حاتم، طبرانی اور بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا مصیبت کے بارے میں جو کچھ اس امت کو عطا کیا گیا ہے وہ کسی کو عطا نہیں کیا گیا اور وہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ہے۔ اور اگر کسی کو عطا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 181 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 181 (فکر) 3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1021 (علمیہ)
4۔ کنز العمال: 6641 (التراث الاسلامی) 5۔ شعب الایمان: 9693 (علمیہ) 6۔ شعب الایمان: 9689 (علمیہ)

کیا جاتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو یقیناً دیا جاتا۔ کیا آپ حضرت یوسف علیہ السلام کی گمشدگی کے وقت ان کا یہ قول نہیں سنتے: یٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ (ہائے افسوس! یوسف کی جدائی پر)۔(1)

أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝

"یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن پر ان کے رب کی طرح طرح کی نوازشیں اور رحمت ہے ۱؎ اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ثابت قدم ہیں ۲؎"

۱؎ حقیقت میں صلوٰۃ کا معنی دعا ہے اور جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو دعا پر مرتب ہوتی ہیں مثلاً برکت، مغفرت اور رحمت وغیرہ۔ اور آیت کریمہ میں اسے جمع ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس کی کثیر انواع واقسام پر دلالت ہو جائے اور اس کے بعد رحمة کا ذکر تاکید کے لئے ہے۔

۲؎ اور یہی لوگ حق اور صواب کی راہ پر ثابت قدم ہیں اس لئے کہ انہوں نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہا اور قضائے الٰہی کے ساتھ راضی ہو گئے۔ حضور نبی رحمت ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی طرف ان کے بیٹے کی تعزیت کے لئے ایک خط تحریر فرمایا اور اس میں لکھا "قَبَضَهُ مِنْكَ بِاَجْرٍ كَثِيْرٍ الصَّلٰوةِ وَالرَّحْمَةِ وَالْهُدٰى اِنِ احْتَسَبْتَ" (کہ اگر تو نے صبر کیا تو پھر وہ کثیر برکتوں، رحمتوں اور ہدایت کے عوض اللہ نے تجھ سے لیا ہے)(2) اسے حاکم نے مستدرک میں اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے، اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا "نِعْمَ الْعِدْلَانِ وَنِعْمَتِ الْعِلَاوَةُ فَالْعِدْلَانِ الصَّلٰوةُ وَالرَّحْمَةُ وَالْعِلَاوَةُ الْهِدَايَةُ" (دونوں ساتھی کتنے اچھے ہیں اور ان پر زیادتی (اضافہ) بھی کتنی عمدہ ہے۔ دونوں ساتھیوں سے مراد صلوٰۃ اور رحمت ہے اور اضافے سے مراد ہدایت ہے)۔ اہل مصیبت کے ثواب اور صبر کرنے والوں کے اجر کے بارے کئی احادیث وارد ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

(1)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب آزمائش میں مبتلا ہونے والوں کو قیامت کے دن ثواب عطا کیا جائے گا تو آزمائش سے نہ گزرنے والے اہل عافیت یہ خواہش کریں گے ہائے کاش! دنیا میں ان کے جسموں کی کھال قینچیوں سے کاٹ دی جاتی(3) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

(2)۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان کو کوئی بیماری، دائمی تکلیف، حزن، اذیت اور غم لاحق نہیں ہوتا حتی کہ کوئی کانٹا تک نہیں چبھتا مگر اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کے گناہ معاف فرما دیتے ہیں، متفق علیہ۔(4)

(3)۔ حضور نبی کریم ﷺ کی رفیقہ حیات حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جب کسی بندے کو کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتا ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اَللّٰهُمَّ اْجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَاخْلُفْ لِيْ خَيْرًا مِّنْهَا۔ تو اللہ تعالیٰ اس تکلیف پر اسے اجر عطا فرماتے ہیں اور اس کے بعد اس سے بہتر اور افضل بدل عطا فرماتے ہیں۔ اسے مسلم نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 182 (فکر)
2۔ مستدرک حاکم: 3068 (علمیہ)
3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2402 (علمیہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 16 صفحہ 106 (علمیہ)

روایت کیا ہے۔(1)

(4)۔ محمد بن خالد سلمی اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی بندے کے لئے درجہ اور رتبہ متعین ہوتا ہے تو بندہ اپنے عمل کے سبب اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ اسے جسمانی، مالی یا اولاد کے اعتبار سے کسی تکلیف اور آزمائش میں مبتلا کر دیتے ہیں پھر اسے اس پر صبر کرنے کی توفیق عطا فرما دیتے ہیں یہاں تک کہ اسے اس مرتبہ پر پہنچا دیتے ہیں جو اس کے لئے من جانب اللہ مقرر ہو چکا ہوتا ہے۔(2) اسے امام احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

(5)۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کونسے لوگوں پر آزمائش شدید ہوتی ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا انبیاء علیہم السلام، پھر ان کے بعد والے مرتبہ کے لوگ، پھر ان کے بعد والے مرتبہ کے لوگ۔ ہر آدمی کو اس کے دین کے مطابق آزمایا جاتا ہے۔ پس اگر وہ اپنے دین کے معاملہ میں سخت ہو تو پھر اس کی ابتلا بھی شدید ہوتی ہے اور اگر وہ اپنے دین میں نرم ہو تو اس کی آزمائش بھی آسان اور خفیف ہوتی ہے۔ پس اسی طرح ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین پر چلتا ہے اور اس کے ذمہ کوئی گناہ باقی نہیں ہوتا(3) اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن صحیح کہا ہے۔ علاوہ ازیں ابن ماجہ اور دارمی نے بھی روایت کیا ہے۔ اس بارے میں اتنی کثیر احادیث ہیں کہ شمار نہیں کی جا سکتیں۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿١٥٨﴾

"بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں پس جو حج کرے اس گھر کا یا عمرہ کرے تو کچھ حرج نہیں اسے کہ چکر لگائے ان دونوں کے درمیان اور جو کوئی خوشی سے نیکی کرے تو اللہ تعالیٰ بڑا قدر دان خوب جاننے والا ہے"

صفا اور مروہ مکہ مکرمہ میں دو پہاڑ ہیں۔

شعائر شعیرہ کی جمع ہے۔ اس کا معنی علامت اور نشانی ہے اور یہاں ان سے مراد وہ مناسک ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے لئے علامت ونشانی قرار دیا ہے، کیونکہ حج اور عمرہ میں ان دونوں پہاڑوں کے درمیان سعی کرنا واجب ہے، سوائے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت کے۔ انہوں نے کہا یہ سنت ہے، اس لئے کہ رب کریم نے فرمایا: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا (تو کچھ حرج نہیں اسے کہ چکر لگائے ان دونوں کے درمیان)۔

تو اس میں حرج کی نفی اباحت پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح رب کریم کا قول وَمَن تَطَوَّعَ بھی اباحت پر دلالت کرتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اباحت اور تطوع دونوں میں سے ہر ایک وجوب سے عام ہے، لہٰذا دونوں وجوب کی نفی نہیں کر سکتے۔ حج کا لغوی معنی قصد کرنا اور عمرہ کا لغوی معنی زیارت کرنا ہے اور شریعت میں دونوں معروف ومشہور عبادات سے عبارت ہیں۔ اور جناح سے مراد قصد سے اعراض کرنا ہے اور اس کا معنی ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں۔ یَطَّوَّفَ اصل میں یَتَطَوَّفَ ہے۔ اس میں تاء کو طاء میں مدغم کیا گیا ہے اور اس کا معنی ہے ان دونوں کے درمیان چکر لگانا۔ اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ صفا اور مروہ پر اساف اور نائلہ نامی دو بت تھے۔ ان

1۔ صحیح مسلم، جلد 6 صفحہ 195 (علمیہ) 2۔ مشکوۃ المصابیح: 1568 (علمیہ) 3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2398 (علمیہ)

میں سے اساف صفا پر تھا اور نائلہ مروہ پر۔ اور زمانہ جاہلیت کے اکثر لوگ ان دونوں بتوں کی تعظیم کے لئے ان کے درمیان طواف کرتے تھے اور ان سے برکت حاصل کرتے تھے۔ جب اسلام غالب ہوا اور بت توڑ دیے گئے تو مسلمان ان بتوں کی وجہ سے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے سے حرج محسوس کرتے تھے۔ اور انصار اسلام سے پہلے مناۃ کی عبادت کرتے تھے اور ذبح کرتے وقت ذبیحہ پر اسی کا نام لیتے تھے اور جو ذبح کے وقت اس کا نام لیتے تھے، وہ صفا اور مروہ کے درمیان طواف کرنے میں حرج محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ جب وہ اسلام لے آئے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے پوچھا اور کہا ہم تو صفا اور مروہ کے درمیان طواف کرنے میں حرج جانتے تھے، تو اس وقت دونوں فریقوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

فریق اول کی دلیل یہ ہے کہ حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں شیاطین اس رات کو بچانتے تھے جس میں وہ صفا اور مروہ کے درمیان جمع ہوتے اور ان دونوں کے درمیان ان کے بت تھے۔ پس جب اسلام آیا تو مسلمانوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! ہم تو صفا اور مروہ کے درمیان طواف نہیں کریں گے کیونکہ یہ ایسا عمل ہے جو ہم عہد جاہلیت میں کرتے تھے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1) حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عاصم سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے صفا اور مروہ کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تو آپ نے کہا کہ ہم یہ خیال کرتے تھے کہ یہ دونوں امر جاہلیت میں سے ہیں، لہٰذا جب اسلام آیا تو ہم ان کے درمیان سعی کرنے سے رک گئے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ الآیہ" (2)۔

فریق ثانی کی دلیل یہ ہے کہ صحیحین میں حضرت عروہ کی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے آپ سے کہا اس قول باری تعالیٰ کے بارے آپ کی رائے کیا ہے۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ؟ تو ام المومنین نے ارشاد فرمایا اے میرے بھانجے تو نے کتنا غلط کہا اگر اس طرح ہوتا جیسے تو نے اس کی تاویل کی ہے تو پھر کلام اس طرح ہوتا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا لیکن یہ تو انصار کے بارے نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ اسلام لانے سے قبل مناۃ طاغیہ کا نام ذبح کے وقت لیتے تھے۔ اس کی عبادت کرتے تھے اور جو اس کا نام لیتا تھا وہ صفا و مروہ کے درمیان طواف کرنے میں حرج جانتا۔ لہٰذا انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ہم تو عہد جاہلیت میں صفا اور مروہ کے درمیان طواف کرنے میں حرج جانتے تھے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ الآیہ" والی آیت نازل فرمائی (3) سعی کے واجب ہونے پر صفیہ بنت شیبہ کی وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو حبیبہ بنت تجراۃ سے انہوں نے نقل کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے دیکھا۔ اس طرح کہ لوگ آپ ﷺ کے آگے آگے تھے اور آپ ﷺ ان کے پیچھے تھے آپ ﷺ اتنا تیز دوڑ رہے تھے حتیٰ کہ میں نے آپ ﷺ کے گھٹنوں کو دیکھ لیا۔ کیونکہ دوڑنے کی وجہ سے آپ ﷺ کی چادر بل کھا رہی تھی۔ اور آپ ﷺ فرما رہے تھے تو سن لو اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی کو (فرض) لازم قرار دیا ہے (4) اسے امام شافعی اور احمد نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن مؤمل ہے جسے دار قطنی اور محدثین کی ایک جماعت نے ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن ابن جوزی نے کہا ہے کہ یحییٰ نے کہا ہے کہ اس کے سبب کوئی حرج نہیں۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

1۔ مستدرک حاکم: 3073 (علمیہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 646 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری: 1561 (ابن کثیر)
4۔ مسند احمد، جلد 6 صفحہ 422 (صادر)

دار قطنی نے اسے منصور بن عبدالرحمٰن کی سند سے روایت کیا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ یحییٰ بن معین نے کہا ہے وہ ثقہ ہے اور ذہبی نے کہا ہے وہ ثقہ ہے اور مسلم کے راویوں میں سے مشہور ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کے دوسرے طرق بھی ہیں طبرانی نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے لہٰذا اس سند کے پہلی سند کے ساتھ ملنے کی وجہ سے وہ بھی قوی ہوگئی۔ کبھی وجوب پر استدلال حضرت ابوموسیٰ کی متفق علیہ حدیث سے کیا جاتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا ''بیت اللہ شریف اور صفا و مروہ کا طواف کرو''(1) تو اس میں صیغۂ امر ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ جن ائمہ نے وجوب کا قول کیا ہے ان کے مابین پھر اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس اصول کے مطابق کہ'' دلائل وجوب جب ظنی ہوں تو ان سے کتاب اللہ پر زیادتی نہیں کی جا سکتی۔'' کہا ہے کہ صفا و مروہ کی سعی واجب ہے لیکن فرض نہیں بلکہ اس کی کو دم کے ساتھ پورا کیا جا سکتا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے کہ سعی رکن ہے اور یہ اس لئے کہا ہے کہ ان کے نزدیک فرض اور واجب کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی سات چکر ہیں۔ اس طرح کہ صفا سے مروہ تک ایک چکر ہے اور مروہ سے صفا کی طرف لوٹ کر آنے سے دوسرا چکر مکمل ہو جاتا ہے۔ شوافع میں ابن جریر طبری اور ابوبکر الصوفی نے اور احناف میں سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان کیا ہے کہ صفا سے مروہ کی طرف جانے اور پھر وہاں سے صفا کی طرف لوٹنے سے ایک چکر مکمل ہوتا ہے۔ انہوں نے اسے بیت اللہ شریف کے طواف پر قیاس کیا ہے کہ جہاں سے اس کی ابتداء ہوتی ہے وہاں ہی اس کی انتہاء ہوگی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صفا کی طرف واپس لوٹنے کا اعتبار ہی نہیں کیا جائے گا بلکہ دوسرے چکر کا آغاز پھر صفا سے ہوگا۔ ہماری دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث ہے۔ اس میں ہے کہ جب ان کے طواف کی انتہاء مروہ پر ہو تو کہے ''لو استقبلت من امری الحدیث''۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2) جمہور کے عمل کا دار و مدار حدیث مشہور پر ہے اور وہ ہمارے لئے بطور حجت کافی ہے۔

علماء نے اس پر بھی اجماع کیا ہے کہ سعی کی متعدد شرائط ہیں: ان میں سے ایک شرط ترتیب ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ سعی کی ابتدا صفا سے ہو اور وہ مروہ پر ختم ہو۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ شرط نہیں، وہ باطل ہے اور اس ترتیب پر حجت حضور نبی کریم ﷺ کا اس پر دوام اختیار کرنا ہے۔ اور حدیث جابر میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ میں وہیں سے ابتداء کروں گا جہاں سے اللہ تعالیٰ نے کی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے صفا سے آغاز کیا اور اس کے اوپر چڑھ گئے(3) اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور امام احمد، مالک، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور نسائی رحمہم اللہ نے اسے صیغۂ واحد کی بجائے جمع سے نقل کیا ہے۔ یعنی ہم ابتداء کریں گے(4) دار قطنی نے اسے صیغۂ امر کے ساتھ روایت کیا ہے کہ تم ابتداء کرو۔ ابن حزم نے اسے صحیح قرار دیا ہے، پس اگر صیغۂ امر ثابت ہے تو وجوب ثابت کرنے کے لئے تو یہ بالکل ظاہر ہے۔ وگرنہ جب اس کے ساتھ آپ ﷺ کا یہ ارشاد ملا دیا جائے ''خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ فَاِنِّیْ لَا اَدْرِیْ لَعَلِّیْ لَا اَحُجُّ بَعْدَ حَجَّتِیْ'' (مجھ سے مناسک حج سیکھ لو کیونکہ میں نہیں جانتا شاید میں اپنے اس حج کے بعد حج نہ کروں)(5) تو یہ وجوب پر حجت بن جاتا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ سعی کا دو طوافوں میں سے کسی ایک کے بعد ہونا یعنی طواف قدوم یا طواف زیارۃ اگر سعی اور طواف کے درمیان

1۔ صحیح بخاری، 1637 (ابن کثیر)　2۔ صحیح مسلم، جلد 8 صفحہ 145 حدیث نمبر 1218 (علمیہ)　3۔ صحیح مسلم، جلد 8 صفحہ 144 (علمیہ)
4۔ سنن ابن ماجہ، 3074 (علمیہ)　5۔ صحیح مسلم، جلد 9 صفحہ 39 (علمیہ)

وقوف عرفہ نہ ہو تو پھر دونوں کے مابین فاصلہ باعث حرج نہیں۔ (یعنی طواف سے فارغ ہونے کے متصل بعد سعی کا ہونا لازم اور ضروری نہیں بلکہ وقفے کے بعد بھی کی جا سکتی ہے) جس نے طواف قدوم سے پہلے سعی کی تو اس کے معتبر نہ ہونے پر اجماع ہے، سوائے اس ایک روایت کے جو عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے عطا سے نقل کی ہے کہ اگر کسی نے سعی کی پھر طواف کیا تو ایسا کرنا جائز ہے۔ اس قول کی دلیل اسامہ بن شریک کی حدیث ہے۔ اس میں طواف سے قبل سعی کرنے کے متعلق سوال کا ذکر ہے۔ تو اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسا کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ امت نے اس حدیث کے مطابق عمل ترک کر دیا ہے۔ لہٰذا وہ شاذ ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ عبادت غیر معقول ہے لہٰذا اسی کیفیت پر اقتصار کیا جائے گا جس کے بارے شریعت کا حکم وارد ہو۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں میں حالت حیض میں مکہ مکرمہ میں آئی۔ میں نے بیت اللہ شریف کا طواف نہ کیا اور نہ ہی صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔ فرماتی ہیں میں نے اس کے بارے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا حاجیوں کے افعال کی طرح اعمال کرتی رہو مگر پاک ہونے تک بیت اللہ شریف کا طواف نہ کرو(1) یہ حدیث متفق علیہ ہے اور یہ اس بارے میں صریح ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو طواف سے منع فرمایا اور اس کے علاوہ دیگر احکام حج ادا کرنے کی اجازت دی اور بیشک آپ اس دوران طواف اور سعی دونوں سے رکی رہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے انہیں فرمایا تیری جانب سے بیت اللہ شریف کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی تیرے حج اور عمرہ کی طرف سے کافی ہوگی۔ تو اس سے یہ واضح ہوا کہ صفا اور مروہ کے مابین سعی طواف کے تابع ہے اور اسی پر اس حکم کا دارومدار ہے کہ جس نے طواف زیارت کیا اور سعی بالکل نہ کی، نہ طواف قدوم کے بعد اور نہ ہی طواف زیارت کے بعد، تو اس پر سعی چھوڑنے کی وجہ سے دم واجب ہوگا اور سعی کی قضا نہیں کی جائے گی کیونکہ صرف اسی سعی کا عبادت ہونا معلوم ہے جو طواف کے بعد ہو۔ لیکن وہ آدمی جس نے طواف اور سعی دونوں ادا نہ کئے تو اس پر دونوں کی اکٹھی قضا واجب ہے۔ سنت یہ ہے کہ جب صفا پر کھڑا ہو تو تین بار تکبیر کہے اور کہے: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ وہ یہ کلمات تین بار کہے اور دعا مانگے پھر مروہ پہنچ کر بھی اسی طرح عمل کرے۔ جب صفا سے اترے تو پیدل چلتے ہوئے آئے مگر جب وادی کے بطن میں پہنچ جائے تو دوڑے یہاں تک کہ اس سے نکل جائے پھر جب مروہ پر چڑھنے لگے تو پیدل چلے(2) اسی طرح صحیحین اور دیگر کتابوں میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور دیگر راویوں سے حدیث مروی ہے۔

؎ "وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا" حمزہ اور کسائی نے تَطَوَّعَ کو يَطَّوَّعْ پڑھا ہے یعنی یاء کے ساتھ اور طاء کو مشدد اور صیغہ مضارع کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح اس آیت میں بھی پڑھا ہے فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۚ وَاَنْ تَصُوْمُوْا۔ اور یعقوب نے صرف پہلے میں ان کے ساتھ موافقت کی ہے۔ جبکہ جمہور نے اسے صیغہ ماضی کی بناء پر تاء اور عین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے نیکی کا عمل کرنا چاہے فرض ہو یا نفل۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے جس کسی نے صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگانے کے سبب نیکی کی(3) انہوں نے یہ قول سعی کے سنت ہونے کی بناء پر کیا ہے۔ مقاتل اور کلبی کا قول ہے کہ جس کسی نے خوشی سے نیکی کی اور واجب طواف کے بعد مزید طواف کیا(4) اس کے بارے یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے حج فرض ادا کرنے کے بعد نفلی حج اور عمرہ کیا۔ حسن

1۔ صحیح بخاری: 1567 (ابن کثیر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 186 (فکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 187 (فکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 187 (فکر)

کہتے ہیں کہ اس سے مراد ایسے تمام اعمال کا کرنا ہے جو فرض نہ ہوں، چاہے ان کا تعلق نماز سے ہو یا زکوۃ سے، یا طواف سے ہو یا ان کے علاوہ دیگر اعمال صالحہ سے ہو(1) عبارت میں خیرًا منصوب ہے، اس لئے کہ وہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یا پھر حرفِ جار کو حذف کر کے فعل کو بلا واسطہ اس کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ یا پھر فعل متعدی ہے اور الی کے معنی کو متضمن ہے (اور یہ اس کا مفعول ہے)۔

ﮯ "فَاِنَّ اللّٰہَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ" یعنی اللہ اس نیکی پر اسے ثواب عطا فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ پر کوئی شی مخفی نہیں ہے، واللہ اعلم۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِۙ اُولٰٓىٕكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَۙ۝

"بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں ان چیزوں کو جو ہم نے نازل کیں روشن دلیلوں اور ہدایت سے اس کے بعد بھی کہ ہم نے کھول کر بیان کر دیا انہیں لوگوں کے واسطے (اپنی) کتاب میں ا۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ دور کرتا ہے انہیں اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت سے) اور لعنت کرتے ہیں انہیں لعنت کرنے والے ہے۔"

ا۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت معاذ بن جبل، سعد بن معاذ اور خارجہ بن زید رضی اللہ عنہم نے علماء یہود کے بعض افراد سے ان بعض امور کے بارے پوچھا جو تورات میں تھے۔ تو انہوں نے انہیں چھپا لیا اور انہیں ان پر آگاہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(2) اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ بیشک جو لوگ ان چیزوں کو چھپاتے ہیں جو ہم نے حضرت محمد ﷺ کی صداقت پر شہادت دینے والی نازل کی ہیں اور جو صراط مستقیم اور حضور نبی کریم ﷺ کی اتباع کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔ "مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ" یعنی اس کے بعد بھی کہ ہم نے اسے انہیں لوگوں کے واسطے کتاب (تورات) میں بیان کر دیا۔

ﮯ اللعن کا اصلی معنی بھگانا اور دھتکارنا ہے اور یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ بیشک وہ اللہ تعالیٰ سے ان کی لعنت کا سوال کرتے ہیں اور لعنت کرنے والوں میں سے جو ان پر لعنت کرتے ہیں وہ ملائکہ، جن و انس میں سے مسلمان اور زمین پر رہنے والے تمام جانور ہیں۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک جنازہ میں حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کافر کو اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ضرب لگائی جاتی ہے تو جن و انس کے علاوہ ہر جانور اس کی آواز سنتا ہے۔ پس ہر جانور اس کی آواز سن کر اس پر لعنت بھیجتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ(3) اسے ابن ماجہ، ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللّٰعنون سے مراد جن و انس کے علاوہ تمام مخلوق ہے۔ قتادہ کا قول ہے کہ اس سے مراد ملائکہ ہیں۔ عطاء نے کہا جن و انس ہیں اور حسن نے کہا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے تمام بندے ہیں۔ مجاہد نے کہا ہے لعنت بھیجنے والے چوپائے ہیں۔ یہ بنی آدم کے نافرمانوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔ جب قحط پڑ جائے اور بارش رک جائے تو وہ کہتے ہیں یہ بنی آدم کی نحوست ہے۔(4)

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوْا فَاُولٰٓىٕكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۝

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 187 (فکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 295 (علمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 296
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 187 (فکر)

"البتہ جو لوگ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں اور ظاہر کر دیں (جواب تک چھپاتے رہے) ۱؎ تو ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہوں ۲؎ اور میں بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہوں ۳؎"

۱؎ مگر وہ لوگ جو (حق و صداقت) کو چھپانے اور دیگر معاصی سے توبہ کر لیں اور انہوں نے جو فساد برپا کیا اس کا تدارک کر کے اپنی اصلاح کر لیں اور جو کچھ تورات میں ہے اسے ظاہر کر دیں۔

۲؎ تو میں انہیں معاف فرما دوں گا۔ کیونکہ بندے کی جانب سے توبہ یہ ہے کہ وہ گناہوں سے رجوع کر لے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ ہے کہ وہ سزا سے رجوع فرما لے۔

۳؎ یعنی اللہ تعالیٰ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور رحمت فرمانے والا ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک بندہ جب گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرما لیتا ہے۔(1) متفق علیہ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے بہت زیادہ فرحت محسوس کرتا ہے جبکہ تم میں سے کوئی اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ فرمایا جس کی سواری صحرائی زمین میں ہو، پھر وہ اس سے بھاگ جائے دراں حالیکہ اس کا کھانا اور پانی اس پر ہو، پس وہ اس سے مایوس ہو کر ایک درخت کے پاس آئے اور اس کے سائے میں لیٹ جائے اس حال میں کہ وہ اپنی سواری سے مایوس ہے پس وہ اسی حال میں ہے کہ اچانک سواری کو اپنے پاس کھڑا ہوا دیکھتا ہے۔ پھر اس کی مہار کو پکڑ لیتا ہے۔ اور پھر بہت زیادہ خوشی کے سبب یہ کہہ دیتا ہے: اَللّٰهُمَّ اَنْتَ عَبْدِیْ وَاَنَا رَبُّکَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ، رواہ مسلم (2) (مقصود یہ ہے کہ جتنی خوشی اس مسافر کو اپنی سواری اور کھانے پینے کا سامان ملنے کے سبب ہوتی ہے، اس سے کہیں زیادہ خوشی رب کریم کو ہوتی ہے۔ جب اس کا بندہ اپنے گناہوں پر اظہار ندامت کرتے ہوئے توبہ کے لئے اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے، مترجم)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

"بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور مرے اس حال پر کہ وہ کافر تھے ۱؎ یہی وہ لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی ۲؎"

۱؎ یعنی ان چھپانے والوں میں سے جنہوں نے توبہ نہیں کی یہاں تک کہ مر گئے۔

۲؎ ابوالعالیہ نے کہا ہے کہ یہ قیامت کے دن ہوگا کہ کافر کو ٹھہرا لیا جائے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ لعنت کرے گا، پھر فرشتے لعنت کریں گے، پھر لوگ اس پر لعنت بھیجیں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ملعون بھی تو لوگوں میں سے ہے، وہ کیسے اپنے آپ پر لعنت کرے گا۔ تو اس کے بارے یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "يَلْعَنُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا" کہ لوگوں میں سے بعض بعض پر لعنت کریں گے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بیشک لوگ ظلم کرنے والوں پر لعنت کریں گے حالانکہ وہ ان ہی میں سے ہیں۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

"ہمیشہ رہیں گے اس میں ۱؎ نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی ۲؎"

1۔ صحیح بخاری: 2518 (ابن کثیر)　2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 355 (وزارت تعلیم)

لے خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: وہ ہمیشہ رہیں گے لعنت میں یا جہنم میں۔ اور اس میں ذکر سے ضمیر اس (جہنم) کی عظمت شان کے لئے ہے۔

لا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ: ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ اس صورت میں ینظرون انظار سے مشتق ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ ان کا انتظار نہیں کیا جائے گا تا کہ وہ کوئی عذر پیش کریں۔ یا پھر یہ معنی ہے کہ ان کی طرف رحمت کی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ کفار قریش نے کہا: اے محمد ﷺ! ہمارے سامنے اپنے رب کا وصف اور نسب بیان کر۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص اور یہ قول نازل فرمایا۔(1)

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝

"اور تمہارا خدا ایک خدا ہے لے نہیں کوئی خدا بجز اس کے ۲ے بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ۳ے"

لے وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ میں الٰہ کی صفت وَاحِدٌ کے ساتھ تاکید کے لئے لگائی گئی ہے اس کے باوجود کہ الٰہ کی تنوین اس کے واحد ہونے پر دلالت کر رہی ہے اور اس میں وحدانیت کا اتنا مضبوط بیان ہے جو الٰهكم واحد میں نہیں ہے۔ یہ خطاب عام ہے یعنی اے عالمین! تم میں سے عبادت کا مستحق صرف الله واحد ہے۔ اس کی کوئی نظیر اور اس کا کوئی شریک ممکن نہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ خطاب ان چھپانے والوں کو ہو اور ایسا انہیں اس طرز عمل پر جھڑکنے اور ڈانٹ پلانے کے لئے ہو جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اختیار کیا۔ اس طرح کہ وہ توحید کو چھپاتے ہوئے کہتے تھے کہ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ۔ عزیر اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے اور مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے۔ اور یہ زجر و توبیخ انہیں رسالت کو چھپانے پر زجر و توبیخ کے بعد ہے۔

۲ے لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یہ وحدانیت کی پختگی اور تقریر کے لئے دوسری صفت ہے اور تقریر کے بعد اس کے لئے تاکید ہے یا پھر یہ الٰهكم کی ایک خبر کے بعد دوسری خبر ہے۔

۳ے الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ: یہ دونوں الٰهكم کی خبریں ہیں۔ یا پھر ان کا مبتدا محذوف ہے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کے مستحق عبادت ہونے کی دلیل کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ مطلقاً انعام فرمانے والا ہے، تمام کی تمام نعمتوں کا مالک ہے، خواہ وہ اصول ہوں یا فروع۔ اور اس کے سوا ان پر کوئی انعام کرنے والا نہیں ہے۔ حضرت اسماء بنت یزید فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم موجود ہے (یعنی) وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ اور اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ اسے ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے (2) سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں ابوالضحیٰ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ، تو مشرکین نے تعجب کیا اور کہا اگر تم سچے ہو کہ ایک خدا ہے تو ہمارے سامنے کوئی علامت پیش کرو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔(3)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 189 (فکر) 2۔ سنن ابی داؤد: 1467 (الرشد) 3۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 30 (علمیہ)

اِلسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

"بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں ۱؎ اور رات اور دن کی گردش میں ۲؎ اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں ۳؎ وہ چیزیں اٹھائے جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو ۴؎ اور جو اتارا اللہ تعالیٰ نے بادلوں سے پانی ۵؎ پھر زندہ کیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور پھیلا دیئے اس میں ہر قسم کے جانور ۶؎ اور ہواؤں کے بدلتے رہنے میں ۷؎ اور بادل میں جو حکم کا پابند ہو کر آسمان اور زمین کے درمیان (لٹکا رہتا) ہے ۸؎ (ان سب میں) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں ۹؎"

۱؎ بیشک آسمانوں اور ان چیزوں کی تخلیق میں جو اُن میں ہیں مثلاً سورج، چاند اور ستارے وغیرہ۔ ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے متصل جید سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ قریش نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی، کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ صفا پہاڑی کو ہمارے لئے سونا بنا دے تاکہ اس کے سبب ہم اپنے دشمنوں پر قوت حاصل کر سکیں۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کی طرف وحی فرمائی کہ میں انہیں عطا کر دوں گا (یعنی ان کے لئے اسے سونا بنا دوں گا) لیکن اگر انہوں نے اس کے بعد کفر کیا تو انہیں اتنا شدید عذاب دوں گا جو عالمین میں سے کسی اور کو نہیں دوں گا۔ آپ ﷺ نے عرض کی اے میرے پروردگار! مجھے اور میری قوم کو چھوڑ دے، میں انہیں رات دن دعوت دیتا رہوں گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1) کہ وہ کیسے یہ سوال کرتے ہیں کہ صفا پہاڑ سونا بن جائے؟ حالانکہ وہ اس سے بڑی بڑی ایسی علامات کو دیکھ رہے ہیں جو موجود ہیں اور اس کی مثل علامات کا پایا جانا بھی ممکن ہے۔ "وَالْاَرْضِ" اور زمین کی تخلیق میں اور جو کچھ اس میں ہے مثلاً درخت، دریا، پہاڑ، سمندر، جواہرات، مختلف انواع کی جمادات اور حیوانات، آب و ہوا کی مختلف تاثیرات، اقالیم اور ان کی مختلف جہات۔ سموٰت کو جمع اور ارض کو مفرد ذکر فرمایا اس لئے کہ سموٰت کا متعدد ہونا مخاطبین کے نزدیک ثابت شدہ امر ہے، اس بناء پر کہ وہ ستاروں کی حرکات کے متعدد ہونے کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اس کے برعکس زمین کا متعدد ہونا صرف شریعت سے ثابت ہے اور استدلال وہی مضبوط ہوتا ہے جو ایسی چیز سے ہو جو مخاطبین کے نزدیک بھی ثابت شدہ اور معلوم ہو۔ اور اس طرح بھی کہا گیا ہے کہ آسمان حقیقۃً مختلف ہیں بخلاف زمینوں کے کہ وہ تمام کی تمام ایک ہی جنس سے ہیں اور وہ مٹی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ آسمانوں کے طبقات ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں بخلاف زمینوں کے۔ لیکن اس کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ سنت سے یہ ثابت ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ ہے۔ جیسا کہ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ کی تفسیر میں ہم احادیث بیان کر چکے ہیں۔

۲؎ یعنی آنے جانے میں رات اور دن کا ایک دوسرے کے پیچھے ہونا، موسم گرما میں راتوں کا چھوٹا اور دنوں کا طویل ہونا اور موسم سرما میں اس کے برعکس ہونا۔

۳؎ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان جہازوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے کہ وہ بھاری بھرکم بوجھ اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں لیکن وہ سمندر میں ڈوبتے نہیں۔ الفُلک کا لفظ واحد اور جمع استعمال ہوتا ہے۔ فرق اس طرح کیا جائے گا کہ جب اس سے مراد جمع ہو تو اس کی صفت مؤنث ذکر کی جاتی ہے اور جب اس سے مراد مفرد ہو تو اس کی صفت مذکر ذکر کی جاتی ہے جیسے اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ، اِذَا

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 299 (علمیہ)

كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ

ؔ "بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ" ایسی چیزوں کے ساتھ جو لوگوں کو نفع پہنچاتی ہیں یہ ما مصدریہ ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ان کے چلنے میں لوگوں کا نفع ہے۔ یا یہ ما موصولہ ہے معنی ہوگا وہ چلتے ہیں ایسی اشیاء کے ساتھ جو لوگوں کو نفع دیتی ہیں کہ لوگ ان پر سوار ہوتے ہیں اور ان میں سامان لادتے ہیں تجارت کرتے ہوئے، مال کماتے ہوئے اور دیگر طرح طرح کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

ۃ "وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ" اس میں پہلا مِنْ ابتداء کے لئے اور دوسرا بیان کے لئے ہے۔

۶ پھر نباتات کے سبب زمین کو زندہ کیا اس کے خشک اور شورزدہ ہو جانے کے بعد۔ اور پھیلا دیئے اس میں ہر قسم کے جانور۔ ان میں اتنے چھوٹے بھی ہیں کہ دیکھے نہیں جا سکتے اور اتنے بڑے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قوت و طاقت کے بغیر ان کی تسخیر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بَثَّ کا عطف اَنْزَلَ یا اَحْيَا پر ہے کیونکہ جانور سبزے اور شادابی سے نمو پاتے ہیں اور پانی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔

ۓ ہوائیں مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی طرف بدلتی رہتی ہیں، ان میں مفید بھی ہوتی ہیں اور نقصان دہ بھی۔ نرم اور خفیف بھی، تند و تیز بھی، گرم بھی اور ٹھنڈی بھی۔

جاننا چاہئے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی الریح معرف باللام واقع ہوا ہے اس کے جمع اور مفرد ہونے میں قراء کے مابین اختلاف ہے۔ مگر سورۃ الذاریات میں الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ کے مفرد ہونے پر تمام کا اتفاق ہے اور سورۂ روم میں پہلی جگہ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ میں اس کے جمع ہونے پر تمام کا اتفاق ہے۔ حمزہ اور کسائی نے یہاں تَصْرِيْفِ الرِّيْحِ پڑھا ہے۔ اسی طرح سورۂ کہف، جاثیہ، اعراف، نحل، روم میں دوسری جگہ اور سورۂ فاطر میں بھی یہ لفظ مفرد پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے آخری چار مقامات پر ان کی اتباع کی ہے۔ ابن کثیر نے سورۂ فرقان میں اور حمزہ نے سورۂ حجر میں مفرد پڑھا ہے جبکہ باقی تمام نے ان تمام مقامات پر جمع پڑھا ہے۔ نافع نے سورۂ ابراہیم اور شوریٰ میں جمع اور باقی قراء نے مفرد پڑھا ہے اور ابو جعفر نے ان تمام مقامات پر جمع کا لفظ پڑھا ہے جو اوپر ذکر کئے گئے ہیں۔ اور قرآن کریم میں جہاں بھی ریح نکرہ ذکر کیا گیا ہے اس کے مفرد ہونے پر اجماع ہے، واللہ اعلم۔

ۘ یعنی بادل نہ نیچے اترتے ہیں اور نہ وہ زائل ہوتے ہیں (حالانکہ فطرت ان دو میں سے ایک کا تقاضا کرتی ہے)۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آ جائے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فضا میں معلق کر رکھا ہے، جہاں چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے۔ ابن وہب نے کہا ہے تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں سے آتی ہیں گرج، بجلی اور بادل۔(1)

ۙ ان سب میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ان میں غور و فکر کرتے ہیں۔ اور ان امور کی طرف اس اعتبار سے دیکھتے ہیں کہ یہ ایسے امور ہیں جن کا ہونا فی ذاتہا ممکن ہے، لیکن ان کی ذاتیں ان کے وجود کا تقاضا نہیں کرتیں اور نہ ہی بہت سی وجوہ میں سے مخصوص وجوہ کی بناء پر ان کے آثار میں سے کوئی شی موجود ہے۔ بلکہ یہ تمام کی تمام احتمالی ہیں۔ اس لئے ایسے صانع کا وجود ضروری ہے جس کی ذات اس کے وجود کا تقاضا کرتی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حیّ (زندہ) ہو، علیم (سب کچھ جاننے والا) ہو اور حکیم (دانا) بھی ہو۔ جو چاہے کر سکتا ہو اور جس کا ارادہ کرے اس کا حکم دے سکتا ہو۔ صفات کمال سے متصف ہو، نقص اور زوال سے منزہ ہو اور مماثل و معارض سے بلند و برتر ہو۔ کیونکہ اگر اس کے ساتھ ایسا الٰہ ہو جو اس کی طرح قدرت رکھتا ہوگا تو پھر ایک معین اثر پر دو اثر کرنے والوں کا اجتماع لازم آئے گا اور یہ محال ہے یا دو میں سے ایک عاجز ہوگا یا پھر ایک دوسرے کو تصرف سے روکے گا تو یہ فساد کا موجب ہوگا۔ وہ ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 191 (فکر)

پیدا کی ہوئی تمام چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار دیکھ رہے ہیں اور یہ پہچانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی عبادت اور شکر کا مستحق ہے، اس کے علاوہ کوئی نہیں۔ ابن ابی الدنیا نے کتاب التفکر میں حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (بے شک آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے میں اور دن اور رات کے بدلتے رہنے میں (بڑی) نشانیاں ہیں اہل عقل کے لئے۔) پھر فرمایا "ہلاکت اور بربادی ہے اس کے لئے جس نے اسے پڑھا اور اس میں غور و فکر نہ کیا" حضرت امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا گیا ان میں تفکر کی انتہا کیا ہے؟ تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس طرح پڑھنا کہ انہیں سمجھ رہا ہو (یعنی غور و فکر اور تدبر کرتے ہوئے ان کی قرأت کرنا) واللہ اعلم۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَ لَوْ یَرَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

"اور کچھ لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اوروں کو اللہ کا مد مقابل [1] محبت کرتے ہیں ان سے جیسے اللہ سے محبت کرنا چاہئے [2] اور جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اللہ سے [3] اور کاش! (اب) جان لیتے جنہوں نے ظلم کیا [4] (جو وہ اس وقت جانیں گے) جب (آنکھوں سے) دیکھ لیں گے عذاب [5] کہ ساری قوتوں کا مالک اللہ ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے [6]"

[1] کچھ لوگ وہ ہیں جو اوروں کو اللہ تعالیٰ کا مد مقابل بناتے ہیں۔ یعنی بتوں کو یا اپنے ان سرداروں کو جن کی وہ اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں یا پھر ایسی شیئ کو جو ان دونوں سے عام ہے۔ یعنی ہر وہ شیئ جو اللہ تعالیٰ سے غافل کرنے والی ہے اور اس کے احکام کی پیروی سے روکنے والی ہے۔

[2] "یُحِبُّوْنَهُمْ" وہ ان کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں۔ "كَحُبِّ اللّٰهِ" جیسا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کرتے ہیں، یعنی وہ اطاعت و محبت میں اللہ تعالیٰ اور ان کے درمیان مساوی سلوک کرتے ہیں۔ محبت کا معنی دل کا میلان ہے۔ زجاج نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ یا پھر آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے معبودوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جیسے مؤمنین اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔

[3] اور کفار جتنی محبت اپنے الہوں سے کرتے ہیں۔ مؤمنین اس سے کہیں زیادہ محبت اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں۔ کیونکہ اہل ایمان کی محبت منقطع نہیں ہوتی۔ اور کسی حال میں بھی وہ اللہ تعالیٰ سے اعراض نہیں کرتے، چاہے وہ خوشحالی میں ہوں یا تنگ دستی سے دو چار ہوں، وہ شدت و تکلیف میں مبتلا ہوں یا راحت و آرام کے مزے لے رہے ہوں۔ لیکن اس کے برعکس کفار کی محبت بعض موہومہ اور فاسدہ اغراض کے لئے ہوتی ہے۔ وہ معمولی سبب کے ساتھ بھی زائل ہو جاتی ہے۔ اسی لئے وہ اپنے الہوں کو مصائب اور شدائد کے وقت اللہ تعالیٰ کے مساوی لے آتے تھے اور کچھ وقت تک ایک بت کی پوجا کرتے تھے اور پھر اسے چھوڑ کر کسی اور کی طرف منتقل ہو جاتے تھے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان لوگوں کو حکم فرمائے گا جو دنیا میں بتوں کی محبت میں

جلتے رہے کہ وہ اپنے بتوں سمیت جہنم میں داخل ہو جائیں۔ تو وہ داخل نہ ہوں گے پھر ان کافروں کے سامنے مومنین سے فرمائے گا اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو جہنم میں داخل ہو جاؤ تو وہ فوراً اس میں کود جائیں گے تو اس وقت عرش کے نیچے سے منادی ندا دے گا" وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (یہ وہ اہل ایمان ہیں جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں)(1) میں کہتا ہوں" وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" کا یہ معنی بھی ممکن ہے کہ جو محبت کسی کے دل میں کسی کے لئے ہو سکتی ہے اس سے زیادہ محبت اہل ایمان اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں کیونکہ لوگوں کے درمیان محبت یا تو جلب منفعت کے لئے یا دفع مضرت کے لئے ہوتی ہے، کبھی حسن و جمال کے سبب لذت کے حصول کے لئے یا پھر باپ یا بیٹا ہونے کے سبب اپنی ذاتوں کی طرف ان کی نسبت ہونے کے سبب ہوتی ہے۔ اور یہ محبت تو در حقیقت اپنے نفسوں کے لئے ہوتی ہے، محبوبوں کے لئے نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ان اسباب محبت کے زوال پذیر ہوتے ہی محبت کو ختم ہوتا دیکھتے ہیں، پھر ان میں سے کفار نے اپنی نظروں کو صرف دنیوی لذتوں پر محدود کر دیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوائے موہومہ وجود کے اور کچھ نہیں جانتے۔ وہ اپنے منافع اور نقصانات کو بندوں، ستاروں یا ان چیزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں جنہیں انہوں نے اور ان کے آباء نے معین کر رکھا ہے۔ لہٰذا وہ ان سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی چاہئے یا پھر اس سے بھی زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اہل الاھواء (نفس پرست) میں سے جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں مثلاً معتزلہ، روافض اور خوارج وغیرہ وہ منافع اور نقصانات کے بارے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ دار آخرت کے ساتھ مختص ہیں اور یہ اعتراف کرتے ہیں کہ یوم قیامت کا مالک اللہ تعالیٰ واحد و قہار ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کی نسبت بہت زیادہ محبت کرتے ہیں اس طرح کہ وہ یہ گمان رکھتے ہیں کہ ان کے منافع اور نقصانات دنیا کے ساتھ ہی مختص ہیں اور جس نے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی اس نے اپنی گردن سے اسلام کا قلادہ اتار دیا۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ پس یہ وہ لوگ ہیں جو اصل محبت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، کیونکہ اصل محبت کا دارومدار نفع اور ضرر پہنچانے پر ہے اور اس کا انحصار ان کے اعتقاد پر ہے اور ان کا اعتقاد یہ ہے کہ افعال بندوں کے پیدا کردہ ہیں نہ کہ اللہ تعالیٰ کے۔ پس وہ بھی فلاسفہ کے عقائد فاسدہ کی اقتداء کے سبب مشرکین کے مساوی ہیں اور اس امت کے مجوسی ہیں۔ جبکہ اہل سنت و جماعت کا اعتقاد یہ ہے کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور یقیناً اللہ تعالیٰ ہی نفع و نقصان دینے والا ہے، کوئی اور نہیں۔ اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور نہ اس کے سوا کسی کی حقیقتاً حمد بیان کرتے ہیں۔ ہاں اگر کسی دوسرے کی تعریف کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے اذن اور حکم سے مجازی طور پر کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتے مگر صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے۔ گویا ان کا کسی کی تعریف کرنا اور کسی سے محبت کرنا سب اللہ تعالیٰ کی طرف ہی راجع ہے، کیونکہ حقیقی محبت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، در حقیقی بغض اور ناراضگی بھی وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو۔ مگر ان میں سے عام کی محبت ان اخروی صحیح اغراض کی طرف راجع ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب ہوتی ہیں۔ مگر اہل سنت و جماعت میں سے اہل تحقیق صوفیاء نے محبت کے لئے اللہ تعالیٰ کی رضا کو علت قرار دیا ہے۔ لہٰذا ہر وہ محبت جو دنیوی یا اخروی خوف یا حرص کی بناء پر ہو ان کے نزدیک وہ محبت نہیں ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک محبت ایک ایسی آگ ہے جو محبت کرنے والوں کے دلوں میں شعلہ زن ہوتی ہے اور محبوب کے سوا ہر شی کو جلا دیتی ہے، نہ کسی کو باقی رہنے دیتی ہے نہ کسی کو چھوڑتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی نظر بصیرت سے اس کی اپنی ذات بھی ساقط ہو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 192 (فکر)

جاتی ہے تو پھر وہ اپنے نفع ونقصان یا کسی اور کو کیسے دیکھ سکتا ہے؟ اصل عبارت ملاحظہ فرمایئے۔

"بَلِ الْحُبُّ عِنْدَهُمْ نَارٌ يَشْتَعِلُ فِي قُلُوْبِ الْمُحِبِّيْنَ تُحْرِقُ مَاسِوَى الْمَحْبُوْبِ لَاتُبْقِي وَلَا تَذَرُ حَتّٰى يَسْقُطَ عَنْ نَظَرِ بَصِيْرَتِهٖ نَفْسُهٗ فَكَيْفَ يَنْظُرُ نَفْعَهٗ وَضَرَّهٗ وَمَا سِوَاهُ"

رب کریم فرماتا ہے: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا (کیا انسان پر کوئی ایسا وقت آیا جبکہ وہ قابل ذکر شئ نہیں تھا) ہاں اے پروردگار! انسان پر مسلسل ایسا وقت رہا جس میں نہ وہ قابل ذکر تھا اور نہ قابل عظمت۔ اس میں راز یہ ہے کہ عوام کے نزدیک اقرب ترین اشیاء ان کے اپنے نفوس ہیں لہٰذا وہ یا تو اپنے ہی نفسوں سے محبت کرتے ہیں یا اپنے نفسوں کے لئے کسی سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن صوفیاء کے نزدیک تمام اشیاء سے قریب تر اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہے۔ جس نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ (ہم تمہاری نسبت اس کے زیادہ قریب ہیں لیکن تم دیکھتے نہیں) اے لوگو! گویا وہ اہل محبت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتے حتیٰ اپنے نفسوں سے محبت بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہی کرتے ہیں نہ کہ اس کے برعکس (یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت اپنے نفسوں کے لئے کرتے ہیں) بلکہ وہ ہر محبوب شئ کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے پسند کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو محبت ذاتیہ کے دعویٰ میں سچے ہیں۔ اور جب محبت اس مقام تک پہنچ جاتی ہے تو پھر محبوب کی جانب سے دکھ اور درد ان کے نزدیک ایک انعام کی مثل ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شیریں اور لذیذ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس درد اور تکلیف میں وہ اخلاص موجود ہوتا ہے جو انعام میں بھی نہیں ہوتا۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قیامت کے دن کفار کے سامنے کہا جائے گا اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو پھر جہنم میں داخل ہو جاؤ تو وہ فوراً اس میں کود جائیں گے اور عرش کے نیچے سے منادی ندا دے گا " وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ "۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ وہ آدمی جو جہنم کے خوف اور جنت کے لالچ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لئے دائمی آگ کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ اس کا تصور صرف اسی کے بارے کیا جا سکتا ہے جسے محبت ذاتیہ حاصل ہو اور یہی اللہ تعالیٰ کی اس امانت کو اٹھانے والا ہے جس کے بارے فرمایا: وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (اور اٹھا لیا اس کو انسان نے، بے شک یہ ظلوم بھی ہے (اور) جہول بھی)۔

ے " وَلَوْ يَرَى " نافع، ابن عامر اور یعقوب نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تَرَى، اس بناء پر کہ یہ یا تو خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہے یا پھر ہر مخاطب کو ہے۔ اور رای کا مفعول ان کے بعد ہے اور باقی قراء نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کا فاعل سامع (سننے والا) کی ضمیر ہے، یعنی لَوْ يَرَى السَّامِعُ (کاش سننے والا جان لیتا) یا پھر اس کا فاعل اس کا مابعد ہے۔ (یعنی کاش وہ جان لیتے جنہوں نے مد مقابل بنا کر ظلم کیا اور پھر ان سے ایسی محبت کی جیسی اللہ سے کی جانی چاہئے اور اس کا مفعول محذوف ہے یعنی اَنْفُسَهُمْ۔

ﮯ جب کفار قیامت کے دن عذاب دیکھیں گے۔ ابن عامر نے یرون کو فعل مجہول کی بناء پر یاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے معروف کی بناء پر یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور لَوْ کا جواب محذوف ہے اور وہ یہ ہے لَرَاَيْتَ اَمْرًا فَظِيْعًا عَظِيْمًا (کہ یقیناً تو انتہائی خوفناک امر کو دیکھے گا) یا یہ الفاظ ہوں گے " لَتَنَدَّمُوْا نَدَامَةً شَدِيْدَةً " (یقیناً وہ بہت زیادہ ندامت وشرمندگی اٹھائیں گے) حذف کا فائدہ یہ ہے کہ لَوْ جب ایسے امر پر داخل ہو جس کا شوق دلایا جا رہا ہو یا جس سے خوفزدہ کرنا مقصود ہو تو وہاں اس کا جواب

حذف کر دیا جاتا ہے تو نتیجتاً دل اس میں مکمل طور پر مستغرق ہو جاتا ہے اور اس سے یا تو رغبت وشوق کا کمال حاصل ہوتا ہے۔ یا پھر شدید گھبراہٹ اور خوف طاری ہو جاتا ہے۔ لَوْ اور اِذْ دونوں فعل ماضی پر داخل ہوتے ہیں اور یہاں تو دونوں فعل مستقبل پر داخل ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جب مستقبل کی خبر دے تو وہ اپنے تحقق اور ثبوت میں ماضی کی مثل ہی ہوتی ہے۔ (یعنی جس طرح زمانہ ماضی میں پائے جانے والے واقعہ کے ثبوت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح زمانہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کی جو خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اس کا واقع ہونا بھی یقینی ہوتا ہے، مترجم)

1۔ "اَنَّ" اصل میں لِاَنَّ ہے۔ اَلْقُوَّۃَ کا معنی غلبہ ہے جَمِیْعًا حال ہے۔ وَّاَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا عذاب انتہائی شدید ہے۔ قرأت عامہ کے مطابق ترکیب کلام میں یہ جملہ محذوف جواب کے متعلق ہے۔ ابوجعفر اور یعقوب نے اسے اس طرح پڑھا ہے۔ اِنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا وَّاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ الایہ۔ یعنی دونوں جملوں میں ہمزہ مکسور پڑھا ہے۔ اور یہ جملہ مستانفہ ہے اور سابقہ کلام اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ کے قول پر مکمل ہے۔ اور لَوْ یَرَی میں خاطب کے صیغہ کی قرأت کے مطابق یہ احتمال بھی ہے کہ "رؤیۃ" سے مراد "رؤیۃ" قلبی ہو۔ اور اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اس کا فاعل ہو اور وَاَنَّ الْقُوَّۃَ الایہ قائم مقام مفعول کے ہو اور معنی یہ ہو۔ کاش جان لیں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا جبکہ دنیا میں وہ عذاب ومصائب دیکھ رہے ہیں کہ تمام تر قوتوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، وہی نفع اور نقصان پہنچانے والا ہے، بندوں کے افعال اس کی قدرت، مشیت اور تخلیق سے ہی معرض وجود میں آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں سخت ترین عذاب دینے والا ہے، جو چیز وہ عطا کرتا ہے اسے روکنے والا کوئی نہیں اور جو چیز وہ روک لیتا ہے وہ دینے والا کوئی نہیں اور کوئی بھی اس کے فیصلے کو رد کرنے والا نہیں، جیسا کہ مومنین جانتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کا مدمقابل نہ بناتے اور نہ غیر اللہ سے ایسی محبت کرتے جیسی مومنین اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں۔ یا معنی یہ ہے اگر قیامت کے دن عذاب کو دیکھ کر ظلم کرنے والے جان لیں گے کہ تمام قوتوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے تو وہ بہت زیادہ ندامت اور شرمندگی اٹھائیں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا لَوْ کا جواب ہو اور معنی یہ ہو۔ اگر ظلم کرنے والے اپنے انداد (وہ بت جنہیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے مدمقابل قرار دیا) کو دیکھ لیں کہ یہ نفع نہیں دیتے تو وہ یہ یقین کر لیں کہ تمام تر قوتوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾

"(خیال کرو) جب بیزار ہو جائیں گے وہ جن کی تابعداری کی گئی ان سے جو تابعداری کرتے رہے[1] اور دیکھ لیں گے عذاب کو[2] اور ٹوٹ جائیں گے ان کے تعلقات سے[3]"

1۔ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا۔ اُذْکُرْ فعل مقدر کے سبب یہ کلام محل نصب میں ہے۔ یا یہ اِذْ یَرَوْنَ سے بدل ہے۔

2۔ وَرَاَوُا الْعَذَابَ میں واؤ حالیہ ہے اور اس کے بعد لفظ قَدْ مضمر ہے یا واؤ عاطفہ ہے اور اس کا عطف تَبَرَّاَ پر ہے۔ جیسا کہ وَتَقَطَّعَتْ میں واؤ عاطفہ ہے۔ اس بیزاری اور برأت کا اظہار قیامت کے دن اس وقت ہوگا جب اللہ تعالیٰ قائدین اور ان کی اتباع کرنے والوں کو جمع فرمائے گا۔ اس وقت بعض بعض سے بیزاری کا اظہار کریں گے اور یہ قول بھی کیا گیا ہے کہ شیاطین انسانوں سے بیزار ہو جائیں گے۔

3۔ اور ان سے ٹوٹ جائیں گے ان کے وہ تعلقات محبت جو دنیا میں ان کے مابین قائم تھے۔ اور اسباب سے مراد نفع کے حصول اور

نقصان کے دور کرنے میں ان کی غلط توقعات ہیں۔

سبب کی تعریف:۔ اَصْلُ السَّبَبِ مَا يُوْصَلُ بِهِ اِلٰى شَيْءٍ مِّنْ ذَرِيْعَةٍ اَوْ قَرَابَةٍ اَوْ مَوَدَّةٍ (فی الحقیقت سبب سے مراد ہر وہ شئی ہے جس کے ساتھ کسی دوسری شئی تک پہنچا جا سکتا ہو۔ چاہے وہ ذریعہ ہو یا قرابت ہو یا پھر محبت و مودت ہو)۔ اسی معنی کے اعتبار سے پہاڑ اور راستے کو بھی سبب کہا جاتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

"اور کہیں گے تابعداری کرنے والے کاش! ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا (دنیا میں) تو ہم بھی بیزار ہو جاتے ان سے جیسے (آج) بیزار ہو گئے ہیں ہم سے [1] یونہی دکھائے گا انہیں اللہ تعالیٰ ان کے (برے) اعمال کہ باعث پشیمانی ہوں [2] ان کے لئے اور وہ (کسی صورت میں) نہ نکل پائیں گے آگ (کے عذاب) سے [3]"

[1] تابعداری کرنے والے کہیں گے کاش! ہمیں دنیا کی طرف لوٹ کر جانا ہوتا تو ہم بھی بیزار ہو جاتے۔ فَنَتَبَرَّاَ لو بمعنی لیت کے جواب میں ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ "مِنْهُمْ" کی ضمیر کا مرجع وہ لوگ ہیں جن کی تابعداری کی گئی ہے۔ "كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا" جیسے وہ آج ہم سے بیزار ہو گئے ہیں۔

[2] یونہی اللہ تعالیٰ ان کے برے اعمال انہیں دکھائے گا جو ان کے لئے باعث ندامت و پشیمانی ہوں گے۔ ترکیب کلام میں حسرت یُری کا تیسرا مفعول ہے اگر اس سے مراد رؤیۃ القلب ہو۔ ورنہ یہ حال ہوگا کہ جو نیکیاں اور اتباع رسول ﷺ انہوں نے ترک کی وہ انہیں ضائع کرنے پر نادم ہوں گے اور جو انہوں نے برائیوں کو ترجیح دی اور دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں اختیار اور پسند کیا تو وہ ایسا کرنے پر کف افسوس ملیں گے اور پشیمان ہوں گے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے ان کے لئے جنت بلند کی جائے گی۔ پس وہ اس کی طرف اور اس میں موجود اپنے ان گھروں کی طرف دیکھیں گے جو انہیں ملتے اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے۔ تو پھر انہیں کہا جائے گا اگر تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے تو وہ تمہارے مسکن اور محل تھے۔ پھر انہیں مؤمنین کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا تو اس وجہ سے وہ نادم بھی ہوں گے اور پشیمان بھی۔ (1)

[3] اصل میں یہ ما یخرجون جملہ فعلیہ ہے۔ پھر اس میں جملہ اسمیہ کی طرف عدول کیا گیا ہے، تاکہ ان کے ہمیشہ جہنم میں رہنے، نجات پانے سے مایوس اور نا امید ہونے اور دنیا کی طرف رجوع نہ ہونے میں مبالغہ کا اظہار ہو۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾

"اے انسانو! کھاؤ اس سے جو زمین میں ہے [1] حلال (اور) پاکیزہ (چیزیں) [2] اور شیطان کے قدموں پر قدم نہ رکھو [3] بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے [4]"

[1] یہ آیت بنی ثقیف، خزاعہ، عامر ابن صعصعہ اور بنی مدلج کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ انہوں نے اپنے اوپر کھیتی، چوپائے،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 194 (الفکر)

بحیرہ (وہ اونٹنی جس کے کان چیر ڈالے گئے ہوں) سائبہ (وہ اونٹنی جسے بتوں کی نذر کے طور پر آزاد چھوڑ دیا گیا یا پانچ چھ بچوں کے بعد اسے آزاد چھوڑ دیا جائے اور اپنے لئے اس کا دودھ وغیرہ ممنوع قرار دیا جائے) حام (عمدہ اور اعلیٰ قسم کے اونٹ) اور وصیلہ کو حرام قرار دیا۔

۲؎ "حَلٰلًا" کُلُوْا فعل کا مفعول ہے۔ یا یہ مَا فِی الْاَرْضِ سے حال ہے۔ اور مِنْ بعضیت کے لئے ہے اور حلال حرام کی ضد ہے یعنی ہر وہ شی جس سے شریعت نے منع نہ کیا ہو۔ کیونکہ اشیاء میں اصل حلت ہے اور دلیل یہ ارشاد ہے: خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (اس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب) اور "طَيِّبًا" سے مراد وہ چیزیں ہیں جو پاکیزہ اور لذیذ ہیں۔

۳؎ اور خواہش نفس کی اتباع میں شیاطین کی اقتدا نہ کرو کہ تم حلال کو حرام قرار دو اور حرام کو حلال کر دو۔ ابو جعفر، ابن عامر، کسائی، حفص اور یعقوب نے طاء کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے سکون کے ساتھ۔ دونوں لغتوں کے مطابق یہ خطوۃ کی جمع ہے۔ اور اس سے مراد چلنے والے کے دو قدموں کے درمیان کا فاصلہ ہے۔ اور خطوت الشیطان سے مراد اس کے آثار اور گناہ ہیں۔ یعنی تم گناہ میں مبتلا کرنے والے شیطانی طریقوں اور ذرائع کی اتباع نہ کرو۔

۴؎ یعنی اہل بصیرت کے نزدیک اس کی عداوت اور دشمنی بالکل ظاہر اور واضح ہے اگرچہ جنہیں وہ گمراہ کرتا ہے ان کے لئے وہ محبت اور دوستی کا اظہار ہے۔ اسی لئے اسے اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ میں ولی کا نام دیا گیا ہے، یا معنی ہوگا وہ عداوت کا اظہار کرنے والا ہے۔ اس طرح کہ جب اس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے جنت سے نکال دیا تو اس نے قسم کھا کر کہا لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (کہ میں ضرور بر ضرور ان تمام کو گمراہ کر دوں گا) معلوم ہوا کہ ابان فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے اس کی عداوت کا ذکر فرمایا اور کہا:

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

"وہ تو حکم دیتا ہے تمہیں فقط برائی اور بے حیائی کا اور یہ کہ بہتان باندھو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں ہو"

۱؎ فی الحقیقت السُّوْٓء اس فعل کا نام ہے جو اپنے کرنے والے کو غمزدہ کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں سَاءَهُ يَسُوْءُهُ سُوْءًا وَمَسَاءَةً یعنی اس نے اسے غمزدہ کر دیا۔ سَائَهُ فَسِيْءَ اَيْ حَزَنَهُ فَحَزِنَ، یعنی اس نے اسے پریشان کیا تو وہ غمزدہ ہو گیا۔ اور الفحشاء بروزن باساء اور ضراء مصدر ہے۔ یہاں ان دونوں سے مراد گناہ ہے۔ اور دونوں کو ایک دوسرے پر عطف اس لئے کیا گیا ہے کہ وصف کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں کیونکہ السوء سے مراد ایسا گناہ ہے جس کے سبب عاقل انسان غم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور فحشاء سے مراد ایسا گناہ ہے جسے وہ قبیح اور برا سمجھتا ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ السوء مطلق گناہ کو کہتے ہیں (چاہے وہ صغیرہ ہو یا کبیرہ) جبکہ فحشاء کبیرہ گناہ کو کہا جاتا ہے یا ایسے گناہ کو جس کے سبب حد واجب ہو جائے۔ آیت طیبہ میں اَمر سے مراد شیطان کا وسوسہ اندازی کرنا ہے۔ اس طرح وہ صرف انہی پر غالب آتا ہے جو گمراہوں میں سے اس کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک شیطان اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے، پھر لوگوں کو فتنوں میں مبتلا کرنے کے لئے اپنے دستے بھیج دیتا ہے۔ پس وہ انہیں اپنے قریب تر درجہ دیتا ہے جو لوگوں کو انتہائی زیادہ اور شدید فتنے میں مبتلا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک واپس آتا ہے۔ وہ آ کر کہتا ہے میں نے اس اس طرح کیا۔ تو وہ اسے کہہ دیتا ہے تو نے کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ پھر ایک اور

آتا ہے اور آ کر کہتا ہے میں نے فلاں کو نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ میں نے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان فرقت اور جدائی ڈال دی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پس وہ اسے اپنے قریب کرتا ہے اور کہتا ہے تو نے بہت اچھا کیا ہے، رواہ مسلم (1) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک ابن آدم کے ذہن میں شیطان بھی کچھ القاء کرتا ہے اور فرشتہ بھی کچھ القاء کرتا ہے۔ مگر شیطان جو القاء کرتا ہے وہ شر اور گناہ کا عادی بناتا ہے اور حق کی تکذیب کرتا ہے۔ اور فرشتے کی جانب سے جو القاء ہوتا ہے وہ خیر اور نیکی کا عادی بناتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے۔ لہٰذا جو کوئی ایسی چیز ذہن میں پائے تو اسے یقین کرنا چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور جو کوئی دوسری چیز ذہن میں پائے تو پھر اسے چاہئے کہ وہ شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ترجمہ: (شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (2) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں آپ ﷺ کا یہ قول ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَدَّ اَمْرَهٗ اِلَی الْوَسْوَسَةِ۔ (سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اس کے امر کو وسوسہ کی طرف پھیر دیا ہے) اسے ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (3)۔

۲؎ "وَاَنْ تَقُوْلُوْا" السوء پر عطف ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ یعنی شیطان کہتا ہے اور یہ کہ کھیتی اور چوپائے حرام کرنے کے بارے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھو جو تم جانتے ہی نہیں۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ۝

"اور جب کہا جاتا ہے ان سے پیروی کرو اس کی جو نازل فرمایا ہے اللہ نے ۱؎ تو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے ۲؎ جس پر ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو ۳؎ اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھ سکتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں ۴؎"

۱؎ یہ ایک نیا واقعہ ہے اور ضمیر کا مرجع غیر مذکور ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود کو اسلام کی دعوت دی، انہیں اس کی رغبت دلائی اور اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی سزا سے انہیں ڈرایا۔ تو رافع بن حرملہ اور مالک بن عوف نے کہا اے محمد (ﷺ)! بلکہ ہم تو اس کی تابعداری کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، کیونکہ وہ ہم سے بہتر اور زیادہ جاننے والے تھے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (4) اور بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے مراد قرآن کریم یا تورات ہے کیونکہ وہ بھی حضرت محمد ﷺ کی پیروی کرنے کا حکم دیتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مشرکین عرب اور کفار قریش کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور ضمیر اس قول کی طرف راجع ہے وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ضمیر قول باری تعالیٰ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا میں لفظ الناس کی طرف راجع ہے۔ اور ان کی ضلالت و گمراہی پر مطلع کرنے کے لئے خطاب سے ان کی طرف عدول کیا گیا ہے گویا کہ عقلاء کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے کہا ان احمقوں کی طرف دیکھو یہ کیا جواب دے رہے ہیں۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 17 صفحہ 130 (علمیہ)
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2988 (علمیہ)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 341 وزارت تعلیم
4۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 306 (علمیہ)

ے قرأت: بَلْ نَتَّبِعُ میں کسائی نے لام کو نون میں مدغم کر کے پڑھا ہے یعنی بَلْ نَتَّبِعُ کیونکہ هَلْ اور بَلْ کے لام کو آٹھ حروف میں مدغم کیا جا سکتا ہے۔ التاء، الثاء، الزاء، السین، الطاء، الظاء، الضاد اور النون۔ جیسے هَلْ تَعْلَمُ، هَلْ ثُوِّبَ، بَلْ زُيِّنَ، بَلْ سَوَّلَتْ، بَلْ طَبَعَ، بَلْ ظَنَنْتُمْ، بَلْ ضَلُّوا، هَلْ نَدُلُّكُمْ، هَلْ نُنَبِّئُكُمْ، هَلْ نَحْنُ اور ان ہی کے مشابہ الفاظ۔ حمزہ نے حرف تاء، ثاء اور سین میں ادغام کیا ہے۔ خلاد نے طاء کی صورت میں اختلاف کیا ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد ہے: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ۔ اور ہشام نے نون اور ضاد کی صورت میں اور سورۃ الرعد میں تاء کے وقت بغیر ادغام کے اظہار کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی هَلْ تَسْتَوِي۔ اس کے علاوہ اظہار نہیں کیا بلکہ ادغام کیا ہے۔ ابو عمرو نے سورۂ ملک میں ادغام کے ساتھ پڑھا ہے هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ۔ اور سورۃ الحاقہ میں فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ۔ لیکن ان کے علاوہ اور کہیں اس طرح نہیں پڑھا اور باقیوں نے آٹھوں حروف کی صورت میں لام کو اظہار کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی بغیر ادغام کے)۔

ے جس پر ہم نے پایا ہے اپنے باپ دادا کو تورات کی اتباع کرتے ہوئے یا حرام اور حلال کرتے ہیں۔

ے اصل میں واؤ عطف کے لئے ہوتی ہے لیکن اس مقام پر کہا جاتا ہے کہ یہ واؤ تعجب کے لئے ہے اور اس پر الف استفہام توبیخ کے لئے داخل ہے۔ یعنی کیا وہ اپنے باپ دادوں کی اتباع کریں گے اگر ان کے آباء کچھ بھی بوجھ رکھتے ہوں، حالانکہ ان کے باپ دادا کچھ سمجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے۔ پس اس میں جملہ کے پہلے جزء کو حذف کر دیا گیا ہے اور ترکیب کلام میں جملہ حال ہے اور لا یعقلون کا لفظ عام ہے لیکن اس کا معنی خاص ہے۔ یعنی وہ دین کے امور میں سے کوئی شئ نہیں جانتے تھے کیونکہ وہ دنیوی امور کی سمجھ بوجھ تو رکھتے تھے۔ اور اگر کہا جائے کہ آیت یہود کے بارے نازل ہوئی تو پھر ان کے باپ دادوں کے بارے میں کیسے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی شئ کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے جبکہ وہ تو توریت کی اتباع کرنے والے تھے؟ تو اس کے بارے میں میں یہ کہوں گا کہ وہ تورات کی اتباع کرنے والے نہیں تھے اگر وہ اس کی پیروی کرنے والے ہوتے تو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کفر نہ کرتے۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ اس میں ان پر تعریض ہے کہ انہوں نے اپنے آباء کو تورات میں تحریف کرتے ہوئے پایا پس وہ بھی اس میں تحریف ہی کریں گے کیونکہ اگر وہ انہیں تورات پر عمل کرتے ہوئے پاتے تو وہ انہیں دین مصطفیٰ ﷺ کا طالب اور منتظر پاتے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

"اور مثال ان کی جنہوں نے کفر (اختیار) کیا۔ ایسی ہے جیسے کوئی چلا رہا ہو ایسے (جانوروں) کے پیچھے جو نہیں سنتے سوائے خالی پکار اور آواز کے ۱ یہ لوگ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ کچھ نہیں سمجھتے ۲"

۱ نعق اور نعیق اس آواز کو کہتے ہیں جو چرواہا ریوڑ کے لئے نکالتا ہے۔ یہ آیت اگر بتوں کی پوجا کرنے والوں کے بارے میں ہے تو پھر اس میں تاویل کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اس کا معنی ہوگا مثال ان کی جنہوں نے بتوں کی عبادت اور انہیں پکارنے کے سبب کفر اختیار کیا اس حیثیت سے کہ وہ ان کی پکار نہیں سنتے، اس آدمی کی طرح ہے جو ایسے جانوروں کے لئے چلا رہا ہو جو نہیں سنتے۔ جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے: اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ۔ (اگر تم انہیں پکارو گے تو وہ تمہاری پکار کو نہیں سنیں گے اور اگر وہ سن لیں تو تمہیں جواب نہیں دیں گے)۔ یہ تمثیل تمثیل مرکب کے باب سے ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے قول اِلَّا دُعَآءً

وَنِدَاءً میں تشبیہ کے فساد کا کوئی خوف نہیں اور اگر یہ آیت یہود کے بارے میں ہے تو پھر توجیہ یہ ہوگی کہ یہودیوں نے آپ کی دعوت اسلام کا جواب جو اس قول سے دیا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ایسے جانوروں کے پیچھے چلا رہا ہوں جو نہیں سنتے، کیونکہ جس طرح جانوروں کے پیچھے چلانے والے کی آواز کا کوئی معنی مقصود نہیں ہوتا، بلکہ وہ مہمل گفتگو کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح کافر بھی ایسا جواب نہیں دیتے جو مقبول ہو بلکہ لایعنی اور بے مقصد آوازنکالتے رہتے ہیں۔ یا پھر اس سے مقصود کفار کو چوپاؤں کے ساتھ تشبیہ دینا ہے، لہٰذا اس صورت میں تاویل ضروری ہے۔ پس تقدیر عبارت یہ ہوگی مَثَلُكَ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ (یعنی آپ کی مثال اور ان کی مثال جنہوں نے کفر کیا)۔ یا عبارت اس طرح ہے مَثَلُ دَاعِي الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (ان کو دعوت دینے والے کی مثال جنہوں نے کفر کیا) یعنی مشبہ میں مضاف محذوف ہے۔ یا تقدیر کلام یہ ہے وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الْمَنْعُوْقِ بِهٖ۔ یعنی ظاہر کلام ناعق (چلانے والا جانوروں کے پیچھے) کے بارے میں ہے لیکن اس سے مراد منعوق بہ (یعنی وہ جانور جس کے لئے آواز نکالی گئی) ہے۔ اور یہ عرب کلام میں مروج ہے کہ وہ کلام میں قلب کر لیتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں فُلَانٌ يَخَافُكَ خَوْفَ الْاَسَدِ (فلاں تجھ سے ایسے ڈرتا ہے جیسے شیر سے) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ حالانکہ اصل اَلْعُصْبَةُ تَنُوْءُ بِالْمَفَاتِيْحِ ہے۔ (ایک جماعت چابیاں مشکل سے اٹھاتی ہے) لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ کفار تقلید میں اتنے منہمک ہیں کہ ان کے اذہان اس کلام کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے جو ان پر تلاوت کیا جاتا ہے اور نہ وہ اس میں غور وفکر کرتے ہیں گویا وہ ان جانوروں کی طرح ہیں جنہیں چلا کر پکارا جاتا ہے کہ وہ آواز تو سنتے ہیں لیکن اس کے معنی کو نہیں سمجھتے۔ یا معنی یہ ہوگا کہ ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اپنے آباء کے ظاہر حال کی اتباع کرتے ہوئے اور اس کی حقیقت کو جاننے میں غفلت اور جہالت برتتے ہوئے کفر کیا، ان جانوروں کی طرح ہے جنہیں چلا کر پکارا جاتا ہے، وہ آواز تو سنتے ہیں لیکن اس کے تحت آنے والے معانی کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ ان کے آباء وہ تھے جو تورات کے نسخ سے قبل ان احکام کی اتباع کرتے رہے جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں نازل فرمائے اور محمد ﷺ اور قرآن کا انتظار کرتے رہے اور یہ وہ ہیں جو تورات کے منسوخ ہونے کے بعد اس کی پیروی کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور قرآن کا انکار کرکے تورات کی مخالفت کرتے ہیں۔

؎ یہ مخصوص بالذم ہونے کی بناء پر مرفوع ہیں۔ یعنی نہ وہ سنتے ہیں کہ وہ غور وفکر کریں، نہ وہ بولتے ہیں کہ اچھی گفتگو کریں اور نہ ہی وہ ہدایت حاصل کرنے کے لئے دیکھتے ہیں۔ سو وہ نظر وفکر کے مختل ہونے کے باعث دین کے معاملے کو وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو حلال اور پاکیزہ اشیاء کھانے اور شیطان کی پیروی کرنے سے رکنے کا حکم ارشاد فرمایا اور ان چیزوں کے بارے میں کلام طویل ہوگئی جو رکنے سے متعلق ہیں حالانکہ مقصود اصلی تو حلال اور طیب چیزیں کھانے کا حکم تھا اور ان پر شکر ادا کرنا تھا۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا دوبارہ ذکر فرمایا، تاکہ اللہ تعالیٰ کا قول واشکروا اس کے ساتھ متصل ہو جائے تو چونکہ شکر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت تسلیم کرنے والوں اور اہل ایمان کے ساتھ ہی مختص ہے، اس لئے یہاں خطاب اہل ایمان کو کرتے ہوئے فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

"اے ایمان والو کھاؤ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں لے اور شکر ادا کیا کرو اللہ تعالیٰ کا اگر تم صرف اسی کی عبادت

کرتے ہو۔ ‘‘

۱ اے اہل ایمان لذیذ اور حلال چیزیں کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ پاک چیز ہی قبول کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو اس شی کا حکم دیا ہے جس کا حکم مرسلین کو دیا ہے۔ اور فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا (اے میرے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔) اور مؤمنین کے بارے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (اے ایمان والو! کھاؤ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں۔) پھر ایک ایسے آدمی کا ذکر فرمایا جو طویل سفر کرتا ہے اور اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے کہتا ہے یا رب یا رب (اے میرے رب، اے میرے پروردگار)، اس کا حال پراگندہ ہے، غبار میں اٹا پڑا ہے حالانکہ اس کا کھانا بھی حرام ہے، پینا بھی حرام ہے، لباس بھی حرام ہے اور غذا حرام سے ہی حاصل کی ہے تو اس کی دعا کیونکر قبول کی جائے گی، رواہ مسلم۔(1)

۲ یعنی اگر یہ صحیح ہے کہ تم صرف اس کی ہی عبادت کرتے ہو اور یہ اقرار کرتے ہو کہ وہی تمام تر نعمتوں کا مالک ہے، تو پھر اس کا شکر ادا کرو۔ کیونکہ تمہاری عبادت شکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔ حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ”میرا جن وانس کے ساتھ بہت بڑا حیرت ناک واقعہ ہے، وہ یہ کہ انہیں پیدا میں کرتا ہوں اور وہ عبادت دوسرے کی کرتے ہیں۔ رزق میں دیتا ہوں اور وہ شکر میرے غیر کا کرتے ہیں“ طبرانی نے اسے شامیوں کی مسندات میں، بیہقی نے شعب الایمان میں اور دیلمی نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔(2)

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝

”اس نے حرام کیا ہے تم پر صرف مردار ۱ اور خون اور سور کا گوشت ۲ اور وہ جانور بلند کیا گیا ہو جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام ۳ لیکن جو مجبور ہو جائے ۴ درآنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (بقدر ضرورت کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں ۵ بیشک اللہ تعالیٰ بہت گناہ بخشنے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے ۶۔ ‘‘

۱ ابو جعفر نے پورے قرآن میں لفظ المیتة مشدد پڑھا ہے یعنی اَلْمَیِّتَةَ اور باقیوں نے بعض مقامات پر مشدد پڑھا ہے۔ عنقریب ہم ان کا ذکر کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اگر کہا جائے کہ اِنَّمَا تو کلمہ حصر ہے حالانکہ کتنی ایسی حرام چیزیں ہیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا؟ تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ احناف کے نزدیک مختار قول وہ ہے جو کوفہ کے علمائے نحو نے کہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لفظ اِنَّمَا قصر کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ اِنَّ برائے تحقیق اور ما کافہ سے مرکب ہے۔ اور اگر قصر کے لئے تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ ان کی نسبت قصر اضافی ہے جنہیں کفار نے حرام قرار دیا ہے، مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام وغیرہ (واللہ اعلم)۔ المیتة سے مراد وہ حیوان ہے جو ذبح کئے بغیر مر جائے جبکہ اس کی شان یہ تھی کہ اسے ذبح کیا جاتا۔ لہٰذا مچھلی اور ٹڈی مردار کے حکم میں داخل نہیں یا پھر ان دونوں کو اس کے حکم سے حدیث رسول ﷺ کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہمارے لئے دو مردار اور دو خون حلال کئے گئے ہیں یعنی مچھلی، ٹڈی، جگر اور تلی (3) اسے ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ اور سنت کے سبب

1۔ صحیح مسلم، جلد 7 صفحہ 88 (علمیہ) 2۔ مسند الفردوس از دیلمی: 4439 (علمیہ) 3۔ سنن ابن ماجہ: 3314

اسی حکم کے ساتھ وہ حصہ بھی ملا دیا گیا ہے جو زندہ سے علیحدہ کر دیا جائے۔ ابوداؤد اور ترمذی نے ابوواقد اللیثی سے روایت نقل کی ہے اور ترمذی نے اسے حسن کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زندہ جانور سے جو حصہ کاٹ دیا جائے وہ مردار ہوگا (1) اس پر اجماع ہے کہ مردار کی بیع کرنا، اس کی ثمن کھانا، اس کی چربی سے منافع حاصل کرنا اور دباغت سے قبل اس کے چمڑے سے نفع اٹھانا جائز نہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے سال رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا در آنحالیکہ آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں تھے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی بیع کو حرام قرار دیا ہے۔ تو عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ! مردار کی چربی کے بارے میں آپ ﷺ کی رائے کیا ہے؟ کیونکہ کشتیوں کو اس سے طلاء کیا جاتا ہے، چمڑوں کو اس سے تیل لگایا جاتا ہے اور لوگ اس سے چراغ روشن کرتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہرگز نہیں، وہ حرام ہے۔ پھر اسی وقت فرمایا اللہ تعالیٰ یہودیوں کو قتل کرے۔ جب سے اللہ تعالیٰ نے چربی کو حرام قرار دیا ہے تو وہ اسے پگھلا لیتے ہیں، پھر اسے بیچ کر اس سے حاصل ہونے والی ثمن کھاتے ہیں، متفق علیہ (2) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان یہودیوں کو قتل کرے، ان پر چربی حرام قرار دی گئی تو انہوں نے اسے پگھلا کر بیچنا شروع کر دیا، متفق علیہ (3) عبد اللہ بن حکیم سے روایت ہے کہ ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا خط آیا کہ خبردار! مردار کے چمڑے اور پٹھوں سے منافع حاصل نہ کرو (4) اسے احمد، شافعی اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کیا ہے۔ ایک روایت میں امام شافعی، احمد اور ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ آپ ﷺ کے وصال سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت میں ایک مہینہ یا دو مہینوں کا ذکر ہے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مردار کی کسی شئی سے بھی نفع حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ابوبکر شافعی نے روایت کیا ہے اور اس کی اسناد حسن ہیں۔ حضرت اسامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے درندوں کی کھال سے منع فرمایا ہے (5) اسے ابوداؤد، نسائی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ اور "وان یفترش" کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ (یعنی آپ ﷺ نے ان کے بچھونے بنانے سے بھی منع فرمایا)۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے کہ آپ ﷺ نے چیتوں کی سواری سے منع فرمایا ہے (6) اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ حضرت مقدام بن معدیکرب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ریشم، سونے اور چیتوں کی کھال کے تکیوں سے منع کیا ہے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ ملائکہ اس جگہ ساتھ نہیں رہتے جس میں چیتے کی کھال ہو۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ دباغت کے بعد مردار کی جلد کے بارے ائمہ کے مابین اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دباغت کے ساتھ پاک ہو جاتی ہے لہٰذا اس کی خرید و فروخت کرنا اور اس سے نفع حاصل کرنا جائز ہوتا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ دباغت کے بعد بھی اس کی خرید و فروخت اور اس کے منافع حاصل کرنا جائز نہیں۔

ہم احناف کے حق میں کئی احادیث ہیں ان میں سے ایک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک مردار بکری کے پاس سے ہوا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس کی جلد سے نفع نہیں اٹھاؤ گے؟ تو صحابہ کرام نے

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1480 (علمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 11 صفحہ 6 (علمیہ) 3۔ مشکوٰۃ المصابیح: 2767 (الفکر)
4۔ سنن ابن ماجہ: 3813 5۔ سنن نسائی، جلد 7 صفحہ 176 (ریان) 6۔ سنن نسائی، جلد 7 صفحہ 176 (ریان)

عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! یہ تو مردار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا بیشک اسے کھانا حرام ہے، کیا پانی اور قرظ میں ایسا وصف نہیں جو اسے پاک کر دیتا ہے؟(1) (یعنی اگر پانی میں قرظ کے پتے ملا کر اسے دباغت دی جائے تو یہ پاک ہو جاتا ہے مترجم۔) بعض روایات میں الفاظ "اَلَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِجِلْدِهَا" کے ہیں(2) اور بعض میں یہ الفاظ ہیں "اِنَّمَا حُرِّمَ لَحْمُهَا وَرُخِّصَ لَكُمْ فِیْ مَسْكِهَا"(3) (کہ اس کا گوشت حرام کیا گیا ہے اور حالت اضطرار میں حاجت کے مطابق تمہارے لئے اس کے استعمال کی رخصت ہے)۔ دار قطنی نے کہا ہے اس کی اسانید صحیح ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی ایک اور روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ جس کھال کو بھی دباغت دے دی جائے وہ پاک ہو جاتی ہے۔ اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(4) اسی کی مثل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک مرفوع روایت بھی ہے جسے دار قطنی نے سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے اور اسی طرح کی ایک روایت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سفیان رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی ہے۔ اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہر چمڑے کی پاکیزگی اس کی دباغت ہے(5) اور آپ ہی سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مردار کی کھالوں سے منافع حاصل کئے جائیں جب انہیں دباغت دے دی جائے(6) حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے ہماری ایک بکری مر گئی تو ہم نے اس کی کھال کو دباغت دی۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے ان احادیث سے استدلال کیا ہے جو ہم نے پہلے ذکر کی ہیں کہ مردار کی کسی شئی سے انتفاع جائز نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے دو امروں میں سے آخری امر ہے۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن حکیم کی حدیث میں یہ موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال سے ایک ماہ یا دو ماہ پہلے آپ ﷺ کا خط ہمارے پاس پہنچا۔ لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ عبداللہ بن حکیم کی حدیث اپنی سند اور متن کے اعتبار سے مضطرب ہے۔ لہٰذا ہم نے جو صحیح روایات نقل کی ہیں وہ ان سے متصادم نہیں۔ اور اس لئے بھی وہ ناسخ نہیں ہو سکتی کہ اس میں لفظ اہاب مذکور ہے اور اہاب دباغت سے پہلے پہلے چمڑے کو کہا جاتا ہے اور اس کے بارے ہم بھی کہتے ہیں کہ اس سے انتفاع حرام ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ طبرانی نے الاوسط میں عبداللہ بن حکیم اور ابن عدی کی حدیث میں ذکر کیا ہے کہ ہم جہینہ کی سر زمین میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے خط لکھا میں نے تمہیں مردار کی کھالوں کے بارے رخصت دی تھی پس تم مردار کے چمڑے اور پٹھوں سے کوئی منافع حاصل نہ کرو(7) تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ یہ سند صحیح نہیں۔ کیونکہ اس میں ایک راوی فضالہ بن مفضل ہے۔ اس کے بارے ابو حاتم رازی نے کہا ہے کہ یہ اس اہل نہیں کہ اہل علم اس سے روایت کریں۔

مردار کے بالوں، ہڈیوں، پٹھوں، سینگوں اور کھروں کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ پاک ہیں ان کی خرید و فروخت کرنا اور ان سے نفع حاصل کرنا دونوں جائز ہیں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ ناپاک (نجس) ہیں اور حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بالوں کے مسئلہ میں ہم احناف کے ساتھ ہیں اور ہڈیوں اور پٹھوں کے بارے میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہیں۔ ان کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ مردار کی کسی شئی سے بھی انتفاع نہیں کیا جا سکتا۔ اور بالوں کے نجس ہونے پر حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 41-42 (محاسن)
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 42 (محاسن)
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 44 (محاسن)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 159 (وزارت تعلیم)
5۔ سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 49 (محاسن)
6۔ سنن نسائی، جلد 7 صفحہ 176 (ریان)
7۔ معجم اوسط از طبرانی: 2121، جلد 3 صفحہ 64

کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ناخنوں، خون اور بالوں کو دفن کر دو کیونکہ یہ مردار ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری حدیث کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن عزیز ہے جس کے بارے میں ابو حاتم رازی نے کہا ہے کہ اس کی احادیث منکر ہیں اور میرے نزدیک یہ سچا نہیں اور علی بن حسین بن جنید نے کہا ہے یہ ایک فلس (پیسے) کے بھی مساوی نہیں یہ جھوٹی احادیث روایت کرتا ہے۔

پہلی حدیث کے بارے بھی کلام کی گئی ہے اور اگر وہ کلام (اعتراض) سے محفوظ بھی ہو پھر وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سابقہ متفق علیہ حدیث کے معارض ہے کہ اس کا کھانا حرام ہے اور اس کی اسناد بھی کثیر ہیں(1) اور ہماری دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ان الفاظ میں بھی ہے "اِنَّمَا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَحْمَهَا فَاَمَّا الْجِلْدُ وَالشَّعْرُ وَالصُّوْفُ فَلَا بَاْسَ بِهٖ"(2) (کہ رسول اللہ ﷺ نے مردار کا گوشت حرام قرار دیا ہے لہٰذا اس کے چڑے، بالوں اور اون کے استعمال میں کوئی حرج نہیں)۔ لیکن اس کی سند میں راوی عبدالجبار ضعیف ہے اور ابن حبان نے اسے ثقات میں ذکر کیا ہے۔ اور آپ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا خبردار! مردار کی ہر شیٔ حلال ہے مگر اسے کھانا حلال نہیں۔ لہٰذا جلد، بال، دانت اور ہڈیاں سب حلال ہیں۔ اس کی سند میں ایک راوی ابوبکر ہذلی متروک ہے(3)۔ غندر نے کہا ہے وہ کذاب ہے اور یحییٰ نے کہا ہے وہ کوئی شیٔ نہیں۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے لئے پٹھوں کا بنا ہوا ایک ہار اور ہاتھی دانت کے بنے ہوئے دو کنگن خریدے۔ اس میں حمید اور سلیمان دو راوی مجہول ہیں۔

ہمارے موقف کے حق میں وہ آثار بھی ہیں جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے معلق ذکر کیے ہیں۔ مثلاً امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے مرداروں کی ہڈیوں، جیسا کہ ہاتھی وغیرہ کے بارے کہا ہے کہ میں نے علمائے سلف میں سے بہت سے لوگوں کو اس طرح پایا کہ وہ ان کی کنگیاں کرتے تھے اور ان میں تیل ڈالا کرتے تھے اور اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے اسلاف تو صحابہ کرام تھے یا پھر کبار تابعین۔ حماد بن ابی سلیمان نے کہا ہے کہ مردار کے پروں سے نفع اٹھانے میں کوئی حرج نہیں اور ابراہیم اور ابن سیرین نے کہا ہے کہ ہاتھی کے دانت کی تجارت میں کوئی حرج نہیں۔ واللہ اعلم۔

لے "وَالدَّمَ" سے مراد بالاجماع جاری خون ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے "اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا" اور اس پر اجماع ہے کہ خنزیر نجس لعینہ ہے اس کے اجزاء میں سے کوئی شیٔ بیچنا جائز نہیں حتیٰ کہ اس کے بالوں کی فروخت بھی جائز نہیں۔ اس میں خاص طور پر لحم (گوشت) کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی وہ عظیم شیٔ ہے جس کا قصد کسی بھی حیوان سے کیا جا سکتا ہے اور تمام کے تمام اجزاء اس کے تابع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس کے حرام لعینہ ہونے پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے فَاِنَّهٗ رِجْسٌ۔ اس کی تفسیر سورۃ الانعام میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ کیا اس کے بالوں سے انتفاع جائز ہے؟ تو اس کے بارے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ ضرورت کے تحت دھاگہ وغیرہ بننے کے لئے اس سے انتفاع جائز ہے۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے مکمل طور پر منع کیا ہے۔ اور حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور اگر یہ قلیل پانی میں گر گئے تو اسے ناپاک کر دیں گے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اسے فاسد نہیں کریں گے کیونکہ مطلق انتفاع ان کی طہارت کی دلیل ہے

1۔ صحیح مسلم، جلد 4 صفحہ 45 (علیہ)
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 48 (محاسن)
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 48 (محاسن)

اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ استقباع کا اطلاق ضرورت کے لئے ہے اور ضرورت صرف حالتِ استعمال میں ہی ظاہر ہوتی ہے اور حالتِ وقوع اس حالت کے مغائر ہوتی ہے۔ ہدایہ میں اسی طرح ہے۔ فقیہ ابو اللیث نے کہا ہے اگر وہ شراء (خرید و فروخت) کے بغیر نہ پائے جائیں تو ان کی شراء جائز ہے۔ اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے دھاگہ بنانے میں ان کی حاجت اور ضرورت ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ ممکن ہے کہ کسی اور سے بنالیا جائے اور ابن سیرین ایسے خفین نہیں پہنتے تھے جو خنزیر کے بالوں سے بنائے جاتے۔ ابن ہمام نے کہا کہ اس بناء پر اس کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں اور ان سے نفع اٹھانا بھی جائز نہیں۔

ہے ربیع بن انس نے کہا ہے وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ سے مراد ایسا جانور جسے ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ اہلال کا اصلی معنی ہے چاند دیکھنا۔ کہا جاتا ہے اهل الهلال (اس نے چاند دیکھا) پھر جب چاند دیکھتے وقت تکبیر کے ساتھ آواز بلند کرنے کا رواج ہوا، تو پھر مطلق آواز بلند کرنے کا نام اہلال ہو گیا اور کفار جب اپنے معبودوں کے لئے جانور ذبح کرتے تو وہ ان کے ذکر کے ساتھ اپنی آوازیں بلند کرتے تھے۔ پس ان کا معاملہ اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ ہر ذبح کرنے والے کو مہل کہا جانے لگا اگرچہ وہ آواز بلند نہ کرے اور جس جانور پر بسم اللہ چھوڑ دی گئی ہو۔ ہم اس کا ذکر عنقریب سورۃ الانعام میں کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ہے قرأت: "فَمَنِ اضْطُرَّ" عاصم، ابو عمرو اور حمزہ نے نون کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح یہ مقامات بھی ہیں أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ، أَنِ احْكُمْ، وَلٰكِنِ انْظُرْ اور أَنِ اقْتُلُوا اور لَقَدِ اسْتُهْزِئَ میں دال کو کسرہ کے ساتھ، قَالَتِ اخْرُجْ میں تاء کو مکسور اور فَتِيلًا انْظُرْ اور مُبِينٍ اقْتُلُوا میں تنوین کے ساتھ اور اس کے مشابہ مقامات پر جبکہ دوسرے ساکن کے بعد ضمہ لازمی ہو اور ابتداء میں ہمزہ وصل مضموم ہو۔ ابن عامر نے صرف تنوین میں ان سے موافقت کی ہے۔ اسی طرح عاصم اور حمزہ نے لام اور واؤ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسے قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ۔ ترجمہ: (آپ فرمایئے اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو۔) یعقوب نے واؤ کے سوا میں ان دونوں کی پیروی کی ہے۔ اور باقی تمام نے ان تمام مقامات میں ضمہ پڑھا ہے۔ یعنی فعل کے پہلے حرف کو ضمہ کے ساتھ۔ ابو جعفر نے نون کے کسرہ کی اتباع کرتے ہوئے طاء کو بھی مکسور پڑھا ہے اور معنی یہ ہے کہ جو آدمی مردار یا اسی کی مثل مذکورہ جانوروں میں سے کوئی کھانے پر مجبور ہو چکا ہے، ان کا یہ اضطرار بھوک کے سبب ہو یا اکراہ کے سبب یا اس کے علاوہ کوئی اور ہو تو بالاجماع اس کے لئے اسے کھانا حلال ہے۔

ہے "غَيْرَ بَاغٍ" ترکیب میں حال ہے۔ یعنی وہ لذت اور شہوت کے لئے سرکشی کرتے ہوئے نہ کھائے "وَلَا عَادٍ" اور نہ وہ کھانے میں حاجت اور ضرورت کی مقدار سے تجاوز کرنے والا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجبور آدمی کے لئے صرف سدِ رمق کی مقدار ہی کھانا جائز ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں ہے کہ اس کے لئے پیٹ بھر کر کھانا جائز ہے۔ یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے (1) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا راجح مذہب یہ ہے کہ اگر قریب ہی اسے حلال چیز کی توقع ہو تو پھر سدِ رمق (آخری سانس کو باقی رکھنے کے لئے گزارہ کرنا) کے سوا کھانا جائز نہیں۔ اور اگر حلال سے وہ مکمل طور پر منقطع ہو تو پھر اس کے لئے پیٹ بھر کر اور خوب سیر ہو کر کھانا مباح ہے۔ بعض اصحابِ شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تاویل میں کہا ہے کہ وہ والی کے خلاف بغاوت کرنے والا نہ ہو اور نہ ہی ڈاکہ زنی اور زمین میں فساد برپا کرنے کی راہ پر گامزن ہو۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 200 (فکر)

ہے کہ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہر مذہب ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور سعید بن جبیر کا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر معصیت کی نیت سے سفر کرنے والا مردار کھانے پر مجبور ہو جائے تو اس کے لئے کھانا جائز نہیں۔ اور نہ اس کے لئے دیگر مسافروں کی طرح احکام میں رخصت ہے یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے (1) میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ بیشک بغاوت اور عدوان دونوں کھانے کی طرف ہی راجع ہیں۔ (یعنی وہ کھانے میں بغاوت اور سرکشی اختیار کرنے والا نہ ہو اور نہ ہی کھانے میں حد سے تجاوز کرنے والا ہو) اور مقاتل بن حبان نے کہا ہے کہ غَیْرَ بَاغٍ سے مراد ہے مردار کو حلال سمجھنے والا اور وَّلَا عَادٍ سے مراد ہے مباح چیز کی تلاش میں کوتاہی اور غفلت برتنے والا۔ (2)

لہ بیشک اللہ بہت بخشنے والا ہے اسے جو اس نے حالت اضطرار میں کھایا ہے۔ ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے اس حیثیت سے کہ اس نے اس حالت میں بندوں کو رخصت دی ہے۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اگر مجبور انسان مردار اور اس قسم کی اور کوئی شی نہ کھائے یہاں تک کہ مر جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا کیونکہ حالت اضطرار میں کھانا اللہ تعالیٰ کی جانب سے رخصت کی بناء پر مباح ہے واجب نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اصح قول یہی ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس طرح مرنے سے وہ گنہگار ہوگا اور ایسی حالت میں اس پر کھانا واجب ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ (حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مفصل بیان کر دیا ہے تمہارے لئے جو اس نے حرام کیا مگر وہ چیز کہ تم مجبور ہو جاؤ اس کی طرف۔) اس میں مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ کی استثناء ان چیزوں سے ہے جو حرام کی گئی ہیں لہٰذا یہ اپنے اصل پر مباح باقی رہی اور ہلاکت کے خوف کے وقت مباح چیز کو کھانا واجب ہے، لیکن اسے مجازاً رخصت کا نام دیا گیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾

"بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب لہ اور خرید لیتے ہیں اس کے بدلے حقیر سا معاوضہ ؏ سو وہ نہیں کھا رہے اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے ؏ اور بات تک نہ کرے گا ان سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اور نہ (ان کے گناہ بخش کر) انہیں پاک کرے گا ؏ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے"

لہ یعنی تورات کی ان آیات کو چھپا دیتے ہیں جو حضور نبی رحمت محمد ﷺ کی شان میں نازل ہوئیں۔ یہ آیت یہودیوں کے سرداروں اور ان کے علماء کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ اپنے سے کم درجہ لوگوں سے ہدایا اور کھانے کی چیزیں وصول کرتے تھے اور وہ یہ امید رکھتے تھے کہ نبی ان میں سے مبعوث ہوگا۔ پس جب رسول اللہ ﷺ ان میں سے مبعوث نہ ہوئے تو انہیں اپنے کھانے کی مجلسوں کے ختم ہونے اور اپنی ریاست و حکومت کے زوال کا خوف لاحق ہونے لگا تب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی صفت بیان کرنے کا ارادہ کیا، لہٰذا انہوں نے آیات و صفات میں تبدیلی کر کے لوگوں کے سامنے ظاہر کر دیا۔ پس جب ان گھٹیا لوگوں نے تبدیل شدہ صفات کو دیکھا تو انہیں رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کے مخالف پایا۔ لہٰذا انہوں نے آپ ﷺ کی تابعداری نہ کی۔ اسے بغوی رحمۃ اللہ علیہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 199 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 199 (فکر)

نے ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے ابوصالح کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح نقل کیا ہے (1) اور ابن جریج نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اور سورۂ آل عمران کی آیت اکٹھی یہود کے بارے میں نازل ہوئیں۔ (2)

۲؎ اور وہ خرید لیتے ہیں اس کے بدلے حقیر سا معاوضہ یعنی دنیوی ساز وسامان۔ اگر چہ وہ کتنا زیادہ کیوں نہ ہو پھر بھی وہ ثواب آخرت کی نسبت بہت قلیل ہے۔

۳؎ اس میں رشوت اور حرام کو آگ کہا گیا ہے، اس لئے کہ یہ آگ تک پہنچا دیتے ہیں۔ یا پھر اس لئے کہ یہ آخرت میں آگ ہو جائیں گے۔ یا پھر آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ آخرت میں آگ کھائیں گے۔ فی بطونھم کا معنی ہے ملاء بطونھم (یعنی وہ اپنے پیٹوں کو آگ سے بھر رہے ہیں)۔

۴؎ اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے نرمی اور رحمت سے بات نہیں کرے گا اور ایسی بات تک نہیں کرے گا جو ان کے لئے خوشی اور مسرت کا باعث ہو۔ یا پھر یہ ان پر اللہ تعالیٰ کے غضب سے کنایہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کی تعریف نہیں فرمائے گا یا اللہ تعالیٰ انہیں گناہوں کی غلاظت سے پاک نہیں کرے گا، بخلاف گنہگار اہل ایمان کے کیونکہ اگر انہیں آگ کا عذاب دیا گیا تو یہ ان کے لئے گناہوں سے پاک کرنے کا سبب ہوگا اور انہیں جنت میں داخل ہونے کے اہل بنا دے گا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾

"یہ وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے عوض، اور عذاب بخشش کے بدلے ۱؎ (تعجب ہے) کس چیز نے اتنا صابر بنا دیا ہے انہیں آگ (کے عذاب) پر ۲؎"

۱؎ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے۔ "وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ" اور آخرت میں نجات کے عوض عذاب۔ اور یہ سب اپنے دنیوی گھٹیا مقاصد کے حصول کے لئے حق کو چھپانے کے سبب کیا۔

۲؎ یعنی آگ پر ان کا صبر کتنا شدید ہے مومنین کے لئے یہ تعجب کی بات ہے کہ انہوں نے آگ کے اسباب کو اختیار کیا، اس کے باوجود کہ وہ جانتے تھے کہ ان کا انجام بالیقین آگ ہے لیکن پھر بھی انہوں نے اسی پر صبر کیا۔ تو کونسی وہ چیز ہے جس نے انہیں اس عذاب پر صابر بنا دیا۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿١٧٦﴾

"یہ سزا اس وجہ سے ہوگی کہ اللہ نے تو اتاری کتاب حق کے ساتھ ۱؎ اور بیشک جو لوگ اختلاف ڈال رہے ہیں کتاب میں ۲؎ وہ دور دراز کے جھگڑوں میں پھنسے ہیں ۳؎"

۱؎ ذلک محل رفع میں ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ محل نصب میں ہے یعنی فعلنا ذالک۔ (ہم نے وہ کیا) "بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ" میں الکتاب سے مراد تورات ہے۔ یا اس سے مراد جنس کتاب ہے یعنی تورات، قرآن کریم وغیرہما۔

پس انہوں نے اختلاف کیا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے یہود کی جانب اللہ تعالیٰ کے خلاف یہ جرأت اور آگ کے عذاب پر ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 200 (فکر) 2۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 308 (علمیہ)

کا صبر کرنا اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ○ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (یکساں ہے ان کے لئے چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے مہر لگا دی اللہ نے ان کے دلوں پر۔)

[۲] الکتاب میں لام جنس کے لئے ہے اور ان کا اختلاف یہ تھا کہ وہ بعض پر ایمان لائے اور بعض کے ساتھ کفر کیا۔ یا پھر لام عہد کے لئے ہے اور یہ ارشارہ یا تو تورات کی طرف ہے۔ اس میں ان کے اختلاف کی صورت یہ ہے کہ انہوں نے اس کے بعض احکام کی پیروی کی اور بعض احکام کو چھوڑ دیا اور یہ حضور نبی کریم ﷺ کی اتباع سے متعلق تھے۔ یا پھر اشارہ قرآن کی طرف ہے اور اس میں ان کے اختلاف سے مراد ان کا یہ قول ہے کہ آیا یہ جادو ہے یا کلام ہے جسے ایک بشر کہتا ہے یا پھر پہلے لوگوں کے افسانے ہیں۔ وہ حق سے بہت دور دراز کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ○

"نیکی (بس یہی) نہیں [۱] کہ (نماز میں) تم پھیر لو اپنے رخ مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف [۲] بلکہ نیکی (کا کمال) تو یہ ہے [۳] کہ کوئی شخص ایمان لائے [۴] اللہ پر [۵] اور روز قیامت پر [۶] اور فرشتوں پر [۷] اور کتاب پر [۸] اور سب نبیوں پر [۹] اور دے اپنا مال اللہ کی محبت سے [۱۰] رشتہ داروں [۱۱] اور یتیموں [۱۲] اور مسکینوں اور مسافروں [۱۳] اور مانگنے والوں کو [۱۴] اور (خرچ کرے) غلام آزاد کرنے میں [۱۵] اور صحیح صحیح ادا کیا کرے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ [۱۶] اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب کسی سے وعدہ کرتے ہیں [۱۷] اور کامل نیک ہیں جو صبر کرتے ہیں مصیبت میں اور تنگی میں اور جہاد کے وقت [۱۸] ایسی لوگ ہیں جو راست باز ہیں اور یہی لوگ حقیقی پرہیزگار ہیں" [۱۹]

[۱] حفص اور حمزہ نے البِرَّ کو لَیْسَ کی خبر ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور اس کا اسم اس کا مابعد ہے اور باقیوں نے اس کے برعکس ترکیب کرتے ہوئے اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ البِرّ سے مراد ہر وہ فعل ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ہو۔

[۲] محدث عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ہمیں معمر نے قتادہ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے کہا یہودی مغرب کی طرف یعنی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور عیسائی مشرق کی طرف تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1) یعنی نیکی وہ نہیں جسے یہود اور عیسائی اپنائے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا قبلہ منسوخ ہو چکا ہے اور ان کا دین کفر ہے۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے ابوالعالیہ سے نقل کیا ہے، علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ قول قتادہ اور مقاتل بن حیان کا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد مسلمان

1۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 310 (علمیہ)

ہیں وہ اس طرح کہ جس آدمی نے ابتدائے اسلام میں فرائض نازل ہونے سے پہلے پہلے شہادتین کو ادا کیا اور کسی جہت بھی منہ کر کے نماز پڑھی پھر وہ اسی حالت پر فوت ہو گیا تو اس کے لئے جنت ثابت ہے۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے ہجرت فرمائی، فرائض نازل ہوئے، حدود مقرر ہوئیں اور قبلہ کو کعبہ کی طرف پھیر دیا گیا تو تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1)۔ یعنی کامل نیکی صرف اسی میں منحصر نہیں کہ تم مشرق و مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو اور اس کے سوا کوئی عمل نہ کرو۔ بلکہ نیکی تو وہ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور ضحاک کا ہے(2) میں کہتا ہوں کہ ابن جریر اور ابن المنذر نے قتادہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا چہروں کو پھیرنے اور اسے نماز کا نام نہ دینے کا ذکر کرنا اس پر قرینہ ہے کہ اس آیت کے مخاطبین یہود و نصاریٰ ہیں مومنین نہیں۔ مومنین کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ۔ یعنی صلاتکم (بیشک اللہ تعالیٰ تمہاری نمازوں کو ضائع نہیں کرے گا)۔

3۔ نافع اور ابن عامر نے لکن کو مخففہ پڑھا ہے اور البرّ کو دونوں مقام پر مرفوع پڑھا ہے۔ اور بقیہ نے لکنّ کو مشدد اور البرّ کو دونوں مقام پر منصوب پڑھا ہے۔

4۔ "مَنْ اٰمَنَ" کا البرّ پر حمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مبالغہ کے طور پر مصدر کو بمعنی فاعل لیا جائے۔ یا اس سے پہلے مضاف مقدر مانا جائے، یا پھر خبر سے پہلے مضاف مقدر سمجھا جائے۔ پہلی صورت میں عبارت ہوگی لٰكِنَّ الْبَارَّ، دوسری صورت میں لٰكِنَّ ذَا الْبِرِّ مَنْ اٰمَنَ اور تیسری صورت میں لٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ اٰمَنَ اور یہی صورت سیاق کلام کے زیادہ موافق ہے۔

5۔ جو اپنی جلال ذات اور کمال صفات کے اعتبار سے منفرد و یکتا ہے، حدوث اور نقص سے منزہ ہے اس کی ثناء اور تعریف انہی الفاظ سے کی جا سکتی ہے جن سے اس نے اپنی تعریف خود فرمائی ہے۔

6۔ "وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" سے مراد قیامت کا دن ہے کیونکہ وہی تمام ایام میں سے آخری ہے۔ یا پھر اس سے مراد قبروں سے اٹھنے کے وقت سے لیکر ابد تک ہے۔ اور یہ وقت ان تمام امور کو شامل ہے یعنی قبروں سے اٹھنا، حساب، میزان، پل صراط سے گزر، جنت اور جو کچھ اس میں ہے، دوزخ اور جو کچھ اس میں ہے، شفاعت، مغفرت، دائمی ثواب اور عذاب اور ہر وہ شئے جو کتاب و سنت سے ثابت ہے۔

7۔ ملائکہ کو نور سے پیدا کیا گیا ہے، ان کے اجسام ذی ارواح ہیں اور دو دو، تین تین اور چار چار پروں والے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کو اس حال میں دیکھا کہ ان کے چھ سو پر تھے۔ فرشتے نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں اور نہ ہی نکاح کرتے ہیں۔ ان کی قوت و طاقت تسبیح و تہلیل ہوتی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے، بلکہ وہ کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔ وہ مریں گے پھر انہیں اٹھایا جائے گا۔ اور ان میں سے وہ رسل ہیں جو انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات پر وحی لیکر آتے ہیں۔ ان کے اعمال کی جزاء ان سے اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے مراتب قرب یہ ہیں کہ فرمایا "عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ" لہٰذا وہ اپنے اعمال کی جزاء میں جنت میں داخل ہونے کے محتاج نہیں۔ بلکہ جہنم کے داروغے اور ملائکۃ العذاب بھی اپنے اجر پورے کریں گے اور ان پر زیادتی نہیں کی جائے گی۔ لہٰذا یہ تصور نہیں رکھنا چاہئے کہ عام مومنین تمام ملائکہ سے اس لئے افضل ہیں کہ وہ تو جزاء کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے لیکن ملائکہ نہیں۔ ہاں خاص بشر ہیں یعنی انبیاء و رسل جو ان تجلیات ذاتیہ کے سبب تمام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 203 (فکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 203 (فکر)

ملائکہ سے افضل ہیں جو مٹی کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ سے بشر کے ساتھ مختص ہیں۔ اسی طرح ملائکہ کے اعمال کی جزاء دخول جنت کے ساتھ ہی موقوف نہیں۔ اسی طرح انسانوں میں سے بعض اصفیاء کو دنیا میں ہی ایسی نعمتیں حاصل ہو جاتی ہیں جو انہیں جنت میں حاصل ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل علیہ السلام کے حق میں ارشاد فرمایا ہے: "اٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ" (اور ہم نے دیا ان کو ان (جاں نثاری) کا اجر اس دنیا میں اور بلاشبہ وہ آخرت میں صالحین (کے زمرہ) میں ہوں گے۔)

۸۔ الکتاب سے مراد یا تو جنس کتاب ہے یا پھر اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ ایمان لانا تمام نازل ہونے والی کتابوں کو مستلزم ہے۔ قرآن کریم اور دیگر کتب اور صحائف اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں اور غیر مخلوق ہیں۔ اور حق بات یہی ہے کہ قرآن کا اطلاق الفاظ اور معانی دونوں پر ہے۔ ان کا ایک دوسرے کے تعاقب میں آنا، لوگوں کی زبانوں پر ان کا مرتب ہونا اور ان کا کانوں میں پڑنا حدوث کا تقاضا کرتا ہے لیکن اسی طرح اس صفت کلام کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہونا مستلزم نہیں آتا۔ وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی اللہ تعالیٰ تو اس سے پاک اور منزہ ہے۔

۹۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہ کریں۔ ان میں سے سب سے اول حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخری اور افضل رسول ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ انبیاء کے ساتھ ایمان لانے میں تعداد کی تعیین جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَیْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَیْكَ (ان میں سے بعض کا ذکر ہم نے تمہارے سامنے کیا اور بعض کو تم پر بیان نہیں کیا) اور جو تعداد بعض احادیث آحاد میں موجود ہے وہ قطعیت کا فائدہ نہیں دیتی اور ایمان کا دارومدار دلائل قطعیہ پر ہے۔ تمام کے تمام انبیاء صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے معصوم ہیں۔ ان میں سے بعض بعض کی تصدیق کرتے ہیں اور ایمانیات میں ان کے مابین کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ فروع اعمال میں اختلاف ہے اور اس کی علت احکام میں نسخ کا جاری ہونا ہے۔ اس سے روافض کے اس قول کا باطل ہونا بھی اظہر من الشمس ہو جاتا ہے کہ ائمہ کے ساتھ ایمان لانا بھی ایمانیات میں داخل ہے۔ اگر اس طرح ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر جہاں انبیاء اور ملائکہ پر ایمان لانے کا ذکر کیا ہے ساتھ ہی ان کا ذکر بھی ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہو واللہ اعلم۔

۱۰۔ "وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ" ترکیب کلام میں یہ جار مجرور حال واقع ہو رہا ہے اور ضمیر اللہ تعالیٰ کی جانب لوٹ رہی ہے کیونکہ ہر وہ شئی جو اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے دی تو اس کا ثواب عطا فرمانا بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور جو کچھ کسی غیر کے لئے دیا تو اللہ تعالیٰ اس سے بری الذمہ ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے تین قسم کے لوگوں کا فیصلہ کیا جائے گا، ان میں سے تیسرا وہ آدمی ہوگا جسے اللہ تعالیٰ نے خوشحالی عطا فرمائی اور ہر قسم کا ساز و سامان عطا فرمایا۔ تو اسے رب کریم کی بارگاہ میں حاضر کیا جائے گا، رب کریم اسے اپنی دی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں گے تو وہ ان تمام کا اعتراف کرے گا پھر رب کریم فرمائیں گے تو نے انہیں کیسے استعمال کیا؟ وہ عرض کرے گا میں نے ہر اس راہ میں تیری رضا کے لئے مال خرچ کیا ہے جس میں تو پسند کرتا ہے کہ مال خرچ کیا جائے۔ رب کریم فرمائیں گے تو نے جھوٹ بولا ہے، بلکہ تو نے صرف اس لئے کیا تا کہ یہ کہا جائے فلاں بہت سخی ہے۔ چنانچہ تجھے ایسا کہا گیا۔ پھر رب کریم ارشاد فرمائیں گے کہ اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے[1] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ

۱۔ صحیح مسلم: 152، جلد 13 صفحہ 44 (علمیہ)

تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کی طرف نہیں دیکھتا، بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کی طرف دیکھتا ہے، رواہ مسلم(1) آپ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میں شرکاء کے شرک سے غنی ہوں۔ جس کسی نے ایسا عمل کیا جس میں اس نے میرے ساتھ غیر کو بھی شریک ٹھہرایا۔ تو میں اسے اور اس کے شرک (عمل) کو چھوڑ دیتا ہوں(2) اور ایک روایت میں ہے، تو میں اس سے بری ہوں، وہ عمل اسی کے لئے ہے، جس کے لئے اس نے کیا ہے، رواہ مسلم۔

یا پھر حُبّہٖ کی ضمیر مال کی طرف راجع ہے۔ یعنی اس نے اپنی صحت کی حالت اور مال سے محبت ہونے کی حالت میں اپنا مال دیا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرح فرمایا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کونسا صدقہ اجر کے اعتبار سے سب سے عظیم ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرا اس حال میں صدقہ کرنا کہ تو صحت مند بھی ہو اور حاجت مند بھی، فقر و افلاس سے ڈرتا ہو اور دولت مند بننے کا امیدوار بھی ہو اور تو ادا کرنے میں پھر اتنی دیر نہ کرے کہ جان حلقوم تک آ جائے اور پھر کہنے لگے فلاں کے لئے اتنا ہے، فلاں کے لئے اتنا ہے، حالانکہ اس وقت تو مال فلاں کے لئے ہی ہے، متفق علیہ(3) مال کی طرف ضمیر کے لوٹنے کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (تم نیکی کو ہرگز نہیں پا سکو گے یہاں تک کہ تم وہ چیزیں خرچ کرو جنہیں تم پسند کرتے ہو)۔ اس صورت میں یہ احتمال بھی ہے کہ معنی اس طرح ہو کہ وہ مال دے اس حال میں کہ وہ اس کے نزدیک تمام مالوں سے زیادہ پسندیدہ ہو۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ الآیہ۔ (خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے جو تم نے کمائی ہیں اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لئے زمین سے نہ ارادہ کرو ردی چیز کا اپنی کمائی سے کہ (تم اسے) خرچ کرو)۔ یا ضمیر مصدر کی طرف راجع ہے معنی یہ ہوگا کہ سخاوت قلبی اور شرح صدر کی بناء پر مال دینے کو پسند کرتے ہوئے مال دینا۔ (یعنی مال دیتے وقت دل تنگ نہ ہو اور کسی نوع کا ملال محسوس نہ ہو بلکہ دل خوشی سے پھولے نہ سمائے)

ذَوِی الْقُرْبیٰ مصدر ہے اور اس کا معنی قرابت ہے۔ اسے پہلے اس لئے ذکر کیا ہے کیونکہ قرابت داروں کو دینا زیادہ اولیٰ او بہتر ہے، وہی اس کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ ذوی القربیٰ میں نسبی رشتہ دار بھی شامل ہیں اور سببی بھی مثلاً خاوند، بیوی اور مملوک وغیرہ۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک دینار تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے، ایک دینار کسی غلام کی آزادی کے لئے خرچ کرے، ایک کسی مسکین پر صدقہ کرے اور ایک دینار اپنی اہل کو دے۔ تو ان میں سب سے زیادہ اجر اس دینار کا ہوگا جو تو نے اپنی اہل کو دیا، رواہ مسلم(4) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ حضرت زینب فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عورتوں کے گروہ! صدقہ کیا کرو اگرچہ وہ تمہارے زیورات میں سے ہی ہو۔ تو آپ نے اور ایک دوسری عورت نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا اس صدقہ کی جزاء دی جائے گی جو اپنے خاوندوں کو دیا جائے اور ان یتیموں کو دیا جائے جو ان کے زیر تربیت ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسے صدقے میں دو اجر ہوتے ہیں: ایک قرابت کا اجر اور ایک صدقے کا اجر، متفق علیہ(5) سلمان بن عامر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسکین پر صدقہ کرنا صرف صدقہ ہے اور یہی صدقہ کسی قرابت دار کو دینے میں یہ دو چیزیں ہیں (یعنی) صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی(6) اسے احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 16 صفحہ 99 (علمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 18 صفحہ 90 (علمیہ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 7 صفحہ 110 (علمیہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 7 صفحہ 72 (علمیہ) 5۔ صحیح مسلم، جلد 7 صفحہ 75 (علمیہ) 6۔ سنن ابن ماجہ: 1844 (علمیہ)

؎۱۲ ایسا بچہ جس کے بالغ ہونے سے قبل اس کا باپ فوت ہو جائے تو وہ یتیم ہوتا ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ذوی القربیٰ اور یتامیٰ سے مراد ان میں سے ایسے افراد ہیں جو حاجت مند ہوں اور کسی نوع کا التباس نہ ہونے کی وجہ سے اس قید کو ذکر نہیں کیا گیا(1) میں کہتا ہوں کہ کلام کو اس قید سے مقید کرنا ظاہر کلام کے خلاف ہے کیونکہ یہاں کلام نفلاً مال دینے کے بیان میں ہے، یا پھر اس بیان میں جو فرض اور نفل دونوں کو شامل ہو کیونکہ فرض زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد عنقریب آ رہا ہے اور نفلاً مال کسی کو دینا اس کے حاجت مند ہونے کی قید سے مقید نہیں۔ (یعنی اگر تطوعاً کسی کو مال دینا ہو تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ حاجت مند ہی ہو بلکہ اگر وہ ضرورتمند نہ بھی ہو تو بھی اسے دینا مباح ہے)، کیونکہ صلہ رحمی اور یتیم کو خوش کرنا اس صورت میں بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مالدار ہو بلکہ صلہ رحمی کے لئے تو یہ بھی ضروری نہیں کہ جسے دیا جا رہا ہے وہ مسلمان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا" (دنیا میں ان دونوں کا اچھے طریقے سے ساتھ دو)۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر فرماتی ہیں کہ میرے پاس میری ماں آئی اس حال میں کہ وہ مشرکہ تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کے ساتھ صلہ رحمی کرو، متفق علیہ(2) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ فلاں قبیلے کے لوگ میرے دوست نہیں۔ میرا دوست تو اللہ تعالیٰ اور صالح مومنین ہیں لیکن وہ میرے قرابتدار ہیں اس لئے میں قرابت کا لحاظ ضرور کروں گا، متفق علیہ(3) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بدلہ دینے والا صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہوتا، بلکہ صلہ رحمی کرنے والا تو وہ ہوتا ہے کہ جب قرابت منقطع ہو جائے تو وہ اسے جوڑ دے۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(4)۔ اور رسول اللہ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے(5) اور ایک روایت میں هٰكَذَا کی بجائے كَهَاتَيْنِ کے الفاظ ہیں اور آپ ﷺ نے اپنی انگشت شہادت اور وسطیٰ سے اشارہ بھی فرمایا۔ اسے بخاری، احمد، ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

؎۱۳ مجاہد نے کہا ہے کہ ابن سبیل سے مراد وہ مسافر ہے جو اپنے اہل وعیال سے دور ہو اور تیرے پاس سے گزر رہا ہو(6) اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد مہمان ہے۔ ابو شریح سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ وہ اپنے مہمان کی عزت وتکریم کرے، متفق علیہ۔(7)

؎۱۴ ام عبید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مانگنے والے کو ضرور دو اگرچہ وہ بکری کا جلا ہوا کھر ہی ہو۔ اور ایک روایت میں ہے اگر تو جلے ہوئے کھر کے سوا کچھ نہ پائے تو وہی سائل کو دے دے(8)۔ اسے احمد، ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سائل کا حق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ ابو داؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے اور اس کی اسناد جید ہیں(9) ابن راہویہ نے اپنی مسند میں حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی حدیث سے اور طبرانی نے ہرماس بن زیاد کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الزہد میں سالم بن ابی الجعد سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے فرمایا بیشک سائل کا حق ہے اگرچہ وہ تیرے پاس ایسے گھوڑے پر سوار ہو کر آئے جس کا طوق چاندی کا ہو(10) میں

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 451 (علمیہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 7 صفحہ 78 (علمیہ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 110 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری: 2233 (علمیہ)
5۔ صحیح بخاری: 4998 (علمیہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 204 (فکر)
7۔ صحیح مسلم، جلد 12 صفحہ 27 (علمیہ)
8۔ سنن ابی داؤد: 1787
9۔ سنن ابی داؤد: 1785
10۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 314 (علمیہ)

کہتا ہوں یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ سائل کو دینے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ محتاج ہو۔ ایسے آدمی کے لئے سوال کرنا اگرچہ حرام ہے جو محتاج نہ ہو، لیکن اس کے باوجود جس سے سوال کیا جائے اس کا یہ حق ہے کہ وہ اسے دے۔

۵؎ الرقاب سے مراد یا تو مکاتب غلام ہیں۔ اس اعتبار سے یہ اس قول باری تعالیٰ کی مثل ہے وَّ اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اٰتٰىكُمْ (اور تم مکاتبوں کو دو اس مال سے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے) اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مطلق غلام کو آزاد کرنا مراد ہے تو پھر یہ فَكُّ رَقَبَةٍ کی مثل ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد قیدیوں کا فدیہ دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا ترجمہ: (اور جو کھانا کھلاتے ہیں اللہ کی محبت میں مسکین یتیم اور قیدی کو۔)

۶؎ یعنی فرضی اور نفلی نمازیں اپنے حقوق اور سنن و آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے ادا کرے اور فرض زکوٰۃ ادا کرے۔ اس سے قبل جو ذکر کیا گیا ہے وہ یا تو صدقات نافلہ کا ذکر ہے یا وہ فرض اور نفل تمام کو شامل ہے۔ لہٰذا مزید اہتمام کے لئے اس کے بعد فرض زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ سابقہ کلام اور اس سے مقصود تو فرض زکوٰۃ ہی ہے البتہ سابقہ کلام کی غرض مصارف زکوٰۃ کا بیان ہے اور اس دوسرے کلام سے مقصود زکوٰۃ کی ادائیگی اور اس پر برانگیختہ کرنے کا بیان ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پہلا نظریہ زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے کیونکہ یہ کلام نیکی (البرّ) کے بیان میں ہے اور اس سے مراد وہ اعمال ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہو چاہے، وہ فرض ہوں یا نفل۔ اس کی تائید حضرت فاطمہ بنت قیس کی حدیث بھی کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی یقیناً حق ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ الآیۃ۔ اسے ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ اور حق سے مراد عام ہے چاہے وہ واجب ہو یا مستحب۔ اس کی اصل اجماع ہے اور اس اجماع کی دلیل حضرت طلحہ بن عبید اللہ کی حدیث ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اسلام کے بارے میں سوال کرنے لگا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا پانچ نمازیں، رمضان المبارک کے روزے اور زکوٰۃ۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا ان کے علاوہ بھی مجھ پر کچھ ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں مگر یہ کہ تو نفلاً ادا کرے، متفق علیہ۔(1)

۷؎ اور جو اپنے ان وعدوں کو پورا کرنے والے ہیں جو یوم میثاق کو ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوئے اور دنیوی زندگی میں جب وہ قسم اٹھاتے ہیں یا نذر مانتے ہیں تو انہیں پورا کرتے ہیں اور جو اپنے اور لوگوں کے درمیان ہونے والے وعدوں کو پورا کرنے والے ہیں، یعنی جب وہ وعدہ کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں۔ جب بولتے ہیں تو سچ بولتے ہیں، جب انہیں امین بنایا جاتا ہے تو وہ امانتیں ادا کرتے ہیں اور جب انہیں حق پر شاہد بنایا جاتا ہے تو وہ اس کی شہادت دیتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منافق کی علامات تین ہیں: جب گفتگو کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جاتی ہے تو اس میں خیانت کرتا ہے، متفق علیہ(2) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کا اضافہ ذکر کیا ہے "اگرچہ وہ روزے رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور یہ گمان کرتا ہو کہ وہ مسلمان ہے"(3) حضرت عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس میں چار چیزیں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی اس میں نفاق کی ایک خصلت موجود رہے گی یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرے، جب

1۔ صحیح بخاری:46 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 41 (علمیہ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 42 (علمیہ)

گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو توڑ دے اور جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ دے، متفق علیہ (1) ترکیب کلام میں اس کا عطف مَنْ اٰمَنَ پر ہے۔

۱۸؎ اس کا عطف بھی " مَنْ اٰمَنَ پر ہے اور یہ کلام کے طویل ہونے کی بناء پر حالت نصبی میں ہے۔ یہ عربوں کی عادت ہے کہ جب کلام طویل ہو جائے تو اعراب تبدیل کر دیتے ہیں۔ ابوعبیدہ نے اسی طرح کہا ہے۔ اسی کی مثل سورۃ المائدہ میں وَ الصّٰبِـُٔوْنَ اور سورۃ النساء میں وَ الْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوةَ ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ یہ مخصوص بالمدح ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور تمام اعمال کی نسبت صبر کے افضل ہونے کی وجہ سے اسے ان پر معطوف نہیں کیا گیا کیونکہ اعمال میں افضل ترین چیز ان پر دوام اختیار کرنا ہے اور ایسا صبر کے سبب ہی ہوتا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اَخُصُّ الصّٰبِرِیْنَ بِمَزِیْدِ الْبِرِّ یا اَمْدَحُ الصّٰبِرِیْنَ بِمَزِیْدِ الْبِرِّ۔ تو اس صورت میں جملے کا عطف جملے پر ہوگا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ ذوی القربیٰ پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی وَ اٰتَی الصّٰبِرِیْنَ۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ٘ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِۚ (خیرات ان فقیروں کیلئے ہے جو روکے گئے ہیں اللہ کی راہ میں، نہیں فرصت ملتی انہیں (روزی کمانے کیلئے) چلنے پھرنے کی زمین میں، خیال کرتا ہے انہیں ناواقف کہ (یہ) مالدار (ہیں) بوجہ ان کے سوال نہ کرنے کے۔) تنگی اور فقر کی حالت میں بیماری اور اپاہج کی حالت میں قتال اور جنگ کی حالت میں۔

۱۹؎ یہی وہ لوگ ہیں جو ایمان اور نیکی میں راستباز ہیں اور یہی کفر اور تمام قسم کی رذالتوں سے بچنے والے ہیں۔ یہ آیت کریمہ صراحۃً یا ضمناً تمام کمالات انسانیہ کی جامع ہے اور صحت اعتقاد، حسن معاشرت اور تہذیب نفس پر دلالت کرتی ہے۔ یہی نیکوکار لوگوں کا منصب ہے لیکن وہ صدیقین جو بارگاہ الٰہی کے مقرب ہیں ان کی مزید فضیلت کا انحصار فضل اور اجتباء خداوندی پر ہے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ (وہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرما دیتا ہے)۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰىؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰىؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝

" اے ایمان والو فرض کیا گیا ہے تم پر قصاص جو (ناحق) مارے جائیں ۱؎ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت ۲؎، پس جس کو معاف کی جائے اس کے بھائی (مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ چیز ۳؎ تو چاہیے کہ طلب کرے (مقتول کا وارث) خون بہا دستور کے مطابق اور (قاتل کو چاہیے) کہ اسے ادا کرے اچھی طرح ۴؎ یہ رعایت ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت ہے ۵؎ تو جس نے زیادتی کی اس کے بعد تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے ۶؎ "

۱؎ قصاص کا معنی مساوات اور مماثلت ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ شعبی، کلبی اور قتادہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قبائل

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 40 (علیہ)

عرب میں سے دو قبیلوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے ظہور اسلام سے تھوڑا قبل عہد جاہلیت میں ایک دوسرے سے خوب قتال کیا۔ ان دونوں کے درمیان بہت سے لوگ مقتول اور زخمی ہوئے۔ ابھی تک انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں لیا تھا کہ اتنے میں نور اسلام ظہور پذیر ہوا۔ مقاتل بن حیان نے کہا ہے کہ یہ قتال بنی قریظہ اور بنی نضیر کے درمیان ہوا تھا (1) اور سعید بن جبیر نے کہا کہ یہ جنگ اوس اور خزرج کے درمیان ہوئی تھی (2) اور یہ تمام نے کہا ہے کہ ان دو قبیلوں میں سے ایک کو دوسرے پر تعداد کی کثرت اور شرف کے اعتبار سے غلبہ حاصل تھا لہٰذا وہ ان کی عورتوں سے بغیر مہروں کے نکاح کرتے تھے۔ پس انہوں نے قسم کھائی کہ ہم اپنے غلام کے بدلے آزاد، عورت کے بدلے ان کا مرد اور اپنے ایک مرد کے عوض ان کے دو مرد ضرور قتل کریں گے اور انہیں اپنے زخموں کے بدلے دوگنا زخم لگائیں گے۔ پھر انہوں نے اپنا معاملہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں پیش کیا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور مساوات کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ اس پر راضی ہو گئے اور اسے تسلیم بھی کر لیا۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان کا راضی ہونا، ان کا تسلیم کرنا اور اللہ تعالیٰ کا انہیں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے قول سے خطاب کرنا اس کی دلیل ہے کہ اس کے مخاطبین اوس اور خزرج ہیں جو انصار اللہ بنے نہ کہ بنی قریظہ اور نضیر کیونکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے دشمن کافر تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس نظریہ کی دلیل ہے کہ قتل عمد میں صرف قصاص واجب ہے نہ کہ دیت اور قاتل کی رضامندی کے بغیر مال لینا جائز نہیں۔ اس کی تائید رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے کہ قتل عمد میں قصاص ہے (3) اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک طویل حدیث میں نقل کیا ہے۔ اس کے متصل اور مرسل ہونے میں اختلاف ہے۔ دار قطنی نے اس کے مرسل ہونے کو صحیح قرار دیا ہے اور مرسل حدیث ہمارے نزدیک حجت ہے، اور دار قطنی نے عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن حزم عن ابیہ عن جدہ کی سند سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ قتل عمد میں قصاص ہے اور خطا میں دیت ہے۔ اس کی اسناد میں ضعف ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ میں سے ہر ایک کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ واجب تو قصاص ہے لیکن مقتول کے ورثاء کے لئے جائز ہے کہ وہ قاتل کی رضامندی کے بغیر دیت لیکر قصاص معاف کر دیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان دو میں سے کوئی ایک واجب ہے قصاص یا دیت۔ ان میں سے کوئی بھی معین نہیں۔ دونوں قولوں کے درمیان فرق تب ظاہر ہوگا جب مقتول کے ورثاء دیت کا ذکر کئے بغیر مطلقاً قصاص معاف کر دیں۔ اس صورت میں پہلے قول کے مطابق قصاص بغیر دیت کے ساقط ہو جائے گا اور دوسرے قول کے مطابق اس میں دیت ثابت ہو جائے گی۔

ان تمام ائمہ کرام نے مجرم کی رضامندی کے بغیر مال لینے کے جواز پر کئی احادیث سے استدلال کیا ہے۔ ان میں سے ابوشریح الکعبی کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا میں اس جگہ کھڑے ہو کر کسی بھی مقتول کے ورثاء کو اختیار دیتا ہوں کہ اگر وہ پسند کریں تو قاتل کو قتل کر دیں اور اگر چاہیں تو دیت لے لیں (4) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ابن جوزی اور دارمی نے ابوشریح الخزاعی سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ کسی کا کوئی آدمی قتل کیا جائے یا اسے زخمی کر دیا جائے تو اسے تین چیزوں میں سے کسی ایک کا اختیار ہے۔ پس اگر وہ چوتھی کا ارادہ کرے تو اس کے ہاتھ پکڑ لو۔ (وہ تین چیزیں یہ ہیں) قصاص لے لے، معاف کر دے یا دیت وصول کر لے۔ اگر کسی نے ان میں سے کسی شی کو اختیار کر لیا پھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 206 (فکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 206 (فکر)
3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3 صفحہ 278 (علمیہ) مطبوعہ
4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1405 (علمیہ)

اس کے بعد حدود سے تجاوز کیا تو اس کے لئے آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا(1) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ جس کا کوئی آدمی مقتول ہو جائے تو اسے اختیار ہے چاہے تو وہ قاتل سے فدیہ لے لے اور چاہے تو اسے قتل کر دے، متفق علیہ(2) ایک حدیث عمر بن شعیب اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ آدمی جو جان بوجھ کر کسی کو قتل کر دے تو اسے مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے۔ پس اگر وہ چاہیں تو اسے قتل کر دیں اور اگر چاہیں تو دیت لے لیں تیس حقے تیس جذعے اور چالیس خلفے جن کے پیٹوں میں بچے ہوں(3) اسے احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے ان احادیث کے جواب میں کہا ہے کہ ان سے مراد یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء کو قصاص اور صلح کے بارے میں اختیار ہے اور صلح تو قاتل کی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتی اور ظاہر حالت بھی ہے کہ قاتل تو اپنی جان کی حفاظت کے لئے راضی ہو جائے گا۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ظاہر حال کی بناء پر ہی قاتل کی رضا کا ذکر نہیں فرمایا و اللہ اعلم۔

؎ آزاد کو قتل کیا جائے گا آزاد کے بدلے اور غلام کو غلام کے بدلے اور عورت کو (قتل کیا جائے گا) عورت کے بدلے۔ یہ کلام اس پر دلالت نہیں کرتا کہ آزاد کو غلام کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا اور غلام کو آزاد کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا، عورت کو مرد کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا اور مرد کو عورت کے عوض قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ آیت ان تمام احکام کو بیان کرنے سے خاموش ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مفہوم مخالف مطلقاً معتبر نہیں۔ اسی طرح مفہوم مخالف کے قائلین کے نزدیک بھی اس آیت میں مذکورہ احکام پر استدلال نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کے نزدیک بھی مفہوم مخالف تب معتبر ہوتا ہے جب اختصاص حکم کے سوا تخصیص کی اور کوئی غرض ظاہر نہ ہو۔ اور یہاں غرض یہ ہے کہ معلوم ہونا چاہئے ایک (فریق) کی حیثیت کو دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ لہٰذا جو مفہوم اس آیت سے اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب ایک آزاد آدمی اکیلے آزاد آدمی کو قتل کر دے تو اکیلے قاتل کو ہی قتل کیا جائے گا، مقتول کی عظمت و شرف کی وجہ سے قاتل کے ساتھ کسی اور کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح غلام جب کسی غلام کو قتل کر دے تو اس مقتول غلام کے عوض اسی قاتل غلام کو قتل کیا جائے گا۔ مقتول کے شرف کی وجہ سے اس کی جگہ آزاد کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح جب عورت کسی عورت کو قتل کر دے تو اس کے بدلے میں اسی عورت کو قتل کیا جائے گا، عورت کی جگہ مرد کو قتل نہیں کیا جائے گا و اللہ اعلم۔ باقی رہی ان احکام کی بحث جن کے بیان سے یہ آیت خاموش ہے تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ نفس کے بدلے نفس کو قتل کیا جائے گا چاہے وہ آزاد ہو یا غلام، مذکر ہو یا مؤنث، مسلمان ہو یا ذمی اور یہ حکم اس لئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد عام ہے وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ (اور ہم نے لکھ دیا تھا یہود کے لئے تورات میں یہ (حکم) کہ جان کے بدلے جان۔) اور وہ احکام الٰہیہ جو سابقہ نازل کردہ کتب میں ہیں جب ان کا بیان ہمارے نزدیک قرآن یا سنت سے ثابت ہو، کیونکہ ان میں یہود و نصاریٰ میں سے کفار کا قول معتبر نہیں تو وہ احکام باقی ہوں گے اور ان کی پیروی واجب ہو گی کیونکہ حاکم بھی ایک ہے اور شریعت بھی ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ۔ مزید ارشاد فرمایا: شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ۔ اس نے مقرر فرمایا ہے تمہارے لئے وہ دین جس کا اس نے حکم دیا تھا نوح کو اور جسے ہم نے بذریعہ وحی بھیجا ہے آپ کی طرف اور جس کا

1۔ سنن دارمی: 2356 (محاسن) 2۔ صحیح بخاری: 2302 (ابن کثیر) 3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1387 (علیہ)

ہم نے حکم دیا تھا ابراہیم موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو۔ نسخ کے بغیر احکام مختلف نہیں ہوتے، چاہے وہ ایک کتاب میں ہوں یا متعدد کتابوں میں۔ اور جب تک نسخ ظاہر نہ ہو تو حکم باقی رہتا ہے اور اس حکم کے باقی رہنے پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی ایسے مسلمان کا خون حلال نہیں ہوتا جو شہادت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ مگر تین چیزوں میں سے ایک کے ساتھ یعنی نفس کے بدلے نفس کو قتل کرنا، ایسا شادی شدہ آدمی جو زنا کرے اور ایسا آدمی جو جماعت کو چھوڑ کر دین سے نکل جائے۔ یعنی (مرتد) ہو جائے، متفق علیہ (1) (یعنی ان تین قسم کے آدمیوں کو قتل کرنا شرعاً مباح ہے)۔ حضرت ابوامامہ کی حدیث ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کیا گیا تو انہوں نے اپنے گھر کے اوپر سے جھانک کر ارشاد فرمایا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہوگا مگر تین کاموں میں سے ایک کے سبب۔ ایک جس نے محصن ہونے کے بعد زنا کیا یا اسلام کے بعد کفر اختیار کیا یا پھر بغیر حق کے کسی نفس کو قتل کر دیا۔ الحدیث (2) اسے امام شافعی، احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔ اس باب میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مسلم اور ابوداؤد وغیرہ نے حدیث نقل کی ہے۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایسے آدمی کو قتل نہیں کیا جائے گا جو اپنے غلام یا اپنے مدبر یا اپنے مکاتب کو قتل کرتا ہے، نہ ہی ایسے آدمی کو قتل کیا جائے گا جو ایسے غلام کو قتل کرتا ہے جس کے بعض حصے کا وہ مالک ہو اور نہ ہی اسے جو اپنے بیٹے کے غلام کو قتل کر دے، کیونکہ وہ اپنی ہی ذات سے اپنے لئے یا اپنے بیٹے کے لئے قصاص کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ یہی قول جمہور کا بھی ہے بخلاف داؤد کے۔ انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی نے حسن کے واسطہ سے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے اپنے غلام کو قتل کیا ہم اسے قتل کریں گے اور جس نے اپنے غلام کو زخمی کیا ہم اسے زخم لگائیں گے (3) جمہور نے کہا ہے کہ یہ حدیث سیاست پر محمول ہے اور یہ مرسل ہے کیونکہ حسن کا سمرہ سے سماع ثابت نہیں اور دار قطنی نے عمرو بن شعیب سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے جان بوجھ کر اپنے غلام کو قتل کر دیا تو حضور نبی کریم ﷺ نے اسے سو دُرّے لگوائے۔ ایک سال کے لئے اسے جلاوطن کر دیا اور مسلمانوں میں سے اس کے حصہ کو ختم کر دیا اور آپ ﷺ نے اس سے قصاص نہ لیا اور اسے غلام آزاد کرنے کا حکم ارشاد فرمایا (4) لیکن اس روایت کی سند میں ایک راوی اسماعیل بن عیاش ضعیف ہے، واللّٰہ اعلم۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ تمام اس پر متفق ہیں کہ غلام کو آزاد کے بدلے، عورت کو مرد کے بدلے اور کافر کو مسلمان کے بدلے قتل کیا جائے گا کیونکہ ان میں سے ہر ایک میں نقصان کے اعتبار سے تفاوت موجود ہے (یعنی ادنیٰ اعلیٰ کے مقابل آ رہا ہے) اور ناقص میں جائز ہوتا ہے کہ اس سے کامل کا بدلہ چکایا جائے، لیکن اس کا برعکس نہیں ہو سکتا۔ اور اس پر بھی تمام کا اتفاق ہے کہ مرد کو عورت کے بدلے قتل کیا جائے گا کیونکہ عمرو بن حزم سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اہل یمن کی طرف اپنے خط میں لکھا کہ مرد کو عورت کے بدلے قتل کیا جائے گا اور یہ حضور نبی کریم ﷺ کے خط کا ایک حصہ ہے اور یہ مشہور ہے۔ اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ البتہ محدثین کا اس حدیث کی صحت میں اختلاف ہے۔ ابن حزم نے کہا ہے کہ عمرو بن حزم کا صحیفہ منقطع ہے، یہ حجت نہیں اور اس کے راوی سلیمان

1۔ مشکوٰۃ المصابیح: 3446 (قدیمی)
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2158 (علمیہ)
3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1414 (علمیہ)
4۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 144 (محاسن)

بن داؤد کے ترک پر سب متفق ہیں۔ ابوداؤد نے کہا ہے کہ سلیمان بن داؤد میں وہم ہے۔ دراصل یہ سلیمان بن ارقم ہے۔ حاکم، ابن حبان اور بیہقی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا میں امید رکھتا ہوں کہ یہ صحیح ہے۔ ابوزرعہ، ابوحاتم اور حفاظ کی ایک جماعت نے سلیمان بن داؤد کی تعریف کی ہے اور ائمہ کی ایک جماعت نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے مگر اسناد کے اعتبار سے نہیں بلکہ شہرت کے اعتبار سے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ میں کہا ہے کہ محدثین نے اس حدیث کو قبول نہیں کیا، یہاں تک کہ ان کے نزدیک ثابت ہو گیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا خط ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ یہ خط اہل سیر کے نزدیک مشہور ہے اور اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اہل علم کے نزدیک معروف ہے۔ باقی اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ آیا آزاد آدمی کو کسی دوسرے کے غلام کو قتل کرنے کے عوض قتل کیا جائے گا؟ تو اس بارے امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ آزاد کو قتل نہیں کیا جائے گا، لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اسے قتل کیا جائے گا۔ ائمہ ثلاثہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا آزاد کو غلام کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا(1) اسے دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ سنت سے ثابت ہے کہ آزاد کو غلام کے عوض قتل نہ کیا جائے(2) اسے بھی دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس کی سند میں جویبر اور عثمان البری دونوں راوی ضعیف اور متروک ہیں۔ ابن جوزی اور حافظ ابن حجر رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ایک راوی جابر الجعفی ہے جو کذاب ہے۔ اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ کیا کافر ذمی کے بدلے مسلمان کو قتل کیا جائے گا؟ تو اس بارے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور احمد رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ ان دونوں نے ابوجحیفہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا تمہارے پاس کوئی ایسی شئی ہے جو قرآن پاک میں نہیں؟ تو آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو چیرا اور جان کو پیدا کیا ہمارے پاس کچھ نہیں مگر وہی جو قرآن میں ہے۔ ہاں ایک فہم و فراست ہے جو اللہ تعالیٰ آدمی کو اپنی کتاب سمجھنے کے لئے عطا فرماتا ہے۔ اور ایک وہ ہے جو اس صحیفہ میں ہے۔ میں نے عرض کی اس صحیفہ میں کیا ہے؟ آپ نے فرمایا دیت اور قیدی کو چھوڑنے کے احکام اور یہ کہ مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے(3) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اس طرح نقل کیا ہے کہ مومن کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ کسی ذمی کو اس کے عقد ذمہ کے دوران قتل کیا جائے گا۔ اور عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے(4) اسے امام احمد اور نسائی کے سوا اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے عطاء، طاؤس، حسن اور مجاہد رحمہم اللہ سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن ارشاد فرمایا کسی مومن کو کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے(5) اسے بیہقی نے عمران بن حصین کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان کو تین خصلتوں میں سے کسی ایک کے سوا قتل کرنا حلال

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 133 (محاسن) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 134 (محاسن) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 207 (الفکر)
4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1413 (العلمیہ) 5۔ شعب الایمان: 1441 (علمیہ)

نہیں۔ اگر زانی محصن ہو تو اسے رجم کیا جائے گا۔ وہ آدمی جو کسی مسلمان کو ارادۃً قتل کر دے اور وہ آدمی جو دین اسلام سے نکل جاتا ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتا ہے لہٰذا اسے قتل کر دیا جائے گا یا سولی چڑھا دیا جائے گا یا جلاوطن کر دیا جائے گا (1) اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ عبدالرزاق نے معمر عن زہری عن سالم عن ابیہ کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مسلمان نے اہل ذمہ میں سے کسی آدمی کو قتل کر دیا چنانچہ یہ مقدمہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس کے عوض مسلمان کو قتل نہیں کیا بلکہ اس کے خلاف دیت مغلظہ کا فیصلہ دیا (2) حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ ابن حزم نے کہا ہے کہ یہ روایت انتہائی صحیح ہے۔ اور صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی اس بارے میں اس کے سوا کوئی صحیح روایت مروی نہیں۔ ہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہم نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے لکھا ایسی صورت میں قصاص لیا جائے لیکن اس کے بعد ایک خط تحریر کیا اور اس میں فرمایا کہ قاتل کو قتل نہ کرو بلکہ اس سے دیت وصول کرو۔

جواب:۔ جواب یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد "لَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ" میں کافر سے مراد حربی ہے ذمی نہیں۔ اور اس پر آپ ﷺ کا ارشاد "وَلَا ذُوْ عَهْدٍ فِيْ عَهْدِهٖ" دلالت کرتا ہے۔ یعنی کسی ذمی کو اپنے عقد ذمہ کی حالت میں کسی کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ذمی کو ذمی کے عوض قتل کیا جائے گا۔ اس پر اجماع ہے، لہٰذا کافر سے مراد حربی ہے کوئی اور نہیں۔ رہا حضرت عثمان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا فتویٰ، تو وہ ان کی اپنی رائے ہے۔ اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جواب میں اختلاف ہوا اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں اسلام کی قید محض اتفاقاً واقع ہوئی ہے۔ صاحب ہدایہ نے ذمی کے عوض مسلمان کو قتل کرنے کے وجوب پر اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ذمی کے بدلے مسلمان کو قتل کیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کو دارقطنی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمان کو ذمی کے بدلے قتل کیا اور فرمایا میں اپنے ذمہ کو پورا کرنے والوں میں سے زیادہ کریم ہوں۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ ابراہیم بن یحییٰ کے سوا اسے کسی نے سنداً بیان نہیں کیا (3) اور وہ متروک الحدیث ہے۔ ابن جوزی نے کہا ہے کہ ابراہیم بن یحییٰ کذاب ہے اور درست یہ ہے کہ ابن سلیمان نے حضور نبی کریم ﷺ سے مرسل روایت نقل کی ہے اور ابن سلیمان ضعیف ہے۔ وہ تب بھی حجت نہیں بن سکتا جب وہ حدیث کو متصل بیان کرے۔ تو پھر مرسل روایت کے ساتھ کیسے حجت ہو سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اولیٰ یہی ہے کہ استدلال اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ کی اس آیت سے کیا جائے جو ہم نے پہلے بیان کی ہے اور علاوہ ازیں حضرت ابن مسعود، حضرت عثمان اور حضرت اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کی حدیث سے استدلال کیا جائے۔ اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ کیا والد کو اپنے بیٹے کے قتل کے عوض قتل کیا جائے گا؟ تو اس بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ جب باپ بیٹے کو لٹا کر ذبح کر دے تو اس کے بدلے اسے قتل کیا جائے اور داؤد ظاہری کا قول ہے کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا، چاہے صورت حال کوئی بھی ہو اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ ہماری دلیل حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ باپ سے بیٹے کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔ اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (4) اس کی سند میں ایک راوی حجاج بن ارطاۃ ہے۔ اس کی ایک دوسری سند ہے جس سے امام احمد رحمۃ

1۔ سنن نسائی، جلد 8 صفحہ 23 (زبان)
2۔ مصنف عبدالرزاق: 18492 (المکتب الاسلامی)
3۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 135 (محاسن)
4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1400 (علمیہ)

اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور ایک دوسری سند ہے جو دار قطنی اور بیہقی کے نزدیک ان دونوں کی نسبت زیادہ صحیح ہے اور بیہقی نے اس سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ ترمذی نے سراقہ کی حدیث سے بھی اسے روایت کیا ہے۔ اس کی اسناد ضعیف ہے اور اس میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے مقام پر اختلاف اور اضطراب ہے۔ اس مقام پر یہ قول بھی ہے کہ عمرو سے مروی ہے اور یہ بھی ہے کہ سراقہ سے مروی ہے۔
امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بلا واسطہ عمرو بن شعیب سے مروی ہے اور اس میں ابن لہیعہ راوی ضعیف ہے اور اسے ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ اس میں ایک راوی اسماعیل بن مسلم مکی ہے جو ضعیف ہے۔ لیکن حسن بن عبداللہ العنبری نے عمرو بن دینار سے نقل کر کے اس کی متابعت اختیار کی ہے۔ یہ قول امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ تمام احادیث معلول ہیں ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ میں نے بہت سے اہل علم سے یہ یاد کیا ہے۔ کہ باپ کو بیٹے کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور میرا موقف یہی ہے۔ واللہ اعلم۔
اکثر ائمہ نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ جب ایک جماعت ایک آدمی کو قتل کر دے تو اس کے بدلے اس جماعت کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن داؤد نے کہا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے کہ انہیں قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ دیت واجب ہوگی۔ حضرت سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ صنعاء کے مقام پر ایک آدمی قتل ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے بدلے سات افراد کو قتل کیا اور فرمایا کہ اگر اس کے قتل میں تمام اہل صنعاء شریک ہوتے تو میں اس کے عوض تمام کو قتل کر دیتا (1) اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں نقل کیا ہے اور امام شافعی نے آپ سے۔ اور ایک دوسری سند سے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔
اگر ایک آدمی پوری جماعت کو قتل کر دے تو اس میں اختلاف ہے۔ تو اس بارے امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ صرف اس پر اس جماعت کے بدلے قصاص ہوگا، کوئی دوسری چیز اس پر واجب نہیں ہوگی اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اگر اس نے انہیں یکے بعد دیگرے ایک ایک کر کے قتل کیا ہے تو پھر اسے پہلے مقتول کے عوض قتل کیا جائے گا اور باقیوں کے عوض اس پر دیتیں واجب ہوں گی۔ اور اگر اس نے ان تمام کو یکبارگی قتل کیا، تو پھر مقتولوں کے ورثاء کے مابین قرعہ اندازی کی جائے گی۔ جس کے نام پر قرعہ نکلے گا اس کے بدلے اسے قتل کر دیا جائے گا اور باقیوں کے لئے دیت ہوگی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اگر تمام مقتولوں کے ورثاء حاضر ہوں اور وہ قصاص کا مطالبہ کریں تو اسے پوری جماعت کے عوض قتل کر دیا جائے اس صورت میں اس پر کوئی دیت نہیں ہوگی۔ اور اگر بعض کے ورثاء قصاص کا مطالبہ کریں اور بعض دیت کا۔ تو اسے ان کے بدلے قتل کر دیا جائے جنہوں نے قصاص کا مطالبہ کیا ہے اور جنہوں نے دیت کا مطالبہ کیا ہے ان کے لئے اس پر دیت واجب ہوگی اور اگر تمام نے دیت کا ہی مطالبہ کیا تو ان میں سے ہر ایک کے بدلے اس پر کامل دیت ہوگی۔ قتل خطأ کی صورت میں قصاص نہ ہونے پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کیونکہ قصاص قتل عمد کی صورت میں ہوتا ہے البتہ عمد کی تفسیر میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ قتل عمد سے مراد یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی کو ہتھیار کی مثل کسی شئ سے بالارادہ قتل کر دے۔ ہتھیار کی مثل سے مراد تیز دھار لکڑی اور پتھر یا اسی نوع کی اور کوئی شئ اور آگ ہے۔ امام شعبی، نخعی اور حسن بصری نے کہا ہے کہ قتل عمد صرف لوہے کے ہتھیار سے ہی ہوتا ہے اور قتل عمد کے سوا کسی صورت میں قصاص نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی نے بالارادہ ایسی شئ کے ساتھ کسی کو قتل کر دیا جو نہ ہتھیار ہو اور نہ ہی ہتھیار کی مثل ہو تو وہ قتل شبہ عمد ہوگا۔ اس میں قصاص نہیں ہوتا بلکہ اس میں دیت ہوتی ہے۔ امام ابو یوسف، محمد، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جب کسی نے ایسے

1۔ مؤطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 871 (التراث العربی)

بڑے پتھر یا بڑی لکڑی کے ساتھ کسی کو مار ڈالا جس کے ساتھ غالباً قتل کیا جا سکتا ہو تو وہ قتل عمد ہوگا۔ اور اس میں قصاص ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی نے اسے پانی میں غرق کر دیا یا اس کا گلا گھونٹ دیا یا اسے اتنے دنوں تک کھانے پینے سے روکے رکھا جن میں اغلباً موت واقع ہو سکتی ہے۔ پس وہ مر گیا تو وہ قتل عمد ہی ہوگا۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے ایسی لاٹھی، درے یا چھوٹے پتھر کے ساتھ مارنے کا قصد کیا جس کے ساتھ عموماً قتل نہ کیا جا سکتا ہو تو وہ بھی قتل عمد ہوگا اور اس میں قصاص ہوگا۔ اس کے بارے جمہور کی رائے یہ ہے کہ یہ خطأ العمد ہے، اس میں قصاص نہیں ہوگا اور دیت ہوگی۔ مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اگر اس نے بار بار ضربیں لگائیں، یہاں تک کہ وہ مر گیا تو اس پر قصاص ہوگا۔ کسی بھاری چیز کے ساتھ قتل کرنے کے سبب قصاص واجب ہونے میں جمہور کی دلیل وہ حدیث طیبہ ہے جو صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک یہودی نے ایک عورت کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل ڈالا اور اسے قتل کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل دیا (1) اور حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے جنین کے بارے فیصلہ فرمایا تو وہ حاضر تھے واقعہ اس طرح ہے کہ ابن مالک رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس دو عورتیں تھیں وہ آپس میں لڑ پڑیں۔ تو ان میں سے ایک نے دوسری کو خیمے کی چوب دے ماری۔ پس اس نے اسے اور اس کے پیٹ میں موجود بچے کو قتل کر دیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ وہ جنین کے بدلے ایک غلام دے اور مقتولہ کے عوض قاتلہ کو قتل کر دیا جائے۔ لاٹھی اور کوڑے سے قتل ہونے کی صورت میں قصاص نہ ہونے کی دلیل حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خطا یعنی شبہ العمد کا مقتول وہ ہے جسے کوڑے اور ڈنڈے (عصا) سے قتل کر دیا جائے اس صورت میں قاتل پر سو اونٹ ہوں گے۔ ان میں سے چالیس ایسے ہوں جن کے پیٹوں میں بچے ہوں (2) اسے ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ ہذیل کی دو عورتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں سے ایک نے دوسری کو پتھر مارا اور اسے اور اس کے پیٹ میں موجود بچے کو ہلاک کر دیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ جنین کے بدلے اس کے ذمہ ایک غلام یا لونڈی دینا ہے اور مقتولہ عورت کی دیت قتل کرنے والی عورت کی عاقلہ پر ہوگی، متفق علیہ (3) اسی قسم کی روایت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے ایسا آدمی جو لوگوں کے درمیان اندھا دھند پتھر پھینکے جانے کے سبب قتل ہوا یا اسے کوڑوں کے ساتھ مارا گیا یا لاٹھی کے ساتھ مارا گیا تو وہ مر گیا۔ تو یہ قتل خطأ ہوگا اور اس کی دیت قتل خطأ کی دیت کی مثل ہوگی اور وہ آدمی جس نے کسی کو اپنے ارادہ سے قتل کیا تو اس پر قصاص ہوگا (4) اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھاری شئی کے ساتھ قتل کرنے کے سبب قصاص نہ ہونے پر دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کہ نفس اور غیر نفس میں لوہے کے بغیر قصاص نہیں ہے (5) (یعنی اگر کسی نے کسی کو جان سے مار دیا یا اسے زخم لگا دیا اگر اس نے یہ فعل لوہے کے ہتھیار کے ساتھ کیا ہے تو اس پر قصاص ہوگا ورنہ نہیں، مترجم) اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی معلی بن ہلال ہے اس کے بارے یحییٰ بن معین نے کہا ہے کہ وہ حدیثیں وضع کرتا ہے۔ جمہور نے یہ کہا ہے کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو پھر اسے اس معنی پر محمول کیا

1۔ صحیح بخاری: 2595 (ابن کثیر)   2۔ سنن ابن ماجہ: 2627 (علمیہ)   3۔ مشکوۃ المصابیح: 3488 (فکر)
4۔ سنن نسائی، جلد 8 صفحہ 39 (ریان)   5۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 88 (محاسن)

جائے گا کہ قصاص صرف تلوار کے ساتھ قتل کرنے کے سبب لازم ہوتا ہے کیونکہ یہ حدیث موجود ہے "لَا قَوَدَ اِلَّا بِالسَّیْفِ" (1) اور ایک روایت میں اِلَّا بِالسِّلَاحِ کے الفاظ بھی ہیں۔ اور اسے حضرت ابوہریرہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔ لیکن ان دونوں سے روایت کرنے والے راوی ابومعاذ سلیمان بن معاذ متروک ہیں۔ اسی طرح یہ ابوبکرہ اور نعمان بن بشیر سے بھی مروی ہے اور ان سے روایت کرنے والا راوی مبارک بن فضالہ ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اسی باب میں حضرت نعمان بن بشیر کی حدیث ہے کہ آپ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ہر قسم کا قتل خطأ ہے مگر وہ جو تلوار کے ساتھ مقتول ہو اور ہر خطأ میں چٹی ہوتی ہے (2) اور ایک روایت میں ہے ہر شئ خطا ہے مگر جو لوہے کے ساتھ ہو۔ (یعنی ہر قتل قتل خطأ ہے مگر جسے لوہے کے ساتھ قتل کیا جائے وہ قتل عمد ہے) ان دونوں حدیثوں کے راویوں میں جابر الجعفی کذاب ہے۔ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کیا اسی قسم کے ہتھیار کے ساتھ قصاص جائز ہوتا ہے جس کے ساتھ قاتل نے اسے قتل کیا ہے؟ تو اس کے بارے امام اعظم ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ قصاص صرف تلوار کے ساتھ ہی لیا جا سکتا ہے۔ اس روایت کی سند اور اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنے دوسرے قول میں یہ کہا ہے کہ قاتل اسی قسم کے ہتھیار سے قتل کیا جائے گا جس کے ساتھ اس نے خود قتل کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ اور قصاص کا معنی مساوات ہے۔ اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ اس سے قبل صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے کہ ایک یہودی نے ایک عورت کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل دیا اور اسے قتل کر دیا تو پھر رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح اس کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل دیا۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس نے کسی کو غرق کیا ہم اسے غرق کریں گے اور جس نے کسی کو جلایا ہم اسے جلا دیں گے۔ امام بیہقی نے اسے المعرفہ میں عمرو بن نوفل بن یزید بن البراء عن ابیہ عن جدہ سے نقل کیا ہے لیکن اس حدیث کی سند میں بعض راوی مجہول ہیں۔

ؔ صاحب قاموس نے کہا ہے کہ العفو کا معنی درگزر کرنا اور سزا کے مستحق کی سزا کو چھوڑ دینا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے عُفِیَ عَنْہُ ذَنْبُہٗ (اس کے گناہ سے درگزر کی گئی) اور عُفِیَ لَہٗ ذَنْبُہٗ (اس کا گناہ اس کے لئے معاف کر دیا گیا) اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ العفو، ذنب (گناہ) کی طرف بذات خود (بلا واسطہ) متعدی ہوتا ہے اور مجرم (جانی) کی طرف عن اور لام کے واسطہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ اس وضاحت کے مطابق ترکیب کلام میں مَنْ مبتدا ہے، چاہے شرطیہ ہو یا موصولہ ہو اور اس سے مراد قاتل ہے۔ اور مِنْ اَخِیْہِ میں مِنْ یا تو ابتداء کے لئے ہے اور ظرف لغو ہے اور اخ سے مراد خود مقتول کا وارث ہے۔ یا پھر مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی اصل عبارت ہے مِنْ دَمِ اَخِیْہِ یعنی اس میں مضاف محذوف ہے اور اخ سے مراد خود مقتول ہے۔ اور یہ ظرف مستقر ہے جو حال مقدم واقع ہو رہی ہے۔ اور شئ عفو کا مفعول بہ ہے فعل کو اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور اس سے مراد جنایۃ (جرم) ہے۔ معنی یہ ہوگا "مَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنَ الْقَاتِلِیْنَ شَیْءٌ مِّنَ الْجِنَایَۃِ کَائِنَۃً مِّنْ دَمِ اَخِیْہِ" (قتل کرنے والوں میں سے جس کو جرم معاف کر دیا گیا درآنحالیکہ وہ جرم اس کے بھائی کا قتل ہو) یا معنی اس طرح ہوگا "مَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ وَّلِیِّ الْمَقْتُوْلِ شَیْءٌ مِّنَ الْجِنَایَۃِ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ" (وہ آدمی جسے مقتول کے وارث کی جانب سے اس کا جرم معاف کر دیا جائے تو اسے

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 106 (محاسن) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 106 (محاسن)

چاہئے کہ وہ نیکی کی اتباع کرے)۔ اور علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عَفَا لازم ہے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ ترک کے معنی میں ہے اور شَيْءٌ اس کا مفعول بہ ہے یہ قول ضعیف ہے۔ کیونکہ عفا الشیء بمعنی تَرَكَ ثابت ہی نہیں بلکہ عُفِيَ عنه اس معنی میں ہے اور یہ عن کے واسطہ کے ساتھ جانی (مجرم) اور ذنب (جرم) کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ" اور وعَفَا عَنْهَا۔ (پہلی آیت میں جانی کی طرف متعدی ہے اور دوسری میں ذنب کی طرف) جب یہ ذنب کی طرف عن کے واسطہ سے متعدی ہو تو پھر جانی (مجرم) کی طرف لام کے واسطہ سے متعدی ہوتا ہے۔ مذکورہ آیت میں ترتیب یہی ہے گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ جس مجرم کو اس کے بھائی یعنی مقتول کے وارث کی جانب سے اس کی جنایۃ (جرم) میں سے کچھ معاف کر دیا جائے۔ تو اس صورت میں عفی مصدر کی طرف مسند ہوگا اور مِنْ اَخِيْهِ میں مِنْ ابتدائیہ ہوگا۔ عبارت اس طرح ہوگی "مَنْ عُفِيَ لَهٗ عَنْ جِنَايَةٍ مِّنْ جِهَةِ اَخِيْهِ يَعْنِيْ وَلِيَّ الدَّمِ شَيْءٌ مِّنَ الْعَفْوِ "(1) ان دونوں ترکیبوں کے مطابق شیٔ کا نکرہ ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جنایۃ کا بعض کا حصہ چھوڑا گیا ہے۔ یا پھر اس پر کہ بعض عفو موجود ہے کل عفو نہیں۔ اسی لئے فعل کی مصدر کی طرف اسناد صحیح ہے کیونکہ مفعول مطلق بیان نوع کے لئے ہے اور اس سے مراد عفو قلیل ہے جیسے اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا (ہم بھی تھوڑا سا گمان کرتے ہیں) لہٰذا یہ آیت اس معنی پر دلالت نہیں کرتی کہ جب مقتول کے تمام ورثاء کی جانب سے جنایت مکمل طور پر معاف ہو جائے تو پھر دیت واجب ہوتی ہے۔ اس لئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کے لئے اس آیت میں کوئی حجت نہیں۔ ازہری نے کہا ہے کہ دراصل عفو کا معنی فضل (فالتو شیٔ یا بچی ہوئی شیٔ) ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَؕ۔ (وہ آپ سے سوال کرتے ہیں وہ کیا خرچ کریں آپ فرما دیجئے عفو یعنی بچی ہوئی چیز) اسی طرح کہا جاتا ہے "عَفَوْتُ لِفُلَانٍ بِمَالِيْ" جب کوئی کسی کو اپنا فالتو مال دے دے تو اس وقت مذکورہ جملہ بولا جاتا ہے اور اسی معنی میں یہ جملہ بھی ہے "عَفَوْتُ لَهٗ عَنْ مَالِيْ عَلَيْهِ" اس صورت میں اخ سے مراد مقتول کا وارث ہے اور معنی یہ ہوگا کہ مقتول کے ورثاء میں سے جس کو اپنے بھائی یعنی قاتل کے مال میں سے کوئی شیٔ بطور صلح دی گئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے قاتل، مقتول یا مقتول کے وارث کو لفظ اخوۃ سے ذکر کیا ہے جو اخوت (بھائی چارہ) صرف جنسیت یا اسلام کے سبب ثابت ہے تاکہ وہ اس کے لئے نرم ہو جائے اور اس پر مہربان ہو۔ تو اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قاتل قتل کے سبب کافر نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قاتل اور مقتول کے درمیان اخوتِ اسلامیہ کا ذکر کیا ہے اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے خطاب یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو) سے کیا ہے۔

ح یعنی چاہئے کہ مقتول کے وارث کی جانب سے اتباع (قبول) ہو جائے۔ یا معنی یہ ہے کہ مقتول کے وارث کے لئے اتباع کا حکم ہے۔ یعنی وہ سختی اور درشتی کا اظہار نہ کرے۔ اور قاتل پر ہے کہ وہ مقتول کے وارث کو ٹال مٹول کئے بغیر خون بہا ادا کرے۔

ط صلح کے جواز کا یہ مذکورہ حکم یا بعض وارثوں کے معاف کر دینے کے بعد بعض ورثاء کے لئے دیت کے وجوب کا حکم تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ ابن جریر نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت پر رحم فرمایا اور انہیں دیت کا مال عطا فرمایا اور ان کے لئے اسے حلال قرار دیا جبکہ اس سے قبل کسی کے لئے اسے حلال نہیں کیا۔ اہل تورات پر یا تو قصاص ہوتا تھا یا پھر معاف کر دینا۔ ان کے درمیان دیت نہیں تھی اور اہل انجیل کو صرف خون معاف کرنے کا حکم تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 455-456 (علمیہ)

قتل، عفو اور دیت تینوں امور جائز قرار دیئے۔(1)

1۔ یعنی جس نے معاف کر دینے کے بعد یا دیت لے لینے کے بعد پھر قتل کیا تو اس کے لئے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ جیسا کہ ابوشریح خزاعی کی حدیث میں گزر چکا ہے کہ اگر کسی نے دیت یا عفو میں سے کوئی چیز اختیار کر لی پھر اس کے بعد اس نے حد سے تجاوز کیا تو اس کے لئے جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ ابن جریج نے کہا ہے ایسے آدمی کا قتل دنیا میں لازم ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کی جانب سے معافی بھی قبول نہ کی جائے۔(2) جیسا کہ سمرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دیت لینے کے بعد قتل کیا میں اسے ہرگز معافی نہیں دوں گا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔(3)

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

"اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقلمندو!1 تاکہ تم (قتل کرنے سے) پرہیز کرنے لگو 2"

1۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے قصاص کو معرفہ ذکر کیا ہے اور حیٰوۃ کو نکرہ، تاکہ اس پر دلالت کرے کہ حکم کی اس جنس میں زندگی کی عظیم نوع موجود ہے اور وہ اس طرح ہے کہ قصاص کا علم قاتل کو قتل سے باز رکھتا ہے تو اس طرح یہ دو نفسوں کی زندگی کا سبب بن جاتا ہے اور اس لئے بھی کہ عہد جاہلیت میں وہ قاتل کے علاوہ دوسرے کو مار دیتے تھے اور کبھی ایک کے بدلے پوری پوری جماعت کو قتل کر ڈالتے تھے۔ نتیجتاً بہت بڑا فتنہ برپا ہو جاتا تھا۔ تو جب قاتل سے قصاص لیا گیا تو بقیہ لوگوں کی جانیں محفوظ ہو گئیں۔ اسی طرح یہ قصاص ان تمام کی زندگیوں کا سبب بن جائے گا۔ پہلی تفسیر کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہوگی "وَلَكُمْ فِيْ شَرْعِ الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ" (تمہارے لئے قصاص کے مشروع ہونے میں زندگی ہے) اور دوسری تفسیر کے مطابق عبارت یہ ہو گی "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ لِلْبَاقِيْنَ" (تمہارے لئے قصاص میں باقی لوگوں کے لئے زندگی ہے) اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ قاتل کے لئے قصاص میں حیات اخروی ہے کیونکہ جب دنیا میں اس سے قصاص لے لیا جائے گا تو پھر آخرت میں اس کا مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ تو گویا وہ وہاں پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رہے گا اور اللہ تعالیٰ نے یہاں خطاب اہل عقل کو فرمایا اس لئے کہ وہی احکام شرعیہ کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔

2۔ تاکہ تم قصاص کے خوف سے قتل سے پرہیز کرو یا تاکہ تم قصاص کے سبب عذاب آخرت سے بچ جاؤ یا تاکہ تم قصاص کی حکمت پر اطلاع پانے کے سبب اسے ترک کرنے سے باز رہو۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۚۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

"فرض کیا گیا ہے تم پر جب قریب آ جائے تم میں سے کسی کے موت۔ بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال 1 کہ وصیت کرے اپنے ماں باپ کے لئے اور قریبی رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ 2 ایسا کرنا ضروری ہے پرہیزگاروں پر 3"

1۔ یعنی جب موت کے اسباب ظاہر ہو جائیں اور اس کے قریب ہونے کا ظن غالب ہو جائے۔ "اِنْ تَرَكَ خَيْرًا" اگرچہ یہاں صیغہ ماضی کا مذکور ہے مگر مراد مستقبل ہے یعنی اگر اس کے لئے ایسا مال ہو جسے وہ چھوڑے گا یہاں خیر سے مراد مال ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ (اور جو مال تم خرچ کرو) مزید فرمایا: وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (اور بلاشبہ وہ مال کی محبت

1۔ مسند الفردوس، جلد 1، صفحہ 317 (علمیہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 209 (فکر)　3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 253 (وزارت تعلیم)

میں بڑا سخت ہے۔) اور یہ قول بھی ہے کہ خیر سے مراد مال کثیر ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے آزاد کردہ ایک غلام نے وصیت کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے پاس نو سو درہم تھے۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے وصیت سے روک دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنۡ تَرَكَ خَيۡرًا اور خیر سے مراد مال کثیر ہے۔ اسے ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں نقل کیا ہے اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے وصیت کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے اس سے پوچھا تیرا مال کتنا ہے؟ اس نے کہا تین ہزار درہم۔ پھر آپ رضی اللہ عنہا نے اس سے پوچھا تیرے گھر کے کتنے افراد ہیں؟ اس نے کہا چار افراد ہیں۔ تو پھر آپ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اِنۡ تَرَكَ خَيۡرًا اور تیرا یہ مال بہت تھوڑا ہے تو اسے اپنے اہل وعیال کے لئے ہی چھوڑ دے۔(1)

ع "اَلۡوَصِيَّةُ" كُتِبَ فعل مجہول کا نائب الفاعل ہے۔ یہاں ترجیح کی بناء پر فعل کو مذکر ذکر کیا گیا ہے حالانکہ مؤنث لانا بھی جائز ہے۔ ایک اور اس کی علت یا تو یہ ہے کہ فعل اور نائب فاعل کے درمیان فاصلہ موجود ہے۔ یا پھر اس لئے کہ وصیۃ اَنۡ يُّوۡصِيَ یا الایصاء مصدر کی تاویل میں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ فمن بدلہ کے قول میں اس کی طرف راجع ضمیر بھی مذکر ذکر فرمائی اور اذا ظرف میں عامل کتب فعل کا مدلول الاعتراض ہے۔ الوصیۃ اس کا عامل نہیں بن سکتا کیونکہ ظرف اس سے مقدم ہے اور مصدر اپنے سے مقدم کے لئے عامل نہیں بن سکتا اور لِلۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ وصیت کے متعلق ہے۔ ابتدائے اسلام کے وقت اس آیت کے مطابق اقارب کے لئے وصیت کرنا فرض تھی پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ علماء نے کہا ہے کہ یہ آیت آیت مواریث سے منسوخ ہے اور حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق عطا کر دیا ہے۔ خبردار! "وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں"(2) لیکن یہ بات محل نظر ہے کیونکہ آیت مواریث اس آیت کے معارض نہیں بلکہ اس حکم کو مزید پختہ کرتی ہے کیونکہ وہ تو وراثت پر وصیت کو مقدم کرنے پر دلالت کرتی ہے تو پھر وہ اس کے لئے ناسخ کیسے ہو سکتی ہے؟ اور رہی حدیث طیبہ تو یہ خبر واحد ہے اور خبر واحد سے کتاب کا نسخ جائز نہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ اس آیت کا حکم منسوخ ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ ورثاء کی رضا کے بغیر کسی وارث کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں۔ اور اس پر بھی ائمہ اربعہ اور جمہور علماء متفق ہیں کہ رشتہ داروں میں سے ایسے آدمی کے لئے وصیت کرنا واجب نہیں جو وارث نہ ہو۔ اور زہری، ابوبکر حنبلی اور بعض اصحاب ظواہر سے اقارب میں سے غیر وارث کے حق میں وصیت واجب ہونے کے بارے میں جو کچھ مروی ہے اس کا اعتبار نہیں کیونکہ ان کا موقف جمہور کے خلاف ہے اور جب اجماع ثابت ہو گیا تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پاس ایسی دلیل قطعی ثابت ہے جو آیت کے لئے ناسخ ہو سکتی ہے، تب ہی انہوں نے کتاب کی نص کو چھوڑ دیا ورنہ وہ اسے قطعاً نہ چھوڑتے، اگرچہ وہ دلیل ناسخ قطعی طریقے سے ہم تک نہیں پہنچی۔ اور ہم یہاں کئی ایسی احادیث بیان کریں گے جو اجماع کیلئے سند ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خطبہ حجۃ الوداع کے دوران رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق عطا کر دیا ہے پس وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں(3) اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اس کی اسناد حسن ہیں۔ اسی طرح امام احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اس کو عمرو بن خارجہ سے نقل کیا ہے۔ ابن ماجہ نے سعید بن ابی سعید کے واسطہ سے حضرت انس رضی اللہ

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 319 (علمیہ) 2۔ مشکوۃ المصابیح: 3073 (فکر) 3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2120 (علمیہ)

عنہ کی حدیث بھی روایت کی ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شافعی عن ابن عیینہ عن سلیمان الاحول عن مجاہد کی سند سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں (1) اور دارقطنی نے اسے حدیث جابر سے روایت کیا ہے اور اس سند کے اعتبار سے اس کے مرسل ہونے کو درست قرار دیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے اور سند حسن کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا۔ اور دارقطنی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں مگر جبکہ دیگر ورثاء اس کی اجازت دیں (2) انہی الفاظ کے ساتھ ابوداؤد نے اسے عطاء خراسانی سے مرسل روایت کیا ہے اور یونس بن راشد نے اسے اس متصل سند سے بیان کیا ہے۔ "عن عطاء عن عکرمة عن ابن عباس" اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ مذکورہ تمام احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ورثاء کے حق میں یہ آیت منسوخ ہے۔ لیکن اقارب میں سے غیر ورثاء کے حق میں یہ احادیث نہ تو وصیت کی نفی پر دلالت کرتی ہیں اور نہ اس کے اثبات پر اور وصیت کے واجب نہ ہونے کے بارے میں ابن جوزی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اس آدمی کا حق نہیں ہے جو دو راتیں گزارتا ہے (3) یا مسلم کی روایت کے مطابق تین راتیں گزارتا ہے اور اس کے پاس مال ہے جس میں وہ وصیت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے مگر یہ کہ اس کی وصیت لکھی گئی ہے (4) (یعنی وصیت کا ثواب اور اجر اسے مل جائے گا) متفق علیہ۔ اس میں وجہ استدلال یہ ہے کہ آپ نے وصیت کو ارادہ کے ساتھ معلق قرار دیا ہے تو یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وصیت واجب نہیں ہو اللہ اعلم۔

جو ہم نے ذکر کیا ہے اس پر علماء کا اتفاق ہے اور اقارب میں سے غیر وارث کے لئے وصیت کے جائز ہونے پر اتفاق اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اجنبی کی طرح ہے بلکہ رشتہ دار کے بارے وصیت کرنا اولی اور زیادہ پسندیدہ ہے کیونکہ ذی رحم کو صدقہ دینا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ مال کے تہائی سے زیادہ میں وصیت جائز نہیں ہے مگر وارثوں کی رضا کے ساتھ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس استثناء میں اختلاف کیا ہے اور آپ کے ایک قول کے مطابق ورثاء کی رضامندی کے ساتھ بھی ثلث سے زائد میں وصیت جائز نہیں۔ اس بارے میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں میری سخت تکلیف کی حالت میں رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لئے تشریف لائے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ درد اور تکلیف اتنی شدت اختیار کر چکی ہے جیسے آپ ﷺ ملاحظہ فرما رہے ہیں، میں چاہتا ہوں کیا اپنے سارے مال کی وصیت کر دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کی پھر نصف مال کی، آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ پھر میں نے عرض کی کیا مال کے تیسرے حصے کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں تیسرے حصے کی۔ پھر فرمایا تیسرا حصہ بھی زیادہ ہے تیرا اپنے ورثاء کو مالدار اور غنی چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تو انہیں اتنا تنگ دست چھوڑے کہ وہ لوگوں سے بھیک مانگنے لگیں، متفق علیہ (5) اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری نیکیوں میں اضافہ کرنے کے لئے تمہاری وفات کے وقت تمہارے مال کا تیسرا حصہ تمہیں دے دیا ہے تاکہ اسے تمہارے مالوں کی زکوٰۃ بنا دیا جائے۔ اسے دارقطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے (6) اس کی سند میں ایک راوی اسماعیل بن عیاش اور اس کا شیخ دونوں ضعیف ہیں۔ امام احمد

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 97 (محاسن) 2۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 94 (محاسن) 3۔ صحیح بخاری: 2587 (ابن کثیر)
4۔ صحیح مسلم، جلد 11 صفحہ 84 (علمیہ) 5۔ صحیح بخاری: 2591 (ابن کثیر) 6۔ سنن الدارقطنی، جلد 4، صفحہ 150

رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حضرت ابوالدرداء کی حدیث سے اور ابن ماجہ، بزار اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے(1) لیکن ان کی اسناد ضعیف ہیں۔ اس بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک روایت عقیلی نے حفص بن عمرو کی سند سے نقل کی ہے لیکن وہ متروک ہے۔ "بِالْمَعْرُوْفِ" سے مراد یہ ہے کہ بعض اقرباء کو بعض پر ترجیح نہ دے اور نہ ہی ایسا کرے کہ غنی کے لئے وصیت کرے اور فقیر کو چھوڑ دے۔

۳؎ "حقًا" مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے یعنی حَقَّ حَقًّا یا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی جَعَلَ اللّٰهُ الْوَصِيَّةَ حَقًّا "اللہ نے وصیت کو پرہیزگاروں پر ضروری قرار دیا ہے۔"

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِیْنَ یُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۸۱﴾

"پھر جو بدل ڈالے اس وصیت کو سن لینے کے بعد تو اس کا گناہ انہیں بدلنے والوں پر ہوگا بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے ۱؎"

۱؎ پس وصیتوں، وارثوں اور گواہوں میں سے جو کوئی اس وصیت کو بدل ڈالے وصیت کرنے والے کا قول سننے کے بعد یا اپنے پاس وصیت کے پہنچنے اور محقق ہو جانے کے بعد تو اس تبدیل شدہ وصیت کا گناہ یا اس تبدیلی کا گناہ انہی پر ہوگا جو اسے تبدیل کرتے ہیں بیشک اللہ تعالیٰ اسے سننے والا ہے جس کی موصی نے وصیت کی ہے اور اس میں تبدیلی کرنے والے کی تبدیلی کو جاننے والا ہے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَیْنَهُمْ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۸۲﴾

"اور جسے اندیشہ ہو وصیت کرنے والے سے کسی طرفداری یا گناہ کا ۱؎ پس وہ صلح کرادے ان کے درمیان ۲؎ تو کچھ گناہ نہیں اس پر ۳؎ بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۴؎"

۱؎ یہاں خاف توقع اور علم کے معنی میں ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدود کو۔) یعنی جسے یہ اندیشہ اور توقع ہو۔ وصیت کرنے والے کی جانب سے حمزہ، کسائی، ابوبکر اور یعقوب نے مُوَصٍّ کو باب تفعیل بناتے ہوئے واؤ کو مفتوح اور صاد کو مشدد پڑھا ہے اور باقیوں نے باب افعال سے واؤ کو سکون اور صاد کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ جَنَفًا سے مراد خطاً حق سے روگردانی کرنا ہے اور اثماً کا معنی جان بوجھ کر ظلم کرنا ہے۔

۲؎ پس وہ ان کے درمیان صلح کرادے۔ مجاہد نے کہا ہے اس کا معنی ہے جب کوئی مریض کے پاس حاضر ہو اور وہ وصیت کر رہا ہو پس وہ اسے دیکھے کہ وہ حق سے پھر رہا ہے۔ تو اسے چاہئے کہ وہ اسے نیکی (حق) کا حکم دے اور منکر (بے راہروی) سے روکے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو مال کے تیسرے حصہ سے زائد میں وصیت کرنے سے روک دیا تھا۔ اور حضرت علی اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما نے اصل وصیت سے ہی روک دیا تھا۔ اور حضرت نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ ان کے والد محترم انہیں لے کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: میں نے اپنے اس بیٹے کو (کچھ) غلام دیئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے اپنی ساری اولاد کو ایسی ہی مثل دیا ہے۔ انہوں نے عرض کی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر اسے بھی واپس

1۔ سنن ابن ماجہ:2709(علمیہ)

لوٹا لو۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا میں تو ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا، متفق علیہ (1) اور دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے جب میت اپنی وصیت میں خطا کرے یا دانستہ زیادتی کرے تو اس کے وارث، وصی یا مسلمانوں کے حاکم کو یہ اختیار ہے کہ وہ اس وصیت کو عدل اور حق کی طرف پھیر دے اور باطل وصیت کو نافذ نہ کرے۔ میں کہتا ہوں اولیٰ یہ ہے کہ ایسا معنی مراد لیا جائے جو دونوں معنوں کو شامل ہو۔

ے تو اس پر کوئی گناہ نہیں بلکہ یہ گناہ وصیت کرنے والے پر ہوگا اور صلح کرانے والے کے لئے صلح کرانے کا اجر ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مرد اور عورت دونوں ساٹھ برس تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کا عمل کرتے رہتے ہیں۔ پھر جب ان دونوں کو موت آتی ہے تو وہ دونوں وصیت کرنے میں نقصان پہنچاتے ہیں۔ نتیجتاً ان دونوں کے لئے جہنم واجب ہو جاتی ہے (2) اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن کہا ہے۔ اس مقام پر فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ اس لئے فرمایا ہے کیونکہ یہ فعل (یعنی وصیت کو تبدیل کرنا) ان افعال کی جنس میں سے ہے جو آدمی کو گنہگار بنا دیتے ہیں۔ لہٰذا یہاں گناہ کی نفی کر دی گئی ہے (کیونکہ یہاں صلح کی تبدیلی اصلاح اور ایصال الی الحق کے لئے ہے) کلبی نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ الآیۃ نازل ہونے کے بعد ورثاء اور اوصیاء میت کی وصیت کو نافذ کر دیتے تھے اگرچہ وہ اس کے سارے مال کو محیط ہوتی اور ورثاء کے لئے کوئی شئ بھی باقی نہ بچتی، لہٰذا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا الآیہ کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ (3)

ے بیشک اللہ تعالیٰ مغفرت فرمانے والا بہت رحم کرنے والا ہے۔ یہ صلح کرانے والے کے لئے مغفرت و رحم کا وعدہ ہے۔ یہاں مغفرت کا ذکر کیا کیونکہ یہی اثم (گناہ) کے ذکر کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے و اللہ اعلم۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾

"اے ایمان والو! فرض کئے گئے ہیں تم پر روزے ۱؎ جیسے فرض کئے گئے تھے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے ۲؎ کہ کہیں تم پرہیزگار بن جاؤ ۳؎ "

۱؎ كُتِبَ کا معنی ہے فُرِضَ۔ اے ایمان والو! فرض کئے گئے ہیں تم پر روزے۔ صوم کا لغوی معنی ہے رکنا۔ جب عین دوپہر کا وقت ہو جائے تو کہا جاتا ہے صَامَ النَّهَارُ (دن رک گیا) کیونکہ سورج جب آسمان کے وسط میں پہنچتا ہے تو ایسے دکھائی دیتا ہے گویا وقت ٹھہر گیا ہے۔ اصطلاح شرع میں روزے کی تعریف یہ ہے: "اَلْاِمْسَاكُ عَنِ الْاَكْلِ وَالشُّرْبِ وَالْجِمَاعِ مَعَ النِّيَّةِ فِيْ وَقْتٍ مَخْصُوْصٍ" (روزے کی نیت سے مخصوص وقت میں کھانے، پینے اور جماع سے رکنا ہے) جیسا کہ اس کے بعد اس کی وضاحت آئے گی۔

۲؎ جیسے فرض کئے گئے تھے ان انبیاء اور امتوں پر جو تم سے پہلے تھیں اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ تشبیہ نفس وجوب میں ہے اور یہ کلام کیفیت، وقت اور دیگر ہر جہت سے کلی مشابہت کا تقاضا نہیں کرتا۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے ہم سے پہلے لوگوں کا روزہ ایک دن

1۔ صحیح مسلم، جلد 11 صفحہ 58 (علمیہ) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2117 (علمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 213 (فکر)

کی رات کے شروع سے لیکر دوسرے دن کی رات آنے تک ہوتا تھا اور ابتدائے اسلام میں بھی اسی طرح تھا۔ لہٰذا یہ روزہ اس کے مشابہ ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ رمضان المبارک کے روزے نصاریٰ پر اسی طرح واجب تھے جیسے ہم پر فرض کئے گئے۔ پس بسا اوقات وہ شدید گرمی کے موسم میں آتے تھے تو سخت پیاس کی وجہ سے وہ ان کے لئے مشکل ہوا کرتے تھے اور کبھی سخت سردی میں آتے اور وہ بھوک کے سبب ان پر شاق گزرتے تھے۔ لہٰذا ان کے علماء اور رؤساء جمع ہوئے اور انہوں نے موسم بہار میں روزے رکھنے پر اجماع کر لیا اور اپنے اس عمل کے کفارہ کے لئے اپنی طرف سے دس روزوں کا اضافہ کر دیا۔ لہٰذا روزوں کی کل تعداد چالیس ہو گئی۔ پھر ان کا بادشاہ بیمار ہو گیا تو اس نے یہ نذر مانی کہ اگر وہ اپنی مرض سے صحت یاب ہو گیا تو وہ روزوں میں ایک ہفتے کا اضافہ کرے گا۔ چنانچہ وہ صحت یاب ہو گیا تو اس نے ان میں ایک ہفتے کا اضافہ کر دیا۔ پھر ایک دوسرا ان کا بادشاہ بنا۔ اس نے کہا تم مکمل پچاس دن کے روزے رکھو(1) مجاہد نے کہا ہے: ایک دفعہ ان میں وباء پھیل گئی اور کثرت سے لوگ مرنے لگے چنانچہ انہوں نے کہا تم اپنے روزوں میں اضافہ کر دو۔ لہٰذا انہوں نے دس روزے پہلے بڑھا دیئے اور دس اس کے بعد۔ حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اگر میں سارا سال روزے رکھوں تو بالیقین اس دن افطار کروں گا جس میں شک کیا جاتا ہے۔ یعنی اس کے بارے کہا جاتا ہے کہ یہ شعبان سے متعلق ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ رمضان میں سے ہے اور اس لئے ہے کہ نصاریٰ پر رمضان المبارک کے روزے فرض کئے گئے تو انہوں نے تیس سے پہلے ایک دن روزہ رکھا اور تیس کے بعد بھی ایک دن۔ پھر اسی طرح وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ ان کے روزوں کی تعداد پچاس تک پہنچ گئی۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے(2) اور ابن جریر نے سدی سے بھی اسے بیان کیا ہے۔

ہے تا کہ تم گناہوں سے بچ جاؤ کیونکہ روزہ شہوت کو ختم کر دیتا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جو نکاح کی طاقت رکھتا ہو اسے چاہئے کہ وہ نکاح کرے کیونکہ نکاح نگاہوں کو جھکا دیتا ہے اور شرمگاہ کو محفوظ کر دیتا ہے اور جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ روزے رکھے۔ متفق علیہ(3) اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے تا کہ تم روزے میں خلل ڈالنے سے بچو۔ (یعنی جب تک روزے فرض نہیں تھے بھی رکھتے تھے اور کبھی نہیں لیکن اب ایسا کرنا بھی درست نہیں کیونکہ روزے فرض ہو چکے ہیں)۔

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾

"یہ گنتی کے چند روز ہیں۱ پھر جو تم میں سے بیمار ہو۲ یا سفر میں ہو۳ تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے۴ اور جو لوگ اسے بہت مشکل سے ادا کر سکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے۵ ایک مسکین کا کھانا۶ اور جو خوشی سے زیادہ نیکی کرے تو وہ اس کے لئے زیادہ بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا ہی بہتر ہے تمہارے لئے۷ اگر تم جانتے ہو۸"

۱ "ایّاما" یہ فعل مقدر کے سبب منصوب ہے۔ یعنی صوموا ایّاماً۔ گویا یہ صوموا فعل کا مفعول فیہ ہے۔ یہ الصیام مصدر کی وجہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 213 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 214 (فکر) 3۔ صحیح بخاری: 4779 (ابن کثیر)

سے منسوب نہیں کیونکہ ان دونوں کے مابین اجنبی الفاظ سے فاصلہ ہے۔ "مَعْدُوْدٰتٍ" یعنی چند دن۔ کیونکہ عرفاً قلیل کو ہی شمار کیا جاتا ہے کثیر کو نہیں۔ یہ قول بھی ہے کہ ان ایام سے مراد ہر مہینے میں تین دن روزے رکھنا اور یوم عاشوراء کا روزہ ہے کیونکہ ہجرت کی ابتداء میں ربیع الاول سے لیکر رمضان المبارک کے مہینے تک سترہ ماہ تک یہ روزے واجب رہے پھر رمضان کے روزوں کے سبب منسوخ ہو گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے ہجرت کے بعد سب سے پہلے جو حکم منسوخ ہوا وہ قبلہ اور روزے کا حکم ہے اور کہا جاتا ہے کہ رمضان المبارک کے روزوں کا حکم غزوۂ بدر سے ایک مہینہ اور کچھ دن پہلے نازل ہوا (1) اور غزوۂ بدر ہجرت کے دوسرے سال رمضان کی سترہ تاریخ جمعہ کے دن ہوا۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عاشوراء کے دن روزہ رکھنے کا حکم دیا کرتے، پھر جب رمضان المبارک کے روزے فرض ہوئے تو جو چاہتا روزہ رکھ لیتا اور جو چاہتا نہ رکھتا، متفق علیہ (2) حضرت سلمہ بن اکوع سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو بھیجا کہ وہ لوگوں میں جا کر اعلان کر دے آج عاشوراء کا دن ہے لہٰذا جو کھا چکا ہے وہ اپنے روزے کو مکمل کرے اور جس نے کچھ نہیں کھایا وہ نہ کھائے کیونکہ آج کا دن عاشوراء کا دن ہے۔ (لہٰذا وہ روزے کی نیت کر لے) متفق علیہ (3) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔ اور یہ آیت منسوخ نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ علماء کے اقوال میں سے ارجح قول یہ ہے کہ یوم عاشوراء کا روزہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کبھی بھی فرض نہیں رہا، بلکہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے اجتہاد سے اسے مستحب قرار دیا پھر آپ ﷺ یہ روزہ رکھا کرتے تھے اور اپنی عادت مبارکہ کے مطابق اس کا حکم دیتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ یہودی یوم عاشوراء کا روزہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ بہت اچھا اور نیک دن ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمنوں سے نجات عطا فرمائی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے روزہ رکھا۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمہاری نسبت موسیٰ علیہ السلام کا زیادہ حق رکھتا ہوں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور اس دن کے روزے کا حکم بھی فرمایا، متفق علیہ (4) حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عہد جاہلیت میں عاشوراء کے دن قریش روزہ رکھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ بھی عہد جاہلیت میں روزہ رکھتے تھے۔ پس جب آپ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے یہ روزہ رکھا اور اس دن کے روزے کا حکم بھی فرمایا۔ پھر جب رمضان المبارک کے روزے فرض کئے گئے تو آپ ﷺ نے عاشوراء کا روزہ رکھنا چھوڑ دیا، متفق علیہ (5) علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ احمد، ابوداؤد اور حاکم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ یوم عاشوراء اور ہر مہینے میں تین دن روزے رکھنا اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے واجب تھے اور وہ اس آیت کے ساتھ منسوخ ہو گئے، اور اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد رمضان المبارک کا مہینہ ہے اور کوئی نہیں واللہ اعلم۔

ے پس وہ آدمی جسے اپنی بیماری کے زیادہ ہونے یا طویل ہونے کا خوف ہو۔ اسی طرح وہ آدمی جو مریض کے حکم میں ہو یعنی وہ ضعیف ہو اور اسے روزے کے سبب مرض لاحق ہونے کا ظن غالب ہو یا عورت حاملہ یا دودھ پلانے والی ہو اور ان دونوں کو روزے کے سبب اپنی جان یا بچے کی زندگی کا خطرہ ہو۔ جاننا چاہئے کہ مریض کے لئے روزہ افطار کرنا جائز ہے اور اس پر اجماع ہے۔ مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 214 (فکر)
2۔ صحیح بخاری: 1897 (ابن کثیر)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 257 (وزارت تعلیم)۔
4۔ صحیح بخاری: 1900 (ابن کثیر)
5۔ صحیح بخاری: 1898 (ابن کثیر)

نے کہا ہے کہ مریض کے لئے جماع کے سبب روزہ افطار کرنا جائز نہیں، البتہ کھانے پینے کے ساتھ جائز ہے اور اگر مریض یا مسافر نے جماع کیا تو اس پر آپ کے نزدیک کفارہ ہوگا۔ ہاں اگر جماع سے پہلے کسی اور سبب سے روزے کو افطار کر دیا تو پھر کفارہ نہیں ہوگا اور مریض کے لئے ہم نے جو مرض کی زیادتی یا مرض کی طوالت کی قید ذکر کی ہے اس پر بھی تمام کا اتفاق ہے۔ مگر ابن سیرین نے کہا ہے چونکہ آیت مطلق ہے اس لئے صرف اتنے مرض کے سبب روزہ افطار کرنا مباح ہے جسے مرض کا نام دیا جا سکے۔ اور حسن اور ابراہیم نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد اتنی بیماری ہے جس کے ساتھ بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہو جاتی ہے۔

ے یا سفر میں ہو۔ اس میں یہ ارشاد موجود ہے کہ جس کسی نے صبح روزہ رکھا پھر دن کے درمیان میں سفر اختیار کیا تو وہ روزہ افطار نہ کرے۔ اور اس پر اجماع ہے مگر وہ روایت جو داؤد ظاہری سے مروی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ سفر میں روزہ افطار کرنا جائز ہوتا ہے چاہے سفر کم ہو یا طویل ہو۔ سفر کی وہ مقدار جس کے سبب روزہ افطار کرنے اور نماز قصر کرنے کی رخصت دی گئی ہے اس میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے۔ حضرت امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ کم سے کم مسافت سفر سولہ فرسخ یعنی چار برید ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اہل مکہ! چار برید سے کم مسافت میں نماز قصر نہ کرو اور چار برید مکہ سے عسفان تک ہے۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے(1) اس کی سند میں راوی اسماعیل بن عیاش ضعیف ہے اور عبدالوہاب تو بہت زیادہ ضعیف ہے۔ امام احمد اور یحییٰ نے کہا ہے کہ عبدالوہاب کوئی شی نہیں ہے۔ ثوری نے کہا ہے وہ کذاب ہے اور نسائی نے کہا ہے کہ وہ متروک الحدیث ہے۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے ایک دن کی مسافت ہو تو نماز قصر کی جا سکتی ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس کی مقدار تین دن اور تین رات کی وہ مسافت ہے جو اونٹ کی چال اور پیدل چل کر طے کی جائے۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اتنی مقدار مقرر کی ہے جو دو دنوں اور تیسرے دن کے اکثر حصہ میں چل کر طے کی جائے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آپ سے مسح علی الخفین کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے کہا کہ "رسول اللہ ﷺ نے مسافر کے لئے مسح کی مدت تین دن اور تین راتیں مقرر کی ہیں اور مقیم کے لئے ایک دن اور ایک رات" (2) اسے مسلم نے روایت کیا ہے یہ حدیث صحیح ہے لیکن اس سے استدلال کرنا ضعیف ہے۔ آیت کا مطلق ہونا اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ اگرچہ سفر معصیت اور گناہ کے لئے بھی ہو وہ بھی روزے کی افطاری کو مباح کر دیتا ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ معصیت کا سفر ہو تو روزے کو افطار کرنا مباح نہیں۔ ان کا استدلال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہے: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ (لیکن جو مجبور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والے۔) حق بات یہ ہے کہ بغاوت اور عدوان نفس سفر میں داخل نہیں بلکہ سفر کے متعلقات میں سے ہیں اور غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کی تفسیر میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس میں ان ائمہ کا استدلال موجود نہیں۔

ے تو اس پر فرض ہے یا واجب ہے کہ وہ اپنی بیماری اور سفر کے دنوں کے روزے دوسرے دنوں میں رکھ لے اگر اس نے پہلے افطار کئے ہیں۔ یہاں کلام میں فعل یا مبتدا اور مضاف و مضاف الیہ اور شرط محذوف ہے کیونکہ اسے دلالت مقام کے سبب جانا جا سکتا ہے، لہٰذا تقدیر عبارت یہ ہے "فَكُتِبَ عَلَيْهِ اَوْ فَالْوَاجِبُ عَلَيْهِ صِيَامُ عِدَّةِ اَيَّامِ مَرَضِهٖ وَسَفَرِهٖ مِنْ اَيَّامٍ اُخَرَ اِنْ اَفْطَرَ" اور آیت کے

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 387 (محاسن)　　2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 135 (وزارت تعلیم)

مطلق ہونے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قضا روزوں کو لگاتار رکھنا شرط نہیں اور اسی پر اجماع بھی منعقد ہے اور داؤد ظاہری نے کہا ہے کہ قضا روزوں کو مسلسل رکھنا واجب ہے۔ آیت کے مطلق ہونے کی تائید حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی کرتی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے رمضان کی قضا کے بارے ارشاد فرمایا اگر آدمی چاہے تو متفرق روزے رکھے اور اگر چاہے تو لگاتار رکھے(1) اسے دار قطنی نے متصل اور مرسل روایت کیا ہے اور محمد بن منکدر کی حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے رمضان المبارک کے قضا روزوں کو متفرق طور پر رکھنے کے بارے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کا اختیار تیرے پاس ہے جیسے چاہو رکھو، الحدیث(2) اسے دار قطنی نے مرسل روایت کیا ہے اور اس کی اسناد حسن ہیں۔ یہ موصولاً بھی مروی ہے لیکن ثابت نہیں۔ دار قطنی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے، اس کی سند میں واقدی اور ابن لہیعہ دو راوی ضعیف ہیں۔ سعید بن منصور نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کی ہے اور امام بیہقی نے ابو عبیدہ، معاذ بن جبل، انس، ابو ہریرہ اور رافع بن خدیج رضی اللہ عنہم کی حدیث نقل کی ہے۔ اور داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آپ نے فرمایا جس آدمی پر رمضان المبارک کے روزے ہوں اسے چاہئے کہ وہ انہیں مسلسل رکھے انہیں متفرق نہ کرے اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے(3) اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن ابراہیم بن العاص ہے۔ اس کے بارے ابن معین نے کہا ہے لَيْسَ بِشَيْءٍ: یہ کوئی شئی نہیں اور دار قطنی نے کہا ہے ضعیف ہے، قوی نہیں ہے۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کے بارے اختلاف ہے کہ جب وہ روزے نہ رکھیں تو کیا ان پر قضا کے ساتھ فدیہ بھی واجب ہوگا یا نہیں؟ جبکہ اس مسئلہ پر تو اتفاق ہے کہ اگر مریض یا مسافر نے روزے نہ رکھے تو ان پر قضا کے ساتھ فدیہ واجب نہیں ہوگا۔ تو حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ ان عورتوں پر فدیہ واجب نہیں ہوگا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے اور آپ سے ایک روایت یہ ہے کہ دودھ پلانے والی پر فدیہ واجب ہوگا لیکن حاملہ پر نہیں۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا راجح مذہب یہ ہے کہ ان پر فدیہ واجب ہوگا۔ لیکن ایسی کوئی سند نہیں جس پر اس قول کے لئے اعتماد کیا جا سکتا ہو یا جو کچھ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت پر کفارہ واجب ہوتا ہے، قضا نہیں۔ اور وہ آدمی جس نے بغیر عذر کے رمضان المبارک کے قضا روزوں میں تاخیر کر دی یہاں تک کہ دوسرا رمضان آ گیا تو اس کے لئے امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس پر قضا کے ساتھ فدیہ بھی واجب ہوگا۔ لیکن امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس پر صرف قضا واجب ہوگی۔ اگرچہ اس نے کئی سالوں کے بعد ان کی قضا کی، کیونکہ قطعی دلیل کے بغیر کتاب اللہ پر زیادتی ممنوع ہے اور وہ آدمی جس نے مرض یا سفر کے عذر کے سبب قضاء کو مؤخر کر دیا یہاں تک کہ دوسرا رمضان آ گیا تو اس پر بالاجماع صرف قضا واجب ہوگی۔ عبدالرزاق، ابن منذر اور دیگر محدثین نے صحیح سند کے ساتھ حضرت نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ”جس نے دو رمضان مسلسل بیماری میں گزار دیئے اور ان کے درمیان وہ صحت یاب نہ ہوا تو اسے چاہئے کہ وہ دوسرے رمضان کی قضا روزوں کے ساتھ کرے اور پہلے کی قضا کھانا کھلانے کے ساتھ“(4) امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے اس قول میں منفرد ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عبدالرزاق نے ابن جریج سے اور انہوں نے یحییٰ ابن سعید

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 193 (محاسن)
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 194 (محاسن)
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 192 (محاسن)
4۔ مصنف عبدالرزاق: 7623 (المکتب الاسلامی)

سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا مجھ تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کی مثل روایت پہنچی ہے۔لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مشہور روایت اس کے خلاف ہے۔انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے ایسے آدمی کے بارے مروی ہے جو رمضان المبارک میں بیمار ہوا اور اس نے روزے نہ رکھے، پھر وہ صحت یاب ہوا پھر بھی اس نے روزے نہ رکھے حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ گیا تو وہ پہلے اس دوسرے رمضان کے روزے رکھے پھر اس رمضان کے روزے رکھے جس کے افطار کئے تھے اور ساتھ ہی ہر دن کی طرف سے ایک مسکین کو کھانا بھی کھلائے۔اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے(1) یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن نافع ہے جس کے بارے ابو حاتم نے کہا ہے یہ جھوٹ بولتا ہے۔اور ایک راوی عمر بن موسیٰ ہے جو حدیثیں وضع کرتا ہے۔حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس بارے کوئی بھی مرفوع حدیث ثابت نہیں۔البتہ صحابہ کے آثار موجود ہیں ان میں سے صاحب المہذب نے حضرت علی، حضرت جابر اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم کے اسماء ذکر کئے ہیں اور میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے علاوہ ان میں سے کسی کی سند پر مطلع نہیں ہوا۔اگر اس بارے میں حدیث مرفوع صحیح بھی ہو تو پھر بھی اس کے سبب کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں کیونکہ وہ خبر واحد ہے۔

ﷺ اور ان پر جو روزے کو مشکل سے ادا کرتے ہیں" فِدْيَةٌ "فدیہ ہے۔علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس آیت کی تاویل اور حکم میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔ان میں سے اکثر کا موقف یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔یہی قول حضرت ابن عمر اور حضرت سلمہ ابن اکوع وغیرہما کا ہے(2) تفصیل یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں لوگوں کو روزہ رکھنے اور روزہ نہ رکھنے بلکہ فدیہ دینے کے درمیان اختیار دیا گیا تھا۔اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار اس لئے دیا تا کہ ان کے لئے یہ حکم تکلیف دہ نہ ہو کیونکہ وہ اس طرح روزے رکھنے کے عادی نہیں تھے۔ پھر اس اختیار کو منسوخ کر دیا گیا اور حتمی حکم اس طرح نازل ہوا: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ میں کہتا ہوں کہ اس بناء پر تو مریض اور مسافر کو گویا تین چیزوں کے درمیان اختیار دیا گیا تھا یعنی روزہ رکھنا، قضا کی نیت سے افطار کرنا اور فدیہ دینا۔پھر جب فدیہ کا حکم منسوخ ہو گیا تو ان دونوں کے لئے دو چیزوں یعنی روزے اور قضا کے درمیان اختیار باقی رہ گیا۔حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ حکم ایسے شیخ کبیر کے ساتھ خاص ہے جو روزے کی طاقت تو رکھتا ہے لیکن اس کے لئے روزہ تکلیف دہ ہوتا ہے، لہٰذا اسے رخصت دی گئی کہ وہ روزہ نہ رکھے اور فدیہ ادا کر دے پھر اسے منسوخ کر دیا گیا۔حسن نے کہا ہے کہ یہ حکم ایسے مریض کے بارے میں ہے جو روزے کی طاقت رکھتا ہے، لہٰذا اسے اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو وہ روزہ رکھے اور چاہے تو نہ رکھے اور فدیہ ادا کرے، پھر اسے منسوخ کر دیا گیا(3) مذکورہ تمام اقوال کی بناء پر ایسے شیخ کبیر کا حکم نص قرآن سے ثابت نہیں ہوتا جو روزے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔اسی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک قول میں کہا ہے کہ شیخ فانی کے لئے روزہ رکھنے سے عاجز ہونے کی وجہ سے روزہ نہ رکھنا جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (ذمہ داری نہیں ڈالتا اللہ تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو اس کی۔) اور اس پر فدیہ بھی واجب نہیں ہوگا۔کیونکہ فدیہ واجب قرار دینے کے لئے دلیل کا ہونا ضروری ہے کیونکہ فدیہ اور اس کی مثل ایسی چیزیں جو عقل میں نہ آنے والی ہوں وہ رائے سے ثابت نہیں ہو سکتیں۔اور ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں۔بلکہ اس کا معنی یہ ہے: وہ لوگ جو حالت شباب میں روزے کی طاقت رکھتے تھے لیکن اب بڑھاپے کے سبب روزے سے

1۔سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 196-217 (عاشق)　2۔تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 215 (فکر)　3۔تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 215 (فکر)

عاجز آ گئے تو ان پر روزے کے بدلے فدیہ واجب ہے۔ نظم کلام اس تاویل کی تائید نہیں کرتا۔ شیخ اجل حضرت جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں حرف نفی لَا مقدر ہے۔ یعنی اصل کلام یہ ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ لَا يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۔ یعنی یہ اصل میں "لِاَنْ لَا تَضِلُّوْا" ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں لَا کو مقدر ماننا بھی بہت بعید ہے کیونکہ یہ تو ظاہر کلام کی ضد ہے، اس طرح کہ یہ مثبت کلام کو منفی بنا دیتا ہے۔ پس اگر کہا جائے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اصح مذہب بھی یہی ہے اور سعید بن جبیر نے بھی کہا ہے کہ شیخ فانی پر روزے کے بدلے فدیہ واجب ہے اور ان اقوال کا انحصار صرف اسی آیت پر ہے۔ اور اگر اس تاویل کو درست تسلیم نہ کیا جائے تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ شیخ کبیر اور ایسے مریض پر فدیہ واجب ہے جسے صحت مند ہونے کی امید نہ ہو۔ تو میں کہتا ہوں وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ بہرحال تاویل تو یہی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ آیت کا حکم یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں روزے اور فدیہ کے درمیان اختیار ان لوگوں کے لئے تھا جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے تھے اور وہ لوگ جو طاقت نہیں رکھتے ان کے لئے یہ اختیار دلالت النص کے ذریعے بطریق اولیٰ ثابت ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب تفضل فرماتے ہوئے اور آسانی مہیا کرنے کے لئے طاقت رکھنے والوں کو اختیار دیا ہے تو اس کا یہ اختیار طاقت نہ رکھنے والوں کے لئے بدرجہ اولیٰ ہوگا۔ اسی وجہ سے میں یہ کہتا ہوں کہ اس وقت مسافر اور مریض کے لئے تین امور کے درمیان اختیار دیا گیا تھا۔ پھر جب آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۚ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا الایۃ نازل ہوئی تو ان کے حق میں فدیہ کا حکم منسوخ ہو گیا جو فی الحال روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں اور ان کے حق میں بھی جو ظاہری عذر ختم ہو جانے کے بعد روزہ رکھ سکتے ہیں اور ان سے مراد وہ مسافر اور مریض ہیں جو سفر ختم ہونے کے بعد اور شفا پانے کے بعد قضا کی امید رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کے حق میں روزے کو ادا کرنا یا قضا کرنا لازم ہو گیا اور ان کے حق میں دلالت النص کے ذریعے فدیہ کے جواز کا حکم باقی رہا جو فی الحال (شیخ فانی ہونے کی بنا پر) یا مآل کار (ایسی بیماری جس سے شفا کی توقع نہ ہو) کے اعتبار روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں کیونکہ وہ اس ارشاد میں داخل ہی نہیں فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ۔ یعنی جو صحیح اور مقیم ہو فَلْيَصُمْهُ (تو وہ روزے رکھے) وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا (اور جو مریض شفا کی امید رکھتا ہو) اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ "ہم نے مریض کو دلالت عقل سے اس قول کے ساتھ مقید کیا ہے کہ اس سے مراد ایسا مریض ہے جو شفا کی امید رکھتا ہو کیونکہ جو شفا کی امید نہیں رکھتا اسے قضا کا مکلف بنانا یہ تکلیف مالا یطاق ہے اور عبارۃ النص سے ثابت ہونے والے حکم کا منسوخ ہونا اس کا تقاضا نہیں کرتا کہ دلالۃ النص سے ثابت ہونے والا حکم بھی منسوخ ہے۔ واللہ اعلم۔

لے قرأت: نافع اور ابن ذکوان نے فِدْيَةُ طَعَامِ مَسٰكِيْنَ قرأت کی ہے یعنی فدیہ کو اضافت کے ساتھ اور مساکین کو جمع اور نون کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہشام نے فِدْيَةٌ کو تنوین کے ساتھ اور طَعَامُ کو بدل ہونے کی بناء پر مرفوع اور مَسٰكِيْنَ کو جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے فِدْيَةٌ کو تنوین کے ساتھ، طَعَامُ رفع کے ساتھ اور مِسْكِيْنٍ کو واحد نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

فدیہ کا معنی جزا ہے اور اس کی طعام کی طرف اضافت بیانیہ ہے۔ فدیہ کی مقدار امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق نصف صاع گندم یا ایک صاع جو یا کھجوریں ہیں آپ نے اسے صدقۂ فطر پر قیاس کیا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے وہ غلہ جو شہر میں اکثر کھایا جاتا ہے اس میں سے ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو دے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ مقدار مُد میں

سے نصف صاع یا گندم میں سے ایک مد ہے اور بعض فقہاء نے کہا ہے کہ جو خوراک اس دن وہ خود کھائے جس دن اس نے روزہ نہیں رکھا وہی مسکین کو بھی دے گا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ہر مسکین کو رات اور اپنی سحری کا کھانا دے دیں۔ طعام الفدیۃ کی تحقیق عنقریب آیت طیبہ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ کی تفسیر میں آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ہے پس جس نے فدیہ میں اضافہ کیا تو وہ اس کے لئے اصل فدیہ سے زیادہ بہتر ہے۔ اور تمہارے روزے رکھنا اے طاقت رکھنے والو! تمہارے لئے فدیہ سے بہتر ہے۔ یہ کلام صراحۃً اس پر دلالت کرتی ہے کہ الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد وہ ہیں جو روزے کی طاقت رکھتے ہیں اور ایسے بوڑھے یا مریض جو طاقت نہیں رکھتے وہ اس سے مراد نہیں کیونکہ ان کے لئے ان کے روزوں کا بہتر ہونا ممنوع ہے۔ اور یہ آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اگر مسافر کے لئے روزہ رکھنے میں کوئی واضح ضرر نہ ہو تو اس کے حق میں روزہ رکھنا افضل ہے۔ جمہور نے اسی طرح کہا ہے لیکن امام احمد، اوزاعی، سعید بن مسیب اور شعبی رحمہم اللہ کا قول جمہور کے قول سے مختلف ہے۔ (یعنی ان کے نزدیک روزہ رکھنا افضل نہیں) انہوں نے متعدد احادیث سے استدلال کیا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں تھے تو آپ ﷺ نے لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا اور ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ اس پر سایہ کئے ہوئے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے عرض کی یہ آدمی روزے دار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں(1) متفق علیہ۔ آپ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال رمضان المبارک میں مکہ کی طرف نکلے۔ آپ ﷺ روزے سے تھے یہاں تک کہ آپ کراع الغمیم کے مقام تک پہنچ گئے۔ لوگوں نے بھی روزہ رکھا ہوا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے پانی کا ایک پیالہ طلب کیا۔ آپ ﷺ نے اسے اتنا بلند کیا کہ تمام لوگوں نے اسے دیکھ لیا پھر آپ ﷺ نے اسے نوش فرمالیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ بعض لوگوں نے روزہ رکھا ہوا ہے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا وہ نافرمان ہیں، وہ نافرمان ہیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سفر میں رمضان المبارک کا روزہ رکھنے والا حضر میں افطار کرنے والے کی مثل ہے۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(3) ہم کہتے ہیں کہ مذکورہ تمام احادیث ان کے حق میں ہیں جن کے لئے روزہ بہت زیادہ ضرر رساں ہوتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے حق میں روزہ نہ رکھنا افضل ہے، چاہے وہ مسافر ہوں یا مریض۔ اسی طرح جب جہاد قریب ہو تو افطار کرنا افضل ہے۔ کیونکہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اب تم اپنے دشمنوں کے قریب آ چکے ہو اور افطار کرنا تمہارے لئے تقویت کا سبب ہے۔ ابوسعید فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد ہمارے لئے رخصت تھا اس لئے ہم میں سے بعض نے روزہ رکھے رکھا اور بعض نے افطار کر دیا پھر ہم ایک دوسری منزل پر پہنچے تو وہاں آپ ﷺ نے فرمایا بیشک تمہیں صبح کے وقت اپنے دشمن کا سامنا ہوگا اور افطار کرنا تمہارے لئے قوت کا سبب ہے لہٰذا تم روزے افطار کر دو۔ تو چونکہ یہ حکم عزیمت تھا اس لئے ہم نے روزے افطار کر دیئے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(4) اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں بعض صحابہ کرام سے نقل کیا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ رحمۃ اللہ علیہ سے مسند میں اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم اور ابن عبدالبر نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اور جب روزہ اس کے لئے تکلیف دہ نہ ہو تو پھر اس آیت کے مطابق اس کے لئے روزہ رکھنا افضل ہے اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی

1۔ صحیح بخاری: 1844 (ابن کثیر)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 356 (قدیمی)
3۔ سنن ابن ماجہ: 1666 (علیہ)
4۔ صحیح مسلم: 1120، جلد 7 صفحہ 303 (علیہ)

حدیث بھی ہے کہ وہ ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور گرمی کی شدت سے بچنے کے لئے ہم میں سے ہر کوئی اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھ رہا تھا اور حضور نبی کریم ﷺ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ کے سوا ہم میں سے کوئی روزے دار نہ تھا، متفق علیہ (۱) میں کہتا ہوں کہ ہم نے جو تفصیل ذکر کی ہے وہ مسافر کے بارے میں ہے کیونکہ اس کی رخصت کا دارومدار نفس سفر پر ہے، چاہے اس کے لئے روزے میں مشقت ہو یا نہ ہو۔ اور شیخ کبیر، مریض، ضعیف، حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کی رخصت کا انحصار روزے کے سبب ان کے مشقت میں مبتلا ہونے اور ان کو ضرر پہنچنے پر ہے۔ پس اگر ان کے لئے روزہ ضرر رساں نہ ہو تو ان کے لئے رخصت بھی نہیں اور جب انہیں روزے کے سبب نقصان پہنچے یعنی مرض بڑھنے کا خوف ہو یا نیا مرض لاحق ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر ان کا حکم اس کی مثل ہے جسے سفر کی وجہ سے ضرر پہنچتا ہو، واللہ اعلم۔

۵ اگر تم اس فضیلت کو جانتے جو روزے میں ہے۔ یہاں جوابِ شرط محذوف ہے۔ جس پر اس کا ماقبل دلالت کرتا ہے، یعنی تم اختیار کی صورت میں افطار اور فدیہ پر روزے کو ترجیح دیتے لیکن اب اختیار کا حکم منسوخ ہو جانے کے بعد جس کسی نے رمضان المبارک میں بغیر عذر کے روزہ نہ رکھا تو اگر وہ اسے حلال سمجھتا ہے تو کفر کا ارتکاب کرتا ہے اور اگر حلال نہیں سمجھتا تو فسق کرتا ہے۔ تو چونکہ بقدر امکان اس کا تدارک واجب ہے، لہٰذا اس روزے کی قضاء اس پر واجب ہوگی۔ اور اس لئے بھی کہ جب معذور کے لئے فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ سے قضا کا حکم ثابت ہے تو پھر اس کے لئے تو بدرجہ اولیٰ قضا کا حکم ہوگا جس نے بلا عذر روزہ نہ رکھا اور ایسے آدمی پر بالا جماع استغفار کرنا واجب ہے۔ اور امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے رمضان کا روزہ بغیر عذر کے نہ رکھا تو پھر اس کی قضا ہزار برس کے ساتھ بھی ممکن نہیں اور حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ساری عمر کے روزے (صوم الدھر) بھی اس کا تدارک نہیں کر سکتے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَ مَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ؗ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۸۵

"ماہ رمضان المبارک ۱ جس میں اتارا گیا قرآن ۲ اس حال میں کہ یہ راہ حق دکھاتا ہے لوگوں کو ۳ اور (اس میں) روشن دلیلیں ہیں ہدایت کی اور حق و باطل میں تمیز کرنے کی ۴ سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو ۵ تو وہ یہ مہینہ روزے رکھے ۶ اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے ۷ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تمہارے لئے سہولت ۸ اور نہیں چاہتا تمہارے لئے دشواری ۹ اور (چاہتا ہے کہ) تم گنتی پوری کر لیا کرو ۱۰ اور اللہ کی بڑائی بیان کیا کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ۱۱ اور تاکہ تم شکر گزاری کیا کرو ۱۲"

۱ شَهْرُ رَمَضَانَ یہ مبتدا ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ذٰلِکَ شَهْرُ رَمَضَانَ یا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 357 (قدیمی)

مضاف کے حذف کے ساتھ الصیام سے بدل ہوگا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ صِیَامُ شَھْرِ رَمَضَانَ یہ اس صورت میں درست ہوگا جب یہ آیت نزول میں اس آیت کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کے ساتھ متصل ہو نہ کہ اس صورت میں کہ اس سے نزول میں متاخر ہو اور ما سبق کے لئے ناسخ بن جائے۔ الشھر شہرت سے مشتق ہے رمضان رَمَضَ کا مصدر ہے۔ رمض کا معنی جلنا ہے شھر کو اس کی طرف مضاف کیا اور اسے علم بنا دیا علمیت اور الف نون زائد تان کی وجہ سے غیر منصرف ہو گیا۔ حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے رمضان کا نام اس لئے دیا گیا کہ رمضان کا مہینہ گناہوں کو جلا دیتا ہے۔ امام اصبہانی نے اسے ترغیب میں نقل کیا ہے۔

ع۔ قرآن کو قرآن کا نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہ سورتوں آیات اور حروف کو جمع کرنے والا ہے اس میں قصے، امر، نہی، وعدہ اور وعید جمع ہیں قرآن کا لغوی معنی جمع کرنا ہے یا یہ قرأت سے مشتق ہے جو مقروء کے معنی میں ہے ابن کثیر نے اس لفظ کو ہمزہ کے حذف اور اس کی حرکت راء کو دینے کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ نے وقف کی صورت میں ابن کثیر کی موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے اسے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام بغوی نے کہا امام شافعی اسے بغیر ہمزہ کے پڑھتے تھے اور فرماتے تھے یہ لفظ قرأت سے مشتق نہیں بلکہ تورات اور انجیل کی طرح یہ اس کتاب کا نام ہے (1) امام بغوی نے کہا مقسم نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ان سے اس آیت شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ اور اس آیت اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ اور ارشاد اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ جبکہ قرآن تمام مہینوں میں نازل ہوا اور اللہ تعالیٰ کے فرمان وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ تمام قرآن لیلۃ القدر کو رمضان شریف میں لوح محفوظ سے آسمان دنیا میں بیت العزۃ کی طرف اتارا گیا۔ پھر جبرئیل امین اسے بائیس سالوں میں تھوڑا تھوڑا نازل کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ سے بھی مراد ہے۔ داؤد ابن ابی ہند نے کہا میں نے شعبی سے اس آیت شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ کے بارے میں پوچھا کہ کیا قرآن سارے سال میں نازل نہیں ہوتا رہتا تھا؟ انہوں نے جواب دیا بات اسی طرح ہے، تاہم جبرائیل امین رمضان میں حضور ﷺ کے ساتھ دور فرماتے، اللہ تعالیٰ جو چاہتا اسے محکم اور ثابت رکھتا اور جو چاہتا اسے بھلا دیتا (2) حضرت ابوذر حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ تین رمضان کو صحف ابراہیم نازل کئے گئے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ رمضان کی پہلی رات میں یہ صحیفے نازل کئے گئے۔ رمضان شریف کے چھ دن گزر چکے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی گئی اور رمضان کے تیرہ دن گزر چکے تھے کہ انجیل نازل کی گئی اور رمضان شریف کے اٹھارہ دن گزر چکے تھے کہ زبور نازل کی گئی اور رمضان شریف کے چوبیس دن گزر چکے تھے کہ حضور ﷺ پر قرآن نازل کیا گیا (3) امام احمد اور طبرانی نے واثلہ بن اسقع سے روایت کیا ہے صحف ابراہیمی رمضان شریف کی پہلی رات اور تورات جب چھ راتیں گزر چکی تھیں، انجیل جب تیرہ راتیں گزر چکی تھیں اور قرآن جب چوبیس راتیں گزر چکی تھی (4) و اللہ اعلم۔ اگر شہر رمضان کو مبتدا بنایا جائے تو اسم موصول صلہ کے ساتھ مل کر اس کی خبر ہوگا۔ اگر اسے خبر بنایا جائے تو اسم موصول صلہ کے ساتھ مل کر اس کی صفت یا بدل ہوگا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مبتدا کی صفت ہو اور اس کی خبر فَمَنْ شَھِدَ ہو اور اس پر فاء اس لئے آئی ہو کیونکہ مبتدا اپنے ضمن میں شرط کا معنی لئے ہوئے ہے۔ اس تقدیر کی صورت میں اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ کا معنی ہوگا یعنی جس کی شان میں قرآن نازل ہوا وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ تا کہ یہ امر ثابت ہو جائے کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 217 (فکر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 217 (فکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 218 (فکر)　4۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 22 صفحہ 75 (الامہ)

قرآن حکیم کا نزول ہی اس مہینہ میں روزوں کی فرضیت کا سبب بنا۔

۳ یہ اپنے اعجاز کے ساتھ لوگوں کو گمراہی سے ہدایت کی طرف لانے والا ہے۔

۴ یعنی واضح دلائل جو حق کی طرف راہنمائی کرتے ہیں، خواہ حق حلال و حرام سے تعلق رکھتا ہو یا حدود و احکام سے۔ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ حق اور جن و انس کے شیاطین کی طرف سے القاء کیے گئے باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ یہ دونوں قرآن سے حال ہیں۔

۵ جس نے حالت صحت، اقامت اور حیض و نفاس سے پاکیزگی کی حالت میں اس مہینہ کو پالیا اسے ہر صورت میں روزہ رکھنا ہوگا لیکن مریض اور مسافر آنے والی آیت سے اس حکم سے خارج ہو گئے، حائضہ اور نفساء خبر مشہور سے خارج ہوئے۔ اسی پر علماء کا اجماع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عورت کے سوال مَا نُقْصَانُ دِيْنِهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کیا بات اس طرح نہیں کہ جب اسے حیض آتا ہے تو وہ نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ ہی روزہ رکھتی ہے۔ متفق علیہ۔(1)

فائدہ:۔ تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ حائضہ پر روزے رکھنا حرام ہے۔ اگر اس نے روزہ رکھا تو اس کا روزہ نہ ہوگا اور اس پر قضاء لازم ہوگی۔

۶ یعنی جس نے رمضان کو پالیا اسے ہر صورت روزہ رکھنا ہوگا اس کے لئے فدیہ کافی نہیں۔ جس طرح اسلام کے ابتدائی دور میں یہ جائز تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں علماء کا ایسے شخص کے بارے میں اختلاف ہے کہ جو رمضان کا چاند دیکھے تو مقیم ہو پھر سفر پر چلا جائے۔ حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ اس کے لئے روزہ افطار کرنا جائز نہیں۔ عبیدہ سلمانی نے بھی یہی کہا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ یعنی پورے روزے رکھے۔ اکثر صحابہ اور فقہاء اسی بات کی طرف گئے ہیں کہ جب اس نے رمضان شریف میں سفر شروع کیا تو اس کے لئے اس دن کے بعد روزہ افطار کرنا جائز ہے(2) میں کہتا ہوں اسی پر تمام علماء کا اجماع ہے مذکورہ آیت کا معنی یہ ہے جو دیکھے اتنے روزے رکھے، اگر سارا دیکھے تو سارے روزے رکھے اور اگر بعض دیکھے تو بعض روزے رکھے اسی معنی کی تائید وہ حدیث بھی کرتی ہے جو حضرت جابر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ فتح مکہ کے سال حضور ﷺ رمضان شریف میں سفر پر روانہ ہوئے تو آپ ﷺ نے روزہ رکھا یہاں تک کہ کدید کے مقام پر پہنچ گئے، پھر آپ ﷺ نے افطار کیا(3) اور تمام لوگوں نے بھی افطار کیا صحابہ کرام نئے عمل پر عمل کرتے تھے حضور ﷺ کا نیا عمل یہی تھا۔

مسئلہ:۔ جو آدمی دن کے پہلے حصے میں مقیم ہو پھر سفر شروع کرے وہ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کے نزدیک اس روز روزہ نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ اس نے پہلا دن دیکھا ہے اس لئے روزہ رکھے۔ امام احمد اور داؤد رحمہما اللہ نے کہا اس دن بھی روزہ چھوڑنا اس کے لئے جائز ہے۔ ابن جوزی نے حضرت ابن عباس کی مذکورہ حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب آپ ﷺ کراع غمیم میں پہنچے تو آپ ﷺ نے روزہ افطار کر دیا اور حضرت ابن عباس کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے رمضان شریف میں سفر کیا یہاں تک کہ آپ ﷺ عسفان کے مقام پر آئے آپ ﷺ نے پانی کا برتن منگوایا تاکہ لوگوں کو دکھائیں پھر آپ ﷺ نے واپس آنے تک افطار کیا۔ ہم اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اس روز حضور ﷺ پہلے پہر میں مقیم نہ تھے کیونکہ کراع الغمیم اور عسفان

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 261 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 218 (فکر) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 260 (وزارت تعلیم)

مدینہ طیبہ کی پہلی منزل میں نہیں۔

مسئلہ:۔ اگر مسافر اور مریض نے روزے کی حالت میں صبح کی پھر افطار کا ارادہ کر لیا امام احمد کے نزدیک اس کے لئے روزہ چھوڑنا جائز ہے صاحب منہاج نے امام شافعی کا بھی یہی مذہب ذکر کیا ہے۔ ابن ہمام نے امام ابوحنیفہ کا مذہب ذکر کرتے ہوئے کہا مسافر کے لئے روزہ افطار کرنا اس وقت مباح ہوگا جب تک اس نے روزہ افطار نہ کیا ہو جب اس نے رات کو ہی نیت کر لی ہو اور فجر سے پہلے اس نے ارادہ نہ توڑا ہو تو وہ روزے سے ہوگا اب اس کے لئے افطار کرنا حلال نہیں ہوگا۔ اگر وہ افطار کرتا ہے تو اس پر کفارہ نہیں ہوگا، جس طرح سابقہ مسئلہ میں شبہ کی وجہ سے کفارہ نہیں ہوگا۔ کراع الغمیم والی حدیث اس مسئلہ میں بغیر کسی شک وشبہ کے امام احمد اور امام شافعی کی دلیل ہوئی۔

یہ یعنی اس پر اور دنوں کی گنتی واجب ہوگی۔ اس حکم کو مکرر ذکر کیا تا کہ اس امر پر دلالت ہو کہ منسوخ معذور کے لئے فدیہ ہے فطر وقضا نہیں اگر یہ فدیہ کے حکم کی منسوخ کے لئے نہ ہو اور اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد رمضان شریف کا مہینہ ہی ہو تو پھر مریض اور مسافر کے حکم کے تکرار میں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

فائدہ:۔ قضاء کے وجوب میں مریض اور مسافر کے ساتھ حائضہ اور نفساء کو ملایا جائے گا۔ اسی پر علماء کا اجماع ہے اور احادیث سے ثابت ہے۔ معاذہ عدویہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ سے کہا کیا وجہ ہے کہ حائضہ روزے کی قضا کرتی ہے نماز کی قضا نہیں کرتی؟ حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا ہمیں بھی یہ عارضہ لاحق ہوتا تھا، ہمیں روزے کی قضا کا حکم دیا جاتا تھا اور نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔(1)

مسئلہ:۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسافر اور مریض جب مقیم اور صحت مند ہوں گے تو رمضان کے بعد جتنے دن اس نے حالت صحت اور اقامت کے پائے ہوں گے تو اتنے دنوں کی اس پر قضا لازم ہوگی جس کے رمضان کے دس دن فوت ہوئے۔ اور رمضان کے بعد صحت اور اقامت کے اس نے صرف دو دن پائے، پھر وہ فوت ہو گیا تو اس پر صرف دو دن کی قضا لازم ہوگی۔ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے جس نے چند دن تو پائے اور اس نے قضا نہ کی یہاں تک کہ وہ فوت ہو گیا، کیا ورثاء پر فدیہ اور قضاء واجب ہوگی؟ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ نے فرمایا وارث پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی، مگر اس صورت میں کہ میت فدیہ کی وصیت کر جائے تو مال کے تیسرے حصے میں سے وصیت کا پورا کرنا لازم ہوگا۔ اگر فدیہ ثلث سے زیادہ ہو جائے تو دوسرے ورثاء کی رضامندی سے دے سکتے ہیں۔ یہی حکم ہوگا جب اس پر نذر یا کفارہ کا روزہ ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا پہلا قول یہ تھا اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے خواہ روزے نذر کے ہوں یا رمضان کے ہوں۔ دوسرے قول میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا کہ دونوں صورتوں میں اس کا قریبی رشتہ دار فدیہ دے گا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا رمضان کے روزے میں فدیہ دے گا اس کی طرف سے روزے نہیں رکھے گا۔ اگر نذر کا روزہ ہو تو ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے گا۔ علماء نے ولی پر روزہ کے وجوب کو حضرت ابن عباس کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ایک عورت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، عرض کی میری ماں فوت ہو گئی ہے اور اس پر ایک مہینے کے روزے لازم تھے، کیا میں اس کی طرف سے قضا کر لوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا اگر اس پر قرض ہوتا تو کیا تم اس کی طرف سے قرض

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 153 (قدیمی)

ادانہ کرتیں؟ عرض کی کیوں نہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا قرض کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ یہ روایت متفق علیہ ہے (1) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جو فوت ہو گیا جبکہ اس کے ذمہ روزے تھے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے۔ متفق علیہ (2) اور حضرت بریدہ کی اپنے باپ سے روایت ہے کہ ایک عورت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، عرض کی میری ماں پر ایک ماہ کے روزے تھے کیا میرے لئے جائز ہے کہ میں اس کی طرف سے روزے رکھوں؟ فرمایا ہاں۔ اسے امام احمد نے روایت کیا (3) اور حضرت ابن عباس کی روایت ایک عورت نے سمندر میں سفر کیا، اس نے نذر مانی اگر اللہ تعالیٰ نے اسے نجات دی تو وہ ایک ماہ کے روزے رکھے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے نجات دی۔ اس نے روزے نذر کے یہاں تک کہ وہ مر گئی۔ اس کی ایک رشتہ دار آئی اور اس کا ذکر حضور ﷺ سے کیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تو اس کی طرف سے روزے رکھ (4) حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ نے حضور ﷺ سے اس نذر کے بارے میں پوچھا جو اس کی ماں کے ذمہ تھی۔ وہ نذر پوری کرنے سے پہلے ہی فوت ہو گئی۔ حضور ﷺ نے انہیں فرمایا کہ تم اس کی قضا دے دو (5) ان احادیث میں سے کچھ نذر میں صریح ہیں اور کچھ مطلق ہیں۔ امام احمد نذر میں روزوں کے وجوب کا قول کرتے ہیں، جس میں نذر کا ذکر نہ ہوا سے نذر کے روزوں پر محمول کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں جب لفظ مطلق ہو تو اسے نذر پر محمول کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی بلکہ مذکورہ احادیث صحیحہ اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ ولی کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ میت کی طرف سے روزے رکھے وہ روزے نذر کے ہوں یا رمضان کے ہوں تو پھر ان کی اتباع لازم ہے۔ ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جو ولی پر روزوں کو واجب کرے۔ اس لئے یہ روایات امام ابوحنیفہ کے خلاف دلیل نہیں بنتیں۔ یہ کیسے دلیل بن سکتی ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کوئی انسان دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اگر وارث میت کی طرف سے روزے نہ رکھے تو اس پر عذاب کیسے لازم ہو سکتا ہے۔ علماء نے میت کی طرف سے فدیہ دینے کے وجوب کو ان احادیث سے استدلال کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے جو آدمی فوت ہو جائے اور اس پر ایک ماہ کے روزے ہوں تو ولی ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلائے (6) اسے امام ترمذی نے روایت کیا فرمایا ہم اسے صرف اسی سند سے مرفوع جانتے ہیں یعنی اشعث بن سوار کی سند سے جو کچھ بھی نہیں اور محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے جو ضعیف اور مضطرب الحدیث ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن عمر پر موقوف ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ طاعت میں نیابت جائز نہیں ہوتی کیونکہ اس میں مقصود نیت اور اطاعت ہوتی ہے اور ثواب و عذاب کا دارومدار اسی پر ہوتا ہے۔ وارث پر روزے اور مال کے واجب ہونے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مانع ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ۔) پس دوسرے فرد پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی۔ مگر جب میت اسے وصیت کرے تو اس وصیت پر عمل کرنا واجب ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ اس وصیت کے ادا کرنے جو اس نے کی اور قرض ادا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اس کے صدقہ کو قبول کرے۔ واللہ اعلم۔

اس مقام پر ثابت شدہ امر یہ ہے کہ جب وارث میت کی طرف سے بطور نفل روزے رکھے یا صدقہ کرے تو احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے ساتھ اسے قبول کرے گا اور میت کو رستگاری عطا کرے گا لیکن میت کی طرف سے اس پر واجب نہیں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 362 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 362 (قدیمی) 3۔ مسند احمد، جلد 5 صفحہ 349 (صادر)
4۔ تحفۃ الاخیار: 1391 (علمیہ) 5۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1546 (علمیہ) 6۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 718 (علمیہ)

ہوگا ان دلائل کی بناء پر جو ہم نے ذکر کر دیئے ہیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث جو بزار نے روایت کی، میں یہ موجود ہے کہ اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے اگر وہ چاہے۔ یہ صورت زیادہ مناسب ہے تاہم روایت ضعیف ہے کیونکہ یہ ابن لہیعہ کے واسطہ سے مروی ہے۔

۸؎ سفر اور مرض کی حالت میں روزہ افطار کرنے کو مباح کر کے اور پھر قضاء کی اجازت دے کر اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ فرمایا۔

۹؎ اور وہ تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں کرتا۔ ابو جعفر نے العُسُر۔ الیسُر اور اس جیسے الفاظ کو سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ مریض اور مسافر کے لئے روزہ افطار کرنا آسانی کے لئے رخصت ہے، یہ عزیمت نہیں، یہاں تک کہ اگر مریض اور مسافر روزہ رکھیں تو بالا جماع یہ صحیح ہوگا۔ مگر جو حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عروہ بن زبیر اور حضرت علی بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے کہ سفر میں روزہ جائز نہیں، جس نے روزہ رکھا تو الفاظ کے ظاہر کو ملحوظ خاطر رکھنے کی بناء پر اس پر قضا ہوگی کیونکہ ارشاد ہے فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے ایام کے روزوں کو واجب کر دیا، اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔ جس نے اس حالت میں روزہ رکھا گویا اس نے فرض سے پہلے روزہ رکھا، اس لئے یہ جائز نہ ہوگا۔ ہم کہتے ہیں وجوب کا سبب رمضان کا مہینہ ہے، سفر وجوب اداء میں مانع ہے نفسِ وجوب کا مانع نہیں۔ جس نے روزہ رکھا اس نے نفسِ وجوب کے بعد روزہ رکھا۔ تو یہ صحیح ہے، جس طرح ایک آدمی نے سال گزرنے سے پہلے ہی زکوٰۃ ادا کر دی۔ جمہور کے مذہب کی تائید یہ حدیث بھی کرتی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سولہ رمضان کو غزوہ کے لئے روانہ ہوئے۔ ہم میں سے بعض لوگوں نے روزہ رکھا اور بعض نے روزہ افطار کر دیا۔ روزے دار نے افطار کرنے والے کو کوئی طعنہ نہ دیا اور افطار کرنے والے نے روزے دار کو برا بھلا نہ کہا۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا(1) حضرت جابر کی حدیث امام مسلم اور حضرت انس کی روایت مؤطا امام مالک میں ہے۔

۱۰؎ یعنی رمضان کے جتنے روزے افطار کیے تھے اتنی تعداد پوری کرے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مہینہ انتیس دن کا ہوتا ہے۔ تم روزے نہ رکھو یہاں تک کہ تم چاند دیکھو اور روزہ افطار نہ کرو یہاں تک کہ عید کا چاند دیکھو۔ اگر آسمان ابر آلود ہو جائے تو تیس دن مکمل کر لو۔ متفق علیہ (2) ابو بکر نے اسے میم کی تشدید اور باقی قراء نے میم کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اپنے معطوف کے ساتھ مل کر الیسر پر معطوف ہے۔ یا تو اس لئے کہ "یسر" معنی علت ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی ہم نے یہ احکام یعنی مریض اور مسافر کے لئے روزہ افطار کرنے کا مباح ہونا مشروع کیا اور مرض کے ایام کے بعد اتنے ہی دن قضاء کے واجب ہونے کا حکم دیا تا کہ امر تمہارے لئے آسان ہو جائے اور تا کہ تم (گنتی) مکمل کر لو۔ یا لام کو برائے تاکید زائدہ مان لیا جائے اور تکملوا ان مقدرہ کے ساتھ یسر پر معطوف ہو اور یرید کا مفعول بہ ہو۔ تقدیر کلام یوں ہوگی یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَ اَنْ تُکْمِلُوْا اَوْ اَنْ تُکَبِّرُوْا اَوْ اَنْ تَشْکُرُوْا۔ یا یہ فعل محذوف کے متعلق ہے جو یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ پر معطوف ہے، یعنی وہ افطار کو مباح کر کے تم پر آسانی کا ارادہ کرتا ہے اور تمہیں قضا کا حکم دیتا ہے تا کہ تم (گنتی) کو مکمل کر لو۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 356 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، 6، جلد 7 صفحہ 167 (علمیہ)

1؎ یہاں ما مصدر یہ ہے یا موصولہ ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اس کے ہدایت دینے پر تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو یا اس لئے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی، تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو جس کے ذریعے تم اپنے رب کی رضا حاصل کر سکتے ہو، اپنے ذمہ سے فارغ ہو سکتے ہو اور بہت بڑا اجر پا سکتے ہو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد لیلۃ الفطر کی تکبیرات ہیں۔ امام شافعی نے حضرت ابن مسیب، حضرت عروہ اور حضرت ابی سلمہ سے روایت کیا ہے کہ وہ عید الفطر کی رات کو بلند آواز سے تکبیریں کہتے تھے (1) ایک قول یہ کیا گیا کہ اس سے مراد عید الفطر کے دن کی تکبیرات ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد عید الفطر یا اس کی تکبیرات ہوں تو اس صورت میں عید الفطر کی تکبیرات واجب ہوں گی اور دلالت التزامی کی بناء پر عید کی نماز بھی واجب ہوگی کیونکہ عید الفطر کے دن اور اس کی رات میں نماز کے باہر تکبیرات بالاجماع واجب نہیں۔ ہم اسے نماز عید کی تکبیرات پر یا نماز عید پر محمول کریں گے، جس طرح جزء بول کر کل مراد لیا جاتا ہے۔ جس طرح قُرْاٰنَ الْفَجْرِ میں ہے۔ واللہ اعلم۔ احتمال کی وجہ سے عید کی نماز فرض نہیں، نبی کریم ﷺ نے اس نماز کے بارے میں مواظبت اختیار کی اس لئے یہ نماز واجب ہے۔

2؎ تاکہ تم روزے کے فرض ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، کیونکہ یہ درجات کو پانے میں وسیلہ ہے۔ اسی طرح مریض اور مسافر کے لئے افطار کرنے کے مباح ہونے پر تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، کیونکہ اس میں تخفیف اور رخصت ہے۔ یہ ''لتکبروا'' پر معطوف ہے۔

فصل:۔ رمضان شریف اور اس کے روزوں کی فضیلت کے بارے میں حضرت ابوہریرہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب رمضان شریف شروع ہوتا ہے تو شیاطین اور سرکش جن جکڑ دیئے جاتے ہیں۔ جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا۔ ایک ندا کرنے والا ندا دیتا ہے اے بھلائی چاہنے والے آگے بڑھو، اے برائی چاہنے والے رک جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت سے لوگ جہنم سے رستگاری پانے والے ہیں۔ یہ ندا ہر رات ہوتی ہے (2) اسے امام ترمذی، ابن ماجہ اور امام احمد نے روایت کیا اور صحیحین میں اسی کی مثل ہے۔ آپ ہی حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا جس نے ایمان اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر رمضان کے روزے رکھے اس کے پہلے گناہ بخش دیئے گئے، جس نے ایمان اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر رمضان شریف میں قیام کیا اس کے پہلے گناہ بخش دیئے گئے اور جس نے لیلۃ القدر کو ایمان اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر قیام کیا اس کے بھی پہلے گناہ بخش دیئے گئے، متفق علیہ (3) حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرمایا ہمیں رسول اللہ ﷺ نے شعبان کی آخری تاریخ کو خطبہ ارشاد فرمایا، فرمایا اے لوگو تم پر ایک عظیم مہینہ آ رہا ہے، ایک روایت میں ہے تم پر ایک بابرکت مہینہ جھانک رہا ہے جس میں لیلۃ القدر ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کے روزے فرض کئے اور رات کو قیام کرنا نفل قرار دیا۔ جس نے اس میں کوئی بھلائی کا کام کیا وہ اس طرح ہے جیسے اس نے کسی اور وقت میں فرض ادا کیا، جس نے اس میں ایک فرض ادا کیا وہ اس طرح ہے جس نے اور اوقات میں ستر فرض ادا کئے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ غمگساری کا مہینہ ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں رزق میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جس نے کسی روزے دار کو روزہ افطار کرایا یہ اس کے گناہوں کی بخشش کا باعث ہوگا، اور جہنم سے اس کی رستگاری کا باعث ہوگا اسے روزے دار کے برابر اجر دیا جائے گا اور روزے دار کے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ صحابہ کرام نے عرض کیا ہم میں سے ہر کوئی تو روزہ افطار کرانے کی حیثیت نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 221 (فکر) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، 682 (علیہ) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 255 (وزارت تعلیم)

رکھتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اسے بھی یہ ثواب عطا فرماتا ہے جس نے کسی روزے دار کا روزہ ایک گھونٹ دودھ یا ایک کھجور یا پانی کے ایک گھونٹ سے افطار کرایا۔ جس نے روزے دار کو پیٹ بھر کھانا کھلایا اللہ تعالیٰ اسے میرے حوض سے ایسا مشروب پلائے گا کہ اسے پیاس نہیں لگے گی، یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ یہ وہ مہینہ ہے جس کا پہلا عشرہ رحمت، درمیانی عشرہ مغفرت اور آخری عشرہ جہنم سے آزادی کا باعث ہے۔ اس میں چار اعمال کثرت سے کرو دو کاموں کے ساتھ تم اپنے رب کو راضی کرو گے اور دو خصلتیں ایسی ہیں جن کے بغیر تمہارا کوئی چارہ کار نہیں، وہ دو خصلتیں جن کے ذریعے تم اپنے رب کو راضی کرتے ہو وہ کلمۂ شہادت ہے اور تمہارا استغفار کرنا ہے اور دو کام جن سے تمہارا چھٹکارا نہیں وہ یہ ہے کہ تم جنت کا سوال کرو اور جہنم سے پناہ چاہو۔ اسے بغوی نے روایت کیا(1) اور بیہقی نے شعب الایمان میں آگ سے آزادی تک روایت کیا۔ ساتھ ہی اس روایت میں یہ بھی ہے جس نے رمضان شریف میں اپنے غلام پر تخفیف کی اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا اور جہنم سے آزاد کر دے گا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انسان کے ہر عمل کو دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مگر روزہ، وہ میرے لئے ہے، میں خود اس کی جزا دوں گا۔ وہ میرے لئے اپنا کھانا، پینا اور شہوت چھوڑتا ہے۔ روزے دار کے لئے دو خوشیاں ہیں: ایک خوشی روزہ چھوڑنے اور دوسری خوشی اپنے رب سے ملاقات پر ہوگی۔ روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں کستوری کی خوشبو سے بھی بہتر ہے۔ روزہ ڈھال ہے۔ جس روز تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ گالی نہ دے اور نہ ہی چیخے، اگر کوئی اسے گالی دے یا اس سے جھگڑے تو کہے میں روزے سے ہوں، متفق علیہ(2) حضرت عبداللہ بن عمرو نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا روزہ اور قرآن بندے کی شفاعت کرتے ہیں۔ روزہ کہتا ہے اے میرے پروردگار میں نے اسے دن کے وقت اور کھانے اور شہوت پوری کرنے سے روکے رکھا، اس کے متعلق میری شفاعت قبول فرما۔ قرآن کہے گا اے میرے رب میں نے اسے رات کے وقت نیند سے روکے رکھا، اس کے بارے میری شفاعت قبول فرما۔ تو دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ اسے امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا(3) حضرت ابو ہریرہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا امت کو رمضان کی آخری رات کو بخش دیا جاتا ہے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ کیا وہ لیلۃ القدر ہے؟ فرمایا نہیں، لیکن کام کرنے والا جب عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے پورا پورا اجر عطا فرماتا ہے۔ اسے امام احمد نے روایت کیا(4) (اللہ تعالیٰ اسے بہتر جانتا ہے۔)

ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، ابوالشیخ اور دوسرے علماء اپنی اپنی سندوں سے جریر بن عبدالحمید سے وہ عبدہ سجستانی سے وہ صلت بن حکیم سے وہ اپنے باپ سے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اس سے مناجات کریں، یا دور ہے کہ ہم اس کو ندا کریں۔ رسول اللہ ﷺ اس کا سوال سن کر خاموش ہو گئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔(5)

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ۝۱۸۶

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 223-222 (فکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 364-363 (قدیمی) 3۔ شعب الایمان: 1994 (علمیہ)
4۔ مشکوٰۃ المصابیح: 1968 (فکر) 5۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 352 (علمیہ)

''اور جب پوچھیں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق تو (انہیں بتاؤ) میں (ان کے) بالکل نزدیک ہوں [1]۔ قبول کرتا ہوں دعا، دعا کرنے والے کی جب وہ دعا مانگتا ہے مجھ سے [2]۔ پس انہیں چاہئے کہ میرے حکم مانیں [3]۔ اور ایمان لائیں مجھ پر [4]۔ تا کہ وہ کہیں ہدایت پا جائیں [5]۔''

[1] یعنی اے محبوب انہیں فرما دیں کہ میں قریب ہوں۔ عبدالرزاق حضرت حسن بصری سے روایت کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا ہمارا رب کہاں ہوتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ یہ روایت مرسل ہے۔ میں کہتا ہوں شائد سوال کرنے والا وہی اعرابی تھا۔ ابن عساکر نے حضرت علی شیر خدا سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دعا سے عاجز نہ آجاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا مجھ سے مانگو میں تمہیں دوں گا۔ صحابہ نے عرض کی ہم نہیں جانتے کہ ہم کب دعا کریں تو پھر یرشدون تک آیت نازل ہوئی (1) امام بغوی نے کہا کلبی نے ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہودیوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا اے محمد ﷺ ہمارا رب کیسے ہماری دعائیں سنتا ہے، جبکہ تم گمان کرتے ہو کہ ہمارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ہر آسمان کی موٹائی بھی اتنی ہے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ سائل کو اپنی طرف مضاف کر کے اسے عزت سے نوازنا اس سے مانع ہے کہ سائل یہودی ہو اور سوال کرنے میں سرکشی کرنے والا ہو، واللہ اعلم۔ یہ سوال کہ ہمارا رب قریب ہے تو ہم اس سے مناجات کریں یا دور ہے تو اس کو ندا کریں، کے جواب میں آیت کا نزول ذکر خفی کی طرف راہنمائی کرتا ہے نہ کہ ذکر جہر پر راہنمائی کرتا ہے جو مخفی نہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے خیبر پر حملہ کیا تو لوگ ایک وادی میں جمع ہوئے اور لا الہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر کے کلمات کے ساتھ اپنی آوازوں کو بلند کیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو تم بہرے اور غائب کو نہیں بلا رہے بلکہ تم سمیع اور قریب کو پکار رہے ہو، وہ تمہارے ساتھ ہے اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے (2) مفسرین نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ میں علم کے اعتبار سے قریب ہوں، مجھ پر کوئی شے مخفی نہیں۔ امام بیضاوی نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کے افعال اور ان کے اقوال کے متعلق کمال علم اور ان کے احوال پر مطلع ہونے کو ایسے آدمی کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی جس کا مکان ان کے قریب ہو (3) میں کہتا ہوں یہ تاویل اس امر پر مبنی ہے کہ ان کے نزدیک قرب صرف قرب مکانی میں منحصر ہے جبکہ اللہ تعالیٰ مکان اور مکانیت کی مماثلت سے پاک ہے۔ حق بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ممکنات کے ساتھ ایسا قرب رکھتا ہے جس کا ادراک عقل سے نہیں کیا جا سکتا، بلکہ وحی اور فراست صحیح سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ قرب مکانی کی جنس سے تعلق نہیں رکھتا اور تشبیہ کے ذریعے بھی اس کی شرح متصور نہیں ہو سکتی کیونکہ اس جیسا کوئی نہیں۔ قریب ترین تمثیل اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا ممکنات کے ساتھ قرب اس طرح ہے جس طرح شعلہ جوالہ کو موہوم دائرہ کے ساتھ ہوتا ہے، کیونکہ شعلہ دائرہ میں داخل نہیں ہوتا کیونکہ موجود حقیقی اور موجود موہوم کے درمیان بہت بعد ہے، نہ وہ شعلہ اس دائرہ سے خارج ہوتا ہے نہ اس کا عین ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا غیر ہوتا ہے۔ وہ دائرہ سے اتنا قریب ہے کہ وہ دائرہ اپنے سے اتنا قریب نہیں کیونکہ وہ دائرہ خود اس شعلہ ہی سے پیدا ہوا ہے اور اس دائرہ کا وجود خارج میں نہیں بلکہ خارج میں ایک نقطہ خارجیہ کے سبب سے اس کا وجود وہمی پیدا ہو گیا ہے و اللّٰہ اعلم۔

[2] قرأت: قالون کے علاوہ اہل مدینہ اور ابو عمرو کی قرأت یہ ہے کہ وصل کی صورت میں دونوں میں (الداع اور دعان) میں یاء کو باقی رکھتے ہیں اور وصل و وقف میں یاء کو حذف کرتے ہیں۔ اسی طرح قراء کا ان یاءات کے اثبات میں اختلاف ہے جو خطاً حذف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 224 (فکر) 2۔ صحیح بخاری: 3968 (ابن کثیر) 3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2، صفحہ 469 (علمیہ)

ہوتی ہیں کہ انہیں تلاوت میں پڑھا جائے گا یا حذف کیا جائے گا۔

ے مجھ سے اپنی دعاؤں کی قبولیت کا مطالبہ کرو۔ یہاں استجاب کو لام کے ساتھ متعدی کیا گیا کیونکہ حاجت طلب کرنا اور دعا کرنا بندے کی طرف سے اللہ کی عبادت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ استجابت اجابت کے معنی میں ہے، یعنی انہیں چاہئے کہ جب میں انہیں ایمان اور عبادت کی طرف بلاؤں تو وہ اس پر لبیک کہیں جس طرح میں ان کی پکار کو سنتا ہوں جب وہ مجھے اپنی ضروریات کے لئے بلاتے ہیں۔ لغت میں اجابت کا معنی سوال کردہ چیز کا عطا کرنا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا اور بندے کی طرف سے طاعت ہے۔

ے ورش نے بی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں ایمان پر ثابت قدم رہنے کا حکم ہے کیونکہ ایمان کی اصل تو ان میں پہلے ہی ثابت ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس سے حقیقی ایمان کا مطالبہ ہو جو ایمان مجازی کے بعد فنا نفس پر مرتب ہوتا ہے، کیونکہ تاکید کی بنسبت تخصیص زیادہ بہتر ہوتی ہے۔

ے وہ ہدایت پانے کی امید رکھتے ہیں۔ یا معنی یہ ہوگا تاکہ وہ ہدایت پا جائیں۔ رشد گمراہی کی ضد ہے، جس کا معنی مقصود اور وصل کو پانا ہے ان شاء اللہ۔ اگر یہ کہا جائے أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اور ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ یہ دعا کی قبولیت کا وعدہ ہے جس کا توڑنا جائز نہیں جبکہ ایک بندہ بے شمار دعائیں کرتا ہے جبکہ اس کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ امام بغوی نے اس کے جواب میں فرمایا علماء نے ان دونوں آیتوں کے معنوں میں اختلاف کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں دعا کا معنی اطاعت ہے اور اجابت کا معنی ثواب ہے۔ اس لئے یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ ایک قول یہ کیا گیا دونوں آیتوں کا معنی خاص ہے، اگرچہ ان کا لفظ عام ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِي إِنْ شِئْتُ۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ(1) اس صورت میں آیت کا مقصود کفار کے اس قول کا رد ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعاؤں کو نہیں سنتا اور وہ غائب ہے۔ یا دونوں آیتوں کی تقدیر یہ ہوگی میں دعا کو قبول کرتا ہوں اگر دعا قبول کرنا بہتر ہو۔ حضرت ابوہریرہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ تمہاری دعاؤں کو اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک وہ گناہ، قطع رحمی یا جلدی کی دعا نہیں کرتا۔ لوگوں نے عرض کی یہ استعجال (جلدی طلب کرنا) کیا ہے؟ فرمایا بندہ یہ کہتا ہے اے میرے رب میں نے دعا کی، اے میرے رب میں نے دعا کی، میں خیال نہیں کرتا کہ تو میری دعا قبول کرے گا اور پھر دعا میں کمی کر دیتا ہے ...... اور دعا کرنا چھوڑ دیتا ہے اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(2) یا اس کی تقدیر یہ ہے میں اس کی دعا قبول کروں گا اگر وہ محال امر کا سوال نہ کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ عام ہے لیکن اس قول اجیب کا معنی یہ ہے میں سنتا ہوں۔ آیت میں دعا کے قبول کرنے سے زیادہ کا ذکر نہیں آرزوئیں عطا کرنے کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ دعا کو قبول کرتا ہے جو اس نے سوال کیا ہے۔ اگر اس کی تقدیر میں ہو تو اسے عطا فرما دیتا ہے، اگر اس کے لئے مقدر نہ کیا گیا ہو تو آخرت میں اس کے لئے ثواب مقدر کر دیتا ہے، یا اس کے سبب عذاب کو اس سے روک لیتا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا زمین پر جو کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرما دیتا ہے، یا اس سے اس کی مثل عذاب کو روک لیتا ہے جبکہ وہ گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے۔ اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے(3) امام احمد نے حضرت ابوہریرہ سے انہوں نے حضور ﷺ سے روایت کیا کہ کوئی مسلمان بھی اپنے آپ کو کسی مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرما دیتا ہے، یا تو اسے جلدی عطا فرماتا ہے یا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 225 (فکر) 2۔ صحیح مسلم: 2735، جلد 17 صفحہ 43 (علمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 225 (فکر)

اس کے لئے ذخیرہ کر لیتا ہے(1) امام ترمذی نے حضرت جابر سے اسی کی مثل مرفوع روایت سے نقل کیا ہے۔ لیکن اس میں یہ الفاظ ہیں مگر اللہ تعالیٰ اس کا سوال عطا فرماتا ہے یا اسی کی مثل اس سے عذاب کو روک لیتا ہے جب تک وہ گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے(2) ایک قول یہ کیا گیا اللہ تعالیٰ اسی وقت اس کی دعا قبول کر لیتا ہے اور اس کی مراد عطا کرنے کو مؤخر کر دیتا ہے تاکہ وہ بندہ اسے پکارے اور اللہ تعالیٰ اس کی آواز کو سنے۔ اور جس انسان کو وہ پسند نہیں کرتا اسے جلدی عطا فرما دیتا ہے، کیونکہ اس کی آواز کو وہ ناپسند کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا دعا کے آداب اور شرائط ہیں، جو اس کی قبولیت کے اسباب ہیں جس نے ان شرائط کو مکمل کیا وہ دعا کی قبولیت کا مستحق بن گیا اور جس نے ان میں کمی کی وہ دعا میں حد سے تجاوز کرنے والا بن گیا، وہ دعا کی قبولیت کا مستحق نہ بنا۔ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ حضور ﷺ نے ایک آدمی کا ذکر فرمایا جو طویل سفر کرتا ہے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے کہتا ہے اے میرے رب بال اس کے بکھرے ہوئے اور غبار آلود، اس کا کھانا حرام کا، پینا حرام کا، لباس حرام کا اور اسے غذا بھی حرام کی دی گئی تو اس کی دعا کیسے قبول ہو گی۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(3) میرے نزدیک اس باب میں تحقیق یہ ہے کہ ہم نے جو بھی اقوال ذکر کئے ہیں وہ سب صحیح ہیں اور یہ بھی کہ ہر دعا قبول نہیں ہوتی۔ اس آیت کا مدلول یہ ہے کہ دعا کا مقتضیٰ قبولیت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جواد و کریم اور عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہے۔ جس کی یہ صفت ہو تو عقل اور نقل کے اعتبار سے یہ ثابت ہے کہ وہ سوال کو رد نہیں کرتا۔ امام ترمذی اور ابو داؤد نے سلمان سے نقل کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا رب حیی اور کریم ہے، وہ بندے سے حیاء کرتا ہے کہ جب بندہ اس کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے تو وہ اس کے ہاتھ خالی لوٹا دے(4) بے شک بعض اوقات دعا کی قبولیت مؤخر ہو جاتی ہے، یہ یا تو کسی حکمت کے تحت ہوتی ہے یا قبولیت کا کوئی مانع ہوتا ہے اور شرط مفقود ہوتی ہے یا مقصود دعا کرنے والے کو سزا دینا ہوتا ہے۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلٰى نِسَآئِكُمْ ۭ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝

"حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لئے رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا وہ تمہارے لئے پردہ، زینت اور آرام ہیں اور تم ان کے لئے پردہ، زینت و آرام ہو جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم خیانت کیا کرتے تھے اپنے آپ سے پس اس نے نظر کرم فرمائی تم پر اور معاف کر دیا تمہیں سو اب تم ان سے ملو اور طلب کرو جو (قسمت میں) لکھ دیا ہے اللہ نے تمہارے لئے اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لئے سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے صبح کے وقت پھر پورا کرو روزہ کو رات تک اور نہ مباشرت کرو ان سے جبکہ تم اعتکاف بیٹھے ہو مسجدوں میں یہ

1۔ مسند احمد، جلد 2 صفحہ 448 (صادر)
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 3381 (علمیہ)
3۔ صحیح مسلم: 65، جلد 7 صفحہ 88 (علمیہ)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 5 صفحہ 403 (ارشد)

اللہ کی حدیں ہیں ان (کو توڑنے) کے قریب بھی نہ جانا ؎ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کرلیں ؎۔"

؎ رفث جماع سے کنایہ ہے۔ زجاج نے کہا رفث کا کلمہ ان تمام چیزوں کو جامع ہے جن کا ایک مرد عورت کے بارے میں ارادہ کرتا ہے۔ یہاں الی کے ساتھ اسے اس لئے متعدی کیا گیا کیونکہ یہ افضاء کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ امام احمد، ابوداؤد اور حاکم نے عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کی سند سے انہوں نے معاذ بن جبل سے روایت کیا کہ صحابہ کھانا کھاتے، پانی پیتے اور اپنی بیویوں کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کرتے رہتے، جب تک کہ وہ سوتے نہیں تھے۔ جب وہ سو جاتے تو پھر اس عمل سے رک جاتے۔ ایک انصاری صحابی جس کا نام صرمہ تھا، اس نے عشاء کی نماز پڑھی پھر سو گیا۔ اس نے نہ کچھ کھایا اور نہ ہی کچھ پیا یہاں تک کہ اس نے صبح کی لیکن بڑی مشقت کے ساتھ کی۔ جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سونے کے بعد اپنی زوجہ سے خواہش پوری کی تھی۔ حضرت عمر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(1) یہ حدیث ابن ابی لیلیٰ سے مشہور ہے۔ انہوں نے حضرت معاذ سے نہیں سنا تھا۔ اس کے کئی شواہد ہیں۔ امام بخاری نے حضرت براء سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام میں سے جب کوئی روزے سے ہوتا افطار کا وقت ہوتا اور وہ افطار کئے بغیر سو جاتا تو نہ اس رات کو کچھ کھاتا اور نہ ہی اگلے دن، یہاں تک کہ اگلی شام ہو جاتی۔ حضرت قیس بن صرمہ انصاری روزے کی حالت میں تھے، جب افطاری کا وقت ہوا تو وہ اپنی بیوی کے پاس آئے۔ پوچھا تمہارے پاس کھانا ہے اس نے کہا کھانا تو نہیں لیکن ٹھہرو میں تمہارے لئے کہیں سے کھانا لاتی ہوں۔ اس روز وہ دن کو کام کرتے رہے تھے اس لئے نیند آ گئی۔ بیوی آئی جب انہیں اس حال میں دیکھا تو کہا بہت بڑا خسارہ ہو گیا۔ جب دوسرے روز دوپہر ہوئی تو ان پر غشی طاری ہو گئی۔ اس کا ذکر حضور ﷺ سے کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی(2) امام بخاری نے حضرت براء سے نقل کیا ہے کہ جب روزوں کا حکم نازل ہوا تو وہ پورے رمضان میں بیویوں کے قریب نہیں جاتے تھے۔ کچھ لوگ اپنے آپ کے ساتھ خیانت بھی کر لیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا" اللہ تعالیٰ نے جان لیا کہ تم اپنے ساتھ خیانت کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے تم پر نظر رحمت فرمائی اور تمہیں معاف کر دیا(3) امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم نے عبداللہ بن کعب سے وہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں۔ کہا کہ لوگ رمضان میں جب روزے رکھتے جب کوئی آدمی روزے سے ہوتا شام ہو جاتی وہ سو جاتا، تو اس پر کھانا، پینا اور عورتیں حرام ہو جاتیں، یہاں تک کہ وہ اگلے روز شام کے وقت افطار کرتا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کی بارگاہ سے واپس آئے جبکہ وہ آپ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ اپنی بیوی سے حقوق زوجیت کا ارادہ کیا بیوی نے کہا میں تو سو چکی ہوں۔ حضرت عمر نے فرمایا میں تو نہیں سویا اور اس سے حقوق زوجیت ادا کئے۔ حضرت کعب بن مالک نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو تمام معاملہ کی خبر دی تو یہ آیت نازل ہوئی(4) امام بغوی نے کہا ابتدائے اسلام میں یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی آدمی نماز پڑھ لیتا یا اس سے پہلے ہی سو جاتا تو اس پر کھانا، پینا اور جماع کرنا اگلی رات تک حرام ہو جاتا(5) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عشاء کے بعد حقوق زوجیت ادا کئے تھے تو حضور ﷺ کی خدمت میں معذرت پیش کی۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اے عمر صرف

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 445 مطبوعہ مکتبہ الرشد الریاض
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 256-257 وزارت تعلیم اسلام آباد
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 847 (وزارت تعلیم)
4۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 357 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت
5۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 136 مطبوعہ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر

تم ہی اس کے مستحق نہ تھے، لوگ اٹھے اور انہوں نے اسی طرح کے اعتراف کئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

۲ یہ جملہ مستانفہ ہے اور علت کے سبب کا بیان ہے۔ زیادہ میل جول کی وجہ سے مرد کا عورت سے اجتناب مشکل ہوتا ہے اور یہی علت کا سبب بنتا ہے۔ جب مرد اور عورت آپس میں معانقہ کرتے ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک دوسرے سے لپٹا ہوتا ہے تو اس کیفیت کو لباس سے تشبیہ دی گئی۔ یا جس طرح لباس انسان کو ڈھانپ لیتا ہے اسی طرح ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے ان امور سے پردہ کا باعث ہوتا ہے جو اس کے لئے حلال نہیں ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے شادی کر لی اس نے اپنے دین کے دو ثلث کی حفاظت کر لی۔(1)

۳ یعنی تم اپنے نفسوں کے ساتھ خیانت کرتے تھے، عشاء کی نماز کے بعد یا سونے کے بعد مجامعت کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے، کیونکہ اس طرح تم اپنے آپ کو عتاب کے لئے پیش کرتے تھے اور اپنے ثواب میں کمی کرتے تھے۔ اختیار خیانت سے بلیغ ہے۔

۴ جب تم نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی تم پر نظر کرم کی۔

۵ اور تمہارے گناہ معاف کر دیئے۔

۶ اب حلال طریقے سے جماع کرو۔ مباشرت، جماع سے کنایہ ہے۔

۷ اللہ تعالیٰ نے تمہارے حق میں جو بچہ مقرر کر دیا ہے اسے طلب کرو۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت سے مجامعت کرے تو اسے چاہئے کہ اس کے ذریعے بچے کی خواہش کرے، محض شہوت کو پورا کرنے کے لئے ایسا نہ کرے۔ اس پر یہی دلیل کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا محبت کرنے والی اور بچے جننے والی عورتوں سے شادی کرو کیونکہ میں تمہاری کثرت کے ساتھ دوسری امتوں پر فخر کروں گا(2) اسے ابوداؤد اور نسائی نے معقل بن یسار سے روایت کیا ہے۔ نیز آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے عزل کرنا مکروہ ہے۔ اور اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جماع صرف اپنے محل میں ہی مباح ہے۔ امام بغوی نے کہا کہ حضرت معاذ بن جبل نے فرمایا کہ اِبْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ سے مراد لیلۃ القدر ہے(3) میں کہتا ہوں یہ معنی سیاق سے بہت ہی دور ہے۔

۸ یعنی جب دن کی سفیدی رات کی سیاہی سے ظاہر ہو جائے۔ دونوں کو خیط کا نام دیا گیا کیونکہ جب ان دونوں کا آغاز ہوتا ہے تو یہ جنوباً شمالاً ایک خط کی صورت میں پھیلتے ہیں۔ من الفجر کا قول الخیط الابیض سے حال ہے اور ذو الحال کی وضاحت کر رہا ہے۔ الخیط اور الاسود کی وضاحت نہیں کی، کیونکہ خیط ابیض کی وضاحت کے ساتھ اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ من حرف جار بیانیہ ہے یا تبعیضیہ ہے یعنی فجر ہو جائے، یا کچھ فجر ہو جائے۔ یہاں حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْفَجْرُ نہیں فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ اس کے پہلے جزء کے ظاہر ہونے کے ساتھ ہی کھانا کھانا حرام ہو جاتا ہے نیز حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْفَجْرِ نہیں فرمایا، بلکہ خیط اسود کا بھی ذکر کیا ہے تا کہ اس پر دلالت ہو کہ فجر سے مراد فجر صادق ہے، کیونکہ یہ خیط ابیض کی صورت میں ہوتی ہے جو شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہوتا ہے، جس کے ساتھ خیط اسود مغرب کی جانب ملا ہوتا ہے۔ یہی رات کی سیاہی کی ایک طرف ہوتی ہے۔ فجر کاذب کا معاملہ مختلف ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک سفید خط ہوتا ہے جو شرقاً غرباً لمبا ہوتا ہے۔ جس کی تمام اطراف میں سیاہی ہوتی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ من الفجر دو خیطوں کے لئے بیان ہے، کیونکہ فجر میں سیاہی اور سفیدی دونوں ہوتی ہیں۔ یہ تعبیر زیادہ بہتر

1۔ تفسیر بغوی بحاشیہ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 137 (التجاریہ) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 287 کتب امدادیہ ملتان 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 137 (تجاریہ)

ہے کیونکہ اس صورت میں وہ اعتراض بھی باقی نہیں رہتا کہ حال اور ذوالحال کے درمیان اجنبی چیز کا فاصلہ حائل ہے، واللہ اعلم۔

حضرت سمرہ بن جندب سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اور فجر مستطیل تمہیں سحری کرنے سے نہ روکے مگر افق میں پھیلنے والی سفیدی۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے(1) حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا بلال رات کو اذان دیتے ہیں، تم کھاتے پیتے رہا کرو، یہاں تک کہ عبداللہ بن ام مکتوم اذان کہیں۔ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نابینا تھے وہ اذان نہیں دیتے تھے، یہاں تک کہ لوگ انہیں یہ کہتے کہ تم نے صبح کر دی صبح کر دی(2)

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے صبح کی نماز پڑھی۔ پھر فرمایا اب خیط اسود سے خیط ابیض واضح ہوا۔ اسے ابن منذر نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اسی طرح ابن منذر نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اگر کھانے کی رغبت اور حرص نہ ہوتی تو میں صبح کی نماز پڑھ کر سحری کرتا۔ ابن منذر اور ابن ابی شیبہ نے ایک سند سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے دروازہ بند کرنے کا حکم دیا تا کہ فجر دکھائی نہ دے۔ یہ آثار اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ صبح کے پھیل جانے کے بعد بھی کھانے کا جواز ہے۔ تو ان کے اقوال کی کیا توجیہ ہوگی؟

اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، میں کہتا ہوں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی شیر خدا کے اقوال کی وجہ یہ ہے کہ دونوں نے یہ گمان کیا کہ من سببیہ ہے اور خیط سے حقیقی معنی مراد ہے لیکن سنت سے یہ ثابت ہے کہ من بیانیہ ہے اور خیط ابیض سے مراد صبح ہے۔ اسی پر علماء کا اجماع ہے۔ حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے ایک سیاہ اور سفید رسی تلاش کی اور انہیں اپنے سرہانے کے نیچے رکھا رات کے وقت میں انہیں دیکھتا رہا لیکن رسیاں مجھ پر نمایاں نہ ہوئیں۔ صبح میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے سامنے اس چیز کا ذکر کیا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اس سے دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی مراد ہے(3) متفق علیہ۔ ایک روایت میں ہے تو کم فہم ہے، اس سے دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی مراد ہے۔ حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے کہ مذکورہ آیت نازل ہوئی مگر اس میں ابھی من الفجر کے الفاظ نازل نہ ہوئے جب لوگ روزے کا ارادہ کرتے تو وہ اپنے پاؤں میں ایک سفید اور ایک سیاہ دھاگا باندھ لیتے اور کھانا کھاتے رہتے یہاں تک کہ وہ دھاگے واضح ہو جاتے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے من الفجر کے الفاظ نازل فرمائے تو لوگوں کو علم ہو گیا کہ دونوں دھاگوں سے مراد رات اور دن ہے، متفق علیہ(4)۔

اگر یہ کہا جائے کہ سہل بن سعد کی حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ من الفجر کے الفاظ دوسری آیت کے بعد نازل ہوئے۔ اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ بیان ضرورت کے بعد واقع ہوا ہے، یہ جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں خیط ابیض اور خیط اسود دن کی سفیدی اور رات کی تاریکی میں مشہور و معروف تھی جس کی دلالت ظاہر تھی، جس کا بیان ضروری نہیں تھا، اگرچہ بعض لوگوں پر تدبر کی کمی کی وجہ سے یہ مخفی رہی۔ یہ مشکل کی قسم سے ہوگی جس کی مراد صیغہ کی وجہ سے مخفی ہوگی۔ اسی وجہ سے کہ اس میں مجاز استعمال ہوا، یا کسی اور وجہ سے اس کی مراد مخفی ہوئی۔ اس کی مراد تامل اور طلب کے ساتھ معلوم کی جا سکتی ہے۔ یہاں من الفجر کے الفاظ کا نزول بطور احتیاط، اہلیت نہ رکھنے والوں کی غلطی کھانے سے حفاظت اور سامعین کو طلب اور تامل سے مستغنی کرنے کے لئے ہوا یہ مجمل نہیں جس کی مراد صرف شارع کی جانب سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ایسی صورت میں وحی

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 88-89 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 86-87 وزارت تعلیم اسلام آباد
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 257 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 647 (وزارت تعلیم)

میں تراخی کوئی ممنوع عمل نہ تھا۔ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ یہ مجمل ہے، شائد اس کا بیان غیر متلو سے صادر ہوا اور سنت سے ثابت ہوا جس پر عدی بن حاتم کی حدیث دلالت کرتی ہے، پھر من الفجر کے الفاظ اس کی تائید اور تاکید کے لئے نازل ہوئے۔ امام طحاوی نے کہا یہ نسخ کے باب سے تعلق رکھتا ہے، خیطین سے جو مفہوم ظاہر میں سمجھ آتا تھا حکم اسی پر تھا۔ امام طحاوی کے قول کی تائید حضرت حذیفہ کی حدیث کرتی ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کی۔ اللہ کی قسم دن ہو چکا تھا مگر ابھی سورج طلوع نہ ہوا تھا۔ اسے سعید بن منصور نے روایت کیا۔ طحاوی میں بھی اسی طرح ہے۔ شائد حضرت حذیفہ کا حضور ﷺ کے ساتھ کھانا یہ من الفجر کے الفاظ کے نازل ہونے سے پہلے تھا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ من الفجر تو مستقل کلام نہیں، ناسخ تو مستقل کلام ہوتی ہے تو پھر اسے ناسخ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے، اگر اسے متاخر مانا جائے تو اسے تخصیص بھی نہیں مان سکتے کیونکہ تخصیص کے لئے بھی اتصال ضروری ہے، دونوں میں فصل درست نہیں تو پھر اس کلام کی کیا توجیہ ہوگی؟ میں کہتا ہوں کہ پہلی دفعہ آیت من الفجر کی قید کے بغیر نازل ہوئی پھر کچھ مدت بعد آیت دوبارہ نازل ہوئی جس میں من الفجر کے الفاظ بھی تھے تو پہلی آیت حکم اور تلاوت دونوں اعتبار سے ساقط ہوگئی و اللہ اعلم۔

فائدہ:۔ حضرت عدی بن حاتم کی حدیث اللہ تعالیٰ کے فرمان من الفجر کے بعد کی ہے کیونکہ حضرت عدی بن حاتم سن نو ہجری میں مسلمان ہوئے جبکہ روزوں والی آیت سن دو ہجری میں نازل ہوئی اور من الفجر کے الفاظ تقریباً ایک سال کے بعد نازل ہوئے تو حضرت عدی بن حاتم سے جو روایت مروی ہے کہ انہوں نے دو دھاگے اپنے سرہانے کے نیچے رکھے، یہ محض ان کی طرف سے یہ گمان تھا کہ من سببیہ ہے و اللہ اعلم۔

فائدہ:۔ فجر کے طلوع ہونے تک مباشرت کی اجازت دینا اس امر کی دلیل ہے کہ جنبی کے لئے فجر صادق کے طلوع ہونے کے بعد تک غسل کو موخر کرنا صحیح ہے، جس نے حالت جنابت میں صبح کی بالاجماع وہ روزے سے ہوگا۔

یہ روزے کے آخری وقت کا بیان ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب رات ادھر سے آ جائے اور یہاں سے دن پیٹھ پھیر لے اور سورج غروب ہو جائے تو روزے دار روزہ افطار کرے (1) اسے امام بخاری نے روایت کیا۔ اس آیت سے روزے کی حقیقت ظاہر ہوگئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تین مفطرات سے صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک نیت کے ساتھ رکے رہنا روزہ ہے۔ روزے کی نیت کا وجوب اللہ تعالیٰ کے فرمان ثُمَّ اَتِمُّوا سے مستفاد ہے کیونکہ اتمام اختیاری فعل ہے۔ یا اس لئے کہ یہ عبادت ہے، اس لئے اسے نیت کی ضرورت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (حالانکہ نہیں حکم دیا گیا تھا انہیں یہ کہ عبادت کریں اللہ تعالیٰ کی دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے۔) اور حضور ﷺ کا فرمان اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، ہر ایک انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے اعمال میں نیت کی، جس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہو اس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہوگی، جس کی ہجرت دنیا کے لئے ہوتا کہ اسے حاصل کرے یا عورت کی طرف ہوتا کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کے لئے اس نے ہجرت کی (2) اس حدیث کو ایک جماعت نے نقل کیا۔ مگر امام مالک نے یہ حدیث موطا میں نقل نہیں کی۔ البتہ امام بخاری نے امام مالک کی سند سے یہ حدیث نقل کی ہے۔ یہ حدیث معنی کے اعتبار سے متواتر ہے۔ اس کے الفاظ یحییٰ بن سعید سے متواتر ہیں۔ وہ محمد بن ابراہیم سے نقل کرنے میں منفرد ہیں وہ علقمہ بن وقاص سے روایت کرنے میں منفرد ہیں۔ اور وہ حضرت عمر سے روایت کرنے میں منفرد ہیں۔ اسے امت نے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 282 مطبوعہ وزارت تعلیم اسلام آباد
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 13 (وزارت تعلیم)

قبولیت سے نواز۔ تمام علماء کا اس امر پر اجماع ہے کہ کوئی عبادت مقصودہ نیت کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ نیت تمام عبادت کے ساتھ مقترن ہو لیکن حرج لاحق ہونے کی وجہ سے یہ حکم ساقط ہو گیا، صرف نماز کے پہلے جزء یعنی تکبیر تحریمہ کے ساتھ ملانے کی شرط لگا دی گئی اور باقی ماندہ نماز میں حکمی طور پر ملنے کو تسلیم کیا گیا۔ روزے میں بالا جماع پہلے جزء میں نیت شرط نہیں کیونکہ روزے کا پہلا جزء غفلت کا وقت ہے۔ اسی وجہ سے علماء نے اس بات کو بھی جائز قرار دیا کہ وہ نیت اس پہلے جزء سے بھی پہلے ہو اور جب تک وہ روزے کو نہ توڑے اس وقت تک وہ باقی رہے گی۔ تاہم علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اگر روزے دار نے طلوع فجر کے بعد نیت کی تو کیا یہ نیت معتبر ہوگی یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا رمضان شریف، نذر معین اور نفلی روزے کی نیت نصف النہار سے پہلے کرنا جائز ہے، امام شافعی اور امام احمد نے کہا نفلی روزہ تو نصف النہار سے پہلے نیت کرنے سے صحیح ہوتا ہے مگر فرض روزے صحیح نہیں ہوتے، امام مالک نے فرمایا دن کے وقت نیت کرنے سے کوئی روزہ بھی صحیح نہیں ہوتا۔ یہی قیاس ہے۔ امام مالک کی تائید حضرت حفصہ کی حدیث کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے طلوع فجر سے پہلے روزہ کی نیت نہ کی اس کا روزہ نہیں (1) اسے امام احمد ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں، ابن ماجہ، دار قطنی اور دارمی نے روایت کیا۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں فَلَا يَصُوْمُ ایک روایت میں ہے لَا صِيَامَ لِمَنْ لَمْ يَفْرِضْهُ مِنَ اللَّيْلِ (اس کا روزہ نہیں جس نے رات کو اپنے اوپر اسے لازم نہ کیا)۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں مَنْ لَمْ يُبَيِّتِ الصِّيَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَا صِيَامَ لَهُ جس نے فجر سے پہلے اپنے اوپر روزوں کو لازم نہ کیا تو اس کے روزے نہیں (2) اگر یہ سوال کیا جائے کہ ابوداؤد نے کہا ہے اس کو مرفوع نقل کرنا صحیح نہیں۔ امام ترمذی نے کہا موقوف زیادہ صحیح ہے۔ ہم اس کا جواب دیں گے کہ اسے ابن جریج اور عبداللہ بن ابی بکر نے زہری، سے انہوں نے سالم، سے انہوں نے اپنے باپ حضرت عبداللہ سے، انہوں نے حضرت حفصہ سے نقل کیا ہے، ابن جریج اور عبداللہ بن ابی بکر ثقہ لوگوں میں سے ہے، ان کا اس روایت کو مرفوع نقل کرنا اضافہ ہوگا، جبکہ ثقہ کا اضافہ مقبول ہوتا ہے۔ محدثین کا اسلوب یہ ہے کہ موقوف اور مرسل پر سند روک دیتے ہیں، موقوف کا اصح ہونا یہ مرفوع کی صحت کے منافی نہیں۔ حاکم نے مرفوع کے بارے میں کہا کہ یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے، مستدرک میں کہا امام بخاری کی شرط پر یہ حدیث صحیح ہے۔ بیہقی اور دار قطنی نے کہا اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ اس باب میں حضرت عائشہ کی حدیث ہے جس نے طلوع فجر سے پہلے روزے کو اپنے اوپر لازم نہ کیا اس کا روزہ نہیں اسے دار قطنی نے راویت کیا اور کہا اس کے راوی ثقہ ہیں، لیکن اس میں عبداللہ بن عباد ہے جسے ابن حبان نے ضعفاء میں ذکر کیا۔ اس سند میں یحییٰ بن ایوب ہے جو قوی نہیں اور میمونہ بنت سعد کی ایک مرفوع حدیث ہے کہ جس نے رات کو ہی روزے کی نیت کر لی پس وہ روزہ رکھے اور جس نے اس حال میں صبح کی کہ اس نے نیت نہ کی تھی تو وہ روزہ نہ رکھے (3) اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اس سند میں واقدی ہے جو کچھ بھی نہیں۔

علماء نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت سے دن کے وقت نیت کرنے کے جواز کو نقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لاتے تو پوچھتے کیا کھانا ہے؟ جب ہم عرض کرتے کہ کھانا نہیں ہے تو آپ ﷺ فرماتے پھر میں روزے سے ہوں (4) آپ ﷺ ایک روز میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے عرض کی ہمیں حلوہ تحفہ کے طور پر بھیجا گیا ہے۔ فرمایا لے آؤ میں نے صبح روزے سے کی تھی۔ امام مسلم کی ایک روایت میں ہے فرمایا کیا تمہارے پاس کھانا ہے؟ میں نے عرض کی میرے

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 91 مطبوعہ وزارت تعلیم اسلام آباد　2۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 172 (محاسن)
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 173 (محاسن)　4۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 326 (وزارت تعلیم)

پاس تو کچھ بھی نہیں۔ فرمایا پھر میں روزے سے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے ہمیں ایک تحفہ بھیجا گیا۔ جب آپ ﷺ واپس تشریف لائے عرض کی ہمارے ہاں تحفہ بھیجا گیا ہے پوچھا وہ کیا ہے؟ میں نے عرض کی کھجوروں کا حلوہ ہے۔ فرمایا لے آؤ۔ میں اسے لے آئی۔ آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا پھر فرمایا میں نے صبح روزے کی حالت میں کی (1) اس کا جواب یہ دیا گیا یہ حدیث اس امر پر دلالت نہیں کرتی کہ نبی کریم ﷺ نے دن کے وقت روزے کی نیت کی، رات کو نیت نہیں کی۔ بلکہ اس سے جو بات عیاں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے صبح اس حال میں کی کہ رات کے وقت سے ہی آپ ﷺ نے روزہ کی نیت کر رکھی تھی پھر آپ ﷺ گھر تشریف لاتے تو کبھی کبھی نفلی روزہ توڑ دیتے تھے۔ اس پر آپ ﷺ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: قَدْ كُنْتُ اَصْبَحْتُ صَائِمًا۔

عکوف کا معنی کسی شے پر قیام کرنا ہے۔ شرع میں اعتکاف سے مراد مسجد میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نیت کے ساتھ ٹھہرنا ہے۔ امام بغوی نے کہا یہ آیت صحابہ کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی، وہ مساجد میں اعتکاف کرتے تھے۔ جب ان میں سے کسی کو گھر والوں کے متعلق کوئی خواہش ہوتی تو وہ گھر جاتا اور اپنی زوجہ سے حقوق زوجیت ادا کرتا، پھر غسل کرتا اور مسجد واپس آجاتا۔ تو اعتکاف کرنے والوں کو دن اور رات کے وقت اس عمل سے روک دیا گیا یہاں تک کہ وہ اعتکاف سے فارغ ہو جائیں (2) جماع کے ساتھ اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے۔ بالاجماع اعتکاف میں جماع حرام ہے، مگر امام شافعی کا ایک قول یہ ہے کہ اگر اس نے بھول کر اعتکاف میں جماع کر لیا تو جس طرح روزہ نہیں ٹوٹتا اسی طرح اس کا اعتکاف بھی نہ ٹوٹے گا۔ ہم امام شافعی کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اعتکاف کی حالت اسے اعتکاف کی یاد دلاتی ہے، روزے کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ حضرت حسن بصری اور امام زہری کا نقطۂ نظر یہ ہے جس نے اعتکاف کی حالت میں بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے تو اس پر کفارہ یمین ہوگا۔ جبکہ علماء کا اجماع اس پر ہے کہ اس پر کفارہ نہیں ہوگا۔

اگر معتکف نے بوسہ لیا یا شہوت کے ساتھ چھوا اور اسے انزال ہو گیا تو بالاتفاق اس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ اگر اسے انزال نہ بھی ہوا تو یہ عمل حرام ہے، سوائے امام مالک کے کسی کے نزدیک بھی اس کا اعتکاف باطل نہیں ہوگا۔ مگر ایسا چھونا جس میں لذت کا حصول پیش نظر نہ ہو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اعتکاف فرماتے تو آپ ﷺ اپنا سر مبارک میرے قریب کرتے تو میں آپ ﷺ کے بالوں میں کنگھی کرتی، متفق علیہ۔ آقائے دو عالم ﷺ گھر میں صرف طبعی ضرورت کے لئے ہی تشریف لاتے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ (3)

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اعتکاف مسجد میں ہی ہونا چاہئے۔ یہ جماعت والی مسجد ہے، گھر والی مسجد نہیں۔ آیت میں لفظ کا مطلق ہونا اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ اعتکاف کسی مسجد میں بھی کیا جا سکتا ہے، یہ مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ اور جامع مسجد کے ساتھ خاص نہیں، جبکہ امام مالک کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اعتکاف صرف جامع مسجد میں کیا جا سکتا ہے۔ امام شافعی کا بھی پہلا قول یہی تھا حضرت ابن عباس کا قول یہ ہے کہ مبغوض ترین عمل بدعت ہے اور بدعت میں سے یہ بھی ہے کہ گھر والی مساجد میں اعتکاف کیا جائے (4) اسے امام بیہقی نے نقل کیا ہے۔ حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ اعتکاف صرف اسی مسجد میں جائز ہے جس میں جماعت ہوتی ہو (5) سے ابن ابی شیبہ اور عبدالرزاق نے اپنی اپنی مصنف میں نقل کیا ہے۔ حضرت حذیفہ سے مروی ہے، فرمایا جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے اس بات کا علم ہے کہ اعتکاف جماعت والی مسجد میں ہوتا ہے۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔ ابن

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 284 (قدیمی)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 138 (تجاریہ)　3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 142 (قدیمی)
4۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 4 صفحہ 316 مطبوعہ دارالفکر بیروت　5۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 2 صفحہ 337 مطبوعہ دارالتاج بیروت

جوزی نے حذیفہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ ہر وہ مسجد جس میں مؤذن اور امام ہو اس میں اعتکاف صحیح ہے۔ ابن جوزی نے کہا یہ روایت بہت ہی ضعیف ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت مروی ہے کہ معتکف کے لئے یہ طریقہ ہے کہ وہ مریض کی عیادت نہ کرے، جنازہ میں حاضر نہ ہو، عورت کو نہ چھوئے، اس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا نہ کرے اور بنیادی ضرورت کے سوا باہر نہ نکلے۔ روزے کے بغیر اعتکاف نہیں اور جامع مسجد کے سوا بھی اعتکاف نہیں۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(1) ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اعتکاف صرف جماعت والی مسجد میں ہے۔

مسئلہ:۔ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف سنت مؤکدہ ہے کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ آخری عمر تک رمضان شریف کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی ازواج اعتکاف فرماتی تھیں۔(2) متفق علیہ۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی بھی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے، متفق علیہ۔(3) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے ایک سال آپ ﷺ نے اعتکاف نہ فرمایا، جب اگلا سال آیا تو آپ ﷺ نے رمضان کے دو عشروں میں اعتکاف کیا۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے(4) اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے ابی بن کعب سے بھی نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں لیکن اکثر صحابہ نے اعتکاف نہیں کیا۔ ابن نافع نے کہا یہ صوم وصال کی طرح ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ صحابہ نے اعتکاف کے تحت ہونے کی وجہ سے اعتکاف نہیں کیا۔ اسلاف میں سے کسی کے بارے میں مجھے یہ خبر نہیں پہنچی کہ انہوں نے اعتکاف کیا ہو، مگر ابوبکر بن عبدالرحمٰن کے بارے میں مروی ہے کہ وہ اعتکاف کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے فرمایا ہم نے کئی صحابہ سے بیان کیا کہ انہوں نے اعتکاف کیا۔ میں کہتا ہوں کہ کثیر صحابہ نے اعتکاف کو ترک کیا، اسی وجہ سے بعض احناف فرماتے ہیں کہ یہ سنت کفایہ ہے و اللّٰہ اعلم۔

۱۱ اس سے مراد وہ احکام ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے یعنی روزے کی حالت میں کھانے پینے اور جماع کی حرمت، اسی طرح اعتکاف میں مباشرت کی حرمت۔ یعنی جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا اور حد کا لغوی معنی روکنا ہے۔

۱۲ روکنے سے مبالغہ کے لئے اس کے قریب جانے سے بھی ہے چہ جائیکہ انسان اسے کر گزرے۔ سورت کے آغاز میں یہ حدیث گزری ہے کہ حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، درمیان میں بہت سے مشتبہات ہیں جنہیں بے شمار لوگ نہیں جانتے، جو آدمی مشتبہات سے بچا اس نے اپنی عزت اور دین کو بچا لیا اور جو مشتبہات میں داخل ہو گیا وہ حرام میں واقع ہو گیا۔ اس کی مثال اس چرواہے جیسی ہے جو محفوظ چراگاہ کے قریب ریوڑ چراتا ہے، قریب ہے کہ اس میں واقع ہو جائے۔ خبردار ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محفوظ چراگاہ اس کے محارم ہیں، متفق علیہ(5) حرام چیز کے قریب جانے سے حرمت حاصل ہونے کی وجہ سے ائمہ کرام نے جماع کے اسباب کو بھی جماع کے ساتھ شامل کیا ہے (یعنی جہاں جماع کرنا حرام ہے وہاں ایسے دواعی بھی حرام ہیں) علماء نے روزے اور اعتکاف میں بھی ان کی حرمت کا قول کیا ہے۔ اگر لمس اور بوسہ لینے سے انزال ہو گیا تو روزہ اور اعتکاف فاسد ہو جائیں گے، و اللّٰہ اعلم۔

۱۳ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان احکامات کو واضح کیا اسی طرح تمام آیات کو بھی لوگوں کے لئے واضح فرمایا ہے، تا کہ وہ اوامر

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 342 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 271 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 271
4۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 99 مطبوعہ فاروقی کتب خانہ کراچی 5۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 13 (وزارت تعلیم)

اور منہیات کی مخالفت سے بچیں اور جہنم کی آگ سے بھی بچیں۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٨﴾

21 ZQ

"اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طریقہ سے [1] اور نہ رسائی حاصل کرو اس مال سے (رشوت دیکر) حاکموں تک [2] تا کہ یوں کھاؤ کچھ حصہ لوگوں کے مال کا ظلم سے [3] حالانکہ تم جانتے ہو (کہ اللہ نے یہ حرام کیا ہے) [4]"

[1] یہاں باطل سے مراد جھوٹا دعویٰ، جھوٹی شہادت یا حق کے انکار کے بعد قسم یا غصب، ڈاکہ مارنا، خیانت کرنا، جوا، گانا گانے والے کی اجرت، بے حیائی کا مہر، کاہن کا معاوضہ، نر چھوڑنے کی اجرت، فاسد بیع وشراء، رشوت، اسی طرح کے دوسرے طریقے جنہیں شرع جائز نہیں سمجھتی۔ بین ظرف کی حیثیت سے منصوب ہے یا اموال سے حال ہے۔ یہ آیت امراؤ القیس بن عابس کندی کے حق نازل ہوئی جس پر ربیعہ بن عبدان حضرمی نے حضور ﷺ کی خدمت میں دعویٰ کر دیا تھا کہ امراؤ القیس نے اس کی زمین غصب کر لی ہے۔ حضور ﷺ نے حضرمی سے فرمایا کیا تیرے پاس گواہ ہیں؟ اس نے عرض کی میرے پاس گواہ نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا پھر تیرے لئے ان کی قسم ہے وہ قسم اٹھانے کے لئے چل پڑا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا خبردار! اگر اس نے اپنے ساتھی کا مال غصب کرنے کے لئے قسم اٹھائی تو وہ ظلم کی وجہ سے مال کھائے گا اور اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس سے اعراض فرما رہا ہوگا (1) ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

[2] تدلوا کا عطف اس فعل پر ہے جس پر نہی وارد ہو رہی ہے یا ان مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی تم ان کے فیصلے حکام کے پاس نہ لے جاؤ۔ مجاہد نے کہا اس کا معنی یہ ہے جب تم ظالم ہو تو پھر مخاصمت نہ کرو۔ ابن عباس نے فرمایا یہ آیت اس آدمی کے بارے میں ہے جس نے کسی کا مال دینا ہو اس پر گواہ نہ ہوں، وہ مال کے بارے میں انکار کر دے اور مسئلہ حاکم کے پاس لے جائے تا کہ جھوٹی قسم اٹھا کر جان چھڑا لے۔ کلبی نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جھوٹی قسم اٹھائے۔ یہ الفاظ ان سب کو عام ہیں۔

[3] تا کہ تم لوگوں کے اموال غلط طریقہ سے کھاؤ جیسے جھوٹی قسم، جھوٹی شہادت یا بالاثم حال ہے یعنی اس حال میں کہ تم گناہ کرنے والے ہو۔

[4] تم جانتے ہو کہ تم غلط راہ اپنائے ہوئے ہو۔ حکام کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہ حقیقت حال سے واقف نہیں، وہ تو ظاہر حال کو دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر حاکم کسی فریق کی طرف جھکاؤ کے بغیر شرع کے حکم کے مطابق فیصلہ کرے تو وہ اجر کا مستحق ہے۔ اگرچہ جس کے حق میں فیصلہ ہو وہ گنہگار ہوگا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی کا فیصلہ حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔ حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں بشر ہوں، تم میرے پاس اپنے جھگڑے لاتے ہو، ممکن ہے تم میں سے کوئی دوسرے کی بنسبت دلیل لانے میں اچھا ہو تو میں جو دلائل سنوں گا ان کے مطابق فیصلہ کر دوں گا۔ میں اگر کسی کے حق میں اس کے بھائی کی چیز کا فیصلہ کروں تو وہ اسے ہرگز نہ لے، میں اس کے حق میں جہنم کے ایک ٹکڑے کا فیصلہ کر رہا ہوں (2) اسے امام شافعی نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں بھی

1۔ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 140 (التجاریہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 1062 (وزارت تعلیم)

اسی کی مثل مروی ہے۔ امام ابوحنیفہ نے باطل طریقہ سے مال حاصل کرنے والے کے متعلق مال کی حرمت کے بارے میں وہی کہا ہے جو دوسرے علماء نے فرمایا، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ عقود وفسوخ میں قاضی کا فیصلہ ظاہری اور باطنی طور پر نافذ ہوگا۔ جبکہ جمہور نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس حدیث سے استدلال کیا جس میں یہ مروی ہے کہ دو گواہوں نے حضرت علی شیر خدا کے سامنے ایک عورت پر نکاح کے بارے میں گواہی دی۔ حضرت علی شیر خدا نے نکاح کا فیصلہ کر دیا عورت نے کہا ہمارے درمیان کوئی نکاح نہیں تھا۔ اگر یہ ضروری ہے تو آپ میری اس سے شادی کر دیں حضرت علی شیر خدا نے ارشاد فرمایا ان گواہوں نے تیرا نکاح کر دیا۔(1)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَ اْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۱۸۹

"دریافت کرتے ہیں آپ سے نئے چاندوں کے متعلق (کہ یہ کیوں گھٹتے بڑھتے ہیں) لے فرمائیے یہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے ۲ے اور یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم داخل ہو گھروں میں ان کے پچھواڑے سے ۳ے ہاں نیکی تو یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے ۴ے اور آیا کرو گھروں میں ان کے دروازوں سے ۵ے اور ڈرتے رہو اللہ سے اس امید پر کہ کامیاب ہو جاؤ ۶ے"

لے یہ آیت معاذ بن جبل اور ثعلبہ بن غنم انصاری کے حق میں نازل ہوئی دونوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا وجہ ہے؟ چاند ابتداء میں باریک ظاہر ہوتا ہے پھر بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ نور سے بھر جاتا ہے پھر باریک ہونا شروع ہو جاتا ہے جس طرح پہلے ظاہر ہوا یہ ایک ہی حالت پر کیوں نہیں رہتا؟ امام بغوی نے بھی اسی طرح ذکر کیا(2) اسے ابونعیم اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں سدی صغیر کی سند سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا۔ ابن ابی حاتم نے عوفی کے واسطے سے حضرت ابن عباس سے اسے نقل کیا کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے چاند کے بارے میں پوچھا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم نے ابوالعالیہ سے نقل کیا ہے فرمایا ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ یہ چاند کیوں پیدا کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔(3)

۲ے اگر سوال چاند کی حالت کے مختلف ہونے اور اس میں تبدیلی کی حکمت کے بارے میں ہے تو جواب سوال کے مطابق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ﷺ جواب ارشاد فرمائیں کہ اس میں ظاہر حکمت یہ ہے کہ یہ چاند لوگوں کے لئے ایک علامت ہو جس کے ذریعے لوگ اپنے معاملات کے اوقات کا تعین کریں اور مخصوص اوقات سے متعلق عبادات کے لئے یہ پہچان کا ذریعہ ہو، جس طرح حج، روزہ اور اسی طرح کے دوسرے امور جن کو اوقات کی مدد سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ اگر سوال چاند کے احوال کی تبدیلی کے متعلق ہو جو ظاہر ہے تو جواب اسلوب حکیم کے طریقہ پر ہوگا۔ مقصود اس بات پر آگاہ کرنا ہوگا کہ سائل کے لئے مناسب یہ تھا کہ وہ فائدہ کے بارے میں پوچھتا نہ کہ علت کے بارے میں، کیونکہ علت کے بارے میں سوال کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اس طرح بے مقصد کاموں میں مشغول ہونا ثابت ہوگا۔ یہ اس پر بھی دال ہے کہ علوم غریبہ جیسے علم ہیئت، علم نجوم اور ان جیسے دوسرے علوم جن میں کوئی دینی فائدہ نہیں ان میں مشغول ہونا جائز نہیں۔ مواقیت میقات کی جمع ہے۔ یہ وقت سے اسم آلہ کا وزن ہے۔ اس سے مراد وہ چیز

1۔المبسوط، جلد 16 صفحہ 181 مطبوعہ السعادۃ بجوار محافظہ مصر 2۔تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 141 (التجاریہ) 3۔الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 367 (العلمیہ)

ہے جس کے ذریعے حج، روزہ، قرضہ کے اوقات معینہ، عدت کا ختم ہونا اور اس جیسے دوسرے امور کو پہچانا جا سکے۔

؎ ابن کثیر، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے البیوت، العیون، الشیوخ، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے جیوبھن اور حمزہ اور ابو بکر نے الغیوب کے پہلے حرف کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ مابعد یاء ہے باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ اصل پر پڑھا ہے۔ امام بخاری نے حضرت براء سے نقل کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جب لوگ احرام باندھتے تو پچھلی جانب (۱) سے گھروں میں داخل ہوتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(1) ابن ابی حاتم اور حاکم نے اسے نقل کیا اور حاکم نے اس کی تصحیح کی۔ اس روایت کو انہوں نے حضرت جابر سے نقل کیا۔ قریش کو حمس کہا جاتا۔ یہ حالت احرام میں بھی دروازوں سے ہی داخل ہوتے۔ انصار اور دوسرے عرب احرام کی حالت میں دروازوں سے داخل نہ ہوتے۔ اسی اثناء میں کہ رسول اللہ ﷺ ایک باغ میں تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ دروازے سے باہر تشریف لائے جبکہ آپ ﷺ کے ساتھ قطبہ بن عامر انصاری تھا۔ لوگوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ قطبہ فاجر آدمی ہے وہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ دروازے سے باہر آیا ہے۔ حضور ﷺ نے اس سے دریافت کیا تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے عرض کی کہ میں نے آپ ﷺ کو اس طرح کرتے دیکھا۔ پس میں نے بھی اسی طرح کیا جس طرح آپ ﷺ نے کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں تو حمسی ہوں۔ اس نے عرض کی میرا دین وہی ہے جو آپ ﷺ کا دین ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(2) ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ عبد بن حمید نے قیس بن جبیر سے اسی طرح نقل کیا ہے، لیکن اس میں قطبہ بن عامر کی جگہ رفاعہ بن تابوت کا نام ہے۔ امام بغوی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز ایک انصاری کے گھر تشریف لائے تو رفاعہ اسی دروازے سے داخل ہوا(3) آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ امام زہری نے کہا انصار میں سے کچھ لوگ جب عمرہ کا احرام باندھتے تو کسی مکان یا خیمہ میں نہ رہتے۔ جب کوئی عمرہ کا احرام باندھ کر نکل پڑتا، گھر سے نکلنے کے بعد اسے کوئی کام پڑ جاتا تو وہ واپس آتا تو دروازے پر چھت ہونے کی وجہ سے دروازے سے داخل نہ ہوتا۔ وہ پیچھے سے دیوار سے سوراخ نکالتا، اندر جاتا اور کام کے بارے میں کہتا یہاں تک کہ ہمیں یہ خبر پہنچی کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ نے عمرہ کا احرام باندھا۔ آپ ﷺ کمرے میں داخل ہوئے آپ ﷺ کے پیچھے ایک انصاری بھی کمرے میں داخل ہوا۔(4)

اس عطف کرنے اور فصل نہ لانے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے ایک ہی حادثہ میں دو چیزوں کے بارے میں سوال کیا تھا یا انہوں نے بے فائدہ سوال کیا اور یہ سوال علم نبوت سے متعلق تھا اور فائدہ مند چیز کے بارے میں انہوں نے سوال چھوڑ دیا جو علم نبوت سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے عطف کے ساتھ اسے ذکر کیا۔ گویا یہ فرمایا مناسب یہ تھا کہ وہ اس قسم کا سوال کرتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سوال ممکنات کے حقائق کے بارے میں ایسے طریقہ پر ہو جو فائدہ مند نہ ہو تو اسے پچھلی جانب سے گھر میں داخل ہونے کے ساتھ تشبیہ دی گئی کیونکہ علوم میں بحث و تمحیص کرنا گھر میں داخل ہونے کے قائم مقام ہے، جس طرح گھر میں داخل ہونے کے لئے دروازہ بنایا جاتا ہے تاکہ گھر کے منافع سے لطف اندوز ہوا جائے اسی طرح حقائق میں تفکر کا موضوع ان کے منافع ہیں اور صانع پر استدلال کرنا ہے، محض افعال اس کا موضوع نہیں جن کا فائدہ نہ ہو جیسے علم ہیئت کے مسائل۔

---

(۱) دروازوں سے گھروں میں داخل ہونا احرام کے آداب کے خلاف جانتے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 648 (وزارت تعلیم)
2۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 368 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 141 (التجاریہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 369 (العلمیہ)

۴؎ اس کی بحث اور قراء کے اختلاف پہلے گزر چکے ہیں۔
۵؎ احرام کی حالت میں گھروں میں دروازے سے آؤ اور اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو تم پر حرام کیا ہے ان سے بچو۔
۶؎ تاکہ تم نیکی پالو۔

واحدی نے ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے جب صلح حدیبیہ کے سال آقائے دو عالم ﷺ کو بیت اللہ شریف کی زیارت سے روک دیا گیا پھر مشرکوں نے آپ ﷺ سے اس بات پر مصالحت کی کہ اس سال واپس جائیں اور آپ ﷺ اگلے سال عمرہ کے لئے آئیں۔ جب اگلا سال آیا تو حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ نے عمرہ کی تیاری کی صحابہ کو خوف ہوا کہ قریش وعدہ پورا نہ کریں گے اور مسلمانوں کو مسجد حرام کی زیارت سے روک دیں گے اور ان سے جنگ کریں گے۔ حضور ﷺ کے صحابہ نے شہر حرام میں جنگ کرنے کو ناپسند کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾

"اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور (ان پر بھی) زیادتی نہ کرنا بےشک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا زیادتی کرنے والوں کو۱؎"

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ان سے جنگ کرو۔ جن سے تم جنگ کی توقع رکھتے ہو۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، راہب اور جو تمہیں سلامتی کا پیغام دیں ان کو قتل کر کے حد سے تجاوز نہ کرو۔ حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب لشکر بھیجتے تو فرماتے اللہ تعالیٰ کے نام سے جنگ کا آغاز کرو، اس کی طاعت میں جنگ کرو، جو اللہ تعالیٰ کا انکار کرے اسی سے جنگ کرو، دھوکہ نہ دو، وعدہ خلافی نہ کرو، عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرو(2) اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے۔ امام مسلم نے ایک طویل حدیث میں نقل کیا ہے جس میں یہ الفاظ ہیں: مثلہ نہ کرو، بچے کو قتل نہ کرو۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتیں اور بچے قتل کرنے سے منع کیا ہے(3) متفق علیہ۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے نام سے نکلو اور رسول اللہ ﷺ کی ملت پر گھروں سے نکلو، کسی بوڑھے، چھوٹے بچے اور عورت کو قتل نہ کرنا، خیانت نہ کرنا، غنیمتوں کو جمع کرنا، اصلاح احوال کی کوشش کرنا اور احسان سے کام لینا۔ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے(4) اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ یہ معنی کیا جائے تو آیت محکم ہوگی، منسوخ نہ ہوگی۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد کا بھی یہی قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ابتداء اسلام میں اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کو مشرکوں کے ساتھ جنگ کرنے سے منع کیا تھا۔ پھر جب آپ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو پھر جو لوگ مسلمانوں سے جنگ کریں ان کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا۔ اسی آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے ربیع نے کہا یہ وہ پہلی آیت ہے جو جنگ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ پھر تمام مشرکوں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم ہوا، وہ قتال کریں یا نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً اس صورت میں لَا تَعْتَدُوْا کا معنی یہ ہوگا کہ آپ اپنی طرف سے جنگ کا آغاز نہ

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 372 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 142 (التجاریہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 423 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 259 (وزارت تعلیم)

کریں۔ آخر میں فرمایا اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کے ساتھ خیر کا ارادہ نہیں کرتا۔

وَ اقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹۱﴾

''اور قتل کرو انہیں جہاں بھی انہیں پاؤ اور نکال دو انہیں جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا، اور فتنہ انگیزی تو قتل سے بھی زیادہ سخت ہے، اور نہ جنگ کرو ان سے مسجد حرام کے قریب یہاں تک کہ (وہ) خود تم سے جنگ کرنے لگیں سو اگر وہ لڑیں تم سے تو پھر قتل کرو انہیں یہی سزا ہے (ایسے) کافروں کی ''

ل مقاتل بن حیان نے کہا یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے منسوخ ہے۔ میں یہ کہتا ہوں یہ اس کی ناسخ نہیں بلکہ خاص کر رہی ہے، کیونکہ یہ دونوں آپس میں ملی ہوئی ہیں، جس طرح کہ یہ آیت کریمہ ہے اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا کیونکہ ناسخ منسوخ سے زمانہ کے اعتبار سے متاخر ہوتی ہے۔ ثقف کا معنی کسی چیز کو جلدی سے لینا خواہ وہ علم ہو یا عمل یہ اپنے ضمن میں غلبہ کا معنی لئے ہوئے ہے۔ معنی یہ ہوگا جہاں بھی تم ان کو قتل کرنے پر قادر ہو۔

ل یعنی مکہ سے انہوں نے تمہیں نکالا، تم بھی انہیں نکال دو۔ فتح مکہ کے روز جو لوگ مسلمان نہ ہوئے تھے انہیں بھی مکہ مکرمہ سے نکال دیا گیا تھا۔

ل ان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا اور انہیں مسجد حرام سے روکنا، اللہ تعالیٰ کے ہاں قتل سے بھی زیادہ گناہ کا باعث ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان کو قتل کرنے کی اجازت دی۔ ابن جریر نے مجاہد، ضحاک، قتادہ، ربیع اور ابن زید سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

ل انہیں حرم میں قتل نہ کرو، اگر وہ حرم میں تمہارے ساتھ جنگ کریں تو پھر انہیں حرم میں بھی قتل کرو۔ حمزہ اور کسائی نے وَلَا تَقْتُلُوْهُمْ، حَتّٰی یَقْتُلُوْكُمْ اور فَاِنْ قَتَلُوْكُمْ مجرد سے پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا تم ان میں سے کسی کو قتل نہ کرو یہاں تک کہ وہ تم میں سے کسی کو قتل نہ کریں۔ عرب کہتے ہیں قَتَلَنَا بَنُوْ فُلَانٍ یعنی انہوں نے ہمارے بعض افراد کو قتل کر دیا۔ جبکہ باقی قراء نے یہ صیغے باب مفاعلہ سے پڑھے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ ابتداء اسلام میں ان کے ساتھ حرم میں جنگ شروع کرنا حلال نہیں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ حکم منسوخ ہو گیا وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ مقاتل نے کہا سورۂ برأت میں آیت سیف نے اسے منسوخ کر دیا۔ میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ حرم پاک میں جنگ شروع کرنا جائز نہیں۔ مجاہد اور ایک جماعت نے بھی یہی کہا ہے۔ اس کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جسے شیخین نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ دونوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے روز ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو اس روز سے حرمت بخشی جس روز سے زمین و آسمان کو پیدا کیا گیا اور قیامت تک اس کی حرمت اسی طرح باقی رہے گی۔ اس میں مجھ سے قبل کسی کے لئے قتال حلال نہیں تھا۔ میرے لئے بھی یہ حلال نہیں ہوا مگر دن کی کچھ ساعتوں میں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ تا قیامت حرام رہے گا۔ اس کے کانٹے کو نہ کاٹا جائے اور نہ ہی اس کے شکار کو بھگایا جائے (1) حضرت جابر نے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کہ مکہ مکرمہ میں کسی کے لئے اسلحہ اٹھانا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 437 (قدیمی)

حلال نہیں۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔(1)

ﮥ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کے مطابق سلوک کرے گا۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٩٢﴾

"پھر اگر وہ باز آجائیں (تو جان لو کہ) اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۔ل"

ل اگر وہ قتال اور کفر سے رک جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے سابقہ گناہ بخش دے گا اور وہ اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۖ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩٣﴾

"اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ (وفساد) اور ہو جائے دین صرف اللہ کے لئے ل پھر اگر وہ باز آجائیں (تو سمجھ لو) کہ سختی (کسی پر) جائز نہیں مگر ظالموں پر ع"

ل ھم ضمیر سے مراد مشرک ہیں۔ فتنہ سے مراد شرک اور فساد ہے۔ یعنی طاعت اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کی جائے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ لوگ گواہی دیں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو انہوں نے مجھ سے اپنے خون اور اموال محفوظ کر لئے مگر اسلام کی وجہ سے جو لازم ہو ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے(2) متفق علیہ۔ اس آیت میں ایسی کوئی دلیل نہیں کہ بت پرست سے سوائے اسلام کے کوئی چیز قبول نہ کی جائے گی۔ اگر وہ اسلام لانے سے کا انکار کر دے تو اسے قتل کر دیا جائے، جس طرح امام بغوی نے فرمایا، کیونکہ بت پرست، آتش پرست اور کتابی میں کوئی فرق نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دین اسلام ہے۔ فتنہ جس طرح بت پرست کی طرف سے ہوتا ہے اسی طرح کتابی اور مجوسی سے بھی ہوتا ہے۔ دونوں سے فتنہ اطاعت کرنے اور جزیہ قبول کرنے سے ختم ہو جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فرمان حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ نہ ہوتا تو کسی سے بھی جزیہ قبول نہ کیا جاتا۔ جب اس آیت سے اہل کتاب سے جزیہ لینا ثابت ہو گیا جبکہ وہ دین باطل پر ہیں تو قیاس کے ذریعے مجوسی اور بت پرست سے بھی جزیہ لینا ثابت ہو گیا۔ یہ امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر ہے جبکہ دوسرے ائمہ آپ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ہم جزیہ کا مسئلہ سورۃ توبہ میں نقل کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

ع اگر وہ شرک یا جزیہ دے کر جنگ سے رک جائیں تو ظالموں کے علاوہ کسی پر بھی عدوان کی کوئی راہ نہیں۔ پہلی فاء تعقیب اور دوسری جزاء کے لئے ہے۔ عدوان سے مراد قتل کرنا، قیدی بنانا اور مال چھیننا ہے۔ ظالمین سے مراد مشرک ہیں اور جو جنگ کے لئے تیار رہیں۔ حضرت ابن عباس نے عدوان کی یہی تفسیر کی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ یا قاعدہ مشاکلہ کی وجہ سے عدوان کی جزاء کو عدوان فرمایا، جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ۔ میں کہتا ہوں اس کی تاویل میں یہ کہنا بھی درست ہے اگر وہ رک جائیں تو عدوان کا گناہ صرف ظالمین کے لئے ہو گا کیونکہ اگر وہ لڑنے سے باز آ گئے اور تم نے پھر ان سے جنگ کی تو تم ظالم بن جاؤ گے اور معاملہ الٹ ہو جائے گا۔ حضرت مقداد بن

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 439 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 37 (قدیمی)

اسود سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی حضور ﷺ ارشاد فرمائیں اگر میں ایک کافر سے ملوں، ہم آپس میں لڑ پڑیں، وہ میرے ایک ہاتھ پر تلوار مارے اور اسے کاٹ دے، پھر مجھ سے بچنے کے لئے درخت کی پناہ میں ہو جائے، جب میں اسے قتل کرنے کے لئے آگے بڑھوں تو وہ یہ کہہ دے لا الہ الا اللہ، کیا۔ اس کے یہ کہنے کے بعد میں اسے قتل کر دوں؟ فرمایا تم اسے قتل نہ کرو۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس نے میرا ہاتھ کاٹا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے قتل نہ کر، اگر تو نے اسے قتل کر دیا تو وہ اس جگہ (۱) پر ہوگا جہاں تو قتل کرنے سے پہلے تھا اور تو اس کے مقام پر ہوگا جس پر وہ یہ کلمہ کہنے سے پہلا تھا (1) متفق علیہ۔

ابن جریر نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ عمرہ کے لئے روانہ ہوئے، ان کے ساتھ قربانی کے جانور بھی تھے۔ یہ چھ ہجری ذی قعدہ کے مہینے کا واقعہ ہے۔ مشرکین مکہ نے حدیبیہ کے مقام پر انہیں روک لیا۔ اہل مکہ نے آپ ﷺ سے اس شرط پر صلح کی کہ اس سال آپ ﷺ واپس چلے جائیں گے اور اگلے سال عمرہ کے لئے تشریف لائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لے آئے اور ذی قعدہ سات ہجری میں عمرہ کی قضا کی۔ آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں تین دن رہے۔ مشرکین مکہ نے اس بات پر فخر کا اظہار کیا تھا کہ حضور ﷺ واپس لوٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(2)

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝

"حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کا بدلہ ہے اور ساری حرمتوں میں (فریقین کے رویہ میں) برابری چاہئے جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کر لو (لیکن) اسی قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو، اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور جان لو یقیناً اللہ (کی نصرت) پرہیزگاروں کے ساتھ ہے[1]"

[1] شھر حرام سے مراد ذی قعدہ ہے جس مہینے میں تم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور عمرہ کی قضا کے قصاص کا معنی مساوات ہے یعنی ہر وہ حرمت جس میں قصاص اور مساوات جاری ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ آیت ماقبل آیت کے لئے علت کے محل میں ہے۔ یعنی جب رسول اللہ ﷺ عمرہ کی قضا کے لئے تشریف لے گئے اور مسلمانوں کو خوف لاحق ہوا کہ مشرک وعدہ کی پاسداری نہ کریں گے اور بیت اللہ شریف کی زیارت سے مسلمانوں کو روک دیں گے، جس طرح گزشتہ سال انہوں نے کیا تھا اور جنگ حرم، احرام اور حرمت والے مہینے میں ہوگی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جنگ کرنے کی اجازت دے دی اور کہا شہر حرام شہر حرام کے بدلہ میں ہے، یعنی اگر وہ حرم اور مہینے کی حرمت کو پامال کریں اور تمہارے ساتھ جنگ کریں تو تم بھی اس سے جنگ کرو، کیونکہ جو کچھ انہوں نے کیا ہے یہ اس کا بدلہ ہے۔ یہ تاویل سیاق کلام کے زیادہ موافق ہے۔ جو حرم پاک میں حرمت والے مہینے میں جبکہ تم حالت احرام میں ہو حد سے تجاوز کرے تو تم بھی ان کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ کرو۔ اس میں قاعدۂ مشاکلت کی بناء پر جزاء کو بھی اسی عمل کا نام دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ متقین کی مدد فرماتا ہے اور ان کے معاملات کو درست فرماتا ہے۔

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَاَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ

(۱) یعنی وہ جنت کا مستحق بن جائے گا اور تو جہنم کا ایندھن بن جائے گا۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 42 (قدیمی)

2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 373 (العلمیہ)

يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

”اور خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں اور نہ پھینکو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں ۱؎ اور اچھے کام کیا کرو بے شک اللہ محبت فرماتا ہے اچھے کام کرنے والوں سے ۲؎ “

۱؎ تم اپنے اموال جہاد میں صرف کرو اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو۔ بایدیکم میں باء زائدہ ہے۔ الفس کو ایدی سے تعبیر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس میں حذف ہے۔ کلام یوں ہے لَاتُلْقُوْا اَنْفُسَكُمْ بِاَيْدِيْكُمْ۔ القاء کا معنی کسی شے کو پھینکنا ہے۔ فعل کا صلہ الی اس لئے ذکر کیا کیونکہ یہ انہاء کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ القی بیدہ یہ لفظ شر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ایک قول یہ کیا گیا ہر چیز جس کا انجام ہلاکت کی طرف ہو تو اسے تھلکہ کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا تھلکہ اسے کہتے ہیں جس سے بچنا ممکن ہو اور ہلاک اسے کہتے ہیں جس سے بچنا ممکن نہ ہو۔ امام بخاری نے حضرت حذیفہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت نفقہ کے بارے میں نازل ہوئی (1) ابوداؤد اور ترمذی نے اسے نقل کیا ابن حبان نے اس کی صحت نقل کی ہے حاکم اور دوسرے محدثین نے بھی ابوایوب انصاری سے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت عطا فرمائی، اس کے مددگار زیادہ ہو گئے، ہم میں سے بعض نے بعض سے رازدارانہ انداز میں کہا ہمارے اموال تباہ ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت عطا فرمائی ہے، کاش ہم اپنے اموال میں رہیں اور جو ضائع ہو چکا ہے تو اس کو درست کریں۔ ہم نے جو کچھ کہا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کا رد کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا۔ تھلکہ سے مراد اموال کی حفاظت، ان کی اصلاح اور غزوات کو چھوڑنا ہے (2) میں کہتا ہوں معنی یہ ہے اگر تم غزوات کو چھوڑ دو گے دشمن تم پر غالب آ جائیں گے اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابوایوب انصاری اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے رہے، یہاں تک کہ آپ کا آخری جہاد قسطنطنیہ کا جہاد تھا، وہیں آپ شہید ہوئے اور قسطنطنیہ کی دیوار کے پاس دفن کئے گئے۔ لوگ ان کے وسیلہ سے بارش کی دعا مانگا کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو فوت ہوا جبکہ اس نے جہاد نہ کیا اور نہ ہی اس نے اپنے آپ کو جہاد پر برانگیختہ کیا تو وہ نفاق کے ایک حصہ پر مرا (3) بعض علماء نے کہا یہ آیت بخل اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ حضرت حذیفہ، حضرت حسن بصری، قتادہ، عکرمہ اور عطاء کا قول ہے۔ یہی حضرت ابن عباس کا بھی فرمان ہے۔ طبرانی نے سند صحیح کے ساتھ ابوجبیر بن ضحاک سے نقل کیا ہے کہ لوگ صدقہ کرتے اور جو اللہ چاہتا وہ لوگوں کو عطا کرتے تو انہیں خشک سالی نے آلیا تو وہ صدقہ کرنے سے رک گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (4) محمد بن سیرین اور عبیدہ سلمانی نے کہا القاء الی التھلکۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا ہے۔ ابوقلابہ نے بھی یہی کہا طبرانی نے سند صحیح کے ساتھ نعمان بن بشیر سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی گناہ کرتا، وہ کہتا اللہ تعالیٰ مجھے نہیں بخشے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (5) براء سے اس کے کئی شواہد ہیں اسے حاکم نے نقل کیا ہے۔

۲؎ اپنے اعمال اور اخلاق کو اچھا کرو، ضرورت مندوں پر فضل و احسان کرو۔ یاد رکھو احسان عبادات میں بھی ہوتا ہے اور معاملات میں بھی ہوتا ہے۔ عبادات میں تو احسان کی وہ صورت ہے جو صحیحین میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جبرئیل امین نے عرض کی مجھے احسان کے بارے میں بتائیے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گویا آپ اس کا دیدار کر

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 648 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 121 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 144 (التجاریہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 374 (العلمیہ) 5۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 375 (العلمیہ)

رہے ہیں اگر تم اس کو نہیں دیکھ سکتے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے(1) یعنی حضور قلب اور خشوع کے ساتھ عبادت کریں۔ رہا معاملات میں احسان تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں کے لئے وہی پسند کر جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اور لوگوں کے لئے وہی ناپسند کر جو اپنے لئے ناپسند کرتا ہے۔ اسے امام احمد نے حضرت معاذ سے نقل کیا ہے۔ فرمایا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں(2) اسے اصحاب سنن نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ امام احمد نے عمرو بن عنبسہ سے اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ کے جواب میں روایت کیا ہے، فرمایا مجھے تم میں سے سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اسے امام بخاری نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا۔ صحیحین میں ان الفاظ کے ساتھ روایت مروی ہے تم میں سے بہترین وہ ہے جو تم میں سے ازروئے اخلاق کے بہترین ہو(3) فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان فرض کیا، جب تم کسی کو قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو، جب ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو، تمہیں چاہئے کہ اپنی چھری کو تیز کرو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ(4) اسے امام مسلم نے شداد بن اوس سے روایت کیا ہے۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ٙ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

"اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ (کی رضا) کے لئے 1 پھر اگر تم گھر جاؤ 2 تو قربانی کا جانور جو آسانی سے مل جائے (وہ بھیج دو) 3 اور نہ منڈاؤ اپنے سر یہاں تک کہ پہنچ جائے قربانی کا جانور اپنے ٹھکانے پر 4 پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا اسے کچھ تکلیف ہو سر میں (اور وہ سر منڈا لے) تو وہ فدیہ دیدے 5 روزوں سے یا خیرات سے 6 یا قربانی سے 7 اور جب تم امن میں ہو جاؤ (اور حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) 8 تو جو فائدہ اٹھانا چاہے عمرہ کا حج کے ساتھ 9 تو جو اسے میسر ہو قربانی دے 10 پھر جسے قربانی کی طاقت نہ ہو تو وہ تین دن روزے رکھے حج کے وقت 11 اور سات جب تم گھر لوٹ آؤ 12 یہ پورے دس روزے ہوئے 13 یہ رعایت اس کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے قریب نہ ہوں 14 اور ڈرا کرو اللہ سے اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے 15"

1 یہ آیت کریمہ حج اور عمرہ کے واجب ہونے پر دلیل ہے۔ نیز ان کے مکمل کرنے کے وجوب اور حج کو عمرہ کے ساتھ فسخ کرنے کے جائز نہ ہونے پر بھی دلیل ہے۔ جہاں تک حج کی فرضیت کا تعلق ہے تو اس پر علماء کا اجماع ہے کہ یہ فرض عین اور محکم ہے۔ یہ اسلام کا ایک رکن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان عالی شان

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 12 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 6 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 891-892 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 152 (قدیمی)

ہے اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، حج اور رمضان کے روزے، متفق علیہ (1) اس باب میں کثیر احادیث ہیں۔

عمرہ کا وجوب: یہ امام احمد کا قول ہے۔ امام شافعی کا بھی صحیح ترین قول یہی ہے۔ امام ابوحنیفہ سے بھی یہ مروی ہے۔ امام مالک نے فرمایا عمرہ سنت ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مشہور قول یہی ہے اور امام شافعی کا بھی ایک قول ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا معنی یہ ہوگا عمرہ شروع کرنے سے حج کی طرح فرض ہو جاتا ہے۔ اس پر اجماع ہے۔ جو امام احمد نے فرمایا اس پر علقمہ اور ابراہیم نخعی کی قرأت دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے وَاَقِیْمُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ۔ حضرت علی شیر خدا کی بھی یہی قرأت ہے۔ یہ ابن جریر، ابن ماجہ اور ابن حبان سے منقول ہیں۔ احادیث میں سے ایک حدیث وہ ہے جسے ابن خزیمہ، دارقطنی، ابن حبان اور حاکم نے اپنی کتاب جو صحیح مسلم پر تخریج کی گئی ہے، میں ابن عباس سے اور وہ حضرت عمر بن خطاب سے حدیث جبرئیل میں نقل کرتے ہیں۔ اس میں یہ ہے حضرت جبرئیل نے سوال کیا اے محمد ﷺ مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے تو حضور ﷺ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دے، نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے، حج اور عمرہ کرے جنابت سے غسل کرے، وضو مکمل کرے اور رمضان کے روزے رکھے (2) یہ تَعْتَمِرَ کی زیادتی اگرچہ صحاح کے اندر نہیں تاہم اس کے راوی ثقہ ہیں۔ دارقطنی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ ابوبکر جوسقی نے اسے اپنی اس کتاب میں ذکر کیا ہے جو صحیحین کے طریقہ پر مرتب کی گئی۔ پس یہ روایت مقبول ہوگی۔ انہیں میں سے ایک حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کیا عورتوں پر جہاد فرض ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا ان پر ایسا جہاد فرض ہے جس میں جنگ نہیں ہوتی، وہ حج اور عمرہ ہے (3) اسے ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ اس باب میں اور ضعیف روایات بھی ہیں جن کو میں نے ذکر نہیں کیا۔ اور صحابہ کے آثار بھی ہیں: صبی بن معبد نے حضرت عمر سے عرض کیا میں نے دیکھا کہ مجھ پر حج اور عمرہ فرض ہیں، میں نے دونوں کا احرام باندھ لیا۔ حضرت عمر نے فرمایا تو نے اپنے نبی ﷺ کی سنت کو پالیا (4) اسے ابوداؤد نے نقل کیا۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا جو آدمی بھی طاقت رکھے اس پر حج اور عمرہ فرض ہے (5) اسے ابن خزیمہ، دارقطنی اور حاکم نے نقل کیا ہے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ امام بخاری نے اسے معلق ذکر کیا۔ حضرت ابن عباس کے اثر کو امام شافعی نے روایت کیا۔ امام بخاری نے اسے معلق ذکر کیا۔

عمرہ کو سنت قرار دینے والے علماء نے بھی احادیث سے استدلال کیا ہے۔ انہیں میں سے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک بدو آیا، اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے عمرہ کے بارے میں بتایئے کیا یہ واجب ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں، عمرہ کرنا تیرے لئے بہتر ہے (6) اسے امام ترمذی، امام احمد اور بیہقی نے نقل کیا ہے۔ اس کا ایک راوی حجاج بن ارطاۃ ہے جو مدلس و متروک ہے۔ اسے ابن مہدی، قطان، یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، ابن مبارک اور نسائی نے متروک قرار دیا، لیکن ذہبی نے کہا یہ صدوق ہے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ امام بیہقی نے ایک اور سند سے اسے نقل کیا ہے۔ اس سند میں یحییٰ بن ایوب ہے، امام احمد نے کہا اس کا حافظہ کمزور تھا ابوحاتم نے کہا وہ قابل حجت نہیں لیکن ابومعین نے کہا وہ صالح ہے ابن عدی نے کہا وہ صدوق

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 6، صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 32 (وزارت تعلیم)
2۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 379 (العلمیہ)
3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3 صفحہ 415 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 257 (وزارت تعلیم)
5۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 377 (العلمیہ)
6۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 112 (وزارت تعلیم)

ہے۔ میں کہتا ہوں اس حدیث کے معارض وہ روایت ہے جو حضرت جابر سے مرفوعاً مروی ہے کہ حج اور عمرہ دونوں فرض ہیں (1) اسے ابن عدی نے ابن لہیعہ کے واسطہ سے نقل کیا ہے، لیکن ابن لہیعہ ضعیف ہے۔ انہیں احادیث میں سے ایک ابو امامہ کی مرفوع حدیث ہے جو فرض نماز کی طرف چلا اس کا اجر حج کی طرح ہے اور جو نفلی نماز کی طرف چلا اس کا اجر عمرہ کی طرح ہے (2) اسے طبرانی نے یحییٰ بن حارث کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ انہیں میں سے ایک عبداللہ بن قانع کی ابو ہریرہ سے مرفوع حدیث ہے کہ حج جہاد ہے اور عمرہ نفل ہے (3) اسے امام شافعی نے ابو صالح حنفی سے مرسل انداز میں روایت کیا ہے۔ طلحہ بن عبداللہ اور حضرت ابن عباس کی مرفوع روایت بھی اسی طرح ہے۔ اسے بیہقی نے روایت کیا۔ دارقطنی نے کہا عبداللہ بن قانع غلطی کر جاتا تھا۔ ترقانی ضعیف ہے، لیکن شیخ تقی الدین نے کہا یہ کبار حفاظ میں سے ہے۔ ابو صالح حنفی کا نام ماہان ہے۔ ابن حزم نے اسے ضعیف کہا، لیکن ابن ہمام نے کہا اس کی تضعیف درست نہیں۔ ابن معین نے اسے ثقہ قرار دیا۔ ایک جماعت نے ان سے روایت کیا ہے۔ طلحہ کی حدیث میں عمرو بن قیس ہے جس میں اعتراض کیا جاتا ہے، حافظ نے کہا اس کی سند ضعیف ہے۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں مجہول راوی ہیں۔ اس باب میں صحابہ کے آثار بھی ہیں: حضرت ابن مسعود نے کہا حج فرض ہے اور عمرہ نفل ہے (4) اسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا۔ ابن ہمام نے کہا حضرت عبداللہ بن مسعود بہت اچھے راہنما ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ کا اثر ان کی مرفوع روایت کی طرح ہے۔ دارقطنی نے ان کی مرفوع روایت کے بارے میں کہا صحیح یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ حضرت جابر کا اثر بھی ان کی مرفوع روایت کی طرح ہے۔

حق بات یہ ہے اس باب میں احادیث متعارض ہیں، اسی طرح آثار بھی متعارض ہیں۔ ابن ہمام نے کہا جب دلائل میں تعارض آجائے تو شک سے وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ صاحب ہدایہ نے کہا فرض تعارض کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا۔ صاحب ہدایہ کا قول بہتر ہے کیونکہ فرض قطعی دلیل پر مبنی ہوتا ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ دلائل کے تعارض کی وجہ سے بطور احتیاط اسے واجب قرار دیا جائے تا کہ نسخ کا تکرار لازم نہ آئے۔

عمرہ کے ساتھ حج کے فسخ کا جائز نہ ہونا، یہ جمہور کا نقطہ نظر ہے وہ اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں، جبکہ امام احمد نے اس سے اختلاف کیا۔ ان کی دلیل حجۃ الوداع کا قصہ ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ حج کو چھوڑ دیں اور عمرہ کا احرام باندھیں، جبکہ وہ حج کا احرام باندھے ہوئے تھے۔ فرمایا اپنے حج کے احرام کو عمرہ کے لئے بنا لو مگر جس نے قربانی کو قلادہ پہنا رکھا ہے (5) اس پر دس سے زیادہ احادیث صحیحہ شاہد ہیں جو شک کو زائل کر دیتی ہیں اور علم قطعی کا فائدہ دیتی ہیں۔ انہیں میں سے ایک حضرت ابو موسیٰ اشعری کی حدیث ہے فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے میری قوم کی طرف یمن بھیجا۔ میں واپس آیا تو آپ ﷺ بطحاء کے مقام پر تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کونسا احرام باندھا؟ میں نے عرض کی وہی احرام باندھا۔ جو نبی کریم ﷺ نے باندھا پوچھا کیا تیرے پاس قربانی ہے؟ عرض کیا نہیں، آپ ﷺ نے مجھے حکم دیا، میں نے بیت اللہ شریف کا طواف کیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی، پھر میں احرام سے فارغ ہو گیا۔ پھر میں نے آٹھویں ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت آیا تو فرمایا ہم کتاب اللہ کے حکم کو لیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا حج اور عمرہ کو مکمل کرو، اور حضور ﷺ کی سنت پر عمل کریں گے کیونکہ آپ ﷺ قربانی کرنے سے قبل احرام سے فارغ نہ ہوئے (6) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صحابہ نے حج مفرد کا احرام باندھا،

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 378-377 (العلمیہ) 2۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 8، صفحہ 127 (مکتبۃ العلوم والحکم) 3۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 378
4۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 378 (العلمیہ) 5۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 213 (وزارت تعلیم) 6۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 213 (ت)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیت اللہ شریف کے طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کے ساتھ احرام سے فارغ ہو جاؤ اور بال کٹوالو، پھر حلالی کی حیثیت سے مکہ میں مقیم رہو(1) حضرت ابن عباس کی حدیث یہ ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ کو حج کا احرام عمرہ میں بدلنے کا حکم دیا تھا۔ نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے۔ اس میں یہ ہے یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ کو کیا چیز روکتی ہے کہ آپ ﷺ ہمارے ساتھ احرام اتار دیں؟ فرمایا میں نے بالوں کو لبدہ کیا اور اپنی قربانی کو قلادہ پہنایا ہے، پس اس وقت تک احرام سے حلالی نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ میں قربانی کر لوں(2) حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث اور یہ چھ احادیث صحیحین میں ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری کی حدیث مسلم شریف میں ہے کہ ہم نکلے، ہم تلبیہ کہتے تھے، یہاں تک کہ جب میں نے طواف کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے عمرہ بنالو، مگر جس کے پاس ھدی ہو(3) امام بخاری کے نزدیک حضرت انس کی مرفوع حدیث ہے: اگر میرے پاس ھدی نہ ہوتی تو میں حلالی ہو جاتا(4) حضرت براء کی حدیث جسے اصحاب سنن نے روایت کیا، ربیع بن سبرہ کی حدیث جو انہوں نے اپنے باپ سے نقل کی اور ان کے علاوہ دوسری احادیث ہیں، ہم نے انہیں منار الاحکام میں جمع کیا ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے اَتِمُّوا الْحَجَّ، وَالْعُمْرَةَ قطعی ہے، قطعی حکم کی تخصیص اور اس کا نسخ اخبار احاد سے جائز نہیں۔ میں یہ کہتا ہوں یہ احادیث شہرت کی حد کو پہنچ گئی ہیں کہ اس واقعہ کے ثبوت کا انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَاَتِمُّوا الْحَجَّ، یہ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کے ساتھ عام خص عنه البعض ہے۔ پھر حضور ﷺ نے اس شخص کو بھی اس حکم سے خارج کر دیا جس کا حج فوت ہو گیا اور حضور ﷺ نے اسے عمرہ کے افعال کے ساتھ احرام سے خارج ہونے کی اجازت دی۔ اسی پر علماء کا اجماع ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ آیت ظنی الدلالۃ ہے جس کی تخصیص اخبار آحاد سے جائز ہے امام احمد کے استدلال کے جواب میں علماء نے ارشاد فرمایا کہ تم نے جس روایت سے استدلال کیا ہے وہ صحابہ کے ساتھ خاص ہے کیونکہ بلال بن حارث کی حدیث ہے کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ صرف ہمارے لئے فسخ کیا گیا یا یہ سب لوگوں کے لئے ہے فرمایا نہیں بلکہ یہ ہمارے لئے خاص ہے(5) اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ ابن جوزی نے کہا اسے عبدالعزیز محمد وراوردی کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا۔ ابوحاتم نے کہا اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ امام احمد نے کہا یہ حدیث صحیح نہیں کہ حج توڑنے کا حکم صحابہ کے ساتھ خاص تھا۔ میں کہتا ہوں اگر یہ روایت نہ ہوتی کہ حضرت عمر بن خطاب نے ارشاد فرمایا دو متعے (1) رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے، میں انہیں حرام کرتا ہوں یعنی میں ان کی حرمت کو ظاہر کرتا ہوں جن کی حرمت میرے نزدیک حضور ﷺ سے ثابت ہے، تو بلال کی مذکورہ حدیث کی وجہ سے دوسری احادیث ناقابل عمل نہ ہوتیں کیونکہ بلال کی مذکورہ حدیث کمزور ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کا معنی اس حدیث کی تائید کرتا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ کی متفق علیہ حدیث میں حضرت عمر کا قول گزر چکا ہے کہ آپ نے اپنی خلافت کے دور میں ارشاد فرمایا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فرمان کو لیں گے۔ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فرمان کہ آپ سے حج تمتع کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا وہ صرف ہمارے لئے تھا تمہارے لئے نہیں ہے(6) اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اگر حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 224 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 404 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 408 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 240 (وزارت تعلیم) 5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 259 (وزارت تعلیم) (1) حج توڑ کر عمرہ کرنا، نکاح متعہ۔
6۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 390 (العلمیہ)

تعالیٰ عنہما کے نزدیک یہ صرف صحابہ کے ساتھ خاص نہ ہوتا تو یہ دونوں حضرت محمد ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرتے اور حضرت عمر ظنی الدلالۃ آیت سے ان احادیث کے مقابلہ میں استدلال نہ کرتے جو حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے سن رکھی تھیں کہ حضور ﷺ نے حج کا احرام توڑنے کا حکم دیا۔ یہ حکم ان دونوں کے حق میں قطعیت کا درجہ رکھتا تھا و اللہ اعلم۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد میں متعہ سے مراد عمرہ کے ساتھ حج کو فسخ کرنا ہے، اس سے مراد حج تمتع نہیں جس کا ذکر کتاب اللہ میں آیا ہے، کیونکہ اس کو رد کرنے والی کوئی دلیل موجود نہیں اسی پر اجماع ہے۔ یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ حضرت عمر نے ضبی بن معبد کو اس قول (میں نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا ہے) کے بارے میں فرمایا تو نے اپنے نبی کریم ﷺ (1) کی سنت کو پالیا ہے(1) اسے ابوداؤد نے ذکر کیا۔ حضرت ابوذر کا اثر بھی بلال کی حدیث کی تائید کرتا ہے کہ آپ اس آدمی کے متعلق فرماتے جس نے حج کا احرام باندھا، پھر عمرہ کے ساتھ اسے توڑ دیا۔ یہ اجازت صرف ان لوگوں کے لئے تھی جو اس موقع پر حضور ﷺ کے ساتھ تھے(2) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ انہی سے ایک روایت ہے یہ متعہ صرف ہمارے لئے تھا۔ ابن جوزی نے کہا ابوذر کے اثر کو ایک کوفی روایت کرتا ہے جو حضرت ابوذر سے نہیں ملا تھا۔ اس لحاظ سے یہ روایت مرسل ہے اور ہمارے نزدیک مرسل حجت ہے۔

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ جس حج اور عمرہ کو مکمل کرنے کا تمہیں حکم دیا گیا اگر ان سے تمہیں روک دیا جائے۔ سیاق کلام اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت حدیبیہ کے قصہ میں نازل ہوئی۔ یہ بات صحیح ہے کہ حدیبیہ کے سال حضور ﷺ نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ جب آپ کو روک دیا گیا تو آپ نے احرام اتار دیا۔ یہ امام مالک کے خلاف حجت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ احصار صرف حج کے ساتھ خاص ہے، عمرہ میں احصار کی وجہ سے محرم حلال نہیں ہو سکتا۔ احصرتم کا معنی یہ ہے کہ تمہیں بیت اللہ شریف تک جانے اور افعال حج وعمرہ کرنے سے مسلمان دشمن یا کافر یا مرض جو اس کے مانع ہو یا نفقہ کے ہلاک ہو جانے یا عورت کے محرم کے فوت ہو جانے کی وجہ سے روک دیا۔ امام ابوحنیفہ نے بھی یہی تفسیر بیان کی ہے، کیونکہ لغت میں احصار اور حصر کا معنی کسی بھی طریقے سے روکنا ہے۔ بلکہ احصار کا لفظ عموماً مرض کے وجہ سے روکنے میں استعمال ہوتا ہے۔ فراء، کسائی، اخفش، ابوعبیدہ، ابن سکیت اور دوسرے علماء لغت نے بھی یہی کہا ہے کہ احصار مرض کی صورت میں اور حصر دشمنی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ابوجعفر نحاس نے کہا تمام اہل لغت کا یہی قول ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ان کا کہنا کہ احصار مرض کی صورت میں اور حصر دشمن سے، یہ غالب استعمال کی وجہ سے ہے، نہ کہ ان کا یہ مطلب ہے کہ احصار کا لفظ مرض کے ساتھ خاص ہے کہ ان پر یہ اعتراض ہو کہ یہ آیت تو حدیبیہ کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی، یہ متفق علیہ ہے اور صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ امام شافعی نے فرمایا اس میں کوئی اختلاف نہیں امام بغوی نے کہا کہ حصر اور احصار دونوں کا معنی ایک ہے(3) عرب کہتے ہیں حَصَرْتُ الرَّجُلَ عَنْ حَاجَتِهٖ فَهُوَ مَحْصُوْرٌ میں نے آدمی کو اس کے کام سے روک دیا پس وہ محصور ہے اور کہتے ہیں اَحْصَرَهُ الْعَدُوُّ فَهُوَ مُحْصَرٌ، یہ اس وقت بولتے ہیں جب دشمن اسے روک دے۔ آیت اپنے الفاظ کے عموم کی وجہ سے امام ابوحنیفہ کی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے خلاف دلیل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حصر صرف دشمن کی طرف سے تو معتبر ہے۔ امام شافعی نے یہ الفاظ صحیح سند سے حضرت ابن عباس سے روایت کئے

(1) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا حج اور عمرہ میں فرق کرو، حج کے مہینوں میں حج کرو اور عمرہ ان مہینوں کے علاوہ کرو۔ یہ تیرے حج اور عمرہ کو مکمل کرنے والا ہے۔ شائد یہ آپ کے نزدیک افضل صورت ہو، از مؤلف۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 257 (وزارت تعلیم)　2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 358-259 (دست)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 148 (تجاریہ)

ہیں۔ انہوں نے کہا آیت اسی کے متعلق نازل ہوئی۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے، سبب نزول کے خصوص کا نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے آیت کا سیاق تخصیص کا تقاضا کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے فَاِذَآ اَمِنْتُمْ کیونکہ امن خوف سے ہی ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ سیاق اس پر دلالت نہیں کرتا کہ احصار صرف دشمن سے ہی ہوتا ہے، بلکہ سیاق اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دشمن کی طرف سے احصار بھی احصار ہوتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ الْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ۔ یہ سیاق اس پر دلالت نہیں کرتا کہ یہاں مطلقات سے مراد صرف طلاق رجعی والی عورتیں ہیں، بلکہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ طلاق رجعی والی عورتیں بھی مطلقات میں داخل ہیں۔

وہ علماء جو دشمن سے ہی احصار کو خاص کرتے ہیں وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور ﷺ ضباعہ بنت زبیر کے پاس تشریف لے گئے، اس سے فرمایا شاید تم نے حج کا ارادہ کیا ہے۔ اس نے عرض کی مجھے بیماری لاحق ہے۔ فرمایا تو احرام باندھ لے اور شرط یہ لگا کہ میرے لئے احرام کھولنے کی وہی جگہ ہوگی جہاں بیماری نے مجھے روک لیا (1) متفق علیہ۔ امام مسلم کے ہاں بھی حضرت ابن عباس کی حدیث ہے جس میں ضباعہ کا قصہ ہے۔ ابوداؤد اور نسائی کے ہاں یہ روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لائیں، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں حج کا ارادہ رکھتی ہوں، کیا میں شرط لگا لوں؟ فرمایا ہاں عرض کی میں کیا کہوں؟ فرمایا تو کہہ لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، میرے لئے احرام کھولنے کی جگہ وہ ہوگی جہاں مجھے تکلیف روک لے۔ حضور ﷺ نے فرمایا جو تو نے استثناء کی تیرے لئے وہی ہوگا (2) اسے امام ترمذی نے صحیح کہا اور مرسل قرار دیا۔ عقیلی نے کہا حضرت ابن عباس نے ضباعہ کا قصہ مختلف عمدہ سندوں سے روایت کیا۔ ابن خزیمہ نے ضباعہ کی حدیث کو انہیں سے نقل کیا۔ امام بیہقی نے حضرت انس اور حضرت جابر سے نقل کیا۔ اسی وجہ سے امام احمد اور شافعی نے کہا اگر اس نے احرام باندھتے وقت احرام کھولنے کی شرط لگائی تو دشمن کے بغیر بھی اس کے لئے احرام کھولنا جائز ہے۔ شرط لگانے کا قول حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عمار، حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ اور دوسرے صحابہ سے ثابت ہے۔ ابن جوزی نے کہا اگر مرض احرام کھولنے کو جائز قرار دیتا تو شرط لگانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ہم یہ کہتے ہیں ضباعہ والی حدیث اخبار آحاد میں سے ہے۔ یہ عموم آیت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایک قول یہ کیا گیا شرط لگانے کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے لیکن اس سند میں حسن بن عمارہ متروک ہے۔ میرے نزدیک دونوں کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ ضباعہ والی حدیث ندب پر محمول ہوگی جسے مرض یا کسی اور عارضے کا خوف ہو اس کے لئے مستحب یہ ہے کہ وہ احرام کے وقت ہی شرط باندھ لے تاکہ اس کے ذمہ وعدہ خلافی لازم نہ ہو اگرچہ یہ عذر کی وجہ سے جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ کے قول کی تائید عکرمہ سے مروی حدیث کرتی ہے جو وہ حجاج بن عمرو انصاری سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کا کوئی عضو ٹوٹ جائے یا وہ لنگڑا ہو جائے تو وہ احرام اتار دے اور اس پر اگلے سال حج ہوگا (3) اسے امام ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا۔ ابوداؤد نے ایک اور روایت میں عکرمہ سے نقل کیا ہے، وہ عبداللہ بن رافع سے وہ حجاج سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں جو لنگڑا ہو گیا یا جس کی ہڈی ٹوٹ گئی یا مریض ہو گیا (4) پھر سابقہ معنی کی حدیث ذکر کی امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ امام بغوی نے اس کی تضعیف کا ذکر کیا۔ میں کہتا ہوں اس میں تضعیف کی کوئی وجہ نہیں مگر اس کی سند میں موجود یحییٰ بن کثیر میں اختلاف ہے۔ اسے اصحاب سنن، ابن

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 385 (قدیمی)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 254 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 112 (وسط)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 246 (وزارت تعلیم)

خزیمہ، دار قطنی اور حاکم نے متعدد طرق سے نقل کیا ہے حافظ نے کہا صحیح وہ ہے جو یحییٰ سے وہ عکرمہ سے وہ حجاج سے روایت کرتے ہیں۔ اس کے آخر میں کہا کہ عکرمہ نے حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عباس سے پوچھا دونوں نے کہا اس نے سچ کہا۔ یحییٰ قطان اور دوسروں کی حدیث میں ہے میں نے حجاج سے سنا ابوداؤد اور ترمذی نے اسے معمر کے واسطہ سے وہ یحییٰ سے وہ عکرمہ سے وہ عبداللہ بن رافع سے اور وہ حجاج سے نقل کرتے ہیں۔ امام ترمذی نے کہا عبداللہ بن رافع کی زیادتی پر معمر کی متابعت معاویہ بن سلام نے کی۔ میں نے امام بخاری کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ معمر اور معاویہ کی روایت اصح ہے میں کہتا ہوں یہ زیادتی حدیث کی صحت کے منافی نہیں کیونکہ اگر عکرمہ نے حجاج بن عمرو سے براہ راست سنا تو بہت بہتر ورنہ ان کے درمیان عبداللہ بن رافع واسطہ ہے جو ثقہ ہے، اگرچہ امام بخاری نے اس سے روایت نقل نہیں کی۔ حافظ نے بھی کہا ہے۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے عکرمہ نے حجاج سے بغیر واسطہ کے سنا ہو اس طرح انہوں نے عبداللہ بن رافع کے واسطہ سے حجاج سے روایت لی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے ہمارا مذہب حضرت ابن مسعود سے مروی ہے۔

۲؎ یعنی ھدی میں سے جو آسان ہو وہ تم پر واجب ہے۔ حضرت مفسر نے یہاں تین ترکیبوں کی طرف اشارہ کیا ایک میں علیکم خبر مقدم محذوف ہے دوسری میں الواجب مبتدا محذوف ہے، تیسری میں اھدوا فعل محذوف ہے اور مذکورہ کلام اس کا مفعول بہ ہے، وہ ھدی اونٹ، گائے اور بھیڑ یا بکری ہو، یہ اس کی ادنیٰ صورت ہے۔ یہ آیت امام مالک کے خلاف حجت ہے۔ وہ فرماتے ہیں قربانی واجب نہ ہوگی۔ پھر جو قربانی کے وجوب کے قائل ہیں ان میں باہم اختلاف ہے۔ امام شافعی نے ایک روایت میں فرمایا اگر وہ قربانی نہ پائے تو بکری کی قیمت کے برابر کھانا صدقہ کردے، اگر وہ اتنا مال بھی نہ پائے تو فقیر (۱) کے عوض ایک روزہ رکھ لے۔ وہ اسے جنایت کے دم پر قیاس کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا اور یہی امام شافعی کا دوسرا قول ہے کہ صرف قربانی ہی جائز ہے کیونکہ اپنی رائے اور قیاس سے بدل معین کرنا جائز نہیں احصار کا دم یہ جنایت کا دم نہیں۔

۳؎ علماء نے مَحِلَّهٗ کی تفسیر میں مختلف اقوال ذکر کئے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا محلہ سے مراد حرم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ۔ خون بہانا عبادت کے طور پر معروف نہیں مگر زمانہ اور مکان کے اعتبار سے ان کا اعتبار کئے بغیر وہ عبادت نہیں بن سکتا اور اس کے بغیر احرام سے فارغ بھی نہیں ہوا جاسکتا۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک محصر پر واجب ہے کہ وہ قربانی حرم کی طرف بھیجے، اس کے لئے اس کے سوا کوئی صورت جائز نہیں۔ وہ قربانی ذبح کرنے کے لئے ایک دن معین کرے اور اس دن محصر احرام سے فارغ ہو جائے۔ آپ کے نزدیک یوم النحر اس کے لئے مختص نہیں۔ امام ابویوسف اور امام محمد کے نزدیک حج میں یوم النحر مختص ہے اس لئے ان کے نزدیک اس کی تعیین کی کوئی ضرورت نہیں۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک وہ اس جگہ ہی جانور ذبح کرکے حلال ہوسکتا ہے جہاں اسے روکا گیا، ہے خواہ اسے حل میں روکا گیا یا حرم کے علاقہ میں روکا گیا کیونکہ حدیبیہ کے قصہ میں مسور بن مخرمہ کی حدیث ہے جب آپ معاہدہ کی تحریر سے فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو فرمایا اٹھو، جانور ذبح کرو پھر حلق کرو۔ اللہ کی قسم صحابہ میں سے ایک آدمی بھی نہ اٹھا یہاں تک کہ آپ ﷺ نے تین دفعہ یہ ارشاد فرمایا، جبکہ کوئی بھی آدمی نہ اٹھا تو آپ ﷺ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور لوگوں کے طرز عمل کے بارے میں ان سے ذکر کیا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی اے اللہ تعالیٰ کے نبی کیا آپ ﷺ یہ پسند کرتے ہیں کہ آپ باہر تشریف لے جائیں، لوگوں سے کوئی بات نہ کریں، اپنی قربانی کو ذبح کریں اور حجام کو بلائیں کہ وہ آپ ﷺ کا حلق کردے۔ آپ ﷺ باہر تشریف لائے لوگوں سے کوئی بات نہ

(۱) فقیر کو نصف صاع گندم دینا ہوتی ہے۔

کی یہاں تک کہ آپ ﷺ نے وہ عمل کیا، اپنا جانور ذبح کیا، حجام کو بلایا، اس نے آپ ﷺ کا حلق کیا۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا وہ بھی اٹھے اور جانوروں کو ذبح کیا، لوگ ایک دوسرے کا حلق کر رہے تھے۔ قریب تھا کہ غم کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو قتل ہی کر دیتے(1) اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ یعقوب بن سفیان نے مجمع بن یعقوب کے واسطہ سے وہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کو روکا گیا تو انہوں نے حدیبیہ میں جانور ذبح کئے اور حلق کیے اللہ تعالیٰ نے ہوا بھیجی جس نے ان کے بال اٹھائے اور حرم میں انہیں جا پھینکا۔ امام مالک نے مؤطا میں ذکر کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ نے حدیبیہ کے مقام پر احرام کھولا۔ انہوں نے قربانیاں کیں، اپنے سروں کے حلق کئے اور ہر چیز سے حلال ہو گئے(2) امام مالک، امام شافعی نے فرمایا حدیبیہ حرم سے باہر ہے۔ احناف نے ان کا دو طرح سے جواب دیا ایک یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی قربانی ناجیہ بن جندب کے ساتھ حرم کی طرف بھیجی(3) اسے طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ ناجیہ سے روایت کیا ہے۔ امام نسائی نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ دوسرا جواب یہ دیا حدیبیہ کا کچھ حصہ حرم میں ہے اور کچھ حصہ حل میں ہے۔ امام طحاوی نے اپنی سند سے مسور سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حدیبیہ میں تشریف فرما تھے آپ ﷺ کا خیمہ حل میں تھا اور نماز پڑھنے کی جگہ حرم میں تھی(4) جب صورتحال یہ ہے تو صحابہ نے اپنی قربانیاں حرم میں کیں۔ میں کہتا ہوں ناجیہ کی حدیث شاذ ہے اور مشہور حدیث کے مخالف ہے اگر یہ بات ہو جائے تو شائد حضور ﷺ نے اپنی بعض قربانیاں حرم کی طرف بھیجی ہوں جبکہ بعض کو حرم میں قربان کیا ہو، یہی دونوں روایتوں کو جمع کرنے کی صورت ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ واضح دلیل ہے کہ ھدی اپنے محل میں نہیں پہنچی تھی، وہ محل حرم ہے۔ پس قربانی کا محل حرم ہی ہوگا، کوئی اور جگہ اس کا محل نہیں ہو سکتا۔ امام بخاری نے تعلیقاً جو ذکر کیا ہے، وہی بہترین ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ محصر وہاں ہی اپنا جانور ذبح کر دے جہاں اسے روکا گیا۔ اگر وہ قربانی حرم میں نہ بھیج سکے، اگر وہ ھدی حرم کی طرف بھیج سکتا ہے تو اس پر ھدی کا بھیجنا فرض ہے(5) تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے فرمان وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ کا معنی یہ ہوگا کہ اگر تم جانور بھیجنے کی طاقت رکھو۔ یہ عام خص عنه البعض ہے، اس کی تخصیص احادیث مشہورہ نیز اللہ تعالیٰ کے فرمان "الْهَدْيَ مَعْكُوْفًا" سے ثابت ہے۔ واللہ اعلم۔

اگر یہ کہا جائے ابوداؤد نے محمد بن اسحاق سے وہ عمرو بن میمون سے روایت کرتے ہیں، کہا میں نے ابو حاضر حمیری سے سنا جو ابو میمون بن مہران کو بیان کرتا تھا، کہا میں اس سال عمرہ کرنے کے لئے نکلا جس سال اہل شام نے عبداللہ بن زبیر کا مکہ مکرمہ میں محاصرہ کیا تھا۔ میری قوم کے کچھ افراد نے بھی میرے ساتھ قربانی کے جانور بھیجے۔ جب ہم شامیوں تک پہنچے تو انہوں نے ہمیں حرم کی حدود میں داخل ہونے سے روک دیا۔ میں نے وہاں ہی قربانی کی، پھر احرام کھولا، پھر میں واپس لوٹ آیا۔ جب اگلا سال آیا تو میں عمرہ کی قضا کرنے کے لئے نکلا۔ میں حضرت عبداللہ بن عباس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا۔ آپ نے فرمایا اس قربانی کے عوض بھی قربانی دو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو حکم دیا تھا کہ وہ اس ھدی کے عوض قربانیاں دیں جو انہوں نے حدیبیہ کے سال دی تھیں(6) یہ حدیث اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ حرم سے باہر قربانی کرنا جائز نہیں اور ساتھ ہی اعادہ کا تقاضا کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں محمد بن

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 243 (وزارت تعلیم)
2۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 360 (مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)
3۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 427 (وزارت تعلیم)
4۔ ایضاً
5۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 244 (وزارت تعلیم)
6۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 264 (وزارت تعلیم)

اسحاق میں اختلاف ہے۔ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اس حدیث پر تمام امت نے عمل کرنا چھوڑ دیا ہے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔
یہاں چند اور مسائل میں بھی اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حج قران کرنے والے پر دو دم واجب ہوں گے کیونکہ اس نے دو احرام باندھ رکھے ہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک ایک ہی دم کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ کا عموم جمہور کے نقطۂ نظر کی تائید کرتا ہے۔ ایک مسئلہ یہ ہے کہ احرام سے فارغ ہونا، یہ احصار سے حاصل ہوتا ہے یا حلالی ہونے کی نیت سے احصار کے بعد جانور ذبح کرنے کے ساتھ یا ذبح کے ساتھ حلق کرنے سے جب کہ اس نے احرام کھولنے کی نیت کی ہو۔ تیسرا مسئلہ امام شافعی اور جمہور علماء کا قول ہے کہ احصار سے مناسک حج ساقط ہو گئے، احرام کے احکام ساقط نہیں ہوتے۔ حلق محلل کے طور پر معروف ہے اس لئے وہ ساقط نہیں ہوگا، اس کا حرم کے ساتھ مخصوص ہونا اس حیثیت سے کہ وہ محلل ہو، ممنوع ہے۔
حلق یا قصر کے واجب ہونے اور حلق کے اولیٰ ہونے پر دلیل حضور ﷺ کا حدیبیہ کے روز یہ ارشاد ہے اللہ تعالیٰ حلق کرنے والوں پر رحم فرمائے۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اور بال کٹوانے والے فرمایا اللہ تعالیٰ حلق کرنے والوں پر رحم فرمائے لوگوں نے عرض کی بال کٹوانے والوں پر تو حضور ﷺ نے تیسری بار فرمایا بال کٹوانے والوں پر بھی[1] اسے امام طحاوی نے حضرت ابن عباس اور ابوسعید کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام محمد نے فرمایا اگر اسے حرم میں روک دیا گیا تو اس پر حلق واجب ہوگا۔ اگر اسے حل میں روک دیا گیا تو حلق واجب نہیں ہوگا کیونکہ حلق مکان اور زمان کے علاوہ بطور عبادت معروف نہیں۔ کافی میں اسی طرح ہے۔ ھدایہ میں ہے ان کے نزدیک حلق واجب نہیں حلالی ہونا یہ تو ذبح سے حاصل ہوگا۔ امام ابویوسف کے نزدیک حلق واجب ہے کیونکہ حضور ﷺ نے حدیبیہ کے سال اس کا حکم دیا۔ تاہم اگر اس نے حلق نہ کرایا تو اس پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی اور محرم صرف قربانی دینے سے حلالی ہو جائے گا۔ امام مالک نے فرمایا صرف روکنے سے ہی محرم احرام سے فارغ ہو جائے گا، اس پر قربانی دینا بھی واجب نہیں۔ یہ آیت امام مالک کے خلاف دلیل ہے۔ امام مالک نے حضرت جابر کی حدیث سے استدلال کیا کہ ہم نے حدیبیہ کے سال حضور ﷺ کے ساتھ ستر اونٹ ذبح کئے، ہر اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک جماعت قربانی میں شریک ہو جائے۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا۔ یہ حدیث، ساتھ ہی وہ روایت جسے شیخین نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سن چھ ہجری کو عمرہ کا احرام باندھا جبکہ آپ ﷺ کے ساتھ چودہ سو افراد تھے، یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ ہر محصر پر ھدی واجب نہیں۔ ایک انسان احرام سے صرف نیت کے ساتھ ہی فارغ ہو جاتا ہے قربانی کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ستر اونٹ پانچ سو سے کم افراد کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ باقی تمام لوگوں کے لئے کوئی قربانی نہیں رہتی۔ میں کہتا ہوں شاید باقی لوگوں نے بھیڑ بکریاں ذبح کی ہوں گی۔ تاہم یہ استدلال کتاب اللہ کے حکم قطعی کے مقابلہ میں خبر واحد سے ہوتا ہے اس لئے اسے قبول نہ کیا جائے گا۔
تیسرا اختلافی مسئلہ یہ ہے عمرہ اور نفلی حج کا احرام باندھنے والا جب محصر ہو جائیں اور وہ جانور ذبح کر کے حلالی ہو جائے تو کیا اس پر قضا واجب ہوگی۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا اس پر قضا واجب نہیں ہوگی۔ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر اس نے حج کا احرام باندھا تھا تو اس پر حج اور عمرہ کی قضا ہوگی، اگر عمرہ کا احرام باندھا تھا تو صرف عمرہ کی قضا ہوگی، اگر حج قران کا احرام باندھا تھا تو ایک حج اور دو عمروں کی قضا ہوگی اگر اس سے وہ فوت ہوئے۔ امام بیضاوی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اس آیت میں

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 435-434 (وزارت تعلیم)

ھدی پر اقتصار کرنا قضاء کے لازم نہ ہونے کی دلیل ہے ابن جوزی نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے چھٹے سال عمرہ کا احرام باندھا جبکہ آپ ﷺ کے ساتھ چودہ سو صحابہ کرام تھے۔ صحیحین میں اسی طرح ہے۔ پھر آپ ﷺ دوسرے سال عمرہ کے لئے تشریف لائے جبکہ آپ ﷺ کے ساتھ چھوٹی سی جماعت تھی اگر ان لوگوں پر عمرہ کی قضا واجب ہوتی تو حضور ﷺ انہیں ضرور آگاہ فرماتے۔ اس کے متعلق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول گزر چکا ہے کہ آپ نے فرمایا ہم متواتر احادیث سے جان چکے ہیں کہ جب حضور ﷺ نے عمرہ کی قضا کا احرام باندھا تو کچھ لوگ بغیر ضرورت کے اس سفر میں شامل نہ ہوئے۔ اگر عمرہ کی قضا لازم ہوتی تو آپ ﷺ ضرور حکم دیتے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگر قضا واجب نہ ہوتی تو اس عمرہ کو عمرہ قضا کا نام کیوں دیا جاتا۔ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اس کو عمرۃ القضاء اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا معنی فیصلہ بھی ہے، کیونکہ یہ عمرہ اس معاملہ کا فیصلہ کرنے کے لئے تھا جو حضور ﷺ اور قریش کے درمیان ہوا تھا۔ واقدی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ عمرہ قضا کے لئے نہیں تھا، بلکہ یہ قریش کی اس شرط کو پورا کرنے کے لئے تھا کہ مسلمان اگلے سال اسی مہینے میں عمرہ کریں گے جس میں انہیں روکا گیا۔ ہماری دلیل یہ ہے جب اس عبادت کو شروع کر دیا جائے تو بالاتفاق اس کی ادائیگی واجب ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ۔ اس لئے قضا کے وجوب کے لئے کسی نئی نص کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ، یہ احصار کی صورت میں احرام سے فارغ ہونے کی رخصت پر دلالت کرتا ہے قضا کے ساقط ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ دوسرے ائمہ نے جو استدلال کیا اس کا جواب دو طرح سے ہو سکتا ہے، ایک یہ کہ ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ دوسرے سال آپ ﷺ کے ساتھ ایک چھوٹی جماعت آئی تھی اور ہم یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ آپ ﷺ نے انہیں حکم نہیں دیا تھا۔ واقدی نے مغازی میں اپنے مشائخ کی جماعت سے نقل کیا ہے کہ جب سات ہجری کا ذی قعدہ آیا تو حضور ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ اس عمرہ کی قضا کا احرام باندھیں جس سے انہیں روک دیا گیا تھا اور جو حدیبیہ میں شریک تھا ان میں سے کوئی بھی نہ رہ جائے تو صرف وہی لوگ شریک نہ ہوئے جو غزوہ خیبر میں شہید ہو گئے تھے یا فوت ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ کے ساتھ وہ لوگ بھی شریک ہوئے تھے جو حدیبیہ میں شریک نہ تھے اور حضور ﷺ کے ساتھیوں کی تعداد دو ہزار تھی۔ واقدی کی خبر مغازی کے بارے میں مقبول ہے جبکہ وہ اخبار صحیحہ کے مخالف نہ ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ امام شافعی کا یہ یقین کرنا کہ ایک جماعت بغیر عذر کے گھروں میں رہ گئی تھی، یہ راوی کے گمان پر مبنی ہے، عذر نہ ہونے پر اس کی شہادت مقبول نہیں۔ جو ساتھ نہ جا سکا ممکن ہے اس کا عذر ہو اور ان لوگوں نے بعد میں عمرہ کی قضا کی ہو ہمارے پیش نظر حجاج بن عمر انصاری کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو لنگڑا ہو گیا یا جس کی ہڈی ٹوٹ گئی وہ احرام کھول دے، اس پر اگلے سال کا حج ہوگا (1) واللہ اعلم۔

۵ اے احرام باندھنے والو اگر تم میں سے کوئی ایسا مریض ہو جائے کہ مرض اسے حلق کرانے پر مجبور کر دے یا زخم ہو یا جوئیں ہوں تو اس نے حلق کرا دیا تو فدیہ اس پر واجب ہوگا۔ یہی حکم ہوگا جس نے خوشبو لگائی یا کسی عذر کی وجہ سے اس نے سلا ہوا کپڑا پہنا، اسے حلق پر قیاس کیا گیا ہے۔

۶ یعنی تین روزے کیونکہ یہ جمع کی ادنیٰ حالت ہے۔ نص مطلق ہے اس لئے پے در پے روزے شرط نہیں۔ یا صدقہ، یہ حکم مجمل ہے، سنت سے اس کی وضاحت آئی ہے۔ امام بخاری نے کعب بن عجرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے دیکھا کہ اس کی

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 264 (وزارت تعلیم)

جوئیں چہرے پر گر رہی ہیں، دریافت فرمایا کیا تیری جوئیں تجھے اذیت دیتی ہیں؟ عرض کی ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ وہ حلق کرائے۔ یہ اس وقت حدیبیہ میں تھے ابھی صحابہ کے لئے یہ واضح نہ ہوا تھا کہ وہ یہاں ہی احرام کھول دیں گے جبکہ ابھی آرزوئیں کر رہے تھے کہ شاید وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فدیہ کا حکم دیا کہ وہ چھ مسکینوں کو ایک "فرق" کھانا کھلا دے یا ایک بکری قربانی دے یا تین روزے رکھ لے(1) میں کہتا ہوں فرق تین صاع کا ہوتا ہے۔

یہ یہ نسیکہ کی جمع ہے جس کا معنی ذبیحہ ہے۔ سب سے بلند مرتبہ بدنہ کا ہے، درمیانی گائے ہے۔ سب سے ادنیٰ بکری ہے۔ من صیام یہ فدیہ کا بیان ہے۔ تمام وہ قربانیاں جو محرم پر لازم ہوتی ہیں بالاتفاق ان کا مکہ میں ذبح کرنا لازم ہے، صرف احصار کی قربانی میں علماء کا اختلاف ہے۔

۸ جب تم روکے جانے سے آزاد ہو جاؤ جیسے تم سے دشمن کا خوف ختم ہو جائے یا تم پہلے مریض تھے تو تم درست ہو گئے اور ابھی تک تم نے احرام نہیں کھولا تھا اس کا معنی ہے کہ تم خوشحالی اور امن میں ہو۔

۹ جس نے حج کے مہینوں میں عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کا نفع کمایا۔ یہ معنی کیا جائے تو قرآن کے یہ الفاظ حج تمتع اور حج قران دونوں کو شامل ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے جس نے عمرہ کے احرام سے فارغ ہونے کے بعد احرام کی حالت میں منہیات سے فائدہ اٹھایا، یہاں تک کہ اس نے حج کا احرام باندھا۔ اس صورت میں یہ نظم حج قران کو شامل نہ ہوگی اس صورت میں باء کا کوئی معنی نہیں ہوگا کیونکہ یہاں نفع کا حصول احرام کی منہیات سے ہوا، عمرہ سے نہیں ہوا۔ پہلی تاویل کرنا لفظاً زیادہ بہتر ہے کیونکہ باء نظم میں موجود ہے اور معنوی اعتبار سے بھی بہتر ہے کیونکہ بالاتفاق حج قران کرنے والے پر بھی دم واجب ہے۔

۱۰ حج تمتع کی نعمت پر شکر بجالانے کے لئے اس پر وہ قربانی واجب ہے جو اس کے لئے آسان ہو، کم سے کم قربانی بکری ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کا قول یہ ہے کہ اس ھدی سے گوشت کھانا جائز ہے کیونکہ یہ شکر کی قربانی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے یہ دم جبر ہے، حج کرنے والے کے لئے اس سے کھانا جائز نہیں۔ ہمارے پاس اپنے نقطہ نظر کے حق میں بے شمار احادیث ہیں۔ انہیں میں سے ایک حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث ہے، اس میں ہے کہ پھر آپ نے ہر جانور سے ایک ٹکڑا لینے کا حکم دیا، اسے ہنڈیا میں ڈال کر پکایا گیا پھر اسے حضور ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھایا اور اس کا شوربہ پیا۔ اس استدلال کی دلیل یہ ہے کہ حضور ﷺ نے حج قران کیا تھا، جب حضور ﷺ نے یہ حکم دیا کہ ہر قربانی سے ٹکڑا لیا جائے پھر آپ ﷺ نے خود اس سے تناول بھی کیا، تو اس سے حج قران اور حج تمتع کی قربانی سے گوشت کھانا ثابت ہو گیا، بلکہ اس گوشت کے کھانے کا مستحب ہونا ثابت ہو گیا ورنہ آپ ﷺ ہر قربانی سے گوشت لینے کا حکم نہ دیتے۔ ابن جوزی نے اس باب میں اس روایت سے استدلال کیا ہے جو عبدالرحمن بن ابی حاتم نے اپنی سنن میں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تمتع کی قربانی کا گوشت لوگوں کو دینے کا حکم دیا سوائے اس گوشت کے جو ہم خود کھائیں۔ یہ دلالت میں زیادہ صریح ہے۔

امام شافعی نے فرض قربانیوں سے استدلال کیا جو ناجیہ خزاعی کی حدیث میں ہے جن کے پاس حضور ﷺ کی قربانی کے اونٹ تھے، وہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے ان جانوروں کے بارے میں نے پوچھا جنہیں کوئی عارضہ لاحق ہو کہ ان کے ساتھ کیا کروں آپ ﷺ نے فرمایا انہیں ذبح کرو اس کا پاؤں خون میں لت پت کر دو اور اس کی ایک طرف میں چھاپہ لگا دو اور لوگوں کے لئے اذن

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 244 (وزارت تعلیم)

عام دے دو لیکن وہ اسے کھائیں(1) اسے امام مالک، امام احمد، امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ نے روایت کیا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ حدیث صحیح ہے واقدی کی روایت میں ہے تم خود اور تیرے ساتھی اس سے کچھ نہ کھائیں تم لوگوں کے لئے اسے چھوڑ دو۔ حضرت ابن عباس کی حدیث بھی اسی طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کے ہاتھ سولہ اونٹ قربانی کے بھیجے اور اسے یہ حکم دیا۔ اس میں یہ بھی ہے کہ نہ تم خود کھانا اور نہ ہی تیرے ساتھیوں میں سے کوئی کھائے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(2) اسی طرح ذویب کی اسی کی مثل حدیث ہے۔ اسے بھی امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں ان احادیث کا حج قرآن یا حج تمتع سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ واقعہ حجۃ الوداع میں نہیں ہوا، یہ حدیبیہ کا قصہ ہے یا کوئی اور جبکہ نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد صرف حجۃ الوداع کیا ہے۔ تو یہ حج تمتع کی ھدی کیسے ہو سکتی ہے بلکہ یہ نفلی ھدی ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ نفلی قربانی سے بھی گوشت کھانا جائز نہیں جب وہ کسی عارضہ کی وجہ سے راستے میں ہی ذبح کر دی جائے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

حج تمتع کی قربانی یوم النحر سے پہلے کرنا جائز نہیں۔ یہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کا نقطہ نظر ہے بلکہ رمی جمار کے بعد ذبح کرنا واجب ہے۔ بعض علماء نے کہا یوم النحر سے پہلے بھی اسے ذبح کرنا جائز ہے۔ ہمارے پیش نظر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ کے احرام کھولنے میں کون سی چیز مانع ہے؟ فرمایا میں قربانی ساتھ لایا ہوں اور میں نے بالوں کو لبدہ کیا ہے، میں اس وقت تک احرام نہیں کھول سکتا جب تک میں قربانی نہ کر لوں اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اگر میں قربانی ساتھ نہ لایا ہوتا تو میں احرام کھول دیتا(3) دونوں حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں اگر حج قران کی ھدی یوم النحر سے پہلے جائز ہوتی تو ھدی ساتھ لانے کی وجہ سے احرام نہ کھولنے کا عذر درست نہ ہوتا واللہ اعلم۔

(1) یعنی جو ھدی نہ پائے تو اس پر ایام حج کے تین روزے ہیں جن میں سے آخری روزہ یوم عرفہ کا ہونا چاہئے، اگر اس نے احرام کی حالت میں اس سے قبل روزے رکھ لئے تو بالاجماع یہ جائز ہے مگر اس کے بعد یہ جائز نہیں کیونکہ اس کے بعد احرام نہیں رہتا۔ نیز یوم النحر اور ایام تشریق کے روزے حرام ہیں، ان دنوں میں روزہ رکھنے سے واجب ادا نہیں ہوگا۔ صحیحین میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا یہ وہ دو دن ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے روزے رکھنے سے منع کیا ہے، ایک عید الفطر اور دوسرے وہ جن میں تم اپنی قربانیوں کے گوشت کھاتے ہو(4) متفق علیہ۔ اسی طرح ابو سعید، ابو ہریرہ اور دوسرے صحابہ کی حدیث بھی متفق علیہ ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے اپنے بیٹے کو ایام تشریق میں فرمایا یہ وہ دن ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے روزے رکھنے سے منع فرمایا اور روزہ افطار کرنے کا حکم دیا۔ اسے ابو داؤد اور ابن منذر نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔ امام مسلم نے کعب بن مالک سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کہ ایام منیٰ کھانے پینے کے دن ہیں(5) امام مسلم کے نزدیک نبیشہ ھذلی سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ بشر بن سحیم کی حدیث بھی اسی طرح مروی ہے جسے امام نسائی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ عقبہ بن عامر کی حدیث کو اصحاب سنن، حاکم اور ابن حبان نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا بزار کے ہاں عبداللہ بن عمر کی ایک مرفوع روایت ہے۔ ایام تشریق کھانے پینے اور نماز کے دن ہیں ان میں کوئی روزہ نہ رکھے اسی باب میں اس کے علاوہ کثیر احادیث ہیں۔

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ نے فرمایا متمتع اگر ھدی نہ پائے اور یوم نحر(1) سے پہلے روزے بھی نہ رکھے تو اس کے لئے

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 110 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 427 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 404 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 267 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 380 (قدیمی) (1) دسویں ذی الحجہ

ایام تشریق میں روزے رکھنا جائز ہے، تاہم دسویں ذی الحجہ کو روزہ رکھنا بالاتفاق جائز نہیں، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ایام تشریق میں کسی کو بھی روزہ رکھنے کی اجازت نہیں مگر جو ھدی کو نہ پائے۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا۔ امام بخاری نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے فرمایا جس نے حج کے ساتھ عمرہ کیا اس کے لئے روزے یوم عرفہ تک ہیں۔ اگر وہ ھدی نہ پائے اور روزے بھی نہ رکھے تو وہ ایام منیٰ کو روزے رکھے(1) علماء نے کہا یہ روایت مرفوع حکمی ہے۔ ہم اسے مرفوع حکمی تسلیم نہیں کرتے۔ شائد حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عائشہ صدیقہ نے ایام تشریق میں روزوں کے جواز کا فتویٰ اس آیت کریمہ سے استنباط کرتے ہوئے دیا ہو ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ ان دونوں کا گمان یہ ہو کہ یہ ایام تشریق بھی ایام حج میں سے ہیں کیونکہ ان میں بعض مناسک حج یعنی رمی جمار وغیرہ باقی ہوتے ہیں۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث دار قطنی میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے متمتع کے لئے اس صورت میں روزہ رکھنے کی رخصت دی ہے جب وہ ھدی نہ پائے(2) امام طحاوی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یحییٰ بن سلام ہے جو قوی نہیں اسے دار قطنی اور طحاوی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اسی سند میں ایک راوی ابن ابی لیلیٰ بھی ہے جس پر امام طحاوی نے ان کے حافظہ میں فساد کی وجہ سے طعن کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث بھی ضعیف ہے تو یہ نہی والی احادیث کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہیں؟ امام طحاوی نے کہا نبی کریم ﷺ سے آثار تواتر کے ساتھ ثابت ہیں کہ حضور ﷺ نے منیٰ میں ٹھہرنے کے دوران روزے رکھنے سے منع کیا ہے حاجی منیٰ میں ہی مقیم تھے جبکہ ان میں ایسے بھی تھے جو تمتع کرنے والے تھے۔ بلکہ میں کہتا ہوں وہ سب حج تمتع کرنے والے تھے یا حج قران کرنے والے تھے کیونکہ اس سال حضور ﷺ نے سب کو حج کی نیت توڑ کر عمرہ کی نیت کرنے کا حکم دیا تھا اور پھر آٹھویں ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھنے کا حکم دیا۔

فائدہ:۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے قول کے مطابق آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ ارکان حج میں تین روزے یا ایام حج میں تین روزے لازم ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ تاویل صحیح نہیں کیونکہ ارکان حج روزوں کی ظرف نہیں بن سکتے جبکہ ایام حج تو یوم عرفہ کے ساتھ ختم ہو چکے جس کا ذکر آئندہ آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ سے مراد دو مہینے نو دن اور دس راتیں جو یوم نحر کی صبح کے طلوع ہونے تک ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ بھی لازم آتا ہے کہ ایام تشریق حج میں نہ ہوں کیونکہ یہ ایام کھانے پینے اور حقوق زوجیت ادا کرنے کے دن ہیں۔ اس میں شکار اور دوسری چیزیں بھی جائز ہیں، و اللہ اعلم۔ جو آدمی روزوں یا اس کے بعد ھدی پر قادر ہو گیا لیکن ابھی اس نے حلق نہیں کرایا تھا تو اس پر ذبح کرنا واجب ہوگا جبکہ امام مالک امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے جب وہ اصل پر قادر ہو چکا ہے جبکہ نائب سے حکم ادا نہیں ہوا تو اس کی صورت وہی ہوگی کہ اس نے پانی پالیا ہو اور وہ تیمم کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو، اگر اس نے قربانی اس وقت پائی جب وہ حلق کرا چکا تھا جبکہ اس نے تین روزے بھی رکھے ہوئے تھے تو بالاتفاق اب اس پر قربانی دینا واجب نہ ہوگا، جس طرح ایک آدمی تیمم کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو تو وہ پانی پائے اگر حج کے دنوں میں تینوں روزے فوت ہو گئے تو قربانی ہی متعین ہو جائے گی۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ نے فرمایا وہ تینوں روزے حج کے بعد قضا کرے گا کیونکہ یہ مثل معقول کے ساتھ قضا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں روزہ ھدی کا بدل ہے بدل شرعی طور

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 288 (وزارت تعلیم)

2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 388 (العلمیہ)

پر ہی متعین کیے جا سکتے ہیں روزہ ھدی کا بدل نہیں بن سکتا مگر انہیں خصوصیات کے ساتھ جن کا ذکر نص میں آیا ہے۔

۱۲ یعنی جب تم حج کے افعال سے فارغ ہو جاؤ تو سات روزے لازم ہیں یہ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کا نقطۂ نظر ہے۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب تم مکہ سے اپنے اوطان کا قصد کرتے ہوئے نکلو تو روزے رکھو جبکہ امام شافعی کا مشہور قول یہ ہے اور وہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی ہے کہ جب تم اپنے گھر پہنچ جاؤ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا رجوع سے مراد گھر لوٹنا ہے اس سے قبل روزے جائز نہیں۔ امام مالک نے فرمایا جب حاجی مکہ مکرمہ سے گھر کے لئے نکل کھڑا ہوا تو اس کا لوٹنا صحیح ثابت ہو گیا تو اس کے لئے گھر پہنچنے سے پہلے بھی روزے رکھنا جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا آیت میں رجوع سے مراد حج سے فارغ ہونا ہے کیا آپ دیکھتے نہیں جس نے حج سے فارغ ہونے کے بعد مکہ مکرمہ کو ہی وطن بنا لیا یا اس کا کوئی اپنا وطن نہ ہو تو بالا جماع مکہ میں اس کے لئے روزے جائز ہیں، اسی طرح جس کا وطن مکہ مکرمہ کے علاوہ ہو اس کے لئے بھی یہ جائز ہے تا کہ حقیقت و مجاز کا جمع ہونا لازم نہ ہو، واللہ اعلم۔

۱۳ یہ بطور تاکید مذکور ہے تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ واؤ اَوْ کے معنی میں ہے یا اس لئے تا کہ عدد کا مجموعی علم ہو جائے جس طرح تفصیلاً علم ہوا تھا کیونکہ اکثر عرب حساب کو اچھی طرح نہ جانتے تھے۔ کاملۃ صفت مؤکدہ ہے جو عدد کی محافظت میں مبالغہ کا فائدہ دیتی ہے۔

۱۴ حج تمتع مکہ مکرمہ کے شہریوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے جائز ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے جبکہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک مکی کے لئے بھی حج تمتع جائز ہے لیکن اس پر قربانی واجب نہ ہوگی۔ ان علماء کا یہ خیال ہے کہ ذٰلِكَ کا مشار الیہ ھدی کے واجب ہونے کا حکم ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان لمن لَّمْ يَكُنْ میں لام ہماری تاویل کی دلیل ہے کیونکہ لام وہیں استعمال ہوتا ہے جس کا کرنا جائز ہو اسی وجہ سے ہم نے جار کو مقدر کیا اگر ذٰلِكَ کا مشار الیہ ھدی کا وجوب ہوتو پھر تقدیر کلام یوں ہوگی یجب اس صورت میں حرف جار علیٰ ہوتا۔ جو معنی ہم نے ذکر کیا ہے وہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ سے حج تمتع کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم اپنی کتاب اور اپنے نبی کی سنت میں رکھا اور اہل مکہ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے اسے مباح قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (1) ابن ہمام نے فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت صحیح ہے کہ آپ نے فرمایا اہل مکہ کے لئے حج تمتع نہیں اور نہ ہی حج قران ہے اور حاضری المسجد الحرام سے مراد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک میقات کے اندر والا حصہ ہے۔ عکرمہ نے بھی یہی کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا جس کا گھر مکہ مکرمہ سے سفر کی مسافت سے کم ہو وہ اس حکم میں شامل ہے۔ طاؤس اور ایک جماعت نے کہا اس سے مراد اہل حرم ہیں کیونکہ بالا جماع یہاں مسجد مراد نہیں۔ پس اس سے مراد حرم ہوگا جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اور اللہ تعالیٰ کے فرمان اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس سے مراد صرف اہل مکہ ہیں۔ نافع اور اعرج نے بھی یہی کہا۔ حنفیہ میں سے طحاوی نے یہی پسند کیا واللہ اعلم۔

اگر مکی حج تمتع کرے گا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر دم جنایت واجب ہوگا کیونکہ اس نے ایک ممنوع عمل کیا ہے روزہ اس دم کے قائم مقام نہیں ہو سکتا اور حاجی کے لئے اس میں سے کھانا بھی جائز نہیں۔ امام شافعی اور دوسرے علماء نے فرمایا اس پر کوئی چیز

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 214 (وزارت تعلیم)

واجب نہ ہوگی۔

۱۵ اللہ تعالیٰ کے اوامر اور اس کے نواہی میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ جان لو! اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حج اور عمرہ کے مناسک کا ذکر فرمایا۔ ہر ایک کو الگ الگ ذکر فرمایا۔ ان کی تکمیل کو واجب قرار دیا۔ پھر ان دونوں کو اکٹھے ادا کرنے کا ذکر فرمایا جسے حج تمتع کہتے ہیں۔ پھر سنت سے اس امر کو ثابت کیا کہ ان دونوں کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں کہ ان دونوں کا اکٹھے احرام باندھے اور اکٹھے احرام سے فارغ ہو اسے حج قران کہتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے عمرہ کا احرام باندھے عمرہ کے افعال سے فارغ ہونے کے بعد احرام کھول دے پھر مکہ مکرمہ میں ہی رہے۔ یہ اس صورت میں جائز ہوگا کہ وہ ھدی ساتھ نہ لے گیا ہو، پھر آٹھویں ذی الحجہ کو مکہ سے حج کا احرام باندھے اور دسویں ذی الحجہ کو احرام سے فارغ ہو جائے۔ اس کو فقہاء تمتع کہتے ہیں۔ بالاجماع یہ سب جائز ہیں، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف اس میں ہے کہ کون سا افضل ہے اور کیا حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ حج قران فرما رہے تھے، حج تمتع کر رہے تھے یا حج مفرد اور کیا حج قران کرنے والے کے لئے حج اور عمرہ دونوں کے لئے ایک ہی طواف اور سعی کافی ہے جس طرح جمہور کا نقطہ نظر ہے یا اس پر دو طواف اور دو سعیاں ضروری ہیں جس طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ یہ طویل مباحث ہیں۔ ہم نے انہیں منار الاحکام میں بیان کر دیا ہے۔ تحقیق یہی ہے کہ حضور ﷺ نے حج قران کیا۔ اگر ھدی ساتھ لے گیا ہو تو حج قران حج تمتع سے افضل ہے۔ اگر ھدی ساتھ نہ لے گیا ہو تو حج تمتع افضل ہے اور یہ دونوں حج مفرد سے افضل ہیں۔ حضور ﷺ جب مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے بیت اللہ شریف کا طواف کیا، صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی، پھر آپ ﷺ نے طواف نہ کیا یہاں تک کہ آپ ﷺ عرفہ سے واپس تشریف لائے (1) اسے امام بخاری نے روایت کیا۔ میں کہتا ہوں کہ وہ طواف اور سعی عمرہ کی تھی اور حج کے طواف قدوم کے لئے وہ پہلا طواف ہی کافی ہو گیا۔ وہ طواف اور سعی پیدل تھی، جس طرح حبیب، ابن عمر اور جابر کی حدیثوں میں تصریح ہے جو امام مسلم اور دوسرے علماء کے پاس موجود ہیں۔ پھر حضور ﷺ نے طواف زیارت کے بعد دوبارہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی جس پر حضرت جابر کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی سواری پر بیت اللہ شریف کا طواف کیا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی تا کہ لوگ آپ ﷺ کو دیکھ سکیں اور آپ ﷺ انہیں دیکھ سکیں نیز لوگ آپ ﷺ سے سوال کر سکیں (2) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع اپنی سواری پر کیا اور اپنی چھڑی سے حجر اسود کو سلام کیا۔ یہ وہ خلاصہ ہے جو مختلف روایات کو جمع کرنے سے حاصل ہوا۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

"حج کے چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں 1 پس جو نیت کر لے ان میں حج کی 2 تو اسے جائز نہیں بے حیائی کی بات 3 اور نہ نافرمانی 4 اور نہ جھگڑا حج کے دنوں میں 5 اور جو تم نیک کام کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور سفر کا توشہ تیار کرو اور سب سے بہتر توشہ تو پرہیز گاری ہے اور ڈرتے رہو مجھ سے اے عقلمندو! 6"

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 220 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 413 (قدیمی)

لہ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ سے مراد حج کا وقت ہے بلکہ حج کے احرام کا وقت ہے کیونکہ حج کے ارکان کا وقت تو صرف نویں اور دسویں ذی الحجہ کے دن ہیں۔ طبرانی نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا حج کے مہینے شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ ہیں (1) میں کہتا ہوں کہ ان سے مراد شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے نو دن دسویں ذی الحجہ کی فجر طلوع ہونے تک ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ دونوں لفظوں میں سے ہر ایک صحیح ہے کیونکہ مقصود ایک ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ پس جنہوں نے دس کہا ہے انہوں نے راتوں کا اعتبار کیا ہے اور جنہوں نے نو کہا ہے انہوں نے دنوں کا اعتبار کیا ہے۔ لفظ اَشْهُرٌ جمع ذکر کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ وقت ہے اور عرب وقت کے لئے لفظ تام ہی ذکر کرتے ہیں چاہے وقت کی مقدار قلیل ہو یا کثیر۔ جیسا کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو رات کے کچھ حصے میں سیر کرائی اور یہی مطلب ہے اس قول کا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحج۔ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے کہ اشھر سے مراد شوال، ذوالقعدہ اور مکمل ذوالحج ہے کیونکہ نویں ذوالحج کے بعد بھی حاجیوں کے لئے کئی ایسے افعال باقی رہتے ہیں، جنہیں کرنا ان پر واجب ہوتا ہے۔ مثلاً قربانی کا جانور ذبح کرنا، رمی جمار کرنا، حلق کرانا، طواف زیارت کرنا، منیٰ میں رات گزارنا، اور ایام تشریق میں رمی جمار کرنا۔ یہ تمام افعال حج کے حکم میں ہی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تمام افعال تیرہویں ذوالحجہ کو ختم ہو جاتے ہیں تو پھر اس توجیہ سے ذوالحج کا مہینہ مکمل طور پر کیسے شمار کیا جا سکتا ہے؟ علامہ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ذوالحج کا مکمل مہینہ اشھر حج میں شامل ہے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک ان سے مراد وقت ہے۔ جس میں حج کے علاوہ کوئی اور عبادت افضل نہ ہو۔ اور فرمایا کہ بیشک حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے ذوالحجہ کے بقیہ ایام میں عمرہ کرنا مکروہ قرار دیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ صحیح نہیں کیونکہ آفاقی (باہر سے آنے والے) کے لئے حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا مکروہ نہیں۔ اس پر اجماع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی چاروں عمرے ذوالقعدہ میں کئے (2) امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکی کے لئے بھی یہی حکم ہے اور ان دونوں کے نزدیک مکی کے لئے حج تمتع کرنا جائز ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ حج کے مہینوں سے قبل حج کے لئے احرام باندھنا جائز نہیں۔ اگر کسی نے احرام باندھا، تو وہ عمرہ کا احرام ہوگا۔ داؤد نے کہا ہے جس نے حج کے مہینوں سے پہلے حج کے لئے احرام باندھا تو وہ لغو ہوگا اور وہ بالکل کسی کے لئے بھی منعقد نہیں ہوگا اور امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے حج کے مہینوں سے پہلے حج کے لئے احرام باندھا، تو وہ ہو جائے گا، لیکن مکروہ ہوگا۔ ان کے اس قول کی وجہ یہ ہے کہ احرام حج کے لئے شرط ہے، رکن نہیں۔ پھر یہ بھی جائز ہے کہ مبہم احرام باندھ لیا جائے، پھر اسے حج، عمرے، یا قران میں سے جس کے لئے چاہے بنا لے۔ جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن کی جانب سے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے کس ارادے سے احرام باندھا ہے؟ تو انہوں نے عرض کی، اسی ارادے سے جس سے نبی کریم ﷺ نے احرام باندھا ہے (3) اسی طرح حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: کہ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کے احرام باندھنے کی طرح احرام باندھا (4) یہ دونوں حدیثیں صحیحین میں ہیں۔ تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ احرام شرط ہے تو پھر وقت سے پہلے باندھنا بھی جائز ہے۔ جیسا کہ نماز کے لئے وضو وقت سے پہلے کرنا جائز ہے لیکن یہ ارکان کے مشابہ بھی ہے۔ اسی طرح کہ جب کسی غلام کو احرام باندھنے کے بعد

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 393 (العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 409 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 211 (وزارت) 4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 211 (وزارت)

یوم عرفہ سے پہلے آزاد کر دیا گیا، تو اس کا فرض ادا نہیں ہوگا۔ اسی لئے ہم نے یہ کہا ہے کہ یہ مکروہ ہے۔ جب آپ نے یہ جان لیا کہ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ حج کے لئے احرام باندھنے کا وقت ہیں، نہ کہ ارکان کا وقت کیونکہ ارکان کا وقت صرف دو دن ہیں۔ تو یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے غلبہ کے لئے کافی ہے کہ بیشک احرام، اگرچہ حج کے لئے شرط ہے، رکن نہیں اور شرط کو مشروط کے وقت سے پہلے لانا اگرچہ جائز ہوتا ہے لیکن اسے اپنے ذاتی وقت سے پہلے لانا جائز نہیں ہوتا۔ جیسا کہ عشاء کی نماز وتر کی ادائیگی کے لئے شرط ہے، لہذا جس نے عشاء کی نماز غروب شفق سے پہلے ادا کی، تو اس کے لئے وتر کی ادائیگی جائز نہیں۔ اس لئے نہیں کہ اس نے وتر کے وقت سے پہلے عشاء کی نماز ادا کی ہے بلکہ اس لئے کہ اس نے عشاء کی نماز اپنے ذاتی وقت سے پہلے ادا کی ہے۔ واللہ اعلم۔

پس جس نے ان دنوں میں اپنے اوپر حج واجب کیا یعنی حج کا احرام باندھا۔ اس بارے میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے کہ احرام کیا ہے؟ چنانچہ حضرت امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ احرام سے مراد دل سے نیت کرنا ہے۔ جیسا کہ روزے میں کی جاتی ہے اور اس میں تلبیہ شرط نہیں مگر ان میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ احرام کے وقت تلبیہ کہنا واجب ہے اور اسے ترک کرنے سے دم دینا (جانور ذبح کرنا) لازم ہوتا ہے۔ امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے۔ جبکہ ان دونوں سے مشہور روایت یہ ہے کہ تلبیہ کہنا سنت ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ احرام سے مراد نیت کے ساتھ تلبیہ کہنا ہے۔ جیسا کہ نماز میں نیت کے ساتھ تکبیر کہی جاتی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے۔ ہمارے نزدیک احرام کو روزے پر قیاس کرنے کی نسبت نماز پر قیاس کرنے میں مشابہت زیادہ ہے۔ اس آیت کی تاویل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے کہا فَرَضَ الْحَجَّ سے مراد احرام باندھنا ہے(1) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد تلبیہ کہنا ہے اور ابن ابی شیبہ نے ابن عمر کے قول کی مثل ہی حضرت ابن مسعود کا قول بھی نقل کیا ہے اور ہمارے لئے حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے کہ اہل مدینہ مقام ذوالحلیفہ سے احرام باندھیں گے الحدیث(2) متفق علیہ۔ یہ روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور آپ ﷺ کا ایک ارشاد گرامی حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس طرح مروی ہے کہ جس کے پاس ھدی (قربانی کا جانور) ہو، اسے چاہئے کہ وہ عمرہ کے ساتھ حج کا احرام باندھے۔ آپ ﷺ نے اِهلال کا حکم ارشاد فرمایا اور اس سے مراد بلند آواز سے تلبیہ کہنا ہے اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ یہی ان کے خلاف دلیل ہے، جو اس کے واجب ہونے کے قائل نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے احرام کو اہلال سے تعبیر کیا ہے۔ تو اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ احرام سے مراد تلبیہ ہے لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس نے اپنے بدنہ کو قلادہ پہنایا، اور اس کے ساتھ حج کے ارادے سے چل پڑا، تو اس نے احرام باندھ لیا اگرچہ اس نے تلبیہ نہ بھی کہا۔ گویا آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے فعل کو ہی قول کے قائم مقام بنا دیا۔ اس لئے کہ جب طرح قول سے ذکر حاصل ہوتا ہے اسی طرح ذکر بالفعل بھی ہوتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جب آدمی نماز کے لئے اذان سنے اور فوراً نماز کے لئے چل پڑے، تو اس کا یہ چلنا ہی اذان کے جواب کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ بیشک داعی کی دعوت کا جواب بالفعل دینا بالقول کی نسبت اقویٰ ہوتا ہے اور تلبیہ کا معنی بھی یہی ہے کہ اطاعت کو لازم پکڑتے ہوئے اس کے لئے کھڑے ہو جانا، واللہ اعلم۔ اور صاحب ھدایہ نے حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے کہ "جس نے بدنہ کو قلادہ پہنا دیا، اس نے احرام باندھ لیا" اور یہ قول معروف نہیں۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں حضرت

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 394 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 206 (وزارت تعلیم)

ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت موقوف نقل کی ہے۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ ان دونوں اثروں کا مدعی سے کوئی قریبی تعلق نہیں۔ کیونکہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا مذہب یہ ہے کہ جس نے مکہ مکرمہ کی طرف اپنی ھدی بھیج دی اور وہ خود حج کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو جب وہ اپنی ھدی کو قلادہ پہنائے گا، تو اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جائیں گی جو محرم پر حرام ہوتی ہیں، یہاں تک کہ اس کی ھدی کو مکہ میں ذبح کر دیا جائے اور حضرت ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس قول سے یہی مراد ہے کہ جس نے اپنی ھدی کو قلادہ پہنایا، تحقیق اس نے احرام باندھ لیا۔ اسی طرح ان دونوں کے علاوہ بھی کئی صحابہ کرام سے مروی ہے لیکن پھر اس کے خلاف موقف پر اجماع منعقد ہو گیا۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ زیاد بن ابی سفیان نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جانب لکھا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جس نے قربانی کا جانور (ھدی) بھیج دیا، اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو گئیں جو حاجیوں پر حرام ہوتی ہیں، یہاں تک کہ اس کی ھدی کو ذبح کر دیا جائے(1) تو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ایسے نہیں جیسے ابن عباس نے کہا ہے۔ میں نے حضور نبی کریم ﷺ کی ھدی کے لئے قلادے اپنے ہاتھ سے بٹے ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے وہ قلادے انہیں پہنائے، اور پھر میرے باپ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کے ساتھ انہیں بھیجا، لیکن رسول اللہ ﷺ پر ایسی کوئی چیز حرام نہیں ہوئی جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال فرمائی تھی۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ 9ھ کا واقعہ ہے، لہٰذا کوئی بھی یہ گمان نہ کرے کہ یہ اسلام کے ابتدائی دنوں کا واقعہ تھا اور پھر منسوخ ہو گیا۔

فَلَا رَفَثَ: نفی بمعنی نہی ہے، یعنی تم رفث نہ کرو اور رفث سے مراد جماع کرنا ہے۔ زجاج کہتے ہیں کہ یہ لفظ ان تمام افعال کو جامع ہے جن کا ارادہ مرد عورتوں سے کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رفث سے مراد فحش اور قبیح گفتگو ہے۔ تو اس کے بارے میں کہتا ہوں کہ یہ تو ہمیشہ کے لئے حرام ہے۔ اسے احرام کے ساتھ متعلق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا فُسُوْقَ سے مراد وہ افعال ہیں جن سے محرم کو منع کیا گیا ہے، یعنی تم احرام کی محرمات کا ارتکاب نہ کرو اور یہ مجموعی طور پر چھ چیزیں ہیں:۔

(1)۔ الرفث یعنی وطی کرنا اور وطی کی طرف دعوت دینے والے امور کا ارتکاب کرنا۔ اس کے شدید اور قبیح ترین ہونے کے سبب اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر علیحدہ فرمایا ہے کیونکہ جماع یا لا جماع حج اور عمرہ کو فاسد کر دیتا ہے جبکہ اس کے علاوہ دیگر ممنوع چیزوں کا ارتکاب کرنے کے سبب دم دینا لازم آتا ہے۔ لیکن جب جماع کا عمل وقوف عرفہ کے بعد ہو تو اس کے سبب حج کے فاسد ہونے میں اختلاف ہے لیکن اس کے باوجود اس کے حرام ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

(2)۔ خشکی کے شکار کو قتل کرنا، اس کی طرف اشارہ کرنا، اور کسی دوسرے کی اس جانب راہنمائی کرنا۔ جیسا کہ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں: ''لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ'' (حالت احرام میں تم شکار کو قتل نہ کرو)، ''وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا'' (اور تم پر خشکی کا شکار حرام کر دیا گیا ہے، جب تک تم محرم ہو) اس کے بارے بحث سورۂ مائدہ میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(3)۔ بال اور ناخن تراشنا، رب کریم فرماتے ہیں ''وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ'' (اور تم اپنے سروں کا حلق نہ کراؤ یہاں تک کہ ھدی اپنی جگہ پر پہنچ جائے) اور جوں کو مارنا۔ یہ میل کچیل کے سبب پیدا ہوتی ہے اور یہ بالوں کے ساتھ متعلق ہوتی ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 230 (وزارت تعلیم)

(4)۔ کپڑے یا بدن میں خوشبو کا استعمال کرنا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "ایسی شئی نہ پہنو جسے زعفران یا ورس نے مس کیا ہو"(1) متفق علیہ عن ابن عمر۔ مذکورہ بالا وہ اشیاء ہیں جن کی حرمت مردوں اور عورتوں تمام کو شامل ہے اور پھر وہ چیزیں جو صرف مردوں کے ساتھ مختص ہیں وہ دو ہیں۔

(5)۔ سلے ہوئے کپڑے پہننا، اور خفین پہننا۔ مگر ایسا آدمی جو نعلین (جوتے) نہ پائے، تو اسے خفین پہن لینے چاہئے اور وہ آدمی جو چادر نہ پائے، تو اسے شلوار پہن لینی چاہئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے متفق علیہ روایت اسی طرح ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

(6)۔ سر کو ڈھانپنا۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک چہرے کو ڈھانپنا تو مردوں اور عورتوں تمام کو شامل ہے۔ جبکہ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ عورتوں کے ساتھ مختص ہے۔ اس لئے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے "کہ مرد کا احرام اس کے سر میں ہے اور عورت کا احرام اس کے چہرہ میں ہے" اسے دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور اسے مرفوع روایت بھی کیا گیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حالت احرام میں اپنا چہرہ مبارک ڈھانپ لیا کرتے تھے۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں صحیح یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ اور موطا میں فرافصہ سے یہ مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مقام عرج پر دیکھا کہ وہ حالت احرام میں اپنا چہرہ ڈھانپے ہوئے تھے۔ ہماری دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ ایک آدمی کو حالت احرام میں اس کی سواری نے گرا دیا، اور گردن توڑ دی۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اس کے سر اور چہرے کو نہ ڈھانپو، بیشک اسے قیامت کے دن تلبیہ کہتے ہوئے اٹھایا جائے گا"(2) اسے مسلم، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

(7)۔ ساتویں نمبر پر وہ فعل ہے جس کے حالت احرام میں حرام ہونے پر ائمہ کے مابین اختلاف ہے۔ اس سے مراد عقد نکاح کرنا ہے۔ اس کے بارے حضرت امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ محرم کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنا نکاح کرے یا کسی غیر کا، اور یہ بھی جائز نہیں کہ وہ کسی کو نکاح کے لئے وکیل بنائے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو نکاح منعقد نہیں ہوگا۔ جیسا کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ محرم نہ خود نکاح کر سکتا ہے، نہ اس کا نکاح کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کو منگنی کی دعوت دے سکتا ہے(3) اسے امام مسلم اور ابوداؤد وغیرہما نے نقل کیا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ حالت احرام میں عقد نکاح جائز ہے اور وہ منعقد ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ "حضور نبی کریم ﷺ نے حالت احرام میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی اور احرام کھولنے کے بعد ان سے قربت اختیار کی، اور ان کا وصال مقام سرف پر ہوا"(4) متفق علیہ۔

لیکن جمہور نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے متعلقہ روایت میں اختلاف ہے۔ مثلاً حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں یزید بن اصم سے روایت نقل کی ہے کہ "انہوں نے کہا مجھے میمونہ بنت حارث نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے اس حال میں شادی کی، کہ وہ بغیر احرام کے تھے۔" انہوں نے کہا کہ آپ رضی اللہ عنہا میری اور ابن

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 208 (وزارت تعلیم)　2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 394 (ت)　3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 453 (قدیمی)　4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 248 (ت)

عباس رضی اللہ عنہم کی خالہ ہیں(1) تو جمہور نے کہا ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی اپنی روایت ہی ارجح ہے کیونکہ آپ اپنے بارے میں ابن عباس کی نسبت زیادہ جانتی تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح سے متعلقہ روایت میں تعارض موجود ہے جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حدیث تعارض سے محفوظ ہے۔ اور ایک وجہ ترجیح یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حدیث قولی ہے۔ جبکہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ آپ ﷺ کا فعل ہے اور اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہو، کیونکہ نکاح کے بارے میں آپ ﷺ کی ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں کے لئے نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "فُسُوْقَ سے مراد تمام قسم کے گناہ ہیں"(2) لیکن پہلا مفہوم زیادہ واضح ہے کیونکہ یہ حج کے ساتھ مختص نہیں۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے اسے رفع (پیش) اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ لَارَفَثٌ وَّلَافُسُوْقٌ میں تکرار کے سبب لا کا عمل باطل ہو گیا۔ جبکہ دوسرے قراء نے اسے بغیر تنوین کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ لہٰذا اسے لاحول ولا قوۃ کی طرح دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔

ۓ اسے ابو جعفر نے رفع اور تنوین کے ساتھ (وَلَا جِدَالٌ) پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ مختلف جگہوں پر وقوف کرتے تھے اور تمام اپنے موقف کے بارے یہ گمان کرتے تھے کہ ان کا موقف ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا موقف ہے اور پھر اسی پر آپس میں جھگڑ پڑتے تھے۔ ان میں سے بعض عرفات میں وقوف کرتے تھے اور بعض مزدلفہ میں۔ بعض ذوالقعدہ میں حج کرتے تھے اور بعض ذوالحجہ میں۔ اور ہر ایک یہی کہتا تھا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہی صحیح ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وَلَا جِدَالَ" یعنی حج کا امر اسی صورت پر پختہ ہو چکا ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے۔ اس لئے اس میں اختلاف نہ کرو۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیشک حج ذوالحج میں ہی ہے، لہٰذا اس کے ساتھ نسئ کو باطل قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "زمانہ اپنی اسی ہیئت کے ساتھ اس دن سے گھوم رہا ہے، جس دن سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا ہے"(3) یہ متفق علیہ روایت ہے اور ابو بکرہ سے مروی ہے اور "فِى الْحَجِّ" یہ اپنے ماقبل کی خبر ہے۔

ۓ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں عمل کے سبب جزاء عطا فرمائے گا۔ تو اس میں شر سے روکنے کے بعد اچھائی اور عمل خیر پر برانگیختہ کرنا ہے۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ "یمن کے لوگ حج کے لئے آتے تھے اور زاد راہ ساتھ نہیں لاتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں۔ پھر جب مکہ مکرمہ پہنچے، تو لوگوں سے مانگنا شروع کر دیتے"(4) اور علامہ بغوی نے کہا ہے کہ ان کی یہ حالت انہیں لوگوں کی چیزیں اچک لے جانے اور غصب کرنے تک پہنچا دیتی تھی۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا "وَتَزَوَّدُوْا" (5) یعنی اتنا زاد راہ لے کر چلو جس کے سبب تم وہاں پہنچ سکو، اور اپنی آبرو بچا سکو۔ اور تمہیں سوال کرنے اور لوگوں کا مال اٹھانے وغیرہ سے بچا لے۔ "وَاتَّقُوْنِ" کو ابو عمرو نے صرف حالت وصل میں اثبات یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ جبکہ دیگر قراء نے اسے حالت وصل اور وقف دونوں میں حذف یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ بیشک عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرا جائے، جو قریب بھی ہے اور غالب بھی۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 454 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 153 (تجاریہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 632 (وزارت تعلیم) 4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 206 (و۔ت) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 154 (تجاریہ)

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ ﴿١٩٨﴾

"نہیں ہے تم پر کوئی حرج (اگر حج کے ساتھ ساتھ) تم تلاش کرو[1] اپنے رب کا فضل (رزق) [2] پھر جب واپس آؤ عرفات سے [3] تو ذکر کرو اللہ کا مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس [4] اور ذکر کرو اس کا جس طرح اس نے تمہیں سکھایا [5] اور اگرچہ تم اس سے پہلے گمراہوں میں سے تھے [6]"

[1] "أَنْ تَبْتَغُوا" (تم تلاش کرو)۔

[2] "فَضْلًا" سے مراد عطا اور رزق ہے یعنی تجارت کے ذریعے اور اسی طرح سفر حج کے دوران تم اپنے رب کی عطا اور رزق تلاش کرو۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں تین منڈیاں تھیں عکاظ، مجنة اور ذوالمجاز (1) جب اسلام ظاہر ہوا تو وہ ان میں تجارت کرنے سے رک گئے، تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ" کہ تم پر حج کے دنوں میں اپنے رب کا فضل (رزق) تلاش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ ابن عباس نے بھی اسی طرح پڑھا ہے۔ امام احمد، ابن ابی حاتم، ابن جریر اور حاکم وغیرہ نے ابوامامہ تیمی کی سند سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا۔ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا میں مکہ مکرمہ کی طرف آنے والے اس گروہ سے ہوں، جو یہ گمان کرتے ہیں کہ ہمارا حج ادا نہیں ہوا۔ تو پھر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ کیا تم ان کی طرح احرام نہیں باندھتے، کیا تم ان کی طرح طواف نہیں کرتے، اور کیا تم ویسے رمی نہیں کرتے جیسے وہ کرتے ہیں؟ تو میں نے عرض کی۔ کیوں نہیں تو آپ نے کہا۔ تم حاجی ہو حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں ایک آدمی حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے اسی کے بارے سوال کیا جس کے بارے تم نے مجھ سے سوال کیا ہے۔ تو آپ ﷺ نے اسے کچھ بھی جواب عطا نہ فرمایا۔ یہاں تک حضرت جبرئیل امین علیہ السلام یہ آیت لیکر حاضر ہوئے۔ (2)

[3] جب تم واپس آؤ عرفات سے۔ الافاضه کا معنی ہے کثرت سے تیزی سے کوچ کرنا، بکھر جانا اور "عَرَفَاتٍ" عرفة کی جمع ہے چونکہ اس میں اس کے گرد و نواح کو شامل کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کا نام عرفات جمع رکھا گیا ہے، حالانکہ فی الحقیقت یہ ایک جگہ ہے۔ اس میں جائے وقوف کا نام عرفات ہے۔ جبکہ وقوف کا دن عرفہ کہلاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفت ہے کہ جونہی آپ نے اسے دیکھا تو پہچان لیا۔ اسے ابن جریر نے سدی سے نقل کیا ہے۔ یا پھر اس لئے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کو مشاعر میں گھما رہے تھے۔ تو جونہی آپ نے انہیں یہ دکھایا تو انہوں نے فرمایا میں نے پہچان لیا۔ یہ روایت ابن جریر نے حضرت ابن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے نقل کی ہے اور امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت عطاء اور ضحاک نے کہا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا گیا، تو وہ سرزمین ہند میں اترے اور حضرت مائی حوا جدہ میں۔ پھر یہ دونوں ایک دوسرے کو تلاش کرنے لگے حتیٰ کہ مقام عرفات پر عرفہ کے دن ایک دوسرے سے جا ملے اور باہم ایک دوسرے کو پہچان لیا (3) اور حضرت سدی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 648 (وزارت تعلیم)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 154 (تجاریہ)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 155 (تجاریہ)

نے کہا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں کو حج کے لئے دعوت دی، اور انہوں نے تلبیہ کے ساتھ (لبیک کہتے ہوئے) اس کا جواب دیا اور پھر جو بھی آیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے عرفات کی طرف نکلنے کا حکم ارشاد فرمایا اور یہ آپ علیہ السلام کی صفت اس اعتبار سے ہے کہ آپ نکلے اور جب عقبہ کے نزدیک درخت کے پاس پہنچے تو شیطان آپ کو روکنے کے لئے آگے بڑھا۔ چنانچہ آپ نے اسے سات کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی۔ وہ اڑا اور دوسرے جمرہ پر جا بیٹھا۔ آپ نے اس کی طرف پھر کنکریاں پھینکیں اور تکبیر کہی اور وہ تیسرے جمرہ پر جا پہنچا۔ تو آپ نے وہاں بھی کنکریاں مارتے ہوئے تکبیر کہی۔ چنانچہ جب شیطان نے یہ جان لیا کہ وہ آپ کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا، تو چلا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چلتے رہے یہاں تک کہ ذوالمجاز پہنچ گئے، پھر وہاں سے چلے تو عرفات میں جا ٹھہرے اور اسے علامات سے اچھی طرح پہچان لیا۔ لہٰذا اس وقت کا نام عرفہ رکھا گیا اور جگہ کا نام عرفات۔ حتیٰ کہ جب شام کے وقت جمع کے قریب ہوئے تو اس کا نام مزدلفہ رکھ دیا گیا۔ اور ابوصالح کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آٹھویں ذی الحجہ کی رات کو عالم خواب میں دیکھا، کہ انہیں اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ جب صبح ہوئی تو وہ دن کے وقت یہ سوچتے رہے کہ کیا یہ خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا یا کہ شیطان کی طرف سے؟ اس لئے اس دن کا نام یوم ترویہ رکھا گیا۔ پھر نویں ذی الحجہ کی رات کو دوبارہ وہی خواب دیکھا۔ تو پھر صبح کے وقت یہ پہچان لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس لئے اس دن کا نام یوم عرفہ رکھ دیا گیا۔ (1)

؎ مشعر حرام سے مراد وہ جگہ ہے جو مازمان عرفہ سے لیکر محسر تک مزدلفہ کے دونوں پہاڑوں کے درمیان ہے۔ مازمان اور محسر اس میں داخل نہیں۔ اس کا نام مشعر رکھا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ حج کی علامات میں سے ہے، کیونکہ مشعر شعار سے بنایا گیا ہے اور شعار کا معنی علامت ہے اور حرام کا اصلی معنی روکنا ہے اور یہ جگہ حرم میں سے ہے اور اس میں وہ تمام کام ممنوع ہیں جنہیں حرم میں کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مزدلفہ کا ایک نام جمع بھی ہے۔ اس لئے کہ اس میں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کی جاتی ہیں۔ وادی عرنہ کے سوا تمام عرفات موقف ہے اور وادی محسر کے سوا تمام مزدلفہ موقف ہے۔ اس پر اجماع ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”عرفات مکمل طور پر موقف ہے اور وادی عرنہ سے بلند ہو جاؤ اور تمام مزدلفہ موقف (ٹھہرنے کی جگہ) ہے۔ مگر وادی محسر سے اوپر چڑھ جاؤ(2) (یعنی یہ دونوں وادیاں ٹھہرنے کی جگہ میں شامل نہیں اس لئے ان میں وقوف نہ کرو) یہ روایت طبرانی، طحاوی اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے سند موقوف اور مرفوع دونوں سے نقل کیا ہے۔ اسی طرح یہ حدیث حضرت جابر، جبیر بن مطعم، ابوہریرہ اور ابورافع رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے اور ان کی اسناد میں کلام ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مؤطا میں مرفوع نقل کیا ہے۔

؎ اور اللہ کا ذکر کرو جیسے اس نے تمہیں سکھایا ہے۔ یا جس طرح اس نے مناسک وغیرہ کے لئے تمہاری بہترین راہنمائی کی ہے یعنی تم اس کی وحدانیت کا ذکر کرو مگر اس طرح نہیں جیسے کفار شرک کرتے ہوئے اسے یاد کرتے تھے۔ اس میں ”ما“ مصدریہ ہے۔ یا ”ما“ کافہ ہے۔

؎ بیشک تم ہدایت سے پہلے مشرکین میں سے تھے یا ایمان اور طاعت سے جاہل اور ناواقف تھے۔ اس میں اِنْ مخففہ ہے، اور بعد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 155 (التجاریہ)

2۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 388 (التراث العربی)

میں لام اِنْ مخففہ اور نافیہ کے درمیان فرق کرنے کے لئے ہے۔ یہ لام فارقہ کہلاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اِنْ نافیہ ہے اور لام اِلَّا کے معنی میں ہے۔ "اِنْ نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ" جیسے اس آیت طیبہ میں ہے۔

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"پھر تم بھی (اے مغروران قریش) وہاں تک (جاکر) واپس آؤ جہاں جاکر دوسرے لوگ واپس آتے ہیں ۱؎ اور معافی مانگو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا انتہائی رحم کرنے والا ہے ۲؎"

۱؎ ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عرب عرفات میں وقوف کرتے تھے اور قریش اس کے علاوہ مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی۔ "ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ"(1) ابن منذر نے حضرت اسماء بنت ابی بکر سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا "قریش مزدلفہ میں وقوف کرتے ہیں اور شیبہ بن ربیعہ کے سوا دوسرے لوگ عرفات میں وقوف کرتے تھے۔ "تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(2) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ قریش یعنی حمس اور ان کے حلفاء تمام اہل عرب کے ساتھ عرفات میں وقوف کرنے سے تکبر کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ہم اہل اللہ ہیں اس کے حرم کے باسی ہیں۔ ہم نہ تو حرم سے پیچھے رہیں گے اور نہ اس سے نکلیں گے اور بقیہ تمام لوگ عرفات میں وقوف کرتے تھے۔ جب لوگ عرفات سے واپس آتے تھے تو حمس مزدلفہ سے واپس لوٹتے تھے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ عرفات میں وقوف کریں اور وہاں سے تمام لوگوں کے ساتھ مزدلفہ کی طرف واپس آئیں اور انہیں یہ خبر دی کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سنت ہے۔ ان تمام روایات میں النّاس سے مراد حمس کے علاوہ تمام عرب ہیں اور ضحاک نے کہا ہے کہ یہاں النّاس سے مراد صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں النّاس سے مراد اکیلے حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ "اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ" اسی طرح یہ آیت طیبہ بھی ہے۔ "اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ" اس میں پہلے النّاس سے مراد نعیم بن مسعود اشجعی ہے اور امام زہری نے کہا ہے کہ النّاس سے مراد صرف آدم علیہ السلام ہیں اور اس کی دلیل حضرت سعید بن جبیر کی یہ قرأت ہے۔ "ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسِىْ"۔ یعنی انہوں نے الناس کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کا عہد بھول گئے اور کہا گیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے، ثُمَّ یعنی عرفات سے واپس آنے کے بعد "اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ" وہاں تک جاکر واپس آؤ جہاں جاکر دوسرے لوگ واپس آتے ہیں۔ یعنی مزدلفہ سے منیٰ تک۔ اکثر مفسرین نے پہلا قول کیا ہے، لیکن لفظ ثُمَّ اس کے بارے اشکال پیدا کر دیتا ہے کیونکہ وہ (وقوف عرفہ) وقوف مزدلفہ سے مقدم ہوتا ہے۔ تو اس کے بارے یہ کہا گیا ہے کہ یہاں ثم واؤ کے معنی میں ہے اور یہ توجیہ بھی ہے کہ یہاں ثُمَّ دونوں افاضوں (واپسیوں) کے درمیان تفاوت رتبی کے اظہار کے لئے ہے کیونکہ وقوف عرفات سے واپس آنا فرض ہے اور یہ بالا جماع حج کا رکن ہے اور اس کے ادا نہ ہونے سے حج ادا نہیں ہوتا۔ جبکہ اس کے برعکس وقوف مزدلفہ بالا جماع حج کا رکن نہیں۔ مگر لیث اور علقمہ نے کہا ہے کہ وقوف مزدلفہ بھی حج کا رکن ہے۔ اور ثُمَّ کے تفاوت رتبی کے لئے استعمال ہونے کی مثال یہ آیت طیبہ بھی ہے۔ "فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" تک اس آیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ایمان درجہ اور رتبہ کے

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 408 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 409 (العلمیہ)

اعتبار سے تمام نیکیوں سے عظیم تر ہے، و اللہ اعلم۔

وقوف مزدلفہ کے رکن نہ ہونے پر اجماع ہونے کے بعد اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا یہ واجب ہے اور اس کے ادا نہ ہونے سے دم (جانور کی قربانی) واجب ہوتا ہے۔ یا یہ سنت ہے تو اس کے بارے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ سنت ہے، جبکہ جمہور کے نزدیک یہ واجب ہے۔ پھر ان کے درمیان وجوب کی مقدار میں اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یوم نحر کو طلوع فجر کے بعد مزدلفہ میں وقوف کرنا واجب ہے۔ امام مالک کا قول ہے کہ یوم نحر کی رات کو مزدلفہ میں گزارنا واجب ہے۔ اگرچہ وہ ایک ساعت ہی ہو اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ نصف رات کے بعد تمام وقت وہاں ٹھہرنا واجب ہے۔ یہی آیت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ان کی دلیل ہے جنہوں نے وجوب کا قول کیا ہے۔ بیشک رب کریم کا یہ ارشاد گرامی "فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ" اپنی عبارت کے اعتبار سے وقوف مزدلفہ کے وجوب پر دلالت کرتا ہے اور اسی میں اشارۃ النص سے وقوف عرفات کے واجب ہونے پر دلالت موجود ہے کیونکہ یہ کلام مشعر حرام کے پاس ذکر کا حکم دینے کے لئے کی گئی ہے اور عرفات سے واپس آنا اس کے لئے شرط ہے۔ اس لئے یہ بدرجہ اولیٰ واجب ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ بالاجماع ذکر تو واجب نہیں، لہٰذا ذکر کا امر استحباب کے لئے ہے تو پھر اس سے وقوف مزدلفہ کے واجب ہونے کے بارے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے؟ تو اس کے بارے ہمارا قول یہ ہے کہ ذکر سے مراد غفلت کو دور کرنا ہے تو یہ جس طرح قول باللسان سے ہو سکتا ہے، اسی طرح یہ عمل بالجوارح سے بھی ہو سکتا ہے۔ صاحب الحسین نے کہا ہے "كُلُّ مُطِيعٍ لِلّٰهِ ذَاكِرٌ" (اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا ہر فرد ذاکر ہے) لہٰذا عبادت کی نیت سے مزدلفہ میں ٹھہرنا یقیناً ذکر ہے۔ اور ذکر مامور بہ ہے، اس لئے یہ واجب ہے۔ پھر تلبیہ، دعا، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں وقوف کے لئے لازم ہیں اور یہ تمام ذکر ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں لازم کے ذکر سے مراد ملزوم ہو۔ جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے۔ "فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ" یعنی اتنی نماز پڑھو جو آسان ہو۔ ہمارے مذہب کی تائید سنت سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ عروہ بن مضرس نے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو یوم نحر کو مزدلفہ میں ہماری اس نماز (فجر کی نماز) میں حاضر ہوا، اور ہمارے ساتھ وقوف کیا۔ یہاں تک کہ ہم واپس چلے جائیں اور اس سے پہلے رات یا دن کے وقت عرفات میں وقوف کیا تحقیق اس کا حج مکمل ہو گیا(1) یہ روایت اصحاب سنن اربعہ، ابن حبان اور حاکم نے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ تمام محدثین کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ نے حج کی تکمیل کو اس کے ساتھ معلق کیا ہے۔ اور یہ وقوف کے واجب ہونے کی دلیل ہے۔ امام نسائی نے بھی حدیث ان الفاظ میں ذکر کی ہے۔ "جس نے امام اور لوگوں کے ساتھ حج کو پا لیا، یہاں تک کہ وہ وہاں سے واپس آ گئے تو اس نے جمع کو پا لیا اور جس نے امام اور لوگوں کے ساتھ اسے نہ پایا، تحقیق اس نے حج کو نہیں پایا"(2) اور ابو یعلیٰ نے اس طرح نقل کیا ہے "کہ جس نے جمع کو نہیں پایا، اس کا حج نہیں ہے" یہ حدیث امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی دلیل بھی ہے کہ صبح طلوع ہونے کے بعد وقوف واجب ہے اور یہ آیت بھی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس موقف کی دلیل ہے کہ وقوف صبح کے بعد واجب ہے کیونکہ وقوف مزدلفہ وقوف عرفات پر مرتب ہوتا ہے۔ اور اس آیت کا مقتضیٰ وقوف عرفات ہے اور اس امر پر اجماع ہے کہ وقوف عرفات کا وقت رات کے آخر تک ہے۔ لہٰذا جس نے یوم نحر کی رات کے آخر تک وقوف عرفہ کر لیا اگرچہ وہ ایک ساعت کے لئے ہی ہو،

1۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 463 مکتبۃ النصر الحدیثۃ الریاض
2۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 38 مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی

اس نے حج کو پالیا۔ اس سے بالضرور یہ ثابت ہوتا ہے کہ وقوف مزدلفہ کا وقت صبح کے بعد ہے۔ عبدالرحمٰن بن یعمر دیلمی حدیث بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو عرفات میں وقوف کرتے دیکھا۔ اتنے میں اہل نجد میں سے کچھ لوگ آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور حج کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ "حج یوم عرفہ کو ہوتا ہے۔ جس نے صبح کی نماز سے پہلے وقوف عرفہ کو پالیا، اس نے حج کو پالیا۔ ایام منیٰ سے مراد تین ایام تشریق ہیں۔ لہٰذا جو جلدی کر کے دو دنوں میں ہی (واپس) چلا گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں" (1) اسے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث طیبہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اس موقف کی دلیل ہے کہ صبح سے پہلے مزدلفہ میں رات کا کچھ حصہ گزارنا واجب ہے۔ لیکن اصحاب سنن، حاکم، دارقطنی اور بیہقی نے اس حدیث کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "حج سے مراد عرفات میں حاضر ہونا ہے لہٰذا جو بھی یوم نحر کی رات صبح کی نماز سے پہلے وہاں حاضر ہوا، تو اس کا حج مکمل ہو گیا" (2) یہ الفاظ وقوف مزدلفہ پر دلالت نہیں کرتے۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مزدلفہ میں رات گزارنا واجب ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزدلفہ میں رات بسر کی اور صبح کی نماز کے بعد وقوف فرمایا اور پھر ارشاد فرمایا۔ "تم مجھ سے مناسک حج سیکھو" تو اس استدلال کا مقتضیٰ یہ ہے کہ رات گزارنا اور صبح کے بعد وقوف کرنا دونوں واجب ہیں لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے ضعیف افراد کو رات کے آخری حصہ میں مزدلفہ سے منیٰ کی طرف جانے کی رخصت عطا فرما دی، تو اس سے یہ واضح ہو گیا کہ صبح کے بعد وقوف کرنا واجب نہیں۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے۔ "میں ان ضعیف افراد میں سے ہوں جنہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنی اہل میں سے پہلے بھیج دیا تھا" (3) اور صحیحین میں حضرت اسماء بنت ابی بکر سے یہ مروی ہے کہ "حضور نبی کریم ﷺ نے رات کے وقت چاند غروب ہونے کے بعد منیٰ کی طرف سے چلے جانے کی اجازت عطا فرما دی" (3) اسی طرح صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بھی ہے اور ایک صحیح میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ لیکن ہمارا موقف یہ ہے کہ ضعیف اور کمزور لوگوں کو رخصت دینے سے طاقتور لوگوں سے وجوب کی نفی نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیت وقوف عرفہ کے وجوب کا تقاضا کرتی ہے اور پھر اسی طرح وقوف مزدلفہ کے وجوب کا بھی تقاضا کرتی ہے اور وقوف مزدلفہ تو رکن نہیں، تو پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وقوف عرفہ رکن ہے؟ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ وقوف عرفہ ادا نہ ہونے کے سبب حج ادا نہیں ہوتا۔ جبکہ وقوف مزدلفہ کے ساتھ حج کی ادائیگی معلق نہیں۔ اور اجماع کی سند حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے "کہ حج عرفہ ہی ہے" اور خبر واحد اجماع کی سند بن سکتی ہے اور اہل اجماع نے وقوف عرفہ کے رکن ہونے کا حکم رسول اللہ ﷺ سے ہی اخذ کیا ہے، واللہ اعلم۔ ائمہ کے مابین وقوف عرفہ کے وقت کے بارے اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کا وقت یوم عرفہ کی فجر ثانی کے طلوع ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس کا وقت عرفہ کے دن زوال شمس کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ وقوف عرفہ کا وقت یوم عرفہ کا سورج غروب ہونے کے بعد سے لیکر یوم نحر کی فجر ثانی طلوع ہونے تک ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل عبدالرحمٰن بن یعمر دیلمی کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو یوم نحر کی رات صبح کی نماز سے پہلے وہاں پہنچ گیا، اس نے اپنا حج مکمل کر لیا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل عروہ بن مضرس کی حدیث ہے۔ اس میں یہ ہے کہ جو آدمی اس

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 408 (وزارت تعلیم) 2۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 464 (النصر) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 418 (قدیمی)

سے قبل دن یا رات کے وقت عرفات آ پہنچا، اس نے اپنا حج مکمل کر لیا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل عروہ بن مضرس کی حدیث ہے۔ اس میں یہ ہے کہ جو آدمی اس سے قبل دن یا رات کے وقت عرفات آ پہنچا، اس نے اپنا حج مکمل کر لیا۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث ہے۔ جسے امام مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ آٹھویں ذوالحج کو منیٰ کی طرف تشریف لے گئے، وہاں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں ادا فرمائیں پھر تھوڑی دیر قیام فرمایا یہاں تک کہ سورج طلوع ہو گیا۔ آپ ﷺ نے خیمہ بنانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ لہٰذا اون سے بنے ہوئے دھاری دار کمبل سے آپ کے لئے خیمہ بنا دیا گیا۔ پھر آپ ﷺ عرفات کی طرف چلے، جب وہاں پہنچے تو کمبل سے بنا ہوا خیمہ پایا۔ اسی میں قیام فرما ہوئے، یہاں تک کہ سورج زوال پذیر ہو گیا۔ پھر آپ ﷺ نے اپنی قصویٰ اونٹنی پر پالان ڈالنے کا حکم فرمایا اور بطن وادی میں تشریف لائے، الحدیث(1) لہٰذا اگر وقوف عرفہ کا وقت زوال سے پہلے ہوتا، تو یقیناً آپ ﷺ اس کی طرف تشریف لاتے، اور اپنے خیمے میں تشریف فرما نہ ہوتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت افضلیت پر دلالت کرتی ہے [اس پر دلالت نہیں کرتی کہ جس نے زوال سے قبل وقوف کیا، اس کے لئے جائز نہیں۔ اسی طرح سالم بن عبداللہ کی حدیث بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عرفہ کے دن زوال شمس کے وقت حجاج کے پاس تشریف لائے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا اور کہا کہ اگر تم سنت پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہو تو یہاں سے کوچ کرو۔ تو اس نے کہا کیا اسی وقت؟ تو انہوں نے کہا جی ہاں، اسی وقت، واللّٰہ اعلم۔

ع اور اپنے ان اعمال پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو جو تم اپنے دور جاہلیت میں کرتے رہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝

"پھر جب تم پورے کر چکو حج کے ارکان [1] تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو [2] بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر الٰہی کرو [3] اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! دے دے ہمیں دنیا میں ہی (سب کچھ) نہیں ہے اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ [4]"

1 یعنی جب تم ارکان حج اور مناسک سے فارغ ہو جاؤ اور ان سے مراد یوم نحر کو جمرۂ عقبہ پر رمی کرنے کے بعد قربانی کا جانور ذبح کرنا، حلق کرانا (سر منڈانا)، طواف کرنا اور سعی کرنا ہے جاننا چاہئے کہ بالاجماع ارکان حج احرام باندھنا، وقوف عرفہ کرنا اور طواف زیارت کرنا ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ سعی کرنا اور حلق کرانا بھی ارکان میں سے ہیں۔ سعی کی بحث پہلے گزر چکی ہے اور حلق کی بحث ان شاء اللہ سورۂ حج میں آئے گی۔

2 اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو مثلاً تکبیر، تحمید اور ثناء وغیرہ۔ (جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو) اہل عرب کا طریقہ یہ تھا کہ جب وہ حج سے فارغ ہوتے، تو بیت اللہ کے پاس ٹھہرتے اور اپنے آباء و اجداد کے مفاخر بیان کرتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت طیبہ میں انہیں اپنا ذکر کرنے کا حکم فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی انہیں اور ان کے آباء کو نعمتیں عطا فرمانے والا ہے اور وہی ان کا خالق ہے نہ کہ ان کے آباء و

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 407 (العلمیہ)

اجداد، لہٰذا اللہ تعالیٰ ان کی نسبت اس ذکر کا زیادہ حق رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔ أَفَرَءَيْتُم مَّا تُمْنُونَ ءَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلْخَـٰلِقُونَ۔ حضرت ابن عباس اور عطاء نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کا ذکر اس طرح کرو جس طرح چھوٹے بچے اباء (باپوں) کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اس کے بارے میں یہ کہتا ہوں کہ اباء کی نسبت امہات کا ذکر کرنا زیادہ اولیٰ تھا (کیونکہ باپ کی نسبت ماں میں شفقت اور محبت زیادہ ہوتی ہے)۔

۳ بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر کرو۔ اعراب کے اعتبار سے اَشَدَّ مجرور ہے اور یہ الذکر پر معطوف ہے یعنی "وَاذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَذِكْرِكُمْ أَوْ كَذِكْرٍ أَشَدَّ مِنْهُ ذَاكِرِيَّةً" یا پھر اس کا عطف ذکر کے مضاف الیہ پر ہے۔ یعنی كَذِكْرِ قَوْمٍ أَشَدَّ مِنْكُمْ ذَاكِرِيَّةً یا اعراب کے لحاظ سے یہ منصوب ہے اور یہ اٰبَآءَكُمْ پر معطوف ہے۔ اس صورت میں ذکر مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی اَوْ كَذِكْرِكُمْ أَشَدَّ مَذْكُورِيَّةً مِنْ اٰبَآءِكُمْ یا تقدیر عبارت یہ ہوگی۔ "كُوْنُوْا أَشَدَّ ذِكْرًا لِلّٰهِ مِنْكُمْ لِاٰبَآئِكُمْ" (تم اپنے اباء کے ذکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کے لئے زیادہ ذکر کرنے والے ہو جاؤ)۔

۴ (اور لوگوں میں سے کچھ ہیں جو کہتے ہیں) یعنی جو صرف دنیا کا لالچ کرتے تھے اور وہ مشرک لوگ تھے جو یوم بعث کے منکر تھے۔ وہ کہتے تھے (اے ہمارے رب! دے دے ہمیں دنیا میں ہی (سب کچھ)) اس میں دوسرا مفعول محذوف ہے اور اس سے مراد تعمیم ہے یعنی تو ہمیں دنیا میں ہر شئ عطا فرما دے یا ہر وہ شئ جو تو ہمیں عطا کرے گا۔ وہ ہمیں دنیا میں ہی عطا کر دے تو مشرکین حج کے دوران دنیا کے متعلق ہی سوال کرتے تھے۔ تو ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِى ٱلدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِى ٱلْـَٔاخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ ٱلنَّارِ

"اور بعض لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! عطا فرما ہمیں دنیا میں بھی بھلائی ۱ اور آخرت میں بھی بھلائی ۲ اور بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے ۳"

۱ (اور بعض لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما) یہاں حَسَنَةً میں تنکیر تعظیم کے لئے ہے یعنی حَسَنَةً عَظِيْمَةً (عظیم بھلائی اور نیکی) اور اس سے مراد عافیت اور عمل کو خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرنا ہے۔ اور اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد جنس حسنہ ہو اور نکرہ عموم کے لئے ہو۔ مثبت کلام میں مقام اور قرینہ کی مدد سے نکرہ عمومیت پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی میں نکرہ عمومیت کے لئے ہے۔ "تَمْرَةٌ خَيْرٌ مِنْ جَرَادَةٍ" (1) یعنی ہر کھجور ہر ٹڈی سے بہتر ہے۔ اس لئے محرم کے لئے ٹڈی کو مار دینے کی صورت میں بطور جزاء اور کفارہ ایک کھجور دینا کافی ہے۔ پس یہ آیت اسی طرح ہے جیسا کہ سنت میں ہے "اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ مِنَ الْخَيْرِ كُلِّهٖ عَاجِلِهٖ وَاٰجِلِهٖ مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ" (اے اللہ میں تجھ سے دنیا اور آخرت کی ہر قسم کی بھلائی کا سوال کرتا ہوں اس کا بھی جسے میں جانتا ہوں اور اس کا بھی جسے میں نہیں جانتا)۔

۲ اس میں حسنۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کی رضا یا ہر وہ شئ ہے جو اخروی نعمتوں میں سے ہے۔

۳ اے اللہ! تو ہمیں عفو و مغفرت کے ساتھ آگ کے عذاب سے بچا لے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا، وہ چوزے کی مثل کمزور ہو چکا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

1۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 416 (التراث العربی)

کیا تو اللہ تعالیٰ سے کسی شئی کے بارے دعا مانگتا ہے یا اس سے کسی شئی کا سوال کرتا ہے؟ تو اس نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میں یہ دعا مانگتا ہوں اے اللہ! جو آخرت میں میرے لئے سزا ہے وہ دنیا میں ہی مجھے دے دے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ! تو اس کی استطاعت نہیں رکھتا یا فرمایا تو اس کی طاقت نہیں رکھتا۔ تو یہ کیوں نہیں کہتا: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ(1) حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ(2) متفق علیہ۔ حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رکن بنی جمح اور رکن اسود کے درمیان حضور نبی کریم ﷺ کو یہ کہتے سنا: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ(3) اسے ابوداؤد، نسائی، ابن حبان، حاکم اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ ابوالحسن بن ضحاک نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اگر سو مرتبہ بھی دعا مانگتے تو اس کی ابتداء اور اختتام اس دعا پر کرتے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ اور اگر دو دعائیں مانگتے تو ان میں سے ایک دعا یہی ہوتی۔ بقی بن مخلد نے ان ہی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعا کی ابتداء، وسط اور آخر میں یہ دعا ہوتی تھی: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ۝۲۰۲

"انہی لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا (دونوں جہانوں میں)¹ بسبب ان کی (نیک) کمائی کے² اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب چکانے والا ہے³"

¹ "اُولٰٓئِكَ" یہ اشارہ دوسرے گروہ کی جانب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا اشارہ دونوں کی جانب ہے۔

² "لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا" میں دعا کو تکسب کہا گیا ہے، اس لئے کہ دعا بھی اعمال میں سے ایک عمل ہے۔

³ حسن نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ آنکھ جھپکنے کی نسبت زیادہ تیزی سے حساب چکانے والا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے قیامت کا آنا قریب ہے لہٰذا تم آخرت کو طلب کرو۔

وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ ۚ وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰی ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ۝

"اور (خوب) یاد کرو اللہ تعالیٰ کو ان دنوں میں جو معدودے چند ہیں¹ اور جو جلدی کر گئے دو دنوں میں ہی چلا گیا² تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں³ (بشرطیکہ) وہ ڈرتا رہا ہو⁴ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو تمہیں اس کی بارگاہ میں اکٹھا کیا جائے گا⁵"

¹ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد ایام تشریق ہیں۔ ان کی مقدار قلیل ہونے کے سبب ان کا نام معدودات رکھا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے اسی طرح مروی ہے اور رب کریم کا یہ ارشاد گرامی بھی اسی معنی پر دلالت کرتا ہے۔

² یعنی جو جلدی کرتے ہوئے ایام تشریق میں سے دو دنوں میں ہی چل پڑا، اور ایام تشریق میں سے دوسرے دن چلا آیا۔ اس بات پر اتفاق ہے کہ جو ابھی تک وہاں سے (منیٰ سے) نہ چلا گیا اور ایام تشریق میں سے تیسرا دن داخل ہو گیا تو پھر اس دن کی رمی اس پر واجب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 155 (تجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 945 (وزارت تعلیم) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 268 (د۔ت)

ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا ایام تشریق کی راتوں میں سے تیسری رات کا اعتبار ہوگا یا تیسرے دن کا؟ تو اس بارے جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس میں اعتبار رات کے داخل ہونے کا ہے یعنی جو منیٰ میں ٹھہرا رہا یہاں تک کہ تیسری رات داخل ہوگئی تو اس کے لئے تیسرے دن کی رمی جمار کے بغیر وہاں سے آنا حلال نہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس پر رمی واجب نہیں ہو گی یہاں تک کہ اسے صبح منیٰ میں ہو جائے، رات کے وقت وہاں سے چلے آنا اس کے لئے جائز ہے اور اگر فجر وہاں طلوع ہو جائے تو پھر رمی لازم ہو جاتی ہے۔ آپ کے نزدیک رمی کا وقت دن ہے، لہٰذا جو رات کے وقت وہاں سے چل پڑا وہ اس مسافر کی مثل ہے جس نے جمعہ کا وقت شروع ہونے سے قبل اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ آپ کے علاوہ دوسروں نے رات کا اعتبار کیا ہے۔ اس طرح کہ اگرچہ رات رمی کا وقت تو نہیں بلکہ وہ رات گزارنے کا وقت ہے اور منیٰ میں رات گزارنا واجب ہے اور رات کے داخل ہونے کے بعد رات گزارنا واجب ہوتی ہے۔ لہٰذا وہاں سے واپس آنا جائز نہیں ہے واللّٰہ اعلم۔

؎ چونکہ اس نے رخصت کو اختیار کیا ہے۔ لہٰذا اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور جس نے وہاں سے چلنے میں تاخیر کی یہاں تک کہ تیسرے دن کی بھی رمی کر لی تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہی اولیٰ اور افضل ہے اور اس میں اہل جاہلیت کا رد بھی ہے کہ ان میں سے بعض جلدی کرنے کو گناہ سمجھتے تھے اور بعض تاخیر کرنے کو گناہ خیال کرتے تھے۔

؎ یعنی یہ احکام اس کے لئے ہیں جو ڈرتا رہا اور وہی ان سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو آدمی اپنے حج میں ایک چیز داخل کرنے سے بچتا رہا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ تو وہ اس حال میں واپس لوٹے گا کہ اس کی بخشش ہو چکی ہو گی اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا چاہے وہ واپس آنے میں جلدی کرے یا دیر۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ قول حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا ہے۔ اس کی تائید اس مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے: ”کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے حج کیا اور رفث و فسق کا ارتکاب نہ کیا تو وہ اس طرح گناہوں سے پاک ہو کر واپس لوٹے گا جیسے وہ اس دن تھا جب اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا“ متفق علیہ(1)۔ اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے اور آپ ہی سے صحیحین میں یہ مرفوع روایت بھی ہے کہ حج مبرور کی جزا صرف جنت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حج اور عمرہ فقر اور گناہوں کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جیسے لوہار کی بھٹی لوہے کے خَبث (میل) کو دور ہٹا دیتی ہے“(2) اسے امام شافعی اور ترمذی رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے اور حضرت عمر وغیرہ سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کیا ہے۔

جاننا چاہئے کہ ایام تشریق میں منیٰ میں قیام کرنا، ان کی راتوں میں وہاں رات گزارنا اور رمی جمار کرنا بالاجماع رکن نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ (پھر جب تم حج کے ارکان پورے کر چکو تو اللہ کو یاد کرو) تو اس میں حرف فاء ترتیب اور تعقیب کے لئے ہے جو مغایرت پر دلالت کرتی ہے۔ البتہ ان کے واجب ہونے میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ منیٰ میں رات گزارنا اور رمی جمار کرنا دونوں واجب ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ایام تشریق میں وہاں قیام کرنا اور ان کی راتیں وہاں گزارنا واجب ہے اور رمی کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے برعکس قول کیا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں ایک قول امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مثل ہے اور دوسرا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرح۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ رمی تکبیر کی حفاظت کے لئے مشروع ہے اس لئے اگر کسی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 206 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 100 (وزارت تعلیم)

نے رمی چھوڑ کر تکبیر کہہ دی تو اس کے لئے جائز ہے۔ اسے ابن جریر نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وغیرہا سے نقل کیا ہے۔ یہی مذہب ظاہر آیت سے موافقت رکھتا ہے لیکن یہ اجماع کے خلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ آیت دو امروں کے ایجاب کا احتمال رکھتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کا فعل اس کے اجمال کے بیان اور وضاحت کے لئے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "خُذُوْا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُمْ" (حج کے احکام مجھ سے حاصل کرو) امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ منیٰ میں قیام کرنے اور رات گزارنے سے مقصود رمی ہے اور اس کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے: "کہ انہوں نے بطن وادی سے رمی کی تو ان سے کہا گیا کہ لوگ تو اوپر کی جانب سے رمی کرتے ہیں، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں کہ یہ وہ مقام ہے جہاں سورۂ بقرہ نازل ہوئی"(1) بیشک اس قول سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ آیت رمی کے بارے میں ہے، نہ کہ کسی اور کے بارے میں۔ اور عاصم بن عدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹ چرانے والوں کو منیٰ سے باہر رات گزارنے کی اجازت عطا فرمائی تھی وہ دسویں ذی الحجہ کو رمی کرتے تھے، پھر گیارہویں، پھر بارہویں اور پھر واپسی کے دن تیرھویں ذی الحجہ کو بھی رمی کرتے تھے(2) اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے نقل کیا ہے اور نسائی میں ہے کہ اونٹ چرانے والوں کو باہر رات گزارنے کی رخصت دی گئی کہ دسویں کے دن رمی کریں گے اور اس کے بعد آنے والے دونوں دنوں کو کسی ایک دن کی رمی میں جمع کر دیں گے(3) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ دسویں کے دن رمی کرتے اور پھر گیارہویں کا دن گزارنے کے بعد بارہویں کے دن رمی کرتے اور یہ واپس آنے کا پہلا دن ہے اور وہ اس دن گزشتہ دن کی رمی کی قضا بھی کرتے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ رمی کی قضا واجب قرار دینا نہ کہ رات گزارنے کی، اس امر کی دلیل ہے کہ رمی واجب ہے اور مقصود بھی ہے اور رات گزارنے کا وجوب رمی کی تبع میں ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اونٹ چرانے والوں کو رات کی رخصت دینا ایک ضرورت کے لئے تھا، لہٰذا یہ رخصت مطلق عدم وجوب پر دلیل نہیں بن سکتی بلکہ یہ تو وجوب پر دلالت کرتی ہے کیونکہ رخصت اسی شئی میں ہوتی ہے جو پہلے واجب ہو۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے حضرت عمر اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ وہ دونوں ان ایام میں نمازوں کے بعد تکبیریں کہا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مجالس میں، بستر پر، خیمے میں اور راستے میں تکبیریں کہا کرتے تھے اور لوگ بھی ان دونوں کی تکبیر کے ساتھ تکبیر کہا کرتے تھے اور وہ دونوں اسی آیت کی تاویل کرتے تھے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ ایام تشریق میں مطلق ذکر بالاجماع واجب نہیں، چاہے وہ منیٰ میں ہو یا منیٰ سے باہر۔ بلکہ وہ منیٰ کے ساتھ مقید ہے اور ان پر فَمَنْ تَعَجَّلَ کا ارشاد باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہاں تقرب کی نیت سے قیام کرنا ذکر ہے اور ذکر باللسان کا اس کے ساتھ ہونا اولیٰ اور افضل ہے۔ لہٰذا آیت طیبہ کو منیٰ میں قیام کرنے پر محمول کیا جائے گا نہ کہ رمی پر۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ مفہوم اس کے منافی نہیں کہ آیت کا محمل دو امر ہوں یعنی وہاں قیام کرنا اور رمی کرنا۔ اس میں کوئی تضاد نہیں، واللہ اعلم۔

جاننا چاہئے کہ جو کچھ سنت سے ثابت ہے وہ آیت کے اجمال کا بیان اور وضاحت ہے۔ بیشک دسویں ذی الحجہ کے دن صرف جمرہ عقبہ پر سات کنکریاں مارنی ہیں اور ان کا وقت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دسویں کی فجر طلوع ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک دسویں کی نصف رات کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور مجاہد کے نزدیک دسویں

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 236 (وزارت تعلیم)　2۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 408 (التراث العربی)　3۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 40 (د ت)

کا سورج طلوع ہونے کے بعد سے اس کے وقت کا آغاز ہوتا ہے۔ مجاہد کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی اہل کے ضعیف اور کمزور لوگوں کو پہلے بھیج دیا اور فرمایا کہ "جمرہ پر رمی نہ کرنا یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جائے"(1) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اسے استحباب پر محمول کیا جائے گا اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ روایت طلوع شمس سے پہلے اور طلوع فجر کے بعد رمی کے جائز ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ آپ اپنی اسانید سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ نے انہیں نقل ہونے والے افراد کے ساتھ بھیجا اور فرمایا کہ تم جمرہ پر رمی نہ کرنا یہاں تک کہ صبح طلوع ہو جائے"(2) اور یہی روایت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہماری دلیل ہے کہ صبح طلوع ہونے سے پہلے رمی جائز نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث طیبہ سے استدلال کیا ہے" کہ رسول اللہ ﷺ نے ام سلمہ کو دسویں کی رات بھیجا، انہوں نے فجر سے پہلے جمرہ پر رمی کی پھر چلی گئیں اور طواف افاضہ کیا"۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی ضحاک بن عثمان ہے جسے قطان نے لین قرار دیا ہے۔ پھر اسے اس معنی پر محمول کیا گیا ہے کہ انہوں نے نماز فجر سے پہلے رمی کی نہ کہ طلوع فجر سے پہلے۔ پس اس طرح یہی حدیث مجاہد کے خلاف ہماری دلیل ہے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک رمی کا آخری وقت زوال تک ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے دسویں کے دن چاشت کے وقت جمرہ پر رمی کی۔ جب کہ جمہور کے نزدیک اس کا آخری وقت غروب آفتاب تک ہے۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حدیث روایت فرماتے ہیں کہ دسویں کے دن منیٰ میں حضور نبی کریم ﷺ سے سوال کیے جا رہے تھے اور آپ ﷺ فرما رہے تھے کوئی حرج نہیں۔ ایک آدمی نے عرض کی میں نے قربانی کا جانور ذبح کرنے سے قبل حلق کرا لیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ اب ذبح کر دو کوئی حرج نہیں۔ ایک نے عرض کی میں نے زوال کے بعد رمی کی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا "کوئی حرج نہیں"(3) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ اس روایت میں ان کے قول "بَعْدَ مَا اَمْسَيْتُ" کا معنی بعد الزوال ہے کیونکہ مساءً کا اطلاق زوال کے بعد کے وقت پر ہوتا ہے۔ اس سے بعد الغروب مراد نہیں کیونکہ یوم النحر کا اطلاق غروب آفتاب سے پہلے تک ہے نہ کہ اس کے بعد پر۔ اور بعض طرق حدیث میں صراحۃً موجود ہے کہ یہ سوال ظہر کے وقت کے بارے تھا۔ اس کے مکروہ وقت کی انتہا گیارہویں کی فجر طلوع ہونے پر ہوتی ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے اونٹ چرانے والوں کو رات کے وقت رمی کرنے کی رخصت عطا فرمائی تھی۔ یہ روایت ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ معذور کے لئے رات کے وقت رمی کرنا جائز ہے اور غیر معذور کے لئے مکروہ ہے۔

ایام تشریق میں تین جمروں پر رمی کی جاتی ہے: الجمرۃ الدنیا، الجمرۃ الوسطیٰ اور الجمرۃ العقبیٰ۔ ہر جمرے کے پاس سات کنکریاں پھینکی جاتی ہیں۔ ایام تشریق میں سے پہلے اور دوسرے دن رمی جمار کا اول وقت بالاجماع زوال کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ ایام تشریق کا پہلا دن یوم القرار یعنی گیارہویں ذوالحجہ کا دن ہے اور دوسرا یوم النفر الاول یعنی بارہویں ذوالحجہ کا دن ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ پھر آقا دو جہاں ﷺ نے رمی نہیں کی یہاں تک کہ سورج زوال پذیر ہو گیا اور رمی کا آخری وقت ہر دن بغیر کراہت کے غروب آفتاب تک ہے۔ جبکہ معذوروں کے لئے دوسرے دن کی فجر طلوع ہونے سے پہلے تک ہے اور غیر معذور کے لئے غروب آفتاب کے بعد رمی کرنا مکروہ ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چرواہوں کو رات کے وقت

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 109 (وزارت تعلیم)　2۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 412 (دست)　3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 234 (دست)

رمی کرنے کی رخصت دے دی تھی۔ ایام تشریق کے تیسرے دن کی رمی کا حکم بھی جمہور کے نزدیک یہی ہے۔ یہ دن وہاں سے واپسی کا دوسرا دن ہے۔ یعنی تیرھویں ذوالحجہ۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے مگر اس دن غروب آفتاب کے بعد رمی کرنا بالاجماع جائز نہیں۔ کیونکہ یہ رات ایام تشریق کی رات نہیں اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس دن زوال سے پہلے بھی رمی کرنا جائز ہے۔ لیکن میں اس قول کی دلیل پر سوائے اس ایک قول کے مطلع نہیں ہو سکا جو ابن ہمام نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ "یوم النحر کو جب دن بلند ہو جائے تو رمی کرنا اور واپس آنا جائز ہے۔" اسے بیہقی نے روایت کیا ہے۔ (انتفاخ کا معنی ارتفاع (بلند ہونا) ہوتا ہے۔) اس کی سند میں ایک راوی طلحہ بن عمرو ہے۔ امام بیہقی، ابن معین اور دارقطنی نے اسے ضعیف کہا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ متروک الحدیث ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ایام تشریق میں رمی جمار کے درمیان ترتیب شرط ہے؟ تو جمہور کے نزدیک ترتیب واجب ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ترتیب سنت ہے۔ جمہور کے قول کی وجہ یہ ہے کہ ہر شئ کو رائے سے نہیں پہچانا جا سکتا۔ پس اس بارے میں وارد ہونے والی تمام خصوصیات کا لحاظ رکھنا واجب ہے اور عدم ترتیب کے بارے کچھ منقول نہیں۔ جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ کہتے ہیں کہ اگر تینوں جمرات میں رمی کرنے کا ایک حکم ہوتا، تو پھر اس کی خصوصیات کی رعایت کرنی واجب ہوتی۔ لیکن یہاں تو ہر جمرے پر رمی کرنا ایک مکمل حکم ہے، لہٰذا ان میں سے ہر ایک کی خصوصیات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ پس متعدد احکام کے درمیان ترتیب شرط نہیں۔ جیسا کہ رمی، ذبح اور حلق کے درمیان ترتیب شرط نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ قیاس تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ہے۔ بیشک یہ ترتیب اگرچہ شرط نہیں لیکن اسے واجب ہونا چاہئے کیونکہ اس کی کوتاہی دم کے ذریعے پورا کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رمی، ذبح اور حلق کی ترتیب کا حکم ہے۔ ان دونوں مسئلوں کے درمیان وجہ فرق میرے لئے ظاہر نہیں ہو سکی و اللہ اعلم۔

ﮤ اور اللہ سے ڈرتے رہو وہ تمہیں تمہارے اعمال اور اخلاص کے مطابق جزاء عطا فرمائے گا و اللہ اعلم۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝

"اور (اے سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو[1] دنیاوی زندگی کے بارے میں[2] اور وہ گواہ بناتا رہتا ہے اللہ کو اس پر جو اس کے دل میں ہے[3] حالانکہ وہ (حق کا) سخت ترین دشمن ہے[4]"

[1] امام بغوی نے کہا ہے کہ کلبی، مقاتل اور عطاء کا قول ہے اخنس بن شریف ثقفی بنی زہرہ کا حلیف تھا اس کا نام اخنس اس لئے پڑ گیا کہ وہ غزوہ بدر کے وقت بنی زہرہ کے تین سو افراد کے ساتھ حضور نبی کریم ﷺ کے خلاف جنگ لڑنے سے پیچھے ہٹ گیا تھا (اور کفار کے لشکر سے نکل کر واپس چلا گیا تھا) یہ انتہائی شیریں کلام اور حسین المنظر آدمی تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس آتا اور آپ ﷺ کی مجالست اختیار کرتا تھا۔ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا، اور کہتا، میں آپ ﷺ سے محبت کرتا ہوں اور اس پر اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم بھی اٹھاتا تھا حالانکہ فی الحقیقت وہ منافق تھا۔ رسول اللہ ﷺ اسے اپنے قریب بیٹھنے کی جگہ عطا فرماتے تھے کہ اتنے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1) یعنی لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو آپ ﷺ کے دل میں عظمت پاتا ہے اور آپ ﷺ اسے اچھا گمان کرتے ہو۔ "قَوْلُهٗ" سے مراد اخنس کی گفتگو ہے۔ ابن جریر نے سدی سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن اسحاق نے حضرت ابن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 161 (التجاریہ)

عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب مقام رجیع پر ایک سریہ میں حضرت عاصم اور مرثد رضی اللہ عنہما شہید ہوئے تو منافقین میں سے دو آدمیوں نے کہا۔ تعجب ہے ان مقتولین پر جو ہلاک ہو گئے نہ تو اپنے گھر والوں میں بیٹھ سکے اور نہ ہی اپنے ساتھی کا پیغام پہنچا سکے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ۔(1)

ؑ "فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" يُعْجِبُكَ کے متعلق ہے۔ یعنی دنیوی زندگی کے بارے میں حلاوت وفصاحت کے اعتبار سے اس کی گفتگو آپ کو پسند آتی ہے اور آخرت کے بارے میں آپ کو پسند نہیں آئے گی جبکہ اسے ذلت ورسوائی لاحق ہوگی۔ یا یہ قول کے متعلق ہے۔ یعنی اس کی طرف سے دعویٰ محبت اور اظہار اسلام کی گفتگو دنیاداری کے اعتبار سے ہے۔

ؑ وہ منافق اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے اور اسے اس پر گواہ بناتا ہے جو کچھ اس کے دل میں ہے وہ اس کی زبان کے مطابق ہے۔ لہٰذا وہ کہتا ہے وَاللّٰهِ اِنِّي بِكَ مُؤْمِنٌ وَلَكَ مُحِبٌّ (قسم بخدا میں آپ کے ساتھ ایمان رکھتا ہوں اور آپ سے محبت کرتا ہوں)۔

ؑ حالانکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ سخت ترین عداوت رکھنے والا اور جھگڑا کرنے والا ہے۔ الْخِصَامِ یہ خاصمہ خصاما کا مصدر ہے۔ زجاج نے کہا ہے یہ خَصِمٌ کی جمع ہے۔ جیسے بحر کی جمع بحار ہے۔ اور یہ جملہ يُشْهِدُ کے فاعل سے حال ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں سے مبغوض ترین آدمی سخت جھگڑا کرنے والا ہے (2)۔" حضرت قتادہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے۔ جو معصیت میں انتہائی سخت ہوتا ہے، باطل طریقے سے جھگڑتا ہے۔ حکمت کی باتیں کرتا ہے اور عمل گناہ کا کرتا ہے۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝

"اور جب وہ حاکم بن جاتا ہے تو سرتوڑ کوشش کرتا ہے کہ ملک میں فساد برپا کر دے اور تباہ کر دے کھیتوں کو اور نسل انسانی کو ؑ اور اللہ تعالیٰ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا ؑ"

ؑ روایت ہے کہ اخنس اور ثقیف کے مابین عداوت تھی۔ پس اس نے ان پر ایک رات شب خون مارا، ان کی کھیتیوں کو جلا دیا اور ان کے مویشیوں کو ہلاک کر دیا۔ مقاتل نے کہا ہے کہ وہ ایک دفعہ گیا تاکہ اپنے غریم سے مال کا تقاضا کرے تو اس نے اس کی کٹی ہوئی کھیتی کے ڈھیر کو آگ لگا دی اور اس کی گدھی کو مار ڈالا۔ النسل سے مراد تمام چوپاؤں کی نسل ہے اور انسان بھی ان ہی میں سے ہے اور ضحاک نے کہا ہے کہ اِذَا تَوَلّٰى کا معنی ہے۔ جب وہ ملک کا والی بنتا ہے تو وہ زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مجاہد نے قول باری تعالیٰ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ کے بارے کہا ہے کہ بیشک جب اسے والی بنایا جاتا ہے تو وہ عداوت اور ظلم کا عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بارش کو روک لیتے ہیں اور کھیتوں اور نسل (مویشیوں) کو ہلاک کر دیتا ہے۔

ؑ یعنی اللہ تعالیٰ فساد پسند نہیں کرتا، لہٰذا اس پر تم اس کے غضب اور غصے سے ڈرتے ہوئے بچو۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

"اور جب کہا جائے اسے کہ (میاں) خدا سے تو ڈرو تو اور اکساتا ہے اسے غرور گناہ پر پس اس کے لئے جہنم کافی ہے ؑ

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 427 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 161 (التجاریہ)

اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے ؂"

؎ اور جب اخنس کو کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو وہ ناک چڑھاتا ہے اور زمانہ جاہلیت کی حمیت اور تکبر اسے گناہ پر برانگیختہ کرتا ہے جیسے کہا جاتا ہے اَخَذْتُهُ بِكَذَا یعنی اس نے اسے اس (گناہ) پر ابھارا اور اسے اس کے ساتھ لازم کر دیا۔ یا باء سببیت کے لئے ہے اور معنی یہ ہے کہ غرور نے اسے اس گناہ کے لئے اکسایا جو اس کے دل میں تھا اور وہ کفر ہے۔ تو جزاء اور عذاب کے طور پر اس کے لئے جہنم کافی ہے اور جَهَنَّمُ دار العقاب کا عَلَم ہے۔ اور یہ اصل میں نار کا مرادف ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ معرب ہے۔

؎ اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ یہ مقدر قسم کا جواب ہے اور مخصوص بالذم یعنی جہنم محذوف ہے۔ امام بغوی نے کہا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ بندے کو کہا جائے اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو وہ کہے تم اپنی ذات کی فکر کرو(1) اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو کہا گیا اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تواضع اور انکساری کرتے ہوئے اپنا رخسار زمین پر رکھ دیا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

"اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی ؎ اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے ؂ اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر ؃"

؎ یعنی جو جہاد یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بیچ ڈالتا ہے اور خرچ کر ڈالتا ہے۔ اپنی جان (عزیز) حتیٰ کہ اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اسی کی مثل یہ ارشاد گرامی بھی ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ الآیہ۔ ترجمہ: (یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمانداروں سے ان کی جانیں۔) حضرت ابو امامہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کونسا جہاد افضل ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ افضل جہاد جابر سلطان کے پاس کلمہ حق کہنا ہے(2)۔ اسے امام احمد، ابن ماجہ، طبرانی اور بیہقی رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے اور ابن ماجہ نے ابو سعید سے نقل کیا ہے۔

؂ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہتے ہوئے گویا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا وہ ثمن ہیں جن کا مطالبہ وہ اپنی جان خرچ کر کے کرتا ہے۔

؃ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے اس حیثیت سے کہ اس نے اس جیسی نفع بخش تجارت کی طرف ان کی راہنمائی کی ہے۔ حارث بن ابی اسامہ نے اپنی مسند میں اور ابن ابی حاتم نے سعید بن المسیب سے نقل کی ہے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف آئے تو قریش کی ایک جماعت نے ان کا پیچھا کیا۔ آپ سواری سے اترے اور اپنے ترکش کے تمام تیر نکال لئے اور پھر کہا اے گروہ قریش! تم جانتے ہو کہ میں تمہاری نسبت تیر اندازی میں زیادہ ماہر ہوں۔ قسم بخدا تم مجھ تک نہیں پہنچ سکو گے یہاں تک کہ میں اپنے ترکش کے تمام تیر پھینک دوں گا، پھر میں تلوار سے لڑتا رہوں گا، جب تک وہ میرے پاس باقی رہی، پھر تم جو چاہو کرنا اور اگر تم چاہو تو مکہ مکرمہ میں میرے مال پر قبضہ کر لو اور میرا راستہ چھوڑ دو۔ تو انہوں نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ پھر جب وہ مدینہ طیبہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ ﷺ نے فرمایا رَبِحَ الْبَيْعُ اَبَا يَحْيٰى رَبِحَ الْبَيْعُ اَبَا يَحْيٰى (اے ابو یحییٰ نفع کا سودا کیا ہے، نفع بخش بیع کی ہے اے ابو یحییٰ) اور اس وقت یہ آیت طیبہ نازل ہوئی(3) حاکم نے اسے مستدرک میں ابن مسیب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 162 (التجاریہ) 2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 404 (العلمیہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 430 (العلمیہ)

عن صہیب کی سند سے موصولاً نقل کیا ہے اور حماد بن سلمہ عن ثابت عن انس کی سند سے بھی روایت کی ہے اور اس میں اس آیت طیبہ کے نازل ہونے کی تصریح بھی ہے اور کہا ہے کہ یہ مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ اور ابن جریر نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت صہیب بن سنان رومی کے حق میں نازل ہوئی کہ مشرکین نے انہیں مؤمنین کے گروہ سے پکڑ لیا اور انہیں سخت اذیت دی تو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا میں بوڑھا آدمی ہوں، تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا، چاہے میں تم میں رہوں یا کسی اور کے ساتھ۔ کیا تمہارے لئے یہ شرط قبول ہے کہ تم میرا مال لے لو اور مجھے میرے دین پر چھوڑ دو تو انہوں نے ایسا کر لیا۔ اس حدیث کا سیاق سابقہ حدیث کے مخالف ہے۔ پہلی حدیث صحیح ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت سریہ رجیع کے وقت نازل ہوئی۔ ابن اسحاق اور محمد بن سعد وغیرہم نے ذکر کیا ہے کہ سفیان بن نبیح ھذلی کے قتل کے بعد ھذیل قبیلہ میں سے بنی لحیان قبیلہ عضل اور قارہ کی طرف چلے یہ دونوں چھوٹے قبیلے تھے۔ انہوں نے انہیں یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کریں کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام کی ایک جماعت ان کی طرف روانہ فرمائیں جو انہیں اسلام کی دعوت دے اور انہیں احکام شریعت سکھائے۔ انہوں نے دل میں کہا جنہوں نے ہمارا ارادہ کیا ہم ان میں سے جسے چاہیں گے قتل کر دیں گے اور بقیہ کو قریش مکہ کی طرف لے چلیں گے اور ان کے عوض ثمن وصول کریں گے۔ چنانچہ قبیلہ عضل اور قارہ کے سات افراد اسلام کا اقرار کرتے ہوئے وہاں آئے اور آپ ﷺ سے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! بیشک ہم اسلام قبول کر چکے ہیں، آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام میں سے ایک جماعت ہمارے ساتھ بھیجیں جو ہمیں احکام اسلام سکھلائے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت خبیب بن عدی انصاری، مرثد بن ابی مرثد غنوی، خالد بن بکیر، عبداللہ بن طارق اور زید بن دثنہ کو بھیجا اور عاصم بن ثابت انصاری کو ان پر امیر مقرر فرمایا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دس شرفاء کو بھیجا اور عاصم بن ثابت کو ان پر امیر مقرر کیا۔ پس انہوں نے ان کے ساتھ دھوکہ کیا اور ان کے خلاف تقریباً سو تیر اندازوں سے مدد طلب کی(1) ایک روایت میں ہے کہ ان کے لئے دو سو افراد چل دیئے۔ میرا خیال ہے کہ شاید ان میں سے سو تیر انداز تھے۔ جب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے ان کے ساتھ تنگی کی (اور ساتھ چل پڑے) تو جونہی مقام فرقد پر پہنچے تو ایک قوم نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور کہا کہ تمہارے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ اگر تم اتر آؤ تو ہم تمہارے ساتھ قتال نہیں کریں گے، قسم بخدا ہم تمہارے قتل کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ہم تو اہل مکہ سے کچھ مال حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تو حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہرگز نہیں میں کسی کافر کی پناہ میں نہیں اتروں گا اور ساتھ ہی رب کریم کی بارگاہ میں التجا کی "اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَحْمِیْ لَکَ الْیَوْمَ دِیْنَکَ فَاحْمِ لَحْمِیْ اَللّٰهُمَّ اَخْبِرْ عَنَّا رَسُوْلَکَ" (اے اللہ! میں آج تیرے لئے تیرے دین کی حفاظت کر رہا ہوں تو میرے جسم کی حفاظت کرنا، اے اللہ! ہمارے بارے میں اپنے رسول ﷺ کو مطلع کر دینا) چنانچہ جس دن انہیں شہید کیا گیا اسی دن آپ ﷺ کو ان کے بارے مطلع کر دیا گیا۔ پس انہوں نے ان کے ساتھ قتال شروع کر دیا، ان پر تیروں کی بارش کر دی، نتیجۃً حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اپنے سات ساتھیوں کے ہمراہ شہید کر دیئے گئے اور دس افراد میں سے صرف حضرت خبیب، زید بن دثنہ اور عبداللہ بن طارق زندہ باقی بچے۔ جب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو بنو ھذیل نے ان کا سر قلم کرنے کا ارادہ کیا مگر شہد کی مکھیوں کے انبوہ کثیر نے آپ رضی اللہ عنہ کو بچا لیا۔ اسی لئے آپ رضی اللہ عنہ کو حمی الدبر کہا جاتا ہے۔ پھر رب کریم نے بارش برسا دی اور وادی پانی سے بہہ پڑی، لہٰذا اس میں یہ احتمال ہے کہ پانی اپنے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ کو بہا کر لے گیا۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 585 (وزارت تعلیم)

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ نہ وہ کسی مشرک کو مس کرے گا اور نہ اسے کوئی مشرک چھوئے گا۔ تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ رضی اللہ عنہ کی قسم کو پورا فرما دیا۔ پھر حضرت زید بن دثنہ، عبداللہ بن طارق اور خبیب رضی اللہ عنہم کو انہوں نے قیدی بنا لیا۔ پھر بعد ازاں وہ انہیں بیچنے کی غرض سے مکہ کی طرف لے کر گئے حتیٰ کہ جب مقام ظہران پر پہنچے تو حضرت عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ رسی سے باہر کھینچا اور اپنی تلوار کو اٹھا لیا تو انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو پتھروں سے مار مار کر شہید کر دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی قبر مقام ظہران پر ہی ہے۔ پھر انہوں نے حضرت زید اور خبیب رضی اللہ عنہما کو مکہ مکرمہ میں فروخت کر دیا۔ ابن اسحاق اور ابن سعد نے کہا ہے کہ حضرت زید کو صفوان بن امیہ نے خریدا (صفوان نے بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا) تا کہ وہ انہیں اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلے قتل کر دے۔ چنانچہ اس نے آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے غلام نسطاس کے ساتھ تنعیم کی طرف بھیج دیا، تا کہ وہ آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دے۔ (نسطاس نے بھی بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا) وہاں قریش کا بہت بڑا اجتماع ہوا جن میں ابوسفیان بھی موجود تھا۔ جب آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے لئے لایا گیا تو ابوسفیان نے ان سے کہا "اَنْشُدُکَ اللّٰهَ یَا زَیْدُ تُحِبُّ اَنَّ مُحَمَّدًا عِنْدَنَا بِمَکَانِکَ یُضْرَبُ عُنُقُهٗ وَاَنَّکَ فِیْ اَهْلِکَ" (اے زید! میں تجھے اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں کہ تو پسند کرتا ہے کہ تیری جگہ ہمارے پاس محمد ﷺ ہوتے ان کی گردن ماردی جاتی اور تو اپنے اہل خانہ میں موجود ہوتا) تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا "وَاللّٰهِ مَا اُحِبُّ اَنَّ مُحَمَّدًا ﷺ الْاٰنَ فِیْ مَکَانِهِ الَّذِیْ هُوَ فِیْهِ تُصِیْبُهٗ شَوْکَةٌ تُؤْذِیْهِ وَاَنَا جَالِسٌ فِیْ اَهْلِیْ" (قسم بخدا! میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ محمد ﷺ اب جس جگہ تشریف فرما ہیں وہاں انہیں کوئی کانٹا بھی اذیت پہنچائے اور میں اپنے اہل میں بیٹھا رہوں) تو یہ سن کر ابوسفیان نے کہا "مَا رَاَیْتُ مِنَ النَّاسِ اَحَدًا یُحِبُّ اَحَدًا کَحُبِّ اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ (ﷺ)" (میں نے لوگوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا جس سے وہ اس طرح محبت کرتے ہوں جیسے محمد (ﷺ) کے اصحاب آپ ﷺ سے محبت کرتے ہیں) پھر نسطاس نے آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو بنو حارث نے خرید لیا۔ اس لئے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر میں حارث کو قتل کیا تھا۔ چنانچہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ ان کے پاس قیدی بن کر ٹھہرے رہے، یہاں تک کہ انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے پر اتفاق کر لیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ایک دن حارث کی بیٹی سے استرا عاریۃً لیا تا کہ اس سے جسم صاف کر لیا جائے۔ تو اس نے وہ دے دیا۔ اتنے میں اس کا بیٹا آپ رضی اللہ عنہ کے پاس چلا گیا۔ اس نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ وہاں عورت کی حفاظت کرنے والا حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے بچے کو اپنی ران پر بٹھا لیا اور استرا آپ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ اس عورت نے یہ دیکھا تو چیخ اٹھی۔ یہ دیکھ کر حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا تو ڈرتی ہے کہ میں اسے قتل کر دوں گا میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ یہ عمل ہماری شان کے مطابق نہیں۔ تو اس کے بعد اس نے کہا۔ قسم بخدا! میں نے خبیب سے بہتر قیدی نہیں دیکھا۔ قسم بخدا! میں نے اسے ایک دن اس طرح پایا کہ وہ اپنے ہاتھ میں انگور توڑ توڑ کر کھا رہا ہے حالانکہ وہ بیڑیوں سے بندھا ہوا تھا۔ مکہ میں کوئی بھی پھل نہیں تھا مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا تھا۔ پھر وہ آپ رضی اللہ عنہ کو لیکر حرم سے نکل گئے تا کہ حل میں آپ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیں۔ انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو سولی دینے کا ارادہ کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا مجھے دو رکعت نماز ادا کرنے کی فرصت دو۔ تو انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا۔ گویا حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے ہر ایسے مسلمان کے لئے سنت قائم کر دی جسے قتل کیا جانا ہو کہ وہ صبر کرتے ہوئے دو رکعت نماز ادا کرے۔ بعد ازاں آپ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا اگر تمہیں میرے اس عمل سے میری گھبراہٹ کا گمان نہ ہونے لگتا تو میں اس سے بھی زیادہ نماز ادا کرتا۔ پھر اپنے رب کے حضور دعا مانگی۔ "اے اللہ! ان

کی تعداد کو شمار کر لے، انہیں ایک ایک کر کے متفرق طور پر قتل کر دے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی باقی نہ رکھنا"(1)۔ یہ کہتے ہوئے اپنی جان قربان کر دی۔

وَلَسْتُ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِمًا عَلٰی اَیِّ شِقٍّ کَانَ فِی اللّٰهِ مَصْرَعِیْ

اور مجھے کوئی پرواہ نہیں جبکہ مجھے حالت اسلام میں شہید کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کون سے پہلو پر گرایا جاتا ہے۔

وَذٰلِکَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰهِ وَاِنْ یَّشَاْ یُبَارِکْ اَوْصَالَ شِلْوٍ مُمَزَّعِ

اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ہے۔ اگر وہ چاہے تو جسم کے ان کٹے ہوئے متفرق اعضاء میں برکت رکھ دے گا۔ انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو زندہ سولی پر چڑھا دیا۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے کہا "اَللّٰهُمَّ بَلِّغْ سَلَامِیْ رَسُوْلَکَ" (اے اللہ! میرا اسلام اپنے رسول اللہ ﷺ تک پہنچا دینا)۔ کہا جاتا ہے کہ مشرکین میں سے ایک آدمی تھا جسے سلامان ابو میسرہ کہا جاتا تھا اس نے اپنا نیزہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے سینے پر رکھا۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے کہا اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو اس سے اس کے غرور اور تکبر میں اور اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے آپ رضی اللہ عنہ کو نیزہ مارا اور شہید کر دیا۔ تو اس کے بارے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ الآیہ۔ محمد بن عمرو بن مسلمہ اسامہ بن زید سے روایت کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا "عَلَیْهِ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهٗ هٰذَا جِبْرَئِیْلُ یُقْرِؤُنِیْ مِنْ خُبَیْبٍ السَّلَامَ" اس پر سلام ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت ہو یہ جبرئیل ہیں جو مجھے خبیب کی جانب سے سلام کہہ رہے ہیں)۔ جب رسول اللہ ﷺ کو آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کو فرمایا جو کوئی خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی کی لکڑیوں سے اتار کر لائے گا اس کے لئے جنت ہے۔ یہ سن کر زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا میں اور میرے ساتھی مقداد بن اسود حاضر ہیں، چنانچہ یہ دونوں نکل پڑے، یہ رات کے وقت چلتے تھے اور دن کے وقت چھپ جاتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک رات مقام تنعیم پر پہنچ گئے۔ سولی کے ارد گرد چالیس مشرکین تھے۔ انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو سولی سے اتارا اس حال میں کہ آپ رضی اللہ عنہ بالکل تر و تازہ تھے، چالیس دن گزرنے کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ میں معمولی سا تغیر بھی رونما نہیں ہوا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر زخم تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی رنگت خون کی مثل تھی اور خوشبو کستوری کی مثل۔ حضرت زبیر نے آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے گھوڑے پر اٹھایا اور دونوں چل پڑے۔ اتنے میں کفار جاگ اٹھے۔ جب انہوں نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی سے گم پایا تو فوراً قریش کو اطلاع دی تو ان میں سے ستر سوار ان کے تعاقب میں نکل پڑے جب وہ ان کے قریب پہنچے تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو زمین پر پھینک دیا اور زمین نے آپ رضی اللہ عنہ کو نگل لیا۔ اسی لئے آپ رضی اللہ عنہ کو بلیع الارض کہا جاتا ہے۔ جب یہ دونوں حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں پہنچے تو اتنے میں جبرئیل امین بھی آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا اے محمد ﷺ! بیشک ملائکہ آپ ﷺ کے ان اصحاب پر فخر کر رہے ہیں۔ لہٰذا حضرت زبیر اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ" جبکہ ان دونوں نے اپنی جانیں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی سے اتارنے کے لئے فروخت کر دی تھیں۔ واللہ اعلم۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 485-486 (وزارت تعلیم)

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٢٠٨﴾

"اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے پورے [1] اور نہ چلو شیطان کے نقش قدم پر بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے [2]"

[1] ابن جریر نے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن سلام، ثعلبہ، ابن یامین، اسد، اسید ابن ابی کعب، سعید بن عمرو اور قیس بن زید نے کہا یہ تمام یہود میں سے ایمان لائے تھے۔ یا رسول اللہ ﷺ ہفتے کا دن وہ ہے جس کی ہم تعظیم کرتے تھے آپ ﷺ ہمیں اس کی ویسی ہی تعظیم کرنے کی اجازت عطا فرمائیں۔ اسی طرح تورات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے آپ ﷺ ہمیں اجازت فرمائیں کہ اس کی تلاوت کے ساتھ رات کو قیام کیا جا سکے۔ اسی طرح امام بغوی نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اونٹ کا گوشت اور دودھ اسلام لانے کے بعد بھی ناپسند کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اَلسِّلْمُ کی دو قرأتیں ہیں: بالکسر یعنی اَلسِّلْمُ اور بالفتح یعنی اَلسَّلْمُ۔ اس کا معنی ہے سر تسلیم خم کرنا اور اطاعت کرنا۔ اسی لئے اس کا اطلاق صلح اور اسلام پر ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد اسلام ہے۔ نافع، ابن کثیر اور کسائی نے یہاں سین کی زبر کے ساتھ قرأت کی ہے اور دوسروں نے زیر کے ساتھ۔ سورۂ انفال میں ابوبکر نے زیر کے ساتھ اور باقیوں نے زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور سورۂ محمد ﷺ میں حمزہ اور ابوبکر نے زیر کے ساتھ اور بقیہ نے زبر کے ساتھ قرأت کی ہے۔ کَآفَّةً (مکمل بدن کا نام ہے) کیونکہ یہ اجزاء کو متفرق ہونے سے روکتا ہے اور ترکیب کے لحاظ سے یہ اُدْخُلُوْا کی ضمیر سے یا السِّلْم سے حال ہے۔ السِّلْم مؤنث ہے جیسا کہ الحرب (اس لئے کَآفَّةً کو اس سے حال بنانا صحیح ہے) اور معنی یہ ہے کہ مکمل طور پر ظاہراً اور باطناً اللہ تعالیٰ کی پیروی کرو اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تصور تو صرف صوفیائے کرام کے نزدیک ہی ہو سکتا ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ اسلام میں کلی طور پر داخل ہو جاؤ اور اس کے ساتھ کسی اور کا اختلاط نہ کرو۔ یا پھر اسلام کے قبیلہ میں داخل ہو جاؤ اور اس کے مکمل احکام کو اپنا لو اور اس میں سے کسی بھی شئی کو نہ چھوڑو۔ حذیفہ بن یمان نے اس آیت کے ضمن میں کہا ہے کہ اسلام کے آٹھ حصص ہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، عمرہ، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور فرمایا جس کے لئے ان میں سے کوئی حصہ بھی نہ ہو وہ خائب و خاسر ہوا۔ میں کہتا ہوں جو کچھ انہوں نے ذکر کیا ہے وہ بطور تمثیل ہے۔ ورنہ آیت سے مراد تو ان تمام امور کی پیروی کرنا ہے جنہیں کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور ان تمام کاموں سے رکنا ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان تمام امور کو شامل ہیں کیونکہ امر بالمعروف ہر عمل کو کرنے کا تقاضا کرتا ہے اور نہی عن المنکر اعمال سے رکنے کا تقاضا کرتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان کے ستر سے کچھ زائد شعبے ہیں ان میں سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ کا قول ہے اور سب سے ادنیٰ راستے سے تکلیف دہ چیز کا دور کرنا ہے اور حیا ایمان کا ایک حصہ ہے (1) اسے مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

[2] وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ میں قرأت کا اختلاف پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی شیطان کے آثار کی پیروی نہ کرو مثلاً یوم سبت کا حرام ہونا، اونٹ کا حرام ہونا اور دیگر وہ امور جو منسوخ ہو چکے ہیں۔ بیشک شیطان کی عداوت بالکل ظاہر ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ حضور نبی

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 47 (قدیمی)

کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہم یہود سے باتیں سنتے ہیں جو ہمیں پسند آتی ہیں، کیا آپ ﷺ اجازت فرماتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض لکھ لیا کریں۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم یہود و نصاریٰ کی طرح مضطرب ہو رہے ہو۔ تحقیق میں تمہارے پاس ایک واضح شفاف نور لیکر آیا ہوں، اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کے لئے بھی میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا۔ یہ روایت امام احمد اور امام بیہقی رحمہم اللہ نے شعب الایمان میں نقل کی ہے۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾

"اور اگر تم پھسلنے لگو اس کے بعد کہ آچکی ہیں تمہارے پاس روشن دلیلیں[1] تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے[2]"

[1] یعنی اگر تمہارے قدم پھسلنے لگیں اور تم اسلام پر استقامت اختیار نہ کر سکو۔ ان واضح آیات اور دلائل کے بعد جو اس کے حق ہونے پر شاہد ہیں۔

[2] کسی بھی نوع کے انتقام سے اللہ تعالیٰ عاجز نہیں ہے اور وہ کسی سے انتقام نہیں لیتا مگر حق کے ساتھ اور وہ کسی کو مہلت نہیں دیتا مگر حکمت کے تحت۔ گویا عزیز کے ساتھ حکیم کا لفظ ذکر فرما کر اس وہم کو دور فرما دیا جو ڈھیل دینے کے بارے پیدا ہو سکتا تھا۔ (کہ اس کا ڈھیل دینا اور فوراً کسی کی گرفت نہ کرنا عاجزی کے سبب نہیں بلکہ اس میں بھی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے)۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

"کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں[1] کہ آئے ان کے پاس اللہ کا عذاب چھائے ہوئے[2] بادلوں (کی صورت) میں[3] اور فرشتے[4] اور (ان کا) فیصلہ ہی کر دیا جائے[5] اور (آخر کار) اللہ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے معاملات[6]"

[1] اس میں النظر بمعنی الانتظار ہے یعنی وہ انتظار نہیں کر رہے ہیں۔

[2] ظُلَلٌ ظُلَّةٌ کی جمع ہے اور الظلۃ کا مفہوم یہ ہے کہ یہ جب بھی تجھ پر چھا جائے۔

[3] علامہ بغوی نے کہا ہے کہ غمام سے مراد وہ بادل ہے جو سفید اور باریک ہو کیونکہ یہ ڈھانپ لیتا ہے اس لئے اسے غمام کہتے ہیں۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس سے مراد سحاب کے علاوہ کوئی اور ہے وہ تو صرف بنی اسرائیل کے لئے چٹیل میدان میں ہوتا تھا۔ مقاتل کا قول ہے کہ اس سے مراد سفید کہر کی مثل مراد لی ہے اور حسن نے کہا ہے کہ غمام سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے کے پردہ میں آئے جس کی طرف اہل زمین نہ دیکھ سکیں۔(1)

[4] وَالْمَلٰٓئِكَةُ کو ابو جعفر نے الغمام پر عطف کرتے ہوئے مجرور (زیر کے ساتھ) پڑھا ہے۔ یا پھر اس کا کسرہ حق جوار کے سبب ہے اور بقیہ قراء نے اسے مرفوع (پیش کے ساتھ) پڑھا ہے۔ یعنی وَيَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 186 (التجاریہ)

وَقُضِیَ الْاَمْرُ کا مفہوم ہے کہ کفار کے لئے عذاب اور مومنین کے لئے ثواب واجب ہو چکا ہے اور وہ حساب سے فارغ ہو چکا ہے اور یہ قیامت کے دن ہوگا، واللّٰہ اعلم۔ سلف وخلف علمائے اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اجسام کی صفات اور حدوث کی تمام علامات سے مبرہ ومنزہ ہے۔ ان کے اس آیت میں دو نظریے ہیں:۔

1:۔ اس پر ایمان لانا اور اس کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ کو سونپ دینا اور اس میں بحث کرنے سے پرہیز کرنا یہ مسلک علماء سلف کا ہے۔ کلبی نے کہا ہے کہ یہ ایسی مخفی چیز ہے جس کی تفسیر نہیں کی جا سکتی۔ مکحول، زہری، اوزاعی، مالک، ابن المبارک، سفیان ثوری، لیث، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ اس آیت اور اس جیسی دیگر آیات میں کہا کرتے تھے کہ ان سے اسی طرح گزر جاؤ جیسے یہ بلا کیف نازل ہوئی ہیں۔ سفیان بن عیینہ نے کہا ہے کہ وہ وصف جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو متصف کیا ہے تو اس کی تفسیر صرف اس کی قرأت کرنا اور اس پر بحث سے سکوت اختیار کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم ﷺ کے سوا کسی کے لئے اس کی تفسیر کرنے کا حق نہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا موقف بھی یہی ہے۔ آپ نے متشابہات کے بارے میں لَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ پر وقف کیا ہے۔ (کہ ان کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا)۔

2:۔ ان کی ایسی تاویل کرنا جو ان کے مناسب ہو۔ اس نظریہ کی بنیاد اس پر ہے کہ "لَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" (کہ ان کی تاویل کو اللہ تعالیٰ اور راسخین فی العلم کے سوا کوئی نہیں جانتا) یعنی اس والراسخون فی العلم کا عطف لفظ اللہ پر ہے۔ (یعنی وقف فی العلم پر ہوا)۔ علامہ بیضاوی وغیرہ نے اِلَّاۤ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ کے بارے میں کہا ہے کہ اس سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ اور وہ اَمْرٌ یا باس ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے "اَوْ یَاْتِیَ اَمْرُ رَبِّكَ ، فَجَآءَهَا بَاْسُنَا" یا پھر معنی اس طرح ہے۔ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ بِبَاْسِهٖ (کہ اللہ تعالیٰ اپنی قوت وطاقت کے ساتھ ان کے پاس آئے) تو گویا اس میں ماتی بہ (جس شئ کے ساتھ آیا جائے) محذوف ہے اور اس پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے، اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ۔ فرمایا کہ عذاب بادلوں میں آئے گا کیونکہ ان کے بارے گمان تو رحمت کا ہوتا ہے، تو جب ان سے عذاب آ جائے تو یہ اس طرح آیا کہ اس کے بارے گمان ہی نہیں تھا لہٰذا وہ زیادہ خوفناک اور ڈراؤنا ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ جو تاویل علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کی ہے اسے اس آیت اور اس جیسی دیگر آیات میں احادیث قبول نہیں کرتیں۔ مثلاً حاکم، ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے یہ آیت پڑھی "وَ یَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ" اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی تمام مخلوق جن وانس، چوپائے، درندے، پرندے اور دیگر تمام مخلوقات کو ایک میدان میں جمع کرے گا تو اتنے میں آسمان دنیا پھٹ جائے گا اور اس کے باسی اتر آئیں گے اور وہ تعداد میں زمین پر رہنے والے جن وانس اور دیگر تمام مخلوقات سے زیادہ ہوں گے، لہٰذا وہ جن وانس اور تمام مخلوق کو گھیر لیں گے۔ پس اہل زمین ان سے کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ تو وہ کہیں گے نہیں۔ پھر دوسرے آسمان کے رہنے والے اتریں گے اور وہ آسمان دنیا اور زمین پر رہنے والوں سے زیادہ ہوں گے پس وہ کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ تو وہ کہیں گے نہیں۔ وہ اپنے سے پہلے اترنے والے ملائکہ، جن وانس اور تمام مخلوق کو گھیر لیں گے۔ پھر اسی طرح تیسرے آسمان کے رہنے والے، پھر چوتھے، پھر پانچویں، پھر چھٹے اور پھر ساتویں آسمان کے باسی اتریں گے اور یہ تعداد میں زمین وآسمان کے تمام رہنے والوں سے زیادہ ہوں گے۔ پس وہ کہیں گے کیا تم میں ہمارا

رب ہے؟ تو وہ کہیں گے نہیں۔ پھر ہمارا رب بادلوں کے سائے میں اترے گا۔ اس کے اردگرد کروبیین ہوں گے جو تعداد میں ساتوں آسمانوں اور زمینوں کے باسیوں سے زیادہ ہوں گے اور حملة العرش بھی جن کے سینگ ایسے ہوں گے جیسے نیزہ کی ابھری ہوئی جگہ ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے قدموں کا فاصلہ اتنا اتنا ہوگا اور ان کے قدم اور ٹخنے کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہوگی۔ ٹخنے سے گھٹنے تک پانچ سو سال کا فاصلہ ہوگا، گھٹنے سے سُرین تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی، سُرین سے ہنسلی تک پانچ سو سال کا سفر ہوگا اور ہنسلی سے بالی کی جگہ (کان) تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی (1) میں کہتا ہوں کہ اگر آیت کا معنی حذف مضاف کے ساتھ کیا جائے جیسا کہ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور اسی طرح اس آیت میں بھی وَ سْـَٔلِ الْقَرْیَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِیْهَا مضاف محذوف نکالا جائے اور کہا جائے وَ سْـَٔلْ اَهْلَ الْقَرْیَةِ اور کوئی بھی یہ نہ کہے کہ یہ متشابہات میں سے ہے تو پھر قرآن کریم میں کوئی آیت بھی متشابہات میں سے نہیں ہوگی حالانکہ رب کریم نے تو فرمایا ہے: "مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ" (آیات میں سے بعض محکم ہیں، جو ام الکتاب ہیں اور دوسری متشابہات ہیں)۔

صوفیائے کرام نے ان آیات میں ایک اور انداز اختیار کیا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات بعض مخلوقات پر ہوتی ہیں مگر ان کا ظہور بلا کیف ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے قلب مومن، کعبہ حسناء اور عرش عظیم کے بارے ذکر کیا ہے مگر تجلیات کا عام نزول انسان پر ہوتا ہے کیونکہ اسے خلیفۃ اللہ ہونے کا شرف حاصل ہے اور وہ تجلیات کبھی چند ضیاء دینے والی بجلی کی مثل برقی ہوتی ہیں اور کبھی دائمی ہوتی ہیں۔ اور وہ تجلیات اللہ تعالیٰ کی ذات میں کسی امر کے حدوث کا تقاضا نہیں کرتیں اور اس کے لئے حوادث کا محل ہونے اور تنزیہ کے مرتبہ سے اترنے کا تقاضا نہیں کرتیں بلکہ یہ ممکن میں امر کے حدوث پر مبنی ہوتیں ہیں۔ جیسا کہ وہ شیشہ جو سورج کے بالمقابل رکھا جائے جب بھی سورج کی شعاعیں اس پر پڑتی ہیں تو اس میں بھی روشن کرنے اور جلانے کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ تجلیات اس آیت کریمہ کا مصداق ہیں: "فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ" اور قول باری تعالیٰ یَاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بادلوں سے ان پر تجلی فرمائے گا۔ پس جس کے دل نے دنیا میں بصیرت حاصل کر لی اس کی آنکھ تو بادلوں کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی ذات تک پہنچ جائے گی جیسا کہ اجرام زجاجیہ (شیشے) سے اجرام فلکیہ کی جانب نگاہ پار چلی جاتی ہے اور یہ بادلوں کے پیچھے سے رویت محال نہیں ہے۔ جبکہ یہ ثابت ہے کہ جنت میں بغیر حجاب کے دیدار الٰہی اسی طرح ہوگا جیسے تم چودھویں رات کا چاند دیکھتے ہو اور جس کے دل کو نور بصیرت حاصل نہ ہوا تو وہ دنیا میں بھی اندھا تھا اور آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا اور وہ راستے سے بھٹکنے والا ہے۔ جیسا کہ ارشاد پاک ہے: وَ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا، تو ایسے آدمی کے لئے بادل حجاب اور پردہ بن جائیں گے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے البدور السافرۃ میں کہا ہے کہ میں نے شیخ بدر الدین زرکشی کی تحریر دیکھی انہوں نے بیان کیا کہ سلمہ بن قاسم نے کتاب غرائب الاصول میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نازل ہونے والی حدیث اور سائے میں اللہ تعالیٰ کے آنے کے بارے کہا ہے کہ ان کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی نگاہوں میں تبدیلی فرما دے گا یہاں تک کہ وہ اسے دیکھنے لگ جائیں گے، حالانکہ وہ خود اپنی شان قدرت کے مطابق غیر متغیر اور غیر منتقل حالت میں اپنے عرش پر جلوہ فرما ہوگا۔ میں کہتا ہوں یعنی لوگ رب کریم کو حجاب کے پیچھے سے بالکل ظاہر دیکھیں گے۔ یہ امام سیوطی نے کہا ہے۔ اسی طرح عبدالعزیز ما جشون سے بھی یہی معنی منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی نگاہوں کو بدل دے گا۔ پس وہ اسے اسی طرح دیکھیں گے گویا وہ نزول فرما رہا ہے، تجلی فرما رہا ہے، وہ اپنی مخلوق سے سرگوشی

1۔ مستدرک حاکم، جلد 4 صفحہ 570 (التفسیر)

کر رہا ہے اور ان سے مخاطب ہے، حالانکہ وہ اپنی عظمت کے سبب غیر متغیر اور غیر منتقل ہے۔ ہم جبرئیل امین کے بارے یہ جانتے ہیں کہ وہ کبھی تو رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اپنی اصلی صورت میں آتے ہیں اور کبھی حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ کی صورت میں۔ حالانکہ جبرئیل امین صورت کے اعتبار سے حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ سے کہیں اجمل اور بڑے تھے، انتہی کلامہ۔

میں کہتا ہوں کہ ہم نے جو تاویل ذکر کی ہے خلف کے اقوال سے اس کا مس بھی نہیں۔ لیکن سلف کے جو اقوال ہم نے ذکر کیے ہیں ان سے یہی مراد ہے کیونکہ انہوں نے کہا کہ استویٰ، نزول اور دیگر تمام امور ثابت ہیں جیسا کہ نصوص میں موجود ہے، لیکن یہ اس طرح بلا کیف ہیں کہ یہ مرتبہ تنزیہ سے مزاحم نہیں۔ تو یہ ایک ایسا امر ہے جس نے اس کا ذائقہ نہیں چکھا وہ اس کے بارے کچھ نہیں جانتا اور جو جانتا ہے اس کے لئے اسے الفاظ سے تعبیر کرنا ممکن نہیں۔ بلکہ اس طرح سامعین کے ذہن فتنہ و فساد میں مبتلا ہو جائیں گے اور وہ اس کے معنی مراد بہ کو بھول جائیں گے۔ اس لئے تم پر لازم ہے کہ ان پر سکوت اختیار کرتے ہوئے ان پر ایمان لاؤ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے سوا کسی کے لئے بھی اس کی تفسیر بیان کرنا جائز نہیں اور لفظ الرسول کا لفظ اللہ پر عطف یہ تقاضا کرتا ہے کہ آپ ﷺ متشابہات کی تفسیر جانتے تھے۔ میں کہتا ہوں اسی طرح آپ کے کامل متبعین بھی جانتے ہیں، واللہ اعلم۔

۲ ابن عامر، حمزہ، کسائی اور یعقوب نے اسے تَرْجِعُ الْاُمُوْرُ پڑھا ہے یعنی تاء کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ۔ اس قرأت کے مطابق الرجوع مصدر لازم سے مشتق ہے۔ جبکہ باقی قراء نے اسے تاء کے ضمہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس طرح یہ الارجاع متعدی سے مشتق ہوگا۔

سَلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝

"آپ پوچھیے بنی اسرائیل سے کہ ہم نے انہیں کتنی روشن دلیلیں عنایت فرمائیں ۱۔ اور جو (قوم) بدل ڈالے اللہ کی نعمت کو اس کے مل جانے کے بعد تو یقیناً اللہ تعالیٰ (اس قوم کو) سخت عذاب دینے والا ہے ۲۔"

۱ یعنی اے محمد (ﷺ) آپ ﷺ مدینہ کے یہودیوں سے پوچھئے۔ اس سوال سے مراد ان کے آباء اور اسلاف کو ڈانٹنا ہے۔ کَمْ استفہامیہ ہے اور یہ سَلْ کے لئے مفعول ثانی ہے۔ یا یہ کم خبریہ ہے اور اٰتَیْنَا کا دوسرا مفعول ہے اور اس کی تمیز مِنْ اٰیَةٍ بَیِّنَةٍ ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ کَمْ مبتدا ہو اور جملہ خبر ہے ضمیر عائد محذوف ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو کَمْ مِنْ اٰیَةٍ بَیِّنَةٍ اٰتَیْنٰهُمْ اِیَّاهَا فَبَدَّلُوْهَا بَعْدَ مَعْرِفَتِهَا۔ (کتنی روشن دلیلیں ہیں جو ہم نے انہیں عنایت فرمائیں تو انہوں نے ان کی پہچان کے بعد انہیں بدل ڈالا) کَمْ استفہامیہ ہونے کی صورت میں کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ جملہ حال ہے۔ یعنی سَلْ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ قَائِلًا كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ۔ اور کم خبریہ ہونے کی صورت میں ایک سوال کا جواب ہے۔ یعنی هَلْ كَانَتْ لَهُمْ اٰیَاتٌ مُّتَكَثِّرَةٌ (کیا ان کے لئے کثیر دلیلیں تھیں) اس میں آیات سے مراد وہ واضح معجزات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر دلالت کرتے ہیں۔ یا پھر تورات میں موجود وہ آیات محکمات ہیں جو حضور نبی رحمت ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ دوسرا معنی زیادہ اظہر ہے۔

۲ اور جو (قوم) اس نعمت کو بدل ڈالتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے آیات کی صورت میں اس پر فرمائی، حالانکہ وہ اس کے لئے ہدایت کا سبب ہے۔ یا کتاب اللہ کی صورت میں اسے عطا فرمائی تو اس نے اس کے مطابق عمل چھوڑ دیا۔ اس تک پہنچنے اور اس کی معرفت پر قدرت

رکھنے کے بعد اس میں یہ تعرض کی گئی ہے کہ انہوں نے نعمت کو جاننے کے بعد اسے بدل ڈالا۔ تو اللہ تعالیٰ اسے سخت عذاب دے گا، اس لئے کہ اس نے سخت جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا ۘ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

"آراستہ کر دی گئی ہے کافروں کے لئے دنیا کی (فانی) زندگی [1] اور مذاق اڑاتے ہیں یہ ایمان والوں کا [2] حالانکہ پرہیزگاروں کی شان بلند ہوگی ان سے [3] قیامت کے دن [4] اور اللہ تعالیٰ روزی تو جسے چاہے بے حساب دے دیتا ہے [5]"

[1] آراستہ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اس طرح کہ اس نے اشیاء کو حسین اور مناظر کو دلکش پیدا فرمایا ہے اور کفار میں قوائے شہوانیہ کو پیدا کیا اور ان کے دلوں میں شراب کی محبت رکھ دی حتیٰ کہ وہ اسی پر ہلاک ہو گئے۔ زجاج نے کہا ہے کہ شیطان نے ان کے لئے اسے مزین کر دیا یعنی ان میں شہوانی تصورات و خیالات کی وسوسہ اندازی کی۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے اور شیاطین بھی ان ہی میں سے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ہی آراستہ کرنے والا ہے۔ ہاں شیاطین کی طرف اس اعتبار سے اس کی نسبت کرنا جائز ہے کہ وہ وسوسہ اندازی کرنے والے ہیں و اللہ اعلم۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت مشرکین عرب ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی۔

[2] اور وہ فقراء اہل ایمان سے استہزاء کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ الَّذِينَ اٰمَنُوا سے مراد حضرت عبداللہ بن مسعود، عمار، صہیب، بلال، خبیب رضی اللہ عنہم اور ان کی مثل افراد تھے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ یہ آیت منافقین عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی ہے۔ وہ دنیا میں خوشحال زندگی گزار رہے تھے اور کمزور مسلمانوں سے تمسخر کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے دیکھو ان کی جانب، یہ ہیں وہ جن کے بارے محمد ﷺ گمان کرتے ہیں کہ ان کے ذریعے وہ غالب آجائیں گے۔ اور عطاء کا قول ہے کہ یہ آیت رؤساء یہود کے بارے نازل ہوئی، وہ فقراء اہل ایمان سے مذاق کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے وعدہ فرمایا کہ وہ بنی قریظہ اور بنی نضیر کا مال و متاع انہیں بغیر جنگ و قتال کے عطا فرمائے گا۔

[3] ان سے مراد وہی فقراء ہیں جن کی طرف الَّذِينَ اٰمَنُوا سے اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تاکہ یہ ان کے متقی ہونے پر دلیل بن جائے اور واضح ہو جائے کہ ان کی عظمت شان کا سبب تقویٰ ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ عمل ایمان کی بنیادی تعریف سے خارج ہے۔ فَوْقَهُمْ ان سے بلند ہوں گے مکان میں یا رتبہ میں یا غلبہ میں کیونکہ متقین اعلیٰ علیین میں اور اللہ تعالیٰ کی عزت و کرامت میں ہوں گے اور وہ کفار کے خلاف فخر کر رہے ہوں گے اور ان سے اسی طرح تمسخر کریں گے جیسے دنیا میں انہوں نے ان سے کیا جبکہ کفار اسفل السافلین اور ذلت میں ہوں گے۔

[4] یعنی بیشک مومنین اللہ تعالیٰ کے نزدیک کفار کی نسبت دارین میں اشرف اور بہتر ہوں گے۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرا تو آپ ﷺ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا۔ اس کے بارے تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا یہ معزز افراد میں سے ہے، قسم بخدا یہ اس لائق ہے کہ اگر یہ کہیں دعوت نکاح بھیجے تو اس کا نکاح ہو جائے اور اگر یہ سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول کی جائے۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر خاموشی اختیار فرمائی۔ اتنے میں ایک اور آدمی پاس سے گزرا۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے اس سے کہا، اس کے بارے تمہاری کیا رائے ہے؟ تو اس نے کہا یا

رسول اللہ ﷺ! یہ آدمی کمزور اور فقیر مسلمانوں میں سے ہے، یہ اس قابل ہے کہ اگر یہ دعوت نکاح بھیجے تو اس کا نکاح نہ کیا جائے اور اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ کی جائے اور اگر یہ بات کرے تو اس کی بات نہ سنی جائے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا یہ تمام اہل زمین سے بہتر ہے(1) اس طرح اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تو اکثر مساکین کو اس کا اہل دیکھا اور میں جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا تو اکثر عورتوں کو اس کے اہل پایا، جبکہ اہل ثروت روک دیئے گئے تھے مگر ان میں سے جو اہل نار تھے، انہیں جہنم کی طرف لیجانے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ اسے بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(2)

ﷺ اللہ تعالیٰ دارین میں جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دے دیتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا بغیر حساب سے مراد کثیر ہے۔ کیونکہ ہر وہ شیٔ (مقدار) جو حساب کے تحت داخل ہو وہ قلیل ہوتی ہے(2) یہ قول بھی ہے کہ بغیر حساب کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چیز بھی عطا فرما دیتا ہے اس پر کوئی اعتراض اور حساب نہیں ہوتا۔ وہ کبھی تو اسے بہت زیادہ عطا فرما دیتا ہے جسے اتنی ضرورت نہیں ہوتی اور اسے قلیل بھی عطا نہیں فرماتا جو اس کا محتاج اور ضرورتمند ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اسے اپنے خزانے ختم ہو جانے کا خوف نہیں کہ وہ حساب کا محتاج ہو۔ (لہٰذا وہ بغیر حساب کے عطا فرما دیتا ہے)۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

"(ابتداء میں) سب لوگ ایک ہی دین پر تھے ۱ (پھر جب ان میں اختلاف پیدا ہو گیا) تو بھیجے اللہ نے انبیاء ۲ خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے ۳ اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب برحق ۴ تا کہ فیصلہ کر دے لوگوں کے درمیان جن باتوں میں وہ جھگڑنے لگے تھے ۵ اور کسی نے اختلاف نہیں کیا اس میں بجز ان لوگوں کے جنہیں کتاب دی گئی تھی بعد از اں کہ آ گئی تھیں ان کے پاس روشن دلیلیں (اس کی وجہ) ایک دوسرے سے حسد تھا ۶ پس اللہ نے ہدایت بخشی انہیں جو ایمان لائے تھے ان سچی باتوں پر جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے اپنی توفیق سے اور اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف ۷"

۱ بزار نے اپنی مسند میں، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن منذر نے اپنی تفاسیر میں اور حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی اور اسے صحیح قرار دیا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا "حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان دس صدیاں تھیں ان میں تمام کے تمام افراد شریعت حقہ پر تھے، پھر ان میں اختلاف پیدا ہو گیا" اسی طرح ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ بیشک ان میں دس صدیاں گزریں ان میں تمام کے تمام علماء حق سے ہدایت یافتہ تھے(3) پھر انہوں نے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 954-955 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 168 (التجاریہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 435 (علمیہ)

اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف بھیجا۔ حسن اور عطاء نے کہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے وقت سے لیکر حضرت نوح علیہ السلام کے مبعوث ہونے تک تمام لوگ چوپاؤں کی مثل کفر پر ایک گروہ بنے بیٹھے تھے کہ اتنے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء کو مبعوث فرمایا(1) مذکورہ دونوں قولوں کے درمیان تطبیق اس طرح ہے کہ پہلے تمام مسلمان تھے پھر ان میں اختلاف ہوا، یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں آپ کے والدین کے سوا تمام کافر ہو گئے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے والدین مومن تھے اور اس کی دلیل ان کا یہ قول ہے: رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیَّ الآیہ۔ یہ قول بھی ہے کہ النَّاس سے مراد عرب ہیں۔ حافظ عماد الدین بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ تمام عرب دین ابراہیمی پر تھے، یہاں تک کہ عمرو بن عامر خزاعی کو مکہ کا والی بنایا گیا۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے حضور نبی کریم ﷺ سے ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس نے سب سے پہلے اونٹنیوں کو بتوں کے نام پر چھوڑا اور بتوں کی عبادت کی وہ ابوخزاعہ عمرو بن عامر ہے۔ بیشک میں نے اسے دیکھا آگ میں اپنی انتڑیاں گھسیٹ کر چل رہا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نے عمرو بن عامر بن لحی بن قمعہ بن خندف کو دیکھا کہ آگ میں اپنی انتڑیاں گھسیٹ کر چل رہا ہے۔ یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے بتوں کے نام پر اونٹنیاں چھوڑی تھیں۔ ابن جریر نے بھی اپنی تفسیر میں آپ سے ہی اسی طرح حدیث نقل کی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ "بیشک یہی وہ پہلا آدمی تھا جس نے دین ابراہیمی کو تبدیل کر دیا تھا" لیکن النَّبِیّٖن جمع کا صیغہ النَّاس سے عرب مراد لینے کے مانع ہے کیونکہ عرب میں حضور نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا۔ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ۔ (تاکہ آپ قوم کو اس سے ڈرائیں جس سے ان کے آباء کو ڈرایا گیا پس وہ غافل ہیں)۔ اور ابوالعالیہ کی سند سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے کہا لوگ جب آدم علیہ السلام پر پیش کئے گئے تھے اور انہیں آپ کی پشت سے نکالا گیا تھا اور ان سے عبودیت کا اقرار لیا گیا تو اس وقت وہ امت واحدہ تھے اور تمام مسلمان تھے اور اس دن کے بعد وہ کبھی بھی امت واحدہ نہ رہے(1) میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ لوگ اس اعتبار سے امت واحدہ ہیں کہ ان میں حق کو قبول کرنے کی استعداد رکھی گئی اور تمام کو ایک فطرت پر پیدا کیا گیا، پھر انسانوں اور جنات میں سے شیاطین نے انہیں بھٹکا دیا۔ لہٰذا ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "ہر بچے کو فطرت (سلیمہ) پر پیدا کیا جاتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی بناتے ہیں، عیسائی بنا دیتے ہیں اور مجوسی بنا دیتے ہیں، جیسا کہ چوپایہ صحیح سالم بچے کو جنم دیتا ہے، کیا تم اس میں کوئی کٹا عضو پاتے ہو؟"(2) متفق علیہ۔

"فَبَعَثَ اللّٰهُ" یہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً پر معطوف ہے اگر اس سے مراد ان کا کفر پر جمع ہونا ہو اور اگر اس سے مراد ان کا حق پر اجتماع ہو تو پھر اس کا عطف فعل مقدر پر ہے۔ یعنی فَاخْتَلَفُوْا فَبَعَثَ اللّٰهُ کیونکہ بعث سے مقصود کفر اور فساد کو روکنا ہے اور اس مقدر عبارت پر بعد میں آنے والا ارشاد گرامی "فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ" دلالت کرتا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! انبیاء علیہم السلام کی کل تعداد کتنی ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "ایک لاکھ چوبیس ہزار ان میں سے ایک جم غفیر تین سو پندرہ رسول ہیں۔" اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ تین سو اور دس سے کچھ زائد رسول ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ان میں سے رسل کی تعداد تین سو تیرہ ہے اور قرآن کریم میں اٹھائیس انبیاء کرام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 169 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 336 (قدیمی)

کے اسماء گرامی مذکور ہیں(1) میں کہتا ہوں کہ قرآن کریم میں چھبیس اسماء مذکور ہیں ان میں سے اٹھارہ اس ارشاد گرامی میں ہیں:۔ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ۔ اور ان کے علاوہ آٹھ کے اسمائے گرامی یہ ہیں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت ذوالکفل علیہ السلام، حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ سید الانبیاء ﷺ۔ یہ قول بھی ہے کہ سورۂ مؤمن میں جس یوسف کا ذکر ہے اس سے مراد حضرت یوسف بن یعقوب علیہما السلام نہیں بلکہ وہ یوسف بن ابراہیم بن یوسف بن یعقوب ہے۔ تو اس طرح قرآن کریم میں مذکور انبیاء کرام کے اسمائے گرامی ستائیس ہو گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ حضرت مریم کی نبوت کے بارے بھی قول کیا گیا ہے۔ اس طرح کل اٹھائیس ہو گئے۔ لیکن یہ قول باری تعالیٰ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ حضرت مریم کی نبوت کے خلاف ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ انتیسویں نبی حضرت لقمان ہوں، واللہ اعلم۔

۳؎ اسے ثواب کی خوشخبری سنانے والا جس نے اطاعت و فرمانبرداری کی اور اسے سزا اور عتاب سے ڈرانے والا جس نے نافرمانی کی۔

۴؎ "وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ" میں کتاب سے مراد جنس کتاب ہے (کوئی مخصوص کتاب مراد نہیں) اور "بِالْحَقِّ" ترکیب کلام میں الکتاب سے حال ہے۔ یعنی "ملتبسا بالحق شاھدا بہ" (حق کے ساتھ متعلق اور اس کی شاہد ہے)۔

۵؎ تاکہ فیصلہ کرے اللہ تعالیٰ یا کتاب یا وہ نبی جو کتاب کے ساتھ مبعوث ہوا۔ (یعنی لِيَحْكُمَ فعل کا فاعل ذات باری تعالیٰ، کتاب اور نبی علیہ السلام تینوں ہو سکتے ہیں)۔ ابو جعفر نے اسے یہاں، سورۂ آل عمران اور سورۂ نور میں دونوں جگہ صیغہ مجہول کے ساتھ پڑھا ہے یعنی یاء کے ضمہ اور کاف کے فتحہ کے ساتھ۔ چنانچہ اس صورت میں اس کا نائب الفاعل ظرف ہوگی اور معنی اسی طرح ہوگا لِيُحْكَمَ بہ یعنی بالکتاب۔ (تاکہ کتاب کے ساتھ فیصلہ کیا جائے) "بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ" یعنی اس حق کے بارے میں جس میں وہ اختلاف کرنے لگے تھے یا اس کے بارے میں جو ان پر ملتبس ہو گیا تھا۔ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ کسی نے کتاب میں اختلاف نہیں کیا۔

۶؎ "اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ" یہ موصول معہود ہے اور اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ البینت سے مراد وہ آیات محکمات ہیں جو تورات میں ہیں معروف کا حکم دیتی ہیں، منکر سے روکتی ہیں اور حضور نبی رحمت ﷺ کے صفات کریمہ کے ساتھ متصف ہو کر آنے کی بشارت دیتی ہیں۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مِنْ بَعْدِ کا قول اختلف کے متعلق ہے اور یہ اور اس کا مابعد کلام معنی میں استثناء سے مقدم ہے۔ یعنی کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اولیٰ یہ ہے کہ اسے فعل محذوف کے متعلق کیا جائے یعنی اِخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ۔ کیونکہ اِلَّا کا ماقبل اس کے مابعد میں عمل نہیں کرتا مگر صرف مستثنیٰ میں اور ایک حرف کے ساتھ متعدد کی استثناء نہیں کی جاتی۔ لہٰذا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ گویا اس طرح کہا گیا ہے مَتٰى اخْتَلَفُوْا؟ (کہ انہوں نے کب اختلاف کیا؟) تو مِنْ بَعْدِ کے ساتھ اس سوال کا جواب دیا گیا۔ اور ان کے اختلاف کا مطلب ان کا یہ قول ہے کہ ہم بعض کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 169 (التجاریہ)

انکار کرتے ہیں اور کتاب کے بعض مقامات پر ان کا کلمات کو تبدیل کرنا ہے اور اس کے ساتھ حضور نبی کریم ﷺ اور قرآن کریم کی صفات کا انکار کرنا ہے۔

ﻓَﻬَﺪَﻯ ﺍﻟﻠّٰﻪُ ﺍﻟَّﺬِﻳْﻦَ ﺍٰﻣَﻨُﻮْﺍ سے مراد امت محمد ﷺ ہے، پس اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی انہیں جو ایمان لائے تھے اس حق کے لئے جس میں انہوں نے اختلاف کیا۔ مِنَ الْحَقِّ یہ مکا بیان ہے۔ "بِاِذْنِهٖ" کا معنی ہے اپنے امر سے یا اپنے ارادے سے یا اپنے لطف و کرم سے۔ ابن زید نے کہا ہے کہ انہوں نے قبلہ کے بارے اختلاف کیا۔ ان میں سے بعض مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور بعض مغرب کی طرف اور بعض بیت المقدس کی طرح رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کعبہ معظمہ کی طرف منہ کرنے کی ہدایت فرمادی۔ انہوں نے روزوں کے بارے اختلاف کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان کی طرف ہماری راہنمائی فرمادی۔ انہوں نے ایام کے بارے اختلاف کیا، عیسائیوں نے اتوار کا دن چنا اور یہودیوں نے ہفتے کا دن منتخب کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہماری راہنمائی جمعۃ المبارک کی طرف فرمائی اور انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے اختلاف کیا۔ یہودیوں نے کہا وہ یہودی تھے اور عیسائیوں نے کہا وہ عیسائی تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بارے ہمارے راہنمائی حق کی طرف فرمائی۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے اختلاف کیا۔ یہود نے انہیں طریۃ (حیرت انگیز اور تعجب خیز شخصیت) قرار دیا اور عیسائیوں نے اللہ بنادیا تو اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں بھی حق کی طرف ہدایت عطا فرمائی۔ اس پر چلنے والا گمراہ نہیں ہوتا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝

"کیا تم خیال کر رہے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ نہیں گزرے تم پر وہ حالات جو گزرے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے ہوئے ہیں پہنچی انہیں تنگی اور مصیبت بھی اور وہ لرزا دئیے گئے یہاں تک کہ کہہ اٹھا (اس زمانہ کا) رسول اور جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ کب آئے گی اللہ کی مدد؟ سن لو یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے"

اَمْ حَسِبْتُمْ یہ ام منقطعہ ہے کیونکہ ام متصلہ کے ساتھ ہمزہ کا آنا لازم ہوتا ہے۔ اور یہ بل اور ہمزہ کے معنی میں ہے۔ پس بل یہود و نصاریٰ کے اختلاف سے اعراض کرنے کے لئے ہے اور ہمزہ مومنین کے گمان کے انکار اور اس کے بعید از حقیقت ہونے کا اظہار کرنے کے لئے ہے اور اس سے مقصود انہیں تکلیف اور شدت کے اوقات میں صبر و ثبات اختیار کرنے پر برانگیختہ کرنا ہے۔ فراء نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے: اَحَسِبْتُمْ اور اس میں میم زائد ہے اور زجاج کے قول کے مطابق بل حَسِبْتُمْ ہے۔ یہ آیت جنگ احزاب کے دن اس وقت نازل ہوئی جب حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سخت آزمائش میں مبتلا ہوئے، شدت خوف، سخت سردی اور طرح طرح کی اذیتوں نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا جب کہ رب کریم نے فرمایا: وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت جنگ احد کے دوران نازل ہوئی اور عطاء نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ان پر حالات انتہائی سخت ہو گئے کیونکہ وہ بغیر مال کے نکلے تھے اور انہوں نے

اپنے گھر اور مال ومتاع مشرکین کے قبضے میں چھوڑ دیئے تھے اور یہاں یہود اپنی عداوت و دشمنی کا اظہار کرنے لگے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ۔ لَمَّا يَاْتِكُمْ میں لَمَّا معنی اور عمل میں لَمْ کی مثل ہے اور اس میں توقع کا معنی ہوتا ہے جو کہ لَمْ میں نہیں ہوتا۔

۲؎ جو انبیاء اور مؤمنین تم سے پہلے گزرے ہیں ان کی مثل حالات تم پر نہیں گزرے۔ تو یہ مثلیت حالات کی شدت اور سختی میں ہے۔ فقر اور مرض کی سختی اور شدت انہیں پہنچی وَزُلْزِلُوْا طرح طرح کی مصیبتوں اور آزمائشوں کے سبب وہ لرز اٹھے۔

۳؎ جب حتّٰی کے بعد فعل مستقبل ہو تو وہ ماضی کے معنی میں ہوتا ہے اس صورت میں اس پر رفع اور نصب دونوں جائز ہوتے ہیں، لہٰذا نافع نے اسے رفع (پیش) کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے نصب (زبر) کے ساتھ۔ انہوں نے جب نصرت اور مدد کو مؤخر سمجھا تو انہیں کہا گیا اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا" جنت آزمائشوں اور بلاؤں سے گھری ہوئی ہے اور دوزخ شہوات سے گھری ہوئی ہے"(1) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، واللّٰہ اعلم۔ ابن منذر نے ابو حیان سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرو بن جموح نے حضور نبی کریم ﷺ سے پوچھا ہم اپنے اموال میں سے کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں؟ اور ابن جریر نے ابن جریج سے نقل کیا ہے کہ مؤمنین نے آپ ﷺ سے پوچھا تو پھر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(2)

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

" آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں آپ فرمایئے جو کچھ خرچ کرو (اپنے) مال سے تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ ہیں اور قریبی رشتہ دار ہیں اور یتیم ہیں اور مسکین ہیں اور مسافر ہیں ۱؎ اور جو نیکی تم کرتے ہو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے ۲؎"

۱؎ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ" اس میں مصارف کا ذکر تو عبارۃً کیا اور مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ کی تعمیم سے اشارۃً سائل کا جواب بیان فرما دیا۔ اس لئے کہ مصرف کا لحاظ رکھنا زیادہ اہم ہوتا ہے کیونکہ نفقے کا شمار اسی کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اور جو نیکی تم کرتے ہو، چاہے صدقہ ہو یا کوئی اور۔ اس میں شرط کا معنی ہے اور جواب شرط فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ اس نیکی کی حقیقت اور تمہاری نیتوں کو جانتا ہے۔ پس وہ تمہاری نیتوں کے مطابق اس کا اجر و ثواب عطا فرماتا ہے۔ اہل تفسیر نے کہا ہے کہ یہ حکم زکوٰۃ کے فرض ہونے سے پہلے تھا، پھر زکوٰۃ کے ساتھ منسوخ ہو گیا۔ لیکن اس میں صحیح بات یہی ہے کہ یہ حکم فرضیت زکوٰۃ کے منافی نہیں کہ اس کے ساتھ یہ منسوخ ہو بلکہ یہ آیت محکم ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

" فرض کیا گیا ہے تم پر جہاد ۱؎ اور وہ ناپسند ہے تمہیں ۲؎ اور ہو سکتا ہے کہ تم ناپسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 378 (قدیمی) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 437 (العلمیہ)

ہوے³ اور ہو سکتا ہے کہ تم پسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہوے⁴ اور (حقیقت حال) اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۝‘‘

1؎ حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جہاد نفل ہے اور آیات کے ذریعے صرف حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو اس کا حکم دیا گیا ہے، دوسروں کو نہیں۔ ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ بھی یہی ہے اور استدلال اس ارشاد باری تعالیٰ سے کیا ہے: فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى۔ دونوں نے کہا ہے کہ اگر بیٹھنے والا فرض کو ترک کرنے والا ہوتا تو اس کے لئے حسنیٰ کا وعدہ نہ ہوتا۔ حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ قیامت قائم ہونے تک تمام مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہے اور ان کی حجت یہ آیت کریمہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا" جو اس حال میں فوت ہو گیا کہ نہ وہ جنگ میں شریک ہوا اور نہ ہی اس کے نفس میں جنگ میں شریک ہونے کی خواہش پیدا ہوئی تو وہ شعبۂ نفاق پر فوت ہوا" یہ روایت مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے (1) اور جمہور کا موقف یہ ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے جب بعض افراد یہ فریضہ ادا کریں تو باقی افراد سے یہ ساقط ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ نماز جنازہ، اسی نظریہ پر اجماع منعقد ہوا ہے۔

تمام ائمہ کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہر شہر کے باسیوں پر واجب ہے کہ وہ ان کفار سے قتال کریں جو ان کے ساتھ ملتے ہیں اور اگر وہ ان کے ساتھ جنگ کرنے سے عاجز ہوں یا بزدل ہوں تو پھر جہاد ان پر واجب ہے جو ان کے زیادہ قریب متصل واقع ہوں اور پھر جو ان کے بعد زیادہ قریبی ہوں اور اگر کفار اسلامی شہروں پر حملہ آور ہوں اور امام وقت کی طرف سے عام اعلان جہاد ہو تو پھر شہریوں پر جہاد واجب یعنی فرض عین ہو جاتا ہے اور ایسا آدمی جو جہاد کے لئے متعین نہ ہو وہ اپنے والدین کی اجازت کے بغیر نہ نکلے، بشرطیکہ وہ مسلمان ہوں اور جس آدمی پر قرض ہو وہ اپنے غریم (قرض خواہ) کی اجازت کے بغیر جہاد کے لئے نہ نکلے۔ جمہور کے موقف کی دلیل وہی ادلہ ہیں جو اوپر فریقین کے نظریہ میں ہم نے ذکر کر دی ہیں اور ان کے ساتھ یہ ارشاد گرامی بھی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ۔ ان شاء اللہ العزیز اس کی وضاحت سورۂ توبہ میں آئے گی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور جہاد کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ان کی خدمت میں رہ کر جہاد کرتے رہو، جاؤ اور ان سے حسن سلوک کرو (2) متفق علیہ۔ علاوہ ازیں ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی اسی طرح اسے نقل کیا ہے۔

2؎ یعنی تم پر وہ شاق گزرے۔ علماء علم المعانی نے کہا ہے کہ یہاں کُرْهٌ سے مراد طبیعت کا اس سے نفرت کرنا ہے۔ جس میں مال اور نفس کی مشقت ہو۔ یہ مراد نہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو ناپسند کیا ہے۔

3؎ ان میں سے ایک جہاد ہے کیونکہ اس میں کامیابی بھی ہے اور مال غنیمت بھی۔ اور اس کے ذریعے دنیا میں غلبہ بھی ہے اور شہادت اور ثواب بھی۔

4؎ جیسا کہ جہاد سے پیچھے رہ جانا وغیرہ۔ بیشک اس میں معصیت اور ذلت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اجر اور مال غنیمت سے محرومی بھی ہے۔ یہاں لفظ عسیٰ ذکر کیا گیا ہے اور یہ شک کا معنی دیتا ہے کیونکہ نفس جب راضی ہو جاتا ہے تو پھر اس کی خواہش امر شرعی کے تابع

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 141 (قدیمی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 883 (وزارت تعلیم)

ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ اس شی کو ناپسند کرتا ہے جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرے اور اس کو پسند کرتا ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند فرمائے۔

۵ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے خیر اور شر دونوں کو جانتا ہے۔ اس لئے تم ایسے امور بجالانے میں جلدی کرو جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے۔ یہاں تک کہ تم ایسے امور کے ذریعے دارین میں کامیاب ہو جاؤ جو تمہارے لئے پسندیدہ ہیں۔

فصل:۔ جہاد کی فضیلت کے بارے میں متعدد احادیث مذکور ہیں۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ کونسا عمل افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنے وقت پر نماز ادا کرنا۔ میں نے عرض کی پھر کونسا عمل افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا والدین سے حسن سلوک سے پیش آنا، میں نے عرض کی پھر کونسا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا۔ راوی کا قول ہے کہ اگر اس کے بعد میں مزید آپ ﷺ سے پوچھتا تو آپ ﷺ یقیناً مزید ارشاد فرماتے(1) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا "کونسا عمل افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ ایمان لانا۔ پھر پوچھا گیا اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا۔ پھر کہا گیا اس کے بعد کونسا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا حج مبرور"۔(2) متفق علیہ۔ یہ دونوں حدیثیں اگرچہ ظاہر صورت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے معارض ہیں کیونکہ پہلی حدیث جہاد سے نماز کے افضل ہونے پر دلالت کرتی ہے اور دوسری حدیث اس کے برعکس معنی پر لیکن ان دونوں کے درمیان تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو اس کیفیت پر محمول کیا گیا ہے جو سائل کی حالت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ یا پھر اس طرح کہا جائے گا کہ نماز اور زکوٰۃ دونوں فرض ہیں اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں لفظ ایمان سے مراد یہی ہیں۔ تو اس طرح دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تعارض باقی نہیں رہے گا۔ یا پھر یہ تاویل کی جائے گی کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ایمان کے بعد جہاد کو رکھنا نماز اور زکوٰۃ کے بعد جہاد کا رتبہ ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" اللہ تعالیٰ کے نزدیک جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آدمی کا لشکر کی صف میں کھڑا ہونا ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے"(3) اسے حاکم نے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ بخاری کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ" تم میں سے کسی کا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کے لئے نکلنا اپنے گھر میں ستر سال کی نمازیں ادا کرنے سے افضل ہے"(4) یہ حدیث امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عرض کی گئی یارسول اللہ ﷺ! کونسا عمل جہاد فی سبیل اللہ کے مساوی ہو سکتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ بعد ازاں انہوں نے یہی سوال دو یا تین مرتبہ آپ ﷺ پر لوٹایا۔ آپ ﷺ نے ہر بار یہی جواب ارشاد فرمایا کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا" اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والا اس آدمی کی طرح ہے جو کامل خشوع و خضوع کے ساتھ آیات الٰہی کو قائم کرتا ہے اور اپنی نمازوں اور روزوں میں قطعاً کمزوری یا سستی ظاہر نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ جہاد سے واپس لوٹ آئے"(5) متفق علیہ۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک جنگ کے لئے نکلے تو ایک آدمی ایک غار کے پاس سے گزرا جس میں تھوڑا سا پانی موجود تھا۔ اس نے اپنے دل میں یہ بات کی کہ وہ اس میں مقیم ہو

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 390 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 206 (ودت) 3۔ مستدرک حاکم، جلد 2 صفحہ 68 (العصر)
4۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 199 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 134 (قدیمی)

جائے اور دنیا سے علیحدگی اختیار کرلے۔ چنانچہ اس نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی اجازت طلب کی تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا" بیشک میں نہ یہودیت کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں اور نہ نصرانیت کے ساتھ، بلکہ میں تو خالص دین اسلام (دین ابراہیمی) کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے ایک صبح یا شام کے وقت اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کے لئے نکلنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اور تم میں سے کسی کا لشکر کی صفوں میں ٹھہرنا ساٹھ سال کی نمازوں سے افضل ہے" (1) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مذکورہ بالا تمام احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ جہاد، نماز، روزے اور نوافل سے افضل ہے۔ اس لئے کہ جہاد فرض کفایہ ہے اور جب بھی کوئی اسے ادا کرے تو اس کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ تمام اوقات کو مستوعب ہوتا ہے اور یہ اس شہادت تک پہنچا دینے والا ہے جو نبوت کی قرین (قریبی) ہے، جبکہ اس کے برعکس نماز اور روزہ فرائض کے علاوہ تو نوافل ہی واقع ہوتے ہیں اور نفل فرض کے مساوی نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ذکر الہٰی میں سے آدمی کا کوئی ایسا عمل نہیں جو اسے عذاب الٰہی سے نجات دلائے۔ تو صحابہ نے عرض کی: کیا جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں مگر جبکہ وہ تلوار سے اتنا لڑے کہ تلوار ٹوٹ جائے۔ آپ ﷺ نے یہ قول تین مرتبہ ارشاد فرمایا (2) یہ روایت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے امام احمد، طبرانی اور ابن ابی شیبہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کی ہے۔ یہ حدیث مذکورہ بالا حضرت عمران، حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہم کی احادیث سے معارض ہے۔ ان کے درمیان وجہ تطبیق کیا ہے؟ تو اس کے بارے ہمارا قول یہ ہے کہ اس حدیث میں ذکر سے مراد وہ دائمی حضور ہے جس میں معمولی سی بھی غفلت اور سستی نہ ہو۔ اس سے مراد وہ نماز اور روزہ نہیں جو کہ زاہدوں کا حصہ ہوتے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد گرامی میں جہاد اکبر سے مراد یہی ہے جو کہ آپ ﷺ نے ایک غزوہ سے لوٹتے وقت فرمایا تھا" رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ " (کہ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں)۔ تو اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کیا رسول اللہ ﷺ جب جہاد اصغر میں مصروف ہوتے تھے تو آپ ﷺ جہاد اکبر میں مشغول نہیں ہوتے تھے؟ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ جہاد اکبر میں مشغول ہوتے تھے لیکن زیادہ اہتمام کے سبب حالات مختلف ہو جاتے ہیں، واللہ اعلم۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ "جنت میں سو درجات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے میں جہاد کرنے والوں کے لئے تیار کئے ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان زمین و آسمان کی مثل بعد اور دوری موجود ہے۔ لہٰذا جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو جنت الفردوس مانگو کیونکہ یہی اوسط الجنۃ اور اعلی الجنۃ ہے۔ اس سے اوپر عرش الرحمٰن ہے اور اس سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں" (3) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " ہلاک ہوجائے وہ جو درہم و دینار کا بندہ ہے اور جو پیٹ اور لباس کا بندہ ہے کہ اگر اسے دیا جائے تو وہ راضی ہوتا ہے اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتا ہے۔ قابل ستائش ہے وہ آدمی جس نے جہاد کے لئے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑی، اس حال میں کہ اس کے بال پراگندہ ہیں اور قدم غبار آلود ہیں۔ اگر اسے حراسہ میں رکھا جائے تو وہ حراسہ میں ہو جاتا ہے اور اگر اسے ساقہ میں رکھا جائے تو وہ ساقہ میں ہوتا ہے۔ اگر وہ اجازت طلب کرے تو اسے اجازت نہیں دی جاتی اور اگر وہ سفارش کرے تو اسے قبول نہیں کیا

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 446 (العلمیہ)
2۔ معجم کبیر از طبرانی، جلد 20 صفحہ 167 (العلوم والحکم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 398 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 404 (وزارت تعلیم)

جاتا" (4) اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ رباط کے فضائل عنقریب سورۂ آل عمران کے آخر میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

بیشک جہاد تمام نیکیوں سے افضل ہے اور یہ دین اسلام کی کوہان ہے۔ اس لئے کہ یہ اسلام کی اشاعت کا سبب ہے اور یہ مخلوق کے لئے باعث ہدایت ہے۔ پس جس نے بھی اس کی محنت اور جہد کے بدلے ہدایت حاصل کی۔ اس کی نیکیاں اس کی نیکیوں میں داخل ہو جائیں گی اور اس سے افضل ظاہری اور باطنی علوم کی تعلیم ہے کیونکہ اس میں فی الحقیقت اسلام کی اشاعت ہے، واللہ اعلم۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَھْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

"وہ پوچھتے ہیں آپ سے کہ ماہ حرام میں جنگ کرنے کا حکم کیا ہے [1] اور آپ فرمایئے کہ لڑائی کرنا اس میں بڑا گناہ ہے [2] لیکن روک دینا اللہ کی راہ سے اور کفر کرنا اس کے ساتھ اور (روک دینا) مسجد حرام سے اور نکال دینا اس میں بسنے والوں کو اس سے، اس سے بھی بڑے گناہ ہیں اللہ کے نزدیک اور فتنہ (وفساد) قتل سے بھی بڑا گناہ ہے [3] اور ہمیشہ لڑتے رہیں گے تم سے یہاں تک کہ پھیر دیں تمہیں تمہارے دین سے اگر بن پڑے [4] اور جو پھرے تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جائے حالت کفر پر تو یہی وہ (بدنصیب) ہیں کہ ضائع ہو گئے ان کے عمل دنیا وآخرت میں اور یہی دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں [5]"

[1] اس میں قِتَالٍ فِيْهِ بدل اشتمال ہے یعنی يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ قِتَالٍ فِي الشَّهْرِ "ابن جریر، ابن ابی حاتم، طبرانی نے کبیر میں، ابن سعد اور بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے پھوپھی زاد حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو جمادی الاخریٰ 2ھ میں غزوہ بدر سے دو ماہ پہلے روانہ کیا، اور ان کے ساتھ مہاجرین میں سے آٹھ افراد بھی روانہ کیے۔ یعنی حضرت سعد بن ابی وقاص زہری، حضرت عکاشہ بن محصن اسدی، حضرت عتبہ بن غزوان سلمی، ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ، سہیل بن بیضاء، عامر بن ربیعہ، واقد بن عبداللہ اور خالد بن بکیر رضی اللہ عنہم۔ بعض نے سہل بن بیضاء کا ذکر کیا ہے اور سہیل، خالد اور عکاشہ کا ذکر نہیں کیا اور بعض نے حضرت مقداد بن عمر کا ذکر کیا ہے۔ ابن سعد نے کہا ہے کہ وہ بارہ افراد تھے اور ان میں سے ہر دو آدمی ایک دوسرے کے پیچھے ایک اونٹ پر سوار تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے امیر حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھ کر دیا اور فرمایا اللہ کا نام لیکر چلو، اور دو دن کا سفر طے کرنے سے پہلے اس خط کو نہ دیکھنا۔ جب دو دن سفر کرنے کے بعد کسی جگہ پر اترو تو اس خط کو کھول کر اپنے ساتھیوں کو پڑھ کر سنانا، پھر وہ کچھ کرنا جس کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے اور اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کرنا۔ چنانچہ وہ چل پڑے اور چلنے سے قبل عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کس طرف؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نجد کی طرف۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ دو دن تک چلتے رہے، پھر اترے اور خط کھولا تو اس میں یہ لکھا ہوا تھا۔ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ

الرَّحِیْمِ اَمَّا بَعْدُ فَسِرْ عَلٰی بَرَکَةِ اللّٰهِ بِمَنْ تَبِعَکَ مِنْ اَصْحَابِکَ حَتّٰی تَنْزِلَ بَطْنَ نَخْلَةٍ فَتَرَصَّدْبِهَا عِیْرَ قُرَیْشٍ لَعَلَّکَ اَنْ تَاْتِیَنَا مِنْهُ بِخَیْرٍ" (کہ اللہ تعالیٰ کی برکت کے ساتھ اپنے ساتھیوں میں سے ان کے ساتھ چلو جو تمہاری اتباع کریں یہاں تک کہ تم وادی نخلہ میں اترو۔ پس وہاں قریش کے ایک قافلے کی تاک میں رہو۔ یقیناً تم اس کے سبب ہمارے لئے بہتری اور نفع لاؤ گے) جب آپ رضی اللہ عنہ نے خط دیکھا تو کہا "سَمْعاً وَّطَاعَةً" (کہ ہم نے سنا اور حکم کی اطاعت کی)۔ پھر آپ نے اپنے ساتھیوں سے اس کے بارے کہا اور فرمایا کہ آپ ﷺ نے مجھے اس سے منع کیا ہے کہ میں تم میں سے کسی کو مجبور کروں۔ لہذا جو تم میں سے شہادت کا ارادہ رکھتا ہے وہ ساتھ چلے اور جو اسے ناپسند کرتا ہے وہ واپس لوٹ جائے۔ پھر آپ چلے اور آپ کے ساتھی بھی آپ کے ساتھ چلے اور کوئی بھی ان میں سے پیچھے نہ رہا۔ یہاں تک کہ وہ فرع سے اوپر مقام معدن تک پہنچ گئے۔ یہ حجاز کے علاقے میں ایک جگہ ہے۔ اسے نجران کہا جاتا ہے۔ یہاں سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان نے اپنا وہ اونٹ گم کر دیا جس پر وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ اس کی تلاش میں پیچھے رہ گئے اور آپ اپنے بقیہ ساتھیوں کے ساتھ آگے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان وادی نخلہ میں جا اترے۔ ابھی وہ دوران وہاں سے قریش کا قافلہ گزرا جس کے پاس کشمش، چمڑا اور طائف کی تجارت کا سامان تجارت تھا۔ اس قافلے میں عمرو الحضرمی، حکم بن کیسان جو ہشام بن مغیرہ کا غلام تھا، عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور اس کا بھائی نوفل بن عبداللہ مخزومی شامل تھے۔ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ لوگ تمہارے سبب رک گئے۔ اس لئے تم اپنے میں سے ایک آدمی کا سر مونڈ دو تا کہ وہ ان کے سامنے جائے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کا سر مونڈ دیا پھر وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے کہا یہ قوم عمار ہے تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ لہذا وہ ان سے مطمئن ہو گئے۔ یہ وہ دن تھا جسے وہ جمادی الثانی کا آخری دن گمان کر رہے تھے، حالانکہ فی الحقیقت وہ رجب کا پہلا دن تھا۔ تو انہوں نے آپس میں مشاورت کی کہ اگر تم نے انہیں آج کی رات چھوڑ دیا تو پھر وہ حرم میں داخل ہو جائیں گے اور وہ تم سے محفوظ ہو جائیں گے اور ساتھ ہی تم پر شہر حرام بھی داخل ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت واقد بن عبداللہ سہمی نے ایک تیر عمرو الحضرمی کو مارا اور اسے قتل کر دیا۔ مسلمان ان پر ٹوٹ پڑے اور عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور حکم بن کیسان کو قیدی بنالیا، جبکہ نوفل بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ مسلمانوں نے اونٹوں اور دونوں قیدیوں کو چلایا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ یہ قول بھی ہے کہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے مال غنیمت میں سے رسول اللہ ﷺ کے لئے خمس (پانچواں حصہ) علیحدہ کیا اور بقیہ سامان اپنے ساتھیوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ یہی وہ پہلا خمس تھا جو اسلام میں نکالا گیا اور یہی پہلا مال غنیمت تھا۔ مشرکین میں سے سب سے پہلے قتل ہونے والا عمرو الحضرمی تھا اور ان میں سے سب سے اول قید ہونے والے عثمان اور حکم تھے۔ یہ واقعہ مال غنیمت میں سے خمس فرض ہونے سے پہلے کا تھا۔ پھر اسی طرح خمس فرض ہو گیا جیسے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اس مال سے نکالا تھا۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے تمہیں حرام مہینے میں قتال کا حکم نہیں دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے سامان اور دونوں قیدی ویسے ہی رہنے دیئے اور ان میں سے کوئی چیز بھی لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر قریش نے مکہ مکرمہ میں رہنے والے مسلمانوں کو کہا اے صابیوں کے گروہ! تم نے ماہ حرام کو حلال بنا دیا ہے اور اس میں قتال کیا ہے۔ یہ بات اس سریہ میں شریک افراد پر انتہائی گراں گزری اور انہیں گمان ہونے لگا کہ بیشک وہ ہلاک ہو گئے اور ان کے قبضے میں جو کچھ ہے وہ ساقط ہو گیا ہے۔ تو

انہوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! جب ہم ابن حضرمی کو قتل کر چکے۔ پھر جب شام ہوئی تو ہم نے رجب کا چاند دیکھا۔ لہٰذا ہم نہیں جانتے تھے کہ آیا ہم نے اسے رجب میں قتل کیا ہے یا جمادی الثانی میں۔ پس اکثر لوگوں کا خیال یہی ہے کہ اسی بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے وہ خمس لے لیا جو عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے علیحدہ کیا تھا۔ یا پھر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مال غنیمت حاصل کیا اور اس میں سے خمس نکال کر دیگر اصحاب سریہ میں تقسیم کر دیا اور یہ قول بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اہل نخلہ کا مال غنیمت روک دیا۔ یہاں تک کہ جب آپ غزوہ بدر سے واپس تشریف لائے تو اہل بدر کے غنائم کے ساتھ ملا کر اسے تقسیم فرمایا اور اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو آپ ﷺ نے فرمایا ہم انہیں سعد اور عتبہ کے آنے تک روکے رکھیں گے کیونکہ ان دونوں کے بارے ہمیں تم سے خطرہ ہے۔ اگر چہ ان دونوں کے بدلے ہمارا انہیں قتل کرنا فدیہ نہیں بن سکتا۔ پس اتنے میں حضرت سعد اور عتبہ رضی اللہ عنہما آ گئے تو پھر رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں قیدیوں سے ہر قیدی کے بدلے چالیس اوقیہ چاندی وصول فرمائی۔ پھر ان میں سے حکم تو مسلمان ہو گیا اور مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی رہنے لگا اور پھر غزوہ بئر معونہ میں شہید ہو گیا۔ جبکہ عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ مکہ واپس لوٹ گیا اور وہاں حالت کفر پر ہی مر گیا اور نوفل نے غزوۂ احزاب کے دن خندق کو عبور کرنے کے لئے اپنے گھوڑے کو ایڑی لگائی تو وہ گھوڑے سمیت خندق میں گر گیا اور دونوں کے اعضا ٹوٹ گئے اور اللہ تعالیٰ نے اسے مار ڈالا تو مشرکین نے اس کے مردہ جسم کو ثمن کے عوض طلب کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے اٹھا لو بیشک یہ خبیث مردار اور خبیث دیت ہے۔(1)

اے محمد ﷺ آپ فرما دیجئے اشہر حرام میں جنگ کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اکثر علماء نے کہا ہے کہ یہ آیت اس ارشاد باری تعالیٰ سے منسوخ ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی تم پاؤ انہیں۔) ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ حکم لفظ حیث کو مجازاً زمان کے معنی میں استعمال کرنے کی بناء پر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لفظ اس معنی میں کثیر استعمال ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ لفظ حیث مکان کے معنی کے لئے حقیقت ہے اور زمان کے لئے اس کے مجازاً استعمال ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اگر ہم فرض کر لیں کہ یہ لفظ زمان و مکان کے معنی میں مشترک ہے تو پھر اس کے تمام زمانوں کو شامل ہونے میں شک ہے اور شک کے ساتھ نسخ جائز نہیں ہوگا۔ اور قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس میں خاص حکم کو عام کے ساتھ منسوخ کیا گیا ہے اور اس میں اختلاف ہے(2) یعنی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حکم خاص کا نسخ عام حکم کے ساتھ جائز ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ خاص کی طرح عام حکم کی دلالت بھی اپنے افراد کے لئے قطعی ہوتی ہے۔ جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے نزدیک یہ نسخ جائز نہیں ہوتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ خاص کے برعکس عام کی دلالت اپنے افراد پر ظنی ہوتی ہے، اس لئے کہ ہر عام سے بعض افراد کو مخصوص کیا جا سکتا ہے۔ "مَامِنْ عَامٍ اِلَّا وَقَدْ خُصَّ مِنْهُ الْبَعْضُ" اس کے بارے تفصیلی بحث اصول فقہ کی کتب میں ہے۔ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اولیٰ یہ ہے کہ مطلقاً اشہر حرام میں قتال کے حرام ہونے پر آیت کی دلالت ممنوع ہے کیونکہ اس میں قتال نکرہ مثبت کے محل میں ہے لہٰذا یہ عام نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ قرینہ قائم ہونے کے وقت نکرہ محل اثبات میں بھی عام ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد گرامی میں ہے "تَمْرَةٌ خَيْرٌ مِنْ جَرَادَةٍ"(3) اگر یہاں نکرہ عمومیت کے لئے نہ ہو تو پھر اس کے لئے سوال کا جواب بننا صحیح نہیں۔ ابن ہمام نے عمومات کے سبب حرمت کے نسخ پر اس طرح استدلال کیا ہے۔ مثلاً قول باری تعالیٰ ہے: وَقَاتِلُوا

1۔ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 172-173 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 2 صفحہ 513 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
3۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 416 (التراث العربی)

الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے۔ "اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" (1) میں کہتا ہوں یہ استدلال مضبوط نہیں ہے کیونکہ ان آیات میں عمومیت مکلفین اور ان کے احوال کے اعتبار سے ہے، زمانوں کے اعتبار سے نہیں۔ کہ ان میں اشہر حرام بھی داخل ہو جائیں اور نسخ ان کے ساتھ ملحق ہو جائے بلکہ اگر زمانوں کی عمومیت ثابت ہوگی تو وہ اقتضاء النص سے ثابت ہوگی اور مقتضی میں عمومیت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس میں تخصیص اور نسخ جاری ہو سکتے ہیں اور وہ کس طرح اشہر حرام میں قتال کی حرمت کے نسخ کا دعویٰ کر سکتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڏ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ، یعنی تم ان میں قتال کر کے اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرو۔ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا النَّسِيْۗءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِــــُٔــوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۭ، یعنی شہر حرام میں اللہ تعالیٰ نے قتال کو حرام قرار دیا ہے وہ اسے حلال بنا لیتے ہیں۔ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْۗءُ اَعْمَالِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۔ آیات قتال میں سے سب سے آخر نازل ہونے والی آیت یہی ہے اور یہ آیت سیف 8ھ کے آخر میں نازل ہوئی۔ اس میں حرام مہینوں کا ذکر ہے۔ لہٰذا یہ آیت حرام مہینوں کے علاوہ دیگر مہینوں میں حکم قتال کے وجوب کے لئے مخصص ہے۔ واللہ اعلم۔

اس کے ساتھ ساتھ حضور نبی کریم ﷺ کا خطبۂ حجۃ الوداع بھی اشہر حرام میں قتال کے حرام ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے یہ خطبہ اپنے وصال سے دو ماہ قبل دسویں ذی الحجہ کو ارشاد فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے اس میں فرمایا خبردار! زمانہ اپنی اسی حالت کی طرح گھوم رہا ہے جیسا اس دن تھا جس دن سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا، سال میں بارہ ماہ ہیں۔ ان میں سے چار اشہر حرام ہیں۔ ان میں سے تین مسلسل ہیں ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور ایک مضر کا رجب ہے (2) اور حدیث کے آخر میں ارشاد فرمایا بیشک تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہارے اسباب تم پر حرام ہیں جیسا کہ تمہارے اس مہینے میں اور تمہارے اس شہر میں تمہارا یہ دن حرمت والا ہے۔ یہ روایت متفق علیہ ہے اور ابوبکرہ سے مروی ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ذوالحجہ کے آخری دس دنوں سے لے کر محرم کے آخر یا ایک مہینے تک طائف کا محاصرہ کیا ہے۔ یعنی آپ ﷺ کا یہ عمل آیت کے حکم کے لئے ناسخ ہے۔ لیکن یہ قول غریب ہے کیونکہ آپ ﷺ نے طائف کا محاصرہ شوال 8ھ میں کیا۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ فتح مکہ کے سال مدینہ طیبہ سے اس وقت نکلے کہ ابھی رمضان المبارک کی دو راتیں گزری تھیں۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ زہری سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کو فتح فرمالیا، ابھی تک رمضان المبارک کے تیرہ دن ہی گزرے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ مذکورہ روایت سے یہ ظاہر ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے بارہ دن راستے میں قیام کیا اور انیس دن آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں قیام فرمایا اور ایک روایت کے مطابق سترہ دن۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور ایک روایت میں بارہ دن کا ذکر ہے، پھر شوال کے چھ دن گزر چکے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد ہفتے کے دن حنین کی طرف خروج فرمایا۔ ابن اسحاق نے پانچ دن گزرنے کا قول کیا ہے۔ عروہ نے بھی یہی کہا ہے اور ابن جریر نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ دس شوال کو حنین پہنچے۔ جب بنی ہوازن پسپا ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے حنین کے مال غنیمت کو

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 37 (قدیمی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 632 (وزارت تعلیم)

فتح فرمایا اور بنی ثقیف نے طائف کے قلعہ میں داخل ہو کر اس کے دروازے بند کر لئے اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ پس رسول اللہ ﷺ مکہ کی طرف واپس نہ لوٹے اور نہ ہی حنین کا مال غنیمت تقسیم کرنے سے پہلے غزوہ طائف کے علاوہ کسی شئی کی طرف تجاوز کیا۔ آپ ﷺ نے مقام جعرانہ پر قیدیوں کو چھوڑا اور طائف کا محاصرہ کر لیا۔ مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ کے اس محاصرے کی مدت چالیس راتیں ہیں اور صاحب ہدایہ نے اسے غریب قرار دیا ہے۔ ابن اسحاق نے تیس راتیں ذکر کی ہیں۔ ابن اسحاق نے ایک روایت میں کہا ہے کہ آپ ﷺ نے بیس سے زائد راتیں ان کا محاصرہ جاری رکھا۔ بیس راتوں کا قول بھی کیا گیا ہے اور یہ قول بھی ہے کہ محاصرے کی مدت دس سے کچھ زائد راتیں ہیں۔ اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ ابن حزم نے کہا ہے کہ بلاشک وشبہ یہی قول صحیح ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کی طرف کوچ فرمایا اور ذوالقعدہ کی پانچ راتیں گزرنے کے بعد جمعرات کی رات آپ ﷺ نے مقام جعرانہ پر قیام فرمایا۔ آپ ﷺ نے تیرہ راتیں اس مقام پر قیام کیا اور اس دوران عمرہ بھی کیا۔ پھر بدھ کی رات آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف اپنے سفر کا آغاز کیا اس حال میں کہ ذوالقعدہ کی بارہ راتیں ابھی باقی تھیں اور ابھی ذوالقعدہ کے تین دن باقی تھے کہ آپ ﷺ جمعہ کے دن مدینہ منورہ میں قدم رنجہ فرما ہوئے۔ ابو عمر نے کہا ہے کہ مدینہ طیبہ سے آپ ﷺ کے غائب رہنے کی کل مدت دو ماہ سولہ دن بلکہ دو ماہ اور چھبیس دن ہے۔ اس دوران آپ ﷺ نے مکہ کو فتح فرمایا، بنی ہوازن کا واقعہ ہوا اور اہل طائف سے جنگ کی۔ یہاں تک کہ پھر مدینہ طیبہ واپس آ گئے۔ لہٰذا جو کچھ ابن ہمام نے کہا ہے اس کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے کہ طائف کا محاصرہ ذوالحج کے آخری دس دنوں سے لیکر محرم کے آخر تک جاری رہا۔ نتیجۃً اس سے اشھر حرام کی حرمت کی منسوخیت ثابت نہیں ہوئی، واللہ اعلم۔ البتہ یہ آیت اس ارشاد باری تعالیٰ سے منسوخ ہے: اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ (حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کا بدلہ ہے اور ساری حرمتوں میں (فریقین کے رویہ میں) برابری چاہئے تو جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کر لو (لیکن) اسی قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو۔) یہ آیت طیبہ اشھر حرام میں قتال کے مباح ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اگر ان میں قتال کی ابتداء کفار کی طرف سے ہو کیونکہ یہ آیت غزوۂ بدر سے پہلے نازل ہوئی اور وہ آیت 7ھ میں عمرہ قضا کے وقت جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ لہٰذا یہ حکم باقی رہا کہ اشھر حرام میں جنگ کا آغاز کرنا حرام ہے و اللہ اعلم۔

؎ یعنی لیکن اسلام سے اور اطاعت سے روک دینا اور پھیر دینا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا" وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" میں مضاف محذوف ہے یعنی مسجد حرام سے روک دینا وَصَدُّ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اس کا ضمیر مجرور پر عطف کرنا جائز نہیں، کیونکہ عطف کی صورت میں حرف جار کا اعادہ واجب ہوتا ہے اور اس میں سبیل اللہ پر عطف کرنا بھی جائز نہیں، کیونکہ و کُفْرٌ بِہٖ کا قول اس کے مانع ہے۔ اس لئے کہ صلہ پر عطف کرنے سے پہلے موصول پر عطف کرنے کو مقدم نہیں کیا جا سکتا۔ (یعنی اس میں صَدٌّ مصدر مرفوع ہے اور اس کی جگہ اَن فعل کے ساتھ مقدر ہے۔ یہ اَن موصولہ ہے اور سبیل اللہ محل صلہ میں ہے جب و المسجد الحرام کو سبیل اللہ پر معطوف کیا جائے تو وہ بھی صلہ ہی بنے گا کیونکہ صلہ کا معطوف صلہ کے حکم میں ہوتا ہے۔ لہٰذا اس طرح ان دونوں کے درمیان ایک اجنبی جملہ و کفر بہ سے فاصلہ واقع ہو جاتا ہے اور یہ جائز نہیں۔ اجنبی سے مراد یہ ہے کہ اس کا صلہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ (شیخ زادہ ج 1 ص 542)۔ اور اہل مسجد کو نکال دینا اور ان سے مراد حضور نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ اللہ

تعالیٰ کے نزدیک اس سے بڑا گناہ ہے جو کچھ اس دستے نے کیا کیونکہ جو بھی کفار مکہ سے صادر ہوا ہے وہ ان سے ارادۃً اور تکلیف پہنچانے کے لئے صادر ہوا ہے اور جو کچھ اس دستے سے صادر ہوا ہے وہ خطأً اور ظن کی بناء پر صادر ہوا ہے اور شرک حضری کے قتل سے بڑھ کر گناہ ہے۔ پس کفار مکہ انہیں ایسے فعل پر کیسے عار دلا سکتے ہیں جس کا ارتکاب انہوں نے خطأً کیا حالانکہ انہوں نے بذات خود اس سے بھی شدید تر فعل کا ارتکاب قصداً اور ارادۃً کیا ہے۔

ٖ یعنی کفار قریش ہمیشہ لڑتے رہیں گے حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ میں ان کی ہمیشہ عداوت رکھنے کی خبر ہے اور اِنِ اسْتَطَاعُوْا میں ان کی استطاعت کو بعید سمجھنے کی طرف اشارہ ہے۔

ؔ اس آیت طیبہ سے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ مرتد جب تک حالت کفر پر مر نہ جائے اس کے اعمال ضائع نہیں ہوتے۔ مثلاً جب کسی آدمی نے ظہر کی نماز پڑھی پھر مرتد ہو گیا (نعوذ باللہ من ذالک) پھر ایمان لے آیا درآنحالیکہ ابھی وقت باقی تھا تو اس پر اس نماز کا اعادہ واجب نہیں ہوگا۔ اسی طرح ایک آدمی نے حج کیا پھر مرتد ہو گیا۔ پھر وہ دوبارہ مسلمان ہو گیا تو اس پر نیا حج واجب نہیں ہوگا۔ یہ استدلال صفت کے مفہوم سے کیا گیا ہے اور یہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک معتبر نہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر مرتد اسلام لے آئے اور ابھی اس کی سابقہ نماز کا وقت باقی ہو تو اس پر نماز کا اعادہ واجب ہے۔ اسی طرح ایسے آدمی پر نئے سرے سے حج کرنا بھی واجب ہوگا۔ ہماری دلیل رب کریم کا یہ ارشاد پاک ہے۔ "وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ" یہ آیت مطلق ہے اور ہمارے نزدیک مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جا سکتا، واللہ اعلم۔ نتیجۂ دنیا میں اس کے اسلام کی بناء پر جان اور مال کے محفوظ ہونے کے احکام مرتب نہیں ہوں گے اس کا قتل حلال ہو جائے گا اور تین دن تک اسے مہلت دینا بھی واجب نہیں رہے گا البتہ مستحب ہوگا۔ یہی قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کے خلاف حجت ہے کہ ایسے آدمی کو مہلت دینا واجب ہے اور آخرت میں ثواب ختم ہو جانے کے سبب ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔ اور تمام کفار کی طرح دوزخی ہیں ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

"بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں لہ (تو) یہی لوگ امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی، اور اللہ بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے ٢ے"

لہ پھر اصحاب سریہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہمیں ہماری اس کوشش پر اجر دیا جائے گا اور کیا ہمارا یہ سفر جہاد شمار ہوگا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ ہجرت اور جہاد کی عظمت کے اظہار کے لئے اسم موصول مکرر ذکر کیا گیا ہے۔ گویا کہ رجاء (امید) کے متحقق ہونے میں یہ دونوں چیزیں مستقل ہیں۔

ٖ یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتے ہیں اور یہی ان کے لئے امیدوں کو پختہ کرتا ہے اور یہ شعور دلاتا ہے کہ بیشک عمل کوئی چیز بھی ثابت کرنے والا نہیں اور نہ ہی قاطع فی الدلالۃ ہے بلکہ اس میں خاتمے کا اعتبار ہوگا۔ جو کچھ انہوں نے خطأً کیا اللہ تعالیٰ اسے بخشنے والا ہے اور ثواب عطا فرما کر بہت رحم فرمانے والا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْـمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

"وہ پوچھتے ہیں آپ سے شراب لے اور جوئے کی بابت ۲ آپ فرمایئے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے ۳ اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لئے اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے ۴ اور پوچھتے ہیں آپ سے کیا خرچ کریں فرمایئے جو ضرورت سے زیادہ ہو ۵ اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے حکموں کو ۶ تاکہ تم غور وفکر کرو ۷"

۱۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو اس وقت لوگ شراب پیتے تھے اور جوا کھیلتے تھے۔ تو پھر انہوں نے آپ ﷺ سے ان کے بارے پوچھا تو رب کریم نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ترجمہ: (وہ پوچھتے ہیں آپ سے شراب اور جوئے کی بابت۔) تو لوگوں نے کہا یہ ہم پر حرام نہیں ہوا۔ البتہ یہ کہا یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ لہٰذا وہ شراب پیتے رہے، حتیٰ کہ ایک دن مغرب کی نماز میں مہاجرین میں سے ایک آدمی نے اپنے ساتھیوں کی امامت کرائی تو انہوں نے قرأت میں فحش غلطی کردی اور آیات قرآنیہ میں اختلاط کا ارتکاب کیا تو پھر رب کریم نے یہ ارشاد گرامی نازل فرمایا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى الایہ۔ (اے ایمان والو! تم نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ) پھر اس سے بھی زیادہ سخت حکم نازل ہوا جو سورۂ مائدہ میں موجود ہے یعنی "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے لیکر فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ تک" تو اس میں ان سے کہا گیا کہ کیا اب بھی تم باز نہیں آؤ گے تو پھر اس کے جواب میں انہوں نے کہا اے ہمارے رب ہم اس سے رک گئے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کا کلی حکم چار مرحلوں میں چار آیات میں نازل فرمایا مکہ مکرمہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ (اور (ہم پلاتے ہیں تمہیں) کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم بناتے ہو اس سے نشہ آور اور پاک رزق۔) مسلمان شراب پیتے رہے اور یہ اس وقت ان کے لئے حلال تھی۔ پھر دوسرا حکم اس وقت نازل ہوا جبکہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ انصار کی ایک جماعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! شراب اور جوئے کے بارے میں ہمیں فتویٰ صادر فرمایئے، یہ دونوں چیزیں عقل کو ختم کر دینے والی ہیں اور مال کو ضائع کرنے والی ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (1) نتیجۃً بعض لوگوں نے اِثْمٌ كَبِيْرٌ کے قول کے سبب اسے چھوڑ دیا اور بعض مَنَافِعُ لِلنَّاسِ کے قول کے سبب اسے پیتے رہے۔ یہاں تک حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے کھانے کا واقعہ پیش آیا انہوں نے اصحاب رسول ﷺ میں سے بہت سے لوگوں کو اپنے پاس کھانے کی دعوت دی اور انہیں شراب بھی پیش کی۔ جب وہ پی چکے اور اس کا نشہ ان پر غالب آ گیا تو اتنے میں نماز مغرب کا وقت ہو گیا۔ انہوں نے ایک ساتھی کو نماز پڑھانے کے لئے آگے کیا تو اس نے سورۂ کافرون کی تلاوت اس طرح کی قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ اسی طرح آخر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 174 (التجاریہ)

تک مکمل سورت پڑھ لی۔ یعنی اس نے لَا اَعْبُدُ کی بجائے اَعْبُدُ پڑھا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى۔ الآیۃ گویا اس میں اوقات نماز میں نشے کو حرام قرار دیا۔ نتیجۃً اسے بعض لوگوں نے مکمل طور پر چھوڑ دیا اور یہ کہا کہ اس شئ میں کوئی نفع نہیں جو ہمارے اور نماز کے درمیان حائل ہوتی ہے اور بعض لوگ اسے نماز کے اوقات کے علاوہ دیگر اوقات میں پیتے رہے۔ لہٰذا لوگ عشاء کی نماز کے بعد پیتے حتیٰ کہ صبح تک اس کا نشہ زائل ہو جاتا یا پھر صبح کی نماز کے بعد پیتے اور ظہر کے وقت تک صحیح ہو جاتے۔ پھر عتبان بن مالک نے ایک ضیافت کا اہتمام کیا اور مسلمانوں میں سے کئی افراد کو دعوت دی، ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص بھی تھے۔ اس نے انہیں اونٹ کے بھونے ہوئے سر پیش کئے۔ جب وہ کھا چکے تو اوپر سے شراب چڑھائی یہاں تک کہ نشے میں ہو گئے۔ پھر وہ وہیں اپنی نسبی مفاخرت کا اظہار کرنے لگے اور اشعار کہنے شروع کر دیئے۔ پس اسی اثناء میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انصار کی ہجو میں ایک قصیدہ کہہ دیا اور اپنی قوم کے فخر کا اظہار کیا۔ پس اتنے میں انصار میں سے ایک آدمی نے اونٹ کی ایک ہڈی اٹھائی اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے سر پر دے ماری جس سے انہیں بہت گہرا زخم لگ گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور انصاری کی شکایت کر دی تو اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رب کریم کی بارگاہ میں التجاء کی "اے اللہ شراب کے بارے میں ہمارے لئے واضح حکم نازل فرما" تو اس وقت سورۂ مائدہ کی آیت نازل ہوئی سو اللہ اعلم۔

علماء کے مابین یہ اختلاف ہے کہ خمر (شراب) سے مراد کیا ہے۔ تو اس بارے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ خمر سے مراد انگور کا وہ پانی ہے جو مسکر (نشہ دینے والا) ہو اور اس کے اوپر جھاگ بن جائے۔ لیکن صاحبین نے اس کے لئے جھاگ بننے کی شرط عائد نہیں کی اور امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہر وہ مشروب جس کی کثیر مقدار نشے میں مبتلا کر دے وہ خمر ہے، جبکہ احناف رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ خمر اس خاص پانی کا نام ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں اور یہی معنی اہل لغت کے نزدیک معروف ہے۔ اسی لئے اس لفظ کا استعمال اس معنی میں مشہور ہے جبکہ دیگر نشہ آور مشروبات کے لئے اور اسماء مشہور ہیں۔ مثلاً مثلث، طلاء، منصف اور باذق وغیرہ اور لغت میں قیاس جاری نہیں ہو سکتا۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ لغوی طور پر خمر ہر اس شئ کا نام ہے جو عقل کو ڈھانپ لے اور میری تحقیق یہ ہے کہ لفظ خمر عام اور خاص کے مابین مشترک ہے۔ ایک معنی پر اس کا اطلاق حقیقۃً ہے اور دوسرے معنی میں اس کا استعمال عموم مجاز کے طریقے پر ہے اور آیت طیبہ میں عام معنی مراد ہے۔ صاحب قاموس نے کہا ہے کہ خمر سے مراد ہر وہ شئ ہے جو نشے میں مبتلا کر دے، چاہے وہ عصیر العنب ہو یا عام ہو۔ اور اس میں عموم زیادہ صحیح ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا خمر حرام کر دیا گیا اور اس میں سے کوئی شئ بھی مدینہ طیبہ میں نہیں تھی (1) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ میں اس دن قوم کا ساقی تھا جس دن خمر حرام قرار دی گئی سوائے کھجور کی شراب کے (اس وقت ان کی کوئی شراب نہیں تھی) (2) متفق علیہ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ میں کھڑے ہو کر ابوطلحہ اور فلاں فلاں کو پلا رہا تھا اور بعض روایات میں ابوعبیدہ بن جراح، ابی بن کعب اور سہیل کے نام آتے ہیں کہ اسی دوران ایک آدمی آیا اور اس نے کہا شراب حرام قرار دی گئی ہے۔ تو انہوں نے کہا "اے انس! ان گھڑوں کو انڈیل دے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آدمی کی خبر کے بعد نہ تو انہوں نے شراب کے بارے پوچھا اور نہ اس کی طرف دوبارہ رجوع کیا" (3) آپ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ جب شراب حرام قرار دی گئی تو اس وقت ہم خمر العنب بہت کم پاتے تھے اور ہماری عام شراب کھجور کی ہوا کرتی تھی (1)

1: بخاری، جلد 2 صفحہ 836 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 162 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 175-176 (التجاریہ)

مذکورہ بالا تمام آثار اس معنی پر دلالت کرتے ہیں کہ بیشک لفظ خمر اخص معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن آیت طیبہ میں اس سے مراد معنی اعم ہے، اگرچہ یہ معنی مجازاً ہے۔ اگر آیت طیبہ میں خمر سے مراد معنی اخص ہو تو پھر جواب سوال کے مطابق نہیں بنتا۔ کیونکہ سوال اس شراب کے بارے تھا جو اس وقت وہ پیتے تھے جب انہوں نے سوال کیا۔ یعنی حضرت عمر اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہما نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ہمیں خمر کے بارے فتویٰ عنایت فرمایئے، بیشک یہ عقل کو ختم کر دینے والی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ (یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعے سے اور روک دے تمہیں یاد الٰہی سے اور نماز سے۔) اور یہ لفظ خمر ماء العنب (انگور کا رس) کے ساتھ مختص نہیں بلکہ ان کے لئے تو ماء العنب مستعمل ہی نہیں تھا، واللہ اعلم۔ اسی باب میں حضرت عمر فاروق اعظم بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آپ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ "شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا ہے اور یہ پانچ چیزوں سے بنتی ہے۔ انگور، کھجور، گندم، جو اور شہد اور خمر ہر وہ شئی ہے جو عقل کو ڈھانپ لے"(2) متفق علیہ۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "شراب (خمر) گندم سے بنائی جاتی ہے۔ شراب جو سے تیار ہوتی ہے، شراب کھجور سے بنتی ہے، شراب کشمش سے بنائی جاتی ہے اور شراب شہد سے بنائی جاتی ہے"(3) اور اسی باب میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مرفوع روایت منقول ہے۔ اسے ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے نقل کر کے آخر میں یہ کہا کہ ہر نشہ آور چیز سے منع کر دیا گیا ہے اور آپ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مسکر چیز حرام ہے اور ہر مسکر (نشہ دینے والی) شئی خمر ہے(4) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خمر انگور، کھجور، شہد اور مکئی سے بنایا جاتا ہے پس ان میں سے جس میں بھی نشہ آ جائے وہی خمر ہے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ نتیجۃً یہ ثابت ہوا کہ جب لفظ خمر تمام نشہ آور شرابوں کو شامل ہے تو پھر نص قرآن سے یہ ثابت ہوا کہ ہر وہ شئی جس کی کثیر مقدار نشہ دینے والی ہو اس کی قلیل مقدار بھی حرام اور نجس ہے۔ ایسی جو شئی بھی ہو پینے والے کو حد لگائی جائے گی۔ چاہے وہ کسی بھی شئی سے بنی ہو۔ اس کی خرید و فروخت جائز نہیں اور اگر کسی نے غیر کی شراب ضائع کر دی تو وہ اس کے لئے ضمان ادا نہیں کرے گا مگر ماء العنب کے علاوہ دوسری شراب کو حلال سمجھنے والا کافر نہیں ہوگا، اس لئے کہ ان کے خمر ہونے میں اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ خمر کے علاوہ تین قسم کی شرابیں حرام ہیں۔

1۔ **الطلاء:**۔ اس سے مراد انگور کا ایسا جوس ہے جسے اتنا پکایا جائے کہ تہائی سے کچھ کم مقدار اس میں سے خشک ہو جائے اور اگر نصف مقدار خشک ہو جائے تو وہ منصف کہلاتا ہے۔ یا پھر نصف سے کم خشک ہو تو اسے باذق کہتے ہیں۔ بشرطیکہ ابلنے کے سبب اس میں شدت (نشہ) آ جائے اور اس پر جھاگ سی بن جائے۔

2۔ **السکر:**۔ اس سے مراد کھجور ملا وہ پانی ہے جس میں ابلنے کے سبب شدت آ جائے اور اس پر جھاگ بن جائے۔

3۔ **نقیع الزبیب:**۔ اس سے مراد کشمش کا وہ پانی ہے جس میں ابلنے کے سبب شدت آ جائے اور اس پر جھاگ ظاہر ہو جائے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 836 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 837 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 70 (العلمیہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 167 (قدیمی)

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے لئے جھاگ بننے کی شرط قائم نہیں کی۔ نتیجہ یہ تمام شرابیں نجس ہیں، ایک روایت کے مطابق ان کی نجاست خفیفہ ہے اور دوسری کے مطابق نجاست غلیظہ ہے۔ ان کی قلیل مقدار ایسے ہی حرام ہے جیسے پیشاب حرام ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی گزر چکا ہے کہ "خمر (شراب) ان دو درختوں سے بنتا ہے۔" لیکن ان کے پینے والے کو اس وقت تک حد نہیں لگائی جائے گی جب تک کہ نشہ اس پر غالب نہ آ جائے کیونکہ ان کی حرمت کا انحصار اجتہاد ظنی پر ہے اور حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کی خرید و فروخت جائز ہے اور انہیں ضائع کرنے والے پر ضمانت بھی ہوگی، لیکن اس میں صاحبین کا موقف آپ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہے۔ اگر مثلث عنبی، نبیذ تمر اور زبیب کو جب تھوڑا سا پکایا جائے اور ان میں اتنی شدت آ جائے کہ پینے سے عقل پر غالب نہ آئے یعنی پینے والا نشے کی حالت میں نہ آئے تو پھر یہ تمام کی تمام حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حلال ہیں، لیکن حضرت امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ اس مسئلہ میں ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ یہ اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ ان کے پینے سے مقصود قوت حاصل کرنا ہو اور اگر پینے والے نے لہو و لعب کا قصد کیا تو پھر بالاتفاق یہ حلال نہیں اور ان تینوں قسموں کی اتنی مقدار استعمال کرنا جو مُسکر ہو، بالاتفاق حرام ہے اور اسے پینے والے کو حد شرب بھی لگائی جائے گی۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ تینوں قسمیں نشہ لانے والی ہوتی ہیں تو ان کا آخری پیالہ حرام ہوتا ہے کیونکہ وہی حقیقت میں مسکر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ شراب جو گندم، جو، مکئی، شہد الفانید بھنگ اور گھوڑیوں کے دودھ وغیرہ سے بنائی جاتی ہے وہ شیخین کے نزدیک حلال ہے اور اگر وہ نشے میں مبتلا کر دے تو اس کے پینے والے کو حد نہیں لگائی جائے گی اور ان کے سبب نشہ ہونے کی صورت میں اگر کسی نے طلاق دے دی تو وہ واقع نہیں ہوگی۔ ان ہی دونوں سے ایک روایت اس طرح ہے کہ اگر ان میں سے کوئی نشے کا سبب بنی تو وہ حرام ہوگی اور پینے والے کو حد لگائی جائے گی۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ فقہاء نے کہا اصح قول یہ ہے کہ حد لگائی جائے گی اور حضرت امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی کہا ہے کہ بیشک یہ حرام ہے، اسے پینے والے کو حد لگائی جائے گی اور اس کی طلاق بھی واقع ہو جائے گی، جبکہ اس کا نشہ اس پر غالب ہو جیسا کہ تمام اشربہ کا حکم ہے۔ لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ اشربہ نجس نہیں ہیں کیونکہ وہ ان کی قلیل مقدار کو حرام نہیں کہتے۔ فتاویٰ نسفی میں ہے کہ بھنگ حرام ہے اور بھنگ پینے والے کی طلاق واقع ہو جاتی ہے اور جو اس کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا اور پینے والے کو ایسے ہی حد لگائی جائے گی جیسے شراب پینے والے کو حد لگائی جاتی ہے اور متعدد احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ہر مسکر شئ حرام ہے اور ہر وہ شئ جس کی کثیر مقدار مسکر ہو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یمن کا رہنے والا ایک آدمی حاضر ہوا اور حضور نبی کریم ﷺ سے اس شراب کے بارے پوچھا جو وہ اپنے علاقے میں مکئی سے بنا کر پیتے تھے اسے مزر کہا جاتا تھا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا وہ مسکر ہے؟ اس نے عرض کی جی ہاں! تو پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "ہر مسکر حرام ہے"(1) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس (شئ) کی قلیل مقدار سے منع فرمایا ہے جس کی کثیر مقدار مسکر ہو"(2) اسے نسائی، ابن حبان اور بزار نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "ہر وہ (شراب) جس کی کثیر مقدار مسکر ہو اس کی قلیل مقدار حرام ہے"(3) اسے ترمذی نے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 167 (قدیمی) 2۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 283 (وزارت تعلیم) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 9 (وزارت تعلیم)

روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے۔ علاوہ ازیں ابوداؤد اور ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ ﷺ سے روایت فرماتی ہیں "ہر وہ (شئ) جس کا ایک فرق (تین صاع کا ایک پیمانہ) مسکر ہو تو اس کی صرف اتنی مقدار بھی حرام ہے جس سے ایک چلو بھر جائے" (1) اسے امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے۔ علاوہ ازیں ابوداؤد نے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر مسکر اور افتراء پردازی پر ابھارنے والی چیز سے منع فرمایا ہے (2) اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ دیلم حمیری روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کہ ہم انتہائی ٹھنڈے علاقے میں رہتے ہیں اور وہاں انتہائی مشکل اور سخت کاروبار کرتے ہیں۔ ہم وہاں اس گندم سے شراب بناتے ہیں تا کہ ہم اس کے سبب کاروبار کے لئے طاقتور ہو جائیں اور اپنے علاقے کی سردی سے محفوظ رہ سکیں تو آپ ﷺ نے استفسار فرمایا کیا یہ نشہ دیتی ہے۔ میں نے عرض کی جی ہاں! تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا اس سے اجتناب کرو۔ میں نے عرض کی لوگ اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ تو یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا اگر وہ اسے نہ چھوڑیں تو ان کے ساتھ قتال کرو (3) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "میری امت میں سے لوگ شراب پیتے رہیں گے اور اسے نام دوسرا دیں گے" (4) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اسی باب میں دارقطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور مستدرک میں خوات بن جبیر کی روایت موجود ہے۔ اور علماء نے نبیذ کی اباحت پر جن احادیث سے استدلال کیا ہے ان میں سے ایک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ "حضور نبی کریم ﷺ کے لئے ایک رات کے اول حصہ میں نبیذ بنائی جاتی تھی اور آپ ﷺ آنے والے دن کی صبح کو نوش فرماتے تھے پھر آنے والی رات کو، پھر دوسرے دن اور دوسری رات اور پھر آنے والے دن کی عصر تک اس میں سے پیتے رہتے تھے۔ بعد ازاں اگر اس میں سے کوئی چیز بچ جاتی تو یا اسے خادم پی لیتا یا پھر اسے حکم ہوتا تو وہ انڈیل دیتا" (5) اسے مسلم نے روایت کیا ہے فقہاء نے فرمایا کہ اگر یہ حرام ہوتی تو پھر خادم اسے نہ پیتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ مسکر نہ ہوتی لیکن اس کی حلاوت ختم ہو چکی ہوتی اور یہ خوف لاحق ہو جاتا کہ اس میں نشہ آ جائے گا تو پھر آپ خادم کو عطا کر دیتے اور اگر گمان غالب کے مطابق وہ مسکر ہو چکی ہوتی تو آپ اسے انڈیل دینے کا حکم فرماتے۔ لہٰذا اس میں کوئی حجت موجود نہیں۔ اور انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب روایت سے اس موقف پر استدلال کیا ہے کہ خمر کے سوا ہر شراب کا آخری پیالہ حرام ہے، اس کی قلیل مقدار حرام نہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے "کل مسکر حرام" کے بارے فرمایا کہ "اس سے مراد وہ شراب ہے جو تجھے نشے میں مبتلا کر دے"۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایک راوی حجاج بن ارطاۃ اور دوسرا عمار بن مطر ہے۔ یہ نخعی کا قول ہے اور ابن مبارک کے پاس جب ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ذکر کی گئی تو انہوں نے کہا یہ حدیث باطل ہے۔ اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے کہ خمر بنفسہ اور ہر شراب میں سے نشہ آور حرام ہے (6) تو ابن ہمام نے کہا کہ یہ قابل تسلیم نہیں اور ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کی روایت حضور نبی کریم ﷺ سے نقل کی ہے۔ تو انہوں نے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 9 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 163 (ایضاً) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 162 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 163 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 168 (قدیمی)
6۔ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 176، مجمع الزوائد، جلد 5 صفحہ 77 مطبوعہ دار الفکر بیروت

کہا یہ روایت موقوف ہے اور اس کی سند ابوسعید تک متصل نہیں۔ تو ابن ہمام نے کہا البتہ ان الفاظ میں سند جید کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے متصلاً مروی ہے کہ "بعینہٖ خمر حرام ہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر اور ہر شراب میں سے مسکر حرام ہے۔" اور یہ الفاظ بھی ہیں "وَمَا اَسْکَرَ مِنْ کُلِّ شَرَابٍ" لیکن ان کے بارے ابن ہمام نے کہا ہے کہ لفظ "اسکر" میں غلطی ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر کا معنی یہ ہے کہ "ہر شراب میں سے مسکر حرام ہے چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر۔" اور انہوں نے حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ایک دفعہ حضور نبی کریم ﷺ کو دوران طواف پیاس محسوس ہوئی تو آپ ﷺ کے پاس مشکیزے میں سے نبیذ لائی گئی مگر آپ ﷺ نے غصے کا اظہار فرمایا۔ تو اس آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ حرام ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ میرے پاس زمزم کے پانی کا ایک ڈول لاؤ۔ چنانچہ آپ ﷺ نے وہ ڈول اس میں انڈیلا اور پھر اسے پی لیا اس حال میں کہ آپ ﷺ طواف کر رہے تھے۔ مطلب بن ابی وداعہ سے بھی اسی طرح مروی ہے اور اس کے آخر میں ہے جب تمہاری پیاس تم پر سخت ہو جائے یعنی غالب آنے لگے تو اس طرح کر لیا کرو۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نبیذ شدید کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ اتنے میں آپ ﷺ نے نبیذ کی ہوا محسوس کی آپ ﷺ نے اسے لانے کے لئے آدمی بھیجا، وہ لائی گئی تو آپ ﷺ نے اپنا سر مبارک اس کے قریب کیا تو آپ ﷺ نے اسے سخت (نشے کے قریب) پایا پھر آپ ﷺ نے اس میں پانی انڈیلا اور پھر آپ ﷺ نے اسے پی لیا۔ بعد ازاں ارشاد فرمایا "جب تمہارے برتن جوش مارنے لگیں تو پانی کے ساتھ ان کے جوش کو ختم کر دو۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی اسی قسم کی حدیث حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ ان تمام احادیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کیا نبیذ حلال ہے یا حرام؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا حلال ہے۔" اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے۔ حضرت سعید بن ذی لعوۃ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے برتن سے نبیذ پی لی تو نشے میں مبتلا ہو گیا۔ آپ نے اس کے لئے کوڑے لگانے کا حکم صادر فرمایا۔ اس نے عرض کی حضور! میں نے آپ کے برتن سے نبیذ پی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تجھے نشے کے سبب کوڑے لگوا رہا ہوں۔ اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے۔ ابومسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کے جواب میں دار قطنی نے کہا ہے کہ وہ یحییٰ بن یمان کے سبب معروف ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یحییٰ بن یمان غلطیاں کرنے والا راوی ہے۔ آپ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ پھر آپ سے کہا گیا کیا ان کے علاوہ بھی کسی نے اسے روایت کیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا نہیں مگر اس نے جو اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ امام نسائی نے کہا اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ ابو حاتم نے کہا یہ مضطرب الحدیث ہے اور مطلب بن وداعہ کی حدیث کے راویوں میں محمد بن سائب کلبی ہے جو کذاب اور ساقط الاعتبار ہے۔ اسی طرح سلیمان، لیث اور سعدی نے کہا ہے۔ نسائی اور دار قطنی نے کہا وہ متروک ہے اور ابن حبان نے کہا کہ اس کا جھوٹ بالکل واضح اور اظہر ہے۔ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ایک راوی عبدالملک بن نافع ہے جو مجہول اور ضعیف ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح مرفوع حدیث اس طرح مروی ہے "ہر وہ شئی جس کی کثیر مقدار نشے میں مبتلا کر دے تو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں قاسم بن بہرام منفرد ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے کہ اس حال میں اس سے استدلال کرنا جائز نہیں ہے اور ابومسعود کی حدیث میں ایک راوی عبدالعزیز بن ابان ہے جس کے بارے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ ابن نمیر نے کہا کہ یہ کذاب ہے اور حدیث وضع کرتا ہے اور سعید بن لعوۃ کی حدیث کے بارے ابو حاتم نے کہا کہ وہ بوڑھا دجال ہے۔ ابن

ابی شیبہ نے عمرو سے اسی طرح روایت کی ہے لیکن اس میں انقطاع ہے۔ پھر نبیذ کے اس حکم میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر وہ انڈیل جائے اور اس میں نشہ آجائے تو اس کی قلیل اور کثیر مقدار بالاتفاق حرام ہے اور اگر اس میں نشہ نہ ہو تو وہ بالاتفاق حلال ہے۔ ان احادیث کا اختلاف کے ساتھ بالکل کوئی مس نہیں ہو اللہ اعلم۔

۲۔ "وَالْمَيْسِرِ" یہ مصدر ہے جیسا کہ مَوْعِدٌ ہے جوئے کو مَیسر اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں آدمی دوسرے کا مال آسانی کے ساتھ لے لیتا ہے، یا پھر اس لئے کہ اس میں دوسرے کی خوشحالی کو چھین لیتا ہے۔ عطاء، طاؤس اور مجاہد نے کہا ہے کہ ہر وہ شئی جس میں قمار بازی ہو وہی مَیسر ہے۔ یہاں تک کہ بچوں کا اخروٹ اور پانسہ کے ساتھ کھیلنا بھی اس میں داخل ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ چوسر اور شطرنج دونوں مَیسر (جواء) ہیں(1) امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ "آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ شطرنج عجمیوں کا جواء ہے"(2) چوسر، شطرنج اور ان کی مثل کھیلوں سے نہی کے بارے کئی روایات موجود ہیں۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو نردشیر (چوسر) کھیلا گویا اس نے اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت سے رنگا"(3) عبدان، ابوموسیٰ اور ابن حزم نے حبہ بن مسلم سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ "وہ ملعون ہے جو شطرنج کھیلے گا اور اس کی طرف دیکھنے والا خنزیر کا گوشت کھانے والے کی طرح ہے۔" حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو چوسر کھیلا تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی نافرمانی کی"(4) اسے امام احمد اور ابوداؤد رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ آپ ہی سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ شطرنج نہیں کھیلے گا مگر گناہ کرنے والا۔ اور آپ سے یہ روایت بھی ہے کہ آپ سے شطرنج کھیلنے کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا یہ باطل ہے اور اللہ تعالیٰ باطل کو پسند نہیں فرماتا(5) اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے شراب، جوئے اور شطرنج سے منع فرمایا ہے(6) اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مرفوع روایت منقول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ الکوبۃ کا معنی طبلہ ہے۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو کبوتری کا پیچھا کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ شیطان شیطانہ کا پیچھا کر رہا ہے"(7) اسے امام احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے شعب میں نقل کیا ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ ہر شئی کے ساتھ (جوا) کھیلنا حرام ہے۔ اسی پر اجماع ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی جو یہ روایت ہے کہ آپ نے شطرنج کھیلنے کو مباح قرار دیا ہے۔ اس میں بھی اصح یہی ہے کہ آپ نے اس قول سے رجوع کر لیا تھا۔ مال کو کسی بھی وجہ سے ضائع کرنا اور فضول خرچی کرنا جیسا کہ رشوت، جواء اور سود وغیرہ، بالاجماع یہ تمام صورتیں حرام ہیں۔ کیونکہ رب کریم نے ارشاد فرمایا: اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ط (بیشک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں) اور جوئے میں دو چیزیں جمع ہیں لہو ولعب اور اضاعة المال (مال کو ضائع کرنا) لہٰذا اس کا حکم دوسروں کی نسبت زیادہ سخت ہے۔ اور بالاجماع یہ کبیرہ گناہوں میں سے ایک ہے۔ چاہیے جواء کھیلنے والا ان چیزوں سے کھیلے جن سے اہل عرب کھیلتے ہیں یا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 178 (التجاریہ)
2۔ شعب الایمان، جلد 5 صفحہ 241 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت
3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 240 (قدیمی)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 327 (وزارت تعلیم)
5۔ شعب الایمان، جلد 5 صفحہ 241 (العلمیہ)
6۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 163 (وزارت تعلیم)
7۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 327 (و ت)

پھر ان کے علاوہ شطرنج اور چوسر وغیرہ سے دونوں کا حکم ایک ہے۔

؎ بیشک یہ دونوں بہت بڑے گناہ کو مستلزم ہیں یعنی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا فساد کرنا اور ایک دوسرے کو گالی گلوچ دینا۔ یہ دونوں آدمی کو عداوت اور بغض میں مبتلا کر دیتے ہیں، ذکر الٰہی اور نماز سے روک دیتے ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے ثاء کے ساتھ قرأت کرتے ہوئے اِثْمٌ كَثِيْرٌ پڑھا ہے۔ اس حیثیت سے کہ گناہوں کی اقسام متعدد ہیں۔ جبکہ بقیہ قراء نے باء کے ساتھ كَبِيْرٌ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ بہت بڑی معصیت ہے اور یہ دونوں عمل گناہ کبیرہ میں سے ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم میں سے کوئی ہرگز شراب نہ پیئے بیشک یہ ہر برائی کی جڑ ہے۔" اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی زانی اس حال میں زنا نہیں کرتا کہ وہ زنا کرتے وقت مومن ہو، کوئی سارق اس حال میں چوری نہیں کرتا کہ وہ چوری کرتے وقت مومن ہو اور کوئی اس حال میں شراب نہیں پیتا کہ وہ پیتے وقت مومن ہو، الحدیث (1) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "خمر (شراب) اُم الفواحش (تمام برائیوں کی اصل) اور تمام کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا ہے۔ جو شراب پیئے گا وہ نماز ترک کر دے گا اور وہ اپنی ماں، خالہ اور پھوپھی کے ساتھ برائی کا ارتکاب کرے گا" اسے طبرانی نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جو شراب پیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں فرماتا، اگر وہ توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرما لیتا ہے اور اگر اس نے دوبارہ شراب پی تو اللہ تعالیٰ اس کی چالیس صبحوں کی نمازیں قبول نہیں کرتا، اگر وہ توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرما لیتا ہے۔ اور اگر وہ تیسری بار اس کا اعادہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دنوں کی نمازیں قبول نہیں فرماتا اور اگر وہ توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرما لیتا ہے اور اگر وہ چوتھی بار پھر شراب پیئے تو اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دنوں کی نمازیں قبول نہیں کرتا، اب اگر وہ توبہ بھی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول نہیں فرماتا اور وہ اسے زہر کے دریا سے سیراب کرے گا (2) اسے نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "شراب ام الخبائث ہے پس جو اسے پیئے گا اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں فرمائے گا اور اگر وہ اس حال میں مر گیا کہ ابھی وہ اس کے پیٹ میں ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔" اسے طبرانی نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ان ہی سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "(والدین کی) نافرمانی کرنے والا، جوا کھیلنے والا، احسان جتلانے والا اور ہمیشہ شراب پینے والا جنت میں داخل نہیں ہوں گے" (3) اسے دارمی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت ہے کہ تین قسم کے آدمیوں پر اللہ تعالیٰ نے جنت کو حرام قرار دیا ہے (1) شراب پر دوام اختیار کرنے والا (2) والدین کی نافرمانی کرنے والا (3) اور بے غیرت دیوث انسان۔ اسے امام احمد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عالمین کے لئے رحمت اور سراپا ہدایت بنا کر بھیجا اور میرے رب نے مجھے گانے بجانے کے آلات، مزامیر، بت، صلیب اور جاہلیت کے معاملات کو ختم کرنے کا حکم فرمایا اور میرے رب نے اپنی عزت کی قسم اٹھا کر ارشاد فرمایا "میرے بندوں میں سے جو کوئی شراب کا ایک گھونٹ پیئے گا اسے میں اس کی مثل پیپ پلاؤں گا اور جو اسے میرے خوف سے چھوڑ دے گا میں اسے حیاض قدس سے سیراب کروں

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 828 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 68 (العلمیہ) 3۔ سنن دارمی، جلد 2 صفحہ 37 (المحاسن)

گا۔" اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تین آدمی جنت میں داخل نہیں ہوں گے، شراب پینے میں دوام اختیار کرنے والا، قطع تعلق کرنے والا اور جادو کی تصدیق کرنے والا (1) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ " رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا شراب پینے میں دوام اختیار کرنے والا اگر اسی حالت میں مرا تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح ملے گا جیسے کسی بت کی پوجا کرنے والا وہاں حاضر ہوگا" (2) اسے بھی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ میں شراب پیوں یا پھر اللہ تعالیٰ کے سوا اس ستون (بت) کی عبادت کروں" (3) اسے نسائی نے روایت کیا ہے۔ (یعنی شراب پینا اور بت کی عبادت کرنا میرے نزدیک برابر ہے)۔ " وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ " بیشک شراب پینے میں لذت اور فرحت ہے اس سے کھانا خوشگوار اور لذیذ ہو جاتا ہے، بزدل کو تشجیع ملتی ہے، مروت میں وقار اور طبیعت میں قوت آتی ہے اور بعض بیماریاں بھی دور ہو جاتی ہیں اور جوئے میں بغیر کسی محنت و کاوش کے مال حاصل کرنا ہوتا ہے۔

مسئلہ:۔ اس پر اجماع ہے کہ اختیاری حالت میں شراب سے نفع حاصل کرنا قطعاً جائز نہیں۔ البتہ حالت اکراہ اور اضطرار میں جائز ہے۔ جیسا کہ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں: اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَیْهِ " (مگر وہ چیز کہ تم مجبور ہو جاؤ اس کی طرف۔) مزید فرمایا: فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ " (لیکن جو مجبور ہو جائے در آنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (بقدر ضرورت کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں۔) وہ آدمی جسے لقمہ اٹک جائے اور وہ شراب کے بغیر کچھ بھی نہ پائے تو امام اعظم ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے لئے وہ پینا جائز ہے، جبکہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے مشہور قول یہ ہے کہ اس حال میں بھی اس کے لئے شراب پینا جائز نہیں۔

اس بارے میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے کہ آیا شراب سے علاج کرنا جائز ہے؟ تو اس میں حضرت امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا موقف یہ ہے کہ دواء کے لئے بھی شراب کا استعمال جائز نہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے دو قولوں میں سے اصح قول یہی ہے۔ جبکہ ان کا ایک قول یہ ہے کہ دواء کے لئے اس کی قلیل مقدار جائز ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ شراب کی تلچھٹ کو پینا اور اسے سر کی مانگ میں ڈالنا مکروہ ہے کیونکہ اس میں عصیر کے اجزاء ہوتے ہیں اور حرام چیز سے انتفاع حرام ہوتا ہے۔ اسی لئے اس سے زخموں کا علاج کرنا یا جانور کی زخمی پیٹھ پر لگانا جائز نہیں، نہ ذمی کو پلانا جائز ہے اور بچے کو دواء کے لئے پلانا بھی جائز نہیں اور اس کا وبال پلانے والے پر ہوگا۔ اسی طرح چاہئے کہ کوئی جانوروں کو بھی نہ پلائے۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضور نبی کریم ﷺ سے شراب کے بارے پوچھا، تو آپ ﷺ نے اسے اس سے منع فرمایا۔ اس نے عرض کی میں نے دوا کے لئے بنائی ہے تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک وہ تو بیماری ہے وہ دوا نہیں ہے، (اِنَّهَا دَاءٌ وَّ لَیْسَتْ بِدَوَاءٍ) (4) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت طارق بن سوید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! بیشک ہماری زمین (علاقے) میں انگور ہوتا ہے ہم اسے نچوڑ کر پی سکتے ہیں یعنی (شراب بنا کر)۔ آپ ﷺ نے

1۔ مسند احمد، جلد 4 صفحہ 399 (دار صادر بیروت) 2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 67 (العلمیہ)
3۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 287 (وزارت تعلیم) 4۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 163 (قدیمی)

فرمایا نہیں۔ میں نے دوبارہ عرض کی آپ ﷺ نے فرمایا نہیں پھر میں نے عرض کی ہم وہ مریضوں کو پلا سکتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا بیشک اس میں شفاء نہیں ہے بلکہ وہ تو بیماری ہے (1) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ ”میں نے انگیٹھی میں نبیذ بنائی اتنے میں حضور نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو وہ ابل رہی تھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کی میری بیٹی بیمار ہے، میں نے اس کے لئے یہ بنائی ہے تو پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان چیزوں میں شفاء نہیں رکھی ہے جو تم پر حرام قرار دی ہیں“ (2) اسے بیہقی اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان کے الفاظ اس طرح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حرام شئ میں شفاء نہیں رکھی ہے۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ابن مسعود سے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد ”کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حرام شئ میں شفاء نہیں رکھی“ کا معنی یہ نہیں کہ اس نے اس میں شفاء کا اثر پیدا نہیں کیا، کیونکہ یہ تو آیت طیبہ کے الفاظ کے خلاف ہے اور کسی شئ کے حرام ہو جانے کے ساتھ اس کے تخلیقی منافع ختم نہیں ہو جاتے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا اللہ کی تخلیق میں۔) بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حرام چیز سے شفاء حاصل کرنے کی تمہیں رخصت نہیں دی۔ کبھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے حرام چیز سے علاج کرنے کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ عکل یا عرینہ قبیلے کے کچھ افراد مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تو حضور نبی کریم ﷺ نے ان کے لئے اونٹنیوں کے ساتھ باہر جانے کا حکم فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ انہیں باہر لے جاؤ اور ان کے دودھ اور پیشاب پیئو۔ چنانچہ انہوں نے پیا تو بیماری سے صحت یاب ہو گئے پھر انہوں نے چرواہے کو قتل کر دیا، الحدیث (3) متفق علیہ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے، اس لئے کہ عرنیین کا یہ واقعہ سورۂ مائدہ کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ اسی حدیث سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ ان جانوروں کا پیشاب پاک ہے جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ لہٰذا اس حدیث طیبہ سے حرام چیزوں سے علاج کے جواز پر استدلال کرنا جائز نہیں۔

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کیا شراب کو سرکہ بنانا جائز ہے؟ تو اس کے بارے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جائز ہے اور سرکہ بنانے کے ساتھ وہ پاک ہو جاتا ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے۔ البتہ وہ سرکہ بنانے سے پاک ہو جائے گا۔ حضرت امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سرکہ بنانا جائز نہیں اور اس طرح وہ پاک بھی نہیں ہوتا۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ان کے پاس ایک بکری تھی جسے آپ ﷺ دوہا کرتے تھے ایک دن حضور نبی کریم ﷺ نے اسے نہ پایا تو آپ ﷺ نے فرمایا بکری کو کیا ہوا؟ تو انہوں نے عرض کی وہ مرگئی ہے پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم نے اس کے چمڑے سے کوئی نفع حاصل نہیں کیا؟ تو ہم نے عرض کی: حضور ﷺ! وہ تو مردار تھی۔ تو اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ”اسے دباغت (رنگائی) اسی طرح حلال کر دیتی ہے، جیسے سرکہ شراب کو حلال بنا دیتا ہے۔“ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ دار قطنی نے کہا ہے کہ اسے بیان کرنے میں فرج بن فضالہ منفرد ہے اور یہ ضعیف راوی ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے کہ اسانید میں قلب ہونے کے سبب صحیح اسانید کے ساتھ ضعیف متون مل جاتے ہیں، لہٰذا ان سے استدلال کرنا جائز نہیں ہوگا۔ محدثین نے کئی ایسی احادیث ذکر کی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں مثلاً ”ان میں سے ایک یہ ہے کہ تمہارے لئے سب سے بہتر سرکہ وہ ہے جو تمہاری شراب سے بنا ہو اور دباغت چمڑے کو پاک کر دیتی ہے جیسے وہ شراب کو حلال بنا دیتا ہے۔“ ان کی اصل کی

1۔ مسند احمد، جلد 4 صفحہ 311 (صادر) 2۔ مجمع الزوائد، جلد 5 صفحہ 140 (الفکر) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 57 (قدیمی)

پہچان نہیں۔ حضرت امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کی دلیل حدیث انس ہے کہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم ﷺ سے ان یتامیٰ کے بارے میں پوچھا جو شراب کے وارث بنے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے بہا دو۔ تو انہوں نے عرض کی، کیا ہم اس کا سرکہ نہ بنالیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی دوسری اسناد بھی ہیں جنہیں دار قطنی نے نقل کیا ہے۔ ان میں سے بعض میں اسی طرح ہے کہ میں نے ان یتامیٰ کے لئے شراب خرید لی ہے جو میرے پاس رہ رہے ہیں۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا شراب انڈیل دو اور برتن توڑ دو۔ آپ نے یہ جملہ ان پر تین بار دہرایا اور حضرت ابو سعید کی حدیث میں ہے کہ جب شراب حرام ہوئی تو ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی، کہ ہمارے پاس یتیموں کی شراب ہے تو آپ ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا تو ہم نے اسے انڈیل دیا(1)

ے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تحریم کے بعد ان دونوں (شراب اور جواء) کا گناہ ان کے اس نفع سے بڑا ہے جو تحریم سے پہلے تھا(2) یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان دونوں کا گناہ اس نفع سے بڑا ہے جو تحریم سے قبل تھا۔ میرے نزدیک ظاہر قول یہی ہے کہ حرام ہونے کے بعد ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے کیونکہ گناہ کا نقصان آخرت کی طرف راجع ہے اور اس کے منافع دنیا کی طرف راجع ہیں اور دنیا کا ساز و سامان قلیل ہے جبکہ آخرت کا دن انتہائی خوفناک اور کڑوا ہے، واللہ اعلم۔ ابن ابی حاتم نے سعید اور عکرمہ کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ایک گروہ کو جس وقت اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا تو وہ حضور نبی مکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ "ہم اس نفقہ کے بارے نہیں جانتے جس کے بارے آپ ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ ہم اپنے مالوں میں سے خرچ کریں"(3) اور انہوں نے حضرت یحییٰ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ثعلبہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ہم تو راتوں کو جاگنے کے سبب کمزور ہو گئے ہیں۔ ہم اپنے مالوں میں سے کیا خرچ کریں؟ تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی۔

ﷺ ابو عمرو نے العفو کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اَلَّذِیْ یُنْفِقُوْنَ هُوَ الْعَفْوُ (جو وہ خرچ کرتے ہیں وہ عفو ہے) حضرات عطاء، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ عفو سے مراد وہ شئی ہے جو حاجت سے فالتو ہو۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مال کماتے تھے۔ اس میں سے اپنے خرچ کی مقدار اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور بقیہ اس آیت کے حکم کے مطابق صدقہ کر دیتے تھے۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اہل صفہ میں سے ایک آدمی فوت ہوا اور اس نے ایک دینار باقی چھوڑا، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ (دوزخ کی آگ کا) ایک داغ ہے۔ حرید کہا پھر دوسرا فوت ہوا تو اس نے دو دینار چھوڑے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ دو داغ ہیں(4) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ ابو ہاشم بن عتبہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے ہم سے عہد لیا اور میں نے آپ ﷺ کو یہ کہتے سنا کہ تجھے جمع شدہ مال میں خادم اور سواری کا جانور کافی ہے"(5) اسے احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔ پھر یہ حکم آیت زکوٰۃ کے سبب منسوخ ہو گیا۔ میں کہتا ہوں یہ صحیح اور قوی بات نہیں کیونکہ زکوٰۃ کا حکم نازل کرنے کا ذکر سورۂ بقرہ کے شروع میں ہے اور اس کا نزول 1ھ یا 2ھ میں ہوا۔ لہٰذا نزول

1۔ مسند احمد، جلد 3، صفحہ 26 (صادر)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 176 (التجاریہ)　　3۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 453 (العلمیہ)
4۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 364 (العلمیہ)　　5۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 464 (العلمیہ)

کے اعتبار سے آیت زکوٰۃ اس آیت سے مقدم ہے۔ پس یا تو یہ کہا جائے گا کہ اس آیت طیبہ کے ذریعے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ مال میں سے زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے نصاب زکوٰۃ کا حاجت اصلیہ قرض وغیرہ سے فالتو ہونا شرط ہے۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ سوال نفلی صدقہ کے بارے تھا اور آیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ضرورت سے زائد مال صدقہ کرنا افضل ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے ضرورت سے زائد مال صدقہ کرنا یہاں تک کہ خود لوگوں کا محتاج نہ ہو جائے حضرت عمرو بن دینار رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ عفو سے مراد فضول خرچی اور کنجوسی کی درمیانی حالت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا (اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ کنجوسی۔) اور طاؤس نے کہا ہے کہ العفو سے مراد وہ مال ہے جس میں آسانی ہو۔ اسی معنی میں رب کریم کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے "خُذِ الْعَفْوَ" یعنی لوگوں کے اخلاق میں سے آسان کو لے لو۔ اس لئے چاہئے کہ جسے خرچ کرنا آسان ہو اسے خرچ کرے اور اس کے سبب مشقت کی حد تک نہ پہنچے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہتر صدقہ اس غنی کا ہے جس کی احتیاج نہ ہو اور اس سے ابتدا کرو جو محتاج ہو(1) اسے بخاری، ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح حکیم بن حزام سے بھی مروی ہے، متفق علیہ اور امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے اور اس میں یہ ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے(2) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی کی مثل مروی ہے اور الفاظ اس طرح ہیں کہ بہتر صدقہ وہ ہے جو غنا کو باقی رکھے۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ عرض کی "یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس ایک دینار ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے اپنے اوپر خرچ کر۔ اس نے عرض کی میرے پاس دوسرا بھی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے اپنی اولاد پر خرچ کر۔ پھر عرض کی میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے اپنی اہلیہ پر خرچ کر۔ پھر عرض کی میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے اپنے خادم پر خرچ کر۔ پھر عرض کی میرے پاس ایک اور بھی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا تو ہی بہتر جانتا ہے (یعنی تجھے اختیار ہے)"(3) اسے ابوداؤد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اس کے پاس سونے کا ایک خود تھا جو اسے مال غنیمت میں سے ملا تھا۔ تو اس نے عرض کی آپ ﷺ مجھ سے یہ بطور صدقہ لے لیجئے۔ لیکن آپ ﷺ نے اس سے اعراض کر لیا۔ پھر جب اس نے بار بار ایسا کہا تو آپ ﷺ نے اسے غصے کی حالت میں فرمایا لے آ۔ چنانچہ آپ ﷺ نے وہ لے لیا اور اسے اتنے زور سے پھینکا کہ اگر اسے لگ جاتا تو اس کے سر کو زخمی کر دیتا۔ پھر فرمایا "يَأْتِيْ اَحَدُكُمْ بِمَالِهٖ كُلِّهٖ يَتَصَدَّقُ بِهٖ وَيَجْلِسُ يَتَكَفَّفُ النَّاسَ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ عَنْ ظَهْرِ غِنًى" (تم میں سے کوئی آتا ہے اور اپنا سارا مال خیرات کر دیتا ہے اور پھر لوگوں سے بھیک مانگنے لگتا ہے۔ صدقہ تو تب ہے جب احتیاج نہ ہو)(4) اسے بزار، ابوداؤد، ابن حبان اور حاکم نے بیان کیا ہے۔ بزار کی روایت میں "بعض المغانم" کے الفاظ ہیں یعنی اسے وہ خود مال غنیمت میں سے ملا۔ جبکہ دوسری کی روایت میں "بعض المغازی" کے الفاظ ہیں، یعنی کسی غزوہ میں وہ اس کے ہاتھ آیا۔ پس اگر کہا جائے کہ یہ حدیث اور آیت طیبہ دونوں تمام مال خرچ کرنے اور اس جہد مقل کی کراہت پر دلالت کرتی ہیں، بیشک عفو جہد (مشقت) کی ضد ہے اور حضرت ابو امامہ

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 243 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 179 (التجاریہ)

3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 245 (وزارت تعلیم)

4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 243 (وزارت تعلیم)

کی حدیث تمام مال خرچ کرنے کے وجوب پر دلالت کرتی ہے اور آپ ﷺ سے یہ بھی صحیح روایت ہے کہ" آپ ﷺ سے پوچھا گیا کونسا صدقہ افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جهد المقل (مزدوری کر کے خیرات کرنا) اور اپنے متعلقین سے ابتداء کرنا"(1) اسے ابوداؤد نے حدیث ابی ہریرہ سے روایت کیا ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" اگر میرے پاس احد پہاڑ کی مثل بھی سونا ہو تو میرے لئے یہ خوشی کا باعث ہو کہ وہ میرے پاس تین راتیں بھی نہ رہے اور اس میں سے میرے پاس کوئی شئی بھی نہ ہو مگر اتنی مقدار جس کی میں قرض کے لئے نگرانی کرتا رہوں"(2) اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خرچ کرو اور اسے روک کر نہ رکھو، ورنہ اللہ تعالیٰ تم سے روک لے گا اور نہ بند کر کے رکھو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں دینا بند کر دے گا۔ تو خیرات کرتی رہ جتنی طاقت رکھتی ہے، متفق علیہ۔ میں کہتا ہوں کہ اشخاص اور احوال کے اختلاف کے ساتھ حکم بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ شخص جو تمام مال صدقہ کرنے کے بعد لوگوں سے بھیک مانگنا شروع کر دیتا ہے اور وہ فقر پر صبر کی طاقت نہیں رکھتا تو اس کے لئے تمام مال خیرات کرنا جائز نہیں۔ اس کے برعکس وہ آدمی جو صبر کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور اس پر لوگوں کے حقوق میں سے کوئی حق نہ ہو تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے راستے میں تمام مال خرچ کر ڈالنا افضل ہے۔ لوگوں کے حقوق سے مراد ان کے قرضے اور اہل و عیال کا خرچہ ہے اور لامحالہ اپنے خادم کو مال دینا کسی اجنبی کو صدقہ دینے سے افضل ہے۔ اس لئے کہ وہ فرض ہے اور یہ نفل ہے۔ جنہوں نے اپنے نفس پر زہد اور حضور نبی کریم ﷺ کی حیات کے مطابق زندگی گزارنا لازم کر رکھا ہو جیسا کہ صحابہ کرام میں سے اصحاب صفہ اور صوفیائے کرام میں سے خانقاہوں میں رہنے والے، تو ان کے لئے اپنی حاجت سے زائد مال اپنے پاس رکھنا مکروہ ہے اور اسی پر حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو محمول کیا جائے گا اور حضور نبی کریم ﷺ نے کئی اعمال میں سے افضل عمل کے فوت ہونے کو تحسر سے تعبیر کیا ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ اگر کسی نے نصاب اور سال مکمل ہونے سے پہلے ضرورت سے زائد مال خرچ کر دیا تو اس کی طرف سے صرف نفلی صدقہ ادا ہوگا اور اگر اس نے مال نصاب تک پہنچنے اور اس پر سال گزرنے کے بعد خرچ کیا تو اس کی طرف سے فرض ادا ہوگا اور فرض کی ادائیگی نفل کی ادائیگی سے افضل ہوتی ہے۔ تو پھر اس کے برعکس کیسے کہا جا سکتا ہے؟ تو ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ انفاق کے واجب ہونے کا سبب نفس مال کا مالک بننا ہے اور اسی سے خرچ کرنے کی ممکنہ قدرت حاصل ہوتی ہے اور شکر سے مراد منعم کی رضا کے لئے نعمت کو خرچ کرنا ہے اور اس میں نصاب، نمو اور حولان حول کی شرائط اللہ تعالیٰ کی جانب سے سہولت اور تفضل کے لئے رخصت ہیں۔ گویا ان سے قدرت میسرہ حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا جس نے قدرت میسرہ نہ ہونے کے سبب انفاق کو ترک کر دیا، رخصت کی بناء پر اس پر کوئی گناہ نہیں لیکن اس کے برعکس جس نے قدرت میسرہ کے فوت ہونے کے باوجود قدرت ممکنہ کے بعد اپنا مال خرچ کر دیا تو اس نے عزیمت پر عمل کیا۔ اور نصاب مکمل ہونے کے بعد اگرچہ مال میں سے چالیسواں حصہ خرچ کرنا واجب ہوتا ہے لیکن جس نے اپنا تمام مال فی سبیل اللہ خرچ کر ڈالا تو اس میں اس کے ذمہ سے فرض بھی ادا ہو جائے گا۔ جیسا کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ چھوٹی تین آیات ملا کر قرأت کرنا واجب ہے، لیکن جس نے ایک ہی رکعت میں مکمل قرآن پڑھ دیا تو اس طرح اس کا واجب بھی ادا ہو جائے گا کیونکہ" فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ" اور" وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ" کے ارشادات ان دونوں کو شامل ہیں اور مال کا ضرورت سے فالتو ہونا۔ مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ میں مِنْ تبعیضیہ کے صدق کے لئے کافی ہے۔

لہ" كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ" اس میں کاف محل نصب میں ہے اور مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی تَبْيِيْنًا اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 243 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 954

تَبیِیۡناً مِثۡلَ ذٰلِکَ التَّبۡیِیۡنِ یعنی اللہ تعالیٰ نفقہ کے احکام اور اسی طرح دیگر احکام کھول کر واضح انداز میں بیان فرماتا ہے۔ اس میں علامت واحد ذکر کی حالانکہ اس کے مخاطب جمع ہیں، اس بناء پر کہ یا تو یہ جمع کی تاویل میں ہے۔ یا پھر یہ خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہے اور آپ کا خطاب امت کے خطاب پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ (اے نبی مکرم! (مسلمانوں سے فرماؤ) جب تم (انہی) عورتوں کو طلاق دینے کا ارادہ کرو۔)

ے تاکہ تم دلائل اور احکام میں فکر کرنے لگو کیونکہ بیشک ایسی آیات و علامات اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی متصور ہو سکتی ہیں جو امور کی مصلحتوں اور ان کے انجام کو جاننے والا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حکیم اور متقن بھی ہے۔ لہٰذا تم اس کے اوامر کی پیروی کرنے اور اس کی مناہی سے رکنے میں جلدی کرو تو تم دونوں جہاں کے منافع کے ساتھ کامیاب ہو جاؤ گے۔

فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَةِ ؕ وَ یَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡیَتٰمٰی ؕ قُلۡ اِصۡلَاحٌ لَّهُمۡ خَیۡرٌ ؕ وَ اِنۡ تُخَالِطُوۡهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ یَعۡلَمُ الۡمُفۡسِدَ مِنَ الۡمُصۡلِحِ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعۡنَتَكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیۡزٌ حَكِیۡمٌ ﴿۲۲۰﴾

”دنیا اور آخرت (کے کاموں) میں [1] اور پوچھتے ہیں آپ سے یتیموں کے بارے میں فرمائیے (ان سے الگ تھلگ رہنے سے) ان کی بھلائی کرنا بہتر ہے اور اگر (کاروبار میں) تم انہیں ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں [2] اور اللہ خوب جانتا ہے بگاڑنے والوں کو سوارنے والے سے اور اگر چاہتا اللہ تو مشکل میں ڈال دیتا تمہیں بیشک اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا حکمت والا ہے [3]“

[1] فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَةِ: یہ ظرف یُبَیِّنُ کے متعلق ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰیٰتِ مَا یَصۡلُحُ لَكُمۡ فِیۡ اَمۡرِ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ“ اور یہ قول بھی ہے کہ ظرف تتفکرون کے متعلق ہے۔ اور معنی یہ ہوگا کہ تم غور و فکر کرو ان امور میں جو دنیا اور آخرت سے تعلق رکھتے ہیں، ان چیزوں کو لے لو جو تمہارے لئے باعث نفع ہیں، اپنے مالوں میں سے وہ روک لو جو تمہارے لئے دنیوی زندگی میں نفع بخش ہو اور اس فالتو سامان کو خرچ کر دو جو آخرت میں تمہارے لئے فائدہ مند ہو۔ یا پھر معنی اس طرح ہے تاکہ تم دارین میں غور و فکر کرو اور انہیں ترجیح دو جو دونوں جہاں میں باقی رہنے والی ہیں اور ان کے منافع کثیر ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دنیا پیٹھ پھیرتے ہوئے کوچ کر رہی ہے اور آخرت سامنے سے آ رہی ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے بیٹے ہیں۔ پس تم آخرت کے بیٹے ہو جاؤ اور دنیا کے بیٹے نہ بنو۔ بیشک آج عمل ہے اور حساب نہیں ہے اور کل حساب ہوگا (1) عمل نہیں ہوگا۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک باب کے عنوان میں ذکر کیا ہے۔ اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ چٹائی پر آرام فرما ہوئے، آپ ﷺ اٹھے تو آپ ﷺ کے جسم اقدس پر اس کے نشانات تھے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ ہمیں حکم فرمائیں تو ہم آپ کیلئے (بستر) بچھا دیا کریں۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”کیا ہے میرے لئے اور دنیا کے لئے؟ میرا تعلق دنیا کے ساتھ ایک مسافر سوار کی مثل ہے جو ایک درخت کے سائے میں بیٹھا پھر تھوڑی دیر ستانے کے بعد اسے چھوڑ کر چلا گیا“(2) اسے امام احمد، ترمذی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 949-950 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 468 (العلمیہ)

اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ بیشک تمہارے سامنے ایک پیچیدہ گھاٹی ہے جسے بھاری بوجھ والے لوگ عبور نہیں کر سکیں گے۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے، واللہ اعلم۔ ابوداؤد، نسائی اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک حدیث نقل کی ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے کہ جب یہ آیات طیبات نازل ہوئیں: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (اور نہ قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو۔) اور اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا (بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کا مال ظلم سے۔) تو مسلمان سخت پرہیز کرنے لگے حتیٰ کہ انہوں نے یتیموں کے مال اپنے مالوں سے جدا کر دیئے، یتیم کے لئے کھانا تیار کیا جاتا۔ اس سے جو چیز بچ جاتی اسے چھوڑ دیتے اور اسے نہ کھاتے یہاں تک کہ وہ خراب ہو جاتی۔ تو یہ صورت حال ان پر انتہائی گراں تھی۔ لہٰذا انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1):۔

ع یعنی یتیموں کے اموال اور ان کے معاملات کی اصلاح بہتر ہے لیکن اگر تم ان کی بھلائی مال علیحدہ کرنے میں گمان کرتے ہو، تو وہ کر لو اور اگر تم یہ گمان کرتے ہو کہ ان کی بھلائی مال کی آمیزش میں ہے تو بیشک وہ تمہارے دینی اور نسبی بھائی ہیں اور بھائی آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور وہ بھلائی اور فائدے کے لئے ایک دوسرے کے مال سے کچھ حصہ لیتے رہتے ہیں۔

ع یعنی اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے جو مال ملانے کا اختلاط سے خیانت، یتیم کا مال برباد کرنے اور اس سے ناحق کھانے کا قصد کرتا ہے اور اسے جو بھلائی اور فائدے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اسے تمہارے لئے مشکل بنا دیتا جو تمہارے لئے مباح قرار دیا ہے لیکن اس نے تمہارے لئے آسان بنا دیا ہے اور اس نے تمہارے لئے اصلاح کے ارادہ پر مال کے اختلاط کو مباح قرار دیا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ غالب ہے جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے، چاہے بندوں پر آسان بنا دے یا ان پر مشکل کر دے۔ اور وہ اپنے فضل کے ساتھ ایسے فیصلہ کرتا ہے جس کا تقاضا حکمت کرتی ہے اور اس کی طاقت بڑی وسیع ہے، واللہ اعلم۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ؀

"اور نہ نکاح کرو مشرک عورتوں کے ساتھ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں لے اور بیشک مسلمان لونڈی بہتر ہے (آزاد) مشرک عورت سے اگرچہ وہ بہت پسند آئے تمہیں ع اور نہ نکاح کر دیا کرو (اپنی عورتوں کا) مشرکوں سے یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں ع اور بے شک مومن غلام بہتر ہے (آزاد) مشرک سے، اگرچہ وہ پسند آئے تمہیں وہ لوگ تو بلاتے ہیں دوزخ کی طرف ع اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے جنت اور مغفرت کی طرف ھ اپنی توفیق سے اور کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے حکم لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں لے"

لے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابومرثد غنوی کو مکہ مکرمہ بھیجا تاکہ وہاں سے خفیہ مسلمانوں کو نکال لائے۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 40 (وزارت تعلیم)

جب وہ وہاں آئے تو ایک مشرکہ عورت نے جسے عناق کہا جاتا تھا ان کے بارے سنا۔ وہ زمانہ جاہلیت میں ان کی دوست تھی، چنانچہ وہ ان کے پاس آئی اور کہا اے ابومرثد! کیا تم خلوت اختیار نہیں کرو گے۔ تو آپ نے اسے کہا اے عناق! تیری ہلاکت ہو بیشک اسلام ہمارے اور اس امر کے درمیان حائل ہے۔ پھر اس نے کہا کیا تیرے لئے مناسب ہے کہ تو میرے ساتھ شادی کرلے؟ تو انہوں نے کہا جی ہاں لیکن میں رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس لوٹ کر اس کی اجازت طلب کروں گا۔ تو اس نے کہا کیا تو میرے ساتھ نخرہ کرتا ہے؟ پھر شور مچا دیا اور ان کے خلاف لوگوں کو اپنی مدد کے لئے پکارا۔ لہٰذا انہوں نے آپ کو سخت ترین مارا پیٹا۔ پھر انہوں نے آپ کا راستہ چھوڑ دیا۔ چنانچہ جب آپ مکہ مکرمہ میں اپنا کام پورا کر چکے تو واپس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو اپنا اور عناق کا سارا واقعہ بتلایا اور ساتھ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا میرے لئے حلال ہے کہ میں اس سے شادی کروں؟ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی (1) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ط (اور نہ نکاح نہ کرو مشرک عورتوں کے ساتھ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔) اسی طرح ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور واحدی نے مقاتل سے روایت نقل کی ہے اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ واقعہ اس آیت کے نازل ہونے کا سبب نہیں ہے۔ بلکہ وہ سورۂ نور کی اس آیت اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً الآیۃ، (زانی شادی نہیں کرتا مگر زانیہ کے ساتھ۔) کے نازل ہونے کا سبب ہے۔ اسی طرح ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے اسے حدیث عمر سے نقل کیا ہے۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے اہل کتاب کے حق میں منسوخ ہے۔ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ، (اور پاکدامن عورتیں ان لوگوں کی جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے۔) حالانکہ اس حیثیت سے وہ مشرکات ہیں کہ وہ عزیر اور عیسیٰ علیہما السلام کی عبادت کرتے ہیں۔

ے یعنی عورت چاہے آزاد ہو یا لونڈی بیشک لوگ اللہ تعالیٰ کے غلام اور اس کی لونڈیاں ہیں اور اگرچہ وہ اپنے مال، جمال اور عادات و خصائل کے اعتبار سے تمہیں بہت پسند آئے۔ وَلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ میں واؤ حالیہ ہے اور لو بمعنی ان تعلیل ہے یعنی یہ سابقہ نہی کی علت بیان کرنے کے لئے ہے۔ بغوی نے کہا ہے کہ یہ آیت خنساء کے بارے نازل ہوئی یہ حذیفہ بن یمان کی لونڈی تھی انہوں نے اسے آزاد کیا اور پھر اس سے شادی کرلی (2) واحدی نے واقدی عن ابی مالک کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ عبداللہ بن رواحہ کی سیاہ رنگ کی لونڈی تھی وہ اس پر ایک دن غضبناک ہوئے تو اسے طمانچے دے مارے۔ پھر پریشان ہوگئے تو حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ آپ ﷺ کو بتایا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا وہ کیا ہے؟ اے عبداللہ! تو انہوں نے عرض کی وہ یہ شہادت دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، وہ رمضان المبارک میں روزے رکھتی ہے اور اچھے طریقے سے وضو کر کے نماز پڑھتی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ تو مومنہ ہے۔ پھر عبداللہ نے کہا، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں اسے ضرور آزاد کروں گا اور پھر اس سے شادی کروں گا۔ پس اس وجہ سے مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے انہیں طعنے دیئے اور کہا کیا تو لونڈی سے شادی کرے گا۔ لہٰذا انہوں نے انہیں آزاد مشرکہ عورت کی پیشکش کی۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اس آیت طیبہ سے بذریعہ قیاس یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ ایسی عورت جو متقی اور اخلاق حسنہ کی مالک ہو اگرچہ وہ مفلس اور بدصورت ہو نکاح کے لئے اس سے بہتر ہے جو فاسق ہو اور بداخلاق ہو اگرچہ وہ دولت مند اور خوبصورت ہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "کسی عورت سے چار چیزوں کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 180 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 181 (التجاریہ)

سب نکاح کیا جاتا ہے اس کے مال، حسب ونسب، حسن و جمال اور دین کی وجہ سے لہٰذا تو دیندار کو تلاش کر، تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں' متفق علیہ۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے "خَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ" (دنیوی متاع زیست میں سب سے بہتر نیک عورت ہے)(1) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ "عورتوں سے بچو بیشک بنی اسرائیل کا سب سے پہلا فتنہ عورتیں تھیں"(2) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

۳ے اور تم کسی مسلم عورت کا نکاح نہ کرو۔ وَلَا تُنْكِحُوا الآیۃ میں دو مفعولوں میں سے ایک محذوف ہے اور یہ خطاب اولیاء کو ہے یا حکام کو، یعنی تم انہیں مشرکین کے ساتھ نکاح کرنے سے روکو۔ یہ آیت اس مسئلہ میں محکم ہے کہ مومنہ عورت کا نکاح مشرک مرد کے ساتھ جائز نہیں، چاہے وہ اہل کتاب میں سے ہو یا کوئی اور۔ اس پر اجماع ہے۔

۴ے یعنی مشرک عورتیں اور مرد کفر اور گناہ کی جانب بلاتے ہیں کیونکہ صحبت اور دوستی کا نفوس میں اثر ہوتا ہے اور آدمی اپنے دوست اور ہم نشین کے دین پر ہی ہوتا ہے۔

۵ے اور اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے سبب جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ یا اس کا معنی ہے کہ اولیاء اللہ بلاتے ہیں۔ اس طرح اس میں مضاف محذوف ہے اور ان کی تفخیم شان کے سبب مضاف الیہ کو مضاف کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ یعنی ایسے اعتقادات اور اعمال کی طرف جو جنت اور مغفرت کو واجب کر دیتے ہیں۔ پس اولیاء اللہ بھی اس صحبت کا سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔

۶ے یعنی اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی طرف سے آسانی مہیا کرنے کے سبب یا پھر اس کے فیصلے اور ارادے کے ساتھ۔ اور وہ کھول کر بیان کرتا ہے اپنے اوامر و نواہی کو لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں، یا وہ اس طرح ہو جائیں کہ ان سے نصیحت قبول کرنے کی امید رکھی جائے واللہ اعلم۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝

"اور وہ پوچھتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق ۱ے فرمایئے وہ تکلیف دہ ہے پس الگ رہا کرو عورتوں سے حیض کی حالت میں ۲ے اور نہ نزدیک جایا کرو ان کے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں ۳ے پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو جاؤ ان کے پاس جیسے حکم دیا ہے تمہیں اللہ نے ۴ے بے شک اللہ دوست رکھتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے صاف ستھرا رہنے والوں کو ۵ے"

۱ے حضرت امام بخاری، مسلم اور ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہودیوں کی عورتوں میں سے جب کسی کو حیض آتا تھا تو وہ گھروں میں نہ اس کے ساتھ کھاتے اور نہ مجامعت کرتے۔ اس کے بارے حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے سوال کیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سائل ثابت بن دحداح تھے۔ ابن جریر نے سدی سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ (اور وہ پوچھتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق)(3) اس میں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 475 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 353 (قدیمی) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 122 (وزارت تعلیم)

لمحیض مصدر ہے، جیسا کہ المجیئ اور المبیت۔ معنی یہ ہے کہ وہ تم سے اس عمل کے بارے سوال کر رہے ہیں جو وہ عورتوں کے ساتھ حالت حیض میں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بغیر واؤ کے تین مرتبہ یَسْئَلُوْنَكَ ذکر کیا ہے، پھر تین مرتبہ واؤ کے ساتھ۔ شاید سابقہ سوالات متفرق اوقات میں تھے اور آخری تین ایک وقت میں تھے۔ اسی لئے انہیں لفظ جمع کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ے اے محمد ﷺ! حیض ایسی غلاظت ہے جو ناپسندیدہ اور ناپاک کرنے والی ہے۔ اس میں عورتوں سے علیحدگی اختیار کرنے سے مراد بالاجماع وطی کو ترک کرنا ہے۔ اس سے مراد کھانے پینے میں اختلاط اور پہلو میں سونے وغیرہ کو ترک کرنا نہیں۔ حضرت امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں ذکر کیا ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وطی کے سوا ہر کام کرو (1) حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اور نبی مکرم ﷺ ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے، درآنحالیکہ ہم دونوں جنبی ہوتے۔ آپ ﷺ مجھے ارشاد فرماتے تھے کہ اپنا کپڑا مضبوطی سے باندھ لے۔ پھر آپ میرے ساتھ لیٹ جاتے تھے، درآنحالانکہ میں حائضہ ہوتی (2) اور آپ ﷺ اپنا سر مبارک اعتکاف کی حالت میں میری طرف نکالتے اور میں اسے دھو دیتی حالانکہ میں حائضہ ہوتی، متفق علیہ۔ آپ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے آپ فرماتی ہیں کہ میں حالت حیض میں کوئی مشروب پیتی تھی، پھر میں وہ رسول اللہ ﷺ کو پیش کرتی۔ تو آپ ﷺ میرے منہ رکھنے کی جگہ اپنا منہ رکھتے اور اسے نوش فرما لیتے اور کبھی میں حالت حیض میں گوشت والی ہڈی سے دانتوں کے ساتھ گوشت اتارتی، پھر میں آپ ﷺ کو پیش کر دیتی، تو آپ ﷺ میرے منہ رکھنے کی جگہ پر ہی اپنا منہ رکھتے (3) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ میری گود میں تکیہ لگاتے تھے اس حال میں کہ میں حائضہ ہوتی اور پھر قرآن کریم پڑھنے لگتے (4) متفق علیہ۔ آپ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے مسجد سے ایک چھوٹی چٹائی عطا فرمائی تو میں نے عرض کی بیشک میں حالت حیض میں ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بیشک تیرا حیض تیرے ہاتھوں میں نہیں ہے (5) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک چادر میں نماز ادا فرما رہے تھے اس حال میں کہ اس کا بعض حصہ میرے اوپر تھا اور بعض آپ ﷺ کے اوپر، درآنحالیکہ میں حائضہ تھی (6) متفق علیہ۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں حائضہ ہوئی، تو میں نے اپنے حیض کے کپڑوں کو لیا اور انہیں پہن لیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا "کیا تجھے حیض آنے لگا ہے۔ میں نے عرض کی جی ہاں! تو آپ ﷺ نے مجھے اپنے ساتھ چادر میں داخل کر لیا" (7) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

ے وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ: یہ سابقہ حکم کی تاکید ہے اور غایت کا بیان ہے۔ اس کو عاصم نے ابوبکر، حمزہ اور کسائی کی روایت کے مطابق طاء اور ھاء کی قرأت شد کے ساتھ کی ہے۔ جبکہ دوسروں نے طاء کے سکون اور ھاء کے ضمہ کے ساتھ تخفیف کی صورت میں قرأت کی ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک قرأتوں کا معنی ایک ہے۔ یعنی یہاں تک کہ وہ غسل کر لیں۔ ان کے نزدیک خون حیض ختم ہونے کے بعد غسل کرنے سے پہلے عورت کے قریب جانا بالکل جائز نہیں۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ تخفیف کی قرأت کا معنی یہ ہے: یہاں تک کہ وہ حیض سے پاک ہو لیں اور ان کا خون ختم ہو جائے۔ لہٰذا اس قرأت کے مطابق خون ختم ہونے کے بعد غسل کرنے سے پہلے اس کے قریب جانا جائز ہے اور مشدد قرأت کا معنی ہے غسل کرنا۔ پس اس قرأت کی بناء پر غسل کرنے سے پہلے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 173 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 43 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 143 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 44 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 143 (قدیمی) 6۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 198 (قدیمی) 7۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 46

ان کے قریب جانا جائز نہیں۔ لہٰذا حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ تخفیف کی قرأت کو اس حالت پر محمول کرتے ہیں جبکہ اس کا خون دس دنوں کے بعد ختم ہو اور قرأت تشدید کو دس دنوں سے کم پر محمول کرتے ہیں۔ اس صورت میں ان پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قرأت تشدید غسل سے قبل عورت کے قریب جانے سے روکنے کے لئے ناطق ہے۔ (یعنی اس کے الفاظ اس معنی پر دلالت کرتے ہیں) اور قرأت تخفیف کا مفہوم غسل سے قبل قربت کے مباح ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ حالانکہ مفہوم منطوق کے معارض نہیں ہوتا؟

حالت حیض میں وطی کی حرمت پر اجماع ہونے کے بعد ائمہ کے مابین اختلاف اس بات میں ہے کہ آیا جس نے اس فعل کا ارتکاب کیا، کیا اس پر کفارہ واجب ہوگا یا نہیں؟ تو اس بارے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا بلکہ اس کے لئے استغفار کافی ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا قول بھی یہی ہے۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ ایک دینار صدقہ کرے گا۔ اور اگر اس کے پاس دینار نہ ہو تو نصف دینار صدقہ کرے گا اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پہلے قول میں کہا ہے کہ اگر کسی نے خون حیض کے ابتدائی ایام میں عورت سے قربت اختیار کی تو اس پر ایک دینار صدقہ لازم ہوگا اور اگر آخری ایام میں ایسا کیا تو پھر نصف دینار صدقہ ہوگا۔ اس لئے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حضور نبی کریم ﷺ سے اس آدمی کے بارے حدیث نقل کرتے ہیں جس نے حالت حیض میں اپنی بیوی سے مقاربت اختیار کی کہ وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے گا(1) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس سند سے نقل کیا ہے۔ عن یحییٰ عن شعبة عن الحکم عن عبدالحمید عن مقیم عنہ۔ اسے اہل السنن اور دارقطنی نے روایت کیا ہے، اور مقیم کے علاوہ اس حدیث کے تمام رواۃ سے صحیحین میں احادیث نقل کی گئی ہیں جبکہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مقیم سے بھی احادیث نقل کی ہیں اور ابن قطان، حاکم اور ابن دقیق العید السعید نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ لہٰذا جنہوں نے اسے موقوفاً روایت کیا ہے، ان کی روایت قطعاً نقصان دہ نہیں۔ کیونکہ مرفوع کی صورت میں ثقہ راوی کی زیادتی مقبول ہے۔ اور علماء نے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلے قول کے لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب خون زرد رنگ میں ہو تو صدقہ نصف دینار ہے اور اگر سرخ رنگ میں ہو تو پھر ایک دینار ہے(2) اس حدیث کا دارومدار عبدالکریم ابی امیہ پر ہے اور اس کے متروک ہونے پر اجماع ہو چکا ہے بلکہ ابوایوب سجستانی اسے جھوٹا کہتے تھے اور احمد اور یحییٰ نے کہا یہ کوئی شی نہیں۔ جماع کے بغیر تحت الازار مقام سے استمتاع کرنے کے بارے بھی ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ جائز ہے۔ جبکہ جمہور نے کہا ہے کہ یہ جائز نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ وطی کے علاوہ سب کچھ کرو اور حضرت عکرمہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعض ازواج مطہرات سے نقل کرتے ہیں کہ "حضور نبی کریم ﷺ جب حائضہ سے کسی شی کا ارادہ فرماتے تو اس کی فرج پر کوئی چیز ڈال دیتے"(3) اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے۔ اور جمہور نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی۔ حالت حیض میں میرے لئے میری بیوی کا کونسا مقام حلال ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ جگہ جو ازار سے اوپر ہے اور اس سے بھی پرہیز کرنا افضل ہے۔" اسے رزین نے روایت کیا ہے۔ محی السنہ نے کہا ہے اس کی اسناد قوی نہیں ہے اور عبداللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے اور اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اور حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں سوال کیا کہ "میرے لئے میری بیوی

1۔ الدرالمنثور، جلد 1، صفحہ 465 (العلمیہ) 2۔ الدرالمنثور، جلد 1، صفحہ 465 (العلمیہ) 3۔ الدرالمنثور، جلد 1، صفحہ 463 (العلمیہ)

کی کونسی جگہ حلال ہوتی ہے جبکہ وہ حالت حیض میں ہو؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو اس پر اس کے ازار کو مضبوطی سے باندھ لے پھر اس کے اوپر جو چاہے کرے"(1) اسے امام مالک اور دارمی نے مرسلاً روایت کیا ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ اگر آدمی اپنے جذبات پر قابو رکھ سکتا ہو تو پھر چادر کے اندر فرج کے علاوہ دیگر جگہ کو مس کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ آیت طیبہ میں جماع سے نہی فرمائی گئی ہے اور حقیقت اور مجاز کو جمع کرنا جائز نہیں ہوتا۔ ورنہ ترک واجب آئے گا کیونکہ جو چراگاہ کے اردگرد گھومتا ہے وہ اس میں واقع بھی ہو سکتا ہے اور اس امر پر اجماع ہے کہ حیض نماز کے جواز اور وجوب کے مانع ہے، لیکن روزہ رکھنے کے جواز کے مانع تو ہے مگر اس کے وجوب کے مانع نہیں۔ اسی لئے نماز کی قضاء نہیں کی جاتی اور روزے کی قضاء کی جاتی ہے۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حالت حیض میں ہوا کرتی تھیں، تو آپ ﷺ ہمیں روزوں کی قضاء کا حکم فرماتے تھے اور نماز کی قضاء کا حکم نہیں دیتے تھے(2) اسے مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث مشہور ہے اس معنی کو کثیر صحابہ کرام سے صراحۃً اور دلالۃً روایت کیا گیا ہے اور صحیحین میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے کیا ایسا نہیں کہ جب اسے حیض آئے تو وہ نہ نماز پڑھے اور نہ روزہ رکھے(3) اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ جب حیض آ جائے تو نماز چھوڑ دے اور حیض مسجد میں داخل ہونے طواف کرنے، قرآن کریم کو مس کرنے اور اس کی قرأت کرنے کے بالاجماع مانع ہے۔ رب کریم نے ارشاد فرمایا۔ لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (اس کو نہیں چھوتے مگر وہی جو پاک ہیں۔) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا" ان گھروں کو مسجد سے (دوسری سمت) پھیر دو، بیشک میں حائضہ اور جنبی کے لئے مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا"(4) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا" حائضہ اور جنبی قرآن کریم میں سے کوئی شئی نہ پڑھیں"(5) اسے ترمذی، ابن ماجہ اور دار قطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے راویت کیا ہے۔ اور اس کی شاہد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ اسے دار قطنی نے مرفوعاً نقل کیا ہے اور ان دونوں حدیثوں کی اسناد میں کلام ہے، واللہ اعلم۔

ے "فَاِذَا تَطَهَّرْنَ" اس مقام پر تمام قراء اسے مشدد پڑھنے پر متفق ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وطی کے مباح ہونے کے لئے غسل کرنا شرط ہے۔ "فَاْتُوْهُنَّ" کا مفہوم ہے کہ تم ان سے جماع کرو یعنی اللہ تعالیٰ نے پاکیزگی کے بعد جماع کا حکم دیا ہے۔ جیسے تمہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے یعنی فرج میں نہ کہ دبر میں۔ ہم نے یہاں اباحت کا ذکر کیا ہے اس لئے کہ یہاں صیغہ امر بالاجماع اباحت کے لئے ہے نہ کہ وجوب کے لئے۔ حضرت مجاہد، قتادہ اور عکرمہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے جس مقام سے علیحدہ رہنے کا حکم دیا ہے وہ فرج ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی قول کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں مِنْ فِیْ کے معنی میں ہے۔ یعنی فِیْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں جس محل میں داخل ہونے کا حکم دیا ہے وہ فرج ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے "اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ ای فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ" اور ابن حنفیہ نے کہا ہے کہ تم ان سے جماع کرو حلال سمت سے نہ کہ ممنوع سمت سے۔

ے بیشک اللہ تعالیٰ کفر اور معاصی سے توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور گندگی سے صاف ستھرا رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ مثلاً حائضہ سے مجامعت کرنا، دبر میں وطی کرنا، احداث اور اخباث وغیرہ۔ عورتوں کے ساتھ ان کی دبر میں وطی کا حرام ہونا اسی آیت

1۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 57 (التراث العربی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 97 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 44 4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 30 (وزارت تعلیم) 5۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 19 (و۔ت)

طیبہ سے اشارۃً ثابت ہے یا پھر حیض والی عورت سے وطی کے حرام ہونے پر قیاس کرنے سے ثابت ہے کیونکہ اس میں اسی طرح غلاظت ہے جیسے حیض کے دوران وطی کرنے میں غلاظت ہے۔ لیکن وطی مطلقاً غلاظت ہے، چاہے قُبل میں ہو یا دُبر میں، چاہے وہ مرد کی ہو یا عورت کی، اسی وجہ سے اس کے سبب غسل واجب ہو جاتا ہے لیکن نسل کو باقی رکھنے کے لئے ضرورۃً قُبل میں وطی کو مباح قرار دیا گیا ہے اور پھر اس اباحت کے لئے چند شرائط مقرر کی گئی ہیں۔ مثلاً نکاح ہونا، محرم نہ ہونا، رحم کا خالی ہونا، حیض سے پاک ہونا وغیرہ۔ جبکہ دُبر میں وطی کی کوئی ضرورت نہیں چاہے، مفعول بہٖ (جس کے ساتھ وطی کی گئی) مرد ہو یا عورت۔ لہٰذا یہ غلاظت کی علت کے سبب حرام باقی رہے گی۔ مرد کی دُبر میں مرد کی وطی کا حرام ہونا نصوص قطعیہ اور اجماع سے ثابت ہے اور اسی عمل کے سبب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم ہلاک ہوئی۔ اسی طرح آدمی کا عورت کی دُبر میں وطی کرنا بھی حرام ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے قول فَأْتُوهُنَّ کو مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ سے مقید کیا ہے۔ اور اذیت کی علت کے سبب جماع کی حرمت کے وہم کو دور کرنے کے لئے اور اباحت کی ضرورت کی وجہ بیان کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے بعد اپنا یہ قول ذکر فرمایا۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٢٣﴾

"تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں [1] سو تم آؤ اپنے کھیت میں جس طرح چاہو [2] اور پہلے پہلے کرلو اپنی بھلائی کے کام [3] اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ تم ملنے والے ہو اس سے اور (اے حبیب) خوشخبری دو مومنوں کو [4]"

[1] یعنی تمہارے لئے کھیتی کا محل ہیں۔ اس میں عورتوں کو کھیت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اس بناء پر کہ ان کی رحموں میں پھینکا جانے والا نطفہ بیج کی مثل ہے۔ یعنی تمہارے لئے ان کے ساتھ وطی کرنا نسل کو باقی رکھنے کے لئے ضرورۃً مباح ہے۔

[2] "فَأْتُوا حَرْثَكُمْ" یعنی ان کی فرجوں میں جماع کرو جیسے تم چاہو۔ یہ قول فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ کا بیان ہے۔ اس میں لفظ أَنّٰى كيف اور اين کے معنی میں مشترک ہے۔ لیکن یہاں این کے معنی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ محل کے عموم پر دلالت کرتا ہے اور یہاں محل حرث تو صرف ایک ہے۔ لہٰذا یہ متعین ہو گیا کہ یہ کیف کے معنی میں ہے اور اسی کا تقاضا وہ تحقیق بھی کرتی ہے جو آیت طیبہ کے سبب نزول کے بارے ہم ذکر کریں گے۔ واللہ اعلم۔

ہم نے یہ جو کہا ہے کہ عورتوں کے ساتھ ان کی دُبروں میں وطی کرنا حرام ہے۔ یہ قول امام اعظم ابوحنیفہ، امام احمد اور جمہور اہل سنت کا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے عورت کی دُبر میں وطی کے جواز کا قول کیا ہے، حالانکہ ان کے اکثر اصحاب ان کے بارے یہ نظریہ ہونے کا انکار کرتے ہیں اور صحیح بات یہی ہے کہ بیشک ان کا یہ مذہب تھا پھر انہوں نے یا ان کے اصحاب نے اس سے رجوع کر لیا اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے اس میں دو قول ہیں۔ آپ کا پہلا قول یہ ہے جسے ابن عبدالحکم کے واسطہ سے آپ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ سے اس کی تحریم اور تحلیل میں کوئی بھی صحیح روایت موجود نہیں اور قیاس یہی ہے کہ یہ عمل حلال ہے۔ گویا کہ انہوں نے اسے اس صورت پر قیاس کیا ہے کہ کسی نے اپنا ذکر عورت کی رانوں یا ہاتھ میں داخل کیا ہو تو اس کے لئے ایسا کرنا حلال ہے۔ حاکم نے اپنی سند کے ساتھ ابن عبدالحکم سے روایت نقل کی ہے کہ اس نے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے عورت کی دُبر میں وطی کرنے کے مسئلہ کے بارے میں گفتگو کی تو انہوں نے کہا کہ محمد بن حسن نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ تو میں

نے انہیں کہا اگر تم غلبہ حاصل کرنے اور روایات کو صحیح بنانے کا ارادہ رکھتے ہو اگرچہ وہ صحیح نہ ہوں تو پھر تم زیادہ جانتے ہو اور اگر تم انصاف کے ساتھ کلام کرو تو پھر میں تمہارے ساتھ گفتگو کرتا ہوں۔ تو انہوں نے کہا میں منصفانہ کلام کا ارادہ رکھتا ہوں۔ پھر میں نے کہا کس شئ کے سبب تم نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ تو انہوں نے کہا رب کریم کے اس ارشاد گرامی کی وجہ سے" فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ، فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ "اس میں کھیتی صرف فرج میں بوئی جا سکتی ہے۔ میں نے کہا کیا اس کے سوا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ حرام ہے؟ تو انہوں نے کہاں جی ہاں! پھر میں نے کہا اس کے بارے تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر کوئی عورت کی پنڈلیوں کے درمیان یا بطن کے نیچے وطی کرے یا عورت اس کا ذکر اپنے ہاتھ میں پکڑ لے کیا اس میں حرث کا معنی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کیا تم اسے حرام قرار دیتے ہو؟ تو انہوں نے کہا نہیں۔ پھر میں نے کہا اس سے تم کیونکر استدلال کر سکتے ہو جس میں حجت بننے کی قوت ہی نہیں۔ تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ (اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔) میں نے کہا اس قول سے وہ اس امر کے جواز کا استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے جو اپنی شرمگاہ کو اپنی بیوی اور لونڈی کے سوا سے محفوظ رکھتے ہیں۔ پس میں نے کہا کہ تم کہتے ہو کہ یہ اپنی بیوی اور لونڈی سے حفاظت کرنے والے کے لئے ہے۔ پھر میں نے کہا کہ جب ہم نے ذکر کیا ہے کہ عورتوں کی دبر میں وطی کے حرام ہونے کا سبب غلاظت ہے، تو یہ سبب وہاں موجود نہیں۔ جس نے عورت کی پنڈلیوں کے درمیان یا اسی جیسے کسی اور مقام پر وطی کی۔ نتیجۃً انہوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قیاس کو غالب قرار دیا۔ لیکن پھر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا۔ حاکم نے کہا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اپنے پرانے قول میں ایسا کہا کرتے تھے لیکن آپ کے جدید اور مشہور قول میں یہ ہے کہ آپ نے بھی اسے حرام ہی کہا ہے اور ربیع نے کہا ہے کہ ابن عبد الحکم نے کذب بیانی سے کام لیا ہے۔ قسم ہے اس ذات اقدس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں اس عمل کو حرام قرار دیا ہے اور آپ سے ایک جماعت نے اسے نقل کیا ہے۔ ان میں سے الماوردی نے الحاوی میں اور ابونصر بن الصباح نے الشامل میں اسے بیان کیا ہے وغیرہم۔ ربیع نے ابن عبد الحکم کی جو تکذیب کی ہے اس کے بارے شیخ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس کا کوئی معنی نہیں۔ کیونکہ وہ اسے بیان کرنے میں منفرد نہیں بلکہ آخر میں عبد الرحمٰن نے بھی اس کی متابعت اختیار کی ہے اور تحقیق یہی ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس بارے میں دو قول ہیں اور قول جدید ہی مرجوع الیہ ہے جس میں آپ نے اس عمل کے حرام ہونے کے بارے میں جمہور سے موافقت کی ہے۔

دبر میں وطی کرنے کے حرام ہونے کے متعلق کئی احادیث وارد ہیں۔ ابن جوزی نے کہا ہے کہ صحابہ کرام کی ایک پوری جماعت نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے۔ ان میں حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت خزیمہ بن ثابت، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص، حضرت ابن مسعود، حضرت عقبہ بن عامر، حضرت براء بن عازب، حضرت طلق بن علی، حضرت ابوذر اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حدیث امام نسائی اور بزار نے اس سند سے نقل کی ہے" زمعه بن صالح عن ابن طاؤس عن ابيه عن الهاد عن عمر "اس میں زمعہ ضعیف ہے۔ اسے امام احمد اور ابو حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے ضعیف کہا ہے اور امام ذہبی رحمۃ اللہ عنہ نے کہا کہ یہ صالح الحدیث ہے۔ اس روایت کے مرفوع یا موقوف ہونے کے بارے اختلاف ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث امام ترمذی، نسائی

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 472 (العلمیہ)

اور ابن ماجہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے " کہ اللہ تعالیٰ حق کہنے سے حیا نہیں فرماتا، تم اپنی عورتوں کی دبروں میں وطی نہ کرو"(1) حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث یہ ہے کہ ایک آدمی نے حضور نبی کریم ﷺ سے عورتوں کے ساتھ ان کی دبر میں وطی کرنے کے بارے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا حلال ہے۔ جب وہ آدمی واپس جانے لگا تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا تو نے کیسے کہا؟ یعنی دو سوراخوں میں سے کس میں؟ اگر پیچھے کی جانب سے قبل میں وطی ہو تو یہ صحیح ہے اور اگر پیچھے کی جانب سے دبر میں وطی ہو تو یہ صحیح نہیں ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ حق کہنے سے حیا نہیں فرماتا کہ "تم عورتوں کے ساتھ ان کی دبر میں وطی نہ کرو"(1) اسے امام شافعی، احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی عمرو بن احیحہ ہے جو مجہول الحال ہے اور امام نسائی نے اسے اس سند سے نقل کیا ہے۔ "عن وهب بن سويد بن هلال عن ابيه عن علي بن السائب عن حصين بن محصين عن هرمي بن عبدالله عن خزيمه" اور هرمي کی سند سے ہی اسے احمد، نسائی اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی روایت کیا ہے حالانکہ اس کا حال معلوم نہیں۔ بزار نے کہا ہے میں اس بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں جانتا اور جو بھی خزیمہ بن ثابت سے مروی ہے وہ غیر صحیح ہے۔ اسی طرح حاکم نے حافظ ابوعلی نیشاپوری سے اور اس کی مثل نسائی سے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں کو قبول کیا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ ملعون ہے جس نے عورت کے ساتھ اس کی دبر میں وطی کی(2) اور ایک روایت میں الفاظ اس طرح ہیں " لَا يَنظُرُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلٰى رَجُلٍ اَتٰى اِمْرَاَةً فِيْ دُبُرِهَا " (اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس آدمی کی طرف نہیں دیکھے گا جس نے عورت کے ساتھ اس کی دبر میں وطی کی) اسے امام احمد، ابوداؤد اور بقیہ اصحاب سنن نے اس سند سے روایت کیا ہے۔ "عن سهيل بن ابي صالح عن الحارث بن مخلد عن ابي هريرة"۔ اور بزار نے بھی اسے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ حارث بن مخلد مشہور نہیں ہے۔ ابن قطان نے کہا ہے اس کا حال معلوم نہیں اور اس میں سہیل کے بارے اختلاف ہے۔ دارقطنی اور ابن شاہین نے اسے اس سند سے نقل کیا ہے۔ " اسماعیل بن عیاش نے سہیل سے اس نے محمد بن منکدر سے اور اس نے جابر سے اور ابن عدی نے اس سند سے نقل کیا ہے۔" رواه عمر مولى عفرة عن سهيل عن ابيه عن جابر" یہ سند ضعیف ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی ایک دوسری سند بھی ہے۔ اسے امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ نے اس سند سے نقل کیا ہے۔ "حماد بن سلمه عن حكيم الاثرم عن أبي تميمة عن ابي هريرة رضي الله عنه" ان کے الفاظ اس طرح ہیں کہ جس نے حیض والی عورت سے وطی کی یا کسی عورت سے اس کی دبر میں یا کوئی کاہن کے پاس آیا اور اسے سچ تسلیم کیا جو کچھ وہ کہتا رہا تو اس نے اس کے ساتھ کفر کیا جو کچھ حضور نبی کریم ﷺ پر نازل کیا گیا(3) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ حدیث غریب ہے، ہم اسے حدیث حکیم کے سوا جانتے ہی نہیں اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ابوتمیمہ کا سماع حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے معروف نہیں۔ بزار نے کہا یہ حدیث منکر ہے اور حکیم قابل حجت نہیں، وہ جس حدیث کے ساتھ منفرد ہو اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کی ایک تیسری سند بھی ہے۔ جسے نسائی نے زہری عن ابی سلمہ عن ابی ہریرہ کی روایت سے نقل کیا ہے، حمزہ الکنانی نے کہا ہے یہ حدیث منکر ہے۔ اس کے راوی عبدالملک ہیں جس میں دحیم اور ابوحاتم وغیرہ نے کلام کی ہے۔ اور محفوظ یہی ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ اس کی ایک چوتھی سند بھی ہے جسے نسائی نے اس طرح نقل کیا ہے "بكر بن خنيس عن ليث عن مجاهد عن ابي هريرة" الفاظ اس طرح ہیں" کہ جس کسی نے مردوں یا عورتوں میں سے ان

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 471 (العلمیہ) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 301 (وزارت تعلیم) 3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 19 (مکتبہ امدادیہ ملتان)

کی دُبر میں وطی کی اس نے کفر کیا۔" اس میں بکر اور لیث دونوں راوی ضعیف ہیں۔ اس کی پانچویں سند اس طرح ہے "عبدالله بن عمر بن حبان عن مسلم بن خالد زنجی عن علاء عن ابیه عن ابی هریرة رضی الله عنه"۔ الفاظ اس طرح ہیں "کہ وہ ملعون ہے جس نے عورتوں کے ساتھ ان کی دُبروں میں وطی کی" (1) اسے احمد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ نسائی اور دوسروں نے مسلم کو ضعیف قرار دیا ہے اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ بہت سچ بولنے والا ہے اور اس کی توثیق یحییٰ بن معین وغیرہ نے کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ترمذی، نسائی، ابن حبان، احمد اور بزار رحمہم اللہ تعالیٰ نے کثیر بن عباس کی سند سے نقل کی ہے۔ بزار نے کہا ہے ہم اسے نہیں جانتے جو ابن عباس سے وہب کی نسبت احسن سند سے روایت کرتا ہو۔ ابو خالد الاحمر ضحاک بن عثمان عن محمد بن سلیمان عن کریب کی سند سے روایت کرنے میں منفرد ہے۔ اسی طرح ابن عدی نے کہا ہے اور نسائی نے اسے ھناد عن وکیع عن ضحاک کی سند سے موقوفاً روایت کیا ہے اور یہ ان کی نزدیک مرفوع کی نسبت زیادہ صحیح ہے اور عبدالرزاق نے اسے ایک دوسری سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً اس طرح روایت کیا ہے کہ معمر ابن طاؤس سے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عورت کے ساتھ اس کی دُبر میں وطی کرنے کے بارے پوچھا، تو آپ نے فرمایا تو کفر کے بارے مجھ سے سوال کر رہا ہے (2) نسائی نے اسے ابن مبارک عن معمر کی روایت سے نقل کیا ہے۔ اور اس کی سند قوی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیث امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے آدمی کے بارے سوال کیا گیا جو عورت سے اس کی دُبر میں وطی کرتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا "یہ لواطت صغریٰ ہے" (3) اسے نسائی نے نقل کیا ہے اور اس کی علت بھی بیان کی ہے اور محفوظ یہ ہے کہ یہ عبداللہ بن عمرو کا قول ہے۔ جیسا کہ عبدالرزاق وغیرہ نے اسے روایت کیا ہے۔ اسی باب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے جسے اسماعیل نے اپنی معجم میں نقل کیا ہے اور اس میں ایک راوی یزید الرقاشی ہے اور وہ ضعیف ہے اور ابی بن کعب سے حسن بن عرفہ کی خبر انتہائی ضعیف سند کے ساتھ مروی ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ابن عدی کے نزدیک انتہائی کمزور سند کے ساتھ مروی ہے اور عقبہ بن عامر سے مروی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی سند میں ایک راوی ابن لھیعہ ہے۔ یہ تمام کی تمام احادیث اگرچہ ضعیف ہیں جیسا کہ آپ نے سنا لیکن ان میں سے بعض بعض کی تقویت کا سبب بنتی ہیں جس کے ذریعے ان سے حضور نبی کریم ﷺ سے اس عمل سے روکنے کے بارے ایسا علم قطعی حاصل ہوتا ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ لہٰذا اس کے بارے قول کرنا واجب ہے۔ والله اعلم۔

جنہوں نے اس عمل کے مباح ہونے کا قول کیا ہے انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس قول سے استدلال کیا ہے۔ جو اسانید کثیرہ سے روایت ہونے کے سبب صحیح ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ "عورتوں کے ساتھ ان کی دُبروں میں وطی کرنے کے بارے نازل ہوا ہے" (4) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح طبرانی نے اسے آپ ہی سے سند جید کے ساتھ روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ یہ آیت دُبر میں وطی کرنے کی رخصت کے بارے نازل ہوئی۔ اور آپ رضی اللہ عنہ سے اس طرح بھی انہوں نے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ مقدس میں ایک آدمی نے اپنی بیوی کی دُبر میں جماع کیا، تو لوگوں نے اسے روکا۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی (5) اسی طرح ابن جریر،

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 472 (العلمیہ)　2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 473 (العلمیہ)　3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 472 (علمیہ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 649 (حاشیہ) (وزارت تعلیم)　5۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 474 (العلمیہ)

ابویعلی اور ابن مردویہ نے عبداللہ بن نافع عن ہشام بن سعد عن زید بن اسلم عن عطاء بن یسار کی سند سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ ایک آدمی نے اپنی عورت کے ساتھ اس کی دُبر میں جماع کیا تو لوگوں نے اس کے سبب اس پر عیب لگایا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ"(1) میں کہتا ہوں کہ یہ حضرت ابن عمر اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما کا وہم ہے ان دونوں نے آیت کی تاویل میں خطا کی ہے اگر اس آیت کے نازل ہونے کا سبب یہ ہوتا تو حکم واقعہ کے مطابق ہوتا۔ حالانکہ رب کریم کے اس ارشاد: فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ میں حرث (کھیت) میں واقع ہونے کا حکم ہے، نہ کہ صرف دُبر میں واقع ہونے کا اور وہ محل حرث ہے ہی نہیں۔ لہٰذا اس سے دبر میں وطی کے مباح ہونے کی حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ نافع کو وہم ہوا ہے جبکہ انہوں نے عبداللہ بن حسن سے روایت کی۔ بیشک وہ سالم بن عبداللہ سے ملے اور ان کو کہا اے ابو عمر! وہ کونسی حدیث ہے جو حضرت نافع حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ بیشک وہ عورتوں کے ساتھ ان کی دُبروں میں وطی کرنے کو حرج گمان نہیں کرتے۔ تو انہوں نے کہا اس بندے نے جھوٹ بولا ہے اور خطا کی ہے، حالانکہ عبداللہ نے کہا ہے کہ وہ عورتوں کی فرجوں میں ان کے پیچھے کی جانب سے وطی کر سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ سالم کا یہ قول صحیح نہیں ہے کیونکہ اس قول کو نافع ابن عمر سے نقل کرنے میں منفرد نہیں ہیں بلکہ اسے تو زید بن اسلم، عبید اللہ بن عبداللہ بن عمر اور سعید بن یسار وغیرہ نے بھی ان سے نقل کیا ہے۔ جیسا کہ شیخ ابن حجر نے ذکر کیا ہے۔ لہٰذا صحیح یہ ہے کہ یہ وہم ابن عمر کے بارے ہے اور ابن عمر پر وہم کا حکم رئیس المفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی لگا دیا ہے۔ ابوداؤد اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ابن عمر کو جو وہم لاحق ہوا اس پر اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ انصار کے اس قبیلے میں رہنے والے وہ لوگ تھے جو یہود کے اس قبیلے کے ساتھ رہنے والے اہل وثن (بت پرست) تھے اور یہودی اہل کتاب تھے وہ علم میں انہیں اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، لہٰذا بہت سے کاموں میں ان کی اقتداء کرتے تھے اور اہل کتاب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ایک جانب سے عورتوں کے پاس آتے تھے اور اس طرح عورت ان کے نیچے چھپ جاتی تھی۔ لہٰذا انصار کے اس قبیلے نے بھی ان سے یہی طریقہ اخذ کیا اور قریش کے اس قبیلے کے لوگ عورتوں کے پاس جاتے تھے اور ان سے لذت حاصل کرتے تھے کبھی آگے سے، کبھی پیچھے سے اور کبھی چت لیٹنے کی حالت میں۔ پھر جب مہاجرین مدینہ طیبہ آئے تو ان میں سے ایک آدمی نے ایک انصاری عورت سے شادی کی۔ جب وہ اس سے ایسا کرنے لگا تو اس نے ایسا کرنے سے اس مرد کو روک دیا اور کہا بیشک ہمارے ہاں تو ایک جانب پر کیا جاتا تھا۔ لہٰذا ان دونوں کا معاملہ چلا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ یعنی تم اپنے کھیت میں آؤ سامنے سے، پیچھے سے اور چت لیٹنے کی حالت میں یعنی ان تمام صورتوں میں محل ولد میں وطی کر سکتے ہو۔

اس آیت کا سبب نزول اس طرح بھی ہے: امام بخاری، ابوداؤد اور ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہود کہا کرتے تھے کہ جب کوئی اپنی عورت سے پیچھے کی جانب سے وطی کرے گا تو اس سے بھینگا بچہ پیدا ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کی تکذیب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ(2) یعنی فرج میں جیسے تم چاہو وطی کر سکتے ہو۔ تو اس سے مراد کھیتی کے لئے محل ولد ہے۔ اسی طرح احمد رحمۃ اللہ علیہ نے عبدالرحمٰن بن سابط سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا میں حفصہ بنت عبدالرحمٰن کے پاس حاضر ہوا اور کہا۔ میں آپ سے ایسے امر کے بارے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ حیاء محسوس ہو رہی ہے آپ سے کیسے

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 475 (العلمیہ)　　2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 649 (وزارت تعلیم)

پوچھوں۔ تو انہوں نے کہا اے بھتیجے حیا نہ کر۔ تو میں نے کہا عورتوں کے پاس ان کی پیچھے کی جانب سے آنے کا معاملہ کیا ہے؟ تو انہوں نے جواباً کہا: یہود کہا کرتے تھے کہ جو اس طرح عورت کے قریب ہوا اس کا بچہ بھینگا ہوگا۔ پھر جب مہاجرین مدینہ طیبہ آئے تو انہوں نے انصار کی عورتوں سے نکاح کئے پس جب وہ ان کے قریب ہوئے ایک عورت نے انکار کر دیا اور کہا ہم ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔ یہاں تک کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوں گی۔ لہٰذا وہ عورت حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئی اور آپ ﷺ کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا بیٹھو ابھی رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے ہیں۔ پس جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، تو انصاریہ نے آپ ﷺ سے اس کے بارے سوال کرنے میں حیا محسوس کی، لہٰذا وہ باہر نکلی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے اس کے بارے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا انصاریہ کو بلاؤ چنانچہ اسے بلایا گیا، تو آپ ﷺ نے اس پر یہ آیت تلاوت فرمائی: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ صماماً واحداً(1) امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں ہلاک ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تجھے کس نے ہلاک کیا ہے؟ عرض کی آج کی رات میرے پاؤں پھر گئے ہیں (یعنی میں نے پیچھے کی سمت سے جماع کیا ہے) تو اس کے بارے کوئی حکم وارد نہیں تھا کہ اتنے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرما دی اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" (اپنی بیوی کے پاس) آگے کی جانب سے آؤ اور پیچھے کی جانب سے آؤ لیکن دُبر اور حیض والی عورت سے بچو"(2) تو اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر اپنے اس ارشاد سے کی "اَقْبِلْ وَاَدْبِرْ وَاتَّقِ الدُّبُرَ وَالْحَيْضَةَ" جیسا کہ آپ ﷺ نے "فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ" کی تفسیر اپنے اس قول سے فرمائی "اِصْنَعُوْا كُلَّ شَيْءٍ اِلَّا النِّكَاحَ" اگرچہ اس آیت کا ظاہر عورتوں کے ساتھ کھانے پینے میں اختلاط کے جائز ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ لہٰذا اس سے صراحۃً دبر کے خلاف حکم ظاہر ہوگا جو ابن عبد الحکم نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت دُبر میں وطی کو حرام کرنے والی نہیں جیسا کہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پنڈلیوں میں وطی کرنا حرام ہے۔

ع یعنی تم نکاح (وطی) سے صرف جلدی حاصل ہونے والی لذت کا ارادہ نہ کرو بلکہ اس سے ان منافع کا قصد کرو جو دین کی طرف راجع ہیں مثلاً فرج کا محفوظ ہو جانا، ایسا نیک بچہ جو اس کے لئے دعا و استغفار کرتا رہے اور اس میں افراط نہ ہو کیونکہ ایسے مباح امور جن کے ساتھ نیت صحیحہ صالحہ مل جائے وہ عبادت ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک کی بضع میں صدقہ ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم سے ہر ایک جب اپنی شہوت کو پورا کرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے لئے اس پر اجر بھی ہوتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا" تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر وہ اسے حرام محل میں پورا کرتا تو کیا اس میں اس پر بوجھ (گناہ) ہوتا؟ تو اسی طرح جب وہ اسے حلال محل میں پورا کرتا ہے تو اس کے لئے اس میں اجر ہے"(3) اسے مسلم نے ابوذر کی حدیث میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا" جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین عمل (ختم نہیں ہوتے) صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے نفع حاصل کیا جا رہا ہو اور ایسا صالح اور نیک بچہ جو اس کے لئے دعا کرتا رہے"(4) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مسلمانوں میں سے جس کسی کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں آگ اسے صرف قسم کے کفارہ کے لئے مس کرتی ہے،(5) متفق علیہ۔ آپ ہی سے روایت

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 469 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 469 (العلمیہ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 325 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 41 (قدیمی)
5۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 167 (وزارت تعلیم)

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انصاری عورتوں کو ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جس کسی کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں اور وہ اس پر صبر کرتی ہے تو وہ جنت میں داخل ہوگی۔ ان میں سے ایک عورت نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! "کیا دو بچے بھی فوت ہو جائیں (تو ایسا ہی ہوگا) تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں دو بچے بھی فوت ہو جائیں تو بھی" (1) اسے مسلم نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت ہے کہ میری امت میں سے جس کے دو نابالغ بچے فوت ہو گئے تو اللہ تعالیٰ ان کے سبب اسے جنت میں داخل فرمائے گا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی، آپ ﷺ کی امت میں سے جس کسی کا ایک بچہ فوت ہو جائے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ بھی جس کا ایک بچہ فوت ہو جائے، الحدیث (2) اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ قول باری تعالیٰ "وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ" کا عطف "فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ" پر عطف تفسیری ہو اور اس کا معنی یہ ہو کہ تمہارا اپنے نفسوں کے لئے اپنی کھیتیوں میں آنا اس کا پیش خیمہ ہے کہ صالح اولاد تمہارے لئے استغفار کرے، دعائیں کرے یا پھر وہ پیشرو ثابت ہو اور اسی سے نکاح کے فوائد ظاہر ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس کی نیت صالحہ نہ بھی ہو۔ اور عطاء اور مجاہد نے کہا ہے کہ اس سے مراد جماع کے وقت بسم اللہ شریف اور دعا پڑھنا ہے۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تم میں سے کوئی اپنی اہلیہ کے پاس آنے کا ارادہ کرے تو کہے "بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا" (اے اللہ تو ہمیں شیطان سے محفوظ فرما اور شیطان کو اس سے دور رکھ جو تو نے ہمیں عطا فرمایا) بیشک اس طرح اگر ان دونوں کے درمیان بچہ پیدا ہوگا تو شیطان اسے کبھی بھی ضرر نہیں پہنچا سکے گا (3)۔

کے گناہوں سے اجتناب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ڈرو تا کہ وہ تمہیں تمہارے اعمال کے بدلے جزاء دے۔ اگر وہ اعمال اچھے ہوں تو اچھی جزاء دے اور اگر برے ہوں تو بری جزاء دے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ بندۂ مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ اگر اسے خوشی نصیب ہو اور یہ شکر کرے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے اور اگر اسے تکلیف پہنچے یہ صبر کرے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے (4)۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

"اور نہ بناؤ اللہ (کے نام) کو آڑ (اپنی) ان قسموں کے لئے جو تم کھاتے ہو کہ نیکی نہ کرو گے اور پرہیزگاری نہ کرو گے اور صلح نہ کراؤ گے لوگوں میں اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا جاننے والا ہے"

لے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ عبد اللہ بن رواحہ اور ان کے بہنوئی بشیر بن نعمان انصاری کے درمیان کسی شی پر اختلاف ہو گیا تو عبد اللہ بن رواحہ نے یہ قسم اٹھالی کہ وہ اس کے گھر داخل نہیں ہوں گے، اس سے کلام نہیں کریں گے اور اس کے اور اس کے مخالفین کے درمیان صلح نہیں کرائیں گے اور جب انہیں اس کے لئے کہا گیا تو انہوں نے کہا میں نے قسم کھائی ہے کہ قسم بخدا میں ایسا نہیں کروں گا۔ لہذا اپنی قسم سے برأت کے بغیر میرے لئے ایسا کرنا حلال نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (5) "وَلَا تَجْعَلُوا

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 330 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 126 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 945 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 413 (قدیمی) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 185 (تجاریہ)

اللہ" یعنی اصل عبارت ہے الحلف باللّٰہ یا یمین اللّٰہ۔ یعنی اس صورت میں مضاف محذوف ہے اور "عُرْضَۃً" یہ مفعول کے معنی میں فعلۃ کے وزن پر ہے۔ جیسا کہ قُبْضَۃٌ اور اس کا اطلاق ہر اس شیٔ کے لئے ہوتا ہے جو کسی شیٔ کے قریب ظاہر ہوتی ہے اور یہ اس کے لئے رکاوٹ بن جاتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کو نیکیوں کے لئے رکاوٹ نہ بناؤ اور لِاَیْمَانِکُمْ میں لام عرضۃ کے لئے صلہ ہے کیونکہ ان ہی میں اعتراض کا معنی ہے اور ایمان سے مراد وہ امور ہیں جن پر قسم کھائی جاتی ہے۔

ع اَنْ تَبَرُّوْا یہ اپنے معطوف سمیت لِاَیْمَانِکُمْ کے لئے عطف بیان ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ لِاَیْمَانِکُمْ میں لام تعلیل کے لئے ہو اور یہ فعل یا عرضۃ کے متعلق ہو۔ یعنی تم اپنی قسموں کی وجہ سے اللہ کو رکاوٹ نہ بناؤ کہ تم نیکی نہیں کرو گے اور کبھی عرضۃ کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جو سامنے گاڑ دی جائے اور دوسری مسلسل اس پر واقع ہوتی رہے (نشانہ) جیسا کہ کہا جاتا ہے" جعلتہٗ عُرْضَۃً لکذا" یعنی (میں نے اسے اس کے لئے نصب کر دیا ہے) اور قاموس میں ہے کہ عُرْضَۃ سے مراد خیر اور شر میں عارض آنا ہے یعنی تم ہر امر میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر واقع نہ ہو اور تم اسے تیر کے لئے نصب شدہ نشانے کی طرح نہ بناؤ اور ہر ساعت میں قسم نہ کھاتے رہو۔ پس اس وقت "اَنْ تَبَرُّوْا" یا تو نہی کی علت ہے۔ یعنی میں تمہیں قسم کھانے سے روک رہا ہوں تا کہ تم نیکی کرو یا پھر یہ لا مقدرہ کے ساتھ منہی کی علت ہے۔ یعنی تم کثرت سے قسمیں نہ کھاؤ کہ تم نیکی نہیں کرو گے۔

ع اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کثرت سے قسمیں کھانا مکروہ ہے اور کثرت سے قسمیں کھانے والا اللہ تعالیٰ کے خلاف یہ جرأت کرنے والا ہے کہ وہ نیکی اور تقویٰ اختیار نہیں کرے گا اور وہ دو مخالفین کے درمیان صلح کرانے کے لئے بھی قابل اعتماد نہیں ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "قسم کے سبب یا انسان حانث ہوتا ہے یا پھر اس پر نادم ہوتا ہے"(1) اسے حاکم نے صحیح سند کے ساتھ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے۔ بیشک وہ آدمی جس نے نیک اعمال میں سے کسی عمل کو ترک کرنے کی قسم کھائی اس پر واجب ہے کہ وہ اپنی قسم کو اس نیک عمل کے لئے رکاوٹ نہ بننے دے بلکہ اسے توڑ دے اور اس کا کفارہ ادا کرے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے قسم کھائی پھر اس نے اس کے علاوہ دوسرے عمل کو بہتر خیال کیا تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے اور وہ عمل کرے جو بہتر ہے(2) اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور صحیحین میں اسی طرح کی روایت حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک قسم بخدا اگر اللہ نے چاہا تو اگر میں نے کسی کام کی قسم کھائی پھر میں نے دوسرے کام کو اس کی نسبت بہتر دیکھا تو میں اپنی قسم کا کفارہ ادا کروں گا اور وہ کام کروں گا جو زیادہ بہتر ہو گا(3) متفق علیہ۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی کہ جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ مسطح کو اپنا مال نہیں دیں گے اس لئے کہ اس نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ پر تہمت عائد کی تھی۔ اسے ابن جریر نے ابن جریج سے نقل کیا ہے۔

ع اور اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں کو خوب سننے والا ہے اور تمہاری نیتوں کو جاننے والا ہے۔

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْۤ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۲۲۵﴾

1۔ مستدرک حاکم، جلد 4 صفحہ 303 (العصر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 48 (قدیمی) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 980 (وزارت تعلیم)

"نہیں پکڑے گا تمہیں اللہ تعالیٰ ۱؎ تمہاری لایعنی قسموں پر ۲؎ لیکن پکڑے گا تمہیں ان قسموں پر جن کا ارادہ تمہارے دلوں نے کیا ہے ۳؎ اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا حلم والا ہے" ۴؎

۱؎ اللہ تعالیٰ آخرت میں سزا کے ذریعہ تمہارا مؤاخذہ نہیں کرے گا۔ یہاں دونوں کلموں میں مؤاخذہ سے مراد یہی ہے۔ اسی طرح سورۂ مائدہ میں بھی ہے۔ ایسا نہیں جیسا کہ یہ کہا گیا ہے کہ سورۂ مائدہ میں اس سے مراد دنیوی مؤاخذہ ہے یعنی کفارہ یا پھر وہ دونوں کو شامل ہے (یعنی دنیوی مؤاخذہ اور اخروی مؤاخذہ) اس لئے کہ کفارہ زکوٰۃ کی مثل ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے اس کے سبب دنیا میں کوئی مؤاخذہ نہیں۔ اسی لئے جو آدمی فوت ہو جائے اور اس کے ذمہ زکوٰۃ یا کفارہ ہو اور وہ وصیت نہ کرے تو یہ دونوں ورثہ کے حق کے اثبات کے مانع نہیں ہوتے۔ بخلاف لوگوں کے قرض، عشر اور خراج کے اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کفارہ نفس قسم کے سبب واجب نہیں ہوتا، بلکہ قسم کھانے کے بعد اسے توڑنے کے سبب واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا عقد یمین کے سبب کفارہ کے ساتھ مؤاخذہ کے تعلق کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ نتیجۃً مؤاخذہ سے مراد حساب (عذاب) ہے اور کفارہ اس مؤاخذہ کے رفع کے لئے مشروع قرار دیا گیا ہے۔ "باللغو" جو لغو ہونے والی ہے۔

۲؎ لغت میں لغو سے مراد کلام یا کسی اور سے ساقط ہونے والی وہ شئ ہے جس کا اعتبار نہ کیا جاتا ہو۔ قاموس میں اسی طرح ہے اور یہاں اس سے مراد زبان پر ایسی قسم کا جاری ہونا ہے جو بغیر کسی عقد و قصد کے ہو۔ چاہے وہ انشاء کی صورت میں ہو یا ماضی اور مستقبل کی خبر کی صورت میں ہو۔ یہ تفسیر حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا کہ یمین لغو انسان کا یہ قول ہے لا واللّٰہ و بلی واللّٰہ(1) اور اسے ابوداؤد نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مرفوع نقل کیا ہے اور یہی موقف شعبی اور عکرمہ نے بھی اختیار کیا ہے اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی ہے۔ اور یہی مذکورہ بالا لغوی معنی کے زیادہ مناسب ہے۔ بیشک جب یہ بغیر ارادے کے ہوگی تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا، اس کا لحاظ نہیں ہوگا اور نہ اس پر بالاجماع کوئی گناہ مرتب ہوگا۔ اگر اس کا تعلق اخبار سے ہو اور اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ قسم منعقد نہیں ہوگی۔ جب یہ قسم انشاء کی صورت میں ہو۔ اور توڑنے کی صورت میں اس پر کوئی کفارہ نہیں ہوگا اور اس کی دلیل اس تفسیر کے سبب یہی آیت ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں قسم منعقد ہو جاتی ہے اور توڑنے کی صورت میں کفارہ واجب ہوتا ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تین امور ایسے ہیں جو بالارادہ کرنے سے بھی ہو جاتے ہیں اور بالاستہزاء کرنے سے بھی ہو جاتے ہیں اور وہ نکاح، طلاق اور یمین (قسم) ہیں۔ صاحب ہدایہ نے ایسے ہی کہا ہے۔ ہم نے یہ حدیث کتب حدیث میں نہیں پائی۔ لیکن حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس سند سے پاتے ہیں "عن عبدالرحمٰن بن حبیب عن عطا عن یوسف بن ماھک عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ" یعنی یہ مرفوع روایت ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو بالارادہ کرنے سے بھی ہو جاتی ہیں اور بالاستہزاء کرنے سے بھی یعنی نکاح، طلاق اور رجعت(2) اسے امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، حاکم اور دار قطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ابن جوزی نے کہا ہے کہ عطاء سے مراد ابن عجلان ہے اور یہ متروک الحدیث ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابن جوزی کو وہم ہوا

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 115 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 305 (وزارت تعلیم)

ہے یہ تو عطاء بن ابی رباح ہیں اور عبدالرحمٰن بن حبیب کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا یہ منکر الحدیث ہے جبکہ دوسروں نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔ بہرحال یہ حدیث حسن ہے۔ ابن عدی نے "الکامل" میں اسے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ "تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر لعب کی صورت میں بھی ان کے بارے کوئی کلام کرے تو وہ لعب نہیں بنتیں بلکہ اس پر واجب (ثابت) ہو جاتی ہیں، اور وہ طلاق، عتاق اور نکاح ہیں۔" اس کی سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ہے جو ضعیف ہے۔ محدث عبدالرزاق رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی اور عمر رضی اللہ عنہما سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ "ان دونوں نے کہا ہے کہ تین چیزیں ہیں جن میں لعب کا اعتبار نہیں ہوتا اور وہ نکاح، طلاق اور عتاق ہیں"(1) اور ان دونوں سے ایک روایت میں چار چیزیں مذکور ہیں اور وہ چوتھی چیز نذر ہے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یمین نذر کے معنی میں ہے، لہٰذا اسے اس پر قیاس کیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے جو مرفوع حدیث ذکر کی ہے اسے آیت طیبہ کے لئے بطور بیان اور تفسیر اس سے ملا دیا جائے گا اور نص کے مقابلہ میں قیاس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اس کے باوجود کہ متفق علیہ اثر موقوف ہے وہ مرفوع نہیں ہے۔ اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ اگر حدیث یمین ثابت بھی ہو جائے تو پھر بھی اس میں دلیل موجود نہیں کیونکہ اس میں یہ مذکور ہے کہ یمین بالاستہزاء یمین بالجد ہے اور استہزاء قسم کھانے والا قسم کا ارادہ کرنے والا تو ہوتا ہے مگر اس کے حکم پر راضی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کی عدم رضا کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیوں کہ سبب اس سے بالاختیار ملا ہوا ہے اور الناسی (بھولنے والا) کسی شئ کا بالکل قصد نہیں کرتا اور نہ وہ اسے جانتا ہے جو اس نے کیا ہے۔ اسی طرح مخطی (خطا کرنے والا) الفاظ میں اس شئ کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ کسی دوسری شئ کا قصد کرتا ہے۔ اس لئے وہ ھازل کے معنی میں نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس بارے میں کوئی نص موجود نہیں اور نہ ہی اس پر کوئی قیاس ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یمین لغو کی تفسیر میں کہا ہے "کہ ماضی شئ پر قسم اٹھانا جس میں وہ سچا ہونے کا گمان کر رہا ہو پھر ان کے خلاف ظاہر ہو جائے" اور یہی قول زہری، حسن، ابراہیم نخعی، قتادہ اور مکحول رحمہم اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس میں نہ کوئی کفارہ ہے اور نہ گناہ، اس کے باوجود کہ اس میں قسم کھانے والا برأت کے گمان کے ساتھ قسم کا ارادہ کرتا ہے، تو جب وہ اس کا قصد ہی نہ کرے بلکہ وہ سونے والے کی مثل ہو اور صرف زبان پر الفاظ جاری ہوں تو پھر بدرجہ اولیٰ اس کی قسم کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے وہ قسم جس کے ساتھ ارادہ متعلق ہو اگرچہ وہ صدق کے گمان پر ہی ہو اگر وہ نفس الامر کے خلاف ہوگی تو اس میں کفارہ واجب ہو گا کیونکہ وہ ان کی تفسیر کے مطابق لغو نہیں بلکہ وہ قلب کا کسب ہونے کے سبب یمین غموس کی طرح ہے، مگر وہ اپنے ظن کی بناء پر معذور ہے اس لئے اس میں گناہ نہیں ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ اگرچہ وہ یمین لغو نہیں ہے، لیکن اس میں کفارہ اور گناہ بھی نہیں ہے۔ گناہ تو اس لئے نہیں کہ قول باری تعالیٰ ہے: وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُم بِهِ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ (اور نہیں ہے تم پر کوئی گرفت جو تم نادانستہ کر بیٹھو البتہ وہ کام جو تمہارے دل قصداً کرتے ہیں۔ (ان پر ضرور گرفت ہوگی)) اور کفارہ اس لئے نہیں کہ کفارے کا دارومدار گناہ پر ہے کیونکہ کفارہ گناہ کے ازالہ کے لئے ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر گناہ نہیں ہوگا تو کفارہ بھی نہیں ہوگا اور اس لئے بھی کہ یہ قسم بِمَا عَقَّدتُّمُ الْأَيْمَانَ میں داخل نہیں اور کفارہ اسی کی طرف راجع ہوتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ اگر کفارے کا دارومدار گناہ پر ہے اور گناہ خطا اور نسیان کی صورت سے اجماع اور حدیث کے مطابق اٹھا دیا گیا ہے تو پھر قتل خطا پر کفارہ کیوں واجب ہوتا ہے؟ تو ہم اس کے بارے یہ کہیں

1۔ مجمع الزوائد، جلد 4 صفحہ 617 (الفکر)

گے کہ قتل کا معاملہ انتہائی شدید ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے دو گناہ قرار دیا ہے۔ ایک گناہ نفس قتل ہے اور یہ گناہ کبیر ہے۔ جبکہ قتل بالعمد ہو تو یہ کفارہ کے ساتھ ختم نہیں ہوتا۔ اس صورت میں کفارے کا وجوب منقول نہیں اور یہ گناہ خطا کے سبب ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا گناہ ترک احتیاط ہے۔ اسی گناہ کے سبب قتل خطا میں کفارہ واجب ہوتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے یمین لغو کے بارے کہا ہے کہ یہ معصیت پر قسم کھانا ہے اس کو توڑنے کے سبب اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں کرے گا بلکہ حالف اسے توڑتا ہے اور کفارہ ادا کر دیتا ہے۔ اس قول کے مطابق یہ قسم مادہ کے اعتبار سے یمین منعقدہ کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے حالانکہ آیت ان کی تقسیم پر دلالت کرتی ہے اور یہ شرکت کے منافی ہے۔ اسی طرح کفارہ کے وجوب کا قول بھی عدم مؤاخذہ کے قول کے منافی ہے کیونکہ کفارہ کا دارومدار گناہ پر ہوتا ہے اور مسروق نے کہا ہے کہ معصیت کی قسم کھانے کی صورت میں حالف پر کفارہ نہیں ہوگا کیا کہیں شیطانی لغزشوں پر بھی کفارہ دیا جاتا ہے؟ اور شعبی نے کہا ہے کہ ایسا آدمی جس نے معصیت پر قسم کھائی اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس سے توبہ کرے۔ میں کہتا ہوں کہ معصیت کی قسم کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی عمومیت شامل ہے "وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ"[2] بیشک ان میں اس عقد کا ذکر ہے جسے پورا کرنا ضروری ہے، لہٰذا یہ یمین منعقدہ ہوگی، نہ کہ لغو۔ اور یہ کفارے کو واجب کرتی ہے اور اس کا معصیت کے لئے ہونا اسے چھوڑنے کو واجب کرتا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کا مقتضیٰ بعینہٖ بھی ہے۔ "کہ اسے چاہئے کہ وہ کفارہ ادا کرے اور وہ کرے جو اس سے بہتر ہو"۔ واللہ اعلم۔

[3] یعنی تم نے جھوٹی قسم کا عزم اور ارادہ کیا ہے اور اپنے قصد اور ارادے سے نافرمانی (گناہ) کا ارتکاب کیا ہے۔ اور ہم نے یہ قول مؤاخذہ کے قرینہ کے سبب کہا ہے کیونکہ مؤاخذہ نافرمانی پر ہی ہوتا ہے، لہٰذا اس قید سے تمام سچی قسمیں اس سے خارج ہو گئیں اور وہ بھی جو سچ کے گمان کے ساتھ ہوں۔ اسی طرح اس سے یمین منعقدہ بھی خارج ہوگی کیونکہ اس میں کوئی معصیت نہیں ہوتی بلکہ قسم کھانے کے بعد توڑنے میں ہوتی ہے۔ اگر کہا جائے کہ سورۂ مائدہ میں ہے: وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ[2] (لیکن باز پرس کرے گا تم سے ان قسموں پر جن کو تم پختہ کر چکے ہو۔) اور یہ معصیت اور اس پر مؤاخذہ کے ثبوت پر دلالت کرتی ہے تو پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ اس سے یمین منعقدہ خارج ہوگئی؟ میں کہتا ہوں وہاں تقدیر کلام یہ ہے: وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ اِنْ حَنِثْتُمْ" (اگر تم نے قسموں کو توڑا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے تم سے مؤاخذہ کرے گا) لیکن یہاں یہ تقدیر عبارت نہیں، کیونکہ تقدیر مجاز کی ایک قسم ہے اور حقیقت و مجاز جمع نہیں ہو سکتے اور غموس کی صورت میں مؤاخذہ صرف قسم کھانے سے ہی متحقق ہوتا ہے۔ چونکہ اس آیت میں صرف یمین غموس ہی اپنی اقسام کے ساتھ مراد ہے۔ اس لئے یہاں وہ تقدیر عبارت نہیں ہو سکتی۔ جبکہ سورۂ مائدہ میں صرف یمین منعقدہ مراد ہے اور اس میں عبارت مقدر ہے، واللہ اعلم۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ اور بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ سے مراد ایک ہے اور وہ لغو کی ضد ہے۔ وہ (عرب) کہتے ہیں کہ دل کا کسب عقد کرنا اور نیت کرنا ہے۔ لہٰذا مَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ اور مَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ دونوں قول یمین غموس، یمین منعقدہ اور یمین مظنونہ کو بھی شامل ہیں۔ اس لئے ان تمام میں کفارہ واجب ہوگا۔ ہم کہتے ہیں اس طرح نہیں ہے بلکہ عقد الیمین سے مراد کسی شی کو قسم کے ذریعے اپنے اوپر اس طرح لازم کرنا ہے کہ اسے پورا کرنا واجب ہوگا۔ جیسا کہ رب کریم کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (اے اہل ایمان عقدوں کو پورا کرو) تو اس میں نہ معصیت ہے اور نہ مؤاخذہ مگر اسے توڑنے کے بعد اور دل کا کسب حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی تفسیر کے مطابق

یمین لغو کی ضد ہے۔ لہٰذا وہ مطلقاً اس سے عام ہے لیکن ہم نے اسے آیت میں تقدیر کے بغیر مؤاخذہ کے قرینہ کے سبب صرف قسم کے عوض کسب المعصیۃ پر محمول کیا ہے اور وہ صرف یمین غموس ہے اور غموس میں کفارہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ قول باری تعالیٰ فَكَفَّارَتُهٗ میں ضمیر کا مرجع صرف ماعَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ ہے اور چونکہ یمین غموس محض گناہ کبیرہ ہے لہٰذا اگر اس پر کفارہ واجب ہوتو یا تو کفارہ غموس کی معصیت کو ڈھانپنے والا اور زائل کرنے والا ہوگا یا نہیں ہوگا۔ اس دوسری صورت میں تو کفارہ کفارہ ہی نہیں ہوگا اور پہلی صورت میں ہر آدمی کو یہ وسعت مل جائے گی کہ وہ جھوٹی قسم کے ذریعے کسی مسلمان آدمی کا مال چھین لے اور پھر قسم کا کفارہ ادا کر دے، لیکن کسی نے بھی ایسا قول نہیں کیا۔ تحقیق رب کریم نے بھی ارشاد فرمایا: اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ (اگر تم ان کبائر سے اجتناب کرو گے جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تم سے تمہارے سیئات کو مٹا ڈالیں گے) اور مزید فرمایا: اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا پانچ نمازیں، ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک اپنے مابین ہونے والے گناہوں کے لئے کفارہ ہیں، جبکہ اس نے کبائر سے اجتناب کیا ہو۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ طاعات صغائر کو مٹانے والی ہیں، کبائر کو نہیں۔ کبائر سے بچنے کا ذریعہ صرف استغفار ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت کے ساتھ ڈھانپ لے اور اس کی مغفرت فرمادے شاید اسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رب کریم نے فرمایا ہے ''وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ'' یعنی اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو کبائر کو توبہ کیساتھ یا بغیر توبہ کے بخش سکتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مغفرت اور حلم کا وعدہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف ہی لوٹ رہا ہے۔ لَا یُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْۤ اَیْمَانِكُمْ بیشک کلام یمین لغو کے لئے ذکر کی گئی ہے اور یمین غموس کا ذکر تبعاً اور اضطراراً کیا گیا ہے اس پر امام بخاری کی وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو انہوں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا کہ یہ آیت لَا یُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْۤ اَیْمَانِكُمْ۔ آدمی کے اس قول کے بارے نازل ہوئی ''لَا وَاللّٰهِ وَبَلٰى وَاللّٰهِ'' (1) واللہ اعلم۔

جان لو کہ فی الاصل یمین کا معنی قوت ہے۔ جیسا کہ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں: لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ (تحقیق ہم نے اسے قوت کے ساتھ پکڑا) اور اعضاء کے لئے کہا جاتا ہے ''ضِدُّ الْیَسَارِ یَمِیْنٌ لِقُوَّتِهٖ'' یعنی یمین یسار کی ضد ہے اپنی قوت کے سبب اور قسم کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ذکر کر کے کلام کو مضبوط اور پختہ کرنا ہوتا ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ اس کا زبان پر بغیر ارادہ کے جاری ہو جانا چاہے ماضی کی خبر کے بارے واقع ہو یا مستقبل کی خبر کے بارے میں، بولنے والا سچا ہو یا جھوٹا، یا پھر وہ انشاء کی صورت میں ہو۔ یہ یمین لغو کہلاتی ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے حکم متعلق ہوتا ہے۔ مگر وہی جو ہم نے انشاء کی صورت میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ذکر کیا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کے ساتھ قصد کا تعلق ہوتا ہے اور اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔ یا یہ خبر کی صورت میں ہوگی یا انشاء کی صورت میں۔ پس اگر یہ خبر کی صورت میں ہو تو اگر خبر واقعہ میں سچی ہو اور متکلم کے گمان میں بھی ایسا ہی ہو جیسے تیرا یہ قول ''وَاللّٰهِ اِنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ لَّا رَیْبَ فِیْهَا وَاِنَّهٗ لَقَدْ طَلَعَتِ الشَّمْسُ'' تو اس قسم کے بارے کوئی کلام اور اعتراض نہیں بیشک یہ عبادت ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کی قسم کھانا جائز نہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' بیشک اللہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 982 (وزارت تعلیم)

تعالیٰ نے تمہیں اپنے آباء کی قسمیں کھانے سے منع فرمایا ہے۔ جو قسم اٹھانے والا ہو اسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھائے یا پھر خاموش رہے" (1) متفق علیہ۔ آپ ہی فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جس نے اللہ تعالیٰ کے غیر کی قسم کھائی اس نے شرک کیا" (2) اسے ترمذی نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "تم اپنے آباء، ماؤں اور شرکاء کی قسمیں نہ کھاؤ اور نہ تم اللہ تعالیٰ کی قسم کھاؤ مگر جب کہ تم سچے ہو" (3) اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

اور اگر وہ قسم امر واقعہ میں جھوٹی ہو لیکن متکلم کے گمان میں سچی ہو تو اگر اس کے گمان کا دارومدار دلیل ظنی پر ہو جیسے حدیث شاذ وغیرہ کے راوی نے اس میں جھوٹ بولا یا اس کی تاویل میں اس نے خطا کی، یا اس نے سلف صالح کو ترجیح دی، یا جس میں اس سے غلطی ہوئی یا استصواب حال یا اسی قسم کی کوئی اور دلیل وغیرہ، درآنحالانکہ اس کے کذب پر کوئی قطعی دلیل موجود نہ ہو تو یہ یمین مظنون ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے مطابق یمین لغو ہے۔ اس کا حکم بھی ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔ اور اگر اس کے گمان کا انحصار کسی دلیل پر نہ ہو جیسے اس کا قول زید قائم، زید سیقوم۔ اور اس کا یہ قول بغیر علم اور روایت کئے ہو اور اسے کسی نے خبر بھی نہ دی ہو تو یہ یمین۔ غموس ہوگی جس سے منع کیا گیا ہے۔ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (اور نہ پیروی کرو اس چیز کی جس کا تمہیں علم نہیں۔) اور جس کے کذب پر دلیل قائم ہو جائے وہ تو بطریق اولیٰ غموس ہوگی۔ جیسے کفار کا قول: اَلْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (کہ مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں) اور "وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ" (اور بیشک اللہ تعالیٰ انہیں نہیں اٹھائے گا جو قبور میں ہیں)۔

اور اگر قسم امر واقعہ میں سچی ہو اور متکلم کے گمان میں جھوٹی ہو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں منافقین کا قول، اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ یا وہ قسم امر واقعہ میں بھی جھوٹی ہو اور متکلم کے گمان میں بھی جیسے یہودیوں کا قول، مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ (اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی شئ نہیں اتاری) اور ان کا یہ قول، لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ (اللہ تعالیٰ انہیں نہیں اٹھائے گا جو مر جائیں گے) اور کسی مقروض کا یہ قول "لَيْسَ لَكَ عَلَيَّ شَيْءٌ" (تیری کوئی چیز مجھ پر نہیں) تو یہ یمین غموس ہے۔ اس کے قریب جانا بھی حلال نہیں اور کبیرہ گناہوں میں سے ایک ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کبیرہ گناہ یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی آدمی کو قتل کرنا اور یمین غموس (جھوٹی قسم) (4) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس کسی نے قسم اٹھائی پھر ڈٹا رہا حالانکہ وہ اس میں فاجر تھا اور اس کے سبب وہ کسی مسلمان کا مال چھین لیتا ہے تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوگا۔" اور اس کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا الآیہ متفق علیہ (5) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جس نے اپنی قسم کے سبب کسی مسلمان آدمی کا حق چھینا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جہنم کو واجب کر دیا اور اس پر جنت کو حرام قرار دیا" (6) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن انیس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 185 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 185 (و۔ت) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 107 (و۔ت)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 987 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 987 (و۔ت) 6۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 80 (قدیمی)

فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی قسم کھانا ہے۔ اسے ترمذی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت خریم بن فاتک مرفوعاً نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ شہادۃ زور (جھوٹی گواہی) کا اشراک باللہ کے ساتھ تین مرتبہ موازنہ کیا گیا ہے اور پھر یہ آیت پڑھی: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ (1) ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور اگر قسم انشاء کی صورت میں ہو یعنی وہ اپنے اوپر کوئی شئ لازم کرلے یا اپنے آپ کو کسی شئ سے روک لے تو یہ یمین منعقدہ ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے۔ ''وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ'' یہ آیت سورۂ مائدہ میں ہے، ہم اس کا حکم وہاں بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾

''ان کے لئے جو قسم اٹھاتے ہیں کہ وہ اپنی بیویوں کے قریب نہ جائیں گے[1] مہلت ہے چار ماہ کی[2] پھر اگر رجوع کر لیں (اس مدت میں)[3] تو بیشک اللہ غفور رحیم ہے[4]''

[1] یعنی وہ لوگ جو عورتوں سے جماع نہ کرنے کی قسم کھاتے ہیں، الیۃ کا معنی یمین ہے اور یہ علیٰ کے صلہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے لیکن جب یہ بُعد کے معنی کو متضمن ہو تو پھر یہ مِنْ کے واسطہ سے متعدی ہوتا ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ ایلاء دور جاہلیت کے لوگوں کی طلاق تھی۔ حضرت سعید بن المسیب نے کہا ہے کہ یہ اہل جاہلیت کی طرف سے تکلیف دینے کا ذریعہ تھا کہ مرد نہ تو اپنی بیوی سے محبت کرتا تھا اور نہ یہ چاہتا تھا کہ کوئی غیر اس سے شادی کرلے۔ لہٰذا وہ قسم کھالیتا کہ وہ ہمیشہ اس کے قریب نہیں جائے گا۔ نتیجۃً نہ وہ رانڈ ہوتی اور نہ خاوند والی ہوتی۔ ابتدائے اسلام میں وہ اسی طریقے پر رہے، پھر اسلام میں اس کی مدت مقرر کردی گئی۔

[2] ''تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ'' یہ مبتداء ہے اس کی خبر اس کا ماقبل کلام ہے۔ یا پھر یہ ظرف کے لئے فاعل ہے اور تربص کا معنی ہے انتظار کرنا اور ٹھہرنا (توقف کرنا) اسے ظرف کی طرف وسعت کی بناء پر مضاف کیا گیا ہے۔ یعنی ایلاء کرنے والے کے لئے اتنی مدت ٹھہرنے کا حق ہے۔ اس مدت میں طلاق واقع نہیں ہوگی۔ یا یہ کہ اس دوران طلاق کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ بخلاف اس صورت کے جو آرہی ہے۔

[3] یعنی اگر وہ چار ماہ کے بعد وطی کے ذریعے عورتوں کی طرف قسم سے رجوع کرلیں۔ یہ قول ظاہر آیت کی بناء پر امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ اس میں فاء تعقیب کے لئے ہے۔ اس بناء پر انہوں نے کہا ہے کہ آدمی ایلاء کرنے والا نہیں ہوگا اگر اس نے چار ماہ کی قسم کھائی جیسا کہ وہ چار ماہ سے کم مدت کی قسم کھانے سے مولی نہیں ہوتا۔ بلکہ جب اس نے اس سے زیادہ مدت کی قسم کھائی تو پھر ایلاء کی مدت کے دوران رجوع کرنا ضروری ہوگا اور بیشک چار ماہ گزرنے سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے قرأت اس طرح کی ہے فَاِنْ فَآءُوْ فِيْهِنَّ یعنی اگر وہ چار ماہ میں رجوع کرلیں۔ اس قرأت کی بناء پر حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ بیشک اگر اس نے چار مہینوں کی قسم کھائی تو وہ ایلاء کرنے والا ہو جائے گا اور چار مہینوں کے اندر ہی رجوع صحیح ہوگا۔ نتیجۃً اختلاف کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آیا قرأت شاذہ کے مطابق عمل جائز ہوتا ہے یا نہیں؟ تو اس کے بارے ائمہ ثلاثہ نے کہا ہے کہ جائز نہیں کیونکہ یہ نہ تو حدیث ہے نہ قرآن۔ اگر یہ قرآن ہوتا تو پھر قرأت متواتر ہوتی۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 150 (وزارت تعلیم)

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہوتا ہے کیونکہ یہ اس امر سے خالی نہیں ہوتی کہ یا تو یہ قرآن ہوتی ہے یا پھر یہ قرآن کی تفسیر کے طور پر رسول اللہ ﷺ کی جانب سے خبر ہوتی ہے اور ان دونوں صورتوں میں سے ہر ایک حجت ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ہم اس کے حجت ہونے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن جب قرأت شاذہ اور قرأت متواترہ کے درمیان تعارض واقع ہو جائے تو پھر اس کا سقوط واجب ہوتا ہے؟ تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ اس کا سقوط تب واجب ہوتا ہے جب ان دونوں کو جمع کرنا ممکن نہ ہو۔ اور یہاں ان دونوں کو جمع کرنا ممکن ہے۔ بیشک فاء جس طرح تعقیب فی الزمان کے لئے آتی ہے اسی طرح یہ کبھی اپنے ماقبل مجمل کی تفصیل وغیرہ کے لئے بھی آتی ہے۔ جیسا کہ ان ارشادات میں ہے:۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً اور یہاں جب یہ ذکر کیا گیا کہ ان کے لئے چار ماہ تک بغیر وطی کے ٹھہرنا ہے تو یہ ایسا مقام ہے جو تفصیل حال کا تقاضا کرتا ہے۔ لہٰذا فرمایا "فَاِنْ فَآءُوْ ...... الی قولہ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ"۔ اور اس تقدیر پر بھی کہ فاء تعقیب فی الزمان کے لئے ہو یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ تعقیب نسبت کے اعتبار سے ہو یعنی فَاِنْ فَآءُوْ بَعْدَ الْاِیْلَاءِ (اگر وہ ایلاء کے بعد رجوع کریں) تو قرأت متواترہ مطلقاً رجوع کے جواز پر دلالت کرتی ہے، چاہے وہ چار مہینوں میں ہو یا ان کے بعد ہو۔ اور قرأت شاذہ رجوع کو چار مہینوں میں ہونے کے ساتھ مقید کرتی ہے لہٰذا مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت قرأت مشہورہ ہے اور اس کے ساتھ کتاب کی تخصیص اور مطلق کو مقید پر محمول کرنا جائز ہوتا ہے۔

حسن، ابراہیم اور قتادہ نے کہا ہے جب مُولی رجوع کر لے تو اس پر کفارہ نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور رحمت کا وعدہ فرمایا ہے اور جمہور کے نزدیک اس پر کفارہ واجب ہوتا ہے۔ بیشک مغفرت کا وعدہ اس کفارہ کے منافی نہیں جو سورۂ مائدہ کی آیت سے ثابت ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے جس کسی نے کسی کام کی قسم کھائی پھر اس نے اس کی نسبت اس کے غیر کو بہتر گمان کیا تو اسے چاہئے کہ وہ قسم کا کفارہ ادا کرے اور وہ کام کرے جو بہتر ہے۔(1)

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ

"اور اگر پکا ارادہ کر لیں طلاق دینے کا تو بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔"

حضرت امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر انہوں نے چار ماہ کے بعد رجوع نہ کیا اور طلاق دینے کا پختہ ارادہ کر لیا اور طلاق دے دی تو بیشک اللہ تعالیٰ ان کے طلاق دینے کا قول سننے والا ہے اور ان کی نیتوں کو جاننے والا ہے۔ اس تاویل کی بناء پر انہوں نے کہا ہے کہ صرف چار ماہ گزرنے کے ساتھ طلاق واقع نہیں ہوگی بلکہ وہ طلاق دینے پر موقوف ہوگی کیونکہ جب تک یہ طلاق دینے پر موقوف نہ ہو اور صرف چار ماہ گزرنے کے ساتھ ہی طلاق واقع ہو جائے تو معنوی طور پر طلاق کے لئے اس کا عزم ثابت نہیں ہوگا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے قول اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ کے ساتھ اختتام اس کے مناسب ہوگا اور اس تاویل کی بناء پر تردید نفی اور اثبات کے درمیان دائر نہیں۔ اور تیسری شق باقی ہے وہ یہ ہے کہ نہ وہ رجوع کرے اور نہ طلاق کا عزم کرے۔ اس شق کے حکم کے بارے خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ اس تاویل کے مطابق گفتگو کرنے والوں کے قول میں اختلاف ہے۔ ان میں سے اکثر کا قول یہ ہے کہ حاکم وقت اس

1۔ مجمع الزوائد، جلد 4، صفحہ 329 (الفکر)

صورت میں طلاق دے دے گا کیونکہ خاوند جب امساک بالمعروف سے انکار کرے تو تسریح بالاحسان میں حاکم اس کا نائب ہوتا ہے جیسا کہ عنین کے مسئلہ میں ہے۔ حضرت امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ سے ایک روایت میں ہے کہ حاکم وقت اسے اس پر مجبور کرے گا کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کی تاویل یہ ہے کہ اگر انہوں نے رجوع ترک کر کے اور ایلاء مسلسل جاری رکھتے ہوئے طلاق واقع ہونے کا عزم کر لیا یہاں تک کہ مدت گزر گئی تو اسی کے ساتھ طلاق واقع ہو جائے گی۔ انہوں نے کہا اگر اس کے ساتھ طلاق واقع نہ ہو اور اس کے لئے مہینوں کے بعد بھی رجوع کرنا جائز ہو تو پھر ابن مسعود کی قرأت کے مطابق معنوی طور پر فیھن کے قول کے ساتھ رجوع مقید نہیں ہوگا۔ اور اگر ہم کہیں کہ اس کے لئے مہینوں کے بعد رجوع کرنا جائز نہیں اور اس پر طلاق دینا لازمی ہے تو اس سے اجماع مرکب کا ٹوٹنا لازم آتا ہے جبکہ کسی ایک نے بھی ایسا نہیں کہا۔ اور اس بناء پر بھی کہ آیت میں واقع تردید بھی اس کا انکار کرتی ہے۔ اس تاویل کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے قول کا معنی یہ بنتا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ اس بحث اور جھگڑے کو سننے والا ہے جو ترک رجوع کے ساتھ مقترن ہے اور حدیث نفس کو اسی طرح سنتا ہے جیسے شیطان کا وسوسہ سنتا ہے۔ یا پھر وہ اس ایلاء کو سننے والا ہے جو طلاق ہے اور وہ وطی کے بغیر چار ماہ گزرنے پر موقوف ہے اور وہ جاننے والا ہے اس ظلم کو جو وہ اس کے سبب جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس میں وعید اور دھمکی کے معنی موجود ہیں۔ اس بات میں صحابہ کرام کے آثار باہم متعارض ہیں۔ پس حضرت عمر، عثمان، علی، زید بن ثابت، ابن مسعود، ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے اس طرح مروی ہے جیسے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے مگر جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ طلاق رجعی پر دلالت کرتا ہے۔ دار قطنی نے اسحاق سے روایت نقل کی ہے کہ مجھے مسلم بن شہاب نے سعید بن مسیب اور ابوبکر بن عبدالرحمٰن سے حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے جب چار مہینے گزر جائیں تو یہ ایک طلاق ہوگی اور جب تک وہ عدت گزار رہی ہو وہ اسے لوٹانے کا مالک ہوگا۔ محدث عبدالرزاق نے روایت نقل کی ہے کہ ہمیں معمر نے عطاء خراسانی اور انہوں نے ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے کہ ایلاء کی صورت میں جب چار مہینے گزر جائیں تو ایک طلاق ہو جاتی ہے اور یہ اپنے نفس کا زیادہ حق رکھتی ہے اور یہ مطلقہ کی عدت گزارے گی۔ محدث عبدالرزاق نے روایت نقل کی ہے کہ معمر نے قتادہ سے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب چار مہینے گزر جائیں تو یہ ایک طلاق ہوگی اور یہ اپنے نفس کی زیادہ حقدار ہے اور یہ مطلقہ عورت کی مثل عدت گزارے گی۔ محدث عبدالرزاق نے ہی روایت نقل کی ہے کہ معمر اور ابن عیینہ نے ابو قلابہ سے ہمیں روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا نعمان نے اپنی بیوی سے ایلاء کیا اور پھر وہ ایک دن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے ان کی ران پر ضرب لگائی اور کہا جب چار ماہ گزر جائیں تو طلاق ہونے کا اعتراف کر لینا۔ ابن ابی شیبہ نے روایت نقل کی ہے کہ ہمیں ابو معاویہ نے اعمش سے انہوں نے حبیب سے انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کی ہے کہ ان دونوں نے کہا جب کسی نے ایلاء کیا پھر رجوع نہ کیا، یہاں تک کہ چار مہینے گزر گئے تو ایک طلاق بائن ہوگی(1) حضرت عثمان، علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ایسی روایات بھی مروی ہیں جو اس موقف کے خلاف ہیں اور وہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے موافق ہیں۔ اسی طرح ان کے علاوہ دیگر صحابہ کرام سے بھی روایات منقول ہیں۔ دار قطنی نے کہا ہے کہ ابوبکر میمونی نے کہا ہے کہ میں نے احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ عطاء خراسانی کی حدیث ذکر کی۔ تو انہوں نے کہا

1۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 4 صفحہ 127 (دار التاج)

میں نہیں جانتا وہ کیا ہے؟ حالانکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اس کے خلاف بھی مروی ہے۔ آپ سے پوچھا گیا اسے کس نے روایت کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا حبیب بن ثابت نے طاؤس کے واسطہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں جعفر بن محمد سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ فرماتے تھے جب آدمی اپنی بیوی سے ایلاء کرے تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ پس اگر چار مہینے گزر گئے تو توقف کیے رکھے گا یہاں تک کہ وہ طلاق دے دے یا رجوع کر لے(1) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ وہ اس ایلاء کے بارے کہا کرتے تھے جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ عورت اس مدت کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، مگر اس طرح کہ وہ اسے احسن انداز میں اپنے پاس روک لے یا پھر طلاق کا عزم کر لے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا ہے(2) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مجھے اسماعیل بن اویس نے کہا ہے کہ مجھے مالک نے نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب چار ماہ گزر جائیں گے تو وہ توقف کیے رکھے، یہاں تک کہ طلاق دے دے(3) اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ہمیں سفیان نے یحییٰ بن سعید کے واسطہ سے سلیمان بن یسار سے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں صحابہ کرام میں سے دس سے زائد افراد کو جانتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ ایلاء کرنے والا توقف کیے رکھے گا۔ میں کہتا ہوں کہ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان صحابہ کرام میں حضرت عمر و ابوالدرداء کا ذکر بھی کیا ہے جنہوں نے وقف (ٹھہرے رہنے) کا مذہب اپنایا ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ جو کچھ ہم نے حضرت عثمان اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے وہ اس کی نسبت اولیٰ ہے جو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس لئے کہ ہماری سند جید متصل ہے، بخلاف اس کے جو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے کیونکہ حبیب تک اس کے رواۃ معروف نہیں۔ انہوں نے اسے معضل قرار دیا ہے اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ طاؤس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے حدیث اخذ کی ہے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے محمد بن علی کی روایت مرسل ہے۔ اس طرح آپ سے حضرت قتادہ کی روایت بھی مرسل ہے اور یہ دونوں ہمعصر ہیں اور جو روایات ہم نے ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہیں ان کے تمام رواۃ ایسے ہیں جن سے شیخین نے صحیحین میں روایات نقل کی ہیں۔ لہٰذا وہ روایت جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اسے ان پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ تابعین میں سے جنہوں نے وقف کا موقف اختیار کیا ہے ان میں سعید بن جبیر، سلیمان بن یسار اور مجاہد ہیں، جبکہ سفیان ثوری، سعید بن مسیب اور زہری نے اس کے خلاف مذہب اپنایا ہے، لیکن انہوں نے یہ کہا ہے کہ طلاق رجعی واقع ہوگی۔ محدث عبدالرزاق نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق جن تابعین سے روایات نقل کی ہیں ان میں حضرت عطاء، جابر بن یزید، عکرمہ، سعید بن المسیب، ابوبکر بن عبدالرحمٰن اور مکحول ہیں۔ اسی طرح دارقطنی نے ابن الحنفیہ، شعبی، نخعی، مسروق، حسن، ابن سیرین، قبیصہ، سالم اور ابو سلمہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایات ذکر کی ہیں اور ترجیح میں یہ کہا گیا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرأت متواترہ کے ظاہر سے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا مذہب مستفاد ہوتا ہے، جبکہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اس سے تکلف کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔ اس کی طرف رجوع سماع کے ساتھ جائز ہوتا ہے۔ لہٰذا صحابہ کرام میں سے جنہوں نے آیت کے ظاہر کے مطابق قول کیا ان کے بارے یہ معلوم ہے کہ انہوں نے رائے سے یہ کہا اور ان میں سے جنہوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ کے مطابق قول کیا ہے ان کے قول کو سماع پر محمول کیا جائے گا۔ علامہ ابن ہمام

1۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 556 (التراث العربی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 797 (وزارت تعلیم)
3۔ ایضاً

نے کہا ہے کہ یہ ترجیح عام ہے و اللہ اعلم۔

یہاں دوسرے اختلافات بھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب کسی نے اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کے بغیر ایلاء کیا تو وہ مُولی ہوگا یا نہیں۔ مثلاً طلاق، عتاق، صدقہ یا کوئی عبادت اپنے ذمہ لازم کر لیتا ہے۔ تو اس کے بارے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ مُولی ہو جائے گا، چاہے اس سے مقصود عورت کو کوئی ضرر پہنچانا ہو یا اس کے لئے کوئی مصلحت ہو مثلاً جب عورت مریض ہو تو وہ ایسا کرے یا پھر وہ اپنی مصلحت کے لئے ایسا کرے مثلاً وہ خود مریض ہو تو ایسا کہہ دے۔ حضرت امام مالک فرماتے ہیں وہ مولی نہیں ہوگا مگر جبکہ وہ حالت غضب میں قسم کھائے یا پھر عورت کو ضرر پہنچانے کے لئے۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے وہ مُولی نہیں ہو گا جب اس نے نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارے میں دو قول ہیں۔ ان میں سے اصح قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل ہے۔

دوسرا اختلافی مسئلہ یہ ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو ضرر پہنچانے کے لئے بغیر قسم کے اس سے وطی ترک کر دی اور چار ماہ سے زائد عرصہ گزر جائے تو کیا وہ مُولی ہوگا؟ تو اس کے بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دو روایتوں میں سے ایک میں کہا ہے: جی ہاں مُولی ہو جائے گا اور جمہور نے کہا ہے نہیں ہوگا۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آیت کے عموم کے سبب غلام کے ایلاء کی مدت آزاد کی مثل چار مہینے ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ مدت ایک امر طبعی کے لئے مقرر کی گئی ہے اور وہ اتنی مدت میں مرد کے بغیر عورت کے صبر کا کم ہونا ہے لہٰذا اس میں آزاد اور غلام برابر ہوں گے جیسا کہ عنیت کی مدت دونوں کے لئے مساوی ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غلامی کے سبب مدت نصف ہوتی ہے لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عورت کی غلامی کے سبب نصف ہوتی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خاوند کی غلامی کے سبب۔ اس اختلاف کی بناء طلاق کے مسئلہ میں ان دونوں کے اختلاف پر ہے۔

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ جب وطی متعذر ہو تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے رجوع بالقول ہوگا یعنی مرد یہ کہہ دے فِئْتُ (میں نے رجوع کر لیا) پھر اگر وہ مدت گزرنے سے پہلے پہلے وطی پر قادر ہو گیا تو اس پر وطی کرنا واجب ہوگی اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رجوع صرف وطی سے ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں قسم سے حانث ہونے کا انحصار بھی اسی پر ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

"اور طلاق دی ہوئی عورتیں 1 روکے رکھیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک 2 اور جائز نہیں ان کے لئے کہ وہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کی رحموں 3 میں اگر وہ ایمان رکھتی ہوں اللہ پر اور روز آخرت پر 4 اور ان کے خاوند 5 زیادہ حقدار ہیں ان کو لوٹانے کے اس مدت میں 6 اگر وہ ارادہ کر لیں اصلاح کا 7 اور ان کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جیسے مردوں کے

حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق ۵ البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے ۶ اور اللہ تعالیٰ عزت والا حکمت والا ہے ۷ "

۱۔ وَالْمُطَلَّقٰتُ یہ لفظ عام ہے اور ایسی تمام عورتوں کو شامل ہے جنہیں طلاق رجعی ہوئی ہو یا بائن چاہے وہ حاملہ ہوں یا غیر حاملہ، وہ مدخول بہا ہوں یا نہ ہوں، آزاد ہوں یا لونڈیاں، پھر سنت اور اجماع کے سبب ان سے لونڈیوں کو خاص کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا لونڈی کے لئے طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہے(1) اسے ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ عنقریب ہم اس حدیث کے بارے بحث ذکر کریں گے اور " اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ " کے قول کی تفسیر میں خبر آحاد کے ساتھ عام کتاب اللہ کی تخصیص کا مسئلہ بھی ان شاءاللہ ذکر کریں گے۔ اور اس آیت کا حکم حاملہ عورتوں کے بارے میں اس قول باری تعالیٰ سے منسوخ ہے۔ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ اور غیر مدخولہ عورتوں کے بارے میں اس قول سے منسوخ ہے۔ سورۂ احزاب میں ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ۔

۲۔ " یَتَرَبَّصْنَ " یہ خبر ہے اور تاکید کے لئے امر کے معنی میں ہے۔ اس میں عورتوں کو انتظار پر ابھارنا ہے یعنی وہ اپنے نفسوں کو روکے رکھیں اور ان پر غالب رہیں اگرچہ یہ ان کی خواہش کے خلاف ہو۔ وہ تین قروء کے دوران شادی نہ کریں۔ لفظ قروء مشترک ہے اور اضداد میں سے ہے۔ باجماع اہل لغت اس کا اطلاق حیض اور طہر دونوں پر ہوتا ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ، حضرت ابن عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ یہاں اس سے مراد طہر ہے کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دی اس حال میں کہ وہ حائضہ تھی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں واقعہ عرض کیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر غصے کا اظہار فرمایا اور پھر ارشاد فرمایا اسے چاہئے کہ وہ اس سے رجوع کر لے پھر طہر آنے تک اسے اپنے پاس روکے رکھے پھر دوبارہ اسے حیض آئے اور پھر وہ اس حیض سے پاک ہو جائے تو پھر اگر وہ اسے طلاق دینا چاہے تو حالت طہر میں اس کے قریب جانے سے قبل اسے طلاق دے دے۔ پس یہی وہ عدت ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے مطلقہ عورتوں کے لئے فرمایا ہے(2)۔ متفق علیہ۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ انہوں نے کہا کہ اس میں لِعِدَّتِهِنَّ کی لام وقت کے لئے ہے یعنی ان کی عدت کے وقت میں انہیں طلاق دو اور حدیث طیبہ میں اس عدت کا مشار الیہ وہ طہر ہے جس میں اس نے عورت کو مس نہ کیا ہو یعنی (اس سے مجامعت نہ کی ہو) تو اس سے معلوم ہوا کہ قروء سے مراد اطہار ہیں۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ لام وقت کے لئے ہے ایسے معنی میں جو استعمال میں معہود نہیں کیونکہ اس طرح تو طلاق پر عدت کا مقدم ہونا لازم آتا ہے یا پھر عدت کے ساتھ اس کی مقارنت لازم آتی ہے کیونکہ یہ تو عدت کے وقت میں طلاق کے واقع ہونے کا تقاضا کرتی ہے بلکہ وہاں لام ان کی مستقبل کی عدت کا معنی دینے کے لئے ہے۔ باجماع اہل عرب تاریخ میں اس طرح کہا جاتا ہے۔ " خَرَجَ لِثَلَاثٍ بَقِیْنَ مِنْ رَمَضَانَ " (وہ ان تین دنوں کے لئے نکلا جو رمضان سے ابھی باقی ہیں)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کی یہ قرأت بھی ہمارے قول کی تائید کرتی ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ اور مسلم کی روایت میں اس حدیث میں آپ ﷺ نے اس طرح تلاوت فرمائی: اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ(3) یا پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے قول میں عدت سے مراد وہ عدت ہے جس کا اللہ تعالیٰ

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 305 (مکتبہ امدادیہ ملتان) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 476 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 477 (قدیمی)

نے طلاق کے لئے بطور وقت حکم دیا ہے یعنی اس سے مراد وہ وقت ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس میں عورتوں کو طلاق دی جا سکتی ہے نہ کہ اس سے مراد وہ عدت ہے جو طلاق کے بعد واجب ہوتی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ ثلثۃ میں تاء ممیز کے مذکر ہونے پر دلالت کرتی ہے اور لفظ قرء حیض کے معنی میں مؤنث ہے اور طہر کے معنی میں مذکر ہے اور یہی مقصود ہے۔ یہ استدلال کوئی شی نہیں کیونکہ جب ایک شی کے دو اسم ہوں ایک مذکر جیسا کہ بُرٌّ (گندم) اور ایک مؤنث جیسا کہ حِنطَۃٌ (گندم) اور وہاں تانیث حقیقی نہ ہو تو وہاں دونوں میں سے مذکر کا اعتبار ہوتا ہے اور یہاں اسی طرح ہے کہ کیونکہ حیض مؤنث ہے اور قرءٌ مذکر ہے اور جب تانیث حقیقی ہو اور لفظ مذکر ہو جیسے لفظ شخص عورت کے لئے بولا جائے تو اس میں دونوں وجہیں جائز ہوتی ہیں۔

امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس سے مراد حیض ہے اور کئی اعتبار سے اس کا استدلال کیا جا سکتا ہے:۔

1۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے جو مسلم کی روایت کے مطابق استدلال شافعی میں گزر چکی ہے اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کی قرأت سے۔

2۔ چونکہ ثلاثۃ کا لفظ ایک خاص عدد ہے جو نہ تو اس سے کم پر دلالت کرتا ہے اور نہ اس سے زیادہ پر اور بالاجماع سنت کے مطابق طلاق طہر میں ہی ہو سکتی ہے اور حدیث ابن عمر میں جو کچھ گزرا ہے اس کے مطابق ثلاثۃ قروء کا تصور حیضوں میں ہی کیا جا سکتا ہے نہ کہ اطہار میں۔ کیونکہ وہ طہر جس میں طلاق واقع ہوئی ہے یا تو وہ عدت میں شمار نہیں کیا جائے گا اور یہ اجماع کے خلاف ہے اور کسی نے بھی ایسا نہیں کہا کیونکہ اس سے تین پر زیادتی لازم آتی ہے۔ یا پھر اسے عدت میں شمار کیا جائے گا تو اس طرح عدت دو طہر اور تیسرے طہر کا کچھ حصہ بنے گی۔ نتیجۃً اس طرح تین طہر مکمل نہیں ہو سکیں گے۔ اور اگر ثلاثۃ کا اطلاق دو مکمل اور تیسرے طہر کے بعض حصے پر کرنا جائز ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ" میں ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ کا اطلاق دو ماہ مکمل اور تیسرے مہینے کے کچھ حصے پر کرنا بھی جائز ہے حالانکہ یہ کسی نے بھی نہیں کہا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ کیا قول باری تعالیٰ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ میں اشہر کا اطلاق دو ماہ مکمل اور تیسرے مہینے کے بعض حصے پر نہیں ہے؟ تو اس بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر یہ نہیں فرمایا "اَلْحَجُّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ مَّعْلُوْمٰتٌ" بلکہ فرمایا اَشْهُرٌ اور وہاں یہ نہیں فرمایا قُرُوْءٌ بلکہ فرمایا ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔ چونکہ یہ انداز زیادہ واضح اور اپنے معنی پر زیادہ دلالت کرتا ہے اس لئے اسے تین سے کم پر مجازاً محمول کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس میں ثلاثۃ کا کلمہ مجاز سے مانع ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معتبر مکمل اقراء ہیں، ایک قرء کا بعض حصہ معتبر نہیں اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی وہ حدیث جس سے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے، اس میں رسول اللہ ﷺ نے اس طہر میں طلاق جائز نہیں قرار دی جو اس حیض کے ساتھ متصل ہے جس میں انہوں نے پہلی طلاق واقع کی تا کہ مکمل حیض کے فاصلے کے بغیر دو طلاقیں جمع نہ ہو جائیں۔

3۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ لونڈی کے لئے طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہے [1] اور اس پر اجماع ہے کہ لونڈی اور آزاد کے مابین ان چیزوں میں کوئی اختلاف نہیں جن کا اعتبار کیا جاتا ہے، بلکہ صرف ان کی مقدار میں اختلاف ہوتا ہے۔ تو اس سے بھی معلوم ہوا کہ قروء سے مراد حیض ہیں۔

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 491 (العلمیہ)

4۔ بیشک عدت براءتِ رحم کی پہچان کے لئے مشروع قرار دی گئی ہے اور یہ حیض سے ہو سکتی ہے نہ کہ طہر سے۔ اسی وجہ سے لونڈی پر حیض کے ساتھ استبراء واجب ہے نہ کہ طہر کے ساتھ۔

5۔ اگر قروء طہر کے معنی میں ہو تو پھر تیسرے حیض کے داخل ہونے کے ساتھ ہی عدت گزر جائے گی اور اگر حیض کے معنی میں ہو تو پھر تیسرے حیض سے پاک ہونے تک عدت ختم نہیں ہوگی نتیجۃً شک کے ساتھ عدت نہیں گزرے گی۔ ہمارا مذہب خلفاء راشدین، عبادلہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، ابوالدرداء، عبادہ بن صامت، زید بن ثابت اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور ان میں ابوداؤد اور نسائی نے معبد الجہنی کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اور تابعین میں سے سعید بن المسیب، ابن جبیر، عطاء، طاؤس، عکرمہ، مجاہد، قتادہ، ضحاک، حسن بصری، مقاتل، شریک القاضی، ثوری، اوزاعی، ابن شبرمہ، ربیعہ، سدی، ابوعبیدہ اور اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی اسی طرح کہا ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرف رجوع کیا ہے اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں کہا ہے کہ ہمیں عیسیٰ بن ابی عیسیٰ خیاط نے شعبی سے اور انہوں نے تیرہ اصحاب نبی ﷺ سے حدیث بیان کی ہے کہ ان تمام نے کہا کہ مرد اپنی عورت کا زیادہ حق رکھتا ہے یہاں تک کہ وہ تیسرے حیض سے پاک ہونے کا غسل کرلے واللہ اعلم۔

۳؎ یعنی عورتوں کے لئے یہ حلال نہیں کہ وہ اسے چھپائیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کی رحموں میں حمل یا حیض پیدا کردیا ہے، اپنی عدت کے جلدی گزرنے کے لئے یا پھر مرد کے رجوع کے حق کو باطل کرنے کے لئے ایسا کرنا حلال نہیں اور اس میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ اس بارے میں عورت کا قول مقبول ہوتا ہے۔

۴؎ یہاں جزاء محذوف ہے یعنی "اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ لَا يَكْتُمْنَ"۔ کیونکہ بندہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ فعل حرام کا ارتکاب نہیں کرتا اور اس سے مقصود تاکید اور توبیخ ہے واللہ اعلم۔

۵؎ "وَبُعُوْلَتُهُنَّ" "بَعْلٌ" کی جمع ہے اور تاء جمع مؤنث کے لئے ہے جیسے کہ عمومة ہے اور بعل کا اصل معنی مالک اور سردار ہے اور خاوند کو بعل کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ اپنی زوجہ کو حکم دینے میں مالک کے قائم مقام ہوتا ہے اور اس کی ضمیر عورتوں میں سے طلاق رجعیہ والی عورتوں کی طرف لوٹ رہی ہے اور اس میں کوئی امتناع نہیں ہے۔ جیسا کہ ظاہر کو مکرر ذکر کیا اور دوسری مرتبہ اسے خاص کردیا یا پھر بعولۃ مصدر ہے اور اسے مضاف محذوف کے قائم مقام ذکر کیا گیا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے "اهل بعولتهن"۔

۶؎ "اَحَقُّ" یہ صیغہ اسم تفضیل ہے اور فاعل کے معنی میں ہے، یعنی حَقِيْقٌ یعنی وہ رجعة کے سبب انہیں نکاح کی طرف لوٹانے کا زیادہ حق رکھتے ہیں چاہے، عورت راضی ہو یا نہ ہو۔ فی ذالک سے مراد (یعنی عدت کے زمانہ میں آدمی رجوع کرنے کا حق زیادہ رکھتا ہے۔) انتظار (عدت) کا زمانہ ہے۔

۷؎ اگر وہ رجوع کے سبب اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں نہ کہ عورت کو ضرر پہنچانے کا۔ جیسا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے کہ آدمی اپنی عورت کو طلاق دیتا تھا پھر جب اس کی عدت گزرنے کے قریب ہوتی تو وہ اس کی طرف رجوع کرلیتا اور پھر اسے طلاق دے دیتا۔ البتہ اس سے یہ مراد نہیں کہ رجعت کے لئے اصلاح کا ارادہ شرط ہے بلکہ اگر اس نے ضرر پہنچانے کے ارادے سے بھی رجوع کیا تو رجوع ہو جائے گا۔ یہ تو صرف تکلیف دینے کے ارادے سے روکنے کے لئے ہے اور اصلاح پر برانگیختہ کرنے کے لئے ہے۔ یا پھر تقدیر عبارت اس طرح ہوگی "اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ فِي الرَّجْعَةِ" (اگر وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہیں تو ان کے لئے

رجوع کرنے میں کوئی حرج نہیں) طلاق رجعی سے رجوع کے جائز ہونے پر تمام علماء کا اجماع ہے اور اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا عدت کے دوران اس سے وطی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی اپنی ظاہر روایت میں کہا ہے کہ وطی جائز ہے اور ان کے دوسرے قول میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح یہ ہے کہ جائز نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے زوجیت قاطع یعنی طلاق کے پائے جانے کے سبب زائل ہو جاتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ طلاق کا عمل عدت گزرنے تک بالاجماع مؤخر ہوتا ہے اس لئے کہ عدت کے دوران ان کے درمیان وراثت جاری ہوتی ہے، عورت کی رضامندی کے بغیر رجوع جائز ہوتا ہے اور نفقہ واجب ہوتا ہے۔ تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نکاح ابھی تک قائم ہے اور اس پر رب کریم کا قول بُعُوْلَتُهُنَّ بھی دلالت کرتا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ بعل کا اطلاق توما کان کے اعتبار سے جائز ہے اور لفظ اَلرَّد نکاح کے زوال پر دلالت کرتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ لفظ بعل میں مجاز کا قول کرنا لفظ الرد میں مجاز کا قول کرنے کی نسبت اَولیٰ نہیں ہے۔ بیشک جب کسی بیع میں بائع کو خیار حاصل ہو تو کہا جاتا ہے رَدَّ الْبَيْعَ (اس نے بیع کو رد کر دیا)۔ لہٰذا جب اس آیت میں لفظ بعل اور لفظ الرد میں مجاز کے احتمالوں کے مابین تعارض آ گیا تو دونوں کا اعتبار ساقط ہو گیا اور باقی یہ قول محفوظ و سالم رہے "فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ" اور "فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ" تو ان میں امساک (نکاح کے) باقی رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ اور لفظ الرد کو پہلی حالت کی طرف لوٹانے پر محمول کرنا بھی ممکن ہے۔ اور یہ وہ حالت ہے جس میں عورت کو عدت گزرنے کے بعد بھی حرام قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس وقت بالکل کوئی اشکال پیدا نہیں ہوگا۔

دوسرا اختلاف اس مسئلہ میں ہے کہ کیا رجوع کرنے کے لئے قول شرط ہے۔ تو اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ رجوع قول کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے اور ان کے اس قول کی بناء اس قول پر ہے کہ رجعت ابتدائے نکاح کے قائم مقام ہوتی ہے اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جب خاوند عورت سے وطی کر لے، یا اسے بوسہ دے لے یا اسے شہوت کے ساتھ مس کر لے یا شہوت کے ساتھ اس کی فرج کی طرف دیکھ لے تو اس کا بھی اسی طرح رجوع ہو جاتا ہے جیسے بالقول رجوع ہو جاتا ہے اور اس کی بنیاد اس قول پر ہے کہ ان دونوں کے نزدیک رجعت ابتدائے نکاح کے قائم مقام نہیں بلکہ اسے باقی رکھنے کے لئے ہے۔ لہٰذا اس میں ایسا فعل کافی ہوتا ہے جو استدامت پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ خیار کو ساقط کرنے کے لئے فعل کافی ہوتا ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ اگر وطی کے ساتھ اس نے رجوع کی نیت کی تو وہ ہو جائے گا اور اگر نیت نہ کی تو نہیں ہوگا۔

تیسرا مسئلہ جس میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ کیا رجعت کے لئے گواہ بنانا شرط ہیں؟ تو اس کے بارے میں امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے سورۂ طلاق کی اس آیت پر عمل کرتے ہوئے کہا ہے کہ گواہ بنانا شرط ہیں "وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ" اور امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنے دو قولوں میں سے اصح میں اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دو روایتوں میں سے ایک میں کہا ہے کہ اس کے لئے گواہ بنانا شرط نہیں اور آیت طیبہ میں امر کو استحباب کے معنی پر محمول کیا جائے گا کیونکہ اگر اس کے لئے گواہ بنانا واجب ہوں تو پھر فرقت پر بھی گواہ بنانا واجب ہوں گے کیونکہ اس کے قریب یہ قول بھی ہے "اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ" لیکن یہ قول کسی نے بھی نہیں کہا۔ اسی طرح یہ بھی ہے کہ اگر یہ واجب ہوں تو پھر بالاستقلال واجب ہوں گے اور یہ رجعت کے لئے شرط نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ قول تو عام ہے۔ فرمایا "فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ"۔

△ "وَلَهُنَّ" یعنی عورتوں کے خاوندوں پر حقوق ہیں۔ جیسے خاوندوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اور ان کا تعلق وجوب اور مطالبہ کے

استحقاق سے ہے نہ کہ جنس سے۔ یعنی ہر وہ شی (حق) جو شریعت میں معروف ہے یعنی حقوق نکاح کی ادائیگی اور حسن صحبت۔ اور کسی کے لئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ دوسرے کو ضرر پہنچانے کا ارادہ کرے بلکہ انہیں ایک دوسرے کی اصلاح کا قصد کرنا چاہئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ میں اپنی بیوی کے لئے زیب و آرائش کرنا اسی طرح پسند کرتا ہوں جیسے وہ میرے لئے بناؤ سنگھار کرنا پسند کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" حضرت معاویہ قشیری سے روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے عرض کی" یارسول اللہ ﷺ! ہم میں سے کسی پر اس کی بیوی کا کیا حق ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جب تو کھانا کھائے تو اسے کھانا کھلا، جب تو لباس پہنے تو اسے بھی پہنا، اس کے چہرے پر ضربیں نہ لگا، اسے قبیح اور برا نہ کہہ اور گھر کے سوا اسے نہ چھوڑ" (1) اسے امام احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور جعفر بن محمد اپنے باپ سے حجۃ الوداع کے قصہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نویں ذوالحجہ کے دن اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا۔" عورتوں کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، بیشک تم نے انہیں اللہ تعالیٰ کی امان کے ساتھ حاصل کیا ہے اور تم نے ان کی شرمگاہیں اللہ تعالیٰ کے کلمات کے ساتھ حلال کی ہیں اور تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستروں کو کسی کے ساتھ نہ روندیں، اس لئے کہ تم اسے ناپسند کرتے ہو اور اگر وہ ایسا کریں تو تم انہیں شدید مار دو مگر وہ ظاہر نہ ہو (یعنی زخمی نہ کر دو) اور ان کے لئے تم پر معروف رزق اور لباس لازم ہے" (2) اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ" رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مؤمنین میں سے ایمان کے اعتبار سے کامل وہ ہے جو اخلاق کے اعتبار سے حسین ہے اور تم میں سے اچھے وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لئے اچھے ہیں" (3) اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اسے خلقا کے قول تک ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ اور حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی بھی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ لگائے، الحدیث متفق علیہ (4) حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا" تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل کے لئے بہتر ہے اور میں اپنے اہل کے لئے بہتر ہوں" (5) اسے ترمذی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم عورتوں کو اچھائی کی نصیحت کرتے رہو (6) بیشک انہیں پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اور پسلیوں میں سے سب سے زیادہ ٹیڑھی اوپر والی ہے، لہٰذا تو اگر اسے سیدھا کرنے لگا تو اسے توڑ دے گا اور اگر تو اسے چھوڑ دے گا تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ اس لئے تم عورتوں کو نصیحت کرتے رہو، متفق علیہ۔

۹ اور مردوں کے عورتوں پر حقوق زیادہ ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر میں کسی کو کسی کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں یقیناً عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر مردوں کے حقوق لازم کئے ہیں (7) اسے ابوداؤد نے قیس بن سعد سے روایت کیا ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معاذ بن جبل سے اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے اور بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوظبیان سے روایت کیا ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 298 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 397 (قدیمی) 3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 138 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 474 (وزارت تعلیم) 5۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 481 (العلمیہ)
6۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 779 (وزارت تعلیم) 7۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 291 (وزارت تعلیم)

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو بھی عورت اس حال میں فوت ہوئی کہ اس کا خاوند اس سے راضی ہو تو وہ جنت میں داخل ہو گی(1) اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور طلق بن علی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مرد اپنی بیوی کو بلائے تو اسے چاہئے کہ وہ آئے اگرچہ وہ تنور پر ہو(2) اسے ترمذی نے نقل کیا ہے۔

۵ یعنی اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لینے کی قدرت رکھتا ہے جو دوسرے پر ظلم کرتا ہے۔ وہ حکمت اور مصلحت کے تحت احکام نافذ فرماتا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

”طلاق دو بار ہے ۱ پھر یا تو روک لینا ہے بھلائی کے ساتھ ۲ یا چھوڑ دینا ہے احسان کے ساتھ اور جائز نہیں تمہارے لئے کہ لو تم اس سے جو تم نے دیا ہے انہیں کچھ بھی ۳ بجز اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو ۴ پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو تو کوئی حرج نہیں ان پر کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑا لے ۵ یہ حدیں ہیں اللہ کی سو ان سے آگے نہ بڑھو اور جو کوئی آگے بڑھتا ہے اللہ کی حدوں سے سو وہی لوگ ظالم ہیں ۶“

۱ یعنی وہ طلاق جس کے بعد رجوع ہو سکتا ہے اور اس کی دلیل مرتٰن کے بعد تیسری طلاق اور امساک کا ذکر ہے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا تیسری کہاں ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا ”اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ“(3) اسے ابوداؤد نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے اور سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اور ابن مردویہ نے ابن رزین اسدی کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ دار قطنی اور ابن مردویہ نے حدیث انس سے روایت کیا ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عروہ بن زبیر نے کہا ہے کہ ابتدائے اسلام میں لوگ بغیر حصر اور عدد کے طلاقیں دیتے تھے۔ ایک آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا پھر جب اس کی عدت گزرنے کے قریب ہوتی تو وہ اس سے رجوع کر لیتا پھر اسے طلاق دیتا اور پھر اسے تکلیف پہنچانے کے ارادے سے اس سے رجوع کر لیتا۔ تب اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ نازل ہوئی کہ جب وہ تیسری بار طلاق دے گا تو وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو گی مگر دوسرے مرد سے نکاح کرنے کے بعد(4) آیت طیبہ میں مَرَّتَانِ فرمایا اِثْنَتَانِ نہیں کہا۔ تو اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ایک ہی دفعہ دو طلاقیں دینا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے کیونکہ مَرَّتَانِ کا کلمہ عبارۃ کے ذریعے تفرق پر دلالت کرتا ہے اور دلالۃ الاشارۃ کے ذریعے عدد پر، اور ”الطلاق“ پر لام جنس کے لئے ہے اور جنس سے وراء کوئی شی بھی نہیں۔ نتیجۂ قیاس یہ ہے کہ شرعاً دو اکٹھی طلاقیں دینا معتبر نہیں ہے۔ تو جب دو طلاقیں معتبر نہیں تو پھر تین اکٹھی طلاقیں دینا بدرجہ اولیٰ معتبر نہیں ہوں گی کیونکہ ان میں دو زیادتی کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ طلاق سے مراد تطلیق (طلاق دینا) ہے

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 138 (وزارت تعلیم)　　2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 138 (وزارت تعلیم)
3۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 495 (العلمیہ)　　4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 191 (التجاریہ)

اور معنی یہ ہے کہ شرعاً طلاق دینے کا طریقہ یہ ہے کہ متفرق طہروں میں ایک کے بعد ایک طلاق ہو وہ جمع نہ ہوں۔ تو اس صورت میں مرتان سے مراد تثنیہ نہیں ہوگا بلکہ اس سے مراد تکریر ہوگی۔ جیسا کہ رب کریم کے اس ارشاد میں ہے ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ یعنی بار بار لیکن اس وقت اشکال اس قول کے عطف میں ہوگا "فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ" اور "فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ" کیونکہ اس تاویل کے مطابق اللہ تعالیٰ کا قول "الطَّلَاقُ" "طلقات ثلاثة" پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے۔ مذکورہ دونوں تاویلوں کی بناء پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دو یا تین طلاقوں کو ایک لفظ کے ساتھ جمع کرنا یا مختلف الفاظ کے ساتھ ایک طہر میں جمع کرنا حرام ہے، بدعت ہے، گناہ میں مبتلا کرنے والا ہے۔ بخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے کہ وہ کہتے ہیں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس بات پر ائمہ نے اجماع کیا ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو کہا "انت طالق ثلاثا" (تو تین طلاقوں والی ہے) تو ان سے بالاجماع تین واقع ہو جائیں گی۔ اور امامیہ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے ایک ہی دفعہ تین طلاقیں دے دیں تو اسی آیت کی وجہ سے بالکل طلاق واقع نہیں ہوگی اور بعض حنابلہ نے کہا ہے کہ ایک طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ صحیحین میں روایت ہے کہ ابوالصہباء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ کیا آپ نہیں جانتے کہ حضور نبی کریم ﷺ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں تین کو ایک بنایا جاتا تھا اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے چند سال بھی تین طلاقیں دینے سے ایک ہی شمار ہوتی تھی۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک لوگوں نے اس امر میں جلدی کی جو ان کے لئے مؤخر تھا، لہٰذا اگر ہم اسے ان پر نافذ کر دیں تو وہ ان پر نافذ ہو جائے گا(1) ابن اسحاق نے عکرمہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رکانہ بن عبد نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دیں اور پھر اس پر انہیں شدید غم اور پریشانی لاحق ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا: اسے کیسے طلاق دی؟ تو انہوں نے عرض کی میں نے اسے ایک مجلس میں تین طلاقیں دی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ تو ایک طلاق ہے تم اس سے رجوع کر لو(2) طاؤس اور عکرمہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا جس نے تین طلاقیں دیں اس نے سنت کی مخالفت کی، لہٰذا اسے سنت کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ ابن اسحاق نے بھی یہی کہا ہے۔ اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے یہ کہا کہ "انت طالق ثلاثا" کے قول میں مدخول بہا عورت کو تین واقع ہوں گی اور غیر مدخول بہا کو ایک طلاق واقع ہوگی۔ جیسا کہ امام مسلم، ابوداؤد، اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے کہ ابوالصہباء حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کثرت سے سوال کرتے تھے، لہٰذا انہوں نے ایک دن کہا کہ آپ نہیں جانتے کہ ایک آدمی جب اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تھا تو وہ اسے ایک طلاق شمار کرتے تھے؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا بلکہ جب آدمی اپنی بیوی کو اس سے دخول کرنے سے قبل تین طلاقیں دیتا تو حضور نبی کریم ﷺ، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں وہ اسے ایک طلاق شمار کرتے تھے۔ پھر جب آپ نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اس صورت میں کثرت سے ایک دوسرے کا پیچھا کرنے لگے ہیں تو فرمایا کہ تمہیں ان کے خلاف عورتوں کی تائید کرنی چاہئے(3) ایک کلمہ کے ساتھ طلاقوں کے جواز اور بغیر گناہ کے ان کے واقع ہونے پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل وہ حدیث ہے جو صحیحین میں ہے کہ حضرت سہل بن اسعد سے مروی ہے کہ عویمر العجلی نے اپنی بیوی سے لعان کیا جب دونوں فارغ ہو چکے تو عویمر نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میں اس کے خلاف جھوٹ بولنے والا ہوں گا اگر میں اسے روکے رکھوں۔ پھر اس نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ پس یہ تین طلاقیں تھیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کا انکار نہیں فرمایا(4) اور فاطمہ بنت قیس کی بعض روایات میں ہے کہ میرے خاوند نے مجھے تین طلاقیں دیں تو حضور نبی

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 478 (قدیمی) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 308 (وزارت تعلیم) 3۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 488 4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 3 (وزارت)

کریم ﷺ نے میرے لئے کوئی نفقہ اور سکنیٰ مقرر نہیں کیا(1) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے تماظر کو اپنی بیماری کی حالت میں تین طلاقیں دیں اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی شہباء کو تین طلاقیں دیں جب کہ اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ کو خلافت کی مبارک باد دی۔ پس یہاں دو مقام ہیں ایک یہ ہے کہ تین واقع کرنے کی صورت میں تین ہی واقع ہوتی ہیں اور دوسرا یہ کہ طلاق دینے والا ان کے سبب گنہگار ہوتا ہے۔ اس موقف پر ہماری دلیل سنت اور اجماع ہیں۔ سنت میں سے دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی اور پھر اس کے بعد دوسری دو طلاقیں دو قروء میں دینے کا ارادہ کیا۔ اتنے میں یہ خبر رسول اللہ ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا اے ابن عمر! اللہ تعالیٰ نے تجھے اس طرح حکم نہیں دیا تو نے سنت کے خلاف عمل کیا ہے۔ سنت یہ ہے کہ طہر آئے تو تو ہر طہر میں طلاق دے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مجھے حکم ارشاد فرمایا تو میں نے اس سے رجوع کرلیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا جب یہ پاک ہو لے تو اس وقت اسے طلاق دے یا اسے اپنے پاس روک لے۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ کی کیا رائے ہے اگر میں اسے تین طلاقیں دے دوں تو کیا میرے لئے اس کی طرف رجوع کرنا حلال ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، اس طرح وہ تجھ سے جدا ہو جائے گی اور ایسا کرنا معصیت ہے۔ اسے دار قطنی نے اور ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں حسن سے روایت کیا ہے کہ انہیں ابن عمر نے حدیث بیان کی اور ان کا ان سے سماع واضح اور صریح ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عطاء خراسانی کے سبب اس پر یہ جرح کی ہے کہ اس نے روایت میں ایسی زیادتی ذکر کی ہے جس کی متابع موجود نہیں اور یہ ضعیف راوی ہے، اس کی وہ روایت قبول نہیں ہوتی جسے روایت کرنے میں یہ منفرد ہو۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ امام بیہقی کی یہ جرح مردود ہے اس لئے کہ شعیب بن رزیق نے سند اور متن دونوں اعتبار سے اس کی اتباع کی ہے۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں جو کچھ مذکور ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ حدیث منسوخ ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین کا حکم صحابہ کرام کی موجودگی میں نافذ کیا اور اس پر امر کا مضبوط ہو جانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے پاس ناسخ کا ثبوت تھا۔ اگرچہ اس سے قبل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں وہ مخفی تھا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ بھی اس روایت کے خلاف صحیح ہے جسے آپ نے ہی روایت کیا۔ ابوداؤد مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھا تو ان کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں۔ پس آپ خاموش رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ آپ وہ عورت اس کی طرف واپس لوٹا دیں گے پھر آپ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی طلاق دیتا ہے تو انتہائی بیوقوفی کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر آ کر کہتا ہے اے ابن عباس، بیشک اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا" (جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے وہ اس کے لئے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے) تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی ہے اور تجھ سے تیری بیوی جدا ہو گئی ہے(2) اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیں تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی ہے اور تیری بیوی تجھ سے جدا ہو گئی ہے تو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرا کہ وہ تیرے لئے نکلنے کی راہ بناتا، الحدیث۔ اور موطا امام مالک میں ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی کہ ایک آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں آپ کیا رائے رکھتے ہیں۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تیری طرف سے اسے تین طلاقیں واقع ہوئی ہیں اور ستانوے کے ساتھ تو نے اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ تمسخر کیا ہے(3) تین

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 485 (قدیمی) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 306 (وزارت تعلیم) 3۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 500 (التراث العربی)

طلاقوں کے واقع ہونے پر اجماع منعقد ہو چکا تھا۔ موطا میں فقہاء صحابہ کرام سے مروی ہے کہ ایک آدمی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو آٹھ طلاقیں دی ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تجھے کیا کہا گیا تو اس نے کہا، مجھے کہا گیا کہ وہ تجھ سے جدا ہو گئی ہے۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو یہ کہتے ہیں انہوں نے سچ کہا ہے(1) تو اس سے یہ واضح ہوا کہ اس جواب پر اجماع ہے۔ اور محدث عبدالرزاق نے علقمہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا میں نے اپنی بیوی کو ننانوے طلاقیں دی ہیں تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا تین ہی اسے جدا کر دیتی ہیں اور یہ تمام کی تمام ظلم ہیں۔ سنن ابی داؤد اور موطا امام مالک میں ہے کہ محمد بن ایاس بن بکیر نے کہا کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو دخول سے قبل تین طلاقیں دیں پھر اسے اس سے نکاح کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ فتوٰی لینے کے لئے آیا۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ گیا۔ تو اس نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما دونوں سے اس کے بارے اکٹھا پوچھا تو دونوں نے جواب دیا کہ ہم یہ رائے نہیں رکھتے کہ تو اس سے نکاح کرے، یہاں تک کہ وہ تیرے علاوہ دوسرے خاوند سے نکاح کر لے۔ تو اس نے کہا میں نے تو اسے ایک ہی بار (تین) طلاقیں دے دی تھیں۔ یہ سن کر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا بیشک تو نے اپنے آگے وہ سب بھیج دی ہیں جو تیرے پاس فالتو تھیں۔ موطا امام مالک میں اسی کی مثل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے اور وکیع اعمش کے واسطہ سے حبیب بن ثابت سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاق دے دی ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ تجھ سے تین طلاقوں کے ساتھ جدا ہو گئی ہے(2) اور وہ بقیہ تمام اپنی عورتوں (بیویوں) پر تقسیم کر لے۔ وکیع معاویہ بن ابی یحییٰ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور کہا میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاق دی ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ آپ سے تین طلاقوں کے ساتھ جدا ہو گئی ہے۔ محدث عبدالرزاق نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ان کے باپ نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دی ہے۔ پس حضرت عبادہ چلے اور رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اس کے بارے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کی معصیت کے باوجود تین طلاقوں کے ساتھ جدا ہو گئی ہے اور بقیہ نوسو ستانوے عداوت اور ظلم ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے عذاب دے اور اگر چاہے تو اسے بخش دے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا وہ عورت مرد کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ دوسرے زوج سے نکاح کر لے۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس جب ایسا آدمی لایا جاتا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہوتیں تو آپ رضی اللہ عنہ اس کی پیٹھ پر تکلیف دہ ضربیں (درے) لگواتے(3) اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت کی ہے کہ جس نے باکرہ عورت کو تین طلاقیں دیں تو وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ دوسرے زوج سے نکاح کر لے۔ مخالفین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی جو حدیث ذکر کی ہے اس کی تاویل کرنا اس طرح ممکن ہے کہ آدمی کا یہ قول انت طالق انت طالق پہلے زمانہ میں ایک طلاق شمار ہوتا تھا اس لئے کہ اس زمانے میں وہ اس سے تاکید کا ارادہ کرتے تھے۔ پھر وہ نئی طلاق کا قصد کرنے لگے تو جب ان کے ارادے کا علم ہوا تو آپ نے ان کے لئے تین لازم کر دیں، یا پھر احتیاطاً یہ حکم جاری کیا۔ اور رکانہ کی حدیث منکر ہے اور اصح روایت وہ ہے جسے ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو بائنہ طلاق دی تو رسول اللہ ﷺ نے اسے اس پر محمول کیا کہ بیشک اس نے ا

1۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 550 (التراث العربی)، 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 496 (العلمیہ)، 3۔ ایضاً

سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے چنانچہ آپ ﷺ نے عورت کو اس کی طرف واپس لوٹا دیا(1) تو اس نے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دوسری طلاق دی اور پھر تیسری طلاق حضرت عثمان ذوالنورین کے زمانہ میں دی۔ ابوداؤد نے کہا یہ روایت اصح ہے۔ اور جو احادیث اور آثار ہم نے ذکر کئے ہیں ان سے جس طرح تین طلاقوں کا بیک وقت واقع ہونا ثابت ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ بدعت اور معصیت ہیں۔ اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے لعان کے بعد عویمر کے تین طلاقیں دینے کا ذکر کیا ہے تو اس سے آپ ﷺ کے انکار نہ کرنے پر استدلال ہوتا ہے اور ایک دوسرے واقعہ میں آپ ﷺ سے انکار ثابت ہونے کے بعد اب نفی پر شہادت کا کوئی اعتبار نہیں اور اس میں یہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے انکار کیا ہو اور راوی نے اسے ذکر نہ کیا ہو۔ یا پھر آپ ﷺ نے اس لئے انکار نہ کیا ہو کہ لعان کرنے کے بعد اب وہ محل طلاق باقی ہی نہیں رہی۔ فاطمہ بنت قیس کی حدیث میں ثلاث کے الفاظ صحیح نہیں ہیں۔ صحیح لفظ یہ ہے: اِنَّہٗ طَلَّقَھَا اَلْبَتَّۃَ اور یہ بھی ہے کہ جب انہوں نے اسے طلاق دی تھی تو ان کے خاوند ان سے غائب تھے اور ایک جنگ میں حاضر تھے۔ اور وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حاضر نہیں تھے کہ آپ کی طرف سے نفقہ مقرر کرنے کا اظہار ہوتا۔ حالانکہ آپ کی طرف سے تین طلاقیں واقع ہونے کی صورت میں نفقہ وغیرہ کی تقریر ثابت ہے۔ اسی طرح فاطمہ بنت قیس کی حدیث کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رد کر دیا اور فرمایا ہم نہیں جانتے آیا اس نے سچ بولا یا جھوٹ، اسے بات یاد رہی یا بھول گئی۔ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما کے اثر حدیث مرفوع کے مقابلہ میں حجت نہیں ہو سکتے۔

مسئلہ:۔ اکٹھی تین طلاقیں دینا بدعت اور حرام ہے اور تینوں کو تین طہروں پر متفرق کرنا مباح اور جائز ہے اور اس کی دلیل یہ آیت اس ارشاد تک ہے فَاِنْ طَلَّقَھَا الآیہ تمام صورتوں میں سے احسن یہ ہے کہ جب آدمی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور ہو تو وہ اسے ایک طلاق دے۔ پھر اگر رجوع کرنے کا ارادہ نہ ہو تو اسے اسی حالت پر رہنے دے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مباح اعمال میں سے سب سے ناپسندیدہ عمل طلاق ہے اور حاجت ایک طلاق سے پوری ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جادو (سحر) کی مذمت میں فرماتے ہیں "فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْھُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِہٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِہٖ" حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے پھر وہ اپنا لشکر بھیج دیتا ہے کہ وہ لوگوں کو فتنوں میں مبتلا کرے پھر وہ ان میں سے رتبہ کے اعتبار سے اسے اپنے زیادہ قریب کرتا ہے جو فتنہ کے اعتبار سے سب سے بڑا ہو۔ اتنے میں ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے میں نے یہ یہ کیا۔ تو وہ اسے کہتا ہے تو نے کچھ نہیں کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور وہ کہتا ہے میں نے فلاں کو نہیں چھوڑا یہاں تک کہ میں نے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کرا دی تو ابلیس اسے اپنے قریب بلاتا ہے اور کہتا ہے تو نے بہت اچھا کیا ہے۔ اعمش نے کہا ہے کہ میرا خیال ہے آپ رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا کہ وہ اس سے چمٹ جاتا ہے(2) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال اعمال میں سے مبغوض ترین عمل طلاق ہے(3) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ حالت حیض میں بالاجماع طلاق واقع ہو جاتی ہے بخلاف امامیہ کے، ان کا کہنا ہے بالکل واقع نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک طلاق واقع ہو جاتی ہے لیکن یہ بالاجماع حرام ہے، اس کے بعد رجوع کرنا واجب ہوتا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی جو حدیث گزر چکی ہے وہ طلاق کے واقع ہونے، اس کے حرام ہونے اور اس سے رجوع کرنے کے وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ اس مسئلہ میں

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 307 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم جلد 2 صفحہ 376 (قدیمی) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 303 (وزارت تعلیم)

اختلاف ہے کہ اگر وہ رجوع کرنے کے بعد سنت طریقے کے مطابق دوبارہ طلاق دینے کا ارادہ کرے تو وہ کب طلاق دے؟ تو اس بارے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جب عورت اس حیض سے پاک ہو، پھر اسے حیض آئے اور وہ دوسرے حیض سے بھی پاک ہو جائے تو اس وقت وہ اسے طلاق دے سکتا ہے۔ اسی طرح امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مبسوط میں ذکر کیا ہے اور انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے صاحبین سے کوئی اختلاف ذکر نہیں کیا اور یہی امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی کہا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں سے بھی مشہور یہی ہے۔ اور یہی مفہوم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے جو صحیحین میں مذکور ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انہیں حکم دو کہ وہ اس سے رجوع کر لیں پھر اسے پاک ہونے تک روکے رکھیں پھر جب دوبارہ حیض آئے اور وہ اس سے بھی پاک ہو لے تو پھر اگر اسے طلاق دینے کی ضرورت ہو تو اسے مس کرنے سے قبل طلاق دے دے۔ پس یہ وہ طریقہ ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے(1) اور ایک روایت میں اس طرح ہے یہاں تک کہ اسے اس حیض کے سوا ایک نیا حیض آ جائے جس میں مرد نے اسے طلاق دی تھی(2) امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ذکر کیا ہے کہ وہ اسے طہر میں طلاق دے جو اس حیض کے بعد آ رہا ہے جس میں اس نے اسے پہلی طلاق دی تھی۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول بھی اسی طرح ہے اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ پہلا قول امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور دوسرے قول کی دلیل حضرت سالم رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جو مذکور حدیث ابن عمر میں ہے "کہ اسے حکم دو وہ اس سے رجوع کر لے پھر اسے طلاق دے، چاہے وہ طاہر ہو یا حاملہ ہو"(3) اسے مسلم اور اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔ لیکن پہلا قول اولیٰ ہے کیونکہ وہی صحت کے لئے اقویٰ ہے اور اس میں تفسیر زیادہ ہے اور اس میں زیادتی بھی ہے اور زیادتی کو لینا اولیٰ ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد "وہ اسے روکے رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے" اس پر دلالت کرتا ہے کہ رجعت کا مستحب ہونا یا رجعت کا واجب ہونا اس حیض کے ساتھ مقید ہے جس میں اس نے اسے طلاق دی ہے۔ پس اگر اس نے اس میں رجوع نہ کیا یہاں تک کہ وہ اس سے پاک ہو گئی تو اس کی معصیت پختہ ہو گئی۔

؎ رجوع اور حسن معاشرت کے سبب روک لیتا ہے۔ دو طلاقوں کے بعد روک لینے کا یہ حکم بالاجماع ثابت ہے۔ بشرطیکہ زوجین آزاد ہوں۔ لیکن جب دونوں غلام ہوں تو پھر بالاجماع دو طلاقوں کے بعد رجوع نہیں ہو سکتا اور اگر لونڈی کا نکاح آزاد مرد کے ساتھ ہو یا آزاد عورت کا نکاح غلام مرد کے ساتھ ہو تو اس میں ائمہ نے اختلاف کیا ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اگر خاوند آزاد ہو تو اسے تین طلاقوں کا اختیار ہے اگرچہ اس کے تحت لونڈی ہو اور اگر خاوند غلام ہو تو اسے دو طلاقوں کا اختیار ہے اگرچہ اس کی بیوی آزاد عورت ہو۔ یہی قول حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے برعکس کہا ہے۔ وہ طلاق میں عورتوں کا اعتبار کرتے ہیں (یعنی اگر عورت آزاد ہو تو اس کے لئے تین طلاقیں ہوں گی، اگرچہ خاوند غلام اور اگر عورت لونڈی ہو تو اس کے لئے صرف دو طلاقیں ہوں گی، اگرچہ مرد آزاد ہو) یہی قول حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا ہے۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے دونوں طرفوں میں احادیث مروی ہیں اور وہ تمام کی تمام ضعیف ہیں۔ علامہ ابن جوزی نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا غلام کے لئے دو طلاقوں کا اختیار ہے اور لونڈی کی عدت دو حیض ہیں اور ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی اور دار قطنی رحمہم اللہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 5، صفحہ 2011 مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 476 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 476 (قدیمی)

تعالیٰ نے آپ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لونڈی کے لئے دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہے"(1) ابن جوزی نے کہا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کا ایک راوی مظاہر بن اسلم ہے اس کے بارے یحییٰ بن سعید نے کہا ہے مظاہر کوئی شئی نہیں ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے وہ منکر الحدیث ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے، ابن حبان نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔ حاکم کا قول ہے مظاہر اہل بصرہ کا شیخ ہے اور ہمارے متقدمین مشائخ میں سے کسی نے بھی ان کے بارے جرح ذکر نہیں کی۔ علامہ ابن جوزی نے کہا ہے کہ جنہوں نے کہا ہے طلاق مردوں کے اعتبار سے ہوگی، ان میں سے بعض نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا طلاق مردوں کے اعتبار سے ہوگی اور عدت عورتوں کے لحاظ سے ہوگی(2) بیشک یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کلام میں سے ہے۔ ابن جوزی نے دار قطنی کی سند سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا لونڈی کے لئے طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہے(3) ابن جوزی نے کہا ہے کہ یہ دونوں حدیثیں ثابت نہیں ہیں۔ پہلی حدیث میں راوی سلیم بن سالم ہے ابن المبارک ان کی تکذیب کرتے تھے۔ یحییٰ نے کہا ہے اس کی حدیث کوئی شئی نہیں اور سعدی نے کہا ہے وہ ثقہ نہیں ہے۔ اور دوسری حدیث کے بارے دار قطنی نے کہا ہے کہ اسے مرفوع نقل کرنے میں عمرو بن شعیب منفرد ہے اور وہ ضعیف ہے۔ یحییٰ بن معین نے کہا ہے عمرو بن شعیب کوئی شئی نہیں اور ابو زرعہ نے کہا ہے وہ واھی الحدیث ہے اور صحیح یہ ہے کہ وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی ترجیح اس طرح ممکن ہے کہ بیشک ہم پہلے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ طلاق متفرق اطہار میں دینا ضروری ہے۔ اور طلاقوں کی تعداد طہروں کی تعداد کے مطابق ہی متصور ہو سکتی ہے اور اس پر اجماع ہے کہ لونڈی کی عدت دو حیض ہے۔ لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ لونڈی کے لئے طلاقیں بھی دو ہیں، واللہ اعلم۔

یہاں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے بارے ایک اشکال ہے وہ یہ کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کے مطابق عام اپنے افراد کو قطعی طور پر شامل ہوتا ہے اور عام کتاب اللہ کی تخصیص خبر واحد اور قیاس کے ساتھ جائز نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ان دونوں سے اس کا نسخ جائز نہیں ہوتا اور قول باری تعالیٰ "وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ" اور قول باری تعالیٰ "اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ" دونوں عام ہیں اور یہ آزاد عورتوں اور لونڈیوں کو شامل ہیں۔ لہٰذا ان کی تخصیص آپ ﷺ کے اس ارشاد سے "طَلَاقُ الْاَمَةِ ثِنْتَانِ وَعِدَّتُهَا حَيْضَتَانِ" صحیح نہیں کیونکہ یہ خبر واحد ہے اور یہ بھی نہیں کہا جائے گا کہ عام قطعی میں سے بعض افراد کی تخصیص جب پہلے دلیل قطعی سے کر دی جائے تو پھر باقی افراد کے لئے وہ ظنی ہو جاتا ہے اور اس وقت اس کی تخصیص خبر واحد اور قیاس کے ساتھ جائز ہوتی ہے۔ لہٰذا قول باری تعالیٰ "وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ الآيَة" کو اولاً ان آیات طیبات سے خاص کیا گیا ہے "وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ الآيَة" اور "وَالّٰٓئِیْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ الآيَة"۔ لہٰذا اس کی تخصیص آخبار آحاد سے جائز ہے۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ مخصص متصل ہوتا ہے اور جو متراخی ہو وہ ناسخ ہوتا ہے مخصص نہیں ہوتا۔ اور جو آیات تم نے تلاوت کی ہیں ان میں سے کوئی بھی اس آیت سے متصل نہیں بلکہ وہ متراخی ہیں، لہٰذا وہ ناسخ ہیں اور عام کے بعض افراد سے حکم کا منسوخ ہونا بقیہ افراد میں اس کے حکم کو ظنی نہیں کرتا، بلکہ وہ باقی افراد کے لئے اسی طرح قطعی ہوتا ہے جیسا کہ نسخ سے پہلے تھا۔ اس اشکال سے رہائی اس طرح ہو سکتی ہے کہ کہا جائے جب اس پر اجماع امت ثابت ہو چکا ہے

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 538 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 491 (العلمیہ)
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 4 صفحہ 38 مطبوعہ دار المحاسن قاہرہ

کہ آیت عدت اور آیت طلاق آزاد عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے اول اجماع کرنے والے صحابہ کرام ہیں۔ تحقیق انہوں نے بالیقین رسول اللہ ﷺ سے ان کے حق میں کوئی قول سنا ہے اور اسی قول کے سبب انہوں نے ان آیات کو خاص کیا، اگرچہ وہ قول ہم تک بالتواتر نہیں پہنچا۔ اگر وہ رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں نہ سنتے تو وہ قطعی آیت کی تخصیص کی جرأت نہ کرتے۔ ورنہ ضلالت پر ان کا اجتماع لازم آئے گا پھر تبعین ان کے راستے کے علاوہ کسی راستے کی خواہش سے روکنے کے لئے ان ہی کے راستے پر چلے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اجماع اس بات پر نہیں ہے کہ طلاق کا اعتبار مردوں کے سبب سے ہوگا یا عورتوں کے سبب سے، تو یہ جواب وہاں کیسے جاری ہوگا؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ بات بالا جماع ثابت ہے کہ قول باری تعالیٰ "اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ" اپنے عموم پر نہیں ہے اور یہ اختلاف ضرر رساں نہیں ہو اللہ اعلم۔

کہا گیا ہے کہ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ سے مراد تیسری طلاق ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قول پختہ نہیں ہے کیونکہ اس کا عطف "فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ" پر ہے، یعنی دو امروں میں سے ایک واجب ہے امساک بالمعروف یا تیسری طلاق۔ حالانکہ اس طرح نہیں بلکہ اس کے لئے جائز ہے کہ نہ وہ اسے روکے اور نہ طلاق دے بلکہ چھوڑ دے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کی طرف رجوع نہ کرے یہاں تک کہ وہ عدت گزرنے کے سبب اس سے جدا ہو جائے۔ اس قول پر اسی کی مثل اعتراض وارد ہوتا ہے جو پہلے پر ہوتا ہے۔ یہ دونوں قول امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کئے ہیں۔ اَولیٰ یہ ہے کہ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کی تفسیر اس طرح کی جائے کہ وہ اسے مطلقاً جدا کر دے چاہے تیسری طلاق کے ساتھ یا عدت گزرنے کے ساتھ اور معنی یہ ہے کہ بھلائی کے ساتھ اسے روکنا یا احسان کے ساتھ اسے جدا کرنا واجب ہے، چاہے تیسری طلاق دے یا نہ دے۔ اور اس سے مقصود یہ ہے کہ ضرر پہنچانے کے لئے بغیر بھلائی کے روکے رکھنا حرام ہے۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد "فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ" اس کے دو احتمالوں میں سے ایک کی تفصیل ہے۔ اور اگر التسریح سے مراد دوسری طلاق ہو تو یہ فی الحقیقت چوتھی طلاق ہوگی۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ سے "اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ" کے بارے پوچھا گیا کہ تیسری کہاں ہے؟ یا رسول اللہ ﷺ۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا "اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ" (1) اسے ابوداؤد نے اپنی ناسخ، سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اور ابن مردویہ نے ابورزین اسدی کی حدیث سے مرسلاً روایت کیا ہے اور دار قطنی نے حماد بن سلمہ عن قتادہ عن انس کی سند سے متصلاً نقل کیا ہے اور ابن قطان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ کوئی شی نہیں ہے۔ دار قطنی اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عبدالواحد بن زیادہ عن اسماعیل عن انس کی سند سے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے اور اس کی صحیح سند یہ ہے۔ عن اسماعیل عن ابی رزین عن النبی ﷺ۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اسی طرح محدثین کی ایک جماعت نے اسے ثقہ راویوں سے نقل کیا ہے اور ابن قطان نے کہا ہے کہ حدیث مسند بھی صحیح ہے (2) تو ہم اس مذکورہ سوال کا جواب یہ دیں گے کہ حضور نبی مکرم ﷺ کا ابن ثالثة (تیسری کہاں ہے؟) کے جواب میں "اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ" کہنے کا معنی یہ ہے کہ یہ اس کے دو احتمالوں میں سے ایک ہے ہو اللہ اعلم۔

ابوداؤد نے ناسخ و منسوخ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مرد اپنی بیوی کے مال میں سے وہ بھی کھاتا رہتا ہے جو اس نے اسے دیا ہوتا ہے اور وہ بھی جو نہیں دیا ہوتا اور اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتا تو تب اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا "وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا" یعنی جو مہر تم نے انہیں دیا ہے اس میں سے لینا تمہارے لئے جائز

1۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 495 (العلمیہ)
2۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 499 (العلمیہ)

نہیں۔ یہ خطاب ازواج (خاوندوں) کو ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب حکام کو ہے اور لینے اور دینے کی نسبت ان کی طرف کرنا اس اعتبار سے ہے کہ ان کے پاس مقدمہ پیش ہونے کے وقت وہ ان کا حکم دیتے ہیں لیکن یہ معنی بعید از حقیقت ہے۔

؎ "اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ" قراء میں سے چھ نے اسے مبنی علی الفاعل (صیغہ معروف) کی صورت میں پڑھا ہے یعنی زوجین اپنے نفسوں میں (بذات خود) جانتے ہوں۔ یعنی عورت کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ اپنے خاوند کے حق میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر بیٹھے گی اور خاوند کو عورت کے حقوق ضائع کرنے کا خوف ہو یا یہ خطرہ ہو کہ اگر وہ اپنی عورت کو طلاق نہ دے تو وہ اس پر ظلم و زیادتی کرے گا۔ اس کلام میں صیغہ خطاب سے صیغہ غیب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ ابو جعفر، حمزہ اور یعقوب نے یَخَافَا کو فعل مجہول یُخَافَا پڑھا ہے۔ یعنی حکام کو زوجین کے بارے خطرہ ہو۔ تو اس صورت میں "ان" اپنے صلہ کے ساتھ مل کر یُخَافَا کی ضمیر سے بدل اشتمال ہوگا۔

؎ اے حکام اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان پر کوئی حرج نہیں۔ فراء نے کہا ہے کہ عَلَيْهِمَا کے قول سے مراد صرف زوج (خاوند) ہے نہ کہ زوجہ (بیوی) لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے باہم مقترن ہونے کے سبب ان کا ذکر اکٹھا کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے "نَسِيَا حُوْتَهُمَا" حالانکہ اس میں بھولنے والا موسیٰ علیہ السلام کا ساتھی تھا نہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ میں کہتا ہوں کہ ظاہر معنی یہ ہے کہ جس طرح ان ارشادات کے سبب مرد کے لئے مال لینے میں حرج ہے "وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا الآیۃ"، "وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا" اسی طرح عورت پر بھی طلاق کے مطالبہ میں مال دینے میں کوئی حرج ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کے مطابق طلاق کا مطالبہ کرنا معصیت ہے "کہ وہ عورت جس نے بغیر ضرورت کے اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کیا اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے" (1) اسے امام احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے اور معصیت کے لئے مال دینا حرام ہے۔ بلکہ انسان کے لئے بغیر حق کے مال ضائع کرنا ممنوع ہے۔ یعنی مال کو ایسے خرچ کرنا کہ نہ اس میں دینی فائدہ ہو اور نہ دنیوی۔ اور اس حدیث طیبہ کا مفہوم بھی یہی ہے۔ "کہ خلع کرنے والیاں منافقات ہیں" (2) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اور جب زوجین کو اللہ تعالیٰ کی حدود قائم نہ کرنے اور معصیت کا ارتکاب کرنے کا اندیشہ ہو تو پھر اس اعتبار سے مال دینا اور لینا دونوں کے لئے جائز ہے کہ جانبین سے نافرمانی کا خوف ہے۔ لیکن جب نافرمانی اور زیادتی صرف مرد کی جانب سے ہو تو پھر اس کے لئے مال لینا حلال نہیں۔ صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ یہ مکروہ تحریمی ہے اور حق یہ ہے کہ یہ ہماری تلاوت کردہ آیت طیبہ اور اباحت پر دلیل نہ ہونے کے سبب حرام ہے اور اس لئے بھی کہ اس نے مسلمان کا مال بغیر حق کے لیا ہے اور عورت کو ضرر پہنچانے کے لئے اور اس کا مال ختم کرکے اس کو تنگ کرنے کے لئے روک کے رکھا ہے۔ اور اگر نافرمانی عورت کی جانب سے ہو تو یہ عورت پر حرام ہے اور اس صورت میں معصیت کا ارتکاب عورت نے کیا ہے نہ کہ مرد نے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اور اگر کسی جانب سے بھی نافرمانی نہ ہو اور دونوں کو اللہ تعالیٰ کی حدود قائم نہ رکھ سکنے کا خوف نہ ہو، تو پھر خاوند کے لئے مال لینا اور عورت کے لئے طلاق کا مطالبہ کرنا اور مال خرچ کرنا حلال نہیں۔ لیکن خلع واقع ہو جائے گا اور تمام صورتوں میں بالاجماع مرد کے لئے عورت کے ذمہ قضاءً مال واجب ہو جائے گا بخلاف ظاہریہ کے۔ ہمارے نزدیک خلع ایک امر شرعی ہے چاہے وہ طلاق ہو یا فسخ۔ اور امور شرعیہ سے نہی ان کے انعقاد اور نفاذ پر

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 523، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 1998

2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 5 صفحہ 130 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 1997

دلالت کرتی ہے، حتیٰ کہ ابتلاء کا تصور ہونے لگے۔ مزنی نے کہا ہے کہ خلع بالکل غیر مشروع ہے اور یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے۔ "وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ الآیۃ"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں بلکہ نکاح کے معاوضہ کے طور پر زوجین کی رضامندی کے سبب لینے دینے کا ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں تعارض نہیں ہے اور تعارض کے بغیر نسخ نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔ اس مسئلہ میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے کہ خلع طلاق ہے یا فسخ؟ تو اس کے بارے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ یہ طلاق ہے۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح مروی ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ فسخ ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے کہ یہ طلاق نہیں۔ پس جنہوں نے کہا ہے کہ یہ فسخ ہے ان کے نزدیک اس سے طلاق کی تعداد کم نہیں ہوگی نہ اس کے ساتھ کوئی دوسری طلاق لاحق ہو سکے گی اور نہ ہی عدت کے دوران وہ ایک دوسرے کے وارث ہو سکیں گے۔ دونوں فریقوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ فسخ کا قول کرنے والوں کا استدلال اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کے اول حصہ میں دو طلاقوں کا ذکر کیا ہے۔ پھر خلع کا اور پھر تیسری طلاق کا ذکر اس قول کے ساتھ کیا "فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ" تو اگر خلع بھی طلاق ہو تو اس سے طلاقوں کی تعداد چار ہونا لازم آئے گی۔ یہ استدلال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ علامہ ابن جوزی نے اپنی سند کے ساتھ طاؤس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے ابراہیم بن سعد کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آدمی کے بارے سوال کرتے سنا ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں پھر عورت نے اس سے خلع کر لیا۔ تو آپ نے فرمایا اگر وہ چاہے تو اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ بیشک طلاق کا ذکر آیت کے اول اور آخر میں ہے اور ان کے درمیان خلع کا ذکر ہے(1) اسے عبدالرزاق نے روایت کیا ہے اور دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ "خلع فرقت ہے"(2) انہوں نے مزید کہا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے غلام نافع نے روایت کی ہے کہ انہوں نے ربیع بنت معوذ بن عفراء سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ خبر دیتے ہوئے سنا کہ اس نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد میں اپنے خاوند سے خلع کیا۔ تو ان کے چچا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ معوذ کی بیٹی نے آج اپنے خاوند سے خلع کیا ہے کیا وہ گھر منتقل ہو سکتی ہے؟ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا اسے چاہئے کہ وہ منتقل ہو جائے۔ اب ان کے درمیان میراث نہیں ہوگی اور نہ ہی اس پر عدت ہوگی ہے۔ مگر وہ اس وقت تک نکاح نہیں کر سکتی جب تک کامل حیض نہ گزر جائے، اس احتمال کی وجہ سے کہ ہو سکتا ہے اسے حمل ہو۔ یہ سن کر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا عثمان ہم سے زیادہ بہتر اور زیادہ جاننے والے تھے۔ ہمارے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دو طلاقوں کا ذکر کیا جن کے بعد رجوع ہو سکتا ہے اور پھر عورت کے فدیہ دینے کا ذکر کیا۔ فدیہ دینے کی نسبت صرف عورت کی طرف کرنا اس کے باوجود کہ کلام کا مقتضیٰ یہ ہے کہ فعل کی نسبت دونوں کی طرف ہو، اور فرقت کا واقع نہ ہونا مگر صرف مرد کے فعل کے ساتھ، یہ مرد کے فعل کے مضبوط ہونے پر واضح دلیل ہے۔ اور سابقہ وضاحت کے مطابق وہ فعل طلاق ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس میں طلاق کی دو قسمیں بیان کیں ایک طلاق بغیر مال کے اور ایک طلاق مال کے ساتھ۔ پھر فرمایا "فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ" اور لفظ فاء تعقیب کے لئے خاص ہے اور طلاق کے پیچھے افتداء (فدیہ دینے) کا ذکر ہے۔ پس اگر خلع کے بعد طلاق واقع نہ ہو تو فاء کا موجب باطل ہو جاتا ہے۔ اور یہ قول کرنا کہ یہ کلام کے اول حصہ کے ساتھ متصل ہے۔ اور قول باری تعالیٰ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ سے الظّٰلِمُوْنَ تک جملہ معترضہ ہے یہ بلا دلیل کلام کے الفاظ کو چھوڑنا اور ان میں مرضی کا تصرف کرنا ہے۔ اور یہ قطعاً درست نہیں اور جو کچھ

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 501 (العلمیہ)   2۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 320 (المحاسن)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کے اول اور آخر میں طلاق کا ذکر کیا ہے اور ان کے درمیان خلع کا ذکر کیا ہے یہ کوئی شی نہیں کیونکہ انہوں نے کلام میں خلع اور فسخ کا بالکل ذکر ہی نہیں کیا۔ بیشک انہوں نے عورت کے فدیہ دینے کا ذکر کیا اور زوج کے فعل سے خاموش ہو گئے اور خاوند کا فعل تو صرف طلاق ہے جیسے مذکور ہوا۔ تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ بیشک پہلے ذکر کی گئی طلاق اگر مال کے بدلے نہ ہو تو وہ رجعی ہے اور اگر مال کے بدلے ہو تو وہ بائن ہے، یہاں تک کہ فدیہ ثابت ہو جائے اور بدل اور مبدل منہ دونوں خاوند کی ملکیت میں جمع نہیں ہو سکتے، چاہے وہ لفظ طلاق کے ساتھ ہو، یا لفظ خلع کے ساتھ یا ان دونوں کے علاوہ کسی اور لفظ کے ساتھ جو اس معنی کو ادا کرتا ہو۔ اور اس کا نام خلع رکھنا ایک ایسی اصطلاح ہے، جو قرآن سے ثابت نہیں، واللہ اعلم۔

اس آیت کا سبب نزول بھی خلع کے طلاق ہونے پر دلالت کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جمیلہ بنت عبداللہ بن ابی ثابت بن قیس کی بیوی تھی۔ (دارقطنی نے اس کا نام زینب ذکر کیا ہے۔ اور ابن حجر نے کہا شاید اس کے دو نام ہیں۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس کا نام حبیبہ بنت سہل ہے۔ ابن حجر نے کہا ہے کہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دو واقعے ہیں اور یہ دونوں انہیں دو عورتوں کے بارے میں پیش آئے دونوں حدیثیں مشہور ہیں، دونوں سندیں صحیح ہیں اور دونوں کا سیاق کلام مختلف ہے) وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور آپ ﷺ کے پاس اپنے خاوند کی شکایت کی، اور ان کے مارنے کے نشانات آپ ﷺ کو دکھائے۔ اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ نہ میں (اس سے خوش) ہوں اور نہ ہی وہ (مجھ سے خوش ہے) تو رسول اللہ ﷺ نے ثابت کو بلا بھیجا اور فرمایا تجھے اور تیری اہلیہ کو کیا ہوا؟ تو انہوں نے عرض کی قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا سطح زمین پر میرے نزدیک آپ ﷺ کے سوا اس سے زیادہ محبوب اور کوئی نہیں۔ تو پھر آپ ﷺ نے اس عورت کو کہا تو کیا کہتی ہے؟ تو اس نے عرض کی "یا رسول اللہ ﷺ میں آپ سے ایسی بات نہیں کرتی جو آپ ﷺ کو اس کے خلاف محسوس ہو وہ تمام لوگوں سے زیادہ اپنی بیوی کے ساتھ مہربان اور شفیق ہے لیکن میں اس سے بغض رکھتی ہوں۔ پس نہ میں (اس سے خوش) ہوں اور نہ وہ (مجھ سے خوش ہے)"(1) حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی حضور نبی مکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں ثابت بن قیس پر اخلاق اور دین کے اعتبار سے تو کوئی عیب نہیں لگاتی۔ لیکن میں اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تو اس کا باغ لوٹانا چاہتی ہے؟ تو اس نے کہا جی ہاں! تو رسول اللہ ﷺ نے ثابت کو فرمایا باغ لے لے اور اسے ایک طلاق دے دے(2) اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسری سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جمیلہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی وہ خلع کا ارادہ رکھتی تھی۔ تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا اس نے تجھے کیا مہر دیا تھا تو اس نے عرض کی، باغ۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا "اس کا باغ اسے واپس لوٹا دو"(3) ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا اسلام میں سب سے پہلا خلع حضرت ثابت بن قیس کی بیوی کا ہے۔ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آئی اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میرا سر اور ثابت کا سر جمع نہیں رہ سکتے۔ بیشک میں نے پردہ اٹھایا اور اسے متعدد بار بہت سے لوگوں میں آتے دیکھا وہ رنگت کے اعتبار سے انتہائی زیادہ سیاہ ہے، قد و قامت کے لحاظ سے سب سے چھوٹا ہے اور چہرے کے اعتبار سے انتہائی قبیح

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 308 مطبوعہ دار الفکر بیروت 1985
2۔ صحیح بخاری، جلد 5 صفحہ 2021 مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت 1987
3۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 7 صفحہ 313 (الفکر)

ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تو اس کا باغ واپس لوٹانا چاہتی ہے؟ تو اس نے کہا جی ہاں اور اگر وہ چاہے تو میں اس سے زیادہ بھی دوں گی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کے درمیان تفریق کر دی (1) ابوداؤد، ابن حبان اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حبیبہ بنت سہل سے روایت کی ہے وہ ثابت بن قیس کے پاس تھی۔ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آئی اور عرض کی میں اور ثابت ایک ساتھ نہیں رہ سکتے، الحدیث (2) اور ابن جریر نے ابن جریج سے روایت کی ہے کہ یہ آیت ثابت بن قیس اور حبیبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں شکایت کی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ کیا تو اس کا باغ اسے واپس لوٹا دے گی اس نے جواب دیا جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور اس کے بارے بتایا۔ اس نے عرض کی کیا آپ ﷺ بھی میرے لئے یہی بہتر سمجھتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں! تو پھر انہوں نے کہا میں نے یہ فیصلہ کر دیا۔ پس اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (3) مجھے یہ قصہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ خلع طلاق ہے۔ جیسا کہ صحیح روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا باغ لے لو اور اسے ایک طلاق دے دو۔ اور اگر کہا جائے کہ راوی کا اپنی روایت کے خلاف عمل امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کے مطابق ناسخ کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اور جو کچھ بخاری میں ہے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے حالانکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اس سے قبل ذکر کیا گیا ہے کہ بیشک خلع فرقت ہے۔ تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ شاید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ گمان کیا ہو کہ ثابت نے حضور نبی کریم ﷺ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے اپنی بیوی کو طلاق دی اور مال کے عوض طلاق ہوئی خلع نہیں ہوا۔ پھر آپ رضی اللہ عنہما نے آیت کی تاویل کے ساتھ فتویٰ دیا کہ خلع فسخ ہے، لہٰذا ان کا عمل ان کے گمان کے مطابق اپنی روایت کے خلاف نہیں۔ اور اس وقت آپ نے جو یہ فرمایا کہ یہ اسلام میں پہلا خلع تھا، آپ کے اس قول کو مجاز پر محمول کیا جائے گا اور ہمارے اوپر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے زعم (خیال) کی اتباع لازم نہیں۔ ان روایات میں سے جو خلع کے طلاق ہونے پر دلالت کرتی ہیں وہ بھی ہے جو عبدالرزاق نے حضرت سعید بن المسیب سے نقل کی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے خلع کو طلاق قرار دیا ہے" (4) یہ روایت مرسل صحیح ہے اور مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حکم لگایا ہے کہ حضرت سعید بن المسیب کی مرسل روایات حدیث متصل کے حکم میں ہیں۔ انہوں نے کہا ہے بیشک میں نے انہیں مسانید پایا ہے اور خلع کے طلاق ہونے کی روایت حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ "آپ نے کہا کہ طلاق بائن نہیں ہوتی مگر فدیہ کی صورت میں یا ایلاء کی صورت میں" اسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے (5) اور ام بکرہ سے روایت ہے کہ اس نے اپنے خاوند سے خلع کیا۔ پھر دونوں یہ مسئلہ لے کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ طلاق بائن ہے۔ مگر ان دونوں نے جو شی مقرر کی ہے وہ مقرر ہی ہے (6) اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اس اثر کے رواۃ میں سے جمھان معروف نہیں۔ تو اس کے بارے ابن ہمام نے کہا ہے کہ اس سے مراد ابو العلی مولی الاسلمیین ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یعقوب القطعی کے مولیٰ تابعی ہیں اور اس نے حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عثمان بن عفان، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ام بکرہ رضی اللہ عنہم سے احادیث روایت کی ہیں اور اس سے حضرت

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 500 (العلمیہ) 2۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 7 صفحہ 312-313 (الفکر) 3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 499 (العلمیہ)

4۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 4 صفحہ 117 مطبوعہ مکتبہ الزمان بیروت 1989 5۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 4 صفحہ 117 (الزمان)

6۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 565 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

عروہ بن زبیر اور موسیٰ بن عبیدہ وزبیدی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ابن حبان نے اس کا ذکر ثقات میں کیا ہے۔

مسئلہ:۔ اس مسئلہ پر تمام ائمہ نے اجماع کیا ہے کہ آیت عام ہونے کی بناء پر مال مہر سے زیادہ کے عوض خلع کرنا صحیح ہے۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ مکروہ ہے اور ان میں سے اکثر کا قول ہے کہ مکروہ نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے جامع صغیر میں یہی روایت ہے۔ اس مسئلہ میں صحابہ کرام کے درمیان اختلاف گزر چکا ہے۔ کراہت کا سبب وہ روایت ہے جسے ابوداؤد نے اپنی مراسیل میں، ابن ابی شیبہ اور عبدالرزاق نے ثابت بن قیس کی بیوی کے قصہ میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا کیا تو وہ باغ اسے واپس لوٹا دے گی جو اس نے تجھے بطور مہر دیا ہے۔ تو اس نے عرض کی جی ہاں زیادتی کے ساتھ لوٹا دوں گی تو آپ ﷺ نے فرمایا "زیادتی کی ضرورت نہیں۔" دارقطنی نے اسے اسی طرح نقل کیا ہے (1) اور کہا ہے کہ ولید نے اس کی سند اس طرح بیان کی ہے۔ "عن ابی جریج عن عطاء عن ابن عباس" اور مرسل روایت اصح ہے۔ ابن جوزی نے دارقطنی کی سند سے ابوالزبیر سے روایت نقل کی ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس کے پاس زینب بنت عبداللہ بن اُبی ابن سلول تھی۔ ثابت نے اسے ایک باغ بطور مہر دیا تھا۔ تو اس نے اسے (ثابت کو) ناپسند کیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا۔ کیا تو وہ باغ اسے واپس لوٹا دے گی جو اس نے تجھے دیا تھا تو اس نے عرض کی جی ہاں زیادتی کے ساتھ۔ تو پھر حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا زیادتی کی ضرورت نہیں بلکہ باغ ضروری ہے۔ تو اس نے عرض کی جی ہاں (صحیح ہے)۔ چنانچہ آپ ﷺ نے وہ باغ اس کے لئے لے لیا اور اس عورت کا راستہ چھوڑ دیا۔ (یعنی اسے نکاح کی قید سے آزاد کر دیا)۔ پس جب یہ خبر ثابت بن قیس کو پہنچی تو انہوں نے کہا "میں نے رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کو قبول کیا" (2) ابن جوزی نے کہا اس کی اسناد صحیح ہے۔ دارقطنی نے کہا ابوالزبیر نے اسے کئی ایک سے سنا اور دارقطنی نے اپنی سند سے حضرت عطاء سے روایت کی ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ خلع کرنے والی عورت سے اس مال سے زیادہ نہ لے جتنا اس نے اسے دے رکھا ہے (3) ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ جمیلہ بنت سلول حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئی، الحدیث۔ اس میں آپ ﷺ نے ثابت کو حکم دیا کہ وہ اپنا باغ لے لے اور زیادتی نہ لے (4) اور صحیح مرسل حدیث سے اس زیادتی کے ثبوت میں کوئی شک نہیں۔ اور وہ مرسل روایت مسند اور مرسل روایات کے سبب مزید قوی ہو گئی ہے۔ اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر بھی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مرد عورت سے اس کی نسبت زیادہ نہیں لے گا جو اس نے اسے دیا ہوا ہے۔ اسے عبدالرزاق نے روایت کیا ہے اور وکیع نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ اور وہ روایت جو عبدالرزاق نے ربیع بنت معوذ سے روایت کی ہے کہ اس نے اپنے خاوند سے مہر اور اس شئی کے بدلے خلع کیا جس کی وہ مالک تھی۔ تو اس کے بارے میں مقدمہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پیش کیا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس کی اجازت دے دی اور اسے حکم دیا کہ اس کے سر کا جوڑا اور اس کے سوا بھی جو ہو سے لے لو۔ اور اسی طرح وہ روایت جو انہوں نے حضرت نافع سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کی بیوی کی (آزاد کردہ) ایک خادمہ حاضر ہوئی اور اس نے اپنی ہر شئی اور تمام کپڑوں حتیٰ کہ اپنی واسکٹ تک کے عوض خلع کیا۔ تو یہ دونوں اثر کراہت کے قول کے منافی نہیں ہیں کیونکہ یہ دونوں قضاء خلع کے نفاذ پر دلالت کرتے ہیں اور کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا۔ اور عدم کراہت کی دلیل یہ آیت ہے اس طرح کہ رب کریم نے فرمایا "فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 255 مطبوعہ دارالمحاسن بیروت
2۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 255 مطبوعہ دارالمحاسن بیروت
3۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 255 (المحاسن)
4۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 524 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت

افْتَدَتْ بِهٖ' اس میں کلمہ "ما" عام ہے اور یہ قلیل وکثیر مقدار کو شامل ہے۔ اور احادیث آحاد کی قبولیت کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ کتاب کے قطعی حکم سے معارض نہ ہوں حالانکہ یہ تو معارض ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا انحصار حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول پر ہے کہ عام اپنے افراد کو شامل ہونے میں قطعی الدلالتہ ہے۔ اس کی تخصیص اخبار آحاد کے ساتھ جائز نہیں ہوتی۔ اور اگر ہم اخبار آحاد کے سبب تخصیص جائز قرار دیں تو پھر ہم کہیں گے کہ آیت کا حکم ان احادیث کے سبب مہر کی مقدار اور اس سے کم کے ساتھ مخصوص ہے، واللہ اعلم۔ تحقیق حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث عدم کراہت پر دلالت کرتی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میری بہن انصار میں سے ایک آدمی کے پاس تھی۔ اس نے ان سے باغ کے عوض شادی کی تھی، الحدیث۔ اور اس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو اس پر اس کا باغ لوٹا دے گی تو وہ تجھے طلاق دے دے گا۔ تو انہوں نے عرض کی جی ہاں، میں اس کے ساتھ زائد بھی دوں گی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تو اس پر اس کا باغ لوٹا دے اور اس سے کچھ زیادہ دے دے (1) اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے لیکن یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس میں ایک راوی عطیہ العوفی ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے اس کی حدیث کو لکھنا بھی صحیح نہیں ہے اور اسی میں ایک راوی حسن بن عمارہ ہے شعبہ نے کہا ہے کہ یہ کذاب ہے۔

یے تِلْكَ یہ اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ وہ حدیں ہیں جن سے تجاوز کرنے سے روکا گیا ہے۔ پس تم ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو کوئی آگے بڑھتا ہے اللہ کی حدوں سے سو وہی لوگ ظالم ہیں۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

"(دو بار طلاق دینے کے بعد) پھر اگر وہ طلاق دے اپنی بیوی کو تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد لے یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ ہے پس اگر وہ (دوسرا) طلاق دے اسے تو کوئی حرج نہیں ان دونوں پر کہ رجوع کر لیں سے بشرطیکہ انہیں خیال ہو کہ وہ قائم رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو سے اور یہ حدیں ہیں اللہ کی وہ بیان فرماتا ہے انہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں ہے۔"

لے پس اگر وہ دو طلاقوں کے بعد اسے طلاق دے۔ یہ قول باری تعالیٰ "اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ" کے دو محمولوں میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس احتمال کو اس حکم کے ساتھ خاص کیا اور فرمایا "فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ" تو پھر وہ اس کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی اور دوسرا احتمال باقی رہا اور وہ یہ ہے کہ عدت گزرنے تک بغیر طلاق کے اسے اپنے اصل پر چھوڑ دینا۔ تو اس صورت میں اس کا نکاح زوج اول سے حلال ہے۔

یے یعنی وہ نکاح صحیح کرے۔ ہم نے اسے صحیح کے ساتھ مقید کیا ہے اس لئے کہ مطلق کا اطلاق کامل پر ہوتا ہے اور شادی اور نکاح کی نسبت زوجین میں سے ہر ایک کی طرف کرنی جائز ہوتی ہے کیونکہ یہ ایجاب وقبول سے منعقد ہوتا ہے اور یہ دونوں سے صادر ہوتے ہیں۔ اس آیت کے ظاہر کی بناء پر حضرت سعید بن المسیب اور داؤد نے کہا ہے کہ زوج ثانی سے عقد نکاح بغیر جماع کے بھی زوج اول

1۔ تفسیر قرطبی، جلد 3 صفحہ 141 (طبع جدید)

کے لئے اسے حلال کر دیتا ہے اور اجماع اس پر ہے کہ زوج ثانی کی وطی حلال ہونے کے لئے شرط ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ آیت میں نکاح سے مراد جماع ہے۔ کیونکہ اس کا لغوی معنی جماع ہی ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ درست نہیں کیونکہ وطی خاوند کا فعل ہے اور عورت اس کا محل ہے لہٰذا اس کی نسبت عورت کی طرف کرنا جائز نہیں۔ تو اس کے بارے میں ہم کہیں گے کہ مجازاً یہ نسبت جائز ہے اور آیت طیبہ مجاز سے خالی نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر نکاح بمعنی عقد ہو تو پھر مجاز لفظ زوج میں ہوگا اس معنی کی بناء پر جو اس کی طرف لوٹ رہا ہے اور اگر نکاح وطی کے معنی میں ہو تو پھر مجاز نسبت میں ہوگا اور مجازاً یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ نکاح سے مراد عورت کا وطی کی قدرت دینا ہو۔ اس اجماع اور ان تاویلات بعیدہ کے ساتھ آیت کی تاویل کرنے پر ابھارنے والی روایت حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ رفاعہ قرظی کی بیوی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اس حال میں کہ میں اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے اور اس نے کہا۔ مجھے رفاعہ نے جدا کرنے والی طلاق دی ہے اور پھر عبدالرحمٰن بن زبیر نے میرے ساتھ شادی کی ہے۔ بیشک ان کے پاس تو ہدبہ کی مثل ہے اور اس نے اپنے کپڑے سے ہدبہ بنایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبسم کناں ہوئے اور فرمایا گویا تو رفاعہ کے پاس واپس جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ تو اس کے شہد میں سے چکھ لے اور وہ تیرا شہد چکھ لے(1) اسے محدثین کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے اور صحیحین میں یہ الفاظ ہیں کہ بیشک وہ رفاعہ کے پاس تھی تو رفاعہ نے اسے تین طلاقیں دے دیں اور موطا میں اس طرح ہے کہ مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مسور بن رفاعہ قرظی کے واسطے سے زبیر بن عبدالرحمٰن بن زبیر سے یہ روایت بیان کی ہے کہ رفاعہ بن سموال نے اپنی بیوی تمیمہ بنت وہب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں تین طلاقیں دیں۔ تو پھر عبدالرحمٰن بن زبیر نے اس سے نکاح کر لیا۔ لیکن اس نے اس سے وطی کرنے کی طاقت نہ رکھی تو اسے اپنے سے علیحدہ کر دیا۔ تو پھر رفاعہ نے اس سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منع فرما دیا اور فرمایا تیرے لئے نکاح حلال نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ شہد چکھ لے(2) اور ایک جماعت نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آدمی کے بارے پوچھا گیا، جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں پھر اس عورت نے دوسرے مرد سے شادی کی۔ وہ اس کے پاس داخل ہوا اور پھر اس کے ساتھ جماع کرنے سے پہلے اسے طلاق دے دی، کیا وہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال ہو گئی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ یہاں تک کہ دوسرا اس کے شہد میں سے وہ چکھ لے جو پہلے نے چکھا۔ اور ابن المنذر نے مقاتل بن حبان سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا یہ آیت عائشہ بنت عبدالرحمٰن بن عتیک کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ رفاعہ بن وہب بن عتیک کی بیوی تھی اور یہ ان کے چچا کا بیٹا تھا۔ پس اس نے اسے طلاق مغلظہ دی۔ تو اس کے بعد اس نے عبدالرحمٰن بن زبیر قرظی سے شادی کی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور کہا کہ اس نے مجھے مس کرنے سے پہلے طلاق دے دی ہے کیا میں پہلے کے پاس واپس جا سکتی ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ یہاں تک کہ تو مس کر لے(3) اور اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی " فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ " " فَاِنۡ طَلَّقَهَا "۔ پس اگر اس نے جماع کے بعد اسے طلاق دے دی " فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَآ اَنۡ يَّتَرَاجَعَآ " (تو ان پر رجوع کرنے میں کوئی حرج نہیں)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ روایت ہے وہ عورت اتنی دیر اس کے پاس ٹھہری رہی جتنا اللہ نے چاہا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوٹی اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیشک میرے خاوند

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 933، دار ابن کثیر بیروت
2۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 531 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 505 (العلمیہ)

نے مجھے مس کر لیا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا اپنے پہلے قول کو تو نے جھٹلایا ہے لہٰذا دوسرے قول میں ہم تیری تصدیق نہیں کریں گے۔ پھر جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ اس کے پاس ٹھہری رہی۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا پھر وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور کہا بیشک میرے خاوند نے مجھے مس کیا ہے اور مجھے طلاق دے دی ہے۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے کہا تو نے رسول اللہ ﷺ کے پاس شہادت دی تھی جب تو آپ ﷺ کے پاس آئی تھی۔ تو آپ ﷺ نے تجھے جو فرمانا تھا فرما دیا اس لئے تو رجوع نہیں کر سکتی۔ پھر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا تو وہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور پہلے کی مثل ہی آپ کو بھی بتایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تو نے رجوع کیا تو میں تجھے رجم کر دوں گا(1) نکاح کو تزویج کے معنی میں لینے سے اس حدیث کے سبب کتاب اللہ پر زیادتی ہو جاتی ہے اور اخبار آحاد سے کتاب اللہ پر زیادتی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسروں کے نزدیک جائز ہے۔ لیکن یہ امر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کی بناء پر مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ جائز نہیں۔ لہٰذا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی توجیہ میں کہا گیا ہے کہ حدیث مشہور سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہے اور یہ حدیث اس طرح نہیں کیونکہ یہ اخبار آحاد میں سے ہے البتہ یہ کہنا ممکن ہے کہ جب اس حدیث کے مطابق اجماع منعقد ہو چکا ہے اور جمہور امت نے اسے قبولیت کے ساتھ لے لیا ہے تو پھر اسے حدیث مشہور کے ساتھ ملا دیا گیا۔ لہٰذا اس سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہوگی۔

؎ اگر زوج ثانی نے وطی کے بعد اسے طلاق دے دی تو عورت اور پہلے خاوند پر کوئی حرج نہیں کہ وہ نئے نکاح کے ساتھ رجوع کر لیں۔ اس میں فعل کا دونوں کی طرف منسوب ہونا اس پر دلالت کر رہا ہے۔ بخلاف اس قول کے جو اس سے پہلے گزرا "وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ" تو اس میں فعل ان میں سے انفرادی طور پر بُعُولَتُهُنَّ (خاوندوں) کی طرف منسوب ہے۔

؎ "إِنْ ظَنَّا" اگر وہ دونوں لوٹ آئیں اور انہیں خیال ہو کہ وہ حدود اللہ کو قائم رکھ سکیں گے۔ یہاں ظن کی تفسیر علم سے کرنا ممکن نہیں، اس لئے کہ علم بالغیب کا امکان نہیں اور اس لئے بھی کہ ان ناصبہ توقع کے لئے آتا ہے اور یہ علم کے منافی ہوتی ہے۔

مسئلہ:۔ اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ زوج ثانی کی وطی زوج اول کی تینوں طلاقوں کو ساقط کر دیتی ہے۔ یعنی اگر وہ عورت پہلے خاوند کی طرف لوٹ آئے تو وہ بالاجماع تین طلاقوں کا مالک ہوتا ہے۔ اور اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کیا وہ تین طلاقوں سے کم کو بھی ساقط کرتی ہے یا نہیں؟ یعنی اگر زوج اول ایک یا دو طلاقیں دے اور اس کی عدت گزر جائے۔ پھر وہ نکاح صحیح کے ساتھ دوسرے مرد سے شادی کرے، پھر وہ اسے وطی کے بعد طلاق دے اور اس کی عدت بھی گزر جائے پھر وہ عورت پہلے مرد کے ساتھ دوبارہ شادی کر لے تو اب کیا زوج اول تین طلاقوں کا مالک ہوگا یا پھر ایک یا دو طلاقوں کے بعد باقی طلاقوں کا مالک ہوگا۔ تو اس بارے میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ زوج ثانی تین سے کم طلاقوں کو بھی ساقط کر دیتا ہے اور زوج اول دوبارہ مکمل طور پر تین طلاقوں کا مالک ہوتا ہے اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ وہ تین سے کم طلاقوں کو ساقط نہیں کرتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زوج ثانی کی وطی کو اسی قول میں اس حرمت غلیظہ کے لئے انتہا بنایا ہے جو تین طلاقوں سے ثابت ہوتی ہے۔ "فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ" گویا یہ تین طلاقوں کے لئے انتہاء ہے اور ثبوت سے پہلے کوئی شی ممنوع نہیں ہوتی۔ اور ہمارا موقف یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وطی کے بعد دوسرے خاوند کی طلاق کو پہلے خاوند کے لئے حلال ہونے کا سبب قرار دیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 311 مطبوعہ دارالفکر بیروت 1985

"فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَّتَرَاجَعَا" اسی طرح آقائے دو جہاں ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں زوج ثانی کو زوج اول کے لئے محلل قرار دیا ہے۔"لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهٗ"(1)(اللہ تعالیٰ نے حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے نکالا گیا دونوں پر لعنت کی ہے)اور حلت میں اصل یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر حلال ہو۔لہٰذا وہ تین طلاقوں کا مالک ہوگا اور یہ دلیل بھی ہے کہ جب زوج ثانی کی وطی حرمت غلیظہ کو ساقط کر دیتی ہے تو وہ حرمت خفیفہ کو بدرجہ اولیٰ ساقط کر دے گی،واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ زوج اول کی تین طلاقوں کے بعد اگر عورت نے دوسرے زوج سے نکاح کیا اور یہ شرط لگا دی کہ وہ اسے طلاق دے گا۔پھر وطی کے بعد اس نے اسے طلاق دے دی اور اس کی عدت گزر گئی۔تو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ نکاح صحیح میں دخول پائے جانے کے سبب پہلے مرد کے لئے حلال ہو جائے گی اور نکاح شرائط کے ساتھ باطل نہیں ہوگا اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ نکاح تو صحیح ہوگا جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔لیکن یہ اسے پہلے مرد کے لئے حلال نہیں کرے گا کیونکہ اس نے اس عمل میں جلدی کی ہے جسے شریعت نے مؤخر کیا ہے۔لہٰذا اس کی جزا یہ ہوگی کہ اسے مقصود سے روک دیا جائے۔جیسا کہ اپنے مورث کو قتل کرنے والے کو میراث سے محروم کر دیا جاتا ہے۔امام احمد،امام مالک،اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ایسا نکاح ہی صحیح نہیں ہوگا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس بارے میں دو قول ہیں اور ان میں سے اصح قول یہ ہے کہ نکاح صحیح نہیں ہوگا کیونکہ یہ نکاح موقت کے معنی میں ہے اور جب نکاح صحیح نہیں ہوگا تو شرط نہ پائے جانے کی وجہ سے وہ زوج اول کے لئے حلال نہیں ہو گی اور شرط سے مراد نکاح صحیح ہے۔انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نکاح صحیح نہ ہونے پر استدلال کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا"رسول اللہ ﷺ نے حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے حلالہ نکالا جائے دونوں پر لعنت کی ہے"(2)اسے دارمی نے روایت کیا ہے اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث صحیح ہے اور ابن ماجہ نے اسے حضرت علی،حضرت ابن عباس اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔تو ہم نے یہ کہا ہے کہ یہ حدیث تو ہمارے حق میں حجت ہے نہ کہ ہمارے خلاف۔اس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے محلل قرار دیا ہے اور یہ حلت کے ثبوت پر دلالت کرتا ہے اور حلت نکاح کے صحیح ہونے کا تقاضا کرتی ہے مگر اس امر پر بھی دلالت کرتی ہے کہ زوج نے ایک حرام امر کا ارتکاب کیا ہے اور ہم بھی کہتے ہیں اور اگر اس نے شادی کی اور کوئی شرط نہ لگائی۔مگر اس کے ارادے میں یہ ہو تو امام اعظم ابوحنیفہ،صاحبین اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک نکاح صحیح ہوگا اور امام مالک اور احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ نکاح صحیح نہیں ہوگا۔لیکن ان کے مکروہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ نافع کہتے ہیں ایک آدمی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہا ایک آدمی نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دی ہیں۔تو اس کا بھائی بغیر مشورہ کے چلا گیا اور اس سے شادی کر لی تاکہ وہ اسے پہلے خاوند کے لئے حلال کر دے۔تو انہوں نے فرمایا......حلال نہیں، کیونکہ نکاح تو رغبت کے سبب ہوتا ہے۔ہم تو اسے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں زنا شمار کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے نکالا جائے دونوں پر لعنت کی ہے۔(3)

ﮯ یعنی مذکورہ احکام اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں۔وہ بیان فرماتا ہے انہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھتے ہیں اور علم کے تقاضے کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

1۔سنن ابن ماجہ،جلد 2 صفحہ 461 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔سنن الدارمی،جلد 2 صفحہ 81،دار المحاسن قاہرہ
3۔تفسیر بغوی،جلد 1 صفحہ 312،دار الفکر بیروت

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَاۤ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۳۱﴾

”اور جب تم طلاق دے دو عورتوں کو اور وہ پوری کر لیں اپنی عدت[1] پس یا تو روک لو انہیں بھلائی کے ساتھ یا چھوڑ دو انہیں بھلائی کے ساتھ اور نہ روکو انہیں تکلیف دینے کی غرض سے تاکہ زیادتی کرو[2] اور جو کوئی کرے گا اس طرح تو وہ ظلم کرے گا اپنی ہی جان پر[3] اور نہ بنا لو اللہ کی آیتوں کو مذاق[4] اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے اور (یاد کرو) جو اس نے نازل فرمایا تم پر قرآن اور حکمت وہ نصیحت فرماتا ہے تمہیں اس سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے[5]“

[1] یعنی وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں۔ اجل کا اطلاق مدت اور اس کی انتہاء پر ہوتا ہے، لہٰذا یہ لفظ انسان کی عمر اور اس مدت کے لئے بولا جاتا ہے جہاں عمر کی انتہاء ہو جاتی ہے اور یہاں مراد مدت کی انتہاء ہے کیونکہ عدت کا آغاز طلاق کے بعد ہوتا ہے اور بلوغ سے مراد کسی شی تک پہنچنا ہے اور کبھی مجازاً قریب ہونے کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور آیت میں یہی مراد ہے تاکہ آنے والے ارشاد کو اس پر مرتب کرنا صحیح ہو۔

[2] فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ۔ جب کہ عدت گزرنے کے بعد امساک (روکنا) ہے ہی نہیں۔ معنی یہ ہے کہ تم ان کی طرف نقصان پہنچائے بغیر رجوع کر لو یا پھر انہیں چھوڑ دو حتیٰ کہ ان کی عدت گزر جائے اور تم انہیں ضرر پہنچانے کے ارادے سے نہ لوٹاؤ، اس میں ضراراً منصوب ہے مفعول لہٗ ہونے کی وجہ سے یا پھر یہ حال ہے اور مُضَارِّیْنَ کے معنی میں ہے۔ تاکہ تم ان پر عدت طویل کرنے کے ظلم اور فدیہ دینے پر مجبور کرنے کے ساتھ ان پر ظلم کرو۔ لتعتدوا میں لام لَا تُمْسِكُوْهُنَّ کے متعلق ہے۔ اور یہ بھی مفعول لہٗ ہے گویا کہ یہ ضِرَارً کا بیان ہے۔ یا یہ ضرار کے متعلق ہے اور اس تقدیر پر بھی یہ ضرار کا بیان ہوگا۔ یہ اس کے لئے قید نہیں کیونکہ ضرار مطلقاً ظلم اور زیادتی ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے امساک بالمعروف کا حکم دیا اور پھر اس کی ضد سے منع فرمایا اور وہ ہے تکلیف دینے کے لئے روکنا۔ پھر اس کے ظلم اور زیادتی ہونے کی تصریح فرمائی۔ پھر اس کے بعد اپنا یہ قول فرمایا۔

[3] وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ: یعنی مبالغہ اور اہتمام کے لئے عتاب (سزا) کا تعریضاً ذکر فرمایا۔ علامہ ابن جریر نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا ایک آدمی اپنی عورت کو طلاق دیتا تھا۔ پھر اس کی عدت گزرنے سے پہلے اس کی طرف رجوع کر لیتا، پھر اسے طلاق دے دیتا وہ اسے تکلیف دینے اور تنگ کرنے کے لئے ایسا کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(1) اور بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا اور اسی طرح ابن جریر نے سدی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا یہ آیت انصار میں سے ایک آدمی کے بارے نازل ہوئی۔ جسے ثابت بن یسار کہا جاتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دی یہاں تک کہ جب عدت گزرنے کے قریب ہوئی تو اس نے اس کی طرف رجوع کر لیا اور پھر اسے تکلیف دینے کے لئے طلاق دے دی۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا الآیۃ“۔(2)

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 508 (العلمیہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 312، دار الفکر بیروت

ؔ تم ایات سے اعراض برت کر اور ان کے مطابق عمل کرنے میں سستی کر کے انہیں مذاق نہ بناؤ۔ کلبی نے کہا اس سے مراد یہ آیت ہے: "فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ" اور ہر وہ جس نے شریعت سے مخالفت کی پس وہی اللہ تعالیٰ کی آیات کو تمسخر بنانے والا ہے(1) ابن ابی عمرو نے اپنی مسند میں اور ابن مردویہ نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا ایک آدمی طلاق دیتا ہے اور پھر کہتا ہے میں نے تو مذاق کیا ہے اور کوئی لونڈی کو آزاد کرتا ہے اور پھر کہتا ہے میں نے تو تمسخر کیا ہے(2) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے اور اس میں یہ ذکر کیا ہے کہ کوئی نکاح کرتا ہے اور وہ بھی اسی کی مثل قول کہہ دیتا ہے(3) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "وَلَا تَتَّخِذُوٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا" ابن مردویہ نے اسی طرح کی روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔ ابن جریر نے اسی کی مثل روایت حسن سے مرسل ذکر کی ہے۔ ابن المنذر نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے اسی طرح ان الفاظ کے ساتھ روایت نقل کی ہے کہ تین ایسی چیزیں ہیں جن کی نسبت کسی نے عورتوں کی طرف کی لہو ولعب کی صورت میں یا بغیر لہو ولعب کے تو وہ واقع ہو جائیں گی اور وہ طلاق، عتاق اور نکاح ہیں۔ اور اس سے قبل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو سنجیدگی سے کرنے کے سبب بھی ہو جاتے ہیں اور مذاق کی صورت میں کرنے سے بھی ہو جاتے ہیں وہ نکاح، طلاق اور رجعت ہیں۔(4)

ؔ من جملہ نعمتوں میں سے ہدایت اور حضور نبی رحمت ﷺ پر آیات قرآن کو نازل کرنا ہے انہیں شکر اور ان کے حقوق بجالانے کے ساتھ یاد کرو۔ الْكِتٰبِ سے مراد قرآن مجید ہے اور الْحِكْمَةِ سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ پر وحی غیر متلو کا نازل کرنا اور اس کے سبب تمہیں نصیحت کرتا ہے جو تم پر نازل کیا گیا ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: تاکید اور تہدید (ڈرانے) کے لئے فرمایا۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

"اور جب تم طلاق دو عورتوں کو پھر وہ پوری کر چکیں اپنی عدت تو نہ منع کرو[1] انہیں کہ نکاح کر لیں اپنے خاوندوں سے[2] جبکہ رضامند ہو جائیں[3] آپس میں مناسب طریقہ سے[4] یہ فرمان الٰہی (ہے)[5] نصیحت کی جاتی ہے اس کے ذریعے اس کو جو تم میں سے یقین رکھتا ہو اللہ پر اور قیامت پر[6] یہ بہت پاکیزہ ہے تمہارے لئے اور بہت صاف اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے[7]"

[1] یعنی جب ان کی عدت گزر جائے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ بیشک دونوں کلاموں کا سیاق دونوں بلوغوں کے علیحدہ علیحدہ ہونے پر دلالت کرتا ہے (یعنی دو علیحدہ علیحدہ مدتوں تک پہنچنے پر دلالت کرتا ہے)۔ پس تم انہیں نہ روکو۔ عضل کا معنی روکنا ہے۔ دراصل اس کا معنی تنگی اور شدت ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے الداء العضال ایسی شدید بیماری جس کا علاج ممکن نہ رہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 313 (الفکر)　　2۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 509 (العلمیہ)　　3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 313 (الفکر)

4۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 515 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت

گے اس آیت سے خطاب اولیاء کو کیا گیا ہے۔ یہ آیت معقل بن یسار کی بہن جملاء بنت یسار کے بارے میں نازل ہوئی۔ اسے بداح بن عاصم بن عدی بن عجلان نے طلاق دی تھی(1) امام بخاری، ابوداؤد اور ترمذی رحمہم اللہ وغیرہ نے معقل بن یسار سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے اپنی بہن کی شادی ایک آدمی سے کی تو اس نے اسے طلاق دے دی، یہاں تک کہ جب اس کی عدت گزر گئی تو وہ اسے نکاح کی دعوت دینے کے لئے آیا۔ میں نے اس کو کہا میں نے تیری شادی کی، تیرے لئے اسے بچھونا بنایا اور تیری تکریم کی لیکن تو نے اسے طلاق دے دی پھر تو آیا کہ اسے پیغام نکاح دے۔ قسم بخدا وہ تیری طرف کبھی بھی نہیں لوٹے گی حالانکہ آدمی میں کوئی نقص نہیں تھا اور عورت بھی اس کی طرف رجوع کا ارادہ رکھتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی" فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ" تو میں نے عرض کی" یارسول اللہ ﷺ! میں ابھی کردیتا ہوں چنانچہ انہوں نے اس کی شادی اس سے کردی۔"(2) اسے ابن جریر نے کثیر اسناد سے روایت کیا ہے۔ پھر سدی سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا ہے یہ آیت جابر بن عبد اللہ انصاری کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کے چچا کی بیٹی تھی، اس کے خاوند نے اسے طلاق دے دی لیکن جب اس کی عدت گزر گئی تو وہ پھر اس کے ساتھ نکاح کے ارادے سے واپس لوٹا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے انکار کردیا۔(3) ان میں سے پہلی روایت زیادہ صحیح اور قوی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آیت اکٹھی دونوں کے بارے میں نازل ہوئی ہو۔ سیاق آیت اس کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ خطاب ساتھ ہی ان ازواج کو بھی ہو جنہیں اس آیت کے ساتھ خطاب کیا گیا" وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ" جو کہ اپنی عورتوں کو عدت گزرنے کے بعد ایسا کرنے سے بالجبر روکتے ہیں کہ وہ ان کے علاوہ دوسرے ازواج سے شادی کریں اور ہم نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی جو روایت شان نزول کے بارے ذکر کی ہے وہ تقاضا کرتی ہے کہ یہ خطاب اولیاء کو ہو جیکہ جملاء کے بھائی معقل بن یسار نے ایسا کرنے سے روکا تھا۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے کیونکہ فعل کی نسبت تمام کی طرف کی جاتی ہے جبکہ ان میں سے کسی ایک سے صادر ہو۔ جیسا کہ رب کریم کے اس ارشاد میں ہے۔" لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" یعنی تم میں سے بعض بعض کا مال نہ کھائیں اور قول باری تعالیٰ" لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ" یعنی تم میں سے بعض بعض نفوس کو ان کے گھروں سے نہ نکالیں اور اس صورت میں سیاق آیت اور سبب نزول کے مابین کوئی مزاحمت نہیں ہوگی اور اس وقت معنی یہ ہوگا جب تم میں سے بعض مرد عورتوں کو طلاق دے دیں پھر وہ عدت گزار چکیں تو اے اولیاء، سابقہ ازواج اور دوسرے لوگو! تم انہیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے ازواج سے نکاح کریں اور لفظ ازواج میں تمام تقادیر پر جائز ہے کہ اس پر یہ اطلاق ماکان کی بناء پر ہو یا اس کی طرف لوٹنے کی بناء پر ہو۔ (یعنی ما یکون کے اعتبار سے) واللہ اعلم۔

شافعیہ نے آیت میں خطاب کو اولیاء پر محمول کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ عورت بذات خود شادی نہیں کرسکتی کیونکہ اگر وہ اس کی قدرت رکھتی تو پھر ولی کے منع کرنے کا کوئی معنی نہ ہوتا اور انہوں نے عورت کی طرف نکاح کی نسبت کو مجاز پر محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ نکاح کی نسبت ان کی طرف اس سبب سے ہے کہ نکاح ان کی اجازت پر موقوف ہے۔ یہ استدلال ضعیف ہے کیونکہ نکاح عورت کا اختیاری فعل ہو تب بھی ولی کی طرف سے روکنا ممکن ہوتا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اللہ کی باندیوں کو اللہ کی مساجد سے نہ روکو(4) اس کے باوجود کہ مساجد میں آنا عورتوں کا اختیاری فعل ہے بلکہ روکنا اور ابھارنا دونوں فعل اختیاری میں ہی متصور ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے اس مسئلہ میں اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کرنا اولیٰ ہے:" وَلَا تُنْكِحُوا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 314 (الفکر)
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 223 (المحاسن)
3۔ تفسیر طبری، جلد 2 صفحہ 369 (الامیریہ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 305 مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت

الۡحَشۡرِ کُتُبُ حَنَفِیَّۃٍ بِمُؤمِنٍ" کیونکہ اسناد میں اصل حقیقت ہے۔

مسئلہ:۔ کیا آزاد، عاقلہ، بالغہ عورت کا نکاح بغیر ولی کے جائز ہوتا ہے؟ تو اس کے بارے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس کا اپنا نکاح اپنی تعبیر سے اور اس کی رضامندی کے ساتھ اس کے وکیل کی تعبیر سے جائز ہوتا ہے۔ اگرچہ ولی اس کا عقد نہ کرے چاہے زوج اس کی کفو سے ہو یا نہ ہو۔ مگر غیر کفو میں ولی کو اعتراض کا حق حاصل ہوگا اور ان دونوں سے ایک روایت میں اس طرح ہے کہ غیر کفو میں نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کفو اور غیر کفو دونوں میں نکاح منعقد ہو جاتا ہے مگر ولی کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اگر عورت صاحب شرف و جمال ہو یا مالدار ہو کہ اس جیسی عورت میں رغبت رکھی جاتی ہو تو اس کا نکاح ولی کے بغیر صحیح نہیں ہوگا، اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہو تو پھر یہ جائز ہے کہ اس کی رضا کے ساتھ کوئی اجنبی اس کے نکاح کا ولی ہو۔ اس کی اپنی تعبیر سے نکاح جائز نہیں ہوگا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ نکاح جائز نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ۔ یہی قول امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے۔ انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ تحقیق اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے وہ آپ پڑھ چکے اور احادیث میں سے ایک یہ ہے کہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے۔ پس اگر اس نے اس سے دخول کیا تو عورت کے لئے وہ مہر ہے جس کے سبب مرد نے اس کی فرج کو حلال قرار دیا۔ اور اگر اختلاف ہو جائے تو سلطان اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو(1) اسے اصحاب سنن نے ابن جریج سے اس سند سے نقل کیا ہے۔ "ابن جریج عن سلیمان بن موسیٰ عن الزهری عن عروة عن عائشة رضی اللّٰه عنها" اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن کہا ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ہمیں ابن ابی عمران نے بتایا اس نے کہا کہ ہمیں یحییٰ بن معین نے ابن علیہ سے اور انہوں نے ابن جریج سے خبر دی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے زہری سے ملاقات کی اور اس حدیث کے بارے انہیں بتایا۔ تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ ان کی طرف سے ابن جوزی نے جواب اس طرح دیا ہے کہ زہری نے سلیمان بن موسیٰ کو حدیث بیان کی، لیکن اس سے انکار کا سبب زہری کا نسیان ہے۔ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کہ نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کے ساتھ اور سلطان اس کا ولی ہے جس کا اور کوئی ولی نہیں" (2) اسے ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس میں راوی حجاج بن ارطاۃ ضعیف ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نکاح نہیں ہوتا مگر ولی اور دو عادل شاہدوں کی موجودگی میں" (3) اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اس کی سند میں راوی یزید بن سنان اور اس کا باپ ہے۔ دار قطنی نے کہا ہے کہ یہ اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔ نسائی نے کہا ہے کہ یہ متروک الحدیث ہے اور امام احمد اور دوسروں نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نکاح کے لئے چار افراد کا ہونا ضروری ہے ولی، زوج اور دو گواہ (4) اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اس کی سند میں نافع بن میسرا ابوخطیب مجہول راوی ہے۔ ایک حدیث ابو بردہ کی ہے جو انہوں نے اپنے باپ ابوموسیٰ کے واسطہ سے حضور نبی کریم ﷺ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ "نکاح نہیں ہے مگر ولی کی اجازت کے ساتھ" اسے

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، 1102 (علمیہ)
2۔ سنن ابن ماجہ، 1880 (علمیہ)
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 226 (محاسن)
4۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 225 (محاسن)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث ہے کہ" نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ اور سلطان اس کا ولی ہے جس کا اور کوئی ولی نہ ہو" اسے حجاج بن ارطاۃ کی سند سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور یہ راوی ضعیف ہے اور ایک دوسری سند میں عدی بن فضل اور عبداللہ بن عثمان دونوں راوی ضعیف ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی بغاوت کرنے والی عورتوں کو جو اپنا نکاح خود کرتی ہیں، فرمایا نکاح جائز نہیں ہوتا مگر ولی، دو گواہوں اور مہر کے ساتھ چاہے مہر قلیل ہو یا کثیر۔ اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے اس میں ایک راوی النہاس ہے یحییٰ نے کہا ہے کہ وہ ضعیف ہے اور ابن عدی نے کہا ہے کہ وہ کسی شی کے مساوی نہیں۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی نکاح نہیں ہوتا مگر ولی اور دو عادل گواہوں کے ساتھ"(1) ابن مسعود کی حدیث میں راوی بکیر بن بکار کے بارے یحییٰ نے کہا ہے کہ یہ کوئی شی نہیں ہے اور اس کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن محرز ہے۔ اس کے بارے میں دار قطنی نے کہا ہے کہ یہ متروک ہے۔ اور ابن عمر کی حدیث میں راوی ثابت بن زہیر منکر الحدیث ہے۔ اسی طرح ابو حاتم نے کہا ہے اور ابن حبان نے کہا ہے اسے حجت نہیں بنایا جا سکتا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت عورت کی شادی نہیں کر سکتی اور نہ ہی عورت اپنی شادی کر سکتی ہے۔ بیشک زانیہ وہی ہوتی ہے جو اپنی شادی خود کرتی ہے(2) اسے دار قطنی نے دو سندوں سے روایت کیا ہے۔ ان میں سے ایک میں جمیل بن حسن اور دوسری میں مسلم بن ابی مسلم راوی غیر معروف ہیں۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے" کہ کوئی نکاح نہیں ہوتا مگر راہنمائی کرنے والے ولی اور دو عادل گواہوں کے ساتھ" اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے۔ اس میں ایک راوی محمد بن عبید اللہ العرزمی ہے۔ اس کے بارے نسائی اور یحییٰ نے کہا ہے کہ یہ متروک ہے۔ اس کی حدیث لکھی نہیں جاتی اور اس میں ایک راوی قطن بن بسیر ضعیف ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس عورت نے اپنا نکاح بغیر ولی کی اجازت کے کیا وہ زانیہ ہے(3) اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ اس میں ایک راوی ابو عصمہ ابن ابی مریم ہے۔ اس کے بارے یحییٰ نے کہا ہے کہ یہ کوئی شی نہیں ہے اور دار قطنی نے کہا ہے کہ یہ متروک ہے۔ احناف نے ان ارشادات سے استدلال کیا ہے۔ "حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ" اور "اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ" کیونکہ اسناد میں اصل حقیقت ہے کہ عورت بذات خود مباشر ہو۔ مزید ان کا استدلال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث سے ہے کہ" بیوہ عورت ولی کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ حق رکھتی ہے اور باکرہ عورت سے اجازت طلب کی جائے گی اور اس کی خاموشی ہی اس کی طرف سے اجازت ہے"(4) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ علاوہ ازیں امام مالک، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی نقل کیا ہے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ اولیاء کو صرف حق مباشرت (نکاح کر دینے کا حق) حاصل ہوتا ہے اور بیوہ اس کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ حق رکھتی ہے، لہٰذا مباشر بننے کے لئے بھی وہی زیادہ اولیٰ ہے۔ اسی طرح ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کی حدیث ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور عرض کی: میرے باپ نے میرا نکاح فلاں آدمی سے کیا ہے اور میں اسے ناپسند کرتی ہوں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے باپ سے فرمایا تیرا کیا ہوا نکاح نہیں ہے اور عورت کو فرمایا" تو جا اور جس سے چاہے نکاح کر لے"(5) اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ حدیث مرسل ہے اور مرسل حدیث حجت نہیں، جبکہ ہمارا قول یہ ہے کہ مرسل حدیث حجت ہے۔ اور

1۔ کنز العمال: 44637 (التراث الاسلامی)　2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3227 (محاسن)　3۔ کنز العمال: 44647 (التراث الاسلامی)

4۔ صحیح مسلم 66، جلد 9، صفحہ 174 (علمیہ)　5۔ مصنف ابن ابی شیبہ: 15953 (الزمان)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ایک دوشیزہ ان کے پاس آئی اور کہا کہ میرے باپ نے میری شادی اپنے بھائی کے بیٹے (بھتیجے) سے کردی ہے تاکہ وہ اس سے رذالت اور خست کو دور کرے اور میں اسے ناپسند کرتی ہوں۔ تو آپ رضی اللہ عنہا نے کہا بیٹھ جاؤ۔ پس اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو اس کے بارے اطلاع دی۔ تو آپ ﷺ نے اسے اس کے باپ کی طرف بھیج دیا اور فیصلے کا اختیار اسے دے دیا۔ تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جو کچھ میرے باپ نے کیا ہے میں نے اس کی اجازت دے دی ہے۔ میں نے اس سوال سے ارادہ صرف یہ کیا ہے کہ میں عورتوں کو یہ بتا دوں کہ اس اختیار میں سے آباء کے پاس کوئی شی نہیں ہے۔ اسے نسائی نے روایت کیا ہے(1) وجہ استدلال یہ ہے کہ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس کے اس قول کو پختہ کیا کہ اختیار میں سے آباء کے پاس کوئی شی نہیں ہے جو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث اور اس حدیث کے معارض ہے کہ " نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ" تو احناف نے کہا ہے کہ جب نصوص میں تعارض آجائے تو پھر ترجیح کا طریقہ اپنانا یا کسی تاویل کے سبب ان کے درمیان تطبیق کرنا واجب ہوتا ہے۔ اس لئے ترجیح کے طریقہ کے مطابق وہ حدیث جسے مسلم نے روایت کیا ہے وہ سند کے اعتبار سے زیادہ ارجح اور اقوی ہے۔ بخلاف ان احادیث کے جنہیں اور محدثین نے روایت کیا ہے کیونکہ وہ ضعف یا اضطراب سے خالی نہیں ہیں۔ اور ان دونوں کے مفہوموں کو جمع کرنے کے طریقے کے مطابق ہم یہ کہیں گے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد " لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ "(2) کا معنی یہ ہے کہ سنت طریقے کے مطابق نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ......... یا پھر یہ کہیں گے کہ نکاح نہیں ہوتا مگر اس کی اجازت کے ساتھ جسے یہ ولایت حاصل ہو جو کہ وہ کافر کا نکاح مسلمہ سے، کسی کا نکاح اس کی محرم عورت سے، پہلے خاوند کی عدت کے دوران نکاح کرنے سے اور دیگر اسی قسم کے فاسد نکاحوں سے روک سکے۔ اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو اس عورت پر محمول کیا جائے گا جس نے اپنا نکاح غیر کفو میں کرلیا اور باطل سے مراد ان کے قول کے مطابق باطل حقیقی ہے جو غیر کفو میں نکاح کرنے کو صحیح نہیں قرار دیتے۔ اور جو نکاح کو صحیح قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد باطل حکمی ہے اور اس صورت میں ولی کے لئے نکاح کو فسخ کرنے کے لئے حق خصومت ثابت ہو جاتا ہے۔ اور یہ تمام چیزیں نصوص کے اطلاقات میں شامل نہیں اور تعارض کو دور کرنے کے لئے اس کا ارتکاب واجب ہوتا ہے۔ یا ہم یہ کہیں گے کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جب کسی عورت نے اپنا نکاح ولی کی اجازت کے ساتھ کیا تو وہ نکاح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی اصل کے مطابق جائز ہوگا کیونکہ وہ مفہوم مخالف کے قائل ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اصل کے مطابق اس لئے جائز ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک بطلان کے حکم میں داخل ہی نہیں اور اس میں اصل یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ عورت کا نکاح میں مباشر ہونا جرح کا سبب نہیں۔ کیونکہ قادح (طعن کا سبب بننے والا) تو ولی کا وہ حق ہے جو رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے مستفاد ہوتا ہے " کہ بیوہ اپنے ولی کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ حق رکھتی ہے اور ولی کا حق غیر کفو میں نکاح ہونے کے سبب ندامت کو دور کرنے کے لئے اعتراض کرنا ہے۔"

یعنی منگنی کی دعوت دینے والے اور عورتیں جب آپس میں راضی ہو جائیں۔ یہ اَنْ يَّنْكِحْنَ کی ظرف ہے۔ باہم رضا مندی کی شرط ہونے کی بناء پر ائمہ نے اس پر اجماع کیا ہے کہ بالغہ عورت پر جبر کرنا جائز نہیں، جبکہ وہ ثیبہ ہو اور بالغہ باکرہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ باپ اور دادا کے لئے اس کی رضا کے بغیر اس کا نکاح کرنا جائز ہے۔ باپ کے

1۔ سنن نسائی، جلد 6 صفحہ 87 (فاریان) 2۔ مستدرک حاکم: 2710 (علمیہ)

بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دو روایتوں میں سے مشہور روایت یہی ہے۔ کیونکہ یہ آیت ثیبات کے بارے میں ہے اور ابن جوزی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس مرفوع روایت کے مفہوم سے استدلال کیا ہے "کہ ثیبہ اپنے ولی کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ حق رکھتی ہے اور باکرہ سے اس کے نفس کے بارے میں اس کا باپ اس سے امر (مشورہ) طلب کرے گا۔" ہم کہتے ہیں کہ یہ استدلال حدیث یا آیت کے مفہوم مخالف سے ہے اور مفہوم مخالف ہمارے نزدیک حجت نہیں۔ اس بناء پر یہ حدیث اور آیت ہمارے حق میں حجت ہیں ہمارے خلاف نہیں۔ اس لئے کہ حدیث شریف کے الفاظ باکرہ عورت سے مشورہ لینے کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں اور مشورہ لینا اجبار (مجبور کرنا) کے منافی ہوتا ہے اور آیت میں قول باری تعالیٰ "ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ الآیۃ" روکنے کی تحریم پر دلالت کرتا ہے اور رضا کی شرط لگانے کا دارومدار ان مفاسد پر ہے جو نکاح سے روکنے اور جبر کرنے کی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے اور باکرہ اور ثیبہ عورت پر جبر کرنے کی صورت میں مفاسد ایک جیسے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اگر باکرہ اور ثیبہ دونوں اپنے لئے اختیار کے اثبات میں برابر ہیں تو پھر رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں وجہ فرق کیا ہے "کہ ثیبہ اپنے ولی کی نسبت اپنے نفس کا زیادہ حق رکھتی ہے اور باکرہ سے اجازت لی جائے گی" (1) اسی طرح مسلم کی روایت میں اس قول کے بعد کہ بیوہ زیادہ حق رکھتی ہے، باکرہ کے ذکر کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ وجہ فرق ان کی اجازت کی کیفیت کا بیان ہے۔ اس قول کے ساتھ کہ باکرہ کی اجازت اس کی خاموشی ہے بخلاف ثیبہ کے، کہ اس کی خاموشی معتبر نہیں۔ بلکہ اس کے لئے پہلے کسی کو وکیل بنانا یا صراحۃً اجازت دینا ضروری ہے اور یہ فرق بھی ہے کہ عموماً باکرہ عقد کے لئے مباشر نہیں ہوتی، اس لئے تعمیم کے بعد اسے خاص کیا تاکہ وہ اجازت لینے میں کسی تساہل سے کام نہ لیں۔ علامہ ابن جوزی نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جو حسن سے مرسلاً مروی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کہ باکرہ عورتوں سے ان کی ذاتوں کے بارے میں ضرور مشورہ لیا جائے اور اگر وہ انکار کر دیں تو انہیں مجبور کیا جائے۔" یہ حدیث متن اور سند دونوں کے اعتبار سے ساقط ہے۔ متن کے اعتبار سے اس طرح کہ اس کے متن میں استیمار اور اجبار کے درمیان تناقض پایا جا رہا ہے، جبکہ ایسی صورت میں اجازت لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور سند کے اعتبار سے اس طرح کہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالکریم ہے۔ اس کے بارے ابن جوزی نے کہا ہے کہ اس میں طعن ہونے پر تمام محدثین کا اجماع ہے۔ ہمارے لئے جو احادیث حجت ہیں ان میں سے وہ ہیں جو ہم نے ذکر کر دی ہیں۔ اور ان میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی ہے کہ ایک باکرہ دوشیزہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آئی اور عرض کی کہ اس کے باپ نے اس کی شادی کر دی ہے حالانکہ وہ ناپسند کرتی ہے تو آپ ﷺ نے اسے اختیار دے دیا (2) اسے امام احمد، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے سند متصل اور رجال صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول کہ یہ مرسل ہے، اس کے لئے نقصان دہ نہیں۔ بیشک یہ بعض اسناد کے اعتبار سے مرسل ہے اور مرسل روایت حجت ہے اور یہ بعض دوسری صحیح سندوں کے اعتبار سے متصل ہے۔ ابن قطان نے کہا ہے کہ ابن عباس کی یہ حدیث صحیح ہے اور اس حدیث میں مراد "خنساء بنت خدام نہیں ہے جس کی شادی اس کے باپ نے کی تھی، درآنحالیکہ وہ ثیبہ تھی پس اس نے اسے ناپسند کیا تو حضور نبی کریم ﷺ نے اس کے نکاح کو رد کر دیا" (3) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ روایت ہے کہ خنساء بھی باکرہ تھی، اس کی حدیث نسائی نے ذکر کی ہے اور اس میں ہے کہ وہ باکرہ تھی، لیکن بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ارجح

1۔ صحیح مسلم: 67، جلد 9 صفحہ 175 (علمیہ)　2۔ سنن ابن ماجہ: 1875 (علمیہ)　3۔ صحیح بخاری: 6568 (ابن کثیر)

ہے اور دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ذکر کی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے باکرہ اور ثیبہ کا نکاح رد کیا، جن کا نکاح ان کے آباء نے کیا تھا اور ان دونوں نے اسے ناپسند کیا تھا"(1) اور دار قطنی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت بھی کی ہے کہ ایک آدمی نے اپنی باکرہ بیٹی کی شادی کی تو اس نے اسے پسند نہ کیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا نکاح رد فرما دیا(2) اور ایک دوسری روایت میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ثیبہ اور باکرہ عورتوں کو ان کے خاوندوں سے علیحدہ کر دیتے تھے، اس لئے کہ ان کے آباء نے ان کی شادیاں کیں اور انہوں نے انہیں پسند نہ کیا۔ دار قطنی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیٹی کی شادی اس کے مشورہ کے بغیر کی، اس حال میں کہ وہ باکرہ تھی۔ پس وہ حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئی، تو آپ ﷺ نے ان کے درمیان تفریق کر دی(3) اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ایک نوجوان عورت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور کہا کہ بیشک میرا باپ بہت اچھا باپ ہے۔ اس نے میری شادی اپنے بھائی کے بیٹے (بھتیجے) سے کر دی ہے تا کہ وہ اپنی خست کی حالت سے دور ہو جائے۔ تو اس نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اختیار اس کے حوالے کر دیا۔ تو اس نے عرض کی جو کچھ میرے باپ نے کیا ہے میں نے اس کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن میں نے اس سوال سے یہ ارادہ کیا ہے کہ آپ ﷺ تمام عورتوں کو یہ بتائیں کہ اس بارے میں آباء کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے(4) دار قطنی نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس، حضرت جابر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کی احادیث مرسل ہیں اور ابن بریدہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حدیث نہیں سنی(5) اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کا انکار کیا ہے اور دار قطنی نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث عطاء سے مرسل ہے اور شعیب کو اس کے مرفوع ہونے میں وہم ہوا ہے اور ابن جوزی نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ثابت نہیں کیونکہ ابن ابی ذئب نے اسے نافع سے نہیں سنا، بلکہ اسے عمر بن حسین سے سنا ہے۔ تحقیق اس حدیث کے بارے میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا یہ باطل ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ احادیث مراسیل حجت ہیں، بالخصوص استشہاد اور تقویت کے لئے اور ابن جوزی کا یہ قول کہ ان احادیث کو اس صورت پر محمول کیا جائے گا جبکہ باکرہ بالغہ عورت غیر کفو میں نکاح کرے تو یہ بغیر سبب کے خلاف ظاہر پر حمل کرنا ہے۔ اس بناء پر کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث "کہ میرے باپ نے میری شادی اپنے بھائی کے بیٹے سے کر دی" اس حمل کو باطل کرنے پر صراحۃً دلالت کرتی ہے کیونکہ چچا کا بیٹا کفو ہوتا ہے اور یہ قول کہ یہ اس کے لئے ماں کی طرف سے بھائی کا بیٹا تھا یہ احتمال بھی بعید اور بلا دلیل ہے، واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ اس پر ائمہ کا اجماع ہے کہ صغیرہ باکرہ پر باپ کو ولایت نکاح حاصل ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آیا ثیبہ صغیرہ کا نکاح کرنے کی ولایت باپ کو حاصل ہے یا نہیں؟ تو اس کے بارے میں حضرت امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ صغیرہ ثیبہ کا نکاح بالکل جائز نہیں ہوتا کیونکہ بالغ ہونے سے قبل اس کی طرف سے اجازت صحیح نہیں ہوتی، اس لئے کہ اجازت کا دارومدار عقل پر ہے اور بلوغت سے قبل عقل معتبر نہیں ہوتی۔ تو اس طرح اس کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر ہوگا اور ثیبہ کا نکاح اس کی اجازت کے

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 233 (محاسن)
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 236 (محاسن)
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 233 (محاسن)
4۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 232 (محاسن)
5۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 233 (محاسن)

بغیر جائز نہیں ہوتا۔ نتیجۃً اس کا نکاح جائز نہیں ہوگا۔ جہاں تک صغرنی کا تعلق ہے تو اس کا حکم تو اجماع کے بعد بالکل بدیہی ہے (کہ اس کا نکاح نہیں ہوگا) اور کبریٰ کا اس لئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے "ثیبہ اپنے نفس کا زیادہ حق رکھتی ہے" الحدیث۔ جیسا کہ حدیث پہلے گزر چکی ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ "ثیبہ کا نکاح نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ اس کی اجازت دے" (1) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور حضرت خنساء کی حدیث ہے "کہ ان کے باپ نے ان کی شادی کر دی اور یہ اسے ناپسند کرتی تھیں درآنحالیکہ وہ ثیبہ تھیں تو حضور نبی کریم ﷺ نے ان کا نکاح رد کر دیا" (2) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ ولی کو ثیبہ پر کوئی اختیار نہیں (3) اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث ضعیف ہے۔ اور دار قطنی نے اس کی علت اور نقص بیان کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک خنساء بالغ تھی اور اس پر اجماع ہے کہ ثیبہ صغیرہ سے اجازت نہیں لی جائے گی اور نہ ہی اس کی اجازت صحیح ہوگی اور اسی بناء پر اس کے لئے نکاح کا مباشر ہونا بھی جائز نہیں۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ باپ کے لئے اس کا نکاح کرنا جائز ہے۔ اگرچہ وہ راضی نہ بھی ہو کیونکہ باکرہ صغیرہ میں ولایت کا سبب یا تو صغر سنی ہے یا پھر اس کا باکرہ ہونا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی سبب نہیں لیکن بالغہ میں بکارت کا سبب ہونا غیر معتبر ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ لہٰذا صغیرہ میں بھی یہ ولایت کا سبب نہیں بن سکتا۔ نتیجۃً صغیرہ میں ولایت کا سبب صرف صغر سنی باقی رہتا ہے اور وہ اس میں موجود ہے۔

یعنی ایسے سبب سے جسے شریعت اچھا کہتی ہو اور مروت اسے حسین گمان کرتی ہو۔ بِالْمَعْرُوْفِ مرفوع ضمیر سے حال ہے یا پھر مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی "تَرَاضِیًا كَائِنًا بِالْمَعْرُوْفِ" اور اس پر یہ دلالت موجود ہے کہ غیر کفو میں شادی کرنے سے روکنا اور وہ شادی جو شریعت میں جائز نہ ہو۔ مثلاً عدت کے دوران نکاح کرنا یا دیگر موانع کے سبب نکاح جائز نہ ہو تو اس سے روکنا جائز ہے ممنوع نہیں۔

ذٰلِكَ یہ گزشتہ عبارت جس میں روکنے سے اجتناب کرنے اور باہم رضامند ہونے کی رعایت کا ذکر ہے، کی طرف اشارہ ہے اور یہ خطاب علی کل واحد کی تاویل پر (جمع) تمام کو ہے۔ یا کاف صرف خطاب کے لئے ہے اس میں مخاطبین کی تعیین کا اعتبار نہیں۔ یا کہا جائے گا کہ کاف کا اعراب میں کوئی محل نہیں پس اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ کاف نفس کلمہ میں سے ہے۔ یہ خطاب کے لئے نہیں۔ اسی بناء پر عرب اسے واحد، تثنیہ، جمع، مذکر اور مؤنث تمام حالتوں میں واحد منصوب پڑھتے ہیں۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے اسی طریقہ پر جیسے اس ارشاد میں ہے "يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ"۔

یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ کفار شریعت کے مخاطب نہیں۔ یا یہ کہا جائے کہ مومنین کا ذکر خاص اس لئے کیا گیا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو شریعت سے نصیحت حاصل کرنے اور نفع اٹھانے والے ہیں۔

ذٰلِكُمْ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے۔ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ کا معنی ہے گناہوں کی آلائش سے پاک ہے کیونکہ روکنا اگر مطلق نکاح سے ہے تو غالباً یہ ان کے زنا میں ملوث ہونے کو لازم ہے اور اگر ان سے انہیں نکاح کرنے سے روکا جن سے نکاح کرنے پر وہ راضی ہیں اور ان سے نکاح کرنے پر مجبور کیا جن سے وہ راضی نہیں تو اس صورت میں یہ خوف ہے کہ وہ حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے اور خلع یا طلاق کا

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 131 (وزارت تعلیم)　2۔ صحیح بخاری: 4845 (ابن کثیر)　3۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 239 (محاسن)

ارتکاب کر بیٹھیں گے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو اس میں منافع اور فوائد ہیں اور تم اپنی عقلوں کے کم ہونے اور امور کے انجام سے ناواقف ہونے کے سبب نہیں جانتے۔

وَ الْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۗ وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا ؕ وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّاۤ اٰتَیْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝

"اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو[1] پورے دو سال[2] (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو پورا کرنا چاہتا ہے دودھ کی مدت[3] اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے کھانا ان ماؤں کا اور ان کا لباس مناسب طریقہ سے[4] تکلیف نہیں دی جاتی کسی شخص کو مگر اس کی حیثیت کے مطابق نہ ضرر پہنچایا جائے کسی ماں کو اس کے لڑکے کے باعث اور نہ کسی باپ کو (ضرر پہنچایا جائے) اس کے لڑکے کے باعث[5] اور وارث پر بھی اسی قسم کی ذمہ داری ہے[6] پس اگر دونوں ارادہ کر لیں دودھ چھڑانے کا بے اپنی مرضی اور مشورہ سے تو کوئی گناہ نہیں[7] دونوں پر اور اگر تم چاہو کہ دودھ پلواؤ (دایہ سے) اپنی اولاد کو پھر کوئی گناہ نہیں تم پر جبکہ تم ادا کر دو جو دینا ٹھہرایا تھا تم نے مناسب طریقہ سے[8] اور ڈرتے رہو اللہ سے اور (خوب) جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو اسے دیکھنے والا ہے[9]"

[1] اس میں اولاد کی نسبت ماؤں کی طرف ہے تا کہ یہ انہیں شفقت کرنے اور دودھ پلانے پر برانگیختہ کرے۔ یہ امر ہے جسے مبالغہ کے لئے خبر کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور یہ وجوب کے لئے ہے لیکن اس صورت میں یہ حکم منسوخ ہے جب کہ ماں دودھ پلانے پر قادر نہ ہو اور باپ کسی کو اجرت پر رکھنے کی قدرت رکھتا ہو۔ تو اس صورت میں وہ بچے کو ماں کے علاوہ کسی اور سے دودھ پلوائے گا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَ اِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى" یا پھر یہ حکم اس ارشاد گرامی کے عام حکم سے مخصوص ہو چکا ہے۔ "لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا" اس کے سوا یہ حکم اپنے اصل پر باقی ہے۔ اسی وجہ سے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اگر آدمی نے اپنی بیوی کو یا اپنی معتدہ کو اجرت پر لیا تا کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلائے تو یہ جائز نہیں اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کے لئے اسے اجرت پر لینا جائز ہے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ ماں پر دودھ پلانا دیانۃً ضروری ہے مگر قضاءً یہ اس کے عذر کو قبول کرنے اس گمان سے کہ وہ اس سے عاجز ہے، جبکہ وہ اپنی تمام شفقتوں کے باوجود دودھ پلانے سے انکار کرے۔ لیکن جب اسے اجرت پیش کی جائے تو اس کی قدرت ظاہر ہو جائے تو پھر اس صورت میں اس پر دودھ پلانا واجب ہوگا اور اجرت لینا اس کے لئے جائز نہیں ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ یہ دلیل تو اس کا تقاضا کرتی ہے کہ مطلقہ عورت کو اس کی عدت گزرنے کے بعد اجرت پر لینا جائز نہیں تا کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلائے، حالانکہ یہ بالاتفاق جائز ہے۔ تو اس کے بارے ہم یہ کہتے ہیں کہ عدت گزرنے کے بعد اسے اجرت پر لینے کا جواز اس

قول باری تعالیٰ سے ثابت ہے" فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ الآية" پس اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ماں پر دودھ پلانے کا ایجاب باپ پر اس کے رزق کے واجب ہونے کے ساتھ مقید ہے اور یہ اس ارشاد سے ثابت ہے: "وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ" لہٰذا حالت زوجیت اور حالت عدت میں وہ اس کے رزق (نفقہ وغیرہ) کو قائم رکھ سکتا ہے لیکن عدت کے بعد اس پر نفقہ واجب نہیں رہتا، لہٰذا اجرت اس کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔

2۔ اسے صفت کمال کے ساتھ مؤکد کیا کیونکہ اس میں تسامح ہو سکتا ہے اور اس قید کا تقاضا یہ ہے کہ کامل دو سال تک دودھ پلانا واجب ہے۔ لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا" فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا" تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ قید دو سال کے بعد دودھ پلانے کے جواز کی نفی کے لئے ہے اور اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ دو سال کے بعد دودھ پلانے کے جواز کی نفی کا دارومدار اپنی اصل پر ہے کیونکہ اصل یہ ہے کہ آدمی کے اجزاء سے نفع اٹھانا اس کی عزت وکرامت کے سبب جائز نہیں۔ اور دو سال کے بعد دودھ پلانے کے جواز کی نفی کا اظہار اس قول باری تعالیٰ سے بھی ہوتا ہے۔" لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ" جبکہ اس کے مکمل ہونے کے بعد کوئی شی نہیں ہے تو یہ ان کے لئے بیان ہے کہ جس کی طرف حکم بالوجوب متوجہ ہو رہا ہے۔ یعنی جو رضاعت کو مکمل کرنے کا ارادہ کرے اس کے لئے دودھ پلانے کی مدت دو سال تک ہے یا پھر یہ يُرْضِعْنَ کے متعلق ہے یعنی باپ پر دودھ پلوانا واجب ہے جیسے نفقہ وغیرہ اور ماں پر دودھ پلانا واجب ہے اگر اس پر یہ گراں نہ ہو۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماؤں پر کامل دو سال دودھ پلانا فرض کر دیا پھر اپنے اس قول کے ساتھ اس میں تخفیف نازل فرمائی۔

3۔ لہٰذا اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے، اس کے بعد جائز نہیں اور نہ ہی اس کے بعد دودھ پلانے سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ یہی قول امام ابو یوسف، امام محمد، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اسی طرح دار قطنی نے حضرت ابن عباس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے یہی قول نقل کیا ہے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ رضاعت کی مدت دو سال اور کچھ ہے۔ انہوں نے اس کی حد بیان نہیں کی۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مدت رضاعت تیس ماہ ہے اور امام زفر رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا دودھ پلانے کی مدت تین سال ہے۔ ان تمام ائمہ نے دو سال سے زیادہ مدت کو" كَامِلَيْنِ" کے قول سے اخذ کیا ہے، کیونکہ کمال کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دو سال تک بچے کو کھانا نہ کھلائے، لہٰذا اس وقت اتنی مدت کا ہونا ضروری ہے جس میں بچہ کھانے کا عادی ہو جائے اور وہ دودھ سے بھی غذا حاصل کرتا رہے۔ اس لئے اس زیادتی کی مقدار ہر ایک نے اپنی رائے سے مقرر کی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کوئی مقدار مقرر نہیں کی۔ لیکن اس بارے میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ کمال کا تقاضا یہ نہیں کہ اس دوران کھانا کھلانا ممنوع ہے بلکہ کمال کے ذکر کا مقصود یہ ہے تاکہ یہ دو سال اسے تسامحاً دو سال سے کم مدت پر برانگیختہ نہ کریں اور ہمارے قول کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ" رضاعت نہیں ہے مگر وہی جو دو سال کے دوران ہو"(1) اسے ابن جوزی اور دار قطنی نے روایت کیا ہے، دار قطنی نے ابن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ اس کے رواۃ صحیح ہیں مگر ہیثم بن جمیل حالانکہ وہ ثقہ حافظ ہے اور اسی طرح امام احمد، عجلی، ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ اور کئی ایک نے اس کی توثیق کی ہے۔

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 4 صفحہ 174 (محاسن)

؎ یعنی باپ پر۔ کیونکہ بچہ اسی کے لئے پیدا ہوتا ہے اور اسی کی طرف منسوب ہوتا ہے اور عبارت میں تبدیلی اس معنی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے جو دودھ پلانے کے وجوب ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور اس کا تقاضا کرتا ہے کہ دودھ پلانے والی کے اخراجات اس پر ہوں گے۔ اور یہ لام اختصاص کے لئے ہے۔ اسی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ظاہر روایت میں کہا ہے کہ بالغہ بچی اور بالغ اپاہج بیٹے کا خرچہ باپ پر ہے اور اسی کے ساتھ خاص ہے نہ کہ ماں پر۔ جیسا کہ صغیر بچے کا خرچہ باپ کے ساتھ خاص ہے۔ اور خصاف کی روایت میں ہے اور حسن ان سے روایت کرتے ہیں کہ وہ خرچہ والدین پر میراث کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم ہوگا۔ یہ خرچہ اور لباس زوجیت کے حکم کے مطابق جاری ہوگا اگر بچے کی ماں اس کی بیوی ہو یا معتدہ ہو۔ اور اگر اس کی عدت گزرنے کے سبب وہ اجنبی ہو چکی ہو تو یہ اجرت کی بناء پر اس کے ذمہ لازم ہوگا۔ جیسا کہ رب کریم کا یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے "فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ" اور نفقہ کی مقدار باپ کی وسعت اور خوشحالی کی کیفیت کے مطابق ہوگی کیونکہ رب کریم نے فرمایا: لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا۔

؎ تو اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ بیشک تکلیف مالا یطاق اگرچہ عقلاً جائز ہے لیکن شرعاً اللہ تعالیٰ کی جانب سے فضلاً اور احساناً اس کی نفی کر دی گئی ہے اور "لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ" کو ابن کثیر اور یعقوب نے "لَا تُكَلَّفُ" سے بدل بناتے ہوئے "لَا تُضَآرُّ" رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ نہی کے معنی میں خبر ہے اور دوسروں نے اسے صیغہ نہی کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ دونوں تقدیروں پر یہ صیغہ مبنی للفاعل (معروف) اور مبنی للمفعول (مجہول) ہونے کا احتمال رکھتا ہے اور باء سببیت کے لئے ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ کوئی ماں اپنے بچے کے سبب اپنے خاوند کو نقصان نہ پہنچائے۔ کہ وہ اس کے ساتھ سختی کرے اور اپنے خرچے یا اجرت کی نسبت اس سے زیادہ کا مطالبہ کرے۔ اور بچے کی دیکھ بھال میں کمی کے سبب وہ اس کے دل کو مضطرب کر دے اور بچے کو اپنے ساتھ مانوس کرنے کے بعد کہے کہ دودھ پلانے والی کوئی اور تلاش کرو۔ یا اسی کے مشابہ اور مطالبات کرنے لگے اور نہ یہ باپ اپنے بچے کے سبب اپنی عورت کو ستائے کہ وہ اس سے بچہ لے لے۔ حالانکہ یہ کسی اجنبیہ عورت کی مثل اجرت کے عوض دودھ پلانے کا ارادہ رکھتی ہو۔ یا پھر یہ اس کی اجرت کم کر دے۔ یا یہ اسے کسی دوسری دودھ پلانے والی پر قادر ہونے کے باوجود دودھ پلانے پر مجبور کرے جبکہ یہ دودھ پلانے کی قدرت نہ رکھتی ہو۔ یا پھر اسی کے مشابہ اور اعمال کرے۔ یہ معنی اس صورت میں ہے جبکہ یہ مبنی للفاعل ہو۔ اور اگر یہ مبنی للمفعول ہو تو پھر معنی عکس ترتیب کے ساتھ اسی طرح ہوں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ لا تضارّ کا معنی لا تضر ہو اور باء زائدہ ہو۔ یعنی کوئی ماں اپنے بچے کو یا کوئی باپ اپنے بچے کو اذیت نہ دے اس طرح کہ وہ اس کی دیکھ بھال، حفاظت، دودھ پلانے اور اس پر اخراجات کرنے میں تفریط سے کام لے، اور ماں اسے باپ کے حوالے نہ کرے یا باپ بچے کو ماں کے ساتھ مانوس ہونے کے بعد اس سے لے لے اور بچے کو دونوں میں سے ہر ایک کی طرف اضافت کے ساتھ ذکر کرنے کا مقصود دونوں سے شفقت کا مطالبہ کرنے کے لئے ہے۔

؎ "وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ" یہ قول قول باری تعالیٰ "وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ" پر معطوف ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان معروف کی تفسیر معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان معترض ہے اور وارث کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ وارث سے مراد بذات خود وہ بچہ ہے جو اپنے فوت ہونے والے باپ کا وارث ہے۔ اس کے دودھ پینے کی اجرت اور نفقہ اس

کے مال سے ہوگا، اور اگر اس کا مال نہ ہو تو پھر یہ ماں پر لازم ہوں گے اور والدین کے سوا کسی کو بچے کے نفقہ پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وارث سے مراد بچے کے والدین میں سے ایک کے فوت ہونے کے بعد باقی رہنے والا دوسرا فرد ہے۔ لہٰذا اس پر رضاعت کی اجرت، نفقہ اور لباس اسی طرح لازم ہے جیسے باپ پر تھا۔ یہ قول بھی امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کے مذہب سے موافقت رکھتا ہے۔ پہلے قول پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ بچے کا اپنے مال سے خرچ کرنا کسی غیر پر اپنے نفقہ کو واجب کرنے سے مقدم ہے۔ چاہے وہ اس کا باپ ہو یا کوئی اور اور باپ پر، یہ واجب نہیں ہوتا۔ مگر یہ فرض کر لینے کے بعد کہ بچے کا کوئی مال نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا اچھا نہیں کہ بچے پر اپنا خرچہ اسی کی مثل لازم ہے جیسے اس کا اس کے باپ پر تھا بلکہ صورت حال اس کے برعکس ہے اور یہ فرض کر لینے کے بعد کہ بچے کا کوئی مال نہیں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اور دوسرے قول پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر باقی رہنے والا صرف باپ ہو یا والدین اکٹھے موجود ہوں تو یہ حکم پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ان کے اخراجات باپ پر لازم ہیں۔ لہٰذا تکرار کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ آیت دونوں کے باقی ہونے کی صورت میں یہ تقاضا کرتی ہے کہ خرچہ دونوں پر ہوگا اور یہ سابقہ حکم کے منافی ہے اور اگر باقی رہنے والی صرف ماں ہو۔ تو پھر معنی یہ ہوگا کہ ماں پر ماں کا رزق لازم ہے۔ لہٰذا اس وقت یہ لازم آئے گا کہ یہ خود مستحق بھی ہے اور مستحق علیہا بھی۔ امام احمد، اسحاق، قتادہ اور ابن ابی لیلیٰ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ وارث سے مراد مردوں اور عورتوں میں سے بچے کا وارث ہے، ہر وارث کو اتنی مقدار اس کے نفقہ پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ جتنی مقدار میراث میں اس کا حصہ ہے، چاہے وہ عصبہ ہو یا کوئی اور، اسی طرح چاہے بچہ اس کا وارث ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح جب بچی ہو تو اس کا وارث اس کے چچا کا بیٹا اور بھائی کا بیٹا ہو سکتا ہے۔ حالانکہ یہ اس کی طرف سے وارث نہیں ہوتی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت اس طرح ہے کہ مجبور صرف اسے کیا جا سکتا ہے جب دونوں ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہوں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی روایت کے مطابق ہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے وہی مفہوم ظاہر ہے اور آیت سے جلدی اخذ ہونے والا ہے، اس پر کوئی غبار نہیں۔ مگر امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے وارث کے لئے ذی رحم محرم ہونے کی قید ذکر کی ہے۔ لہٰذا اس قید سے معتق (آزاد کرنے والا)، چچا کا بیٹا اور اس قسم کے دوسرے وارث نکل جاتے ہیں۔ اور اس قید کا سبب حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ قرأت ہے: "وَعَلَى الْوَارِثِ ذِي الرَّحِمِ الْمَحْرَمِ مِثْلُ ذٰلِكَ" امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اصول کی بناء پر یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت کے ساتھ کتاب کی تخصیص اور اس پر زیادتی جائز ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ وارث سے مراد عصبہ ہے۔ لہٰذا بچے کے عصبوں کو اس کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا مثلاً دادا، بھائی، بھائی کا بیٹا، چچا اور اس کا بیٹا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ قول حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہے اور اسی طرح ابراہیم، حسن، مجاہد، عطاء اور سفیان رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی کہا ہے(1) میں کہتا ہوں کہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ نقصان دہ چیز کو چھوڑنا وارث کے ساتھ مختص نہیں۔ بیشک اس کا ذکر والدین کے بارے میں ضرر کے پیدا ہونے والے وہم کو دور کرنے کے لئے کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اس لئے بھی کہ ذالک کا کلمہ وضع کے اعتبار سے بعید کے لئے ہے اور وہ نفقہ کا وجوب ہے۔ قریب کے لئے یہ استعمال نہیں ہوتا جو کہ ضرر رساں چیز ہے۔ واللہ اعلم۔

اسی آیت کی بناء پر امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ غنی پر ہر ذی رحم محرم کا نفقہ واجب ہوتا ہے جب وہ صغیر اور فقیر ہو، یا عورت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 317-318 (فکر)

بالغ فقیر ہو، یا مذکر اپاہج ہو، یا اندھا فقیر ہو۔ ان امور سے اسے مقید اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ نص وارد ہونے کا محل صغیر ہے۔ اور صغر محتاج ہونے کے اسباب میں سے ہے۔ لہٰذا ان میں سے ہر ایک محتاج ہونے کے اعتبار سے صغیر کے ساتھ ملحق ہو جاتا ہے۔ بخلاف ایسے فقیر کے جو کمانے والا ہو چونکہ وہ اپنے کسب کے سبب غنی ہے اس لئے وہ صغیر کے ساتھ ملحق نہیں ہوگا اور اس کا نفقہ کسی دوسرے پر واجب نہیں ہوگا۔ اور اس میں میراث کی مقدار کا اعتبار کیا جائے گا، کیونکہ مشتق کی طرف حکم کی اضافت ماخذ اشتقاق کے علت ہونے پر دلالت کرتی ہے لہٰذا ماں اور دادا پر تہائی کا ایک تہائی ہوگا اور تنگ دست اپاہج بھائی کا خرچہ خوشحال متفرق بہنوں (یعنی اخیافی یا علاتی) پر میراث کی مقدار کے مطابق پانچواں حصہ ہوگا۔ علماء نے کہا ہے کہ اعتبار اہلیت ارشاد کا ہوتا ہے نہ کہ اس کی حفاظت کرنے کا۔ کیونکہ اسے تو موت کے بعد ہی جانا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جب کسی معسر (تنگ دست) کا ماموں اور چچا کا بیٹا ہو تو اس کا نفقہ اس کے ماموں پر ہوگا نہ چچا کے بیٹے پر۔ اور دین مختلف ہونے کی صورت میں بھی ان پر نفقہ واجب نہیں ہوگا، اس لئے کہ ان میں اہلیت ارث باطل ہے اور یہی نفقہ واجب ہونے کی علت ہے اور فقیر پر بھی نفقہ واجب نہیں ہوگا کیونکہ یہ تو از روئے صلہ رحمی کے واجب ہوتا ہے تو جب یہ خود کسی غیر پر اپنے نفقے کا استحقاق رکھتا ہے۔ تو اس پر وہ کیسے لازم ہو سکتا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جو کہا ہے کہ آدمی پر واجب ہے کہ وہ اپنے والدین، دادوں اور دادیوں پر خرچ کرے جبکہ وہ فقیر ہوں اگر چہ وہ کافر ہوں اور ان کا خرچہ صرف بیٹے پر ہوگا، والدین کے خرچہ میں بیٹے کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہوگا اور ظاہر روایت کے مطابق ان کا خرچہ مردوں اور عورتوں پر برابر برابر ہے وارثت کے طریقہ پر نہیں۔ بخلاف امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے کہ وہ کہتے ہیں کہ مرد اور عورت پر نفقہ تین حصوں میں تقسیم ہوگا۔ (یعنی مرد پر دو حصے اور عورت پر ایک حصہ) اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی مروی ہے۔ تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا دارومدار اس آیت پر نہیں۔ بلکہ انہوں نے کہا ہے کہ ان کا خرچہ جزئیت کے سبب ہے نہ کہ وراثت کے سبب۔ اللہ تعالیٰ نے کافر والدین کے بارے میں فرمایا ہے:۔ "وَ اِنْ جٰهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا" اور معروف یہ نہیں ہے کہ وہ دونوں بھوکے مر جائیں حالانکہ ان کا بیٹا غنی ہو اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لئے ہے" اسے حضور نبی کریم ﷺ سے صحابہ کرام کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ اور اصحاب سنن اربعہ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کہ آدمی کے لئے سب سے اچھا کھانا وہ ہے جو اس نے اپنے بیٹے کی کمائی سے کھایا کیونکہ اس کا بیٹا بھی اس کی اپنی کمائی میں سے ہے۔" اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن کہا ہے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ نے عمرو بن شعیب سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے کہا میرے پاس مال ہے اور میرے والد میرے مال کے محتاج ہوتے ہیں۔ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "تو اور تیرا مال تیرے والد کے لئے ہیں بیشک تمہاری اولاد تمہاری سب سے اچھی کمائی ہے۔ اس لئے اپنی اولاد کی کمائی سے کھاؤ" (1) ان تمام احادیث کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بیٹے کے مال میں باپ کی ملکیت ثابت ہے، لیکن اسے اجماع اور آیت میراث کی دلالت کے سبب اپنے ظاہر سے پھیر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کا معنی یہ ہے کہ حاجت کے وقت والد کے لئے مالک بننا جائز ہوتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کا نفقہ بچے پر واجب ہوتا ہے اور ورثاء میں سے اپنے علاوہ کسی اور کو ان کے خرچہ میں شریک نہیں کرے گا تو جب وارثت کی بناء پر نفقہ ثابت نہیں ہوگا تو اس میں وراثت کا طریقہ اور اصول بھی معتبر نہیں ہوگا۔ رہا دادا اور دادی کا حکم، تو ان دونوں کو باپ اور ماں پر ہی قیاس کیا گیا ہے۔ اسی لئے یہ دونوں باپ اور ماں کی میراث کی حفاظت کرتے ہیں اور دادا

1۔ سنن ابن ماجہ: 2292 (علمیہ)

نکاح میں ولی بنتا ہے۔ حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی "میں فقیر ہوں، میرے پاس کوئی شئ نہیں اور میرے پاس یتیم کا مال ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنے یتیم کے مال سے کھانے مگر اس میں اسراف نہ ہو، اس میں مبادرت نہ ہو اور نہ ہی تو اسے اپنے پاس جمع کرنے والا ہو" (1) اسے ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور جب امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ نے وارث کی وہ تفسیر کی جو ہم نے ذکر کی ہے۔ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نفقہ واجب نہیں ہوگا مگر قریبی والدین کے لئے اور صلبی اولاد کے لئے نہ کہ دادوں اور دادیوں کے لئے اور بیٹے اور بیٹی کی اولاد کے لئے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ نفقہ مطلقاً اصول و فروع کے لئے واجب ہوتا ہے اور وہ ان عمود النسب (نسب کے ستون باپ دادا) سے تجاوز نہیں کرے گا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی کہا ہے کہ نفقہ مردوں کے ساتھ خاص ہے۔ مثلاً دادا، بیٹا اور پوتا وغیرہ عورتوں پر نہیں ہوتا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ نفقہ صلبی اولاد پر ہوتا ہے۔ اس میں مذکر و مؤنث دونوں برابر ہوتے ہیں بشرطیکہ دونوں خوشحال ہوں اور اگر ان میں سے ایک خوشحال ہو اور دوسرا فقیر ہو تو نفقہ خوشحال پر لازم ہوگا و اللہ اعلم۔

ے یعنی والدین اگر ارادہ کریں دو سال سے پہلے دودھ چھڑانے کا کیونکہ دو سال کے بعد دودھ چھڑانا تو واجب ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ "جو کوئی مدت رضاعت کو مکمل کرنے کا ارادہ کرے تو اس کے لئے دودھ پلانے کی انتہائی مدت دو سال ہے۔" اگر یہ کہا جائے کہ فاء تقاضا کرتی ہے کہ دودھ چھڑانے کا ارادہ دو سال کے بعد کیا جائے۔ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ فاء مطلق رضاعت سے تعقیب کے لئے ہے، نہ کہ دو سال کے بعد کے لئے ہے اور مدارک میں ہے کہ حکم مطلق ہے چاہے، دو سال سے مدت زائد ہو یا کم۔ اور کہا کہ یہ حد بیان کرنے کے بعد ایک وسعت ہے اور انہوں نے یہ کہا تاکہ وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے موافق ہو جائے کیونکہ ان کے نزدیک دو سال کے بعد نصف سال تک دودھ پلانا جائز ہے۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اگر یہ آیت تحدید کے لئے ناسخ ہے اور حکم دو سالوں کے بعد کے ساتھ مطلق ہو یا مقید۔ اس سے تین سالوں کے بعد بھی دودھ پلانے کا جواز لازم آئے گا اور یہ اجماع کے خلاف ہے۔ کسی نے بھی یہ قول نہیں کیا۔ لہٰذا اڑھائی سال حد بیان کرنے کا کوئی سبب نہیں اور اسی طرح یہ جو انہوں نے کہا کہ اڑھائی سال کی مدت اس قول باری تعالیٰ سے ثابت ہے "وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا" تو اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ ہم ان شاء اللہ عنقریب سورۂ نساء میں اس آیت کی تفسیر میں اس کے بارے بیان کریں گے "وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْۤ اَرْضَعْنَكُمْ" اور اگر کہا جائے کہ دو سال سے کم مدت پر فصال کو محمول کرنے سے بھی دو سال کی حد بیان کرنے کا نسخ لازم آتا ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ مکمل دو سال تک دودھ پلانے کا وجوب اس قول کے ساتھ مقید ہے: "لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ" اور یہ آیت دونوں کی باہم رضامندی اور مشاورت کے ساتھ دودھ چھڑانے کی اباحت پر دلالت کرتی ہے۔ اس لئے نہ یہ اس کے منافی ہے اور نہ ہی ناسخ۔ و اللہ اعلم۔

۸ یعنی باہم رضامندی سے صادر ہو والدین سے اور اہل علم سے مشورہ کرنے کے ساتھ تاکہ وہ ایسے وقت میں دودھ چھڑانے کی اجازت دیں جب وہ بچے کے لئے نقصان دہ نہ ہو اور مشاورۃ سے مراد رائے لینا ہے۔ تو اس میں ان پر کوئی حرج نہیں۔ اس میں دونوں کی رضامندی کا اعتبار کیا گیا ہے تاکہ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی خاص مقصد کے لئے ایسا اقدام نہ کرے جس کے سبب بچے کو

1۔ سنن ابن ماجہ: 2718 (علیہ)

نقصان پہنچے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان دو میں سے کسی ایک کے لئے بھی باہم رضامندی اور اہل الرائے سے مشورہ لئے بغیر دو سال سے قبل دودھ چھڑانا جائز نہیں۔

۹؎ اے آباء اگر تم ارادہ کرو کہ تم اپنے بچوں کو ان کی ماؤں کے علاوہ دوسری دودھ پلانے والیوں سے دودھ پلواؤ اگر وہ اپنی کسی علت یا دودھ ختم ہو جانے کے سبب انہیں دودھ پلانے سے انکار کر دیں یا وہ نکاح کا ارادہ کریں یا وہ غیر عورتوں کی نسبت زیادہ اجرت طلب کریں۔ بیشک ہم نے والدین سے نقصان اور ضرر کو دور کرنے کے لئے اس حکم کو ان سابقہ قیود کے ساتھ مقید کیا ہے اور مفعول اول کو استغناء کے سبب حذف کیا گیا ہے۔ تم پر کوئی گناہ نہیں جب تم ان کی ماؤں یعنی انہیں دودھ پلانے والیوں کے سپرد کر دو جب تم نے انہیں دینے کا ارادہ کیا ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد ہے اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ (جب تم نماز کے لئے کھڑے ہونے کا ارادہ کرو) یا بِمَآ اٰتَيْتُمْ سے مراد وہ مال ہے جو تم نے ان کے دودھ پلانے کی مقدار بطور اجرت رضاعت ان کے لئے مقرر کیا ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ جب تم دودھ پلانے والیوں کی اجرت ان کے حوالے کر دو۔ بلا جناح یہ سپرد کرنا مستحب ہے، جواز کے لئے شرط نہیں۔ ابن کثیر نے یہاں مَآ اَتَيْتُمْ پڑھا ہے۔ اور سورۂ روم میں وَمَآ اَتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا میں الف مقصورہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے مَا فَعَلْتُمْ (جو تم نے کیا) اس صورت میں تسلیم بمعنی اطاعت اور عدم اعتراض ہوگا۔ یعنی جب والدین میں سے ایک نے اس کی اطاعت کر لی جو دوسرے نے کیا دودھ پلوانے کے بارے میں ایسے متعارف طریقے سے جو شرعاً مستحسن ہو۔ یہ سَلَّمْتُمْ کے متعلق ہے۔ اور جواب شرط محذوف ہے۔ جس پر اس کا ماقبل دلالت کرتا ہے۔

۱۰؎ وَاتَّقُوا اللّٰهَ یہ ان اصول و ضوابط کی محافظت میں مبالغہ کا اظہار کرنے کے لئے ہے جو بچوں اور دودھ پلانے والیوں کے بارے میں مشروع قرار دیے گئے اور وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ انہیں برانگیختہ کرنے اور ڈرانے کے لئے ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

"اور جو لوگ فوت ہو جائیں تم میں سے اور چھوڑ جائیں بیویاں تو وہ بیویاں انتظار کریں ۱؎ چار مہینے اور دس دن ۲؎ اور جب پہنچ جائیں اپنی (اس) مدت کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقہ سے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب واقف ہے ۳؎"

۱؎ یعنی جو مر جاتے ہیں۔ التوفی کا معنی ہے کسی شی کو مکمل طور پر پورا کر کے لینا۔ یعنی جو اپنی مدتیں پوری کر کے اس حال میں فوت ہو جاتے ہیں کہ وہ بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں انتظار کریں۔ یتربصن میں ضمیر ازواج کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی ان کے خاوند انہیں روکتے ہیں۔ یا پھر ابتداء میں مضاف محذوف ہوگا۔ یعنی "اَزْوَاجُ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ يَتَرَبَّصْنَ بَعْدَهُمْ" (یعنی وہ ازواج جو فوت ہو گئے ان کے بعد وہ انتظار کریں)۔

۲؎ اس میں لیالی کے اعتبار سے عشر کو مؤنث ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ مہینوں اور دنوں میں پہلے ہوتی ہیں۔ عرب جب دنوں اور راتوں کے

درمیان مبہم عدد ذکر کریں تو اس میں پھر راتوں کو غلبہ دیتے ہیں اور ایسی صورت میں کبھی بھی مذکر کا استعمال نہیں کرتے حتیٰ کہ وہ کہتے ہیں صُمْتُ عَشْرًا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا" پھر فرمایا "اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا" اور آیت حاملہ عورتوں اور غیر حاملہ دونوں قسم کی عورتوں کو شامل ہے۔ پھر حاملہ عورتوں کے حق میں اس کے حکم کو اس قول باری تعالیٰ سے منسوخ کر دیا گیا "وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ" حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو چاہے میں اس سے مباہلہ کرتا ہوں کہ سورۃ النساء القصری (عورتوں کے بارے چھوٹی سورت) یعنی سورۃ طلاق سورۃ النساء الطولی (عورتوں کے بارے لمبی سورۃ) یعنی سورۃ البقرہ کے بعد نازل ہوئی اور اس پر اجماع منعقد ہے۔ حضرت مسور بن مخرمہ سے روایت ہے کہ سبیعہ اسلمیہ کے ہاں ان کے خاوند کے فوت ہو جانے کے چند راتیں بعد بچہ پیدا ہوا۔ تو وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور نکاح کرنے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے اسے اجازت دے دی لہٰذا اس نے نکاح کر لیا۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(1) صحیحین میں حدیث سبیعہ اسی طرح منقول ہے اور حدیث ام سلمہ بھی اسی طرح ہے اور اسے نسائی نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے خاوند کے فوت ہو جانے کے نصف مہینہ بعد بچے کو جنم دیا اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں چالیس راتوں کا ذکر ہے۔ اور ایک روایت میں تقریباً دس راتوں کا ذکر ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی اور اس کے بعد پندرہ کا ذکر کیا۔ اور حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایسی عورت ابعد الاجلین کے ساتھ عدت گزارے گی (یعنی دو مدتوں میں سے جو زیادہ ہو گی (عدت وفات یا عدت حمل) اس کے ساتھ وہ عدت گزارے گی) اسے ابو داؤد نے اپنی تاریخ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا اگر عورت نے اپنا حمل وضع کر لیا درآنحالیکہ ابھی اس کا خاوند چارپائی پر پڑا ہو تو پھر بھی وہ حلال ہو جائے گی۔ اسے امام مالک، امام شافعی اور ابن ابی شیبہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ: ۔ ایسی لونڈی جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت بالاجماع دو مہینے اور پانچ دن ہے۔

فصل: ۔ عدت وفات میں بالاجماع احداد (سوگ منانا) واجب ہے مگر حسن اور شعبی رحمہما اللہ تعالیٰ سے یہ منقول ہے کہ یہ واجب نہیں اور طلاق رجعی کی عدت میں بالاجماع احداد نہیں ہے اور طلاق بائن کی عدت گزارنے والی کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ واجب ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ واجب نہیں اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ سے ان دونوں مذہبوں کی مثل منقول ہے۔ ہمارے نزدیک صغیرہ پر احداد نہیں ہے کیونکہ وہ مکلفہ نہیں ہے اور ذمیہ عورت پر بھی نہیں ہے کیونکہ وہ شریعت کی مخاطبہ نہیں ہے۔ حضرت امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک دونوں پر واجب ہے۔ اور احداد سے مراد خوشبو لگانے، زینت کے لئے سرمہ اور مہندی لگانے اور ایسے کپڑے پہننے کو ترک کرنا ہے جو زینت و آرائش کے لئے رنگے جائیں مثلاً زرد یا زعفرانی رنگ سے رنگا ہوا کپڑا یا ان ہی کی مثل کوئی اور پرکشش رنگ، ریشم، دیباج پہننے سے اجتناب کرنا، خضاب نہ لگانا، سر پر تیل نہ لگانا اور جسم پر خوشبودار یا سادہ تیل لگانے سے رکنا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سر کے علاوہ بدن پر ایسا تیل لگانے میں کوئی حرج نہیں جس میں خوشبو نہ ہو۔ اور اگر وہ سرمہ لگانے کے لئے مجبور ہو جائے تو اس بارے میں کثیر علماء نے اسے رخصت دی ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ رات کے وقت سرمہ لگائے اور دن کے وقت صاف کر دے۔ اسی طرح عذر کی صورت میں خضاب یا اس

1۔ صحیح بخاری:5014 (ابن کثیر)

جیسی کوئی اور چیز لگانے میں کوئی حرج نہیں۔ طلاق رجعی اور بائنہ والی عورت کے لئے رات اور دن کے وقت اپنے گھر سے نکلنا جائز نہیں۔ جیسا کہ رب کریم نے فرمایا "لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ" (اور تم انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ ہی وہ خود نکلیں) اور وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے وہ دن کے وقت یا رات کے بعض حصہ میں باہر نکل سکتی ہے لیکن وہ اپنے گھر کے سوا کسی کے گھر میں رات بسر نہیں کر سکتی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے وہ مطلقاً نکل سکتی ہے اور طلاق بائنہ والی کے لئے دن کے وقت نکلنا جائز ہے۔ حضرت عطاء نے کہا ہے کہ آیۃ المیراث نے سکنیٰ کو منسوخ کر دیا ہے، لہٰذا وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے اور احداد کا وجوب حضرت ام حبیبہ اور زینب بنت جحش رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لاتی ہے اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ میت پر تین راتوں سے زیادہ سوگ منائے مگر اس کے اپنے خاوند پر چار مہینے اور دس دن سے زیادہ احداد حلال نہیں، متفق علیہ (1) حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی عورت کسی میت پر تین دن سے زیادہ احداد نہ کرے مگر اپنے خاوند پر چار مہینے اور دس دن احداد کرے، وہ رنگا ہوا کپڑا نہ پہنے مگر ایسا کپڑا جس کا سوت بننے سے پہلے رنگ دیا جائے۔ وہ سرمہ نہ لگائے اور نہ ہی خوشبو لگائے مگر جب وہ پاک ہو جائے تو تھوڑا سا قسط (ایک دوا کا نام ہے) یا اظفار (ناخن کے مشابہ ایک خوشبو دار شی) استعمال میں لے آئے، متفق علیہ (2) اور ابو داؤد نے اس میں یہ زیادتی کی ہے کہ وہ کسی قسم کا خضاب نہ لگائے (3) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میری بیٹی کا خاوند فوت ہو چکا ہے اور اس کی آنکھوں میں تکلیف ہے کیا ہم اسے سرمہ لگا سکتے ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ اس نے دو یا تین مرتبہ عرض کی۔ آپ ﷺ نے ہر بار فرمایا نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا بیشک وہ چار مہینے اور دس دن ہی تو ہے۔ تحقیق تمہاری حالت یہ تھی کہ بیوہ پر سال بھر کے بعد اونٹ کی مینگنیاں ماری جاتی تھیں، متفق علیہ (4) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب ابو سلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے تو میں نے اپنے اوپر جر (سفید رنگ کی کوئی چیز یعنی ایلوہ) لگا رکھی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا اے ام سلمہ یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یہ جر ہے اس میں خوشبو نہیں ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ چہرے کو نکھار دیتا ہے، اس لئے یہ رات کے وقت لگایا کرو اور دن کے وقت اتار دیا کرو اور خوشبو اور مہندی کے ساتھ کنگھی نہ کرو کیونکہ یہ خضاب ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں کونسی شی سے کنگھی کروں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا "بیری کے پتوں سے اپنے سر کو دھولیا کرو" (5) اسے ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ آپ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اسے چاہئے کہ نہ وہ زرد رنگ اور سرخ مٹی سے رنگا ہوا کپڑا پہنے، نہ زیور پہنے، نہ خضاب لگائے اور نہ ہی سرمہ لگائے (6) اسے ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ زینب بنت کعب سے روایت ہے کہ فریعہ بنت مالک بن سنان جو کہ حضرت ابو سعید خدری کی بہن ہے نے اسے خبر دی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی تا کہ اپنے اہل بنی خدرہ کی طرف لوٹنے کے بارے آپ ﷺ سے پوچھے۔ بیشک اس کا خاوند اپنے غلاموں کی تلاش میں نکلا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا تو اس نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے اہل کی طرف لوٹنے کے بارے پوچھا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 171 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم: 66، جلد 10، صفحہ 99 (علمیہ)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 315 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم: 61، جلد 10، صفحہ 98 (علمیہ)
5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 315 (وزارت تعلیم)
6۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 315 (وزارت تعلیم)

کیونکہ میرے خاوند نے مجھے ایسے گھر میں نہیں چھوڑا جس کا وہ مالک ہو اور نہ ہی اس نے کوئی نفقہ چھوڑا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جی ہاں (اچھا ہے) پس میں واپس مڑی یہاں تک کہ ابھی میں حجرہ کے پاس تھی یا مسجد کے پاس تو آپ ﷺ نے مجھے بلایا اور فرمایا "تو اپنے گھر میں ٹھہر یہاں تک کہ عدت کی مقررہ مدت گزر جائے۔ وہ کہتی ہے کہ پھر میں نے اسی گھر میں چار مہینے اور دس دن عدت گزاری"(1) اسے امام مالک، ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح میں، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے دو سندوں سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ دو سندوں کے اعتبار سے صحیح الاسناد ہے اور شیخین نے اسے نقل نہیں کیا اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے اور ابن عبدالبر کا قول ہے کہ یہ حدیث مشہور ہے۔ اور انہوں نے اس حدیث سے جسے دارقطنی نے روایت کیا ہے یہ استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو جس کا خاوند فوت ہو جائے یہ حکم دیا ہے کہ وہ جہاں چاہے عدت گزارے۔ تو ابن عبدالبر نے اس کے بارے کہا ہے کہ ابو مالک اشجعی کے بغیر اس کی کوئی سند نہیں اور وہ ضعیف ہے(2) اور ابن قطان نے کہا ہے کہ محبوب بن محرز بھی ضعیف ہے، عطاء بن سائب مختلط ہے اور ابو بکر وبن مالک ان تمام سے بڑھ کر ضعیف ہے۔ اسی لئے دارقطنی نے اس پر جرح کی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اگر میت کے گھر میں عورت کا حصہ اس کے لئے کافی نہ ہو اور ورثاء اپنے حصوں سے اسے نکال دیں تو پھر وہ منتقل ہو سکتی ہے کیونکہ اس کا یہ انتقال عذر کے سبب ہے اور عبادات میں عذر مؤثر ہوتا ہیں۔ تو یہ اسی طرح ہے کہ جب اسے مکان کے گرنے کا خوف ہو یا وہ ایسے اجرت والے مکان میں ہو جس کی اجرت ادا کرنے کے لئے وہ مال نہ پائے اور جس مکان کی طرف وہ منتقل ہوئی وہاں سے اسے کوئی نہ نکالے۔

3؎ یعنی جب ان کی عدت گزر جائے اے ائمہ اور مسلمانو! جو بھی کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں زینت، شادی اور گھر سے باہر نکلنے وغیرہ امور میں سے۔ ایسے انداز میں کہ شرعاً وہ ممنوع نہ ہو۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ ایسے کام کریں جو شرعاً ممنوع ہیں تو پھر انہیں روکنا ان پر لازم ہے کیونکہ منکر عمل سے روکنا واجب ہے۔ لہٰذا اگر انہوں نے اس معاملے میں کوتاہی کی تو پھر ان پر گناہ ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے اعمال کے مطابق جزا دے گا۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾

"اور کوئی گناہ نہیں تم پر اس بات میں کہ اشارہ سے پیغام نکاح دو ان عورتوں کو[1] یا جو چھپائے ہو تم اپنے دلوں میں جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے[2] البتہ نہ وعدہ لینا ان سے خفیہ طور پر بھی[3] مگر یہ کہ کہو (ان سے) شریعت کے مطابق کوئی بات[4] اور نہ پکی کر لو نکاح کی گرہ[5] یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت اپنی انتہاء کو اور جان لو کہ یقیناً اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے سو اس سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا حلم والا ہے[6]"

1؎ خطبۃ سے مراد نکاح کا مطالبہ کرنا ہے۔ تعریض سے مراد ایسا کلام ہے جس سے سامع متکلم کی مراد سمجھ جائے مگر اس کے الفاظ حقیقۃً

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1204 (علمیہ)　　2۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 316 (محاسن)

یا مجازاً اس معنی مراد کے لئے وضع نہ کئے جائیں اور کنایہ سے مراد کسی شی پر اس کے لوازمات کے ذکر کے سبب دلالت کرنا ہے۔ جیسا کہ لمبے قد والے آدمی کے لئے طویل النجاد اور مہمان نواز کے لئے کثیر الرماد بولا جاتا ہے۔ تعریض کی مثال یہ ہے کہ سکینہ بنت حنظلہ اپنے خاوند سے بیوہ ہو گئی تو اس کی عدت کے دوران ابو جعفر محمد بن علی الباقر اس کے پاس آئے اور کہا اے حنظلہ کی بیٹی! میں وہ ہوں کہ تو رسول اللہ ﷺ سے میری قرابت، میرے دادا علی رضی اللہ عنہ کے حق اور ان کے اسلام لانے میں سب سے مقدم ہونے کو بالیقین جانتی ہے۔ تو سکینہ نے کہا کیا تو مجھے نکاح کی دعوت دے رہا ہے حالانکہ میں عدت میں ہوں اور اس کا تجھ سے مؤاخذہ کیا جائے گا۔ تو انہوں نے کہا بیشک میں نے تجھے رسول اللہ ﷺ سے اپنی قرابت کے بارے خبر دی ہے اور رسول اللہ ﷺ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے حالانکہ وہ ابھی اپنے خاوند ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی عدت میں تھی۔ تو آپ ﷺ نے اس کے پاس رب کریم کی بارگاہ میں اپنے مقام و مرتبہ کا ذکر فرمایا اور آپ ﷺ اپنے ہاتھ پر زور دے کر چٹائی پر تشریف فرما تھے حتیٰ کہ دست مبارک پر زیادہ بوجھ ہونے کی وجہ سے چٹائی کے نشانات اس میں ظاہر ہو گئے۔(1)

لے یعنی تم اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہو اور تم نے اسے صراحۃً یا تعریضاً ذکر نہیں کیا اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ بیشک تم ضرور ان کا ذکر کرو گے دلوں کے ساتھ اور تم ان سے خاموشی پر صبر نہیں کر سکو گے۔ پس اس نے تمہارے لئے تعریض کو مباح قرار دیا اور چھپانے پر کوئی مؤاخذہ نہیں کیا۔ یہ بھی نکاح کی دعوت پر زجر و توبیخ کی ایک نوع ہے۔

لے یہ محذوف کلام سے استدراک ہے جس پر سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ دلالت کرتا ہے کہ تم دلوں میں ان کا ذکر کرو اور نکاح کی دعوت تعریضاً دو لیکن تم ان سے خفیۂ نکاح صریح یا جماع کا کوئی وعدہ نہ لو۔ اس میں وطی کو سِر سے تعبیر کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ آسان ہے پھر اس سے مراد عقد نکاح بھی ہے۔ اس لئے کہ وہ وطی کا سبب ہے۔

لے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ تعریض کریں صراحۃً نہ کہیں۔ اس میں مستثنیٰ منہ محذوف ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے" لا تواعدوھن مُوَاعَدَةً اِلَّا مُوَاعَدَةً مَعْرُوْفَةً" یا" اِلَّا مُوَاعَدَةً بِقَوْلٍ مَعْرُوْفٍ"(تم ان سے کوئی وعدہ نہ لو مگر مناسب وعدہ یا مناسب قول کے ساتھ وعدہ) جان لو ایسی عدت گزارنے والی عورت جس کی فرقت کا سبب رضاع یا اس کی مثل کوئی اور ہو، یا وہ لعان کے سبب جدا ہوئی ہو یا اسے تین طلاقیں ہو چکی ہوں تو اس طرح کہ اس کے ساتھ پہلے مرد کی شادی حلال نہ ہو گی۔ تو ایسی معتدہ کو بھی اجنبی آدمی کے لئے تعریضاً نکاح کی دعوت دینا جائز ہے اور اگر اسے طلاق بائنہ ہو چکی ہو تو پہلے خاوند کی شادی اس سے حلال ہو گی، لہٰذا پہلے خاوند کے لئے اسے صراحۃً اور تعریضاً نکاح کی دعوت دینا جائز ہے۔ تو کیا غیر آدمی کا اس سے تعریض کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کے بارے یہ کہا گیا ہے کہ یہ تین طلاقوں والی عورت کی مثل ہے، اس لئے زوج اول کا حق منقطع ہو جانے کے سبب تعریض جائز ہے اور یہ قول بھی ہے کہ غیر کے لئے تعریض جائز نہیں کیونکہ اس زوج اول کا دوبارہ اس کی طرف لوٹنا جائز ہے اور نکاح کا اثر ابھی باقی ہے لیکن پہلا قول زیادہ واضح اور اظہر ہے۔

لے یہ کنایۂ عدت کے دوران عقد نکاح کرنے سے نہی ہے کیونکہ عزم عقد کے لئے لازم ہے اور نہی میں یہ انداز زیادہ بلیغ ہے۔ اس قول کی نسبت کہ لَا تَعْقِدُوْا النِّكَاحَ (کہ تم عقد نکاح نہ کرو) اور اس میں عزم کی حرمت پر دلالت نہیں ہے لہٰذا اول سے پختہ ارادہ کرنے

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 224 (کامن)

پر بالا جماع کوئی مؤاخذہ نہیں ہے اور اس کی اباحت اس ارشاد کے تحت پہلے گزر چکی ہے۔ "عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ" الآیۃ اور یہ اسی طرح ہے جیسے کسی نے کہا" زَيْدٌ طَوِيْلُ النِّجَادِ وَكَثِيْرُ الرَّمَادِ "تو اگر زید طویل القامت اور مہمان نواز ہے تو کہنے والا قطعاً کاذب نہیں اگرچہ اصلاً اس کے لئے نجاد اور رماد نہ ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کلام حقیقی معنی پر محمول ہو اور عدت کے دوران عقد نکاح کا پختہ عزم کرنے سے روکنا مقصود ہو۔ تو اس صورت میں نہی تنزیہ کے لئے ہوگی اور نہی عن العزم کی بناء اس پر ہوگی کہ "جو چراگاہ کے گرد گھومتا ہے قریب ہے کہ وہ اس میں داخل ہو جائے۔"

لے اس میں اللہ تعالیٰ نے عدت کو کتاب کا نام دیا ہے اس لئے کہ یہ فرض ہے۔ جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے "كُتِبَ عَلَيْكُمْ، اى فُرِضَ عَلَيْكُمْ" (تم پر فرض کئے گئے) اپنی انتہا کو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں عزم ہے۔ تو یہ قول عزم کی کراہت پر دلالت کرتا ہے۔ پس تم اس سے ڈرو اور عزم نہ کرو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے اسے جس نے عزم کیا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس پر عمل نہ کیا (اور اللہ تعالیٰ) حلم والا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾

"کوئی حرج نہیں تم پر اگر تم طلاق دے دو ان عورتوں کو جن کو تم نے چھوا بھی نہیں اور نہیں مقرر کیا تم نے ان کا مہر اور خرچہ لے دو انہیں مقدور والے پر اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے مطابق یہ خرچہ مناسب طریقہ پر ہونا چاہئے لے یہ فرض ہے نیکوکاروں پر لے"

لے چونکہ طلاق تمام مباح امور میں سے سب سے زیادہ مبغوض عمل ہے اس لئے یہاں ان الفاظ میں اس کا ذکر کیا گیا۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ۔ کو حمزہ اور کسائی نے یہاں الف کے ساتھ پڑھا ہے "لَا تُمَاسُّوْهُنَّ" اور سورۂ احزاب میں باب مفاعلہ کے وزن پر پڑھا گیا ہے اور معنی ایک ہے یعنی تم نے ان سے جماع نہیں کیا۔ مگر یہ کہ تم مقرر کرو ان کے لئے مہر اور خرچہ یا یہاں تک کہ تم مقرر کر دیا اور تم مقرر کرو (اِلَّاۤ اَنْ تَفْرِضُوْا، اَوْ حَتّٰى تَفْرِضُوْا اَوْ وَتَفْرِضُوْا) "فَرِيْضَةً" فعیلۃ کے وزن پر بمعنی مفعول ہے اور تاء لفظ کو وصف سے اسم کی طرف نقل کرنے کے لئے ہے اور یہ مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہو اور معنی یہ ہے کہ بیشک تم پر مہر واجب نہیں ہوگا اگر تم نے مس کرنے سے قبل طلاق دی مگر جب تم نے مہر مقرر کیا ہو تو اس مقرر شدہ کا نصف واجب ہوگا جیسا کہ اس کا حکم اس کے بعد آئے گا۔ لیکن جب طلاق چھونے کے بعد ہو تو پھر "وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" کے مطابق مقرر کیا ہوا تمام کا تمام مہر واجب ہوگا اور اگر مہر مقرر نہ ہو تو بالا جماع مہر مثل واجب ہوگا۔

لے "مَتِّعُوْهُنَّ" کا عطف فعل مقدر پر ہے فَطَلِّقُوْهُنَّ وَمَتِّعُوْهُنَّ یعنی تم انہیں اپنے مالوں میں سے وہ عطا کرو جس سے وہ کچھ فائدہ اٹھائیں۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ متعہ واجب ہے۔ یعنی جب کسی نے عورت کو مس کرنے سے قبل طلاق دی اور اس کے لئے مہر مقرر نہیں ہوا اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ متعہ واجب نہیں ہوتا بلکہ یہ مستحب

ہوتا ہے اور یہ امر استحباب کے لئے ہے لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ "حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ" میں کلمہ حقًّا اور علٰی استحباب کی نفی کرتے ہیں اور امر میں اصل وجوب ہے۔ اور پھر واجب کی مقدار میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ تین کپڑے ہیں قمیص، اوڑھنی اور چادر جو اس کے اپنے لباس کی مثل ہوں۔ ان کے مہر مثل کے قائم مقام ہونے کی وجہ سے ان میں عورت کی حالت کا اعتبار کیا جائے گا۔ جن کی قیمت نصف مہر مثل سے زائد نہ ہو اور پانچ درہم سے کم نہ ہو اور یہی قول امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس میں مرد کی حالت کا اعتبار کیا جائے گا کیونکہ رب کریم نے فرمایا "عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ" ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ تقدیر (مرد کی حالت کا اعتبار) حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن المسیب، حضرت عطاء اور حضرت شعبی رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اور امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ "اس میں سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک خادم بھی ہو اور اوسط درجہ کے تین کپڑے ہوں یعنی قمیص، اوڑھنی، اور چادر اور اس سے کم وقایۃ ہے یعنی کسی بھی چیز کی اتنی مقدار ہے جس سے نفع حاصل کیا جا سکے یا پھر چاندی کی کوئی بھی شئی" (1) اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دو قولوں میں سے اصح میں اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قول میں کہا ہے کہ "اسے حاکم کے اجتہاد کے سپرد کیا گیا ہے۔" اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت بھی ہے کہ بیشک اتنی مقدار ضرور دی جائے جسے مال کا نام دیا جا سکے چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اور ان کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ اس کی مقدار تیس درہم سے کم نہ ہو۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت اس طرح ہے کہ لباس کی اتنی مقدار ہو جس میں نماز جائز ہو اور وہ دو کپڑے ہیں قمیص اور اوڑھنی۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف نے ایک عورت کو طلاق دی اور اسے سیاہ رنگ کی لونڈی بطور متعہ عطا کی۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو دس ہزار درہم بطور متعہ دیئے (2) مَتَاعًا علیٰ مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ بِالْمَعْرُوفِ سے مراد ایسا طریقہ ہے جسے شریعت اچھا گمان کرتی ہو نہ کہ حاکم کی جانب سے اس میں جبر ہو۔

۳۔ یعنی یہ فرض ہے نیکوکار لوگوں پر۔

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾

"اور اگر تم طلاق دو انہیں اس سے پہلے کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ اور مقرر کر چکے تھے ان کے لئے مہر تو نصف مہر (ادا کرو) جو تم نے مقرر کیا ہے ۱۔ مگر یہ کہ وہ (اپنا حق) معاف کر دیں یا معاف کر دے وہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے ۲۔ اور (اے مردو!) اگر تم معاف کر دو تو یہ بہت قریب ہے تقویٰ سے۔ اور نہ بھلایا کرو احسان کو آپس کے (لین دین) میں بیشک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہے ۳۔"

۱۔ یعنی ان کے لئے جو تم نے مقرر کیا ہے اس کا نصف واجب ہے۔ اس صورت میں جمہور کے نزدیک نصف مہر سے زائد متعہ واجب نہیں ہوگا۔ مگر حسن اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ تعالیٰ سے یہ مروی ہے کہ ہر مطلقہ عورت کے لئے متعہ ہے، چاہے طلاق مہر مقرر کرنے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 326 (فکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 326 (فکر)

مس کرنے سے پہلے ہو یا مہر مقرر کرنے کے بعد اور مس کرنے سے پہلے۔ اس لئے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ" اسی طرح سورۂ احزاب میں ہے:۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا" اور یہ مفوضات اور غیر مفوضات تمام کو شامل ہے۔ اور جمہور یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس صورت میں حصہ ہی نصف مہر ہے کیونکہ مہر بضع کے مقابل ہوتا ہے اور بضع اسے صحیح سالم واپس لوٹ گئی ہے، اس لئے نصف مہر علی سبیل الصلہ ہی واجب ہوگا۔

ع مگر یہ کہ طلاق والی عورتیں نصف مہر چھوڑ دیں تو پھر مکمل مہر زوج کی طرف واپس لوٹ جائے گا یا وہ خاوند جو کہ نکاح کی گرہ کا مالک ہے اور مہر کا وہ حصہ جو اس کی طرف لوٹتا ہے اسے چھوڑ کر اس گرہ کو کھولنے کا مالک ہے۔ تو اس صورت میں مکمل مہر عورت کو مل جائے گا۔
"الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ" کی تفسیر طبرانی نے الاوسط میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مرفوعاً زوج نقل کی ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے نقل کی ہے۔ اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، شعبی، شریح، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی کہا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی جدید اور راجح مذہب یہی ہے اور اسے عفو کا نام دیا ہے یا تو عفو کے مشاکل ہونے کی وجہ سے اور یا پھر اس لئے کہ وہ شادی کے وقت عورتوں کو مہر دیا کرتے ہیں اور پھر جو مس کرنے سے قبل طلاق دے تو وہ اپنا نصف مہر واپس لینے کا حق رکھتا ہے تو جب وہ اپنا حق واپس نہ لے، تو یہ ایسے ہی ہے گویا اس نے اسے معاف کر دیا۔ حضرت جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک عورت سے شادی کی اور اسے دخول سے پہلے طلاق دے دی اور اسے مکمل مہر دیا اور کہا میں اسے معاف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں۔
اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے(1) اور یہ قول بھی ہے کہ الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ سے مراد ولی ہے یہ بھی بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے(2) یہی مذہب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا پہلا قول بھی یہی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے دو قولوں کی مثل دو روایتیں ہیں۔ پس ان کے نزدیک آیت کا معنی یہ ہے "مگر یہ کہ عورت مرد کی طرف نصف مہر چھوڑ کر معاف کر دے اگر وہ ثیبہ اہل عفو میں سے ہے۔ یا اس کا ولی معاف کر دے اگر عورت باکرہ ہو یا اس کا امر جائز نہ ہو تو اس کے ولی کا معاف کرنا جائز ہے۔" اور یہ قول علقمہ، عطاء، حسن، زہری اور ربیعہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے۔ ہمارے نزدیک مہر خالص عورت کا حق ہے کسی غیر کے لئے اس میں تصرف کرنا جائز نہیں۔ اسی وجہ سے ولی کے لئے صغیر کے مال میں سے کوئی چیز ہبہ کرنا جائز نہیں اور نہ ہی اس کے لئے طلاق سے قبل اسے مہر ہبہ کرنا جائز ہے، اس پر اجماع ہے۔ لہٰذا آیت کی تاویل جائز نہیں مگر اسی کے مطابق جو ہم نے کہا۔

ع "وَاَنْ تَعْفُوْۤا" مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی تم میں سے بعض کا بعض کو معاف کرنا یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور یہ خطاب مردوں اور عورتوں تمام کو ہے (لیکن صیغہ مذکر اس لئے ہے) کیونکہ مذکر مؤنث پر غالب ہوتا ہے اور تم میں سے بعض بعض پر احسان کرنا بھول نہ جائیں کیونکہ دینے والا اس سے افضل ہوتا ہے جسے دیا جائے بیشک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہے۔

1۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 7 صفحہ 251 (فکر)
2۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 7 صفحہ 252 (فکر)

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

"پابندی کرو سب نمازوں کی ؎ اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی ؎ اور کھڑے رہا کرو اللہ کے لئے عاجزی کرتے ہوئے ؎"

؎ جب ازواج اور اولاد کے احکام کے بارے طویل کلام ہو چکی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر متنبہ کیا کہ ان کا اپنے معاملات میں مصروف ہونا ذکر الٰہی اور اس نماز سے انہیں غافل نہ کردے جو دین کا ستون ہے، گناہوں کو مٹانے والی ہے اور دلوں کو جلا بخشنے والی ہے۔ لہٰذا ارشاد فرمایا تم نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنے کے ساتھ، ان پر دوام اختیار کرتے ہوئے اور ان کے ارکان وصفات کو مکمل کر کے ان کی پابندی کرو۔ اس پر اجماع امت ہے کہ نماز فرض قطعی ہے اور اس کا منکر کافر ہو جاتا ہے لیکن وہ آدمی جو عمداً نماز کا تارک ہو تو اس کے بارے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ کافر ہو جائے گا۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی ایک روایت ہے کہ وہ کافر نہیں ہو گا لیکن اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا، اگر وہ توبہ کرے تو صحیح ورنہ اسے قتل کر دیا جائے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اسے قتل تو نہیں کیا جائے گا لیکن اسے اس وقت تک قید میں رکھا جائے گا، یہاں تک کہ وہ مر جائے یا توبہ کر لے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "بندے اور کفر کے درمیان فاصلہ ترک صلوٰۃ کا ہے۔" اسے مسلم نے روایت کیا ہے(1) اور حدیث بریدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ عہد جو ہمارے اور ان کے درمیان ہے وہ نماز کو ترک کرنا ہے، لہٰذا جس نے نماز کو ترک کیا وہ کافر ہو گیا(2) اسے احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن حضور نبی کریم ﷺ نے نماز کا ذکر کیا اور فرمایا جس نے نماز کی پابندی کی وہ اس کے لئے نور، برہان اور قیامت کے دن نجات کا ذریعہ ہے اور جس نے اس کی پابندی نہ کی تو اس کے لئے نہ نور ہے نہ برہان اور نہ ہی نجات۔ اور وہ قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہو گا۔ اسے احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3) لیکن جمہور ان احادیث میں اقامة الصلوٰة کا عطف ایمان پر ہونے کی بناء پر تاویل کرتے ہیں اور ان احادیث کا حاصل یہ ہے کہ بیشک نماز کا امر دیگر تمام احکام اور عبادات کی نسبت زیادہ سخت ہے۔ لہٰذا جس نے اسے ترک کیا، گویا اس نے کفر کیا۔ یا معنی یہ ہے کہ جس نے اسے حقیر سمجھ کر ترک کیا وہ کافر ہو گیا، واللہ اعلم۔ نماز کے فضائل کے بارے میں بہت زیادہ احادیث ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر نہر ہو اور وہ ہر روز پانچ مرتبہ اس میں غسل کرتا ہو کیا اس پر میل میں سے کوئی شئی باقی رہے گی؟ تو صحابہ کرام نے عرض کی۔ اس پر کوئی میل باقی نہیں رہے گی تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا یہی پانچ نمازوں کی مثال ہے اللہ ان کے ذریعے گناہوں کو مٹا دیتا ہے، متفق علیہ(4) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں پس جس نے ان کے لئے وضو اچھی طرح کیا، انہیں اپنے وقت میں ادا کیا اور ان کے لئے رکوع وخشوع مکمل کیا تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہ عہد ہے کہ وہ اسے بخش دے گا اور جس نے ایسا نہ کیا تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ پر کوئی عہد نہیں اگر چاہے تو اسے بخش دے اور اگر چاہے تو اسے عذاب دے" (5) اسے احمد اور ابوداؤد رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام مالک اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی

1۔ صحیح مسلم: 134، جلد 2، صفحہ 82 (علمیہ) الفاظ مختلف ہیں 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2621 (علمیہ)

3۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 169 (صادر) 4۔ صحیح مسلم: 283، جلد 5، صفحہ 144 (علمیہ) 5۔ سنن ابی داؤد: 410، جلد 2، صفحہ 303 (ارشد)

اسی طرح نقل کی ہے۔ اور یہی حدیث جمہور کی اس مؤقف پر حجت ہے کہ نماز کو ترک کرنے والا کافر نہیں ہوتا ہو اللہ اعلم۔

؂ مزید اہتمام کے لئے یہ خاص کا عطف عام پر ہے۔ وُسطٰی اَوْسَط کی مؤنث ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ صلوٰۃ وسطٰی کے بارے میں صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والے علمائے کرام کے مابین اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ اس سے مراد نماز فجر ہے۔ یہ قول حضرت عمر، ابن عمر، ابن عباس اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم کا ہے حضرت عطاء، عکرمہ اور مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی یہی کہا ہے یہی مؤقف امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا ہے (1) دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد صلوٰۃ الظہر ہے۔ یہ قول حضرت زید بن ثابت، ابو سعید خدری اور اسامہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اس لئے کہ یہ نماز دن کے وسط میں ہے اور یہ دن کی نمازوں میں سے بھی درمیانی نماز ہے۔ ان کی دلیل وہ روایت ہے جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں روایت کیا ہے اور امام احمد، ابوداؤد، بیہقی اور ابن جریر رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ظہر کی نماز سورج ڈھلنے کے بعد سخت گرمی کی حالت میں پڑھا کرتے تھے اور یہ نماز آپ ﷺ کے صحابہ کرام پر سب سے زیادہ ثقیل تھی تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی "حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى" (2) اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسری سند سے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز سخت گرم میں پڑھا کرتے تھے تو آپ ﷺ کے پیچھے صرف ایک یا دو صفیں ہوتی تھیں اور لوگ اپنے قیلولے اور تجارت میں مصروف ہوتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ الآیہ۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اس سے باز آ جائیں ورنہ میں ان کے گھروں کو جلا دوں گا" (3) ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں اس پر دلالت نہیں کرتیں کہ صلوٰۃ الوسطٰی سے مراد نماز ظہر ہے کیونکہ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ کے الفاظ ظہر کو شامل ہیں۔ اکثر نے کہا ہے اور یہی تمام اقوال میں سے ارجح قول ہے کہ صلوٰۃ الوسطٰی سے مراد نماز عصر ہے۔ اسے ایک پوری جماعت نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے اور یہی قول حضرت علی، ابن مسعود، ابو ایوب، ابو ہریرہ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کا ہے اور اسی طرح ابراہیم نخعی، قتادہ اور حسن نے بھی کہا ہے اور امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا مذہب بھی یہی ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ احزاب کے دن فرمایا تھا اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور قبروں کو اسی طرح آگ سے بھر دے جیسے انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطٰی سے مشغول رکھا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا، متفق علیہ (4) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطٰی یعنی صلوٰۃ العصر سے مشغول رکھا اللہ تعالیٰ ان کے دلوں اور گھروں کو آگ سے بھرے (5) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو نماز عصر سے روک دیا یہاں تک کہ سورج زرد پڑ گیا یا سرخ ہو گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطٰی سے مشغول رکھا ہے اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں اور قبروں کو آگ سے بھرے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (6) ابو یونس مولیٰ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مجھے اپنے لئے مصحف لکھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پھر فرمایا جب تو اس آیت پر پہنچے تو مجھے بتانا۔ لہٰذا جب میں اس آیت پر پہنچا تو میں نے آپ کو اطلاع دی تو آپ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 329 (فکر) 2۔ سنن ابی داؤد: 395، جلد 2، صفحہ 272 (الرشد)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 329 (فکر)، الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 538 (علمیہ) 4۔ صحیح مسلم: 202، جلد 5، صفحہ 108 (علمیہ)

5۔ صحیح مسلم: 206، جلد 5 صفحہ 109 (علمیہ)

رضی اللہ عنہا نے آیت اس طرح املاء کرائی۔ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَ صَلٰوةِ الْعَصْرِ" اور فرمایا میں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔(1) حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے فرمایا یہ آیت نازل ہوئی۔ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْعَصْرِ" پھر جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا ہم یہ پڑھتے رہے پھر یہ منسوخ ہوگئی۔ اور یہ آیت نازل ہوئی۔" حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى" اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمرو بن رافع رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں حضور نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا کے لئے مصحف لکھا کرتا تھا تو آپ رضی اللہ عنہا نے مجھے یہ آیت املاء کرائی" حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَصَلٰوةِ الْعَصْرِ"۔ اور ابوداؤد نے عبد بن رافع سے روایت کیا کہ انہوں نے کہا میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے لئے مصحف لکھا کرتا تھا تو آپ نے فرمایا لکھو" حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَصَلٰوةِ الْعَصْرِ" اور ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بھی اسی طرح قرأت کی ہے۔ ابورافع مولیٰ حفصہ رضی اللہ عنہا سے ابوداؤد نے نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے مصحف لکھا تو انہوں نے کہا تو لکھو۔" حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَصَلٰوةِ الْعَصْرِ" پس میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ملا اور انہیں ان کے بارے خبر دی۔ تو انہوں نے کہا ویسے ہی ہے جیسے انہوں نے کہا ہے۔ کیا ظہر کی نماز کا وقت ہمیں اپنے ریوڑوں اور اونٹوں میں زیادہ مشغول کرنے والا نہیں ہوتا ہے(3) حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کی احادیث کو اپنے لئے حجت بنایا ہے اور کہا ہے کہ صلوٰۃ العصر کا عطف صلوٰۃ الوسطیٰ پر ان کے درمیان مغایرت پر دلیل ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ ایسا نہیں بلکہ یہ عطف تفسیری ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ان الفاظ میں نقل کی ہے" حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى صَلٰوةِ الْعَصْرِ" یعنی انہوں نے بغیر واؤ کے ذکر کی ہے، واللہ اعلم(4) قبیصہ بن ذویب نے کہا ہے کہ یہ نماز مغرب ہے کیونکہ یہ درمیانی نماز ہے۔ یعنی نہ تو یہ سب سے کم رکعتوں (یعنی دو رکعتوں) والی نماز ہے اور نہ ہی یہ سب سے زیادہ (چار رکعتوں) رکعتوں والی نماز ہے۔ اور اسلاف میں سے کسی سے بھی یہ منقول نہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد نماز عشاء ہے۔ لیکن بعض متاخرین نے یہ ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد عشاء کی نماز ہے کہ یہ ایسی دو نمازوں کے درمیان جن میں قصر نہیں کی جاتی اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد پانچ نمازوں میں سے کوئی ہے لیکن وہ معین نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مبہم رکھا ہے تاکہ وہ بندوں کو تمام نمازوں کو ادا کرنے کی پابندی پر برانگیختہ کرے جیسا کہ اس نے لیلۃ القدر، ساعۃ جمعہ اور اسم اعظم کو مخفی رکھا ہے۔ اکثر کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تعمیم کے بعد صلوٰۃ وسطیٰ کی تخصیص دیگر نمازوں پر اس کی فضیلت کے اظہار کے لئے ہے لیکن میرے نزدیک اس طرح نہیں بلکہ یہ تاکید کی زیادتی کے لئے ہے اور اس میں یہ اہتمام اس لئے ہے کہ نماز عصر کا وقت بازاری مصروفیات کا وقت ہوتا ہے، لہٰذا اس میں تاکید کی زیادتی اور اس اہتمام کا لحاظ رکھا گیا تاکہ یہ نماز فوت نہ ہونے پائے یا پھر یہ مکروہ انداز میں بغیر جماعت کے یا مکروہ وقت میں ادا نہ ہو۔ پس اس بناء پر نمازوں میں سے کوئی نماز بھی ہو اسے علی وجہ السنۃ ادا کرنے سے کوئی مانع موجود ہو تو اس کے لئے زیادہ ذمہ داری کا ثبوت دینا اور اہتمام کرنا ضروری ہے۔ جیسے موسم سرما میں صبح

1۔ صحیح مسلم: 207، جلد 5 صفحہ 110 (علمیہ)
2۔ صحیح مسلم: 208، جلد 5 صفحہ 111 (علمیہ)
3۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 139 (التراث العربی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 330 (فکر)

اور عشاء کی نماز، موسم گرما میں ظہر کی نماز، اہل بازار کے لئے عصر کی نماز بشرطیکہ ان کے بازار کا رواج اس وقت میں ہو اور مال مویشی رکھنے والے کے لئے مغرب کی نماز وغیرہ ذالک۔ واللہ اعلم۔

ج۔ قنوت سے مراد لوگوں جیسے کلام سے سکوت اختیار کرنا ہے۔ جیسا کہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز میں گفتگو کرتے تھے اور ہم میں سے ایک آدمی اپنے ساتھی سے گفتگو کر لیتا تھا کہ اتنے میں یہ آیت نازل ہوئی "وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ" تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خاموش رہنے کا حکم فرمایا اور کلام کرنے سے منع فرما دیا(1) اسے ائمہ خمسہ وغیرہم نے روایت کیا ہے۔ ابن جریر نے مجاہد سے یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ نماز میں گفتگو کرتے تھے اور ایک آدمی اپنے بھائی کو کسی کام اور حاجت کا حکم دیتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ"(2) حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ قنوت سے مراد خشوع ہے۔ انہوں نے کہا کہ قنوت سے مراد رکوع کو لمبا کرنا، آنکھوں کو بند کرنا، ساکن ہونا اور پہلو کو جھکانا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ جب تم میں سے کوئی نماز کے لئے کھڑا ہوتا اسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے کہ وہ اس دوران ادھر ادھر متوجہ ہو یا سنگریزوں کو الٹ پلٹ کرتا رہے یا وہ کسی اور شی سے کھیلتا رہے یا پھر نسیان کے بغیر عمداً امور دنیا میں سے کسی شی کے بارے میں سوچ و بچار کرتا رہے۔ یہ قول بھی ہے کہ قنوت سے مراد قیام کو لمبا کرنا ہے(3) جیسا کہ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ کونسی نماز افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جس میں قنوت (قیام) طویل ہو(4) یہ قول ضعیف ہے کیونکہ امر فی الاصل وجوب کے لئے ہوتا ہے اور قیام کا لمبا ہونا واجب نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے کہا ہے کہ قنوت سے مراد دعا قنوت ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلسل ایک مہینہ تک دعائے قنوت پڑھی اور آپ ﷺ سلیم، رعل، ذکوان اور عصیہ کے قبائل کے لئے بددعا کرتے رہے(5) یہ قول بھی ضعیف ہے کیونکہ آیت کا سیاق تمام نمازوں میں قنوت کے عام ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ یہ کسی مہینے یا نماز کے ساتھ مختص نہیں ہے اور یہ صحیح ہے کہ فجر کی نماز میں قنوت بدعت ہے(6) ابو مالک اشجعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں میں نے اپنے باپ سے کہا اے ابا جی آپ نے حضور نبی کریم ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر الفاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے بھی یہاں کوفہ میں تقریباً پانچ سال سے نمازیں پڑھی ہیں کیا وہ بھی قنوت پڑھتے تھے تو انہوں نے کہا اے بیٹے یہ بدعت ہے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور یہ روایت ان الفاظ میں بھی ہے۔ میں نے حضور نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے دعائے قنوت نہ پڑھی، میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ نے قنوت نہیں پڑھی۔ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ نے قنوت نہیں پڑھی۔ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز پڑھی تو آپ نے دعائے قنوت نہیں پڑھی اور میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ نے بھی دعائے قنوت نہیں پڑھی، پھر کہا اے بیٹے یہ بدعت ہے(7) ابو مالک کا نام سعد بن طارق بن اشلم ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ طارق بن اشلم صحابی ہیں اور اس حدیث کی اسناد صحیح ہے اور صبح کی نماز میں دعائے قنوت کی نفی میں تو احادیث ہیں اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 331 (فکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 543 (علمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 331 (فکر) 4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 387 (علمیہ)
5۔ مستدرک حاکم: 820 (علمیہ) 6۔ مسند احمد، جلد 3 صفحہ 472 (علمیہ) 7۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 204 (الریان)

انہوں نے جو روایت قنوت فجر کے بارے روایت کی ہے وہ یا تو ضعیف ہے یا پھر وہ قنوت نوازل پر محمول ہے۔ اس کے بارے طویل بحث ہے اور یہ مقام اس کی وسعت نہیں رکھتا۔ حضرت شعبی، عطاء، سعید بن جبیر، حسن، قتادہ اور طاؤس رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ قنوت کا معنی اطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "اُمَّةً قَانِتاً اي مُطِيْعاً" (اطاعت کرنے والی امت) کلبی اور مقاتل نے کہا ہے کہ ہر اہل دین کے لئے نماز ہے جس میں وہ نافرمانی کرتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں پس تم ان نمازوں میں اطاعت کرتے ہوئے کھڑے ہو (1) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے نماز پڑھنے والے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ اي مُصَلٍّ "(یا وہ جو کہ رات کے وقت نماز پڑھتا ہے)۔ یہ قول بھی ہے کہ قنوت سے مراد ذکر ہے یعنی در آنحالیکہ وہ قیام میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان تمام میں سے پہلا معنی اظہر ہے کیونکہ حضرت زید بن ارقم کی حدیث معنی مراد کے لئے زیادہ صریح اور اصح ہے، بخلاف دوسری روایات کے، ان میں ایسے احتمالات ہیں جو مسموع کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝

"پھر اگر تم کو ڈر ہو (دشمن وغیرہ کا) تو پیادہ یا سوار (جیسے بن پڑے)، پھر جب تمہیں امن حاصل ہو جائے تو یاد کرو اللہ تعالیٰ کو جس طرح اس نے سکھایا ہے تمہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔"

راجل کی جمع رجال ہے جیسے صاحب کی جمع صحاب قائم کی جمع قیام نائم کی جمع نیام ہوتی ہے رکبان راکب کی جمع ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہما نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ گھڑ دوڑ میں بھی نماز پڑھنا جائز ہے۔ ابن جوزی نے امام بخاری سے مروی روایت سے استدلال کیا ہے حضرت نافع حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں جب آپ سے صلوۃ خوف کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اس کی وضاحت فرمائی، پھر فرمایا اگر خوف زیادہ ہو تو زمین پر چلتے ہوئے نماز پڑھو یا سواریوں پر سوار ہو کر منہ قبلہ کی جانب ہو یا نہ ہو۔ حضرت نافع کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے یہ رسول اللہ ﷺ سے ہی روایت کیا ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا چلتے ہوئے اور گھڑ دوڑ کے دوران نماز پڑھنا جائز نہیں اور اس آیت میں دوڑ کے درمیان نماز پڑھنے کے جواز پر کوئی دلیل نہیں کیونکہ راجل کا معنی چلنے والا نہیں بلکہ قدموں پر کھڑا ہونے والا ہے۔ اسی طرح حدیث طیبہ میں رجالا وقیاما میں عطف تفسیری ہے (قیام رجال کی تفسیر کر رہا ہے) جو چلنے کی حالت میں نماز پڑھنے کے جواز پر دلالت نہیں کرتا نیز اس روایت کا مرفوع ہونا یہ حضرت نافع کا گمان ہے، یہ مرفوع صریح نہیں۔ اگر کوئی یہ کہے صلوۃ خوف میں آنا اور جانا جائز ہے جس پر سب علماء کا اجماع ہے جس کا ذکر ہم سورۂ نساء میں کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ تو پھر صلوۃ خوف پیدل چلتے ہوئے بھی جائز ہونی چاہئے۔ ہم کہتے ہیں جو امر شرع سے ایسا ثابت ہو جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو اس کو بنیاد بنا کر کسی اور چیز پر حکم لگانا جائز نہیں ہوتا جیسے یہ استدلال کرنا کہ نماز میں چلنا پھرنا اس چلنے کی طرح ہے جو نماز کے دوران کسی کا وضو ٹوٹ جانے کی صورت میں ہوتا ہے جبکہ اس حالت میں چلنا نماز میں پیدل چلنے سے کم مرتبہ ہے، پس اعلیٰ کو ادنیٰ کے ساتھ قیاس کرتے ہوئے حکم میں نہیں ملایا جائے گا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 331 (العلمیہ)

مسئلہ:۔ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے علماء نے اس پر اجماع کیا کہ اگر خوف زیادہ ہو تو لوگ سوار ہو کر نماز پڑھیں، اگر وہ قبلہ کی طرف منہ کرنے پر قادر نہیں تو کسی سمت بھی منہ کر کے اشاروں کے ساتھ رکوع و سجود کریں۔ لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ایسی صورت میں وہ تنہا تنہا نماز پڑھیں۔ امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے مروی ہے وہ شدید خوف میں بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھ سکتے ہیں، جبکہ ہدایہ شریف میں ہے یہ (امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول) صحیح نہیں کیونکہ جماعت کے لئے جگہ کا ایک ہونا شرط ہے۔

مسئلہ:۔ چاروں ائمہ اور جمہور علماء کے نزدیک خوف کی وجہ سے نماز کی رکعات میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ امام مسلم، مجاہد سے وہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی ﷺ کی زبان پر اقامت کی حالت میں چار اور سفر کی حالت میں دو رکعت نماز فرض فرمائی ہے اور سفر میں صرف ایک رکعت (1) یہی حضرات عطاء، طاؤس، حسن بصری، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے ہم صلوۃ خوف کے مسائل سورۃ نساء میں ذکر کریں گے۔

ؔ جب تم امن میں ہو جاؤ اور تمہارا خوف ختم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو یعنی نماز کو اس کی شرائط، ارکان اور آداب کے ساتھ مکمل پڑھو یعنی ایسا ذکر جیسے تمہیں سکھایا نبی کریم ﷺ کی زبان پر کما علمکم میں ما مصدر یہ ہے یا موصولہ ہے جسے تم نہیں جانتے تھے۔ یہ مالم تکونوا .... تعلمون علم کا مفعول ثانی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

"اور جو لوگ فوت ہو جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویاں (انہیں چاہئے کہ) وصیت کر جایا کریں اپنی بیویوں کے لئے لؔ کہ انہیں خرچ دیا جائے ؔ ایک سال تک اور نہ نکالا جائے (انہیں گھر سے) ؔ پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو کوئی گناہ نہیں تم پر جو کچھ وہ کریں اپنے معاملہ میں ؔ مناسب طور پر ؔ اور اللہ بہت زبردست بڑا دانا ہے ؔ"

لؔ ابو عمرو، ابن عامر، حمزہ اور حفص رحمہم اللہ تعالیٰ نے وصیۃ کو منصوب پڑھا ہے۔ نصب دینے والا فعل فَلْيُوْصُوْا محذوف ہے یعنی انہیں چاہئے کہ وصیت کریں۔ باقی قراء نے وصیۃ کو مرفوع پڑھا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی تُجِبُ عَلَيْكُمْ وَصِيَّةٌ تم پر وصیت فرض کی گئی ہے۔ دوسری قرأت کی تائید یہ قرأت بھی کرتی ہے تُجِبُ عَلَيْكُمْ وَصِيَّةٌ لِّاَزْوَاجِكُمْ یا اس کا معنی ہوگا ان کا حکم وصیت ہے۔

ؔ متاعاً مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی مَتِّعُوْهُنَّ مَتَاعًا یا یہ مضمر فعل لِيُوْصُوْا کا مفعول بہ ہوگا یا یہ وصیۃ کا مفعول بہ ہوگا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی لِيُوْصُوْا وَصِيَّةً مَتَاعًا یعنی وہ عورتیں ان کی موت سے جس نفقہ (خرچہ) کسوۃ (لباس) سے فائدہ اٹھائیں۔

ؔ غیر اخراج یہ متاعاً سے بدل ہے یا مفعول مطلق ہے جو تاکید کا فائدہ دے رہا ہے۔ جیسا کہ یہ قول هٰذَا الْقَوْلُ غَيْرَ مَا تَقُوْلُ یا یہ ازواجھم سے حال ہے، یعنی غیر مخرجات یا حرف جار کے حذف کے ساتھ منصوب ہے، یعنی مِنْ غَيْرِ اِخْرَاجٍ مفہوم اس کا یہ ہے کہ ... مرد جن کی موت قریب ہو ان پر واجب ہے کہ وہ اپنے بیویوں کے حق میں وصیت کریں کہ وہ ایک سال تک ان کے اموال سے

1۔ صحیح مسلم: 687، جلد 5، صفحہ 167 (علیہ)

روزی کا خرچہ اور لباس سے فائدہ اٹھائیں اس آیت کریمہ سے بیویوں کے حق میں وصیت کرنا خاوندوں پر اسی طرح فرض ہے۔ جس طرح کہ اس آیت کریمہ۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨالْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ (تم پر فرض ہوا کہ جب تم میں کسی کو موت آئے اگر کچھ مال چھوڑے تو وصیت کر جائے اپنے ماں باپ اور قریب کے رشتے داروں کے لئے) سے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں قریب الموت آدمی پر فرض ہے۔ پھر یہ دونوں حکم منسوخ کر دیے گئے۔ دونوں کی ناسخ آیت میراث ہے۔ حضور ﷺ کا ایک فرمان بھی ہے، وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عورتوں کا نفقہ انہیں خاوند کے مال میں چوتھے اور آٹھویں حصہ کا وارث بنا کر ختم کر دیا گیا اور كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ والی بحث یہاں بھی ہوگی مگر ہم نے اس کا اعادہ نہیں کیا۔ زمانہ جاہلیت میں عورتیں خاوندوں کے فوت ہو جانے کے بعد ایک سال تک سوگ مناتی تھیں، اسی طرح اسلام کے ابتدائی دور میں یہ سلسلہ جاری رہا جس پر حضور ﷺ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے جو ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے، متفق علیہ (1) کہا گیا ہے کہ یہ عدت اللہ تعالیٰ کے ان ارشاد کے ساتھ منسوخ ہوگئی۔ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا اگرچہ مذکورہ آیت زیر بحث آیت سے تلاوت میں پہلے ہے، تاہم نزول کے اعتبار سے متاخر ہے، اس لئے چار ماہ دس دن والی آیت ناسخ ہوگی۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سال والی عدت اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا سے منسوخ ہوگئی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت طائف کے ایک آدمی کے حق میں نازل ہوئی جس کا نام حکیم بن حارث تھا۔ جس نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی جس کی اولاد بھی تھی اور والدین اور بیوی بھی ساتھ تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے ترکہ میں سے اس کے والدین اور اس کے بچوں کو حصہ عطا فرمایا اور اس کی بیوی کو کچھ بھی نہ دیا اس کے ورثاء کو ارشاد فرمایا کہ میت کے ترکہ میں سے ایک سال تک اس کی بیوی کا خرچہ دو (2) اسحق بن راہویہ نے اس کی تفسیر میں مقاتل بن حیان سے یوں نقل کیا ہے۔ اہل طائف میں سے ایک شخص مدینہ طیبہ آیا الحدیث۔ میری رائے یہ ہے کہ سیاق کلام اس حدیث سے مختلف ہے، کیونکہ آیت کریمہ وصیت کے وجوب کا تقاضا کرتی ہے جبکہ حدیث طیبہ وصیت کے بغیر ہی خاوند کے ترکہ میں سے عورت کے لئے سال کے نفقہ کا تقاضا کرتی ہے، شائد وہ اس آیت کے نزول کے بعد فوت ہوا ہو۔ اس نے اس آیت کی وجہ سے ایک سال نفقہ کی وصیت کی ہو اور حضور ﷺ نے اس کے مطابق عمل فرمایا ہو۔ نیز یہ حدیث اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ مذکورہ آیت يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ آلا یہ۔ ترجمہ: (اللہ تمہیں حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں) کے بعد اور وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ الآیہ۔ (اور تمہارے ترکہ میں عورتوں کا چوتھائی حصہ ہے، اگر تمہاری اولاد نہ ہو) سے پہلے مراد نازل ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

ے اگر وارثوں کے نکالے بغیر عورتیں سال سے پہلے گھر سے نکل جائیں تو اے ائمہ تم پر کوئی حرج نہیں جو کچھ انہوں نے سوگ، زینت اور تزویج کو ترک کرنے میں عمل کیا ہے۔

ۓ یعنی شرع جسے ناپسند نہ کرے تو تمہیں انہیں روکنے کا کوئی حق نہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہاں خطاب میت کے ورثاء کو ہے۔ حرج کی نفی کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ان میں سے ایک وہی ہے جو میں نے پہلے ذکر کر دی۔

اگر وہ عورتیں سال مکمل ہونے سے قبل ہی خاوند کے گھر سے چلی جائیں اور تم ان کو نفقہ دینا چھوڑ دو تو تم پر کوئی گناہ نہیں میں یہ کہتا

1۔ صحیح مسلم: 1488، جلد 10، صفحہ 98 (علمیہ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 333 (فکر)

ہوں آیت کا ظاہر اس دوسرے معنی کی تائید نہیں کرتا کیونکہ اگر مقصود یہ ہوتا تو عبارت یوں ہوتی فِیْمَا فَعَلْتُمْ یعنی تم نے نفقہ دینا ہے جو چھوڑا ہے اور فِیْمَا فَعَلْنَ کے الفاظ نہ ہوتے، واللہ اعلم۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ پہلے ان عورتوں پر ایک سال تک عدت گزارنا اور سوگ منانا فرض نہیں تھا بلکہ وہ صرف دور جاہلیت کے مطابق میت کے فراق میں بطور افسوس ایسا کرتی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت تک بطور مروت ان کو خرچہ دینے کا حکم ارشاد فرمایا جب تک وہ حالت افسوس میں رہیں اور خاوندوں کے گھر سے نہ نکلیں تو اس تعبیر کے لحاظ سے چار ماہ دس دن تک عدت گزارنے والا حکم نیا حکم ہوگا یہ پہلے کسی حکم کے لئے ناسخ نہیں ہوگا، واللہ اعلم۔

2۔ یعنی جو اس کے حکم کی خلاف ورزی کرے اس سے انتقام لیتا ہے وہ مروت اور مصالح کی رعایت کرتے ہوئے حکم دیتا ہے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝

"اور (اسی طرح) جن کو طلاق دی گئی ان کو خرچ دینا چاہئے مناسب طور پر یہ واجب ہے پرہیز گاروں پر 1"

1۔ واجب ہے خوش حال پر اس کے حساب سے اور تنگ دست پر اس کے حساب سے یعنی جو لوگ شرک سے بچتے ہیں ان پر فرض ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس آیت میں متاع سے مراد عدت کے ایام کا نفقہ ہے جس طرح سابقہ آیت وصیت سے مراد سال کا نفقہ تھا کیونکہ موت اور طلاق دونوں صورتوں میں عورت خاوند کے حقوق کی وجہ سے ہی محبوس ہوتی ہے تو مرد کے مال سے اس پر انفاق لازمی ہے۔ طلاق رجعیہ کی عدت میں انفاق کے وجوب کا حکم تو متفق علیہ ہے، تاہم اگر طلاق بائنہ ہو تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہی حکم ہے، کیونکہ اس آیت میں لفظ عام ہے۔ نیز اس آیت اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ (عورتوں کو وہاں رکھو جہاں خود رہو، اپنی طاقت بھر) میں ابن مسعود کی قرأت میں اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ وَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ مِنْ وُّجْدِكُمْ کے الفاظ ہیں نیز حضرت جابر حضور ﷺ سے حدیث روایت کرتے ہیں، فرمایا وہ عورت جسے تین طلاقیں دی گئی ہوں اس کے لئے رہائش اور نفقہ ہے اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے(1) اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ابن جوزی نے کہا ہے اس کی سند میں ایک راوی حرث بن ابی عالیہ ہے جس کے متعلق یحییٰ بن معین نے کہا وہ ضعیف ہے۔ ہم جواب دیں گے: ذہبی نے کہا ہے حرث بن ابی عالیہ ابو معاذ جو عبداللہ قواریری کے شیخ ہیں، انہیں بغیر دلیل کے ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ نیز عورت کا عدت گزارنا خاوند کے حق کی وجہ سے ہے جو رحم کے خالی ہونے کو ظاہر کرتا ہے یا سوگ کے لئے اور فراق کے اوپر افسوس کے لئے بطور مروت ایسا کرتی ہے۔ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس پر انفاق کلیۃً منسوخ نہیں بلکہ خرچہ کے بدلہ میں اس کے لئے میراث میں سے حصہ معین کر دیا گیا ہے گویا یہ حکم منسوخ نہیں۔ امام مالک اور شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما نے فرمایا اس کے لئے نفقہ نہیں ہوگا لیکن رہائش ثابت ہے یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی لئے رہائش ہے نہ خرچہ۔ انہوں نے فاطمہ بنت قیس کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہیں ابو عمرو بن حفص نے طلاق بائنہ دی جبکہ وہ خود غائب تھے ان کے وکیل نے فاطمہ بنت قیس کی طرف جو بھیجے وہ سخت ناراض ہوئیں، تو وکیل نے کہا قسم بخدا آپ کا ہمارے اوپر کوئی حق نہیں۔ فاطمہ بنت قیس حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تمام معاملہ عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرے لئے کوئی خرچہ نہیں۔ آپ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ ام شریک کے گھر میں عدت گزارے پھر فرمایا وہ ایسی عورت ہے جن کے پاس میرے صحابہ کی بھیڑ رہتی ہے۔ تم ابن ام مکتوم کے ہاں عدت

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 4 صفحہ 21 (محاسن)

گزارہ۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (1) ایک روایت میں ہے کہ ان کے خاوند نے تین طلاقیں دیں یہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئیں آپ ﷺ نے فرمایا تیرے لئے کوئی نفقہ نہیں مگر اس صورت میں کہ تو حاملہ ہو۔ امام احمد نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہا مجھے فاطمہ بنت قیس نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے رہائش اور خرچہ معین نہ فرمایا اس حدیث کی سند میں حجاج بن ارطاۃ راوی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فاطمہ بنت قیس سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خرچہ اور رہائش اس عورت کے لئے ہے جس کو طلاق رجعی دی گئی ہو، جب خاوند کو رجوع کا حق نہ ہو تو عورت کے لئے خرچہ ہے نہ رہائش (2) اسی حدیث کی بناء پر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ ایسی عورت کے لئے رہائش کا حق بھی نہ ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے احباب نے ایسی عورت کے لئے رہائش کو واجب قرار دیا ہے اور اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے وَأَسْكِنُوهُنَّ۔ گویا انہوں نے اس حدیث پر من وجہ عمل کو ترک کر دیا ہے۔ ہمارا (احناف کا) اس کے بارے میں جواب یہ ہے کہ فاطمہ بنت قیس والی حدیث کتاب اللہ کے خلاف ہے پس اس کو چھوڑ دیا جائے گا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کی موجودگی میں اس پر عمل ترک کر دیا تھا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی سند سے مغیرہ سے اور وہ شعبی سے روایت کرتے ہیں کہ فاطمہ بنت قیس نے کہا کہ میرے خاوند نے حضور ﷺ کے زمانہ میں مجھے تین طلاقیں دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تیرے لئے نہ رہائش ہے نہ خرچہ۔ مغیرہ نے کہا میں نے ابراہیم سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہم ایک عورت کی بات کی وجہ سے کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتے، ہم نہیں جانتے کہ اسے یاد ہے یا وہ بھول چکی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسی عورت کے لئے رہائش کا فیصلہ فرماتے (3) ابن جوزی نے کہا ابراہیم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔ ایک جماعت نے یہ روایت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم اللہ تعالیٰ کی کتاب کو نہیں چھوڑتے لیکن انہوں نے سنت نبی ﷺ کا ذکر نہیں کیا۔ یہ زیادہ صحیح ہے پھر کسی صحابی کا ایسا قول قبول نہیں کیا جائے گا جس کی ضد حضور ﷺ سے ثابت ہو۔ ہم کہتے ہیں اگر ابراہیم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا تو روایت مرسل ہوئی۔ جبکہ مرسل روایت ہمارے نزدیک حجت ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہمارے نبی ﷺ کی سنت ثابت ہو جائے تو یہ ایسی روایت ہے جو انہوں نے مرفوع نقل کی۔ اگر ہم تسلیم بھی کر لیں تو ابن جوزی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول "لَا نَذَرُ كِتَابَ اللّٰهِ" (ہم کتاب اللہ کو نہیں چھوڑتے) کی صحت کا جو اعتراف کیا ہے، ہمارے دعویٰ کے لئے کافی ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول ابن مسعود کی قرأت "أَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ مِنْ وُجْدِكُمْ" کی صحت کو ثابت کرتا ہے تو اس طرح بھی مدعی ثابت ہو گیا۔ اس آیت کی تاویل میں ایک قول یہ بھی کیا گیا ہے متاع بالمعروف سے مراد متعہ (تین کپڑے) ہے، نفقہ نہیں۔ جس طرح ایسی مطلقہ کو متعہ دیا جاتا ہے جسے حقوق زوجیت ادا کرنے سے پہلے ہی طلاق دی گئی ہو۔ اس تاویل کی بناء پر المطلقات میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک الف لام عہد خارجی (ا) کا ہوگا اسی کے اوپر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جسے ابن جریر نے ابن زید سے روایت کیا ہے، کہا جب یہ آیت "وَمَتِّعُوهُنَّ .... عَلَى الْمُحْسِنِينَ" نازل ہوئی۔ ایک آدمی نے کہا اگر میں نے اچھا جانا تو ایسا کروں گا اگر میری رائے نہ ہوئی تو نہ کروں گا تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل کیا: وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۖ حَقًّا عَلَى

1۔ صحیح مسلم: 1480، جلد 10، صفحہ 80 (العلمیہ) 2۔ مسند احمد، جلد 6 صفحہ 417 (صادر)

3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 141 (وزارت تعلیم) حاشیہ (ا) جس کی مراد متکلم اور سامع کے نزدیک معین ہو۔

الْمُتَّقِيْنَ۔ (اور طلاق والیوں کیلئے بھی مناسب طور پر نان ونفقہ ہے یہ واجب ہے پرہیزگاروں پر) اس حکم کی بناء پر متعہ صرف اس عورت کے لئے واجب ہوتا ہے جسے حقوق زوجیت سے پہلے ہی طلاق دی گئی ہو، یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر ہے۔ اگر کوئی یہ کہے اگر اس آیت کا یہ معنی ہے تو پھر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا کیا مطلب ہوگا کہ ہر ایسی مطلقہ کو متعہ دینا بھی مستحب ہے جس کو حقوق زوجیت ادا کرنے کے بعد طلاق دی گئی ہو، خواہ اس کا مہر معین کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ ہم جواب دیتے ہیں ہم متعہ کے مستحب ہونے کو اس آیت سے ثابت نہیں کرتے بلکہ سورۂ احزاب کی اس آیت سے ثابت کرتے ہیں: فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا (تو لے آؤ میں تمہیں مال دوں اور اچھی طرح چھوڑ دوں) واللہ اعلم۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''المطلقات'' میں الف لام استغراقی (۱) ہے۔ اس لئے وہ فرماتے ہیں ہر مطلقہ کو متعہ دینا واجب ہے مگر وہ عورت جس کا مہر معین کیا گیا ہو اور اسے حقوق زوجیت ادا کرنے سے پہلے طلاق دی گئی ہو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ میں کہتا ہوں اگر اس کا یہ مفہوم ہے تو اس عورت جسے حقوق زوجیت ادا کرنے سے پہلے طلاق دی گئی ہو اس کو ماقبل کے حکم سے خارج کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مگر جب یہ کہا جائے کہ استثناء کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں متعہ نصف مہر ہے، جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ اس صورت میں ہم کہیں گے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے جو معنی ذکر کیا ہے وہ مذکورہ احتمالات میں سے ایک ہے جیسے میں نے سنا تو ہر مطلقہ کے لئے متعہ کے واجب ہونے میں شک واقع ہو گیا اور وجوب شک کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا پس ہم نے احتمالات میں سے ایک احتمال پر عمل کرتے ہوئے استحباب کا قول کیا، واللہ اعلم۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝

''اسی طرح کھول کر بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے احکام کو تاکہ تم سمجھ جاؤ۔[1]''

[1] ذٰلِكَ سے طلاق اور عدت کے سابقہ احکامات کی طرف اشارہ ہے۔ وعدہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ان دلائل اور احکام کو بیان فرمائے گا جن کے وہ دنیا اور آخرت کے اعتبار سے محتاج ہوں گے تاکہ تم سمجھ جاؤ اور ان معاملات میں اپنی عقل کو استعمال کرو۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ۝

''کیا نہیں دیکھا تو نے[1] ان لوگوں کی طرف جو نکلے تھے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے[2] موت کے ڈر سے[3] تو فرمایا انہیں اللہ تعالیٰ نے کہ مر جاؤ[4] پھر زندہ فرمایا انہیں[5] بیشک اللہ تعالیٰ مہربان ہے لوگوں پر[6] لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ہے''

[1] تعجب دلانے اور مابعد کلام کو سننے کا شوق دلانے کے لئے استفہام انکاری کے انداز میں کلام لایا گیا ہے۔ پس یہ تعجب دلانے کے لئے بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا۔ اب اس کلام کے ساتھ ایسے آدمی کو خطاب کیا جاتا ہے جس نے اس سے قبل دیکھا ہو نہ سنا ہو، یا اہل کتاب اور اصحاب تاریخ میں سے جو اس واقعہ کو سن چکے تھے۔ ان کے لئے بطور وضاحت خطاب کیا گیا۔ معنی اس کا یہ ہوگا کیا وہ

حاشیہ (۱) تمام افراد کو شامل ہے۔

اس چیز کو نہیں جانتے کہ میں نے آپ کو باخبر کر دیا ہے۔ اس میں بھی تعجب کا اظہار کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں بھی یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا یہی معنی ہوگا۔ حضور پر نور ﷺ نے اپنی ظاہری آنکھوں سے اسے نہیں دیکھا تھا۔

ے عطاء، خراسانی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا وہ تین ہزار تھے۔ وہب نے کہا وہ چار تھے۔ حاکم نے اسی طرح نقل کیا اور ابن عباس سے اس کی تصحیح کی۔ ایک قول یہ کیا گیا وہ آٹھ ہزار تھے۔ سدی نے کہا ان کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ تھی۔ ابن جریج نے چالیس ہزار نقل کی ہے۔ ابن جریر نے منقطع سند کے ساتھ ابن عباس سے اڑتالیس ہزار نقل کی ہے اور عطاء بن رباح نے ستر ہزار(1) ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کا معنی ہے ان کے دل ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ تھے اور یہ الالفة سے مشتق ہے۔

ے یہ فعل حذر الموت کا مفعول لہ ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ اہل داوردان ہیں واسط کے قریب ایک بستی تھی جہاں طاعون کی وباء پھوٹ پڑی۔ ان کے مکینوں کی ایک جماعت وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور ایک جماعت وہاں ہی رہ گئی۔ جو لوگ بستی میں رہ گئے تھے ان کی کثیر تعداد ہلاک ہوگئی اور جو لوگ وہاں سے نکل گئے وہ بچ گئے۔ جب وباء ختم ہوگئی وہ لوگ صحیح و سالم واپس آ گئے۔ وہاں رہنے والوں میں جو لوگ باقی بچ گئے تھے انہوں نے کہا ہمارے یہ ساتھی زیادہ محتاط رہے، اگر ہم بھی ایسا ہی کرتے جس طرح انہوں نے کیا تو ہمارے وہ ساتھی بھی زندہ ہوتے جو اب مر چکے ہیں، اگر دوبارہ وباء پھوٹی تو ہم بھی ایسے علاقہ کی طرف نکل جائیں گے جہاں وباء نہ ہوگی۔ قریب زمانہ میں ہی وباء دوبارہ پھوٹ پڑی تو اس بستی کے عام لوگ بھی چھوڑ کر چلے گئے اور افیح وادی میں فروکش ہوئے۔ جب وہ اس جگہ پہنچے جہاں وہ پڑاؤ ڈالنا چاہتے تھے تو وادی کی ایک جانب سے ایک فرشتے اور وادی کی دوسری جانب سے دوسرے فرشتہ نے یہ کہا "مُوْتُوْا" "سب مرجاؤ تو سب مر گئے(2) ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم اور امام نسائی رحہم اللہ تعالیٰ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اگر تم کسی علاقہ میں طاعون کی وباء کے پھوٹ پڑنے کا سنو تو اس میں داخل نہ ہو۔ اگر تمہاری بستی میں وباء پھوٹ پڑے تو وہاں سے یوں نہ نکلو کہ تم اس سے بھاگ رہے ہو"(3) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ شام کی طرف نکلے۔ جب آپ رضی اللہ عنہ سرغ کے مقام پر پہنچے تو آپ رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ شام میں وباء پھوٹ پڑی ہے، تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ والی مذکورہ حدیث بیان کی، تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرغ سے ہی واپس آ گئے۔ کلبی، مقاتل اور ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا ہے کہ وہ لوگ جہاد سے بھاگے تھے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ نے انہیں دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے لشکر اکٹھا کیا، پھر بزدلی غالب آ گئی، موت کو ناپسند کرنے لگے اور بیمار پڑ گئے۔ اپنے بادشاہ سے کہنے لگے جس علاقہ میں ہمیں جانے کا حکم دیا گیا ہے وہاں طاعون کی وباء پھوٹ پڑی ہے، ہم اس وقت تک وہاں نہیں جائیں گے جب تک وباء ختم نہیں ہو جاتی، تو اللہ تعالیٰ نے موت کو ان پر مسلط کر دیا، وہ موت کے خوف سے اپنے گھروں سے بھاگے تھے۔ جب بادشاہ نے ان کی اس حالت کو دیکھا تو اس نے دعا کی اے حضرت یعقوب اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے معبود برحق! تو نے اپنے بندوں کی نافرمانی کو دیکھ لیا، انہیں اپنی قدرت کی ایسی نشانی دکھا جس سے وہ یہ جان جائیں کہ وہ تیرے فیصلوں سے بھاگ نہیں سکتے(4)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 335 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 334 (فکر)
3۔ صحیح بخاری: 97-5396 (ابن کثیر) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 335 (فکر)

۴ بطور سزا انہیں یہ فرمایا مرجاؤ۔ یہاں امر تحویل کے لئے ہے۔ وہ اور ان کے سارے چوپائے یوں مر گئے جس طرح ایک آدمی پر موت طاری ہوتی ہے۔ لوگ ان کی طرف نکلے لیکن وہ ان کو دفن نہ کر سکے۔ انہوں نے درندوں سے لاشیں محفوظ کرنے کے لئے ایک باڑ لگادی اور اس باڑے میں انہیں چھوڑ آئے تو ایک مدت یوں ہی گزر گئی۔ بعض نے آٹھ دن اور بعض نے کہا یہاں تک کہ ان کے جسم بوسیدہ ہو گئے اور ان کی ہڈیاں ننگی ہو گئیں۔

۵ اس کا عطف کلام محذوف پر ہے۔ جس کلام محذوف پر مُوْتُوْا دلالت کرتا ہے وہ فعل محذوف مَاتُوْا ہے۔ ابن جریج نے سدی رحمہم اللہ تعالیٰ کی سند سے ابی مالک سے روایت کیا ہے کہ حضرت حزقیل علیہ السلام اہل داوردان کے پاس سے گزرے جن کی ہڈیاں ننگی ہو چکی تھیں اور ان کے جوڑ الگ الگ ہو چکے تھے۔ آپ متعجب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ انہیں "قُوْمُوْا بِاِذْنِ اللّٰہ" کے ساتھ ندا کرو۔ آپ نے انہیں ندا کی تو سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت حزقیل بن بوذی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے تیسرے خلیفہ تھے۔ حضرت حسن بصری اور مقاتل نے کہا کہ وہ ذوالکفل تھے۔ ان کا یہ لقب اس وجہ سے پڑا کیونکہ انہوں نے ستر انبیاء کی ضمانت اٹھائی تھی اور انہیں قتل سے بچایا تھا۔ مقاتل اور کلبی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا یہ قوم حزقیل تھی کہا گیا، جب انہیں یہ مصیبت پہنچی تو حضرت حزقیل علیہ السلام ان کی تلاش میں نکلے تو آپ علیہ السلام نے انہیں مردہ حالت میں پایا۔ پس آپ علیہ السلام روئے اور عرض کی اے میرے رب میں ایک ایسی قوم میں تھا جو تیری حمد، تسبیح، تقدیس، تکبیر اور تہلیل بیان کرتے تھے اب میں اکیلا رہ گیا ہوں میری اب کوئی قوم نہیں اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے ان کی زندگی تیرے سپرد کر دی ہے انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ ہو جاؤ۔ پس وہ زندہ ہو گئے۔ مجاہد نے کہا جب وہ زندہ ہوئے تو زبانوں پر یہ کلمات جاری تھے سُبْحَانَکَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِکَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وہ اپنی قوم کی طرف چلے اور ایک عرصہ تک یوں زندہ رہے کہ موت کا رنگ ان کے چہروں سے عیاں تھا۔ نیز وہ جو لباس پہنتے تھے وہ کفن میں بدل جاتا۔ یہاں تک کہ انہیں وقت مقررہ پر موت آئی۔ ابن عباس نے کہا یہودیوں کی اس نسل میں ان کی بو آج بھی پائی جاتی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ ان سے موت سے فرار کی وجہ سے ناراض ہوا تو بطور سزا انہیں موت عطا کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ اٹھایا تا کہ وہ اپنی مدت پوری کریں۔ اگر ان کا پہلے ہی وقت مقررہ آچکا ہوتا تو دوبارہ نہ اٹھایا جاتا۔(1)

۶ اس لئے انہیں زندہ کیا تا کہ وہ عبرت حاصل کریں اور کامیاب ہوں اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر ان کا قصہ اس لئے بیان کیا تا کہ تم اس سے بصیرت حاصل کرو۔ آیت کریمہ میں فضل سے مراد تمام لوگوں پر دنیا میں اس کا فضل ہے کیونکہ قرآن حکیم کا اگلا حصہ اس پر قرینہ ہے۔

۷ اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ اس لئے ذکر کیا ہے تا کہ مومنوں کو توکل، فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور جہاد پر برانگیختہ کیا جائے گویا یہ مابعد کلام کے لئے تمہید ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝

"اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں ۱ اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے ۲"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 336 (فکر)

1۔ کیونکہ موت سے فرار کوئی فائدہ نہیں دیتا، جو چیز مقدر کی گئی ہے وہ ہر صورت میں واقع ہوگی، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرے کیونکہ اگر وقت مقررہ آ جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت پانے والا ہوگا، اگر زندہ رہا تو پھر بھی غلبہ اور بدلہ لے گا۔

2۔ جو بھی گھر بیٹھنے والا یا سبقت لے جانے والا کہتا ہے اسے جاننے والا، سننے والا ہے اور جو وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہوتے ہیں اسے بھی جاننے والا ہے، و اللّٰہ اعلم۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں اور ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابن عمر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے جب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ الخ (مثال ان لوگوں کی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانے کی سی ہے جو سات بالیاں نکالے) نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے عرض کی رب زِدْ اُمَّتِیْ اے میرے رب میری امت کے لئے اور اضافہ فرما۔ تو اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت کو نازل فرمایا۔(1)

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

”کون ہے جو اے دے اللہ تعالیٰ کو 1 قرض حسن 2 تو بڑھا دے اللہ اس قرض کو 3 اس کے لئے کئی گنا 4 اور اللہ تعالیٰ تنگ کرتا ہے (رزق کو) اور فراخ کرتا ہے 5 اور اس کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے 6“

1۔ من استفہامیہ ہے۔ مبتدا ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہے۔ ذا اس کی خبر ہے۔ الذی ذا کی صفت ہے یا اس کا بدل ہے۔

2۔ قرض کا لغوی معنی قطع کرنا ہے اب قرض اس کو کہتے ہیں کہ کوئی انسان دوسرے کو اپنے مال میں سے کوئی چیز دے تاکہ دوسرا اس کی مثل اسے واپس کرے کیونکہ اس میں بھی اپنے مال سے الگ ہونے کا معنی پایا جاتا ہے اس لئے اسے قرض کہتے ہیں۔ پھر اگر اس آیت میں قرض کا حقیقی معنی مراد ہو تو پھر کلام سے مضاف محذوف ہوگا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی یُقْرِضُ عِبَادَ اللّٰهِ (جو اللہ کے بندوں کو قرض دیتا ہے) جس طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے ”اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا اے میرے رب میں تجھے کیسے کھلاتا جبکہ تو رب العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا طلب کیا تھا تو نے اسے نہیں کھلایا، کیا تو نہیں جانتا اگر تو اسے کھلاتا تو اسے میرے پاس پاتا“(2) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ قرض دینے کی فضیلت میں کئی احادیث ہیں۔ انہیں میں سے ایک حضرت عبد اللہ بن مسعود کی حدیث ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا ہر قرض صدقہ ہوتا ہے(3) اسے طبرانی نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ نیز بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کیا ہے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے ہی مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو مسلمان بھی کسی مسلمان کو ایک دفعہ قرض دیتا ہے وہ اس کے دو دفعہ صدقہ کے برابر ہو جاتا ہے اسے ابن ماجہ نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا اور بیہقی نے اسے مرفوع اور موقوف روایت کیا(4) اگر قرض کا مجازی معنی لیا جائے تو اس کا معنی یہ ہوگا عمل صالح کو بھیجنا تاکہ اس کے ساتھ ثواب طلب کیا جائے۔ اس معنی پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی سبب نزول والی روایت دلالت کرتی ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 555 (علمیہ)　　2۔ صحیح مسلم: 2569 (علمیہ)
3۔ شعب الایمان: 3563 (علمیہ)　　4۔ سنن ابن ماجہ: 2430 (علمیہ)

ہے مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ایسا مال دیا جائے جو حلال اور اچھا ہو۔ یا یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ایسا قرض جو اخلاص اور خوش دلی سے دیا گیا ہو۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا قرض حسن سے مراد مجاہدہ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔

ہی یعنی اللہ تعالیٰ اس کی جزاء میں کئی گنا اضافہ کر دیتا ہے۔ ابن کثیر، ابو جعفر، ابن عامر اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے فَيُضَعِّفَهُ پڑھا ہے اور جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے باب تفعیل سے پڑھا ہے ابو عمرو نے سورۂ احزاب میں ان قراء کی موافقت کی ہے۔ یہاں تشدید کثرت کے اظہار کے لئے ہے۔ باقی قراء نے باب مفاعلہ سے اسے پڑھا ہے۔ اس میں مبالغہ کا معنی پایا جا رہا ہے۔ ابن عامر، عاصم اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے "فاء" پر زبر پڑھی ہے۔ سورۂ حدید میں استفہام کے جواب میں ہونے کی وجہ سے اَنْ کے مضمر ہونے کے ساتھ اسے منصوب پڑھا ہے۔ باقی قراء نے یقرض پر عطف کرتے ہوئے فعل مضارع کو مرفوع پڑھا ہے۔ یہاں چار قرأتیں ہیں۔ ابن کثیر اور ابو جعفر رحمہم اللہ تعالیٰ نے "فیضعفہ" کو مرفوع، ابن عامر اور یعقوب نے منصوب عاصم نے باب مفاعلہ سے منصوب یعنی فَيُضَاعِفَهُ اور باقی قراء نے اسے باب مفاعلہ سے مرفوع پڑھا ہے یعنی فَيُضَاعِفُهُ۔

ھ یہ ضعف کی جمع ہے۔ یہ "ہ" ضمیر سے حال ہے یا یہ مفعول ثانی ہے کیونکہ مذکورہ فعل تصییر کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ یہ مفعول مطلق ہے کہ ضعف اسم مصدر ہے اور جمع اس کی اقسام کی وجہ سے لائی گئی ہے۔ سدی کا قول ہے اس تضعیف کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے (۱) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ایک عمل کا بدلہ سات سو گنا سے دیا جاتا ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ بخاری شریف کی سبب نزول والی حدیث اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

لے ابو عمرو، قنبل، حفص، ہشام اور حمزہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے خلاد سے اختلاف کے ساتھ قرأت نقل کی ہے کہ یہاں اور اعراف میں بسطة سین کے ساتھ ہے۔ باقی قراء نے صاد کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے جس کے حق میں چاہتا ہے رزق کم کر دیتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے پس تم صدقہ کرنے میں بخل سے کام نہ لو تا کہ تمہاری حالت نہ بدلے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر روز آسمان سے دو فرشتے اترتے ہیں، ان میں سے ایک دعا کرتا ہے اے اللہ خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما اور دوسرا بددعا کرتا ہے اے اللہ مال روکنے والے کو ہلاکت دے، متفق علیہ (2) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ دلوں کے متعلق ہے رزق کے متعلق نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو صدقہ کا حکم دیا تو یہ خبر بھی دی کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی قادر ہوتے ہیں یعنی بعض کے دلوں کو تنگ کر دیتا ہے۔ پس وہ بھلائی کرنے پر خوش نہیں ہوتے اور بعض کو فراخ کر دیتا ہے تو وہ اپنے لئے نیک اعمال کرتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بخیل اور صدقہ کرنے والے کی مثال ان دو آدمیوں جیسی ہے جنہوں نے لوہے کے بنے ہوئے جبے پہنے ہوئے ہیں۔ ان دونوں کے ہاتھ ان کے پستانوں اور ہنسلی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ صدقہ کرنے والا جب بھی صدقہ کرتا ہے اس کا جبہ کھلتا چلا جاتا ہے اور بخیل آدمی جب بھی صدقہ کا قصد کرتا ہے تو وہ جبہ سکڑ جاتا ہے اور ہر حلقہ جگہ پر رہتا ہے، متفق علیہ (3) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں کے دل رحمٰن کی دو انگلیوں (قبضہ قدرت) کے درمیان ہیں جیسے چاہتا ہے انہیں پھیرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یقبض کا مفعول صدقات ہے اور یبسط کا مفعول جزاء اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 338 (فکر) 2۔ صحیح مسلم: 7،57/83 (علمیہ)
3۔ صحیح بخاری: 5461 (ابن کثیر)، صحیح مسلم: 76، جلد 7، صفحہ 98 (علمیہ)

ثواب ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے پاکیزہ روزی سے کھجور کے برابر صدقہ کیا جبکہ اللہ تعالیٰ پاکیزہ چیز کو ہی قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دائیں ہاتھ سے پکڑتا ہے۔ پھر صدقہ کرنے والے کے لئے یوں بڑھاتا جاتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی ایک بچھیرے کی پرورش کرتا ہے یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے، متفق علیہ (1) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یقبض کا مفعول الارواح اور الانفس ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ موت آنے پر روحوں اور نفوس کو قبض کرتا ہے اور جنہیں موت نہیں آئی انہیں نیند میں قبض کر لیتا ہے اور انہیں روک لیتا ہے جن پر اس نے موت کا فیصلہ کر دیا ہو اور دوسری ارواح کو ایک معین مدت تک چھوڑ دیتا ہے۔

یعنی موت کے بعد اسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے۔ پس جو تم نے اعمال آگے بھیجے ہوں گے ان پر تمہیں بدلہ دے گا۔ قتادہ نے کہا الیہ میں ہ ضمیر تراب کی طرف لوٹ رہی ہے جو غیر مذکور ہے کنایہ ہے۔ معنی یہ ہوگا اِلَى التُّرَابِ تُرْجَعُوْنَ۔ تمہیں مٹی کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰىۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْاؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَ اَبْنَآىٕنَاؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ۝

"کیا نہیں دیکھا تم نے اس گروہ کو بنی اسرائیل سے (جو) موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا جب کہا انہوں نے اپنے نبی سے [1] کہ مقرر کر دو ہمارے لئے ایک امیر تا کہ لڑائی کریں ہم اللہ کی راہ میں [2] نبی نے کہا کہیں ایسا نہ ہو [3] کہ فرض کر دیا جائے تم پر جہاد [4] تم جہاد نہ کرو [5] وہ کہنے لگے (کوئی وجہ) نہیں ہمارے لئے کہ ہم جہاد نہ کریں اللہ کی راہ میں [6] حالانکہ ہم نکالے گئے اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے مگر جب فرض کر دیا گیا ان پر جہاد تو منہ پھیر لیا انہوں نے بجز چند کے ان میں سے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو۔"

[1] ملاء کا لفظ معزز لوگوں کی ایسی جماعت کے لئے بولا جاتا ہے جو مشورہ کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اس کا لفظ واحد نہیں ہوتا۔ اس کی جمع املاء آتی ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد۔ قتادہ کے قول کے مطابق وہ نبی یوشع بن نون تھے۔ سدی کا کہنا ہے وہ شمعون تھے، جبکہ اکثر علماء کا قول ہے وہ اشمویل تھے۔ وہب، ابن ابی اسحاق، کلبی رحمہم اللہ تعالیٰ اور دوسرے علماء نے کہا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصال ہوا تو ان کے پیچھے بنی اسرائیل میں یوشع علیہ السلام نبی ہوئے۔ جب آپ کا وصال ہوا تو حضرت کالب پھر حضرت حزقیل علیہم السلام۔ جب آپ کا وصال ہوا تو بنی اسرائیل میں بڑے بڑے حادثات رونما ہوئے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے وعدے کو بھلا دیا، یہاں تک کہ انہوں نے بت پرستی کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کو مبعوث فرمایا تا کہ بنی اسرائیل تورات کے جو احکام بھلا چکے تھے انہیں نئے سرے سے یاد دلائیں۔ پھر حضرت یسع کو مبعوث فرمایا۔ جب آپ کا وصال ہوا پھر نا خلف پیدا ہو گئے اور ان میں گناہ بڑھ گئے تو جالوت کی قوم عمالقہ ان پر غالب آ گئی جو مصر و فلسطین میں ساحل سمندر پر آباد تھی۔ عمالقہ نے ان کی زمینوں پر

1۔ صحیح بخاری، 1344 (ابن کثیر)

قبضہ کر لیا اولادوں کو قید کر لیا اور ان کے سرداروں میں سے چار سو چالیس افراد کو غلام بنا لیا۔ ان پر جزیہ لازم کر دیا اور تورات لے لی۔ بنو اسرائیل نے اس قوم سے بڑی مصیبتیں برداشت کیں۔ اب ان میں کوئی نبی نہیں تھا جو ان کے معاملہ کی تدبیر کرتا۔ ان کے انبیاء کے خاندان میں کوئی مرد باقی نہ بچا تھا۔ صرف ایک عورت رہ گئی جو حاملہ تھی، اس نے ایک بچہ جنا۔ عورت نے اس کا نام اشموئیل رکھا۔ اس نے وہ بچہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دیا تا کہ وہ بیت المقدس میں جا کر تورات کی تعلیم حاصل کرے۔ بنی اسرائیل کے علماء میں سے ایک اس کا نگہبان بنا۔ جب یہ بچہ جوان ہوا تو جبریل آمین آئے تو وہ اس شیخ کے پاس سویا ہوا تھا۔ تو جبریل امین نے شیخ کے لہجہ میں یااشمونیل کہا تو بچہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا، اور شیخ کی طرف متوجہ ہوا کہا اے میرے مولیٰ آپ نے مجھے پکارا؟ شیخ نے لا (نہیں) کہنا پسند نہ کیا کہ کہیں بچہ گھبرا ہی نہ جائے۔ شیخ نے کہا اے بیٹے سو جا۔ حضرت جبریل امین نے دوبارہ شیخ کے لہجہ میں اسے ندا دی۔ بچے نے کہا اے شیخ آپ نے مجھے بلایا ہے تو شیخ نے کہا اگر میں تجھے تیسری دفعہ بلاؤں تو مجھے جواب نہ دینا۔ جب تیسری دفعہ آواز دی تو جبریل امین اس کے لئے ظاہر ہو گئے۔ فرمایا اپنی قوم کے پاس جاؤ اور اپنے رب کے پیغامات پہنچاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تجھے بحیثیت نبی مبعوث کیا ہے۔ بنی اسرائیل نے حضرت اشموئیل کی تکذیب کی اور کہنے لگے اگر تم سچے ہو(1)

ل تو ہمارے لئے ایک بادشاہ بھیج تا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کریں۔ نقاتل فعل مضارع جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے ان کے معاملہ کا انحصار بادشاہوں پر تھا جو ان کے انبیاء کی اطاعت کرتے تھے۔ قال کا فاعل حضرت اشموئیل ہیں۔

ل نافع نے یہاں اور سارے قرآن میں عَسِیْتُمْ سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے "سین" کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حرف استفہام ھل کو عسی پر اس لئے داخل کیا تا کہ جو امر ان کے نزدیک متوقع تھا تا کہ استفہام کی صورت میں اس کی وضاحت ہو جائے اور اسے ثابت کیا جائے۔

ل یہ شرط ہے جو جملہ جزائیہ کے درمیان واقع ہے۔

ھ یہ عسی کی خبر ہے۔ معنی اس کا یہ ہے اگر تم پر جہاد فرض کیا گیا تو میں توقع رکھتا ہوں کہ تم اس بادشاہ کی معیت میں جہاد نہیں کرو گے۔

ل اخفش نے کہا یہاں ان زائدہ ہے اور معنی یہ ہے ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ہم جہاد نہ کریں۔ امام کسائی نے یہ کہا اس کا معنی ہے ہمیں قتال کرنے سے کوئی چیز نہیں روکتی۔ صحیح قول یہ ہے اَنْ مَالَکَ لَا تَفْعَلُ اور مَالَکَ اَنْ لَا تَفْعَلَ دونوں صحیح لغتیں ہیں، یعنی دونوں طرح اس کا استعمال درست ہے۔ یعنی ہم میں سے جن افراد کو قید کیا گیا انہیں یہاں سے نکال لیا گیا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے نہر عبور کی جس طرح بعد میں آئے گا۔ آیت کے اس حصہ میں جہاد ترک کرنے پر وعید ہے۔ حضرت اشموئیل نے رب العالمین سے دعا کی کہ ان کے لئے بادشاہ بھیجے آپ کو عصا اور ایک سینگ دیا گیا جس میں قدس کا تیل تھا حکم ہوا جس آدمی کا قد اس عصا کے برابر ہو اور جب وہ داخل ہو تو سینگ والے تیل میں جوش کی وجہ سے آواز پیدا ہو تو اس آدمی کے سر پر لگا دینا اور بنی اسرائیل پر بادشاہ بنا دینا۔ اتفاق سے طالوت کے گدھے گم ہو گئے وہ ان کی تلاش میں نکلے۔ آپ دباغت کا کام کرتے تھے یا پانی لاتے تھے یہ حضرت اشموئیل کے گھر میں داخل ہوئے تا کہ ان سے اپنے گدھوں کے بارے میں پوچھیں کہ اچانک تیل میں جوش کی وجہ سے آواز پیدا ہوئی۔ حضرت اشموئیل اٹھے، طالوت کو اس عصا کے ساتھ ناپا، اس کا قد عصا کے برابر تھا۔ آپ نے طالوت کے سر پر وہ تیل لگایا اور بنی اسرائیل کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 339 (فکر)

بادشاہ بنادیا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٧﴾

"اور کہا انہیں ان کے نبی نے بے شک اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمادیا ہے تمہارے لئے طالوت کو امیر[1] بولے کیونکر ہوسکتا ہے اسے حکومت کا حق ہم پر حالانکہ ہم زیادہ حقدار ہیں حکومت کے اس سے[2] اور نہیں دی گئی اسے فراخی مال و دولت میں[3] نبی نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور زیادہ دی ہے اسے کشادگی علم میں اور جسم میں[4] اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اپنا ملک جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے[5]"

[1] بنی اسرائیل میں نبوت کا سلسلہ لاوی بن یعقوب کی اولاد میں تھا اور بادشاہت کا سلسلہ اولاد یہود میں تھا جبکہ طالوت حضرت بنیامین کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو ایک فقیر آدمی تھا۔

[2] انہوں نے کہا کیونکر وہ ہمارا بادشاہ ہوسکتا ہے جبکہ ہم بادشاہوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں وہ تو عام سا ہے۔

[3] اور مال و دولت کی فراخی نہیں دی گئی جبکہ ہم غنی ہیں۔

[4] کلبی نے کہا طالوت فن حرب میں سب سے زیادہ ماہر تھا۔ طالوت بنی اسرائیل میں سے خوبصورت ترین اور سب سے طویل تھا ایک طویل آدمی اپنا ہاتھ لمبا کرتا تب اس کے سر تک پہنچتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے جب اسے ملک عطا کیا گیا تو اسے وحی آئی۔ میں کہتا ہوں جب اللہ تعالیٰ نے طالوت کی تعریف اصطفاء اور وسعت علم سے فرمائی۔ یہ امر ظاہر ہے کہ علم سے مراد شریعت کا علم ہے کیونکہ اس کی مدد سے ہی دین اور دنیا کے امور درست ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ لوگوں نے طالوت کے بارے میں جو یہ قصے ذکر کئے ہیں کہ اس نے حضرت داؤد علیہ السلام سے حسد کیا اور قتل کا ارادہ کیا تو حضرت داؤد بھاگ گئے۔ بنی اسرائیل کے علماء نے اس بناء پر طالوت پر طعن کیا تو طالوت نے تمام علماء کو قتل کرادیا، یہ سب باطل ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں، اس لئے ہم نے اس قصہ کو ذکر نہیں کیا۔

[5] یعنی وسیع فضل والا ہے فقیر کو نوازتا ہے اور اسے غنی کردیتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ کون بادشاہت کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں ان کے اس خدشہ کو کئی طرح سے رد فرمایا کہ طالوت کس طرح بادشاہ بن سکتا ہے:۔

(1)۔ بادشاہت کا حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی عطا اور اس کا انتخاب ہے، یہ نسب، حسب یا کسی اور قابلیت پر موقوف نہیں۔

(2)۔ بادشاہت کی اہلیت اور لوگوں کے امور کی اصلاح کا دوسرا سبب علم اور علم کے مطابق عمل کرنے کی قدرت ہے جو قوت ارادی اور بدنی استعداد پر منحصر ہے نہ کہ کثرت مال پر موقوف ہے کیونکہ مال تو آنے جانے والی چیز ہے، اس کے ہونے یا نہ ہونے کا اعتبار نہیں۔

(3)۔ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے اس کے بادشاہ ہونے کا فیصلہ کردیا تو اس کو مستبعد جاننا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے مصالح کو بہتر جانتا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٤٨﴾

"اور کہا انہیں ان کے نبی نے [1] کہ اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ آ ئے گا تمہارے پاس ایک صندوق [2] اس میں تسلی (کا سامان) ہوگا تمہارے رب کی طرف سے [3] اور (اس میں) بچی ہوئی چیزیں ہوں گی جنہیں چھوڑ گئی ہے اولاد موسیٰ اور اولاد ہارون [4] اٹھا لائیں گے اس صندوق کو فرشتے [5] بے شک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان دار ہو [6]"

[1] جب بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے طالوت کے بادشاہ منتخب ہونے کی نشانی طلب کی تو ان کے نبی نے انہیں فرمایا۔

[2] تابوت توب سے فعلوت کے وزن پر ہے جس کا معنی لوٹنا ہے کیونکہ جو چیز اس سے نکالی جاتی وہ ہمیشہ اس کی طرف پلٹ آتی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے تابوت سے مراد شمشاد کی لکڑی کا ایک صندوق تھا جس کے اوپر سونے کا پانی چڑھایا گیا تھا، یہ تین ہاتھ لمبا اور دو ہاتھ چوڑا تھا۔ ابن منذر نے وہب بن منبہ سے یہی نقل کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایک تابوت نازل کیا تھا جس میں انبیاء کی تصاویر تھیں، وہ حضرت آدم پھر حضرت شیث پھر ہر انبیاء میں ورثہ در ورثہ چلتا رہا یہاں تک کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس میں تورات رکھتے اور کچھ دوسرا سامان۔ جب موسیٰ علیہ السلام کا وصال ہو گیا تو بنی اسرائیل کے انبیاء نے اسے لے لیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ تورات رکھنے والا صندوق تھا۔ جب جنگ کا موقع ہوتا تو اس صندوق کو اپنے سامنے رکھتے اور اس کے وسیلہ سے دشمنوں کے خلاف فتح کی دعا کرتے۔ جب تابوت چلنے لگتا تو یہ بھی چل پڑتے، جب وہ رک جاتا تو یہ بھی رک جاتے۔

[3] اس تابوت کے لانے میں یعنی اس کے ذریعے تمہارے دلوں کو سکون ہوگا۔ پس تم طالوت کی بادشاہت میں شک نہ کرو۔ علیہ کی ضمیر تابوت کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی تابوت میں وہ چیز رکھی گئی ہے جس سے تم کو سکون حاصل ہوگا وہ تورات ہے۔ یا اس کا معنی یہ ہے اس میں ایسی خصوصیت ہے کہ اس کے آنے سے تمہارے دلوں کو سکون حاصل ہوگا۔ ابن اسحٰق اور ابن جریر رحمہم اللہ تعالیٰ نے وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب جہاد کرتے تو اسے آگے رکھتے تو بنی اسرائیل کے نفوس کو سکون حاصل ہوتا اور وہ میدان جنگ سے فرار نہ ہوتے۔ میں کہتا ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر انبیاء اور ان کے صالح متبعین کے آثار دیکھنے سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور شیطان کے وساوس دور ہو جاتے ہیں۔ ابن عساکر کلبی کی سند سے روایت کرتے ہیں وہ ابی صالح سے اور ابی صالح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ سکینہ زبرجد یا یاقوت کے صندوق میں ایک تصویر تھی جس کا سر بلی کے سر جیسا تھا۔ اس کی دم اور دو پر بھی تھے جو آواز نکالتی تو تابوت دشمن کی طرف چل پڑتا۔ بنی اسرائیل اس کے پیچھے چل پڑتے جب تابوت ٹھہر جاتا وہ بھی رک جاتے اور سکون حاصل کرتے اور مدد نازل ہوتی۔ بغوی نے مجاہد سے یوں ہی نقل کیا ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ تیز ہوا تھی، اس تصویر کے دو سر تھے اور چہرہ انسان کے چہرے جیسا تھا (1) طبرانی نے حضرت علی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 344 (العلمیہ)

شیر خدا رضی اللہ عنہ سے وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا سکینہ خفت ہوا تھی (1) واللہ اعلم۔ ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے یہ سونے کا ایک طشت تھا جو جنت سے آیا جس میں انبیاء کے دل دھوئے جاتے۔ (2)

؎ ال موسیٰ اور ال ھارون سے مراد ان کی ذاتیں ہیں۔ لفظ ال زائد ہے ان دونوں ہستیوں کی عظمت شان کے لئے مذکور ہے یا الھما سے مراد بنی اسرائیل کے انبیاء ہیں کیونکہ وہ ان کے چچا کی اولاد میں سے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس تابوت میں تورات کی دو تختیاں یا ان تختیوں کے ٹکڑے تھے جو ٹوٹ گئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، آپ کے نعلین حضرت ہارون علیہ السلام کا عصا اور عمامہ اور اس میں کھانے کا ایک قفیز جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا تھا۔ یہ تابوت بنی اسرائیل نے اس وقت گم کر دیا۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، قربانی میں نئی چیزیں ایجاد کر لیں اور قدس میں برائیاں کیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آسمانوں کی طرف اٹھا لیا۔ ایک قول یہ کیا گیا دشمن نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی وہ کانٹا جس سے وہ اپنی قربانیاں بھونتے تھے وہ دو شاخا تھا جو گوشت اس کے ساتھ آ جاتا وہ کاہن کے لئے ہوتا۔ عیلی جس نے حضرت اشمویل کی تربیت کی، جب بنی اسرائیل کی قربانیوں کا والی بنا تو اس کے دونوں بیٹوں نے اس کے کئی کانٹے بنا لئے۔ جو عورتیں بیت المقدس میں نماز پڑھتی تھیں، یہ دونوں ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت اشمویل کے ذریعے عیلی کو پیغام دیا اولاد کی محبت نے تجھے اس بات سے روک رکھا ہے کہ تو انہیں ان چیزوں سے روکے جو انہوں نے میری قربانی اور میرے گھر میں شروع کر رکھی ہیں، میں تجھ سے اور تیری اولاد سے منصب چھین لوں گا اور تجھے ہلاک کر دوں گا۔ دشمن ان کی طرف بڑھا اس کے بیٹے نکلے اور اپنے ساتھ تابوت بھی لے گئے، دونوں قتل کر دیئے گئے اور ان کا دشمن تابوت بھی لوٹتا گیا۔ جب عیلی نے یہ خبر سنی تو بے ہوش گیا اور مر گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا تو آسمان سے تابوت کو نازل فرمایا۔

؎ یہ پہلے قول کی بناء پر ہے، دوسرے قول کی بناء پر جب عمالقہ تابوت لے گئے تو اسے بت خانے میں سب سے بڑے بت کے نیچے رکھ دیا۔ صبح کے وقت بت تابوت کے نیچے تھا اور تمام بت ٹوٹے ہوئے تھے، تو انہوں نے تابوت کو ایک طرف رکھ دیا، تو اس طرف والے اکثر ہلاک ہو گئے۔ انہوں نے تابوت ایک اور بستی کی طرف بھیج دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بستی والوں پر ایک چوہا بھیج دیا۔ ایک آدمی رات گزارتا، صبح کرتا تو چوہا اس کا پیٹ کھا چکا ہوتا۔ بنی اسرائیل کی ایک عورت جو ان کے پاس قید تھی، اس نے انہیں کہا جب تک یہ تابوت تمہارے پاس رہے گا تم اس قسم کی تکلیف میں مبتلا رہو گے۔ اسے یہاں سے نکال دو۔ وہ ایک ریڑھا لائے تابوت کو اس پر رکھا، اس کے آگے دو بیل باندھے اور ضربیں لگا کر انہیں ہانک دیا۔ اللہ تعالیٰ نے چار فرشتوں کو متعین کر دیا جو اسے ہانکتے ہوئے بنی اسرائیل کے پاس لے آئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ تابوت تیہ کے ریگستان میں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسے یوشع بن نون کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ یہ تابوت طالوت کے زمانہ تک تیہ میں رہا پھر فرشتے اسے اٹھا کر طالوت کے گھر لے آئے۔

؎ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ حضرت اشمویل کا کلام ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیا کلام ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ تابوت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا بحیرہ طبریہ میں ہے اور انہیں قیامت سے پہلے نکالا جائے گا۔ (3)

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 562 (علمیہ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 344 (فکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 346 (فکر)

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۙ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۗ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ ۙ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۗ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللّٰهِ ۙ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۲۴۹﴾

"پھر جب روانہ ہوا طالوت [1] اپنی فوجوں کے ساتھ [2] اس نے کہا [3] بے شک اللہ تعالیٰ آزمانے والا ہے تمہیں ایک نہر سے [4] سو جس نے پانی پی لیا اس سے وہ نہیں میرے ساتھیوں سے [5] اور جس نے نہ پیا وہ یقیناً میرے ساتھیوں میں سے ہے [6] مگر جس نے بھر لیا ایک چلو اپنے ہاتھ سے [7] پس سب نے پیا اس سے [8] مگر چند آدمیوں نے ان سے (نہیں پیا) [9] پھر جب عبور کیا اسے طالوت نے اور ان لوگوں نے جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ [10] کہنے لگے کچھ طاقت نہیں ہم میں آج جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی [11] مگر کہا ان لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے کہ وہ ضرور ملاقات کرنے والے ہیں اللہ سے [12] کہ بارہا چھوٹی جماعتیں غالب آئی ہیں [13] بڑی جماعتوں پر اللہ کے اذن سے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے [14]"

[1] فصل یعنی نکلے۔ فصل کا اصل معنی قطع کرنا ہے، یہ فعل متعدی ہے، یعنی انہوں نے اپنے آپ کو شہر سے جدا کیا۔ کثرت استعمال کی وجہ سے اس کا مفعول حذف کر دیا گیا جب یہ لازم کی طرح ہو گیا۔ اب اس کا معنی ہوگا جب وہ دشمن کی طرف نکلے۔

[2] یہ فصل فعل کے فاعل سے حال ہے، یعنی اس حال میں کہ وہ لشکر کے درمیان تھے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب بنی اسرائیل نے تابوت دیکھا اور انہیں اللہ تعالیٰ کی مدد کا یقین ہو گیا تو سب جہاد کی طرف جلدی جلدی نکلے۔ طالوت نے کہا میرے ساتھ لشکر میں ایسے چست نوجوان نکلیں جو مجرد ہوں۔ مقاتل کے قول کے مطابق اس لشکر کی تعداد ستر ہزار ایک قول کے مطابق اسی ہزار تھی۔ سخت گرمی تھی انہوں نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے ایک نہر جاری فرمائے۔

[3] طالوت اگر نبی تھے تو اللہ تعالیٰ کی وحی کے ساتھ کہا اگر نبی نہیں تھے تو نبی کی ہدایت پر یہ کہا۔

[4] ابن عباس اور سدی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا وہ نہر فلسطین ہے۔ قتادہ نے کہا وہ اردن اور فلسطین کے درمیان کی نہر ہے۔ ابتلاء کا معنی آزمانا ہے (1) یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ایک ممتحن کا معاملہ کرے گا تا کہ فرمانبردار کو نافرمان سے الگ کر دے۔

[5] یعنی جس نے اس میں سے سیر ہو کر پیا وہ میرے پیروکاروں میں سے نہیں یا میرے ساتھ متحد نہیں۔

[6] یعنی جس نے اسے نہ چکھا، یہ طعم الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی ہے چکھنا، خواہ وہ چیز کھانے سے تعلق رکھتی ہو یا پینے سے تعلق رکھتی ہو۔ بے شک وہ مجھ سے ہے نافع اور ابو عمرو رضی اللہ عنہ نے "یاء" پر فتحہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے "یاء" کو ساکن پڑھا ہے۔

[7] یہ مَنْ شَرِبَ سے مستثنیٰ ہے، دوسرے جملے کو اس کی اہمیت کے پیش نظر پہلے لائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قلیل میں رخصت ہے، کثیر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 347 (فکر)

میں نہیں۔ شائد اس میں حکمت یہ تھی کہ شدید گرمی اور سخت پیاس میں پانی پینا لوگوں کے لئے تکلیف کا باعث ہوتا ہے وہ ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ یا انہیں جنگ کے لئے کمزور کر دیتا ہے یہ بھی احتمال ہے یہ حرمت بطور سزا ہو کہ انہوں نے نہر کے جاری کرنے کا بلا وجہ سوال کیا۔ اہل حجاز اور اہل بصرہ نے غَرفَۃً پڑھا ہے اور باقی قراء نے غُرفۃً پڑھا ہے۔ کسائی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے چلو لیتے وقت جو پانی ہتھیلی میں رکتا ہے اسے غُرفہ کہتے ہیں اور غرفۃ کا معنی چلو بھرنا ہے۔ یہ دونوں صورتوں میں مفعول بہ یا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

۸؎ یعنی انہوں نے منہ لگا کر پانی پیا کیونکہ یہاں مِن ابتدائیہ ہے جس کی وجہ سے حقیقی معنی یہ ہوگا کہ منہ اور پانی کے درمیان میں کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ پہلا معنی عموم مجاز (۱) کی وجہ سے ہوگا۔ استثناء اس کا قرینہ ہے۔ یا اس کا معنی ہے انہوں نے پینے میں زیادتی کی۔

۹؎ قلیلاً مستثنیٰ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ سدی نے کہا ان کی تعداد چار ہزار تھی (1)۔ صحیح تعداد وہ ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے براء بن عازب سے روایت کی ہے کہ ہم حضور ﷺ کے صحابہ آپس میں بات چیت کرتے تھے کہ اصحاب بدر کی تعداد اتنی ہی تھی جتنی تعداد طالوت کے ان ساتھیوں کی تھی جنہوں نے طالوت کے ساتھ نہر کو عبور کیا تھا ان مومنوں کی تعداد تین سو دس سے اوپر تھی (2) ایک روایت میں تین سو تیرہ کی تعداد ہے، جس نے ایک آدھ گھونٹ پیا اس کا دل مضبوط ہو گیا اور پیاس جاتی رہی، جس نے خوب سیر ہو کر پیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی وہ بزدل ہو گئے اور سیر بھی نہ ہوئے، ان کے ہونٹ سیاہ ہو گئے اور نہر کے کنارے پر ہی رہ گئے، انہوں نے طالوت کے ساتھ نہر کو عبور نہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے نہر کو عبور کیا تھا لیکن آیت کا ظاہر بتاتا ہے کہ انہوں نے نہر کو عبور نہ کیا تھا اس کی تائید آیت کا اگلا حصہ بھی کرتا ہے۔

۱۰؎ یعنی جب طالوت نے نہر عبور کی، یعنی جنہوں نے پانی پینے میں طالوت کی اطاعت کی، قَالُوْا جو لوگ بزدل بن کر نہر کے کنارے بیٹھ گئے تھے انہوں نے گزر جانے والوں کو معذرت کرنے اور ڈرانے کی غرض سے کہا۔

۱۱؎ پیاس کے غلبہ، کمزوری اور تعداد کی قلت کی وجہ سے کہا آج ہمارے اندر جالوت اور اس کے لشکروں سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں کیونکہ ان کی تعداد اور قوت بہت زیادہ ہے۔

۱۲؎ انہوں نے کہا جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا یقین رکھتے تھے اور ثواب کی امید رکھتے تھے۔ اور یہ وہی تھے جنہوں نے چلو بھر پانی پیا تھا اور نہر عبور کی تھی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ فعل قالوا کی ضمیر ان کی طرف لوٹ رہی ہے جنہوں نے نہر عبور کی تھی۔ اس صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا کہ ان میں سے بعض نے بعض سے پہلے کہا کہ آج ہم میں طاقت نہیں، پھر ان میں سے مخلص لوگوں نے کہا۔

۱۳؎ یہاں کم خبریہ ہے اور مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ یا کم استفہامیہ ہے اور استفہام تقریر کے لئے ہے اور مِن زائدہ ہے فئۃ لوگوں کی جماعت کو کہتے ہیں یہ فاوت واسہ سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے میں نے اس کا سر پھاڑ دیا۔ یا یہ فاء سے مشتق ہے جس کا معنی لوٹنا ہے۔ اس کا وزن فعۃ یا فلۃ ہوگا (الف) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ جمع ہے جس کی واحد نہیں آتی ہے۔ اس کا معنی جماعت ہے۔

۱۴؎ یعنی اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور ارادہ کے ساتھ بڑی جماعت پر غالب آئی اللہ تعالیٰ کے مدد کرنے اور بدلہ دینے کے ذریعے اللہ تعالیٰ صابرین کے ساتھ ہے۔ صوفیاء کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ایسی معیت کے ساتھ ہوتا ہے جس کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی۔

حاشیہ (۱)۔ کسی طریقے سے بھی پانی پینے پر اطلاق ہوگا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 347 (فکر) 2۔ صحیح بخاری: 3741 (ابن کثیر)

وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَؕ(۲۵۰)

"اور جب سامنے آگئے جالوت اور اس کی فوجوں کے [1] تو بارگاہِ الٰہی میں عرض کرنے لگے اے ہمارے رب اتار ہم پر صبر اور جمائے رکھ ہمارے قدموں کو اور فتح دے ہمیں قوم کفار پر [2]"

[1] طالوت اور اس کا لشکر جالوت اور اس کے لشکروں کے سامنے آئے یعنی جب دونوں لشکروں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آپس میں ملے تو طالوت اور اس کے سپاہیوں نے کہا۔

[2] انبیاء اور صالحین کی سنت ہے کہ جب وہ کسی امر کو مشکل جانتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کے ذریعے اس سے نجات حاصل کرتے ہیں۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﳜ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا یَشَآءُؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ(۲۵۱)

"پس انہوں نے شکست دی جالوت کے لشکر کو اللہ کے اذن سے [1] اور قتل کر دیا داؤد نے جالوت کو [2] اور عطا فرمائی داؤد کو اللہ تعالیٰ نے حکومت [3] اور دانائی [4] اور سکھا دیا اس کو جو چاہا [5] اگر نہ بچاؤ کرتا اللہ تعالیٰ [6] بعض لوگوں کا بعض کے ذریعے [7] تو برباد ہو جاتی زمین [8] لیکن اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرمانے والا ہے سارے جہانوں پر [9]"

[1] باذن اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی مدد ہے۔ ترکیب میں جار مجرور فعل کے متعلق ہے یا جار مجرور شبہ فعل کے متعلق ہے اور فاعل سے حال ہے۔ حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے والد کے ساتھ تھے جو اپنے تیرہ بیٹوں کے ساتھ طالوت کے لشکر میں شریک تھے انہوں . . . مجبوری۔ سب سے چھوٹا بیٹا ریوڑ چراتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے نبی کی طرف وحی کی کہ وہ جالوت کو قتل کرے گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام سے راستے میں تین پتھروں نے یوں گفتگو کی تو ہمارے ساتھ جالوت کو قتل کرے گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان تینوں کو توبرے میں رکھ لیا۔ طالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو گھوڑا، زرہ اور اسلحہ دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا اگر اللہ تعالیٰ نے میری مدد نہ کی تو یہ اسلحہ مجھے کچھ فائدہ نہ دے گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان تمام چیزوں کو نہ لیا اپنا توبرہ لیا اور دشمن کی طرف چل پڑے۔ حضرت داؤد علیہ السلام چھوٹے قد اور دائمی مریض تھے۔ جب جالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو دیکھا وہ بڑا بہادر اور طاقتور انسان تھا۔ اکیلا ہی لشکر کو شکست دے دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں حضرت داؤد علیہ السلام سے رعب ڈال دیا۔ جالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام سے کہا تو گوپھیے اور پتھر کے ساتھ یوں میری طرف آیا جیسے کتے پر حملہ کیا جاتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا بالکل اسی طرح بات ہے کیونکہ تو کتے سے بھی برا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے تینوں پتھر گوپھیے میں رکھے اور کہا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں اور پتھر اسے مار دیئے۔ پتھر اس کے دماغ کو لگے اور گدی کی جانب سے باہر نکل گئے۔

۳ حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا، پھر طالوت نے اپنی بیٹی کا حضرت داؤد علیہ السلام سے نکاح کر دیا۔

۴ طالوت کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو ملک عطا کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے بنواسرائیل کسی بادشاہ پر جمع نہیں ہوئے۔

۵ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام میں نبوت اور بادشاہی دونوں کو جمع کر دیا۔ اس سے قبل دونوں کسی ایک فرد میں جمع نہ ہوئی تھیں بلکہ بادشاہت پہلے ایک خاندان میں اور نبوت دوسرے خاندان میں تھی۔

۶ اللہ تعالیٰ نے انہیں زبور عطا کی، انہیں زرہ بنانے کا فن عطا کیا اور لوہے کو آپ علیہ السلام کے لئے نرم کر دیا۔ آپ علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے(1) مقدام بن معد یکرب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی آدمی اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کھانا نہیں کھاتا اور اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ انہیں پرندوں کی گفتگو اور چیونٹیوں کی کلام کا بھی علم سکھایا گیا۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے بہت اچھی آواز دی یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب وہ زبور کی تلاوت کرتے تو وحشی جانور آپ علیہ السلام کے اتنے قریب ہو جاتے کہ انہیں گردنوں سے پکڑا جا سکتا۔ پرندے آپ علیہ السلام پر سایہ کر لیتے، چلتا پانی ٹھہر جاتا اور ہوا رک جاتی۔ حضور ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے فرمایا ابوموسیٰ اشعری آپ کو آل داؤد علیہ السلام کی خوش آوازیوں میں سے آواز دی گئی ہے، متفق علیہ۔(2)

۷ حضرت نافع اور یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ نے دفاع پڑھا ہے۔ اس میں مبالغہ ہے باقی قراء نے متن کے مطابق پڑھا ہے۔

۸ یعنی کفار بعضھم الناس سے بدل بعض ہے۔

۹ یعنی مومنین۔

۱۰ یعنی مشرکین زمین پر غالب آ جائیں اور اس میں فساد برپا کر دیں، شہروں کو تباہ و برباد، انسانوں کو قتل اور ان پر ظلم کریں۔ وہ عبادت گاہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے وہ گرا دیں، لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس کی عبادت سے روک دیں۔ ابن عباس اور مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت یوں ہی کی ہے۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ جہاد کے فرض ہونے کی علت فساد کو ختم کرنا ہے جس کی وضاحت ہم لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (کچھ زبردستی نہیں دین میں) میں کریں گے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے اگر مومنوں اور نیکوں کے ذریعے کفار اور فجار سے عذاب کو دور نہ کیا جائے تو زمین اپنے باسیوں کے ساتھ تباہ و برباد ہو جائے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن احمد رضی اللہ عنہ سے وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ایک صالح مسلمان کی وجہ سے اس کے پڑوس میں رہنے والے سو گھر والوں سے مصیبت کو دور رکھتا ہے، پھر یہ آیت کریمہ تلاوت کی(3) اور حدیث طیبہ میں یہ بھی ہے اگر نماز پڑھنے والے بوڑھے اور شیر خوار بچے اور چرنے والے جانور نہ ہوں تو تم پر عذاب موسلا دھار بارش کی طرح برسے۔

۱۱ لیکن اللہ تعالیٰ فضل عظیم والا ہے۔

تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ۝۲۵۲

1۔ صحیح بخاری: 1966 (ابن کثیر) 2۔ صحیح بخاری: 4761 (ابن کثیر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 355 (فکر)

"یہ آیتیں ہیں اللہ کی ۱؎ ہم پڑھتے ہیں انہیں آپ پر ۲؎ (اے حبیب) ٹھیک ٹھیک اور یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں ۳؎"

۱؎ ترکیب کلام میں اسم اشارہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔ اس کے ساتھ ہزاروں افراد جو موت کے ڈر سے بھاگ گئے تھے کا قصہ، طالوت کو بادشاہ بنانے، تابوت لانے، عمالقہ کی شکست، حضرت داؤد کا جالوت کو قتل کرنا اور انہیں ملک، حکمت اور کتاب کی تعلیم دینا کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تیری نبوت کے اوپر دلیل ہیں۔

۲؎ آپ پر اس طرح بیان کرتے ہیں جو واقع کے مطابق ہے جس میں اہل کتاب شک نہیں کرتے۔

۳؎ یہ آیات تیرے لئے اعجاز اور تیری رسالت پر شواہد ہیں کیونکہ جو کتاب کو نہیں پڑھتا اسے اس کا علم نہیں ہوسکتا۔ اس کو ان اور لام مفتوح کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے تاکہ جو آپ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں ان کا رد ہو جائے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

"یہ سب رسول ۱؎ ہم نے فضیلت دی ہے (ان میں سے) بعض کو بعض پر ۲؎ ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ تعالیٰ نے ۳؎ اور بلند کئے ان میں سے بعض کے درجے ۴؎ اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں ۵؎ اور مدد فرمائی ہم نے ان کی پاکیزہ روح سے ۶؎ اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) وہ لوگ جو ان (رسولوں) کے پیچھے آئے بعد اس کے کہ آگئیں ان کے پاس کھلی نشانیاں ۷؎ لیکن انہوں نے اختلاف کیا ۸؎ ان میں سے کوئی ایمان پر ثابت رہا ۹؎ اور ان میں سے کوئی کافر ہو گیا ۱۰؎ اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) ۱۱؎ لیکن اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے ۱۲؎"

۱؎ تلک کے ساتھ رسولوں کی اس جماعت کی طرف اشارہ ہے جو آیت کریمہ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ میں مذکور ہیں۔ الرسل کے اوپر لام استغراقی ہے۔ یہ موصوف صفت مل کر مبتدا اور مابعد کلام اس کی خبر ہے۔

۲؎ فضل کا معنی یہ ہے کہ دو چیزیں جو ایک وصف سے مشترک ہوں ان میں سے ایک کی دوسری پر زیادتی کو بیان کرنا۔ عرف اور اصطلاح میں یہ کمال کی صفت کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ دنیا میں تعریف اور آخرت میں بدلہ کا تقاضا کرتی ہے۔ اگر ان میں سے ایک ایک وصف کمال کے ساتھ متصف ہو اور دوسری دوسرے وصف کمال کے ساتھ متصف ہو تو دونوں کو ایک دوسری پر جزوی فضیلت حاصل ہوگی، یعنی دونوں تعریف اور ثواب کی مستحق ہوں گی۔ کلی فضیلت اس کے لئے ہوگی جسے زیادہ ثواب اور اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب کا شرف حاصل ہوگا۔ تمام انبیاء اور رسول صفت رسالت و نبوت اور اجر و ثواب کے مستحق ہونے میں تو شریک ہیں۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے ہاں کثرت ثواب اور قرب کی زیادتی میں باہم فضیلت ثابت ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور بعض کی فضیلت اللہ تعالیٰ کے بتانے

سے جانی جا سکتی ہے۔

۲؎ ان میں سے کوئی تو وہ تھا جس سے اللہ نے کلام کیا۔ اہل تفسیر کا کہنا ہے اس سے مراد موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں کیونکہ کئی آیات اس پر صراحۃً دلالت کرتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضور پر نور حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے طور کے مقام پر اور سردار دو عالم حضرت محمد ﷺ سے معراج کے موقع پر کلام فرمایا جب آپ مقام قاب قوسین او ادنیٰ کے مقام پر فائز تھے، دونوں کے مقام میں کتنا فرق ہے مخفی نہیں۔

۳؎ یعنی بعض کے درجات کو بعض پر یا تمام پر بلند کر دیا۔ جہاں تک بعض کے درجات کو بعض پر بلند کرنے کا مطلب ہے تو یہ بہت سے انبیاء اور رسل میں واقع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو انبیاء پر فضیلت دی اور اولوالعزم رسولوں کو دوسرے رسولوں پر فضیلت دی۔ رہی یہ بات کہ کسی ایک کے درجات کو تمام پر فضیلت دینا تو یہ صرف ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کے لئے وحی غیر متلو سے ثابت ہے جس پر تمام علماء اسلام کا اجماع ہے۔ حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں قیامت کے روز تمام بنی آدم کا سردار ہوں گا، یہ کوئی فخر نہیں کر رہا(1) میں سب سے پہلا سفارش کرنے والا ہوں گا اور سب سے پہلا ہوں گا جس کی سفارش قبول کی جائے گی اور میں کوئی فخر نہیں کر رہا۔ اسے امام احمد بن حنبل، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اصحاب رسول ﷺ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ باہر تشریف لائے ان کے قریب ہوئے ان کو گفتگو کرتے ہوئے سنا۔ بعض نے کہا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا، دوسرے نے کہا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا۔ ایک اور نے کہا حضرت عیسیٰ کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ ایک اور نے کہا حضرت آدم صفی اللہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ان کی طرف تشریف لائے، فرمایا میں نے تمہاری گفتگو کو سنا اور تمہیں اس چیز نے تعجب میں مبتلا کیا کہ ابراہیم خلیل اللہ ہیں جبکہ وہ ایسے ہی ہیں، موسیٰ نجی اللہ ہیں جبکہ وہ ایسے ہی ہیں، عیسیٰ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں جبکہ وہ ایسے ہی ہیں، حضرت آدم صفی اللہ ہیں جبکہ وہ ایسے ہی ہیں، خبردار میں اللہ کا حبیب ہوں اور میں کوئی فخر نہیں کرتا، میں قیامت کے روز لواء الحمد اٹھائے ہوئے ہونگا جبکہ اس کے نیچے حضرت آدم اور دوسرے سب ہونگے اور میں کوئی فخر نہیں کر رہا، میں قیامت کے روز پہلا شفاعت کرنے والا ہوں گا اور پہلا وہ جس کی شفاعت قبول کی جائے گی میں ہونگا اور میں کوئی فخر نہیں کر رہا، میں سب سے پہلا ہونگا جو دروازے کے حلقہ کو حرکت دوں گا اللہ تعالیٰ اسے میرے لئے کھولے گا۔ پس وہ مجھے جنت میں داخل کرے گا تو میرے ساتھ میری امت کے فقراء ہونگے، میں کوئی فخر نہیں کر رہا۔ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اولین و آخرین میں سے سب سے زیادہ معزز ہوں اور میں کوئی فخر نہیں کر رہا(2) اسے امام ترمذی اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں رسولوں کا قائد ہوں اور میں کوئی فخر نہیں کر رہا اور میں خاتم النبیین ہوں اور میں کوئی فخر نہیں کر رہا اور میں پہلا شافع اور مشفع ہوں جبکہ میں فخر نہیں کر رہا۔ اسے دارمی نے روایت کیا ہے(3) حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے جب قیامت کا روز ہوگا میں انبیاء کا امام، خطیب اور صاحب شفاعت ہونگا جبکہ میں فخر کرنے والا نہیں۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(4) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں میں سب سے پہلا ہوں جس پر زمین

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:3615 (علمیہ)
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:3616 (علمیہ)
3۔ سنن دارمی:50، جلد 1، صفحہ 31-32 (محاسن)
4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:3613 (علمیہ)

کھلے گی، میں جنت کے حلوں میں سے ایک حلہ پہنوں گا میں عرش الٰہی کے دائیں جانب کھڑا ہونگا اور مخلوقات میں سے میرے سوا کوئی وہاں کھڑا نہ ہوگا۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1) آپ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے وسیلہ مانگو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وسیلہ کیا ہے؟ فرمایا جنت کا سب سے بلند مرتبہ جسے صرف ایک آدمی پائے گا، میں امید کرتا ہوں کہ وہ میں ہی ہونگا۔ اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2) یہ احادیث اگرچہ آحاد ہیں، لیکن معنی کے اعتبار سے متواتر ہیں اور امت مسلمہ نے انہیں شرف قبولیت سے نوازا ہے۔ امام محی السنۃ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کسی نبی کو کوئی معجزہ نہیں دیا گیا مگر وہ ہمارے نبی ﷺ کو بھی دیا گیا، آپ ﷺ کو ان معجزات میں فضیلت دی گئی جیسے آپ ﷺ کے اشارہ سے چاند کا ٹکڑے ہونا، آپ ﷺ کی جدائی پر ستنے کا رونا، پتھر اور درخت کا حکم کی تعمیل کرنا، جانوروں کا بولنا اور آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دینا، آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی کا جاری ہونا، اس کے علاوہ بے شمار معجزات ہیں(3) ان معجزات میں سے بڑا معجزہ قرآن حکیم ہے جس کی مثل لانے سے اہل زمین اور اہل آسمان سب عاجز آگئے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نبی کو معجزات میں سے اتنے ہی عطا کیے گئے جن کی مثل لوگ ان پر ایمان لائے، مجھے جو چیز عطا کی گئی وہ یہ وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف کی۔ میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کے روز ان میں سے میرے تابعدار زیادہ ہوں گے، متفق علیہ(4) انہیں کی سند سے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئیں جو کسی اور نبی کو عطا نہیں کی گئیں: مجھے ایک ماہ کی مسافت سے رعب سے نوازا گیا(الف)، میرے لئے تمام زمین، مسجد اور پاکیزگی عطا کرنے والی بنادی گئی، میری امت میں جب کسی کو جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے پس وہ نماز پڑھ لے۔ میرے لیے غنائم حلال کردی گئیں جبکہ اس سے قبل حلال نہ تھیں مجھے شفاعت کرنے کا حق دیا گیا۔ ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا جبکہ مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا(5) متفق علیہ۔ وہ اپنی سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے چھ چیزوں کے ساتھ انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے: مجھے جوامع الکلم (ب) عطا فرمائے گئے، مجھے رعب سے نوازا گیا، میرے لئے غنائم حلال کی گئیں، میرے لئے زمین مسجد اور طہور (ج) بنادی گئی، مجھے تمام مخلوقات کی طرف مبعوث کیا گیا اور مجھ پر انبیاء کی بعثت کا سلسلہ ختم کردیا گیا۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(6) یہ بہت طویل بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں، اس میں کئی کئی جلدیں تصنیف کی گئیں۔

۱؎ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات عطا فرمائے آپ علیہ السلام پنگھوڑے میں لوگوں سے کلام فرماتے، مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو درست کردیتے، مردوں کو زندہ کردیتے، آپ علیہ السلام کے اوپر آسمان سے مائدہ نازل کیا گیا۔

۲؎ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خصوصاً ذکر فرمایا کیونکہ یہودی آپ علیہ السلام کی تحقیر اور عیسائی آپ علیہ السلام کی تعظیم میں افراط سے کام لیتے ہیں۔

۳؎ یعنی اگر اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کی ہدایت کو چاہتا تو وہ رسولوں کی آمد کے بعد باہم قتال نہ کرتے بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح معجزات آچکے تھے۔

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 13 صفحہ 88 (علمیہ) 2۔ ایضاً: 3612 (علمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 356 (فکر)

4۔ صحیح بخاری: 4096 (ابن کثیر) 5۔ صحیح بخاری: 328، 434 (ابن کثیر) 6۔ صحیح مسلم، جلد 5، صفحہ 5 (علمیہ)

8۔ لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارادہ کی وجہ سے اختلاف کیا۔ یہ ارادہ اس لئے کیا تا کہ وہ اپنی صفات جلالیہ اور صفات جمالیہ کو ظاہر فرمائے اور اپنے اسماء ہادی، مضل، غفار، منتقم اور غفور وغیرہ اسماء کو واضح کرے۔

9۔ ان میں سے کچھ ایمان لائے اللہ تعالیٰ نے انہیں انبیاء کے دین کو اپنے اوپر لازم کرنے کی ہدایت اور توفیق دے کر فضل و احسان فرمایا انبیاء ہی وہ ہستیاں ہیں جن کا راہ عمل ہدایت ہے۔

10۔ یعنی عدل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انہیں رسوا کیا کیونکہ انہیں لوگوں کا عمل صفت ضلال سے متصف ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق تاریکی میں پیدا کی۔ پھر ان پر اپنا نور ڈالا جس کو وہ نور پہنچا وہ ہدایت پا گیا اور جسے نہ پہنچا وہ گمراہ رہا۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کے علم میں قلم خشک ہو چکا ہے (یعنی فیصلہ ہو چکا ہے)۔ اسے امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔(1)

11۔ اسے تاکید کے لئے مکرر ذکر کیا ہے۔

12۔ لیکن اللہ تعالیٰ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ اس پر اعتراض جائز نہیں نہ کوئی اس کی حکمت کی حقیقت کو پہنچ سکتا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ایک آدمی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا مجھے قدر کے بارے میں بتایئے؟ فرمایا یہ تاریک راستہ ہے، اس پر نہ چل، اس نے سوال دہرایا۔ فرمایا یہ گہرا سمندر ہے، اس میں داخل نہ ہو، اس نے پھر سوال دہرایا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ مخفی راز ہے، اس کی جستجو نہ کر(2) یعنی یہ ایک امر ہے جسے عقل سے ادراک نہیں کیا جا سکتا، اس کی تفتیش ہلاکت کو واجب کرتی ہے جس طرح گہرے سمندر میں داخل ہونا اور تاریک راستہ میں چلنا ہلاکت کو ثابت کرتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوا سنا جس نے تقدیر کے بارے گفتگو کی قیامت کے روز اس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا اور جس نے اس کے متعلق گفتگو نہ کی اس سے باز پرس نہ ہوگی۔ اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3) ابی بن کعب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کے مکینوں کو عذاب دے تو وہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں ہوگا۔ اگر وہ سب پر رحمت فرمائے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہتر ہوگی۔ اگر تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو اسے اس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک تو تقدیر پر ایمان نہ لائے۔ یہ یقین رکھ کہ جو چیز تجھ تک پہنچی ہے وہ چھوٹنے والی نہ تھی اور جو تجھ سے چھوٹ گئی وہ پہنچنے والی نہ تھی۔ اگر تو اس کے خلاف عقیدہ پر فوت ہوا تو تو جہنم میں داخل ہو گیا(4) حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث بھی اسی کی مثل ہے جسے امام احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیت بعض رسولوں کی بعض رسولوں پر فضیلت پر دلالت کرتی ہے تو حضور ﷺ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہوگا اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو باہم فضیلت نہ دیا کرو(5) ایک اور روایت میں تفضلوا کی جگہ لاتخیروا کے الفاظ ہیں جو متفق علیہ ہے(6) حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک مرفوع حدیث نقل کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، 2642 (علمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 357 (فکر) 3۔ سنن ابن ماجہ، 84 (علمیہ)
4۔ سنن ابن ماجہ، 77 (علمیہ) 5۔ صحیح بخاری، 3233 (ابن کثیر) 6۔ صحیح مسلم، 163، جلد 15، صفحہ 108 (علمیہ)

فرمایا مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو(1) اور آپ کا یہ فرمان میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی یونس بن متی پر فضیلت رکھتا ہے، متفق علیہ۔ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے(2) ہم یہ کہیں گے اس کا معنی یہ ہے کہ بعض انبیاء کو بعض انبیاء پر بغیر نص کے رائے کے ساتھ فضیلت کا حکم لگانا جائز نہیں کیونکہ فضیلت کا مطلب ہے ثواب کی کثرت اور اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب۔ یہ چیز رائے سے معلوم نہیں کی جا سکتی ابھی وہ فضیلت جو کتاب اور سنت سے ثابت ہے۔ اگر دلیل ظنی ہو خواہ ظن سند یا متن کی وجہ سے ہو تو ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ اس کی نقیض بھی جائز ہے۔ اگر دلیل قطعی ہو تو اس کا اعتقاد واجب ہے۔ انبیاء کے علاوہ دوسرے لوگوں میں بھی یہی حالت ہوگی۔ جہاں تک حضور ﷺ کے اس فرمان کا تعلق ہے کہ "مجھے موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو" اور اس فرمان" کہ میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی یونس بن متی سے افضل ہے تو یہ اس پر محمول ہوگا کہ ابھی آپ کو تمام انبیاء پر آپ کی فضیلت سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔" واللہ اعلم۔ یہ آیت معتزلہ کے خلاف اہل سنت کی دلیل ہے کہ تمام تر حوادثات اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں اس کی مشیت کے تابع ہیں، وہ امر خیر ہو یا شر، ایمان ہو یا کفر۔ اسی طرح اصلح (1) وغیرہ کوئی شے اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بہت ہی بلند اور بالا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمام لوگوں کے دل ایک دل کی مانند رحمن کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں (یعنی اس کے قبضہ میں ہیں)، جیسے چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ! اے دلوں کے پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی طاعت کی طرف پھیر دے(3) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسی کی مثل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی، ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

"اے ایمان والو خرچ کر لو [1] اس (مال) میں سے جو ہم نے دیا ہے تم کو اس سے پہلے کہ آ جائے وہ دن [2] جس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی اور نہ (کفار کے لئے) دوستی ہوگی [3] اور نہ (ان کے لئے) شفاعت [4] اور جو کافر ہیں وہی ظالم ہیں [5]"

[1] اے ایمان والو وہ خرچ کرو جو میں نے تم پر خرچ کرنا واجب کیا ہے۔

[2] اس میں سے جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اس سے قبل کہ وہ دن آ جائے جس میں تم نے جو کوتاہیاں کی ہیں اس کے تدارک پر تم قادر نہ ہو سکو اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھٹکارا نہ پا سکو۔

[3] کیونکہ اس دن کوئی خرید و فروخت نہ ہوگی کہ تم اموال حاصل کر سکو اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر سکو یا تم فدیہ دے کر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ سکو۔ نہ دوستی ہوگی کہ تمہارے دوست تمہاری مدد کریں یا تمہاری معافی کی صورت پیدا کر سکیں اور اللہ تعالیٰ کے اذن کے

(1) معتزلہ مسلمانوں کا فرقہ تھا، جس کا بانی واصل بن عطا تھا جن کے عقائد میں سے ایک یہ بھی تھا کہ بندے کے حق میں جو امر بہترین ہو وہ اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔

1۔ صحیح مسلم: 160، جلد 15، صفحہ 107 (علمیہ) 2۔ صحیح بخاری: 1255 (ابن کثیر) 3۔ صحیح مسلم: 2854، جلد 16، صفحہ 186 (علمیہ)

بغیر کوئی شفاعت نہ ہوگی۔ ابن کثیر، ابوعمرو، یعقوب اور ابومحمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے بیع، خلة اور شفاعة کو مبنی بر فتحہ پڑھا ہے۔ اسی طرح سورۃ ابراہیم میں لَا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خِلٰلٌ اور سورۃ طور میں لَا لَغْوٌ فِیْهَا وَلَا تَاْثِیْمٌ کو مبنی بر فتحہ پڑھا ہے۔ باقی تمام قراء نے ان کلمات کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ هَلْ فِیْهِ بَیْعٌ اَوْ خُلَّةٌ اَوْ شَفَاعَةٌ کے جواب میں ہے۔

ے کافر ہی ظالم ہیں ظالم ہونے کی وجہ یہ ہے کیونکہ وہ عبادت اور اموال غیر محل میں رکھتے ہیں اور مال کو نامناسب طریقے سے خرچ کرتے ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ کے حکم سے اعراض کر کے اور اپنے آپ کو عذاب پر پیش کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو اے مومنو تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ کافر جو زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کرتے ہیں وہ ظالم ہیں۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہاں کافرون سے مراد زکوٰۃ کے تارک ہیں تارکین زکوٰۃ کی جگہ کافرین کے لفظ کا ذکر بطور تغلیظ ہے جیسے مَنْ لَّمْ یَحُجَّ کی جگہ مَنْ کَفَرَ ذکر کیا جس طرح کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں تارکین زکوٰۃ کو مشرکین کے لفظ سے یاد کیا: وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِكِیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (اور ہلاکت ہے مشرکوں کے لئے جو زکوٰۃ نہیں دیتے۔) اس کی حکمت یہ ہے کہ زکوٰۃ نہ دینا کفار کی صفت ہے(1) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جب حضور ﷺ نے اس جہان فانی سے پردہ فرمایا تو بدو مرتد ہو گئے اور انہوں نے کہا ہم زکوٰۃ نہیں دیں گے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگر انہوں نے ایک عقال (۱) دینے سے انکار کیا تو پھر بھی میں ان سے جہاد کروں گا۔ میں نے عرض کی اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ لوگوں سے نرمی کیجئے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے فرمایا کیا دور جاہلیت میں جبار اور اسلام میں بزدل بنتے ؟ وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا، دین مکمل ہو چکا، کیا اس دین میں کمی کی جائے گی جبکہ میں زندہ ہوں۔ اسے رزین نے روایت کیا۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۝

"اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے ۱؎ زندہ ہے ۲؎ سب کو زندہ رکھنے والا ہے ۳؎ نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند ۴؎ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ۵؎ کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے ۶؎ جانتا ہے جو ان سے پہلے (ہو چکا) ہے اور جو ان کے بعد (ہونے والا) ہے ۷؎ اور وہ نہیں گھیر سکتے کسی چیز کو اس کے علم میں سے ۸؎ مگر جتنا وہ چاہے ۹؎ سما رکھا ہے اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو ۱۰؎ اور نہیں تھکاتی اسے ان زمین و آسمان کی حفاظت ۱۱؎ اور وہی سب سے بلند عظمت والا ہے ۱۲؎" -

۱؎ ترکیب کلام میں یہ جملہ مبتدا اور خبر ہے۔ اس کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ ہی عبادت کا مستحق ہے کوئی اور اس کے لائق نہیں۔

۲؎ وہی اس کے لائق ہے کہ جانے، سنے، دیکھے، اندازہ لگائے اور ارادہ کرے اور جو اسے زیبا ہے وہ اس کے لئے ہمیشہ سے ثابت ہے

(۱) رسی، اونٹ، بکریوں میں ایک سال کی زکوٰۃ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 576 (علمیہ)

اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثابت رہے گا کیونکہ بالقوۃ (ا) اور بالامکان (ب) اس کے لئے ممتنع ہے۔ حیات اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو تمام صفات کمالیہ کا مبدا ہے۔

۳؎ عمرو بن مسعود نے اسے قیام اور علقمہ نے قیم پڑھا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ تمام کلمات ہم معنی ہیں (1) ابن مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قیوم کا معنی ہر چیز پر نگہبان۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہر نفس نے جو کمایا اس پر نگہبان۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے امور کو قائم فرمانے والا۔ ابو عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جو ہمیشہ ہو۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قیوم کا معنی ہمیشہ سے خلق کی تدبیر اور اس کی حفاظت کرنے والا۔ عرب قام بالامر اس وقت کہتے ہیں جو کوئی کسی امر کی حفاظت کرے (2) سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہمیشہ باقی رہنے والا (3) میں یہ کہتا ہوں تمام اقوال کا مرجع یہ ہے جو دائمی ہو، جو خود بھی قائم ہو اور دوسری اشیاء کو قائم کرنے والا ہو، کسی شی کی حفاظت اور بقاء کا تصور اس کے بغیر متصور نہیں ہوتا۔ پس اس اسم کا مقتضی یہ ہے کہ ہر چیز اپنی بقاء میں اللہ تعالیٰ کی اسی طرح محتاج ہے جس طرح اپنے وجود میں اس کی محتاج ہے، جیسے سایہ اپنی اصل کا محتاج ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی محتاج ہوتی ہے وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى اللہ تعالیٰ کی عظیم شان ہے۔

۴؎ سنۃ ایسی شکستگی ہے جو نیند سے پہلے ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا ذکر پہلے فرمایا، جبکہ قیاس اس کے برعکس کا تقاضا کرتا ہے۔ نیند ایسی حالت کو کہتے ہیں جو حیوان کو لاحق ہوتی ہے، اٹھنے والے بخارات کی رطوبتوں سے دماغ کے اعصاب میں ڈھیلا پن آ جاتا ہے کہ حواس ظاہرہ کو احساس سے مطلقاً معطل کر دیتا ہے۔ یہ جملہ صفت سلبیہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی کسی چیز کے ساتھ مشابہت کی نفی کرتا ہے۔ یہ اس بات کی تاکید ہے کہ وہ حی و قیوم ہے۔ کیونکہ جسے اونگھ یا نیند آ جائے اس کے حواس ماؤف ہو جاتے ہیں، کیونکہ نیند موت کی مانند ہے جو اشیاء کی حفاظت اور ان کو قائم رکھنے سے قاصر ہے۔ اسی وجہ سے الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ کے درمیان حرف عطف نہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں پانچ باتیں بتائیں فرمایا اللہ تعالیٰ کو نیند نہیں آتی نیند کا آنا اس کی شان کے لائق نہیں وہ میزان کو جھکاتا ہے اور بلند کرتا ہے۔ رات کے اعمال دن کے اعمال سے پہلے اس کی بارگاہ میں پیش کئے جاتے ہیں اور دن کے اعمال رات کے اعمال سے پہلے پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کا حجاب بھی نور ہے۔ اگر حجاب ہٹ جائے تو اس کی ذات کا نور مخلوق کی ہر چیز کو جلا دے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ (4)

۵؎ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی قیومیت کی وضاحت ہے اور الوہیت میں اس کے یکتا ہونے پر دلیل ہے مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ سے ان میں جو چیز بھی پائی جاتی ہے۔ ان دونوں کی حقیقت میں داخل ہو یا ان سے خارج ہو اس ارشاد میں لَهٗ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَا فِيْهِنَّ سے زیادہ مبالغہ ہے۔

۶؎ اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کا بیان ہے کوئی اس کا ہم پلہ ہے، نہ اس کے قریب۔ اللہ تعالیٰ جس امر کا ارادہ کرے اس کے اذن کے بغیر کوئی شفاعت کے ذریعے بھی نہیں روک سکتا، چہ جائیکہ دشمنی کرتے ہوئے اسے روک دے۔

(ا) اللہ تعالیٰ کی صفات بالفعل ثابت ہیں بالقوۃ نہیں۔ جیسے انسان بول تو سکتا ہے، لیکن بول نہ رہا ہو تو بولنے کی صفت بالقوۃ ہوئی بالفعل نہ ہوئی۔

(ب) امکان جس کا معدوم ہونا جائز ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 359 (فکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 577 (علمیہ)
3۔ تفسیر جلالین صفحہ 56 (انوار)
4۔ صحیح مسلم، 393، جلد 3، صفحہ 13 (علمیہ)

ہے ان سے جو پہلے ہوئے یا بعد میں۔ یا اس کا معنی ہے جس کا لوگ ادراک رکھتے ہیں یا ادراک نہیں رکھتے، سب کو جانتا ہے یا جو وہ لیتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں انہیں بھی جانتا ہے، کیونکہ جس کو وہ چھوڑ دیتے ہیں۔ گویا اس کو وہ اپنی پشتوں کے پیچھے پھینک دیتے ہیں۔ ھم ضمیر ما اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے۔ جمع مذکر غائب کی ضمیر ذوی العقلا کو غلبہ دینے کی وجہ سے ہے یا یہ ضمیر ذا اسم اشارہ کے مدلول کی طرف لوٹ رہی ہے جو انبیاء اور ملائکہ ہیں۔

8 لوگ اس کی معلومات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہاں من علمہ کی قید کے ساتھ شی کو مقید کیا ہے، یعنی صفت ذکو کی ہے جبکہ ہر شے اس کا معلوم ہے، اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے کہ یہاں احاطہ سے مراد احاطہ علمی ہے۔ ولا یعلمون شیئا نہیں فرمایا اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے کہ تمام اشیاء کی کنہ کا علم محیط اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ کسی غیر کا علم محیط کسی شے کی کنہ تک نہیں پہنچتا مگر نادر وشاذ صورت میں ایسا ہوتا ہے۔ یہاں بعلمہ سے مراد وہ علم ہے جو اس کی ذات کے ساتھ خاص ہے وہ علم غیب ہے جس کا لوگ احاطہ نہیں کر سکتے۔

9 مگر جس کے احاطہ کو اللہ تعالیٰ چاہے یہ بہت ہی قلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا، اور تمہیں بہت کم علم دیا گیا ہے۔ وَلَا يُحِيْطُوْنَ میں واؤ یا تو حالیہ ہے۔ اس صورت میں يَعْلَمُ کے فاعل سے یہ حال ہے۔ یا یہ واؤ عاطفہ ہے۔ عطف کی صورت میں ان دونوں جملوں کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کیونکہ دونوں جملے اللہ تعالیٰ کے مخلوق کے تمام احوال کے علم ذاتی میں یکتا ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

10 امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کی تصویر ہے اور ایک مجرد تمثیل (ا) ہے، حقیقت میں کوئی کرسی ہے نہ کوئی بیٹھنے والا(1) حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے۔ یہاں کرسیہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔ یہی مجاہد کا قول ہے۔ اسی وجہ سے صحیفہ (ب) علم کو کراسۃ (ج) کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ کرسیہ سے مراد اس کا ملک اور بادشاہت ہے عرب ملک قدیم کو کرسی کہتے ہیں۔ اگر کرسی کا لفظ علم اور ملک کے معنی میں ہو تو یہ مذکورہ جملہ "لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ..... وَمَا خَلْفَهُمْ" کا مستدرک ہے۔ محدثین کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ کرسی ایک جسم ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے علماء نے کرسی کی تعبیر میں اختلاف کیا ہے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے یہ عرش ہی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کرسی عرش کے سامنے رکھی ہوئی ہے اور وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کا معنی یہ ہے کہ اس کی وسعت آسمانوں وزمین کی وسعت جتنی ہے(2) ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابوذر کے واسطہ سے حضور ﷺ سے یہ روایت کیا ہے کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے ساتھ وہی نسبت رکھتی ہیں جس طرح ایک انگوٹھی صحرا میں پڑی ہو اور عرش کو کرسی پر وہی فضیلت حاصل ہے جس طرح اس صحرا کو اس انگوٹھی پر فضیلت حاصل ہے(3) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ

(ا) جس میں ارکان تشبیہ کا کوئی وجود نہیں

(ب) علم کا صحیفہ جس میں علم کی باتیں لکھی جائیں۔

(ج) کاپی۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 580 (علمیہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 361 (فکر) 3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 58 (علمیہ)

ساتوں آسمان کرسی میں یوں سمائے ہوئے ہیں جس طرح سات درہم ترس (ڈھال) میں رکھ دیئے گئے ہوں۔ حضرت علی اور مقاتل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ہر پائے کی لمبائی ساتوں آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے اور وہ عرش کے سامنے پڑی ہوئی ہے، اس کرسی کو چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں، ہر فرشتے کے چار چہرے ہیں جس کے قدم اس چٹان میں ہیں جو ساتویں زمین کے نیچے ہے جس تک پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ فرشتہ سید البشر حضرت آدم کی صورت میں ہے وہ لوگوں کے لئے ایک سال سے دوسرے سال تک رزق کا سوال کرتا ہے۔ ایک فرشتہ چوپاؤں کے سردار کی صورت میں ہے جو بیل ہے، وہ چوپاؤں کے لئے ایک سال سے دوسرے سال تک رزق کا سوال کرتا ہے، اس کے چہرے پر غضاضہ (زخم) ہے۔ یہ اس وقت سے ہے جب سے انسانوں نے بچھڑے کی عبادت کی۔ ایک فرشتہ درندہ کے سردار کی صورت پر ہے جو شیر ہے جو ایک سال سے دوسرے سال تک درندوں کے لئے رزق کا سوال کرتا ہے ایک فرشتہ پرندوں کے سردار کی شکل پر ہے جو نسر (گدھ) کی شکل پر ہے جو پرندوں کے لئے ایک سال سے دوسرے سال تک کے لئے رزق کا سوال کرتا ہے[1] بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ عرش اٹھانے والے فرشتوں اور کرسی اٹھانے والے فرشتوں کے درمیان ستر حجاب تاریکی کے اور ستر حجاب نور کے ہیں، ہر حجاب کی موٹائی پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کرسی کو اٹھانے والے عرش اٹھانے والوں کے نور سے جل جاتے۔ کرسی اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جس پر بیٹھا جائے اور بیٹھنے والے سے کرسی کی کوئی جگہ نہ بچے۔ گویا یہ کرس کی طرف منسوب ہے جس کا معنی بعض چیز کو بعض کے ساتھ ملانا ہے کرسی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ایسے ہی ہے جس طرح عرش کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف، اسی طرح بیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف گویا اللہ تعالیٰ کی تجلیات کی انواع میں سے ایک نوع اس کے ساتھ خاص ہے۔ اس کا ذکر ہم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ میں کیا ہے۔ حدیث طیبہ سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ عرش گول ہے جو ساتوں آسمانوں کو محیط ہے اور جو ہم نے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث روایت کی ہے اس سے یہ معنی سمجھ آتا ہے کہ کرسی آسمانوں کو محیط ہے اور عرش کرسی کو محیط ہے۔ ان میں سے بعض کا بعض کو محیط ہونا تقاضا کرتا ہے کہ تمام ہی گول ہوں۔ اسی وجہ سے بعض نے کہا کرسی آٹھواں فلک ہے اور عرش نواں فلک ہے۔ شاید عرش اور کرسی ماہیت میں آسمانوں سے تجلیات کے اعتبارات سے جدا اور ممتاز ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے آسمانوں میں شمار نہیں کیا اور آسمانوں کی تعداد سات سے زیادہ نہیں کی۔

1۔ یعنی اسے بوجھل نہیں کرتی۔ یہ اود سے مشتق ہے جس کا معنی ثقل ہے۔

2۔ آسمانوں، زمینوں، کرسی اور جو کچھ ان میں ہے ان کی حفاظت یہ جملہ اپنے ما بعد معطوف کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت، تمام معلومات کے ساتھ اس کے تعلق یا اس کے جلال، عظمت اور اشیاء کو قائم کرنے کی عمومیت کا بیان ہے۔ یہ دونوں جملے حکم میں ایک جملے کی طرح ہیں۔ جب یہ جملہ پہلے جملے کے لئے تاکید اور بیان ہے تو ان جملوں میں حرف عطف ذکر نہیں کیا۔

3۔ وہ ندا اور شبیہ سے ماوراء ہے کسی اعتبار سے بھی کوئی چیز اس کی ذات اور صفات جیسی نہیں ہے وہ اس سے بھی بلند و بالا ہے کہ حمد کرنے والے اس کی ایسی حمد کریں اور صفت بیان کرنے والے ایسی صفت بیان کریں جو اس کی زیبا ہے۔ کوئی چیز بھی جب اس کی طرف منسوب کی جائے وہ حقیر ہوتی ہے۔ یہ آیت ذات و صفات کی مباحث میں مختص ہے۔ یہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ وجود میں متوحد ہے، صفات

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 361 (فکر)

• کمال جیسے حیات سے متصف ہونے میں اصل ہے اسی طرح یہ صفت جن صفات کا تقاضا کرتی ہے جیسے علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر اور کلام، سے بھی متصف ہے۔ یہی وجود عطا کرنے والا اور ماسوی کو قائم کرنے والا ہے اس حیثیت میں کہ ماسوی اسی کے ساتھ قائم ہے لیکن یہ قیام عرض (ا) کے عین (ب) کے ساتھ قیام جیسا نہیں، جیسا کہ بعض علماء کی گفتگو سے محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ عالم ایک عین میں جمع ہونے والے اعراض ہیں، بلکہ ان کا تعلق ایسا ہے کہ وہاں مجال خیال بھی نہیں۔ اس قیام کو جس عبارت سے کچھ تعبیر کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے "کہ اللہ تعالیٰ شاہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے" وہ کسی چیز میں سمانے اور حلول سے پاک، تغیر وفتور سے مبراء ملک وملکوت کا مالک بطش شدید والا اس کے انتقام کی کوئی طاقت نہیں رکھتا، کوئی اس کی اجازت کے بغیر اس کی بارگاہ میں سفارش نہیں کر سکتا، وہ تمام اشیاء کو علم محیط کے ساتھ جاننے والا ہے، کوئی بھی چیز خواہ مخفی ہو یا جلی اس کے علم سے باہر نہیں، وہ اپنے علوم میں بھی لکھتا ہے، اس کے علوم کو کوئی اس وقت تک نہیں جان سکتا جب تک وہ خود آگاہ نہ کرے، وہ وسیع ملک اور قدرت والا ہے، وہ اپنی بعض مخلوقات پر ایسی تجلی فرماتا ہے جو اس کی تنزیہ کے منافی نہیں، کوئی مشکل سے مشکل کام بھی اسے تھکا تا نہیں اور کوئی کام کسی کام سے غافل نہیں کرتا جو اسے زیبا نہیں اس سے وہ بلند وبالا ہے، بلکہ وہ اس سے بھی ماوراء ہے کہ کوئی اس کی صفت بیان کرے جس کے (ج) ہاتھ میں روز قیامت لواء الحمد ہوگا وہ بھی تیری حمد سے عاجز ہے کیونکہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ تو ایسا ہی ہے جیسے تو نے اپنی ثناء کی وہ عظیم ہے جب بھی کسی چیز کی عظمت کو اس کی طرف منسوب کیا جائے تو وہ چیز حقیر نظر آتی ہے، کسی بھی عالم کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا کسی بھی عبادت گزار کی عبادت اس کی عظمت کے مناسب نہیں، سب سے بہتر (د) نے بھی عبادت میں کمی کا اعتراف کیا ہے جب یہ فرمایا "ہم نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا، اسی وجہ سے جب حضور ﷺ سے یہ پوچھا گیا سب سے ذی شان آیت کونسی ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا آیۃ الکرسی۔ جب پوچھا گیا سب سے عظمت والی سورت کونسی ہے؟ فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اسے دارمی نے اسقع بن عبد الکلاعی سے روایت کیا اور حارث بن اسامہ نے حسن سے مرسل حدیث روایت کی "سب سے عظمت والی آیت آیۃ الکرسی ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابومنذر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے کونسی آیت عظیم ہے؟ میں نے عرض کی اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ تو حضور ﷺ نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر مار کر فرمایا تجھے علم مبارک ہو(1) پھر فرمایا قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس آیت کی ایک زبان اور دو ہونٹ ہیں، فرشتہ پایہ عرش کے پاس اللہ تعالیٰ کی تقدیس کرتا ہے۔ میری رائے یہ ہے شاید اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ حاملین عرش اس آیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدوسیت بیان کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عالم مثال میں ہر شے کی ایک صورت ہے، یہاں تک کہ قرآن، اس کی آیات، رمضان اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں کی بھی۔ ابن مردویہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے، ابن راہویہ اپنی مسند میں عوف بن مالک سے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ابوذر سے اسی طرح روایت کرتے ہیں۔ امام ترمذی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ قرآن کی آیات کی سردار آیۃ الکرسی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آیۃ الکرسی چوتھائی قرآن ہے حضرت

(ا) جو قائم بالذات نہ ہو جیسے رنگ وغیرہ۔
(ب) جو قائم بالذات ہو جیسے اجسام اور جواہر۔
(ج، د) حضور محمد ﷺ۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 6 صفحہ 81 (علمیہ)، سنن دارمی، جلد 2 صفحہ 321 (محاسن)

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے صبح کے وقت آیۃ الکرسی اور حٰمٓ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ کی دو آیتیں پڑھیں تو شام تک اس کا دن محفوظ رہتا ہے، اگر اس نے رات کے وقت انہیں پڑھا تو دن تک وہ محفوظ رہتا ہے۔ اسے ترمذی اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث غریب ہے(1) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان شریف کی زکوٰۃ کی حفاظت پر متعین فرمایا۔ ایک آنے والا آیا اور لپ بھر بھر کر غلہ اٹھانے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا، میں نے کہا میں تجھے ضرور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پیش کروں گا۔ اس نے کہا میں ضرورت مند ہوں اور میرا بال بچہ بھی ہے اور مجھے سخت مجبوری ہے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ جب صبح ہوئی نبی کریم ﷺ نے فرمایا گزشتہ رات کے قیدی نے تیرے ساتھ کیا کیا؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس نے سخت ضرورت اور عیال کی شکایت کی، میں نے اس پر رحم کر دیا اور اس کو چھوڑ دیا۔ فرمایا خبردار اس نے تجھ سے جھوٹ بولا، وہ پھر آئے گا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور آئے گا۔ کیونکہ حضور ﷺ نے اس کے آنے کا ذکر فرمایا تھا۔ میں اس کا انتظار کرنے لگا، وہ آیا اور کھانا چوری کرنے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ میں نے کہا میں تجھے ضرور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پیش کروں گا۔ اس نے کہا مجھے چھوڑ دے اور اسی طرح بات کی جس طرح پہلی دفعہ اس نے بات کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلی دفعہ کی طرح گفتگو کی۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تیسری دفعہ کہا یہ تیری تیسری دفعہ ہے، تو نے کہا تھا کہ تو نہیں آئے گا تو پھر آ جاتا ہے۔ اس نے کہا مجھے چھوڑ دے میں تجھے ایسے کلمات بتاتا ہوں اللہ تعالیٰ جن کے ذریعے تجھے نفع عطا فرمائے گا، جب تو بستر پر لیٹے تو آیۃ الکرسی پڑھ، اللہ تعالیٰ تیرا محافظ رہے گا اور صبح تک شیطان تیرے قریب نہیں آئے گا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا تیرے قیدی نے رات کو کیا کیا؟ میں نے عرض کی اس نے کہا میں تجھے ایسے کلمات سکھاتا ہوں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ تجھے نفع دے گا۔ فرمایا ہاں اس نے تجھ سے سچ کہا جب کہ وہ خود جھوٹا ہے۔ کیا تو جانتا ہے تین راتوں سے کون تجھ سے مخاطب تھا؟ میں نے عرض کی نہیں۔ فرمایا وہ شیطان تھا۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2) امام نسائی، ابن حبان اور دار قطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں صلصال دمشقی اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی اسے جنت میں داخل ہونے سے کوئی چیز نہیں روکتی مگر موت(3) ایک روایت میں ہے جس نے سونے کے وقت آیۃ الکرسی پڑھی، اللہ تعالیٰ اس کے گھر، اس کے پڑوسی اور اردگرد کے گھر والوں کی حفاظت فرماتا ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے جس نے ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی، اللہ تعالیٰ دوسری نماز تک اس کی حفاظت فرماتا ہے، نبی، صدیق اور شہید کے سوا کسی کی حفاظت نہیں کی جاتی(4) و اللہ اعلم۔

ابو داؤد، نسائی اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کوئی عورت مقیر ہوتی تو وہ اپنے دل میں یہ عہد کرتی اگر اس کا بچہ زندہ رہا تو وہ اسے یہودی بنائے گی، جب بنو نضیر کو جلا وطن کیا گیا تو ان میں انصار کے بیٹے بھی تھے تو انہوں نے کہا ہم اپنے بیٹے نہیں چھوڑ سکتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(5)

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙۗ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2879 (علمیہ) 2۔ صحیح بخاری: 2187 (ابن کثیر) 3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 575 (علمیہ)
4۔ شعب الایمان، جلد 2 صفحہ 459 (علمیہ) 5۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 582 (علمیہ)

يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ

"کوئی زبردستی نہیں دین میں ۱؎ بے شک خوب واضح ہو گئی ہدایت گمراہی سے ۲؎ تو جو انکار کرے شیطان کا ۳؎ اور ایمان لائے اللہ کے ساتھ ۴؎ تو اس نے پکڑ لیا مضبوط حلقہ جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے ۵؎"

۱؎ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے ساتھیوں کو اختیار دیا گیا ہے، اگر وہ تجھے پسند کریں تو تم میں سے ہوں گے، اگر انہوں نے یہودیوں کو پسند کیا تو ان کے ساتھ جلاوطن ہوں گے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اوس کے کچھ افراد یہودیوں میں اپنے بچوں کو دودھ پلاتے تھے جنہوں نے دودھ پیا تھا انہوں نے کہا ہم بنو قریظہ کے ساتھ ہی جائیں گے، یا ان کا دین اختیار کریں گے۔ تو ان کے خاندان والوں نے انہیں منع کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(1) ابن جریر، سعید اور عکرمہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ بنی سالم بن عوف کے ایک آدمی کے بارے نازل ہوئی جسے حصین کہتے ، اس کے دو نصرانی بیٹے تھے، جبکہ وہ خود مسلمان تھا۔ اس نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: کیا میں انہیں مجبور نہ کروں کیونکہ انہوں نے نصرانیت کے علاوہ کسی دین کو اپنانے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(2)۔

اکراہ کا معنی کسی دوسرے پر ایسا فعل لازم کرنا جس پر وہ راضی نہ ہو۔ یہ ظاہری اعضاء کے افعال سے تعلق رکھتا ہے۔ رہا ایمان تو یہ دل کا اعتقاد ہے جو اکراہ سے نہیں پایا جاتا۔ یا اس کا معنی ہے دین میں جبر نہ کرو۔ اس صورت میں اخبار بمعنی نہی ہے۔ اس منع کرنے کی ایک وجہ تو وہی ہے جو ہم نے پہلے ذکر کی ہے کہ جب ایمان اکراہ سے نہیں پایا جاتا تو اس اکراہ کا کیا فائدہ۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان اور ساری عبادات کو آزمائش کے لئے واجب کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" تا کہ تمہیں آزمائے کہ از روئے عمل کون اچھا ہے" اس میں معتبر اخلاص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا" اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے" اکراہ ابتلاء اور اخلاص کے منافی ہے۔ اس قول میں یہ کہا گیا ہے کہ مجبور نہ کرنے کا حکم اہل کتاب کے ساتھ خاص ہے کیونکہ ہم نے اس کے شان نزول میں ذکر کیا ہے کہ انصار کے بچے یہودی تھے یا نصاریٰ تھے جن پر جبر نہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ میری رائے یہ ہے کہ شان نزول کا خاص ہونا نص کی تخصیص کا تقاضا نہیں کرتا، نص عام ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد" مشرکین کے ساتھ جہاد کرو" اور " کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کرو"۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ نسخ تعارض کے بعد ہوتا ہے، یہاں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ قتال و جہاد کا حکم لوگوں کو دین قبول کرنے پر مجبور کرنے کے لئے نہیں، بلکہ یہ تو زمین سے فساد دور کرنے کے لئے ہے، کیونکہ کفار زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو ہدایت اور عبادت سے روکتے ہیں۔ پس ایسے لوگوں کو قتل کرنا سانپ، بچھو اور باؤلے کتے کو قتل کرنے کی طرح ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان سے جنگ کی غایت جزیہ قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ " یہاں تک وہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور وہ ذلیل و رسوا ہوں"۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ نے بچوں، عورتوں، بوڑھوں، راہبوں، اندھوں اور ان لوگوں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے جن سے فتنہ و فساد کا خوف نہیں ہوتا تو اس کے نسخ کا کیسے تصور کیا جا سکتا ہے جبکہ دین میں جبر کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے، نہ یہ کوئی فائدہ دیتا ہے جس طرح ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 362 (الفکر)

2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 583 (علمیہ)

۲؎ یعنی معاملہ واضح ہو چکا اور دلائل عقلیہ اور معجزات نبویہ نے اس بات پر دلالت کر دی ہے کہ ایمان ہدایت ہے جو ابدی سعادت تک پہنچاتی ہے اور کفر گمراہی ہے جو دائمی بدبختی تک لے جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت بندوں پر کامل ہو گئی، لوگوں کا عذر زائل ہو گیا اور ان کی آزمائش صحیح ہو گئی۔ اب ان کو مجبور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر میں کہا کہ اکراہ کسی دوسرے فرد کو ایسے کام پر برانگیختہ کرنا ہے جس میں وہ خیر نہیں دیکھتا۔ پس دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں، کیونکہ ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔ عقلمند آدمی کے لئے جب ہدایت واضح ہو جاتی ہے تو اس کا نفس نجات اور سعادت حاصل کرنے کے لئے ایمان کی طرف جلدی کرتا ہے، اسے اکراہ اور مجبور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی (1)۔ اگر یہی تقدیر کلام یعنی اذ کو محذوف تسلیم کریں تو یہ لازم آتا ہے کہ یہ عاقل خوشی خوشی مومن ہو اور اگر عاقل سے مراد عقل سلیم والا ہو اور جس کی معرفت تام ہو تو یہ کفار پر جبر کے منافی نہیں کیونکہ ان کا عقل سلیم نہیں۔ اسی وجہ سے تو انہوں نے ایمان کی طرف جلدی نہیں کی۔

۳؎ طاغوت طغیان سے فعلوت کے وزن پر ہے جس کے عین اور لام کلمہ میں قلب (۱) کیا گیا ہے، یا یہ فاعول کا وزن ہے جس کے لام کلمہ کو حذف کیا گیا ہے، لام کے بدلے میں "تاء" کو ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مراد معبودان باطلہ ہیں یا جن و انس میں سے شیاطین مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے روکتے ہیں۔

۴؎ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے راہنمائی کی اس کے مطابق اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان جیسا چاہئے، اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک رسول اللہ ﷺ کی تصدیق اور ان سے ہدایت نہ لی جائے۔

۵؎ یعنی اپنے آپ سے پکڑنے کا مطالبہ کیا۔ مضبوط رسی کو یہ حق کو مضبوطی سے پکڑنے والے سے مجاز ہے جو ٹوٹتی نہیں جو آپ انہیں دعوت دیتے ہیں، آپ کے اقوال اور ان کے اقوال کو وہ جانتا ہے، آپ جو ان پر حرص رکھتے ہیں اور سب کی نیتوں کو وہ جانتا ہے۔ اس میں اعمال اور نیتوں کو صحیح کرنے پر ابھارنا اور کفر و نفاق پر دھمکی دینا ہے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾

"اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا ۱؎ نکال لے جاتا ہے ۲؎ انہیں اندھیروں سے ۳؎ نور کی طرف ۴؎ اور جنھوں نے کفر کیا ان کے ساتھی شیطان ہیں ۵؎ نکال لے جاتے ہیں انہیں نور سے ۶؎ اندھیروں کی طرف ۷؎ یہی لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ ۸؎"

۱؎ ولی سے مراد محبت کرنے والا اور ان کے امور کا والی۔ آمنوا سے مراد جس نے ایمان کا ارادہ کیا۔

۲؎ اللہ اپنی ہدایت اور توفیق کے ساتھ نکالتا ہے۔

۳؎ جہالت، خواہشات نفسانی کی اتباع، وساوس اور شبہات کو قبول کرنے کی تاریکیاں جو کفر کی طرف لے جاتی ہیں۔

(۱) القلب یعنی ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف رکھنا۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 582 (العلمیہ)

ہے ایسی ہدایت کی طرف جو ایمان تک پہنچانے والی ہے۔ واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قرآن حکیم میں جہاں بھی ظلمت اور نور آیا ہے اس سے مراد کفر و ایمان ہے، سوائے سورۃ انعام کے، فرمایا "بنائے تاریکیاں اور نور" کیونکہ یہاں رات اور دن مراد ہے (1) یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایمان وہبی امر ہے اور جملہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے یا خبر میں جو ضمیر پوشیدہ ہے اس سے یہ حال بن رہا ہے یا اسم موصول سے حال ہے یا دونوں سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے جو ولایت کی وضاحت یا اس کا اثبات کر رہا ہے۔

ے یہاں طاغوت سے مراد جن وانس کے شیاطین ہیں۔ انہیں میں سے کعب بن اشرف، حیی بن اخطب اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ تھے یا خواہشات اور شیاطین اور ان کے علاوہ جو چیزیں گمراہی کا باعث ہیں وہ مراد ہیں۔ یہ ان کے گمان کے مطابق ان کے امور کے نگہبان اور ان سے محبت کرنے والے ہیں جبکہ حقیقت میں یہ ان کے دشمن ہیں۔

ے یہاں نور سے مراد اصل فطرت ہے، جس طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث طیبہ میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر بچے کو فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے، اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بناتے ہیں، متفق علیہ (2) ابن جریر نے عبدہ بن ابی لبابہ سے روایت کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے جب حضور ﷺ تشریف لائے تو آپ کا انکار کر دیا۔ (3)

ے ظلمات سے مراد شکوک و شبہات، شہوات میں انہماک اور استعداد کا فساد ہے جو کفر تک لے جاتا ہے۔ یہاں فعل کی نسبت طاغوت کی طرف کرنا ایسے ہی ہے جیسے فعل کی نسبت سبب کی طرف کی جائے۔ کسب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تعلق اور اس کے ارادہ سے انکار نہیں کرتا۔ طاغوت مذکر، مؤنث اور واحد جمع ہر طرح استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ ؕ (النساء: ۶۰) وہ ارادہ کرتے ہیں کہ طاغوت کے پاس فیصلہ لے جائیں جبکہ انہیں اس کے انکار کا حکم دیا گیا تھا اور فرمایا: وَ الَّذِیۡنَ اجۡتَنَبُوا الطَّاغُوۡتَ اَنۡ یَّعۡبُدُوۡہَا جنہوں نے طاغوت کی عبادت کرنے سے اجتناب کیا۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ وہ قوم ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائی اور وہ قوم ہے جس نے حضور ﷺ کا انکار کیا جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا تھا وہ آپ ﷺ پر ایمان لے آئے اور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، انہوں نے حضور ﷺ کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ابن منذر، طبرانی نے کبیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اس قوم کے بارے میں نازل ہوئی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو آپ پر ایمان لے آئے، جب حضور ﷺ کو مبعوث کیا گیا تو اس قوم نے انکار کر دیا۔ (4)

ے اس میں وعید اور تحذیر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے مومنین کے ساتھ وعدہ کا مقابلہ میں ذکر نہیں یہ مومنین کی شان کو بیان کرنے کے لئے ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اپنے ضمن میں مومنوں کا وعدہ لئے ہوئے ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡ حَآجَّ اِبۡرٰہٖمَ فِیۡ رَبِّہٖۤ اَنۡ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الۡمُلۡکَ ۘ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ رَبِّیَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ ؕ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاۡتِیۡ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 363 (فکر) 2۔ صحیح بخاری، 1292 (ابن کثیر)
3۔ تفسیر طبری، جلد 3، 315 (الامیریہ) 4۔ تفسیر طبری، جلد 3 صفحہ 15 (الامیریہ)

بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ﴿٢٥٨﴾

"کیا نہ دیکھا آپ نے (اے حبیب) اسے جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں ؎ا اس وجہ سے کہ دی تھی اسے اللہ تعالیٰ نے بادشاہی ؎۲ جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے ؎۳ (اسے) کہ میرا رب وہ ہے ؎۴ جو جلاتا ہے اور مارتا ہے ؎۵ اس نے کہا میں بھی جلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں ؎۶ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے بیجے تو تو نکال لا اسے مغرب سے ؎۸ (یہ سن کر) ہوش اڑ گئے اس کافر کے ؎۹ اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو ؎۱۰"

؎ا نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے گفتگو میں جو استدلال کیا اس پر اور اس کی حماقت پر تعجب کا اظہار ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے یہ پہلا حاکم ہے جس نے اپنے سر پر تاج رکھا، زمین میں تجبر کیا اور رب ہونے کا دعویٰ کیا۔

؎۲ اس نے اس لئے سرکشی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ملک عطا کیا یعنی اس کی حجت بازی بادشاہت کے تکبر اور اپنی سرکشی کی وجہ سے تھی یا حجت بازی کو بادشاہت عطا کرنے کی طرف منسوب کرنا عکس کے طریقہ پر ہے یعنی اس پر فرض تو یہ تھا کہ وہ شکر کرتا لیکن اس نے الٹ کام کیا، جس طرح یہ قول کیا جاتا ہے تو مجھ سے اس لئے دشمنی کرتا ہے کہ میں نے تجھ پر احسان کیا۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بادشاہ کرنے کے وقت اس نے حجت بازی کی۔ معتزلہ نے جو یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کافر کو بادشاہت عطا کرنا منع ہے اس کے خلاف یہ آیت دلیل ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا پوری زمین کے صرف چار حکمران ہوئے دو مومن اور دو کافر مسلمان سلیمان اور ذوالقرنین اور کافر نمرود اور بخت نصر۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑا تو نمرود نے آپ کو قید کر دیا پھر آپ کو نکالا تا کہ آپ کو جلا دے تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا آپ کا وہ رب کون ہے؟ جس کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا یہ سوال و جواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال لئے کے بعد ہوا لوگ قحط کا شکار ہو گئے۔ وہ نمرود کے پاس خوراک لینے کے لئے آتے۔ نمرود کے پاس جب کوئی آدمی آتا تو وہ پوچھتا تیرا رب کون ہے اگر آدمی کہتا تو (میرا رب) ہے تو وہ خوراک دے دیتا۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے تو اس نے پوچھا آپ کا رب کون ہے؟ تو آپ نے جواب دیا میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت عطا کرتا ہے۔ تو نمرود نے آپ سے بحث و تمحیص کی اور کوئی چیز عطا نہ کی۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام واپس آ گئے اور ریت کے ایک ڈھیر پر سے گزرے گھر والوں کو مطمئن کرنے کے لئے کچھ ریت اپنے سامان میں رکھ لی جب گھر پہنچے اپنا سامان رکھا اور سو گئے۔ آپ کی زوجہ سامان کی طرف گئیں، اسے کھولا تو وہ بہترین کھانے کی چیزیں تھیں۔ زوجہ نے اس میں سے آپ کے لئے کھانا تیار کیا اور آپ کو پیش کر دیا۔ آپ نے پوچھا یہ کھانا کہاں سے آیا؟ انہوں نے عرض کی اسی میں سے جو آپ لائے تھے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی۔

؎۳ یہ اٰتٰہُ اُحْیٖ وَاُمِیْتُ کی ظرف ہے اور فعل حاج کا بیان ہے یا سوال مقدر کے جواب میں جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یوں کہا گیا اس نے کیسے بحث کی؟ یہ ظرف حاج فعل کے متعلق ہے اور ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ اس کا بیان ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔ یہ ظرف ان اٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ میں مصدر، وقت کے معنی میں ہو تو اس کا بدل ہوگا۔

؎ حمزہ نے وقف اور وصل دونوں صورتوں میں "یاء" کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، اسی طرح رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ، عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ، قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ، وَاٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ، وَمَسَّنِیَ الضُّرُّ، وَعِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ، وَعِبَادِیَ الشَّکُوْرُ، وَمَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ، وَاِنْ اَرَادَنِیَ اللّٰهُ اور اَنْ اَهْلَکَنِیَ اللّٰهُ۔ ابن عامر اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے لِعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اور ابن عامر نے اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ میں موافقت کی ہے۔ دوسرے قراء نے تمام میں زبر پڑھی ہے۔

؎ نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جو یہ سوال کیا تیرا رب کون ہے جس کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے ساتھ اسے جواب دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے واجب الوجود صانع کے موجود ہونے پر ایسے آثار سے استدلال کیا جو کائنات میں مشاہدہ کیے جاتے ہیں۔ نمرود شائد دھریہ تھا، جس طرح دوسرے دھریے کائنات کی چیزوں کو حادثہ کی پیداوار سمجھتے تھے، نمرود کا نظریہ بھی یہی تھا، وہ یہ بھی گمان کرتا تھا کہ ذوالعقول اپنے افعال کے خود خالق ہوتے ہیں جس طرح معتزلہ اور رافضیوں کا نقطہ نظر ہے۔ اس نے دو آدمیوں کو بلایا ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا۔

؎ نمرود نے کہا میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، الف جب ہمزہ متحرکہ کے ساتھ ملا ہو تو اہل مدینہ الف کو مد کے ساتھ پڑھتے ہیں باقی قاری الف کو حذف کر دیتے ہیں اور الف پر وقف کرتے ہیں (1)۔ جب حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عام وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے استدلال میں اس کی غباوت کو دیکھا تو آپ نے بعد والا کلام کیا۔

؎ یعنی اللہ تعالیٰ اسے مغرب سے لانے پر بھی قادر ہے یا جس طرح وہ چاہے اس پر قادر ہے۔

؎ اگر تو گمان کرتا ہے کہ تو جو چاہے اس کے کرنے پر قادر ہے تو تو سورج کو مغرب سے طلوع کیونکہ تمام ممکنات تخلیق میں برابر ہیں۔

؎ یعنی وہ متحیر اور دہشت زدہ ہو گیا اور لاجواب ہو گیا۔ جب نمرود نے یہ دیکھا کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب سے سورج مغرب سے لانے کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ سورج کو مغرب سے اسی طرح لائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر آگ کو ٹھنڈک اور سلامتی بنا دیا۔

؎ اگر وہ تمام معجزات بھی دیکھ لیں، یہاں تک کہ وہ عذاب الیم کو دیکھ لیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

"یا (کیا نہ دیکھا) اس شخص کو جو گزرا ایک بستی پر؎ دراں حالیکہ وہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں کے بل؎ کہنے لگے کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد؎ سو مردہ رکھا اسے اللہ تعالیٰ نے سو سال تک؎ پھر زندہ کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 365 (فکر)

اسے ۶ے فرمایا کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا ۱ے اس نے عرض کی میں ٹھہرا ہونگا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ۷ے اللہ نے فرمایا نہیں بلکہ ٹھہرا رہا تو سو سال اب (ذرا) دیکھ اپنے کھانے اور اپنے پینے (کے سامان) کی طرف یہ باسی نہیں ہوا ۸ے اور دیکھ اپنے گدھے کی طرف ۹ے اور یہ سب اس لئے کہ ہم بنائیں تجھے نشان لوگوں کے لئے ۱۰ے اور دیکھ ان ہڈیوں کو ۱۱ے کہ ہم کیسے جوڑتے ہیں انہیں ۱۲ے پھر (کیسے) ہم پہناتے ہیں انہیں گوشت ۱۳ے پھر جب حقیقت روشن ہو گئی اس کے لئے ۱۴ے (تو) اس نے کہا میں جان گیا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۱۵ے"

ا۔ قریۃ سے مراد بیت المقدس یا ہرقل کا عبادت خانہ ہے۔ اس قصہ کا ہم عنقریب ذکر کریں گے۔ اس میں کاف تشبیہ زائدہ ہے، اسم موصول الذی حاج پر معطوف ہے۔ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ گزرنے والے حضرت ارمیاء یا حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام تھے۔ حاکم نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسحٰق بن بشیر رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن سلام اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے کہ وہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے(1) مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ گزرنے والا ایک کافر تھا جسے موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر شک تھا(2) لیکن مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ کافر اس عزت کا مستحق نہیں۔ اگر یہ کہا جائے جب اس نے موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے کا منظر دیکھا تو وہ ایمان لے آیا ہم کہیں گے۔ یہ ایمان بالغیب نہیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان دونوں قصوں کو اکٹھے ذکر کیا، اس لئے کہ دونوں تعجب انگیز ہیں اگرچہ ایک میں دعویٰ ربوبیت نہیں، جو شخص ہر لحہ اپنے عجز کو دیکھتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے موت کے بعد حیات کا تصور زیادہ تعجب کا باعث ہوگا، جبکہ یہ عام ہے جس طرح تم مشاہدہ کرتے ہو کہ نطفہ انسان بن جاتا ہے، بیج درخت بن جاتا ہے وغیرہ۔

۲ے اس ویران (بستی) کی دیواریں گری ہوئی تھیں، یعنی پہلے ان کے چھت گرے پھر دیواریں گریں۔

۳ے یہ کلام انہوں نے اس کے زندہ کرنے کی طلب اور تمنی کے طور پر کی، کیونکہ عادۃً اس کا زندہ کرنا بعید ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے آپ کو اس مقام سے فروتر جانتے تھے کہ ان کی دعا قبول ہوگی۔ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ سے جو واقعہ نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارمیاء علیہ السلام کو ناشیہ بن اموص جو بنی اسرائیل کا بادشاہ تھا، کے پاس بھیجا کہ وہ اپنے معاملہ کو درست کرے وہ ایک نیک حاکم تھا۔ حضرت ارمیاء علیہ السلام اس کے پاس اللہ تعالیٰ کے احکام لاتے بنی اسرائیل میں گناہ بہت زیادہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ارمیاء علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی میں انہیں آزمائش میں ڈالوں گا، ایک جابر مسلط کروں گا اور ان کی اکثریت کو ہلاک کر دوں گا۔ حضرت ارمیاء علیہ السلام رونے لگے، اللہ تعالیٰ نے وحی کی میں انہیں اس وقت تک ہلاک نہ کروں گا جب تک تو نہ کہے گا تو حضرت ارمیاء علیہ السلام خوش ہو گئے۔ بنی اسرائیل تین سال تک اسی طرح رہے ان میں نافرمانی اور سرکشی کا اضافہ ہی ہوتا گیا۔ جب وقت مقررہ آ چکا بادشاہ نے انہیں توبہ کرنے کو کہا۔ انہوں نے توبہ نہ کی۔ بخت نصر اپنے لاتعداد لشکر کے ساتھ بابل سے بیت المقدس کی طرف چلا۔ بنی اسرائیل کا بادشاہ خوفزدہ ہو گیا۔ حضرت ارمیاء علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ جو وعدہ کیا ہے مجھے اس پر اعتماد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بنی اسرائیل کے آدمی کی شکل میں حضرت ارمیاء علیہ السلام کے پاس بھیجا۔ عرض کی میں آپ سے اپنے اہل کے بارے فتویٰ لینا چاہتا ہوں، میں ان کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک کرتا ہوں، وہ میرے ساتھ مزید ناراض ہوتے

1۔ مستدرک حاکم: 3115 (علمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 366 (فکر)

ہیں فرمایا تو احسان جاری رکھ، ان سے صلہ رحمی کر، تجھے بھلائی کی بشارت ہے۔ پھر چند دن کے بعد فرشتہ اسی انسان کی صورت میں آیا اور پہلے کی طرح اپنے اہل کے بارے گزارش کی۔ حضرت ارمیاء علیہ السلام نے بھی اسے سابقہ جواب دیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد جب بخت نصر نے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت ارمیاء علیہ السلام بیت المقدس کی دیوار پر بیٹھے تھے اور بنی اسرائیل کا بادشاہ آپ سے کہہ رہا تھا اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام سے جو وعدہ کیا تھا وہ کہاں ہے؟ وہی فرشتہ اسی انسان کی صورت میں حاضر ہوا اور اپنے گھر والوں کے بارے شکایت کی۔ حضرت ارمیاء علیہ السلام نے فرمایا کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ وہ اس چیز سے رک جائیں جس میں وہ منہمک تھے۔ فرشتے نے عرض کی اے اللہ کے نبی آج تک مجھے ان کی طرف سے جو تکلیفیں پہنچیں میں نے ان پر صبر کیا۔ انہوں نے اب ایک ایسا عمل کیا جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ پس میں اللہ تعالیٰ کے لئے ان پر غضبناک ہوا۔ اب میں آپ کو اس اللہ کا واسطہ دیتا ہوں جس نے تجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا کہ تو ان کے حق میں بددعا کرے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کر دے۔ تو حضرت ارمیاء علیہ السلام نے یوں دعا کی اے آسمانوں اور زمینوں کے مالک اگر انہوں نے ایسا عمل کیا ہے جس پر تو خوش نہیں تو انہیں ہلاک کر دے۔ تو اللہ تعالیٰ نے بجلی بھیجی جس سے قربانی کی جگہ جل گئی اور ساتوں دروازے زمین میں دھنس گئے۔ تو حضرت ارمیاء علیہ السلام یوں گویا ہوئے اے میرے رب تیرا وعدہ کہاں ہے؟ تو ندا آئی انہیں یہ عذاب آپ کی دعا سے ہی تو آیا ہے۔ تو حضرت ارمیاء علیہ السلام کو اس وقت علم ہوا کہ وہ سائل تو اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا تھا۔ تو حضرت ارمیاء علیہ السلام وحشی جانوروں کے ساتھ جا ملے۔ بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ و برباد کر دیا، شام کو روند ڈالا، بنی اسرائیل کو قتل کیا اور انہیں قیدی بنا لیا۔ یہ وہ پہلا عذاب تھا جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ظلم کے باعث ان پر نازل کیا۔ جب بخت نصر اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد بابل کی طرف لوٹا تو حضرت ارمیاء علیہ السلام ایک دراز گوش پر سوار ہو کر بیت المقدس آئے۔ آپ علیہ السلام کے پاس انگوروں کا رس مشکیزہ میں اور ایک ٹوکری میں انجیر تھا۔ جب آپ علیہ السلام بیت المقدس پہنچے۔ اس کی تباہی و بربادی کو دیکھا، عرض کی اللہ تعالیٰ انہیں موت کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟ یہاں انّیٰ متیٰ کے معنی میں ہو کر ظرف ہے یا کیف کے معنی میں ہو کر حال ہے۔ پھر حضرت ارمیاء علیہ السلام نے اپنی سواری رسی کے ساتھ باندھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند کو مسلط کر دیا۔

؎ سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن اور ابن ابی حاتم نے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ وہ میت کی حیثیت سے سو سال تک یوں ہی رہے۔ آپ علیہ السلام کا دراز گوش، انگور کا رس اور انجیر آپ علیہ السلام کے پاس ہی رہے، اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کو انہیں دیکھنے سے روک دیا۔ پس کوئی آنکھ نہ دیکھ سکی جب ان کی موت کو ستر سال (۱) گزر چکے تو اللہ تعالیٰ نے فارس کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کی طرف ایک فرشتہ بھیجا بادشاہ کو نوشک کہتے۔ فرشتہ نے بادشاہ سے کہا اللہ تعالیٰ تجھے حکم دیتا ہے کہ تو بیت المقدس کو آباد کرے، یہاں تک کہ وہ پہلے کی طرح آباد ہو جائے۔ وہ اس کی تعمیر کرانے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو ایک مچھر کے ذریعے ہلاک کر دیا، وہ مچھر اس کے دماغ میں داخل ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے باقی ماندہ اسرائیلوں کو نجات عطا فرمائی اور سب کو بیت المقدس اور اس کے گرد و گرد کے علاقوں میں لوٹا دیا۔ اب ان اسرائیلوں نے بیت المقدس کی تیس سال تک تعمیر کی، یہاں تک کہ وہ پہلے سے بھی خوبصورت ہو گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ارمیاء علیہ السلام کو زندہ کیا۔

؎ ان کی بعثت سورج کے غروب ہونے سے پہلے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ ان کی طرف بھیجا۔

(۱) یا سو سال

۶ فرشتے نے آپ علیہ السلام سے پوچھا آپ علیہ السلام کتنے عرصہ اس حال میں رہے، جب حضرت ارمیاء علیہ السلام نے گمان کیا کہ جس دن وہ سوئے تھے اس دن کا سورج غروب ہو چکا تھا۔

۷ تو کہا میں ایک دن اس حالت میں رہا پھر جب سورج کی طرف متوجہ ہوئے تو سورج کو باقی دیکھا تو کہا یا دن کا کچھ حصہ تو فرشتے نے کہا۔

۸ بلکہ تم تو سو سال اس حالت میں رہے اپنے کھانے کو دیکھو، یعنی انجیر اور انگور کا رس جو وہ متغیر نہیں ہوا۔ انجیر کی حالت یہ تھی گویا ابھی اسے درخت سے کاٹا گیا ہے۔ انگور کا رس یوں تازہ تھا گویا ابھی اسے نچوڑا گیا ہے۔ کسائی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے گویا اس پر سالوں کا گزر نہیں ہوا۔ حمزہ، کسائی، اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے وصل کی صورت میں لم یتسنّ "ہ" کے بغیر اور وقف کی صورت میں ہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہی صورت "فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ" کی ہے۔ باقی قراء نے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں ہ کے ساتھ پڑھا ہے، جس نے وصل کی صورت میں ہ کو حذف کیا ہے اس نے اسے زائدہ صلہ بنایا ہے اور جس نے ثابت رکھا ہے اسے اصلیہ بنایا ہے۔ علماء کہتے ہیں یہ لفظ سنہ سے مشتق ہے، اگر اس کا لام کلمہ ہا ہو تو یہ اصلیہ ہوگا تو اس کی اصل سنھۃ ہوگی کیونکہ اس کی تصغیر سُنَیْھَۃ آتی ہے۔ اس سے مسانھۃ کا لفظ بھی آتا ہے اگر اس کا لام کلمہ واؤ ہو تو ھاء سکتہ کے لئے ہوگی تو واؤ کو متحرک ماقبل مفتوح ہونے کی بناء پر الف سے بدل دیا گیا، پھر حالت جزمی میں الف کو حذف کر دیا اور وقف میں ھاء کا اضافہ کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کی اصل لَمْ يَتَسَنَّنْ ہے جو حماء مسنون سے مشتق ہے، اس کے تیسرے نون کو حرف علت سے بدل دیا، جس طرح دسّٰها میں تیسری سین کو حرف علت سے بدل دیا۔ ضمیر واحد اس لئے ذکر کی کیونکہ طعام اور شراب ایک جنس سے تعلق رکھتے ہیں۔

۹ اپنے دراز گوش کو دیکھو۔ آپ علیہ السلام نے اسے دیکھا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آپ علیہ السلام نے اسے اسی طرح کھڑا دیکھا جس طرح آپ نے اسے باندھا تھا کہ اس نے سو سال تک کچھ کھایا پیا نہیں، اس کے گلے میں رسی بالکل نئی دیکھی جس میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ آپ علیہ السلام نے اپنی سواری کو مردہ حالت میں پایا جس کی ہڈیاں گل سڑ چکی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی تو وہ میدانی اور پہاڑی علاقے سے اس کی ہڈیاں لے آئی۔ جنہیں پرندے اور درندے دور لے گئے تھے تو وہ سب جمع ہو گئیں۔ میری رائے میں دوسرا غالب قول یہ ہے اس کے اوپر انظر کے کلمہ کا تکرار دلالت کرتا ہے اگر دراز گوش پہلی حالت پر ہی باقی رہتا جس طرح طعام اور شراب تھا تو کلام یوں ہوتی فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ وَحِمَارِكَ۔

۱۰ موت کے بعد دوبارہ زندگی پر اسے لوگوں کے لئے نشانی بنا دیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں واؤ زائدہ ہے۔ فراء نے کہا واؤ اس لئے داخل ہوئی کہ اس بات پر دلالت کرے کہ یہ کلام فعل مقدر کے متعلق ہے، تو پھر کلام یوں ہوگی وَفَعَلْنَا ذٰلِكَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً۔

۱۱ یعنی حمار کی ہڈیوں کو دیکھو۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے ہلاک ہوا ہو۔ اکثر مفسرین نے یہی قول کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد ان کی اپنی ہڈیاں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کی آنکھ اور سر کو زندہ کیا جبکہ آپ کا سارا جسم مردہ تھا، وہ سفید بکھری ہوئی ہڈیاں بن چکا تھا۔ اس قول کو حضور ﷺ کا یہ ارشاد رد کر دیتا ہے۔ "اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے اجساد کو حرام کر دیا ہے۔" (1)

۱۲ حجاز اور بصرہ کے قراء نے اسے نُنْشِرُهَا پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے ہم اسے زندہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ثُمَّ إِذَا شَآءَ

1۔ مسند احمد، جلد 4 صفحہ 8 (صادر)، کنز العمال: 23301 (التراث الاسلامی)

اَنْشَرَهٗ پھر جب وہ چاہے گا اسے زندہ کرے گا اور وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ اور اس کی طرف اٹھنا ہے۔ دوسرے قراء نے اسے "ز" کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہم اسے زمین سے اٹھائیں گے، بعض کو بعض سے ملائیں گے۔ کیف ترکیب کلام میں ننشزھا سے محل نصب میں ہے اور مکمل جملہ عظام سے حال ہے۔

۱۳ جب اللہ تعالیٰ نے ہڈیوں پر گوشت اور خون چڑھا دیا تو وہ زندہ ہو گیا۔ یا وہ ایسا گدھا ہو گیا جس میں روح نہیں تھی۔ فرشتے نے اس میں پھونک ماری تو گدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آواز نکالی۔ آیت کریمہ میں تقدیم اور تاخیر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے "فرمایا بلکہ تو سو سال تک رہا ہم نے تجھے موت عطا کی، پھر ہم نے تمہیں زندگی دی۔ پس آپ علیہ السلام اپنے کھانے اور مشروب کو دیکھیں وہ خراب نہیں ہوا، اپنے گدھے کو دیکھو، اور ہڈیوں کو دیکھو ہم کیسے انہیں زندہ کر دیتے ہیں، پھر ہم اسے گوشت پہناتے ہیں۔ ہم نے یہ اس لئے کیا تا کہ ہم آپ کو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دیں۔

۱۴ جو ان کے ساتھ ہوا جب وہ واضح ہو گیا۔

۱۵ تو اس بندے نے کہا میں جانتا ہوں اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جمہور قراء نے اَعْلَمُ واحد متکلم فعل مضارع کا صیغہ پڑھا ہے۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے امر کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں قائل فرشتہ یا اللہ تعالیٰ کی ذات ہو گی یا وہ بندہ اپنے آپ سے خطاب کر رہا ہو گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے بخت نصر نے جب بیت المقدس کو تباہ و برباد کیا اور بنی اسرائیل کے قیدیوں کے ساتھ بابل آیا ان قیدیوں میں حضرت عزیر، حضرت دانیال اور حضرت داؤد علیہم السلام کے خاندان کے لوگ بھی تھے۔ جب حضرت عزیر علیہ السلام کو بابل سے نجات ملی تو اپنے گدھے پر سوار ہو کر چل پڑے، یہاں تک کہ دجلہ کے کنارے شام کے بادشاہ کے عبادت خانہ میں اترے۔ پوری بستی میں پھرے کسی ایک کو بھی نہ دیکھا، اس کے تمام درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ آپ علیہ السلام نے پھل کھائے، انگوروں کا رس نچوڑ کر پیا، باقی ماندہ پھل اپنی ٹوکری میں رکھا اور باقی ماندہ رس مشکیزہ میں جب آپ علیہ السلام نے بستی کی بربادی اور مکینوں کی ہلاکت کو دیکھا کہا اللہ تعالیٰ ان کی ہلاکت کے بعد انہیں کیسے زندہ کرے گا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کعب رحمۃ اللہ علیہ سے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ، سدی رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اور وہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے، نیز ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو سو سال تک موت عطا کئے رکھی، پھر جب زندہ کیا تو آپ علیہ السلام گدھے پر سوار ہوئے اور اپنے محلّہ میں آئے، آپ علیہ السلام لوگوں اور گھروں کو نہ پہچان سکے، اسی طرح لوگ بھی آپ علیہ السلام کو نہ پہچان سکے۔ آپ علیہ السلام اپنے گمان کے مطابق اپنے گھر آئے۔ وہاں ایک نابینا معذور عورت موجود تھی جس کی عمر ایک سو بیس سال ہو چکی تھی۔ یہ حضرت عزیر علیہ السلام کی لونڈی تھی۔ جب حضرت عزیر علیہ السلام اس کے پاس سے گئے تھے تو اس وقت اس کی عمر بیس سال تھی۔ حضرت عزیر علیہ السلام نے اس سے پوچھا کیا یہ عزیر کا گھر ہے عورت نے جواب دیا جی ہاں۔ عورت نے کہا میں نے تو اتنے عرصہ سے کسی کو عزیر کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا میں عزیر ہوں، مجھے اللہ تعالیٰ نے سو سال تک موت عطا کئے رکھی پھر دوبارہ مجھے زندہ کیا کیونکہ عزیر مستجاب الدعوات تھے۔ عورت نے کہا اگر تم عزیر علیہ السلام ہی ہو تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ میری بینائی واپس کر دے۔ آپ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں پر پھیرا تو اس کی آنکھیں صحیح ہو گئیں۔ آپ علیہ السلام نے اس کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ

کھڑی ہو جا تو وہ تندرست ہو کر کھڑی ہو گئی۔ جب اس نے حضرت عزیر علیہ السلام کو دیکھا تو پہچان گئی۔ اس نے کہا میں گواہی دیتی ہوں کہ تم عزیر ہو، وہ بنی اسرائیل کی طرف گئی جبکہ وہ اپنی مجالس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عزیر علیہ السلام کا بیٹا سو سال کا بوڑھا ہو چکا تھا۔ آپ علیہ السلام کی اولاد میں بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں تھیں۔ جبکہ حضرت عزیر علیہ السلام کے سر اور داڑھی کے بال سیاہ تھے۔ اس عورت نے کہا یہ عزیر علیہ السلام ہیں۔ لوگوں نے اس عورت کی تکذیب کی۔ اس عورت نے کہا میں فلاں عورت ہوں جو تمہاری لونڈی ہے۔ انہوں نے میرے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اللہ تعالیٰ نے میری بینائی لوٹا دی اور میرے پاؤں کو ٹھیک کر دیا۔ ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سو سال تک انہیں موت عطا کئے رکھی پھر دوبارہ اٹھایا تو اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے بیٹے نے کہا ان کے والد کے دونوں کندھوں کے درمیان شامة سوداء (ہلالی شکل کا کالا مسہ) تھا۔ اس نے آپ علیہ السلام کے کندھوں سے کپڑا ہٹایا، وہ عزیر علیہ السلام ہی تھے۔ سدی اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا جب حضرت عزیر علیہ السلام اپنی قوم کی طرف چلے۔ بخت نصر نے تورات کو جلا دیا تھا۔ حضرت عزیر علیہ السلام تورات کے جلنے پر رونے لگے۔ ایک فرشتہ آپ علیہ السلام کے پاس برتن میں پانی لایا، آپ علیہ السلام کو پلایا، تو رات آپ علیہ السلام کے سینے میں ثبت ہو گئی۔ آپ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف لوٹے جبکہ اللہ تعالیٰ نے تورات آپ علیہ السلام کو سکھا دی اور نبی کی حیثیت سے مبعوث کیا۔ فرمایا میں عزیر علیہ السلام ہوں۔ لوگوں نے آپ علیہ السلام کی تصدیق نہ کی۔ آپ علیہ السلام نے حافظہ سے انہیں تورات املاء کرا دی۔ لوگ کہنے لگے تورات کے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں تورات نہیں رکھتا مگر وہ اس کا بیٹا ہو، تو انہوں نے کہا عزیر ابن اللہ۔ اس کا قصہ سورۂ توبہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ۔(1)

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰىؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰـكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًاؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ۠ ﴿۲۶۰﴾

"اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے پروردگار دکھا مجھے کہ تو کیسے زندہ فرماتا ہے مردوں کو ؑ فرمایا اے ابراہیم کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے ؑ عرض کی ایمان تو ہے لیکن (یہ سوال اس لئے ہے) تاکہ مطمئن ہو جائے میرا دل ؑ فرمایا تو پکڑ لے چار پرندے ؑ پھر مانوس کر لے انہیں ؑ اپنے ساتھ ؑ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا ؑ پھر بلا انہیں چلے آئیں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے ؑ اور جان لے یقیناً اللہ تعالیٰ سب پر غالب بڑا دانا ہے ؑ"

ؑ حسن، قتادہ، عطاء خراسانی اور ابن جریج رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا۔ اس سوال کا سبب یہ تھا کہ ساحل پر گدھے کا ایک ڈھانچہ پڑا تھا جب سمندر میں مد (ا) ہوتا تو سمندر کے جانور اسے کھاتے اور جب جزر (ب) ہوتا تو درندے اور پرندے اسے کھاتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے دیکھا تو متعجب ہوئے۔ عرض کی اے رب میں جانتا ہوں کہ تو سمندر، اور خشکی سے جمع کرے گا، مجھے دکھا تو کیسے زندہ فرماتا ہے تاکہ میں اپنی آنکھوں، سے دیکھوں میرے یقین میں اضافہ ہو (2) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ جب نمرود نے کہا میں بھی

(ا،ب) مد و جزر عام اصطلاح ہے جب پانی کناروں کی طرف پھیلتا ہے تو اسے مد کہتے ہیں اور جب سمٹ جاتا ہے تو اسے جزر کہتے ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 73-372 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 74-373 (فکر)

زندہ کرتا ہوں اور موت دیتا ہوں، ایک آدمی کو قتل کرادیا اور ایک کو آزاد کر دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ موت عطا کرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ نمرود نے کہا تو نے خود دیکھا ہے، تو آپ ہاں نہ کہہ سکے۔ اس وقت آپ نے رب سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ اسے مردوں کو زندہ کرنا دکھائے تاکہ بعد میں اگر کوئی کہے کہ تو نے دیکھا ہے تو میں ہاں کہہ سکوں۔ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ موت کا فرشتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ انہیں اس کی بشارت دے۔ فرشتہ نے آپ علیہ السلام کو بشارت دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا اس کی علامت کیا ہے؟ فرشتہ نے کہا اللہ تعالیٰ تیری دعا کو قبول کرے گا اور تیرے سوال کرنے پر مردوں کو زندہ کرے گا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ سوال کیا۔

؎ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تو ایمان نہیں رکھتا کہ میں موت دینے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا جبکہ اسے علم تھا کہ بندوں میں سے یہ سب سے مضبوط ایمان والے ہیں تاکہ یہ جواب اس نے زیادہ جواب دے اور سننے والے اسے جان لیں۔

؎ تاکہ میری بصیرت اور اطمینان قلب میں اضافہ ہو جب میرا مشاہدہ وحی اور استدلال کے ساتھ ملے۔ یا اس کا مفہوم یہ ہے تاکہ میرا دل اس سے مطمئن ہو کہ تو نے مجھے اپنا دوست بنایا اور میری دعا کو قبول کیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے حقدار ہیں۔ جب آپ نے کہا تھا اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى الآیۃ (پروردگار! دکھا مجھے تو کیسے زندہ فرماتا ہے مردوں کو اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے) اور اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے، وہ قوی سہارے کی پناہ میں تھے۔ اگر میں اتنی دیر قید میں رہتا جتنا عرصہ حضرت یوسف قید میں رہے تھے تو میں دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کر لیتا۔ متفق علیہ (1) علماء کی اس مقام پر بحث ہے۔ اسماعیل بن یحییٰ مغربی نے کہا نبی کریم ﷺ نے شک کیا نہ ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی اس قدرت میں شک کیا کہ کیا وہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے؟ انہوں نے شک اس میں کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کی عرضداشت کو شرف قبولیت سے نوازے گا جو انہوں نے عرض کیا؟ اس قول کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ (اے ابراہیم) کیا تم ایمان نہیں رکھتے عرض کی ایمان تو ہے لیکن یہ سوال اس لئے ہے تاکہ مطمئن ہو جائے میرا دل) نہیں کرتا۔ امام ابو سلیمان خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حدیث میں حضور ﷺ کا اپنی ذات یا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر شک کا اعتراف نہیں، بلکہ دونوں سے شک کی نفی ہے۔ اس کا معنی یہ ہے جب میں اس میں شک نہیں کرتا تو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام تو بدرجہ اولیٰ اس میں شک نہیں کرتے۔ حضور ﷺ نے یہ قول تواضع اور کسر نفسی کے طور پر فرمایا یہی مفہوم اس ارشاد کا بھی ہے اگر میں اتنی دیر قید میں رہتا جتنا حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام رہے تو میں دعوت کو قبول کر لیتا۔ اس میں اس بات کی خبر دینا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے سوال شک کی بناء پر نہ تھا، بلکہ مشاہدہ کے ذریعے علم میں زیادتی کے لئے تھے، کیونکہ مشاہدہ ایسی معرفت اور اطمینان عطا کرتا ہے جو استدلال عطا نہیں کرتا (2) حضور ﷺ کا فرمان خبر مشاہدہ جیسی نہیں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ ان کی قوم بچھڑے کی پوجا کرنے لگی ہے لیکن انہوں نے تختیاں نہ پھینکیں مگر جب خود

1۔ صحیح بخاری: 3192 (ابن کثیر)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 375 (الفکر)

دیکھا تو تختیاں پھینک دیں تو وہ ٹوٹ گئیں (1) اسے امام احمد اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے سند صحیح کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے انس رحمۃ اللہ علیہ سے، خطیب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ کا ذکر نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا جب یہ آیت نازل ہوئی، ایک قوم نے کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شک کیا ہمارے نبی نے شک نہیں کیا تو رسول اللہ ﷺ نے تواضع اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مقدم جانتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا(2) میں یہ کہتا ہوں کہ یہ قول اور حدیث کا یہ معنی بیان کرنا ضعیف ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شک کی نفی تو اللہ تعالیٰ کے کلام سے ثابت ہے کیونکہ فرمایا کیوں نہیں لیکن تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شک کیا۔ اس وہم کو دور کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میرے نزدیک سچی بات وہ ہے جو صوفیاء کرام نے کہی، سلوک میں اہل اللہ کے دو مقام ہیں۔ 1۔ مقام عروج وہ صفات بشریہ سے خلاصی اور صفات ملکیہ وقدسیہ اپنانا ہے۔ حضور ﷺ کا یہ ارشاد اس مقام کی وضاحت کرتا ہے جو آپ ﷺ نے وصال کے روزے رکھنے سے منع کرنے پر فرمایا" میں تمہاری طرح نہیں ہوں میں اپنے رب کے ہاں رات گزارتا ہوں، وہی مجھے کھلاتا ہے، وہی مجھے پلاتا ہے"(3) صوفیاء کی اصطلاح میں اسے سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کا نام دیا جاتا ہے۔ 2۔ دوسرا مقام نزول ہے وہ بشری صفات سے مکمل انخلاع کے بعد دوبارہ بشری صفات کو اپنانا ہے۔ یہی مقام تکمیل ہے اور مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینا ہے۔ اسی کو سیر من اللہ باللہ (اللہ تعالیٰ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ سیر) کہتے ہیں۔ مقام نزول کی حکمت یہ ہے کہ فیضان کرنے والے اور فیض پانے والے کے درمیان کوئی مناسبت ہونی چاہئے، تاکہ صبغ والصباغ (1) کے طریقہ پر استفاضہ آسان ہو جائے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے رسول انسانوں کی طرف مبعوث فرمائے اور عوام کے لئے اللہ تعالیٰ سے فیض پانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ باہم مناسبت نہیں، اللہ تعالیٰ تو جہاں بھر سے غنی ہے اور نہ ہی فرشتوں سے رسول مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا" فرما دیجئے اگر زمین میں فرشتے ہوتے چلتے پھرتے تو ہم ان پر بھیج دیتے آسمان سے فرشتے رسول" اور فرمایا اگر ہم رسول فرشتہ بناتے تو اسے بھی انسان ہی بناتے اور ہم ان پر معاملہ اسی طرح مشتبہ کرتے جس طرح وہ اب شبہ میں مبتلا ہیں۔ جب کبھی کسی انسان کا نزول مکمل ہوا تو اس کی دعوت بھی زیادہ فائدہ مند اور مکمل ہوئی جس طرح تیر پھینکنے والا ہدف سے بلند جگہ پر ہو تو اکثر اس کا تیر نشانہ پر نہیں لگتا۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی قدس سرہ العزیز نے فرمایا لوگوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا اس لئے انکار کیا کیونکہ دونوں میں بہت فرق تھا اور حضور ﷺ کی دعوت کو اس لئے قبول کیا کیونکہ داعی اور مدعوین میں مناسبت تھی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب لوگوں کی استعداد انتہائی پست تھی اور حضرت نوح علیہ السلام مقام عروج پر فائز تھے تو دونوں میں باہمی فرق کی وجہ سے عوام آپ علیہ السلام سے اثر قبول نہ کر سکے اور جب حضور ﷺ نزول میں انتہائی مقام تک پہنچے تو باہم تعلق قائم ہونے کی وجہ سے لوگوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول کیا۔ اے قاری! جب تو نے یہ سن لیا تو جان لے عارف معرفت تامہ رکھتا ہے، کبھی کبھی اس پر آثار نزول ظاہر ہوتے ہیں، اس وقت وہ عوام کی طرح اور اسباب سے متعلق ہوتا ہے۔ اسی مقام کی یہ واقعات وضاحت کرتے ہیں کہ حضور

(1) رنگ چڑھانا اور رنگ چڑھنا۔

1۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 271 (صادر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 375 (فکر)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 263 (وزارت تعلیم)

ﷺ نے جنگ میں دولوہے کی زرہیں زیب تن فرمائیں، مدینہ طیبہ کے اردگرد خندق کھودی۔ اسی مقام پر عارف یقین کی زیادتی اور اطمینان قلب کے لئے استدلال کو لازم پکڑتا ہے، اسی مقام کی طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ اور حضرت لوط علیہ السلام کا قصہ اشارہ کرتا ہے جب انہوں نے کہا "لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِیْدٍ" ترجمہ: (اے کاش! میرے پاس بھی تمہارے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں پناہ ہی لے سکتا کسی مضبوط سہارے کی)۔ حضور ﷺ نے یقین کی زیادتی کی طلب کو مجازاً شک سے تعبیر کیا کیونکہ دونوں میں صوری مشابہت ہے اور اپنے مقام نزول کے متعلق ان الفاظ سے خبر دی: لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِیْدٍ یعنی ہمارا مقام نزول حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام نزول سے بڑھ کر ہے، ہم یقین کی زیادتی کے طلب کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضور ﷺ کا نزول حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نزول سے بڑھ کر ہے کیونکہ آپ ﷺ تمام بنی نوع انسان کی طرف مبعوث کئے گئے۔ جس طرح حضور ﷺ کا مقام عروج بھی تمام انبیاء ورسل کے مقام عروج سے بڑھ کر ہے۔ آپ ﷺ قاب قوسین اوادنی کے مقام پر فائز تھے۔ آپ ﷺ پر کمالات کی تمام جہتیں ختم ہوتی ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد "رَحِمَ اللّٰهُ لُوْطًا لَقَدْ كَانَ یَاْوِیْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِیْدٍ" یہ آپ ﷺ کا بھی مقام نزول تھا۔ یہ حضرت لوط علیہ السلام کے لئے مدح ہے اور حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد "لَوْ لَبِثْتُ فِی السِّجْنِ طُوْلَ مَا لَبِثَ یُوْسُفُ لَاَجَبْتُ الدَّاعِیَ" یہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضور ﷺ کا مقام نزول حضرت یوسف علیہ السلام کے مقام نزول سے بڑھ کر تھا۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کا مقام نزول حضور ﷺ کے مقام نزول جتنا ہوتا تو وہ دعوت کو قبول کر لیتے۔

ﷺ فرمایا چار پرندے پکڑو۔ الطیر مصدر ہے۔ مصدر کے ساتھ نام رکھا گیا ہے، یا طائر کی جمع ہے جس طرح صاحب کی جمع صحب آتی ہے۔ حضرات مجاہد، عطاء بن ابی رباح اور ابن جریج رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ آپ علیہ السلام نے چار پرندے پکڑے مور، مرغ، کبوتر اور کوا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے کبوتر کی جگہ گدھ منقول ہے۔ عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کی طرف وحی کی ایک سبز بطخ، سیاہ کوا، سفید کبوتر اور سرخ مرغ پکڑو(1) میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے چار پرندے پکڑنے کا اس لئے حکم دیا کیونکہ انسان بھی چار اخلاط سے مل کر بنا ہے جو چار عناصر سے بنتے ہیں، سرخ مرغ خون، سفید کبوتر بلغم، سیاہ کوا سوداء اور سبز بطخ صفراء کی حکایت بیان کرتا ہے۔ ان چار پرندوں کو مارنے کے بعد زندہ کرنا اس پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے اجزاء کو مارنے کے بعد زندہ کر سکتا ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نفس کو ابدی زندگی عطا کرنا، یہ شہوات کو مارنے کے ساتھ ہی حاصل ہوتا ہے۔ ظاہری سجاوٹ اور خواہشات کی محبت مور کی صفات میں سے ہیں، حملہ کرنے اور رعب میں مرغ مشہور ہے، نفس کی خست اور آرزوں کی طوالت یہ کوے کی صفت ہے، اپنے آپ کو بلند سمجھنا اور خواہشات کی طرف جلدی کرنا یہ کبوتر کی صفت ہے(2) میں کہتا ہوں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام مقام نزول اور مقام دعوت پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو راہنمائی کے راستہ سے آگاہ کیا یعنی مرید کو فناء بقاء کو عطا کرنا ان پرندوں کو پکڑنا اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنا سلوک وفناء سے آگاہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہیں بلانا، جذب اِلَی اللّٰه اور بقاء سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ کلمات اہل بصیرت کے لئے ہیں، ان کی تفسیر کی گنجائش نہیں۔ واللہ اعلم۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 76-275 (فکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 591 (علمیہ)

۵ ابوجعفر اور حمزہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے صاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہ صار یصیر صیرا سے مشتق ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ فراء نے کہا یا صری یصری سے قلب کیا گیا ہے۔ دوسرے قراء نے صاد کے ضمہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے، اس کا معنی مائل کرنا ہے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی جمع کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے صار یصور جب وہ جمع کرے (1)۔

۶ یہ جمہور کی قرأت کے مطابق صرھن کے متعلق ہے اور حمزہ کی قرأت کے مطابق محذوف کے متعلق ہو کر حال ہوگا محذوف شبہ فعل منضمًا الیک ہے۔

۷ عاصم رحمۃ اللہ علیہ نے ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے جزء کو زاء مضموم اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی یہ لفظ واقع ہوا۔ ابوجعفر رحمۃ اللہ علیہ نے زاء کو مشدد اور بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ باقی قراء نے زاء ساکن اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ پرندوں کو ذبح کریں، ان کے پروں کو اکھیڑ دیں، ان کے پر، خون اور گوشت آپس میں ملا دیں۔ پھر حکم دیا کہ اس کے اجزاء کو پہاڑوں پر رکھ دیں۔ آپ علیہ السلام نے ان کے سات سات ٹکڑے سات پہاڑوں پر رکھے اور ان کے سر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیے۔ اسی طرح ابن جریج اور سدی رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کیا۔ ابن جریر نے ابن اسحاق رحمہما اللہ تعالیٰ کے واسطے سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا کہ آپ علیہ السلام نے ہر پرندے کے چار ٹکڑے کیے اور چار پہاڑوں پر ہر پرندے کا چوتھائی رکھا۔ (2)

۸ انہیں کہو اللہ تعالیٰ کے اذن کے ساتھ آ جاؤ۔ دوڑتے ہوئے جلدی کرتے ہوئے آئیں گے، اڑتے ہوئے یا پیدل چلتے ہوئے۔ آپ علیہ السلام نے انہیں بلایا، ہر قطرہ دوسرے قطرے کے ساتھ جمع ہونے لگا۔ ایک پر دوسرے پر کے ساتھ ملنے لگا، ہر ہڈی اور ٹکڑا دوسری ہڈی اور ٹکڑے کے ساتھ ملنے لگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، یہاں تک کہ ہر جسم سر کے بغیر مکمل ہو گیا۔ پھر وہ دھڑ سروں کی طرف بڑھے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے اذن سے پہلے کی طرح ہو گئے۔

۹ جس چیز کا ارادہ کرے کوئی اسے عاجز نہیں کر سکتا جو کچھ وہ کرتا ہے یا چھوڑتا ہے۔ اس میں حکمت بالغہ کارفرما ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ قصہ میں عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور اس قصہ میں عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ فرمایا ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ارشاد: اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا، ترجمہ: (کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد)۔ یہ تعجب اور استبعاد کے طور پر تھا کیونکہ یہ عادت کے خلاف تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى یہ ایک لطیف حال پر مبنی تھا جس کا حکمت تقاضا کرتی ہے، واللہ اعلم۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت، دعاء میں تضرع اور سوال میں حسن ادب کی اہمیت پر شاہد عادل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسی وقت آسان ترین صورت میں وہ دکھا دیا جس کا ارادہ فرمایا جبکہ حضرت عزیر علیہ السلام کو سو سال تک موت عطا کرنے کے بعد دکھایا۔ (3)

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۱﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 376 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 376 (فکر)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 592 (علمیہ)

"مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں [1] ایسی ہے جیسے ایک دانہ [2] جو اگاتا ہے سات بالیں [3] اور ہر بالی میں سو دانے ہوں [4] اور اللہ تعالیٰ (اس سے بھی) بڑھا دیتا ہے [5] جس کے لئے چاہتا ہے [6] اور اللہ وسیع بخشش والا جاننے والا ہے [7]"

[1] سبیل اللہ سے مراد جہاد یا اس کے علاوہ خیر کے راستے ہیں۔

[2] اس میں مضاف محذوف ہے یا یہ حذف مبتدا میں ہوگا یا خبر میں جیسے مَثَلُ نَفَقَةِ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ كَمَثَلِ حَبَّةٍ يا مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ بَاذِرِ حَبَّةٍ۔

[3] مجاز اً انبات کی نسبت حبة کی طرف کی کیونکہ عادۃً یہی اس کا سبب ہے۔

[4] جس طرح دخن (کنگنی یا جرہ) اور دوسری فصلوں میں ہوتا ہے۔

[5] جتنا دگنا کرنا چاہتا ہے، اسے دگنا کرتا ہے۔

[6] اپنے بندوں میں سے دنیا و آخرت میں جس کے حق میں چاہتا ہے۔

[7] وہ جو فضل و احسان فرماتا ہے اسے تنگ نہیں کرتا، خرچ کرنے والوں کی نیتوں کو جانتا ہے، ان کی نیتوں کے مطابق انہیں بدلہ دیتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾

"جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں [1] پھر جو خرچ کیا اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ دکھ دیتے ہیں [2] انہیں کے لئے ثواب ہے ان کا ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے [3]"

[1] امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چار ہزار درہم صدقہ کے طور پر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کئے۔ عرض کی میرے پاس آٹھ ہزار درہم تھے، میں نے اپنے اور اہل و عیال کے لئے چار ہزار درہم رکھ لئے ہیں اور چار ہزار اللہ تعالیٰ کو قرض دیئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان میں برکت ڈالے جو تو نے اپنے پاس رکھے اور ان میں بھی جو تو نے عطا کئے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غزوہ تبوک میں ایک ہزار اونٹ تمام سامان کے ساتھ پیش کئے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ غزوہ تبوک میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک ہزار دینار لائے، انہیں حضور ﷺ کی گود میں ڈالا۔ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اس میں ہاتھ ڈالتے ہیں اور الٹ پلٹ کرتے ہیں اور فرماتے آج کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کام بھی کرے وہ کام اسے نقصان نہیں دے گا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔ امام احمد نے عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت کی اس میں نزول آیت کا ذکر نہیں۔

[2] انفاق اور احسان جتانے اور اذیت نہ دینے میں جو تفاوت ہے۔ اس کو ذکر کرنے کے لئے ثم کا لفظ ذکر کیا۔ "مَنٌّ" کا معنی ہے جس پر احسان کیا جائے اس پر احسان کو شمار کرنا۔ اذی کا مطلب ہے کہ یہ کہنا کتنے عرصے تک تو سوال کرتا رہے گا کتنا عرصہ تک تو اذیت دیتا رہے گا، یا ایسے آدمی کے پاس احسان کو ذکر کرنا جس کی آگاہی کو وہ پسند نہ کرتا ہو۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 378 (فکر)

عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میرے والد کہتے جب تو کسی آدمی کو کوئی چیز دے اور تو یہ دیکھے کہ تیرا سلام اس پر ثقیل ہے تو اسے سلام نہ کرے۔(1)

۳؎ یہاں فاء ذکر نہیں کی جبکہ مبتدا میں شرط کے معنی پائے جاتے ہیں، اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ وہ اس کے اہل ہیں اگرچہ وہ ایسا نہ کریں تو ان کا کیا حال ہوگا جب وہ ایسا کریں گے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝

"اچھی بات کرنا۱؎ اور (غلطی) معاف کر دینا۲؎ بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے پیچھے دکھ پہنچایا جائے۳؎ اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے بڑے حلم والا ہے۴؎"

۱؎ اچھا کلام اور سائل کو اچھا جواب۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا **قول معروف** کا مفہوم یہ ہے عدم موجودگی میں کسی بھائی کے لئے اچھی دعا کرنا۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دو آدمی جن کے درمیان افتراق اور جدائی ہے ان میں مصالحت کی کوشش کرنا۔(2)

۲؎ اصرار کرنے والے سائل کو اچھی طرح جواب دینے کے ساتھ اس سے صرف نظر کرنا۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا سائل پر اس کی تنگ دستی چھپاتا ہے اور اس کی بے عزتی نہیں کرتا(3) بعض علماء نے فرمایا اچھے جواب کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے بخشش کو پانا۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے کہ مسئول عنہ کو بخش دینا یعنی اسے معذور سمجھنا اور اس کے جواب کو لوگوں پر ظاہر نہ کرنا۔ کلبی اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا **مغفرۃ** سے مراد ظالم کو بخش دینا ہے۔

۳؎ یہ کلام ان دونوں سے خبر ہے۔ نکرہ کو مبتدا بنانا جائز ہے کیونکہ صفت کے ساتھ وہ خاص ہو گیا ہے۔

۴؎ وہ غنی ہے اس سے کہ کوئی احسان جتلائے اور اذیت دے کر خرچ کرے۔ جو آدمی احسان جتلاتا ہے اور اذیت دیتا ہے اس کو جلدی سزا دینے میں حلم سے کام لیتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

"اے ایمان والو مت ضائع کرو اپنے صدقوں کو احسان جتلا کر۱؎ اور دکھ پہنچا کر۲؎ اس آدمی کی طرح۳؎ جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے۴؎ اور یقین نہیں رکھتا اللہ پر اور دن قیامت پر۵؎ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چکنی چٹان ہو جس پر مٹی پڑی ہو۶؎ پھر برسے اس پر زور کی بارش۷؎ اور چھوڑ جائے اسے چٹیل صاف پتھر۸؎ (ریاکار) حاصل نہ کر سکیں گے کچھ بھی۹؎ اس سے جو انہوں نے کمایا۱۰؎ اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کفر اختیار کرنے والوں کو۱۱؎"

۱؎ سائل پر احسان جتلا کر اپنے صدقات کے اجر کو ضائع نہ کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے اللہ تعالیٰ پر احسان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 379 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 379 (فکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 379 (فکر)

جتلا کر۔(1)

۲؎ ان دونوں میں سے ہر ایک کے ساتھ اپنے صدقات کو ضائع نہ کرو۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی احسان جتلانے والا اور والدین کی نافرمانی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا(2) اسے نسائی اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

۳؎ کاف محل نصب میں ہے مفعول مطلق کی حیثیت سے یا حال ہونے کی حیثیت سے، یعنی ریاء کار کی طرح یا اس کی ہم مثل بنتے ہوئے۔

۴؎ لفظ رئاء مفعول لہ حال یا مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے کہ لوگوں کو دکھانے کے لئے، ریاء کاری کرتے ہوئے یا ریاء والا خرچ کرتے ہوئے۔

۵؎ یہ صدقہ کو باطل کرنے کی قید نہیں کیونکہ صدقہ تو ریاء کے ساتھ باطل ہو جاتا ہے، اگرچہ خرچ کرنے والا اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، لیکن یہاں اس کا ذکر اس لئے کیا کہ مومنوں کو تنبیہ کی جائے کہ یہ مومنوں کا کام نہیں، بلکہ یہ منافق کی خصلت ہے۔

۶؎ ریاء کار کی مثال اس ملائم پتھر کی مانند ہے۔ صفوان واحد ہے، اس کی جمع صُفِيّ و صِفِيّ آتی ہے۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے کہ صفوان جمع ہے، اس کی واحد صفوانۃ ہے۔

۷؎ ایسی بارش جس کے موٹے قطرے ہوں۔

۸؎ بالکل ملائم جس پر کوئی مٹی نہ ہو۔

۹؎ ضمیر معنی کے اعتبار سے اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ اس سے مراد جنس یا جمع ہے۔

۱۰؎ یعنی وہ آخرت میں کسی بھی ایسی چیز سے نفع اٹھانے کے قابل نہ ہوں گے جو انہوں نے دنیا میں کمایا۔

۱۱؎ اس میں اشارۃً بات کی گئی ہے کہ ریاء، احسان جتلانا اور اذیت دینا کافروں کا کام ہے مومن کو زیب نہیں دیتا کہ ان چیزوں کا ارتکاب کرے۔ اس کا معنی یہ ہوگا جس نے ان میں سے کوئی کام کیا وہ منعم حقیقی کی نعمتوں کا انکار کرنے والا ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں شریکوں کے شرک سے غنی ہوں، جس نے کوئی ایسا کام کیا جس میں اس نے میرے ساتھ کسی اور کو شریک کیا میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں(3) ایک اور روایت میں ہے میں اس سے بری ہوں، وہ اس کے لئے ہے جس کے لئے اس نے عمل کیا۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ حضرت جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جو شہرت طلبی کے لئے عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کا عمل شہرت طلبی کے لئے بنا دیتا ہے اور جو ریاء کاری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے کام کو ریاء کاری قرار دیتا ہے، متفق علیہ(4) حضرت ابو سعید بن ابوفضالہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ اس روز لوگوں کو جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں ہوگا، ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا جس کسی نے اللہ کے لئے عمل کرتے ہوئے اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے ہی بدلہ طلب کرے، بے شک اللہ تعالیٰ شریکوں کے شرک سے غنی ہے اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(5) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا بے شک تھوڑا سا ریاء بھی شرک ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(6) حضرت شداد بن اوس رضی اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 380 (فکر)　2۔ سنن نسائی، جلد 5 صفحہ 81 (الریان)　3۔ صحیح مسلم: 2985، جلد 18، صفحہ 90 (علمیہ)
4۔ صحیح بخاری: 6134 (ابن کثیر)　5۔ مسند احمد، جلد 3 صفحہ 466 (صادر)　6۔ سنن ابن ماجہ: 3989 (علمیہ)

عنہ سے مروی ہے، کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا جس نے ریاء کاری کرتے ہوئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے ریاء کاری کرتے ہوئے روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے ریاء کاری کرتے ہوئے صدقہ کیا اس نے شرک کیا۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(1) محمود بن لبید سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمہارے بارے سب سے زیادہ جس چیز سے ڈرتا ہوں وہ شرک اصغر ہے۔ لوگوں نے حضور ﷺ سے عرض کی شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا ریاء۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(2) امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں یہ زیادہ کہا اللہ تعالیٰ جس روز لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا دے گا، وہ لوگوں سے فرمائے گا ان کے پاس جاؤ جن کے لئے تم دنیا میں ریاکاری کرتے تھے دیکھو تو سہی کیا ان کے پاس کوئی جزاء اور خیر پاتے ہو(3) حضرت شداد بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا میں اپنی امت پر شرک اور مخفی خواہش نفسانی سے ڈرتا ہوں۔ میں نے عرض کی کیا آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی امت شرک کرے گی؟ فرمایا ہاں وہ کسی سورج، چاند، پتھر اور بت کی عبادت نہیں کریں گے، لیکن وہ اپنے اعمال میں مخفی خواہش نفسانی کے ساتھ ریاء کاری کریں گے، ان میں سے ایک آدمی روزے کی حالت میں صبح کرے گا تو اس کی خواہشات نفسانی میں ایک خواہش شہوات لاحق ہوگی، وہ اپنا روزہ چھوڑ دے گا۔ اسے امام احمد اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے(4) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے قیامت کے روز سب سے پہلے جس آدمی کے خلاف فیصلہ ہوگا، وہ ایک شہید ہوگا اسے لایا جائے گا اللہ تعالیٰ اس پر اپنے انعامات کا ذکر کرے گا۔ وہ اعتراف کرے گا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے کیا عمل؟ کیا وہ بندہ کہے گا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا یہاں تک کہ میں شہید ہو گیا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ بولا، بلکہ تو نے اس لئے قتال کیا کہ لوگ تجھے بہادر کہیں، تو تجھے بہادر کہا گیا۔ پھر اس کے بارے حکم ہوگا اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے گا یہاں تک کہ اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اور ایک آدمی ہوگا جس نے علم سیکھا اور سکھایا، اس نے قرآن پڑھا۔ اسے لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے سامنے اپنی نعمتوں کا ذکر کرے گا وہ اعتراف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے کیا کیا؟ وہ عرض کرے گا میں نے علم سیکھا اسے سکھایا، میں نے تیرے لئے قرآن پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ بولا، بلکہ تو نے علم اس لئے حاصل کیا تا کہ تجھے عالم کہا جائے، تو نے قرآن پڑھا تا کہ تجھے قاری کہا جائے۔ پھر اس کے بارے حکم ہوگا، اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے گا اور اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ ایک اور آدمی ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے وسیع رزق دیا ہوگا اور تمام قسم کے مال دیئے ہوں گے۔ اسے لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے کیا کیا؟ وہ کہے گا میں نے کوئی ایسی راہ نہیں چھوڑی جس میں مال خرچ کرنا تو پسند کرتا ہے مگر میں نے اس میں اپنا مال خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ بولا، تو نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ تجھے سخی کہا جائے۔ پس تجھے سخی کہا گیا۔ پھر اس کے بارے حکم دے گا اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے گا۔ اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(5) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ اس کے آخر میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔ فرمایا اے ابوہریرہ یہی تین وہ پہلے لوگ ہوں گے جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز جہنم کی آگ کو بھڑکائے گا۔(6)

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ

1۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 126 (صادر) 2۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 428 (صادر) 3۔ شعب الایمان 6831 (علمیہ)
4۔ شعب الایمان 6830 (علمیہ)، مسند احمد، جلد 4، صفحہ 124 (صادر)
5۔ صحیح مسلم 105، جلد 13، صفحہ 44 (علمیہ) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 382

كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

"اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے ۱؎ اور اس لئے تا کہ پختہ ہو جائیں ۲؎ ان کے دل ۳؎ ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جو ایک بلند زمین پر ہو ۴؎ برسا ہو اس پر زور کا مینہ ۵؎ تو لایا ہو وہ باغ دوگنا پھل ۶؎ اور اگر نہ برسے اس پر بارش تو شبنم ہی کافی ہو جائے ۷؎ اور اللہ تعالیٰ تو جو تم کر رہے ہو سب دیکھ رہا ہے ۸؎"

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کو طلب کرنے کے لئے۔

۲؎ اسلام کو مضبوط بنانے کے لئے، اللہ تعالیٰ نے جزاء کا جو وعدہ کیا ہے اس کی تصدیق کرنے کے لئے اور ثواب کی نیت کے طور پر۔ اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مال کو محفوظ کرنے کے لئے کیونکہ حقیقت میں باقی رہنے والا مال وہی ہے جو آخرت میں انسان کو نفع دے، باقی سب ہلاک ہونے والا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہے؟ سب نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم میں سے ہر ایک کو اپنا مال وارث کے مال سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس کا مال وہی ہے جو اس نے آگے بھیج دیا (اللہ کی رضا کی خاطر خرچ کر دیا) اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو اس نے پیچھے چھوڑا۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (1) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے بکری ذبح کی۔ نبی کریم ﷺ نے پوچھا اس میں سے کیا بچا ہے؟ حضرت عائشہ صدیقہ نے عرض کیا ایک بازو کے سوا کچھ نہیں بچا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بازو کے سوا سب باقی ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ (2)

۳؎ من ابتدائیہ ہے، تثبیت کے متعلق ہے، یعنی ایمان کی تثبیت اور تصدیق کے لئے یا اپنی ذات سے مال خرچ کرنا شروع کریں یا من تبعیضیہ ہے یا ظرف مستقر ہے، محذوف مفعول کی صفت ہوگا۔ معنی یہ ہوگا اپنے آپ میں سے کسی چیز کو ایمان پر ثابت کرنے کے لئے کیونکہ نفس کی کئی قوتیں ہیں، بعض مال خرچ کرنے کا مبدء اور بعض روح خرچ کرنے کا مبدء۔ مال روح کا جز واں ہے، جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر مال خرچ کیا تو اس نے اپنے بعض کو ایمان پر مضبوط کر دیا، جس نے مال اور روح دونوں کو خرچ کیا تو اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر ایمان پر ثبت کر دیا۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا اس میں یہ تنبیہ ہے، انفاق میں منفق کے لئے یہ حکمت ہے کہ وہ اپنے نفس کو بخل اور مال کی محبت سے پاک کرے۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا بچے کے مال میں زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی تا کہ ولی ادا کرے کیونکہ زکوٰۃ کی حکمت مکلف کو مال خرچ کرنے میں آزمانا ہے جو روح کا جز واں ہے، تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرے، یہ چیز ولی کی طرف سے زکوٰۃ دینے سے حاصل نہیں ہوتی۔

۴؎ جنت کا معنی باغ ہے۔ ابن عامر اور عاصم رحمہما اللہ تعالیٰ نے یہاں اور سورۂ مومنین میں راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے راء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ربوۃ کا معنی بلند جگہ، جو ہموار ہو، جس میں نہریں بہتی ہوں، پانی اس پر غالب

1۔ صحیح بخاری: 6077 (ابن کثیر) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2470 (علمیہ)

ہوتا ہے نہ وہ پانی سے بہت بلند ہوتی ہے۔ یہاں باغ کی یہ صفت ذکر کی ہے کیونکہ اس کے درخت بہت اچھے اور عمدہ ہوتے ہیں۔

؎ وابل ایسی بارش جو موٹے قطرات والی ہو۔

؎ وہ باغ دوگنا پھل دیتا ہے۔ نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو رحمہم اللہ تعالیٰ نے اکل کاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی پھل ہے۔ ضعفین حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی جتنا بغیر بارش کے پھل دیتا ہے، بارش کے ساتھ دوگنا دیتا ہے۔ یہاں ضعف سے مراد مثل ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد زوجین اثنین میں زوجین سے مراد زوج ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ضعفین سے چار گنا مراد ہے۔

؎ صاحب تفسیر نے یہاں کئی تراکیب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک میں طل موصوف اور اصابہا جملہ محذوف اس کی صفت ہے یا اصابہا جملہ محذوف اور طل اس کا فاعل ہے تو وہ باغ ایک قدر پھل دیتا ہے۔ دونوں تقدیروں پر یعنی موٹے قطرات والی بارش اسے پہنچے یا نہ پہنچے، اس کا پھل ضائع نہیں ہوتا۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ پھوار بھی اس کے لئے کافی ہو جاتی ہے کیونکہ زمین عمدہ اور آب وہوا ٹھنڈی ہے۔ طل چھوٹے قطرات والی بارش۔ معنی اس صورت (مضاف محذوف ہونے) میں یہ ہوگا وہ لوگ جو مال خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جس طرح اس باغ کا پھل ضائع نہیں ہوتا۔ اسی طرح مومن کے نفقات بھی باطل نہیں ہوتے بلکہ اگر اس کے ساتھ ایسی چیزیں مل جائیں جو اس کے اجر میں اضافہ کا باعث ہوں تو اس کے اجور میں اضافہ کر دیا جاتا ہے، جتنا اللہ تعالیٰ چاہئے یا اس کے ساتھ کوئی ایسی چیز نہ ملے گی تو اس کا اصل عمل باطل نہیں ہوگا اور اجر کو واجب کرے گا۔ یا بغیر تقدیر کلام کے معنی کریں گے وہ مومن جو مال خرچ کرتا ہے اس کی مثال باغ جیسی ہے یعنی جس طرح باغ بارش کے حساب سے پھلدار ہوتا ہے، اسی طرح خرچ کرنے والے کو نفقہ کے حساب سے اجر دیا جاتا ہے، وہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ اس میں سے کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔

؎ یہ جملہ دونوں فریقوں کے متعلق ہے جو اپنے صدقات احسان جتلا کر اور اذیت دے کر ضائع کرتے ہیں یا اپنے اموال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور جو اپنے اموال اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ اس آیت میں تحذیر بھی ہے اور ترغیب بھی۔

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيلٍ وَّأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَأَصَابَهَآ إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۶۶﴾

"کیا پسند کرتا ہے کوئی تم میں سے؎ کہ ہو اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا بہتی ہوں اس کے نیچے ندیاں (کھجور اور انگور کے علاوہ) اس کے لئے اس میں ہر قسم کے اور پھل بھی ہوں؎ اور آلیا ہو اسے بڑھاپے نے؎ اور اس کی اولاد بھی کمزور ہو؎ (تو کیا وہ پسند کرتا ہے کہ) پہنچے اس کے باغ کو بگولہ؎ جس میں آگ ہو پھر وہ باغ جل بھن جائے؎ ایسے ہی کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنی) آیتیں تاکہ تم غور وفکر کرو؎"

؎ یہاں ہمزہ انکار کے لئے ہے اور یہ آیت یاأیہا الذین آمنوا الخ کے ساتھ متعلق ہے۔

۲؎ نخیل اور اعناب جنت کا بیان ہے۔ باغ میں ہر قسم کے درخت ہوتے ہیں۔ ان دونوں کو ان کے شرف اور منافع کی کثرت کی وجہ سے ذکر میں غلبہ دیا ہے، پھر کل الثمرات کا ذکر فرمایا تا کہ اس پر دلالت ہو کہ باغ صرف انہیں دو قسم کے درختوں پر محدود نہیں۔

۳؎ وہ محنت مزدوری پر قادر نہ رہے۔ یہاں واؤ حالیہ ہے، و قد اصابه الکبر کے معنی میں ہے۔ یا واؤ عاطفہ ہے اور معنی کا عطف معنی پر ہوگا ایود احدکم لو کانت لہ جنۃ و اصابہ الکبر۔

۴؎ یعنی چھوٹے بچے یا عورتیں ہوں جو کما نہ سکتے ہوں واؤ عاطفہ ہے، اس کا عطف اصابه پر ہے، یا حالیہ ہے اور اصابه کی ضمیر سے حال ہے۔

۵؎ اعصار سے مراد بگولہ ہے۔ اس کا عطف اصابه پر ہے، یا معنی کے اعتبار سے تکون پر عطف ہے۔

۶؎ معنی یہ ہے کہ تم میں سے کوئی بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کا عمدہ مال ہو، جس طرح ذکر کیا گیا ہے جب اسے مال کی سخت ضرورت ہوتی ہے تو وہ جل جاتا ہے، جب تک وہ عالم فانی میں رہے گا خائب و خاسر رہے گا تو وہ کس طرح پسند کرے گا کہ قیامت کے روز اس کی نیکیاں ضائع ہو جائیں، جب اسے ان کی سخت ضرورت ہوگی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خائب و خاسر ہو جائے۔ حضرت عبید بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اصحاب نبی سے کہا کیا تم جانتے ہو یہ آیت کس کے حق میں نازل ہوئی؟ صحابہ نے کہا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سخت غصے ہوئے، فرمایا کہو ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا اس کے بارے میں میرے پاس علم ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا بھتیجے کہو اور اپنے آپ کو حقیر نہ جانو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا اس میں ایک عمل کی مثال دی گئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ایک آدمی کی مثال دی گئی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کے اعمال کرتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کے پاس شیطان بھیجتا ہے تو وہ نافرمانی کے کام شروع کر دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے اعمال جلا دیتا ہے۔ (1)

۷؎ ان کے ذریعے تم عبرت حاصل کرتے ہو۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

"اے ایمان والو خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے ۱؎ جو تم نے کمائی ہیں ۲؎ اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لئے زمین سے ۳؎ نہ ارادہ کرو ۴؎ ردی چیز کا اپنی کمائی سے کہ (تم اسے) خرچ کرو ۵؎ حالانکہ (اگر تمہیں کوئی ردی چیز دے تو ۶؎) تم نہ لو اسے ۷؎ بجز اس کے کہ چشم پوشی کر لو اس میں ۸؎ اور (خوب) جان لو کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے ہر تعریف کے لائق ہے ۹؎"

۱؎ طیبت کا معنی عمدہ ابن مسعود اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا ہے۔ (2)

۲؎ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسا نہیں ہے کہ ایک بندہ حرام مال کمائے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 384 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 384 (فکر)

اسے صدقہ کرے تو اسے قبول کیا جائے، ایسا نہیں ہے کہ وہ خرچ کرے تو اس میں برکت رکھی جائے۔ ایسا شخص اپنے پیچھے مال چھوڑ کر نہیں جاتا مگر وہ اس کے لئے جہنم کا زاد راہ ہوتا ہے، وہ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو نیکی سے مٹاتا ہے(1) بے شک خبیث خبیث کو نہیں مٹاتا۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے یہ آیت کریمہ اجماع کی سند اور جمہور کی داؤد کے خلاف حجت ہے۔ انہوں نے کہا زکوٰۃ صرف چوپاؤں اور نقدیوں میں واجب ہوتی ہے اور جمہور علماء کے نزدیک سامان تجارت اور جائداد میں واجب ہوتی ہے جب وہ تجارت کے لئے ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے سامان میں زکوٰۃ نہیں ہوتی مگر جب تجارت کے لئے ہوں۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت سمرہ بن جندب سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ ہمیں اس سامان سے زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیتے تھے جو تجارت کے لئے ہو۔ اسے دار قطنی، ابوداؤد اور بزار رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے(2) سلیمان بن سمرہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، یہ روایت بزار رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہے، اس کی سند میں جہالت ہے۔ جو روایت سامان تجارت میں زکوٰۃ کے وجوب پر دلالت کرتی ہے وہ حماس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے کہا میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سے گزرا میں اپنی گردن پر کچھ چمڑے اٹھائے ہوئے تھا۔ آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے فرمایا اے حماس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا؟ عرض کی میرے پاس ان کے سوا کچھ نہیں جو مجھے قرظ میں ہبہ کئے گئے۔ فرمایا وہ مال ہے، اسے رکھو۔ اس نے مال آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے رکھ دیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حساب لگایا تو اس میں زکوٰۃ لازم آتی تھی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس میں سے زکوٰۃ لی۔ اسے امام شافعی، احمد، ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق، سعید بن منصور اور دار قطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اونٹوں میں زکوٰۃ ہے، گائے میں زکوٰۃ ہے، کپڑے میں زکوٰۃ ہے(3) اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے تین ضعیف سندوں سے روایت کیا ہے، دو سندوں کا دارومدار موسیٰ بن عبیدہ زبدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ہے، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے روایت کرنا حلال نہیں۔ تیسری سند میں عبداللہ بن معاویہ بن عاصم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جسے نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف قرار دیا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے منکر قرار دیا۔ اس میں ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ عمران بن انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہیں سنا۔ اس کی چوتھی سند بھی ہے جسے دار قطنی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے کہ اونٹ میں اس کی زکوٰۃ ہے، بھیڑ بکریوں میں اس کی زکوٰۃ ہے، گائے میں اس کی زکوٰۃ ہے، کپڑے میں اس کی زکوٰۃ ہے، جس نے دراہم و دنانیر اٹھائے جو وہ قرض خواہ کو نہیں دیتا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ یہ وہ خزانہ ہے جس کے ساتھ قیامت کے روز اسے داغا جائے گا۔ یہ ایسی سند ہے جس میں کوئی حرج نہیں۔ پھر علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ سامان تجارت کئی سالوں تک نہ بیچا جائے تو کیا زکوٰۃ ہوگی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی اگرچہ زمانہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو جائے جب وہ بیچے گا تو اس پر ایک زکوٰۃ ہوگی ائمہ ثلاثہ(۱) فرماتے ہیں اس مال میں ہر سال زکوٰۃ ہوگی اگرچہ وہ نہ بیچے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد عام ہے

"اس میں سے زکوٰۃ دے جو سامان تجارت کے لئے ہو یعنی خواہ اسے بیچے یا نہ بیچے۔"

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ آیت نفلی صدقات کے بارے میں ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول

(۱) امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 385 (فکر) 2۔ سنن ابی داؤد: 1682 (الرشد) 3۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 101 (محاسن)

اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی مسلمان جو درخت لگاتا ہے یا کھیتی کاشت کرتا ہے۔ پس اس سے کوئی انسان، پرندہ یا چوپایا جو کھاتا ہے وہ اس کا صدقہ ہوتا ہے اسے امام احمد، شیخین اور ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے(1) میں یہ کہتا ہوں یہ حدیث کھیتی باڑی کے استحباب پر دلالت کرتی ہے اور حضرت ابی امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث جس میں انہوں نے کہا میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا یہ کھیتی باڑی کے آلات کسی گھر میں داخل نہیں ہوتے مگر اس پر ذلت داخل ہو جاتی ہے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2) یہ اس کی نحوست پر دلالت کرتی ہے، واللہ اعلم۔ صحیح بات یہ ہے کہ آیت زکوٰۃ کے متعلق ہے کیونکہ امر وجوب کے لئے ہے اس کو نفل پر محمول کرنے کی کوئی وجہ نہیں، یہ زمین کی پیداوار سے عشر نکالنے کا حکم ہے۔

مسئلہ:۔ علماء نے کھجور اور انگور سے اور جو دانے خوراک بنتے ہیں، اگر وہ بارش، چشمے، وادیوں اور دریاؤں کے پانی سے سیراب ہوں جس میں کاشتکار کو مشقت برداشت نہیں کرنا پڑتی تو اس میں عشر ہوگا اگر وہ ڈول یا رہٹ سے سیراب ہو تو اس پر نصف عشر ہوگا اور اس بات پر اجماع ہے کہ گھاس اور لکڑی میں عشر نہیں ہوگا جبکہ ان کے ذریعے زمین سے نفع اٹھانے کا قصد نہ کیا گیا ہو۔ دوسری چیزوں میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا زمین کی ہر پیداوار خواہ دانے ہوں، پھل ہوں اور سبزیاں ہوں اس سے عشر ہوگا۔ آپ اس آیت کے عموم سے استدلال کرتے ہیں اور حضور ﷺ کے ارشاد جسے بارش اور چشموں کا پانی سیراب کرے جبکہ وہ عشری ہو تو اس میں عشر ہے اور جسے سیراب کیا جائے اپنے ذرائع سے تو اس میں نصف عشر ہے(3) اسے امام بخاری، ابوداؤد، نسائی، ابن حبان اور ابن جارود رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے امام نسائی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا جو چیزیں کھانے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں ان میں زکوٰۃ ہے جیسے کھجور، انگور، گندم، جو، چنے، چاول اور دوسری چیزیں باقی میں نہیں۔ امام ابو یوسف، امام محمد اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا کیلی اور وزنی چیزوں میں سے جو لوگوں کے پاس دیر تک رہتی ہیں ان میں زکوٰۃ ہے، جیسے تل، شہدانج، بادام، فندق، پستہ، زعفران، زیرہ اور عصفر کے بیج بھی۔ انہوں نے سبزیوں میں زکوٰۃ نہ ہونے کو حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، فرمایا جسے بارش اور سیلاب کا پانی سیراب کرے اس میں عشر ہے جسے مصنوعی ذرائع سے سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر ہے۔ پس یہ حکم کھجور، گندم اور دانوں میں ہوگا رہا کھیرا، تربوز، انار، گنا اور سبزیوں میں زکوٰۃ معاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے معاف کیا ہے(4) اسے دار قطنی، حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس میں ضعف اور انقطاع ہے۔ اس کے راویوں میں اسحاق اور ابن نافع رحمہما اللہ تعالیٰ ضعیف ہیں۔ یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کوئی چیز نہیں اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی۔ امام احمد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ متروک ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ انہوں (معاذ) نے نبی کریم ﷺ کی طرف سبزیوں اور چارہ کے متعلق پوچھنے کے لئے خط لکھا حضور ﷺ نے فرمایا اس میں زکوٰۃ نہیں(5) یہ بھی ضعیف ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس حدیث کی سند صحیح نہیں رسول اللہ ﷺ

1۔ صحیح بخاری: 2195 (ابن کثیر) 2۔ صحیح بخاری: 2196 (ابن کثیر)
3۔ صحیح بخاری: 1412 (ابن کثیر) 4۔ مستدرک حاکم: 1458 (علمیہ) 5۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 638 (علمیہ)

سے اس مسئلہ میں کوئی شے صحیح طور پر ثابت نہیں۔ یہ موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جو حضور ﷺ سے مرسل (1) انداز میں نقل کرتے ہیں۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے علل میں ذکر کیا ہے اور کہا صحیح مرسل ہی ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہا ہمارے پاس معاذ کا خط ہے جسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا اور کہا موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کبیر تابعی ہے (اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا) موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کرنے کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ معاذ سے نہیں ملے، نہ اس کا زمانہ پایا۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کئی سندوں کے ساتھ موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ اپنے باپ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ سبزیوں میں صدقہ نہیں ہے(1) ان کی ایک سند میں حراث بن نبہان ہے، جس کی تضعیف ایک جماعت نے نقل کی ہے۔ دوسری سند میں نصر بن حماد ہے، یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نصر کذاب ہے۔ یعقوب بن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ کچھ بھی نہیں۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کمزور حدیث والا ہے۔ تیسری سند میں محمد بن جابر ہے، یہ بھی کچھ نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے شریر آدمی ہی روایت کرتا ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے مروان بن محمد سنجاوی سے، وہ موسیٰ بن طلحہ سے، وہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ مروان بن محمد سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔ ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الخراج میں موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ زکوٰۃ کی رائے نہیں رکھتے تھے مگر گندم، جو، کھجور، انگور اور کشمش میں اور انہوں نے کہا ہمارے پاس ایک مکتوب ہے جسے نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا تھا۔ تحقیق یہی ہے کہ موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث مرسل صحیح ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء نے یہی کہا مرسل روایت حجت ہوتی ہے، خصوصاً اس صورت میں جب اسے مذکورہ سندوں کی تائید حاصل ہو۔ اس کی تائید حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث بھی کرتی ہے جسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اس سند میں صقر بن حبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت ضعیف ہے، اسے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے موقوفاً نقل کیا ہے۔ اس سند میں قیس بن ربیع ہیں جو صدوق ہیں مگر حافظہ کمزور ہے، اس لئے قوی نہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک مرفوع حدیث مروی ہے "زمین سبزیوں میں سے جو چیز اگاتی ہے اس میں زکوٰۃ نہیں" (2) اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(3) اس میں صالح بن موسیٰ ہیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ منکر الحدیث ہے۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ متروک ہے۔ محمد بن جحش رضی اللہ تعالیٰ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کو یمن بھیجا تو انہیں حکم دیا کہ ہر چالیس دیناروں سے ایک دینار وصول کرے، اور سبزیوں میں صدقہ نہیں۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا، اس میں صالح بن موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ امام بخاری اور نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ متروک اور منکر الحدیث ہے۔

یہاں کئی اور احادیث بھی ہیں جو ان چار چیزوں کھجور، کشمش، گندم اور جو کے علاوہ میں عشر کی نفی پر دلالت کرتی ہیں۔ حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابو بردہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ ابو موسیٰ اور معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کرتے ہیں جب حضور ﷺ نے ان دونوں کو یمن بھیجا تاکہ لوگوں کو دین کے معاملات سکھائیں، انہیں فرمایا ان چار چیزوں جو، گندم، کشمش اور کھجور کے علاوہ کسی چیز سے صدقہ وصول نہ

(ا)۔ جس کی سند کے آخر سے راوی حذف ہے۔

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 96 (محاسن) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 95 (محاسن)

3۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 96-95 (محاسن)

کرنا۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسکے راوی ثقہ ہیں اور یہ روایت متصل ہے اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چار چیزوں میں زکوٰۃ جاری فرمائی پھر چار چیزوں کا ذکر کیا(1) اسی طرح دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن شعیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ اپنے باپ اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا زکوٰۃ نہیں ہے مگر چار چیزوں میں کھجور، کشمش، گندم اور جو میں(2) امام بیہقی نے امام شعبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کی طرف خط لکھا کہ صدقہ صرف گندم، جو، کھجور اور کشمش میں ہے(3) آپ ﷺ نے پانچ چیزوں میں زکوٰۃ کا ذکر کیا ہے، چار مذکورہ اور پانچویں جو، لیکن یہ قول ضعیف اور کمزور ہے۔ میں کہتا ہوں جب علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ زکوٰۃ ان چار چیزوں میں محصور نہیں تو یہاں مضاف کے حذف کے ساتھ تاویل کرنا واجب ہوگی۔ معنی یہ ہوگا کہ ان چار چیزوں جیسی اشیاء میں زکوٰۃ ہو گی۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک علت خصیت ہے، بہتر یہ ہے کیل یا وزن اور ذخیرہ کرنے میں مماثلت کا اعتبار کیا جائے کیونکہ زکوٰۃ کے باب میں مقصود غناء ہے جو مال سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ خوراک بنانے میں۔ ہر وہ چیز جس میں کیل جاری کیا جاتا ہے، اس کا وزن کیا جاتا ہے اور اسے ذخیرہ کیا جاتا ہے، اس کے ساتھ غناء حاصل ہوتی ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ بالاتفاق کھیتوں کے پھل میں عشر کے لئے سال کا گزرنا شرط نہیں کیونکہ سال گزرنے کی شرط نمو کے لئے ہے جبکہ یہ پھل اضافہ ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عشر کے لئے عاقل و بالغ ہونا بھی شرط نہیں جس طرح باقی علماء کے نزدیک دوسرے اموال میں زکوٰۃ کے لئے بھی یہ دونوں چیزیں شرط نہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ اموال کی زکوٰۃ محض عبادت ہے، اس میں نیت ضروری ہے۔ رہا عشر تو اس میں عبادت کے ساتھ ساتھ ذمہ داری کا پہلو بھی موجود ہے، اس لئے کہ یہ عبادت ہے، اس میں اسلام کی شرط لگائی گئی ہے تو کافر پر خراج واجب ہوگا، عشر واجب نہیں ہوگا، اسی طرح اگر اس عشری زمین کو کافر خرید لے تو اس سے خراج لیا جائے گا۔ یہی جمہور کا نقطہ نظر ہے، جبکہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے اختلاف(۱) کیا ہے اس حیثیت سے کہ یہ ایک ذمہ داری ہے یہ بچے اور مجنون پر بھی لازم ہوگا جس طرح خاوند خواہ چھوٹا یا مجنون ہو تو بیوی کا نفقہ واجب ہوگا۔

نصاب کی شرط میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اس میں نصاب کی شرط نہیں، جتنی فصل بھی ہو اس میں عشر ہوگا کیونکہ وہ دلائل جو پہلی بحث میں ذکر کیے ہیں وہ عام ہیں۔ یہی حضرت عمر بن عبدالعزیز، مجاہد اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ تعالیٰ کا نقطہ نظر ہے۔ عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے تینوں ائمہ سے یہ نقل کیا ہے کہ پیداوار تھوڑی ہو یا زیادہ اس میں عشر ہوگا۔ امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں یہ بھی اضافہ ہے کہ دس وسق میں بھی ایک وسق ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے، وہ امام حماد رحمۃ اللہ علیہ سے، وہ ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی مثل روایت کرتے ہیں۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس میں بھی نصاب کی شرط ذکر کی ہے۔ یہ مقدار پانچ وسق ہے جس میں وسق جاری ہوتا ہے ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔ جس میں وسق کے ساتھ کیل نہیں ہوتا اس میں جاری ہونے والے پیمانہ میں سے سب سے بڑے پیمانہ کی تعداد پانچ ہو جائے وہ مراد ہوگا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک روئی میں پانچ حمل ہے اور ہر حمل تین سو سیر کے برابر ہوتا ہے اور زعفران

(۱) امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زمین کا فریضہ نہیں بدلتا، اگر عشر لازم ہوا تو ہمیشہ عشر اور اگر خراج واجب ہوا تو ہمیشہ خراج مالک بدل لینے سے کچھ فرق نہ ہوگا۔

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 94 (محاسن) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 96 (محاسن) 3۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 4 صفحہ 129 (فکر)

میں پانچ سیر ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا، اگر اس کی قیمت اس چیز کے پانچ وسق کے برابر تک پہنچ جائے جس میں وسق جاری ہوتا ہے، جبکہ قدر کے لحاظ سے کم مرتبہ ہو۔ جمہور علماء کے نزدیک نصاب کی شرط حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے پانچ سے کم وسق میں زکوۃ نہیں، متفق علیہ۔ یہ روایت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے(1) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حدیث جابر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے(2) امام احمد اور دار قطنی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے(3) اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن حزم سے اور دار قطنی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اسے روایت کیا ہے، واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ عشر ہر زمین کی پیداوار میں ہوتا ہے، یہ کسی زمین کے ساتھ مقید نہیں۔ اگر ایک مسلمان خراجی زمین کا مالک بنے اور اس میں فصل کاشت کرے تو اس سے خراج ساقط ہو جائے گا اور عشر واجب ہو جائے گا یا پیداوار میں عشر اور زمین میں خراج واجب ہوگا۔ یہ جمہور علماء کا مسلک ہے، کیونکہ خراج زمین کا فریضہ ہے اور عشر پیداوار کا اس لئے اس میں نصاب شرط ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا خراجی زمین سے خراج کبھی بھی ساقط نہیں ہوگا اور ایک زمین میں خراج اور عشر جمع نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کے نزدیک عشر زمین کا فریضہ ہے، نہ کہ کھیتی کا اس وجہ سے پیداوار میں نصاب کی شرط نہیں۔ خراج کے ساقط ہونے یا نہ ہونے کی بحث کی یہاں گنجائش نہیں۔ عشر اور خراج کے اجتماع کا ممنوع ہونا کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں جو ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے کامل میں یحییٰ بن عنبسہ سے ذکر کیا ہے، ہمیں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا، آپ حضرت حماد سے، وہ علقمہ سے، وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان پر عشر و خراج جمع نہیں ہوتے، یہ باطل ہے۔ ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ رسول اللہ کا کلام نہیں یحییٰ بن عنبسہ دجال ہے، وہ حدیث وضع کرتا تھا، اس نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے حضور ﷺ تک پوری سند کے راویوں پر جھوٹ بولا ہے۔ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس حدیث کو یحییٰ بن عنبسہ کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا، یہ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول روایت کیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کا قول حجت نہیں۔ امام شعبی اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی یہی ہے کہ ایک زمین یا ایک مال میں عشر اور خراج جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ دونوں اثر ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کئے ہیں۔ صاحب ہدایہ نے اجماع سے استدلال کیا ہے کہ ظالم اور عادل کسی حاکم نے بھی ان دونوں چیزوں کو جمع نہیں کیا، ان کا یہ اجماع بطور دلیل کافی ہے، اجماع کا دعویٰ درست نہیں کیونکہ ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن عبد العزیز سے عشر و خراج دونوں وصول کرنے کو نقل کیا ہے جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آثار کی اتباع کرتے تھے۔ اگر یہ مسئلہ متفق علیہ ہوتا تو حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر مخفی نہ ہوتا۔

مسئلہ:۔ امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کا مشہور قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لئے زمین سے)۔ یہ زمین سے جو سونا اور چاندی نکلتا ہے اسے بھی شامل ہے۔ جب یہ چیزیں نصاب کی مقدار کو پہنچ جائیں تو ان سے چالیسواں حصہ وصول کیا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا مصرف زکوۃ کا مصرف ہو گا جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مال فی کے مصارف پر خرچ کیا جائے گا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ایک روایت

1۔ صحیح بخاری:1340 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم:6، جلد7، صفحہ47 (علمیہ) 3۔ سنن الدار قطنی، جلد2 صفحہ93 (محاسن)

بھی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے ایک قول میں یہ آیت معدنیات کو شامل نہیں، بلکہ معدنیات میں خمس ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الآیۃ (اور جان لو جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو تو اللہ کے لئے ہے اس کا پانچواں حصہ) کیونکہ معدنیات زمین کے اجزاء میں سے ہے جو کفار کے قبضہ میں تھے جو ہمیں ملے ہیں۔ پس یہ ان اموال کی طرح ہیں۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ ہمارے قول کی دلیل یہ ہے کہ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ یہ معدنیات کو شامل نہیں کیونکہ اخراج کا حقیقی معنی زمین کے اندر موجود چیز کو اس کے ظاہر کی طرف نکالنا ہے۔ یہ معنی کھیتی اور پھلوں میں موجود نہیں تو مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ سے پھل اور پیداوار بطور مجاز لئے گئے ہیں۔ یہاں مجازی معنی بطور اجماع ہے تو کیونکہ حقیقی اور مجازی معنی جمع نہیں ہو سکتے، اس لئے حقیقی معنی مراد نہیں لیا جا سکتا، جس طرح اصول کی کتابوں سے ثابت ہے، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حقیقت اور مجاز جمع ہو سکتے ہیں۔ اسی آیت کی مثل اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ اس میں لٰمَسْتُمْ سے بالاتفاق جماع مراد ہے جو اس کا مجازی معنی ہے، اس وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عورت کو مس کرنے سے وضو نہیں ٹوٹتا جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وضو ٹوٹ جاتا ہے یہ مسائل میں اختلاف اس قاعدہ میں اختلاف کی وجہ سے ہے کہ کیا حقیقت ومجاز ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔

پھر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر معدن میں خمس واجب ہوگا، خواہ وہ ٹھوس ہو جو نہ پگھلے جیسے چونا وغیرہ یا جامد نہ ہو جیسے تارکول اور تیل وغیرہ یا جامد ہو اور پگھل جائے اور اس سے کئی چیزیں بنائی جائیں جیسے سونا، چاندی اور لوہا وغیرہ کیونکہ یہ سب چیزیں غنیمت بن سکتی ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں صرف تیسری صورت میں خمس ہوگا کیونکہ رکاز کا اطلاق اسی پر ہوتا ہے جو چیز پگھلتی نہیں وہ جنس زمین سے ہے، اس کے ساتھ تیمم کرنا جائز ہے، وہ رکاز نہیں جبکہ حضور ﷺ نے رکاز میں خمس فرض کیا ہے حدیث طیبہ ہے رکاز میں خمس ہے۔ امام شافعی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس میں زکوٰۃ ہے یہ صرف نقدی میں ہوگی کسی اور میں نہ ہوگی تو پس یہ فریضہ سونے اور چاندی میں ہوگا یہ لوہے اور اس جیسی معدنیات میں نہیں ہوگا۔ میں کہتا ہوں ثمنیت (سونا اور چاندی، نقدی) میں زکوٰۃ اس کی نماء (اضافہ، بڑھوتری) کی وجہ سے ہے جبکہ یہ پورے کا پورا نماء ہے اسی وجہ سے اس میں سال کے گزرنے کی شرط نہیں۔ اسی وجہ سے پھلوں اور دانوں میں بھی زکوٰۃ ہوتی ہے جبکہ وہ نقدی نہیں ہوتے تو معادن میں نقدی کی تعیین کا کیا فائدہ، واللہ اعلم۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی معدنیات میں زکوٰۃ کی دلیل وہ حدیث ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں ربیعہ بن عبدالرحمن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے راویوں سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بلال بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معادن قبلیہ عطا فرمائے جو فرع کے اطراف میں تھیں ان سے آج تک زکوٰۃ کے علاوہ کوئی چیز نہیں لی جاتی (1) ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ مؤطا میں منقطع ہے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ سے ملے ہیں، صحابی میں جہالت روایت کو نقصان نہیں پہنچاتی اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مرسل ہے۔ ابوعبید رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الاموال میں کہا یہ حدیث منقطع ہے۔ انقطاع کے ساتھ ساتھ اس میں یہ تصریح نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ اس چیز کا حکم دیا ان سے آج تک زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ حکمرانوں کا اجتہاد ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ذکر کرنے کے بعد کہا ہے یہ ان چیزوں میں سے نہیں جسے علماء حدیث صحیح قرار دیں، انہوں نے اسے لکھا بھی نہیں اس ضمن میں حضور ﷺ سے مروی نہیں ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے

1۔ موطا امام مالک، جلد 1، صفحہ 248 (التراث العربی)

مستدرک میں دراوردی رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے انہوں نے حارث بن بلال مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ ابن جوزی نے دراوردی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معادن قبلیہ سے زکوٰۃ لی(1) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے فِی الرِّکَازِ خُمُسٌ کہ رکاز میں خمس ہے۔ صحاح ستہ کے اصحاب نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس حدیث کو روایت کیا ہے(2) اس استدلال کی وجہ یہ ہے کہ لفظ رکاز معدن اور خزانہ دونوں کو شامل ہے۔ قاموس میں ہے رکاز اسے کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے کان میں پیدا کیا ہو اور زمانہ جاہلیت کا دفینہ بھی رکاز ہے، سونے اور چاندی کے ٹکڑے معدن ہیں(3) نہایہ میں ہے اہل حجاز کے نزدیک رکاز زمانہ جاہلیت کا خزانہ ہے۔ اہل عراق کے نزدیک اس کا معنی معدن ہے۔ لغت دونوں قولوں کا احتمال رکھتی ہے۔ میں کہتا ہوں جب آپ نے لفظ رکاز مطلق ذکر کیا اور اس کے اوپر الف لام استغراق کا ذکر کیا تو حکم اس کے تمام افراد پر صادق آئے گا اور معادن میں بھی خمس کے وجوب کا قول کیا جائے گا یہ مشترک نہیں جس طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے گمان کیا، بلکہ یہ متواطی ہے کیونکہ رکاز کا معنی ان دونوں میں موجود ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نقطہ نظر کی تائید بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ روایت بھی کرتی ہے جو انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت کی ہے، فرمایا رکاز میں خمس ہے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ رکاز کیا ہے؟ فرمایا سونا اور چاندی جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس وقت پیدا فرمایا جب اس نے آسمان اور زمین کو پیدا فرمایا، لیکن یہ حدیث ضعیف ہے(4) امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ راوی نے جو یہ کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے معادن قبلیہ سے زکوٰۃ لی، اس زکوٰۃ سے مجازاً خمس مراد ہو، کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ خزانہ جس میں بالاجماع خمس لازم آتا ہے، اس کا مصرف زکوٰۃ کا مصرف ہے اور اس کے اوپر زکوٰۃ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ منہاج میں ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ خزانہ کا مالک پانے والا ہوگا اور اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی، واللہ اعلم۔ اس تعارض کی بناء پر رکاز میں خمس والی حدیث اصح اور اقویٰ ہے، واللہ اعلم۔

ے یعنی تم قصد نہ کرو یہ باب تفعل سے فعل مضارع ہے اصل میں دو تاء تھے ایک تخفیف کے لئے حذف ہے۔ قرأت ابن کثیر نے بزی رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت سے وصل میں قرآن حکیم میں اکتیس مقامات پر تاء کو مشدد پڑھا ہے، جو تاء گری ہوئی ہے اس کو واپس لوٹایا ہے ایک یہاں سورہ آل عمران میں لاتفرقوا، سورۂ نساء میں ان الذین توفّٰھم، سورۂ مائدہ میں ولا تعاونوا، سورۂ انعام میں فتفرق بکم، سورۂ اعراف میں ھی تلقّف اسی طرح سورۂ طٰہٰ میں اسی طرح سورۂ شعراء اور انفال میں ولا تولّوا ولا تنازعوا، سورۂ توبہ میں قل ھل تربّصون، سورۂ ہود میں وان تولّوا فان تولّوا ولا تکلّم نفس، سورۂ حجر میں ما تنزّل، سورۂ نور میں اذ تلقّونه وفان تولّوا فانّما، سورۂ شعراء میں علی من تنزّل، الشیطین تنزل، سورۂ احزاب میں او لا تبرّجن ولا ان تبدّل، سورۂ صٰفٰت میں لا تناصرون، سورۂ حجرات میں ولا تنابزوا ولا تجسّسوا ولتعارفوا، سورۂ ممتحنہ میں ان تولوھم، سورۂ ملک میں تکاد تمیز، سورۂ ن والقلم میں لما تخیّرون، سورۂ عبس میں عنه تلھّی، سورۂ لیل میں نارا تلظّی، سورۂ قدر میں تنزّل بعض دوسرے قراء نے بزی رحمۃ اللہ علیہ سے دو اور جگہوں کو بھی ذکر کیا ہے۔ ایک سورۂ آل عمران ولقد کنتم تمنّون اور سورۂ واقعہ میں فظلتم تفکھون اگر کلام تاء سے شروع ہو تو اس میں تخفیف ہی ہوگی اگر ان سے پہلے صرف مدہ ہو جس طرح اس آیت میں ہے تو اس کی تمکین

1۔ مستدرک حاکم: 1467 (علمیہ) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1377 (علمیہ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 706 (التراث العربی) 4۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 4 صفحہ 152 (فکر)

میں اضافہ کیا جائے گا یعنی تخفیف نہ ہوگی۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں تمام قسم کی قرأت میں تخفیف ہی کی ہے۔

۵ یہاں خبیث سے مراد ردی ہے۔ یہ جملہ تَیَمَّمُوْا کے فاعل مقدر سے حال ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ منہ اس فعل کے متعلق ہو اور ضمیر لفظ الخبیث کی طرف لوٹ رہی ہو اور یہ جملہ لفظ الخبیث سے حال ہو۔ امام حاکم، ترمذی، ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے دوسرے محدثین نے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت ہم انصار کے بارے نازل ہوئی ہم کھجوروں کے باغات کے مالک تھے۔ ہم میں سے کچھ لوگ دل سے خیرات دینا نہیں چاہتے تھے، اس لئے اپنے درختوں سے جا کر کم وبیش چھواروں کا ٹوٹا ہوا خوشہ لا کر دے دیتے تھے۔ خوشہ بھی کمزور گٹھلی والے خراب ردی چھواروں کا ہوتا تھا۔ ابوداؤد، نسائی اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے سہل بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ لوگ اپنے ردی پھلوں کا قصد کرتے تھے اور اس سے صدقہ دیتے تھے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1) حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک صاع کھجور کا صدقہ فطر دینے کا حکم دیا تو وہ ردی کھجور لائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2) ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام ردی کھانا خریدتے اور اسے صدقہ کرتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ (3)

۶ جبکہ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم اپنے حقوق وصول کرتے وقت یہ ردی چیز نہیں لیتے۔

یہ اغماض آنکھ بند کرنے کو کہتے ہیں یہاں مجاز اور گزر کرنا ہے، یعنی اگر تم میں سے کسی کا کسی دوسرے پر کوئی حق ہو وہ حقدار کے پاس ردی چیز لے آئے، وہ اسے وصول نہیں کرتا مگر اسی صورت میں کہ اپنے حق کو ترک کر رہا ہو۔ حضرت حسن اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اگر تم اس کو بازار میں بکتا ہوا دیکھو تو تم عمدہ بھاؤ کے ساتھ اسے نہ لو گے (4) حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اگر یہ چیز تمہیں بطور ہدیہ دی جائے تو تم اسے نہیں لو گے مگر دوست کا حیاء کرتے ہوئے اور ناراض ہوتے ہوئے تو تم اللہ تعالیٰ کے لئے ایسی چیز پر کیسے راضی ہو جاتے ہو جس پر خود راضی نہیں ہوتے۔ یہ حکم اس صورت میں ہوگا جب اس کا مال عمدہ ہو اگر اس کا مال ردی ہو تو پھر ردی دینے میں حرج نہیں (5) اگر کچھ عمدہ اور کچھ ردی ہو تو حصہ کے مطابق ادا کرے۔

۷ وہ تمہارے صدقات سے غنی ہے کیونکہ وہ ان صدقات کی منفعت تمہاری طرف ہی لوٹاتا ہے وہ اپنے افعال میں محمود ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۟ۙ

"شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے [1] اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا [2] اور اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے تم سے اپنی بخشش کا اور فضل (وکرم) کا [3] اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے [4]"

۱ وعدہ کا لفظ خیر اور شر دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن جب کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو خیر کے لئے وعد کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور شر کے لئے او عد کا لفظ فقر اصل میں برے حال کو کہتے ہیں۔ یہ کسر الفقار (ریڑھ کی ہڈی توڑنا) سے مشتق ہے، یعنی شیطان تمہیں صدقہ دینے پر فقر سے ڈراتا ہے۔

1۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 559 (علمیہ)　　2۔ مستدرک حاکم، جلد 2 صفحہ 312 (علمیہ)

3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 611 (علمیہ)　　4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 388 (فکر)

5۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 388 (فکر)

۲؎ فحشاء کا معنی معصیت ہے۔ یہ زکوٰۃ روکنا اور دوسری برائیوں کو بھی شامل ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قرآن حکیم میں فحشاء کا لفظ جہاں بھی آیا ہے اس کا معنی بدکاری ہے مگر یہاں بدکاری مراد نہیں۔(1)

۳؎ اللہ تعالیٰ صدقہ دینے پر تم سے گناہوں کی بخشش اور دونوں جہانوں میں اچھا بدل دینے کا وعدہ کرتا ہے یا صرف آخرت میں اچھا بدل دینے کا وعدہ کرتا ہے۔

۴؎ یعنی جو مال خرچ کرتا ہے اس پر زیادہ فضل فرمانے والا ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک مرفوع حدیث مروی ہے کوئی بندہ صبح نہیں کرتا مگر دو فرشتے اترتے ہیں، ایک فرشتہ کہتا ہے اے اللہ خرچ کرنے والے کو اچھا بدل عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے مال روکنے والے کو ہلاکت عطا فرما، متفق علیہ (2) حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خرچ کرتی جا، حساب نہ کر، ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تیرا احساب رکھے گا، کسی مال کو محفوظ نہ کر، ورنہ اللہ تعالیٰ تیرے اوپر اپنا مال محفوظ کر لے گا، جتنی طاقت رکھتی ہے مال خرچ کر، متفق علیہ (3) حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب کعبہ کی قسم! وہ خسارہ پانے والے ہیں۔ میں نے عرض کی کون؟ فرمایا زیادہ مال جمع کرنے والے، مگر وہ جس نے ایسے کہا، ایسے کہا، ایسے کہا، یعنی سامنے، پیچھے، دائیں اور بائیں سے دیتے ہیں، یہ بہت تھوڑے ہیں، متفق علیہ (4) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرمایا سخی اللہ تعالیٰ کے قریب ہے، جنت کے قریب ہے، لوگوں کے قریب ہے، آگ سے بعید ہے، بخیل اللہ تعالیٰ سے بعید ہے، جنت سے بعید ہے، لوگوں سے بعید ہے، آگ کے قریب ہے۔ جاہل سخی اللہ تعالیٰ کے نزدیک، عابد بخیل سے زیادہ محبوب ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (5) آپ رحمۃ اللہ علیہ ہی سے مروی ہے سخاوت جنت میں ایک درخت ہے، جو سخی ہوتا ہے اس نے اس درخت کی ٹہنی کو پکڑ لیا، ٹہنی اسے نہیں چھوڑتی، یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ بخل جہنم میں ایک درخت ہے جو بخیل ہوتا ہے وہ اس کی ٹہنی کو پکڑ لیتا ہے، ٹہنی اسے نہیں چھوڑتی، یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (6) حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے صدقہ میں جلدی کرو کیونکہ مصیبت اس سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اسے رزین رحمۃ اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

"عطا فرماتا ہے دانائی۱؎ جسے چاہتا ہے۲؎ اور جسے عطا کی گئی دانائی۳؎ تو یقیناً اسے دے دی گئی بہت بھلائی۴؎ اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند۵؎"

۱؎ حکمت سے مراد ایسا علم نافع ہے جو واقعہ کے مطابق ہو۔ نیز اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہنچانے والا ہو اور اس پر عمل بھی کیا جائے۔ یہ وحی کے علاوہ کسی پر صادق نہیں آتا۔ یہ اصل میں انبیاء کو حاصل ہوتا ہے اور دوسروں کو وارثۃً ملتا ہے۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے جویبر کے ذریعے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے، کہا حکمت قرآن ہے۔ ابن عباس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 388 (فکر)　2۔ صحیح بخاری: 1374 (ابن کثیر)　3۔ صحیح بخاری: 2451 (ابن کثیر)
4۔ صحیح مسلم: 2451، جلد 2، صفحہ 915 (علمیہ)　5۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1961 (علمیہ)　6۔ شعب الایمان: 10877 (علمیہ)

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا یعنی قرآن کی تفسیر کیونکہ اسے نیک اور گناہ گار دونوں پڑھتے ہیں۔(1)

2 یہ یوتی کا مفعول اول ہے۔ مفعول ثانی کے اہتمام کے لئے اسے مؤخر کیا گیا۔ اسی وجہ سے فعل کو اس مفعول کے لئے خاص کیا کیونکہ یہی اس ارشاد میں مقصود ہے۔

3 یوت مجہول کا صیغہ ہے اور یہی جمہور کی قرأت ہے۔ یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے اسے معروف پڑھا ہے، تو پھر تقدیر کلام یوں ہوگی مَنْ يُّؤْتِيْهِ اللّٰهُ جسے اللہ تعالیٰ حکمت عطا کرے۔

4 خیر کو تعظیم کے لئے نکرہ ذکر کیا۔ معنی یہ ہوگا ایسا خیر کثیر جو دونوں جہانوں کی خیر کو جامع ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جس کے بارے خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین میں سمجھ عطا کر دیتا ہے بے شک میں نعمتیں تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا کرنے والا ہے، متفق علیہ (2) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب انسان فوت ہوتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے مگر تین عمل صدقہ جاریہ، علم جس سے نفع حاصل کیا جارہا ہو یا نیک بچہ جو اس کے لئے دعا کرتا ہو، اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (3) حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے بھلائی پر راہنمائی کی تو اس کے لئے اتنا اجر ہے جتنا اجر اس کے کرنے والے کا ہوتا ہے اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (4) حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرماتے ہیں عالم کی عابد پر فضیلت اسی طرح ہے جس طرح چودھویں کی رات میں چاند کو دوسرے ستاروں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ بے شک انبیاء دینار اور درہم ورثہ نہیں چھوڑتے، بے شک وہ علم کا ورثہ چھوڑتے ہیں۔ جس نے علم حاصل کیا اس نے وافر حصہ لیا (5) اسے امام ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابو امامہ باہلی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کا ذکر فرمایا۔ ان میں سے ایک عابد تھا اور دوسرا عالم رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عالم کی عابد پر فضیلت اس طرح ہے جیسے مجھے تم میں سے ادنیٰ ترین انسان پر فضیلت حاصل ہے۔ پھر فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے اور زمین و آسمان والے، یہاں تک کہ چیونٹی اپنی بل میں اور مچھلی پانی میں اس آدمی کے لئے دعا کرتے ہیں جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دیتا ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(6)

5 اللہ تعالیٰ نے انفاق فی سبیل اللہ اور دوسرے امور میں جو آیات نازل کی ہیں ان میں سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں جو علوم بالفعل اور بالقوہ ودیعت کئے ہیں ان میں غور و فکر نہیں کرتا مگر دانشمند آدمی۔ اولوا الالباب ایسے دانشمند لوگوں کو کہتے ہیں جو وہم اور شیطانی خطرات کے معارضہ سے محفوظ ہوں۔ میں کہتا ہوں یہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب نفس کو مکمل فنا کر دیا جائے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 616 (علمیہ) 2۔ صحیح بخاری: 71 (ابن کثیر) 3۔ صحیح مسلم: 1631، جلد 11، صفحہ 71 (علمیہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 13 صفحہ 34 (علمیہ) 5۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2682 (علمیہ) 6۔ ایضاً: 2685 (علمیہ)

"اور جو تم خرچ کرتے ہو۱ یا منت مانتے ہو۲ تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۳ اور نہیں ہے ظالموں کے لئے۴ کوئی مددگار۵"

۱۔ یہاں نفقہ سے مراد خرچ کرنا ہے، تھوڑا یا زیادہ، خفیہ یا اعلانیہ، حق کی راہ میں یا باطل کے راستہ میں، سب کو شامل ہے۔

۲۔ یعنی تم نے اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے نفسوں پر جو طاعت لازم کی ہے، خواہ شرط لگائی ہو یا نہ لگائی ہو۔

۳۔ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ پس تمہیں جزا دے گا۔ اس میں "ہ" ضمیر ما کی طرف لوٹ رہی ہے۔

۴۔ یہاں ظالمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تھے نہ نذریں پوری کرتے تھے یا وہ ریاء اور معصیت میں اپنا مال خرچ کرتے تھے۔

۵۔ ایسے مددگار جو ان کی مدد کریں اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کو ان سے روکیں۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

"اگر ظاہر کرو (اپنی) خیرات۱ تو بہت اچھی بات ہے۲ اور اگر پوشیدہ رکھو صدقوں کو اور دو انہیں فقیروں کو تو یہ بہت بہتر ہے تمہارے لئے۳ اور (صدقہ کی برکت سے) مٹا دے گا۴ تم سے تمہارے بعض گناہ۵ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خبردار ہے۶"

۱۔ یعنی اگر تم صدقات کو ظاہر کرو مگر ریاء کاری کے لئے نہیں۔

۲۔ یعنی ان کا ظاہر کرنا کتنا اچھا ہوتا ہے۔ ابن کثیر، ورش اور حفص رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہاں اور سورۂ نساء میں نون اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قالون، ابوبکر، ابوعمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نون کے کسرہ اور عین کی حرکت کے اخفاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کو ساکن کرنا بھی جائز ہے۔ باقی قراء نے نون کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ سب لغتیں ہیں۔

۳۔ یعنی فقراء کو مخفی طریقے سے دو کیونکہ یہ اعلانیہ صدقہ دینے سے افضل ہے۔ ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خفیہ انداز میں صدقہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو ختم کر دیتا ہے اور صلہ رحمی عمر میں اضافہ کرتی ہے(1) اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سات قسم کے افراد کو اللہ تعالیٰ اپنا خصوصی سایہ عطا فرمائے گا جبکہ اس روز اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا (1) عادل امام، (2) ایسا نوجوان جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہوئے پروان چڑھا ہو، (3) ایسا آدمی جس کا دل مسجد کے ساتھ ہی لگا رہے جب وہ مسجد سے نکلے، یہاں تک کہ وہ واپس آئے، (4) ایسے دو آدمی جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر باہم محبت کریں، اسی پر وہ جمع ہوں اور اسی پر وہ جدا ہوں، (5) ایسا آدمی جو تنہائی میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑیں، (6) ایسا آدمی جسے حسب و جمال والی عورت دعوت دے تو وہ کہے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں، (7) ایک ایسا آدمی جو صدقہ کرے تو اسے مخفی رکھے، یہاں تک کہ اس کا بایاں ہاتھ نہ جانے جو اس کے دائیں ہاتھ نے خرچ کیا ہو، متفق علیہ (2) حضرت عبداللہ بن مسعود سے ایک مرفوع روایت مروی ہے تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 621 (علمیہ)
2۔ صحیح بخاری: 629 (ابن کثیر)

ایسا آدمی جو رات کو کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہوئے، قیام کرے ایسا آدمی جو دائیں ہاتھ سے صدقہ کرے تو اسے بائیں ہاتھ پر مخفی رکھے۔ ایک ایسا آدمی جو جنگ میں شریک ہو اس کے ساتھی بھاگ جائیں، وہ دشمن کے سامنے ڈٹا رہے۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے(1) حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین افراد کو اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے اور تین کو مبغوض رکھتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے، وہ یہ ہیں:۔(1) ایک آدمی کسی قوم کے پاس آتا ہے اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر ان سے سوال کرتا ہے، باہمی قرابت اور رشتہ داری کی وجہ سے سوال نہیں کرتا، اسے کوئی کچھ نہیں دیتا۔ انہیں میں سے ایک پیچھے رہ جاتا ہے، وہ سائل کو خفیہ طریقے سے عطیہ دیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ اور لینے والے کے سوا کوئی نہیں جانتا۔(2) ایک قوم رات کو سفر کرتی ہے۔ جب نیند انہیں محبوب ہوتی ہے، ہر محبوب ترین چیز اپنے سر رکھ دیتے ہیں (سو جاتے ہیں) انہیں میں سے ایک آدمی آہ وزاری کرتے ہوئے قیام کرتا ہے اور میری آیات کی تلاوت کرتا ہے۔(3) ایک آدمی جنگ میں شریک تھا۔ وہ دشمن سے مقابلہ کرتا ہے، اس کے ساتھی بھاگ جاتے ہیں، وہ ان کی طرف سینہ تان کر آگے بڑھتا ہے، یہاں تک کہ اسے شہید کر دیا جاتا ہے یا اسے فتح نصیب ہوتی ہے۔ تین وہ افراد جنہیں اللہ تعالیٰ مبغوض رکھتا ہے وہ یہ ہیں: بدکار بوڑھا، متکبر فقیر، ظالم غنی(2) اسے ترمذی اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔

ے ابن کثیر، ابوعمرو اور ابوبکر رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے جمع متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور مرفوع پڑھا ہے۔ حفص اور ابن عامر رحمہم اللہ تعالیٰ نے واحد مذکر غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ مرفوع ہے کیونکہ یہ جملہ فعلیہ ہے اور کلام یہاں سے شروع ہے یا جملہ اسمیہ ہے اور فاء کے مابعد پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہو گی نَحْنُ نُكَفِّرُ یا اَللّٰهُ يُكَفِّرُ یا يُكَفِّرُ اللّٰهُ نافع، حمزہ اور کسائی نے نون اور جزم کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ فاء کے محل پر معطوف ہے کیونکہ جزاء کی وجہ محل جزم میں ہے۔

ے ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس میں مِن زائدہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مِن تبعیضیہ ہے۔ یہ گناہ صغیرہ کو معاف فرما دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خفیہ صدقہ گناہ کو مٹا دیتا ہے۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ سے صغیر میں نقل کیا ہے۔

ے یہ صدقہ کو راز داری سے پیش کرنے کی رغبت دلانے کے لئے ہے۔

نسائی، طبرانی، بزار، حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ اور دوسرے محدثین نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام مشرک رشتہ داروں پر تھوڑا سا صدقہ کرنا بھی ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ سے پوچھا آپ ﷺ نے انہیں رخصت عطا فرمائی تو یہ آیت نازل ہوئی لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ(3) اسی طرح ابن ابی شیبہ نے محمد بن حنفیہ سے مرسل روایت ذکر کی ہے ابن ابی حاتم نے آپ سے ہی روایت نقل کی ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ حکم دیتے تھے کہ اہل اسلام پر ہی صدقہ صرف کیا جائے تو یہ آیت نازل ہوئی۔(4)

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝

"نہیں ہے آپ کے ذمہ ان کو سیدھی راہ پر چلانا۔ ہاں اللہ سیدھی راہ پر چلاتا ہے جسے چاہتا ہے ے اور جو کچھ تم خرچ کرو

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:2567 (علمیہ)
2۔ ایضاً:2568 (علمیہ)
3۔ مستدرک حاکم:3128 (علمیہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 631 (فکر)

اپنے مال سے تو (اس میں) تمہارا اپنا فائدہ ہے [3] اور تم تو خرچ ہی نہیں کرتے ہو سوائے اللہ کی رضا طلبی کے [4] اور جتنا کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پورا ادا کر دیا جائے گا تمہیں [5] اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا [6]"

[1] ہر دین سے تعلق رکھنے والے ہر انسان پر صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ اسی طرح امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر کا ذکر کیا۔ ابن ابی شیبہ نے سعید بن جبیر سے مرسل روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے دینی بھائیوں کے علاوہ کسی پر صدقہ نہ کرو، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تمام ادیان کے لوگوں پر صدقہ کرو۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ تم لوگوں کو ہدایت یافتہ بنا دو اس لئے آپ ان کو صدقہ نہیں دیتے تا کہ وہ اپنی ضرورت کی وجہ سے دین اسلام میں داخل ہو جائیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کلبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول اس آیت کے سبب نزول میں ذکر کیا ہے کہ کچھ مسلمانوں کی یہودیوں میں رشتہ داری تھی۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ ان کی مالی مدد کرتے تھے۔ جب اسلام قبول کر لیا تو اسے ناپسند کیا کہ وہ ان پر اپنا مال خرچ کریں۔ ساتھ ہی یہ بھی ارادہ کیا کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔(1)

[2] لیکن اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دیتا ہے جن کے بارے میں چاہتا ہے کیونکہ ہدایت تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ سے ہی ملتی ہے۔

[3] خیر سے مراد نفقہ معروفہ ہے، یا خیر سے مراد مال ہے، یعنی اس کا نفع تمہاری طرف ہی پلٹتا ہے۔ اس لئے فقیر کو دے کر اس کے بدلے میں کسی چیز کی تمنا نہ کرو اور ردی چیز بھی خرچ نہ کرو۔

[4] واؤ حالیہ ہے۔ یہ جملہ تُنْفِقُوْا فعل کی ضمیر سے حال ہے یعنی تم جو مال بھی خرچ کرو اس حال میں کہ تم اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر خرچ کرنے والے ہو تو وہ تمہارے اپنے لئے ہے۔ یا اس کا ما قبل پر عطف ہے۔ معنی یہ ہوگا "اے مومنو! تمہارا خرچ کرنا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر، تو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اس کے بدلے میں فقیر سے تمنائیں کرتے ہو یا ردی مال خرچ کرتے ہو۔" یہ مومنوں کی حالت کی خبر دیتا ہے۔ یہ حال اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ احسان جتلانا اور اس قسم کی چیزوں کو چھوڑ دیں۔ یہ لفظاً نفی ہے، اور معنی نہی ہے یعنی تم خرچ نہ کرو مگر اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا پیش نظر نہ ہو تو خرچ کرنا حرام ہے کیونکہ اس میں مال ضائع کرنا ہے جو حرام ہے۔

[5] تمہیں کئی گنا بدلہ دیا جائے گا اس (یُوَفَّ) میں اداء کا معنی موجود ہے۔ اس لئے الی حرف جار کے ساتھ اسے متعدی کیا گیا۔ یا اس کا معنی یہ ہے تم جو مال خرچ کرتے ہو اس کا بدل پورا پورا تمہیں دیا جائے گا۔ یہ فرشتہ کی اس دعا کی قبولیت کی وجہ سے ہوگا اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا، جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ ان تینوں کے درمیان حرف عطف ذکر فرمایا جبکہ ظاہر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ حرف عطف نہ ہو کیونکہ بعد میں آنے والا جملہ پہلے جملہ شرطیہ کی تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں حرف تاکید کا قصد نہیں کیا گیا بلکہ ایک دلیل کے بعد دوسری دلیل لائی گئی ہے کہ احسان جتلانا اور اذیت دینا قبیح ہے کیونکہ پہلا جملہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ جب ایک عمل تمہارے لئے نفع مند ہے اس کے کرنے پر غیر پر احسان جتلانا یہ قبیح عمل ہے۔ دوسرا جملہ اس مفہوم پر دلالت کرتا ہے جس عمل سے تم اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ سے فقیر پر احسان جتلانا ایسے ہی ہے جیسے تم ایسے آدمی سے عوض طلب کر رہے ہو جس پر بدلہ دینا واجب ہی نہ تھا۔ تیسرا جملہ اس دلیل پر دلالت کرتا ہے کہ جس عمل کے عوض تم کئی گنا اجر وصول کر چکے ہو۔ اس کی وجہ سے غیر پر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 392 (فکر)

احسان جتلانا صحیح نہیں کیونکہ جب ایک عوض بھی وصول کر لیا جائے تو احسان باقی نہیں رہتا جس طرح خرید و فروخت میں ہوتا ہے۔

لے یعنی تمہارے اعمال کے ثواب میں کچھ بھی کمی نہ کی جائیں گی۔ یہ نفلی صدقہ کے بارے میں ہے کہ ذمی کو صدقہ دیا جا سکتا ہے مگر فرضی صدقہ صرف مسلمانوں کو ہی دیا جا سکتا ہے۔ صدقہ فطر، کفارات اور نذر میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کیونکہ مصرف عام ہے اس لئے ذمی کو دینا جائز ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ صدقات فقراء کے لئے ہیں۔ لیکن انہیں زکوٰۃ دینا جائز نہیں کیونکہ جب حضور ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو اس میں یہ بھی فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض فرمائی، جو ان کے اغنیاء سے لی جائے گی اور ان کے فقراء کو لوٹا دی جائے گی، متفق علیہ (1) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے صاحب ہدایہ نے کہا یہ مشہور حدیث ہے، کتاب اللہ کے مطلق حکم پر اس سے زیادتی کرنا جائز ہے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آیت عام ہے، حربی اس سے بالاجماع خاص ہے۔ اجماع کو اس آیت کی طرف منسوب کرتے ہیں: اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ (اللہ تمہیں صرف ان لوگوں سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی) تو اس کے بعد خبر واحد سے بھی اس کی تخصیص جائز ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝

"خیرات ان فقیروں کے لئے ہے لے جو روکے گئے ہیں اللہ کی راہ میں ٢ جنہیں فرصت ملتی انہیں ٣ (روزی کمانے کے لئے) چلنے پھرنے کی زمین میں ٤ خیال کرتا ہے ٥ انہیں ناواقف ٦ (کہ یہ) مالدار (ہیں) بوجہ ان کے سوال نہ کرنے کے ٧ (اے حبیب) آپ پہچانتے ہیں انہیں ٨ ان کی صورت سے ٩ یہ نہیں مانگا کرتے لوگوں سے لپٹ کر ١٠ اور جو کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پس یقیناً اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے ١١"

لے یہ یا تو ظرف لغو ہے، مَا تُنْفِقُوْا کے متعلق ہے۔ یعنی تم فقراء پر جو مال بھی خرچ کرتے ہو وہ تمہارے لئے ہی ہے، اس کا تمہیں کئی گنا اجر دیا جائے گا۔ یا یہ فعل محذوف کے متعلق ہے جس فعل محذوف پر سابقہ کلام دلالت کرتی ہے، وہ فعل محذوف اعمدوا یا اجعلوا ہوگا۔ یا یہ ظرف مستقر ہے اور مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ کلام یوں ہوگی صَدَقٰتُكُمْ لِلْفُقَرَآءِ۔ یا یہ خبر مقدم ہوگی اور مبتدا بعد میں محذوف ہوگا، وہ حَقٌّ عَلَيْكُمْ ہے۔

٢ جو علوم ظاہری اور باطنی کے حصول اور جہاد میں روک لئے گئے ہیں۔

٣ کیونکہ وہ حصول علم اور جہاد میں مشغول ہونے کی وجہ سے طاقت نہیں رکھتے۔

٤ کہ تجارت اور کمانے کے لئے سفر کریں۔

٥ ابو جعفر، ابن عامر، عاصم اور حمزہ رحہم اللہ تعالیٰ نے مضارع میں سین کو مفتوح پڑھا ہے اور باقی قراء نے اسے مکسور پڑھا ہے۔ مثال

---

(۱) ماضی اور مضارع دونوں مکسور العین ہوں۔ یہ مثال میں تو باب آتا ہے لیکن مثال کے علاوہ نادر اور شاذ ہے۔

1: صحیح بخاری: 1425 (ابن کثیر)

کے علاوہ یہ باب شاذ (!) ہے۔

لے جوان کی حالت سے ناواقف ہے۔

یے کیونکہ وہ سوال نہیں کرتے، اس لئے انہیں غنی خیال کرتا ہے۔ تعفف یہ عفت سے باب تفعل کا مصدر ہے۔ یہ ان کا قناعت کرنے کی وجہ سے بطور تکلف سوال کو ترک کرنا ہے۔

ے اے نبی مکرم ﷺ آپ ان کی حاجت اور فقر کو جانتے ہیں۔

ے ان کی گفتگو سے نہیں بلکہ ان کی نشانیوں سے آپ انہیں پہچانتے ہیں۔ سیماء ایسی علامت کو کہتے ہیں جس کی مدد سے کسی شے کو پہچانا جاتا ہے یعنی بھوک اور تکلیف کو رنگوں کی زردی اور کپڑوں کی بوسیدگی سے۔

ے الحاف کا معنی اصرار کرنا ہے۔ وہ مسئول عنہ کے ساتھ اس وقت تک چمٹے رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے عطا کر دے۔ معنی یہ ہے کہ وہ اکثر سوال کرتے ہی نہیں۔ اسی وجہ سے جاہل انہیں غنی سوال کرتے ہیں جبکہ ان کی حاجت ان کے چہروں سے عیاں ہوتی ہے۔ اگر وہ کبھی ضرورت کی وجہ سے سوال کریں بھی تو اصرار نہیں کرتے۔ ایک قول یہ کہا گیا کہ یہ مطلق سوال کرنے کی نفی ہے، یعنی وہ مطلقاً سوال نہیں کرتے کہ ان سے اصرار واقع ہو۔ الحاف مفعول مطلق ہے کیونکہ یہ بھی سوال کی ایک قسم ہے یا یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد اہل صفہ ہیں(1) یہ تقریباً چار سو فقراء، مہاجرین میں سے تھے۔ ان کے مدینہ طیبہ میں مکانات تھے نہ خاندان۔ یہ مسجد کے چبوترہ میں بیٹھتے تھے۔ وہ اپنے اوقات عبادت اور علم سیکھنے میں گزارتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ جب بھی کوئی لشکر روانہ کرتے تو انہیں ضرور بھیجتے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ان پر اپنے اموال خرچ کرنے پر برانگیختہ کیا، جس کے پاس کچھ زائد ہوتا شام کے وقت ان کے پاس لے آتا۔ حضرت عطاء بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو بنی اسد سے تعلق رکھتے تھے، انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جس نے سوال کیا، جبکہ ان کے پاس ڈیڑھ اونس (ایک اوقیہ) یا اس کی مثل ہو اس نے الحاف کیا(2) اسے امام مالک، ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی رسی سے لکڑیوں کا گٹھا باندھ کر اپنی پشت پر لائے، اس طرح اللہ تعالیٰ اس کا چہرہ لوگوں سے محفوظ رکھے اس کے حق میں بہتر ہے اس کی بجائے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے چاہیں تو وہ اسے دے دیں، چاہیں نہ دیں۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبکہ آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے اور صدقہ اور سوال نہ کرنے کا ذکر فرما رہے تھے، اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے، متفق علیہ(4) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو لوگوں سے سوال کرتا ہے اور اس کے پاس ایسی چیز موجود ہو جو اسے کفایت کرتی ہو، وہ قیامت کے روز آئے گا کہ اس کا سوال اس کے چہرے میں نشان کے طور پر موجود ہوگا۔ عرض کی گئی کتنا مال اسے کفایت عطا کرتا ہے؟ فرمایا پچاس درہم اور سونا اتنی قیمت کا(5) اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا۔ سہیل بن حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے لوگوں سے سوال کیا جبکہ اس کے پاس اتنا مال تھا جو اسے کفایت کرتا تو اس نے اپنے لئے آگ کا اضافہ کیا۔ نفیلی نے کہا جو اس کے راویوں میں

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 632 (علمیہ) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 8 صفحہ 363 (ارشاد) 3۔ صحیح بخاری: 1402 (ابن کثیر)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1362 (ابن کثیر) 5۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 410 (علمیہ)

سے ایک ہے کہ وہ غنی کونسی ہے جس کی موجودگی میں سوال مناسب نہیں ہوتا، کہا اس قدر جو اس کے دوپہر اور شام کے کھانے کے لئے کافی ہو۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ اس کے پاس ایک روز یا رات اور دن کے لئے سیر ہو کر کھانے کا سامان موجود ہو۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1) میں کہتا ہوں سوال کی حرمت کے نصاب میں وارد ہونے والی احادیث میں جمع کی صورت یہ ہوگی کہ اسے لوگوں کے حالات کے اختلاف پر محمول کیا جائے جس کے پاس دن رات کے سیر ہونے کا کھانا موجود ہو اور وہ آئندہ کل کے لئے ایسی ہی امید رکھتا ہو اس کے لئے سوال کرنا حلال نہیں اور جو اس کی امید نہیں رکھتا اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے، یہاں تک کہ اسے وہ چیز حاصل ہو جو اتنی مدت کے لئے اسے کفایت کر جائے جن چیزوں کی اسے عموماً ضرورت ہوتی ہے اور جس کے پاس سیر ہو کر کھانے کی چیزیں تو موجود ہوں لیکن اس کے پاس ستر عورت کے لئے لباس اور دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کا سامان موجود نہ ہو تو جس چیز کی اسے ضرورت ہے اس کا سوال کرنے کی اسے اجازت ہے۔ چالیس درہم سوال کے حرام ہونے کا مطلقاً نصاب ہے ہو اللہ اعلم۔

(1) انفاق کی ترغیب دی، خصوصاً ایسے لوگوں کی مدد کرنے کی جن کا ذکر پہلے آیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

”جو لوگ خرچ کیا کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں چھپ کر اور اعلانیہ (1) تو ان کے لئے ان کا اجر ہے اپنے رب کے پاس اور نہ انہیں کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے (2)۔“

(1) یعنی تمام اوقات اور تمام احوال میں وہ خرچ کرتے ہیں، جب کبھی بھی کسی محتاج کی ضرورت ان تک پہنچتی ہے اس کو پورا کرنے میں جلدی کرتے ہیں۔ اس میں تاخیر نہیں کرتے وہ وقت اور حال کا بہانہ نہیں بناتے۔ ابن منذر نے ابن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت عبدالرحمٰن بن عوف اور عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حق میں نازل ہوئی، جب انہوں نے غزوہ تبوک کے موقع پر مال پیش کیا تھا(2) عبدالرزاق، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور طبرانی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں نازل ہوئی، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس چار درہم تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رات کے وقت ایک درہم، دن میں ایک درہم، خفیہ طور پر ایک درہم اور اعلانیہ ایک درہم خرچ کیا(3) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے وہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب یہ آیت لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا نازل ہوئی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کثیر دینار اصحاب صفہ کی طرف بھیجے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رات کے اندھیرے میں ایک وسق (ا) کھجوروں کا بھیجا تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی، دن اور اعلانیہ طریقہ سے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صدقہ اور رات اور مخفی طریقہ سے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صدقہ مراد ہے(4) امام بغوی رحمہ اللہ تعالیٰ عنہ نے ذکر کیا ہے کہ ابوامامہ، ابودرداء، مکحول اور اوزاعی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جو جہاد کے لئے اپنے پاس گھوڑے رکھتے ہیں کیونکہ وہ ان

حاشیہ (ا) تقریباً چھ من۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 6 صفحہ 385 (ارشد) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 242 (علمیہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 242 (علمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 336 (علمیہ)

گھوڑوں کو رات، دن، خفیہ اور اعلانیہ چارہ کھلاتے ہیں (1) طبرانی اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے یزید بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ اپنے باپ سے، وہ اپنے دادا سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں، جبکہ یزید اور اس کا باپ دونوں مجہول ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس کے وعدہ کی تصدیق کرتے ہوئے جہاد کی غرض سے گھوڑا رکھا تو اس کی خوراک، پانی، لید اور بول قیامت کے روز اس کے نامہ اعمال میں رکھے جائیں گے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ (2)

ے یہ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ کی خبر ہے اس صورت میں فاء سببیہ ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جو منہم ہے اس صورت میں فاء عاطفہ ہوگی۔

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

"جو لوگ کھایا کرتے ہیں سود[1] وہ نہیں کھڑے ہوں گے[2] مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے[3] وہ جسے پاگل بنا دیا ہو شیطان نے[4] چھو کر[5] یہ حالت اس لئے ہوگی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ سوداگری بھی سود کی مانند ہے[6] حالانکہ حلال فرمایا اللہ تعالیٰ نے تجارت کو[7] اور حرام کیا سود کو[8] پس جس کے پاس آئی نصیحت اپنے رب کی طرف سے[9] تو وہ (سود سے) رک گیا[10] تو جائز ہے اس کے لئے جو گزر چکا[11] اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے[12] اور جو شخص پھر سود کھانے لگے[13] تو وہ لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے[14]"

ل ربوٰا واؤ کے ساتھ لکھا گیا ہے یہ ان کی لغت پر ہے جو اس میں تفخیم (۱) کرتے ہیں، جس طرح لفظ صلوٰۃ لکھا جاتا ہے، اس کے بعد الف زائد کیا گیا ہے واؤ جمع کے ساتھ تشبیہ دینے کے لئے۔

ع وہ قبروں سے نہیں اٹھیں گے۔ عبد الرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی تفسیر میں یہی نقل کیا ہے (3)۔

ع اس میں کاف مصدر کی صفت ہے۔

ع یہاں شیطان سے مراد جن ہے۔ خبط کا معنی سخت ضرب اور فساد برپا کرنا ہے۔ قاموس میں ہے خبط الشیطن فلانا یعنی اسے اذیت پہنچائی۔ تخبط کا معنی بھی یہی ہے۔ یاتخبطه کا معنی فاسد کرنا ہے۔ (4)

ھ مس کا معنی جنون ہے یا چھونا ہے۔ یہ جار مجرور یقوم یا یتخبطه کے متعلق ہے، یعنی وہ جنونی کھڑے ہوتے ہیں اس کی طرح جسے شیطان نے اذیت پہنچائی ہو اور اس کی عقل کو فاسد کر دیا ہو، یا اس آدمی کی طرح جسے شیطان نے محض چھونے کے ساتھ خراب کر دیا ہو۔

حاشیہ (۱) موٹا کر کے پڑھنا۔

1۔ صحیح بخاری: 2698 (ابن کثیر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 397 (فکر)

3۔ القاموس المحیط از محمد بن یعقوب فیروز آبادی، جلد 1 صفحہ 97-896 (التراث العربی) 4۔ معجم از کبیر طبرانی، جلد 17، صفحہ 188 (الامۃ)

یعنی شیطان کے مس کرنے سے اسے جنون اور فساد عقل لاحق ہو گیا۔ مرض، مرگی اور جنون شیطان کے مس کرنے سے لاحق ہوتا ہے۔
یہاں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ کہا جائے کہ یہ آیت ان کے گمان کے مطابق وارد ہوئی کہ وہ خیال کرتے تھے کہ شیطان انسانی عقل کو خراب کر دیتا ہے کیونکہ شیطان کے چھونے سے مرض کا لاحق ہونا، یہ کتاب و سنت سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت ایوب علیہ السلام کے قصہ میں فرماتا ہے: اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ پہنچائی ہے مجھے شیطان نے بہت تکلیف اور دکھ۔ رسول اللہ ﷺ نے مستحاضہ کے بارے فرمایا کہ یہ شیطان کے کچوکوں میں سے ایک کچوکا ہے (1) سود خوروں کا قبر سے کھڑا ہونا بھی اسی طرح ہوگا اس کی وجہ یہ ہے جو کچھ انہوں نے ربو میں کھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں میں اس کا اضافہ کرتا رہتا ہے تو ان کے پیٹ یوں ہو جاتے ہیں کہ ان میں سانپ ہوں جو ان کو بوجھل کر دیتے ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسراء کے واقعہ میں حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا مجھے جبرئیل امین ایسے لوگوں کے پاس لے گئے جن میں سے ہر ایک آدمی کا پیٹ بڑے کمرے کی مانند تھا۔ یہ لوگ فرعونیوں کی گزرگاہ میں تھے۔ فرعونیوں کو صبح و شام آگ پر پیش کیا جاتا تھا۔ فرعونی ان بھڑکائے ہوئے اونٹوں کی طرح جو اندھا دھند پتھروں اور درختوں کو روندتے چلے جاتے ہیں، نہ سنتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں، سامنے سے دوڑے چلے آرہے تھے۔ جب ان پیٹیوں کو ان کی آہٹ محسوس ہوئی تو کھڑے ہونے کا ارادہ کیا لیکن ان کے پیٹوں نے انہیں جھکا دیا اور فرعونیوں نے انہیں روند ڈالا۔ پھر ایک شخص اٹھنے لگا لیکن اس کا پیٹ اس کو لے جھکا اور وہ بھی روند ڈالا گیا۔ فرعونی آتے جاتے انہیں روندتے رہے۔ ان پر یہ عذاب برزخ میں دنیا و آخرت کے درمیان ہو رہا تھا۔ فرمایا قوم فرعون کہتی ہے اے اللہ قیامت کبھی بھی برپا نہ کرنا۔ فرمایا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائے گا قوم فرعون کو شدید ترین عذاب میں داخل کر دو۔ میں نے کہا اے جبرئیل یہ کون ہیں؟ جبرائیل نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھاتے تھے۔ یہ نہیں کھڑے ہوتے مگر اس آدمی کی طرح جسے شیطان نے چھو کر مجنون بنا دیا ہو۔ اسے بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (2) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس رات مجھے سیر کرائی گئی میں ایک ایسی قوم کے پاس آیا جن کے پیٹ کمرے کی مانند تھے جس میں سانپ تھے جو پیٹ کے باہر سے دیکھے جا سکتے تھے۔ میں نے کہا یہ کون ہیں؟ اے جبرئیل! انہوں نے عرض کی یہ سود خور ہیں۔ اسے امام احمد اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے (3) ابو یعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے، فرمایا قیامت کے روز وہ اس علامت سے پہچانے جائیں گے، وہ نہیں کھڑے ہوں گے مگر ایک مجنون کی طرح (4) طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے عوف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس کی مثل مجنون یتخبط کے الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے (5) اس آیت کی تاویل میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس مجلس میں وہ سود کا مال کھاتے ہیں وہ اس سے نہیں اٹھتے مگر مجنون کی طرح۔ اس کا معنی یہ ہے کہ سود کھانے کے ساتھ اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ حق و باطل حلال و حرام میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا، جس طرح مجنون آدمی خیر اور شر میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا کیونکہ حرام کا لقمہ اس کا جزو بدن بن جاتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی حقیقت بدل جاتی ہے جبکہ دوسرے معاصی اعراض کی مانند ہیں جو حقیقت پر زائد چیز کی طرح ہیں، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے سود خور پر لعنت فرمائی اور اسے زنا سے بھی شدید قرار دیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایات امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہیں (6)

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 1، صفحہ 163 (علمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 398 (فکر) 3۔ سنن ابن ماجہ: 2273 (علمیہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 642 (علمیہ) 5۔ معجم کبیر از طبرانی، جلد 18، صفحہ 60 (امانۃ) 6۔ صحیح مسلم 1598، جلد 11، صفحہ 22 (علمیہ)

اور ابی جحیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی روایت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے اور کھلانے پر لعنت کی (1) ابوداؤد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن مسعود سے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے جابر سے روایت کی ہے کہ اس کے لکھنے والے اور گواہوں پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت کی فرمایا وہ سب برابر ہیں۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے تاہم "شاہدیہ" (گواہوں) کی جگہ "مانع صدقہ" کے الفاظ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہیں فرشتوں نے غسل دیا نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک درہم سود کا جسے ایک انسان کھاتا ہے جبکہ وہ جانتا ہو یہ چھتیس بار زنا کرنے سے شدید ہے اسے امام احمد اور دار قطنی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔(2) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی کی مثل ابن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی کی مثل روایت موجود ہے اس میں یہ الفاظ زائد ہیں جس کا گوشت سود سے پیدا ہوا آگ اس کے زیادہ لائق ہے۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سود میں ستر گناہ ہیں ان میں سے کم سے کم آدمی کا اپنی ماں سے نکاح کرنا ہے(3) اسے ابن ماجہ اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔ روایت میں لفظ الحوب کا معنی گناہ ہے۔

یعنی انہیں یہ سزا ان کے کفر کے باعث اور حرام چیز کو حلال جاننے کی وجہ سے ہے۔ یہ امر اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ یہ سزا کفار کے ساتھ خاص ہے نہ کہ ان مومنین کے لئے جو اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ یا ذلک سے اس دائمی عذاب کی طرف اشارہ ہے جو اس آیت کریمہ سے سمجھا جا رہا ہے "لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا" کیونکہ نفی ہے جو نکرہ مصدر پر داخل ہے اور آئندہ زمانوں میں سے زمانہ بھی نکرہ ہے۔ جب نکرہ نفی کے تحت داخل ہو تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا اس عذاب کی ابدیت کفار کے ساتھ خاص ہے مگر مومنین میں سے جو اس کا ارتکاب کرے گا اسے یہ عذاب پہنچے گا یہاں تک کہ اسے کسی نبی کی شفاعت یا اپنے رب کی رحمت اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا کلمہ آ پہنچے۔ اصل کلام تو یوں ہے اِنَّمَا الرِّبٰوا مِثْلُ الْبَيْعِ لیکن ربٰوا کی حرمت کی نفی میں مبالغہ کرنے کے لئے اسے الٹ دیا کیونکہ انہوں نے ربٰوا کو اصل بنا دیا۔

فخر الاسلام نے کہا بیع لغت میں مال کو مال سے بدلنا ہے، شرع میں بھی یہی معنی ہے تاہم اس میں باہم رضامندی کی شرط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ باہمی رضامندی بھی لغوی معنی سے ماخوذ ہے کیونکہ جب باہم رضامندی نہ ہو تو لغت میں اسے غصب کہتے ہیں، بیع نہیں کہتے۔ اختیار اور باہم رضامندی کے مبادلہ کے لئے عقل ہونا ضروری ہے۔ اسی وجہ سے اس بات پر اجماع ہے کہ مجنون اور بچے کی بیع نہیں ہوتی۔ ایسا بچہ جو سمجھ بوجھ رکھتا ہو اس کی بیع کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے عقل کی کمی کی وجہ سے بیع صحیح نہیں ہوگی۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اس کی بیع صحیح ہوگی، تاہم عقل کی کمی کی وجہ سے جس نقصان کا اندیشہ ہے اس کو دور کرنے کے لئے ولی کی رائے شرط ہے۔ یہ شرط شرع سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ (تو لکھائے اس کا ولی (سرپرست) انصاف سے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یتیموں کو آزماؤ یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں، اگر تم ان میں دانش پاؤ تو ان کے اموال انہیں دے دو۔ یہ مبادلہ ایک امر کو وجود میں لاتا ہے جو ایجاب و قبول

1۔ صحیح بخاری: 5617 (ابن کثیر)　　2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 16 (محاسن)
3۔ سنن ابن ماجہ: 2274 (علمیہ)

(۱) سے تحقق ہوتا ہے جو دونوں الفاظ فعل ماضی کے ہوں جیسے میں نے بیچا، میں نے خریدا کیونکہ شرع نے یہی الفاظ وضع کئے ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ نے معاطات (سامان ایک دوسرے کے ہاتھ میں دے دینا) کو ایجاب وقبول کے قائم مقام رکھا ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک یہی روایت ہے۔ امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ خسیس چیزوں میں تعاطی ایجاب وقبول کے قائم مقام ہو جائے گا لیکن عمدہ چیزوں میں ایسا نہیں ہوگا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا قول اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا راجح قول یہی ہے کہ تعاطی سے عقد متحقق نہیں ہوتا ہم کہتے ہیں کہ تعاطی ایک دوسرے کو چیز دے دینا قول کی طرح باہم رضامندی پر دلالت کرتا ہے اور یہی مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "مگر وہ تجارت ہو باہم رضامندی کے ساتھ تمہارے درمیان" جو عقد کرنے والا ہے اس کے لئے ولایت شرعیہ کا ہونا ضروری ہے، خواہ وہ مالک ہو وکیل ہو، وصی ہو، رشتہ دار ہو یا کوئی اور۔

مسئلہ:۔ فضولی (ب) کی بیع میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ آدمی جس کے لئے یہ بیع کی گئی ہو وہ جب بعد میں اجازت دے دے تو اس کی یہ اجازت عقد سے پہلے اس کو وکیل بنانے کے قائم مقام ہو جائے گی، اس لئے وہ بیع صحیح ہوگی اور مالک کی اجازت پر موقوف ہوگی۔ اسی طرح فضولی اگر خریدتا ہے تو ان دونوں ائمہ کے نزدیک مشتری کی اجازت پر یہ موقوف ہوگی۔ یہ اس وقت ہوگا جب وہ عقد کرتے وقت چیز کو مشتری کی طرف منسوب کرے مثلاً وہ یہ کہے اپنا غلام زید کے لئے بیچ دو بائع نے کہا میں نے بیچ دیا۔ فضولی نے کہا میں نے اسے زید کے لئے خرید لیا۔ اگر وہ عقد کرتے وقت زید کی طرف اسے منسوب نہیں کرتا تو بیع اس فضولی کے لئے نافذ ہو جائے گی کیونکہ حقیقت میں وہ اب فضولی رہا ہی نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قدیم قول یہی تھا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا راجح مذہب یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی انہیں کی طرح دو روایتیں ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جو وہ حضور ﷺ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں" جو تیرا مال نہیں اسے نہ بیچ" (1) اور جو ابن جوزی نے عمرو بن شعیب رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے وہ اپنے باپ اور وہ دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو تیرا مال نہیں اس کی بیع حلال نہیں اور جس میں ضمانت نہیں اس میں نفع نہیں (2) ہم کہتے ہیں اس سے مراد وہ بیع ہے جس میں جانبین سے مطالبہ ہوتا ہے، وہ نافذ ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ وہ ایسی شے کی بیع ہے جو بیع کے وقت معدوم، ہو پھر وہ اسے خریدے اور مشتری کو بیچے حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ بھی اسی معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ جب حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ایک آدمی میرے پاس آتا ہے، وہ مجھ سے ایسا سامان طلب کرتا ہے جو میرے پاس نہیں (3) میں اس کے ساتھ بیع کر لیتا ہوں۔ پھر میں بازار داخل ہوتا ہوں، اسے خریدتا ہوں اور اسے مشتری کے حوالے کر دیتا ہوں تو حضور ﷺ نے فرمایا اسے نہ بیچ جو تیرے پاس نہیں۔ اسے امام احمد، اصحاب سنن اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنی اپنی صحیح میں یوسف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے انہوں نے حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے۔ یوسف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صراحت موجود ہے کہ اسے حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیث بیان کی۔ بعض سندوں میں عبداللہ بن عصمہ بن یوسف اور حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا نام آتا ہے۔ عبدالحق نے گمان کیا کہ عبداللہ بہت

(ا) جو پہلے قول کرے اسے ایجاب جو بعد میں قول کرے اسے قبول کہتے ہیں۔

(ب) ایسا آدمی جو مالک بھی نہیں اور ولایت کا کوئی دوسرا حق بھی نہیں رکھتا خواہ مخواہ کسی کی مملوکہ چیز کی بیع و شراء کرے۔

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:1232 (علمیہ) 2۔ سنن ابن ماجہ:2188 (علمیہ)

3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:1232 (علمیہ)

ضعیف ہے۔ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ عبداللہ مجہول ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عبداللہ کے بارے جو جرح کی گئی ہے وہ مردود ہے، اس سے تینوں علماء نے حدیث نقل کی ہے۔ نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے استدلال کیا۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حسن صحیح ہے ہمارے پیش نظر عروہ بارقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے ایک دینار عطا فرمایا تا کہ اس کے ساتھ ایک بکری خرید لائے انہوں نے اس سے دو بکریاں خریدیں، پھر ان میں سے ایک بکری دینار کے بدلے میں بیچ دی اور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں ایک بکری اور ایک دینار لائے تو حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تیری تجارت میں برکت ڈالے، تو بعد میں وہ اگر مٹی خریدتے تو اس میں نفع کماتے (1) اسے ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور دار قطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں سعید بن زید ہے جسے قطان اور دار قطنی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ضعیف قرار دیا اور ابن معین رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی توثیق کی۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ اس میں ابولبید لماذہ بن زباد ہے، ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ مجہول ہے، لیکن ابن سعد نے اس کی توثیق کی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تعریف کی۔ منذری اور نووی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس کی سند حسن صحیح ہے۔ امام شافعی اور کرخی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ایک اور سند سے ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ سے وہ شبیب بن عرقدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جنہوں نے اپنی قوم سے وہ عروہ بارقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر یہ صحیح ہے تو میں اس کے مطابق کہوں گا۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسے امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ اس کی قوم غیر معروف ہے۔ یہ روایت مرسل ہے۔ اسی طرح خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ ایک اور سند کے ساتھ شبیب بن عرقدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ ہمیں حسن نے خبر دی وہ عروہ بارقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں تو ارسال جاتا رہا اور سند متصل ہو گئی۔ نیز مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے، اپنے مسند روایت سے قوت حاصل ہو گی جسے ہم نے پہلے ابولبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور وہ عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ، حبیب بن ابی ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں دینار دیا تا کہ وہ قربانی خرید لائے انہوں نے ایک بکری خریدی پھر اسے دو دیناروں کے بدلے بیچ دیا پھر ایک دینار کے بدلے ایک بکری خریدی اور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں ایک بکری اور دینار لائے۔ حضور ﷺ کو اس بارے بتایا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ تیری تجارت میں برکت ڈالے (2) قربانی کو آپ ﷺ نے ذبح کر دیا اور دینار کو صدقہ کر دیا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ حدیث اسی سند سے معلوم ہوئی ہے، میرے نزدیک حبیب نے حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہیں سنا۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ کی سند سے جو اہل مدینہ سے تھے اور وہ حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس شیخ کی وجہ سے وہ ضعیف ہے، و اللہ اعلم۔

جب تیرے لئے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ بیع مال کا مال سے تبادلہ کرنا ہے اور مال دو قسم کے ہیں، جو مقصود بالذات ہوتا ہے جس کی صورت اور مالیت کا قصد کیا جاتا ہے، وہ عین (1) ہے، جو بالذات تو مقصود نہیں ہوتا بلکہ اپنی تخلیق کے اعتبار سے غیر کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے وہ سونا اور چاندی ہے۔ بیع کی پھر چار قسمیں ہیں۔

پہلی قسم: کسی عین چیز کا نقدی کے ساتھ بیع کرنا، یہ بیع مطلق ہے۔ جب بیع مطلق بولی جائے تو ذہن اس طرف ہی جاتا ہے پس عینی چیز مبیع ہو گی اور نقدی ثمن ہو گی۔ اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ بیع کرتے وقت مبیع موجود ہو اور اس کی تعیین بھی کی جائے کیونکہ عقد میں

---

(۱) جو نقدی نہیں ہوتا۔

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1258 (علمیہ)

2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1257 (علمیہ)

بھی مقصود ہوتی ہے اور اس کی صورت اور مالیت کا قصد کیا جاتا ہے۔ اس کے موجود ہونے کی شرط پر حکیم بن حزام اور عمرو بن شعیب رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت جو وہ اپنے باپ سے اور وہ دادا سے نقل کرتے ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اسی طرح ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ادھار کی ادھار کے ساتھ بیع کرنے سے منع فرمایا۔ اسے دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1) اس میں ثمن کے موجود ہونے اور اس کی تعیین کی شرط نہیں بلکہ یہ مشتری کے ذمہ ثابت ہوتی ہے کیونکہ یہ بالذات مقصود نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی صورت کا قصد کیا جاتا ہے۔ قیاس تو یہ تھا کہ ثمن کے موجود ہونے کی شرط لگائی جاتی کیونکہ معدوم چیز مال نہیں ہوتی لیکن شرع نے اس شرط کو باطل کر دیا ہے تاکہ تکلیف کو ختم کر دیا جائے اسے مشتری کے ذمہ ہونے کی شرط لگائی گئی ہے لیکن اس میں یہ شرط بھی ہوتی ہے کہ ثمن کی جنس، مقدار اور صفت معین ہو، اگر وہ ادھار ہے تو مدت کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ تنازع کی طرف نہ لے جائے اور منازعت بیع کے جائز ہونے کے مانع ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودی سے ادھار کھانا خریدا اور لوہے کی زرہ اس کے پاس رہن کے طور پر رکھی۔ یہ روایت متفق علیہ ہے(2) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا آقائے دوعالم ﷺ نے جب اس جہان فانی سے پردہ فرمایا تو آپ ﷺ کی زرہ تیس صاع جو کے عوض ایک یہودی کے پاس رہن کے طور پر موجود تھی، اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3) اسی طرح امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث صحیح ہے بیع کی تعیین اور ثمن کی عدم تعیین پر علماء کا اجماع ہے تاہم ثمن معروف ہونی چاہئے۔

دوسری قسم: عین کی عین کے بدلے بیع ہے۔ اسے مقایضہ (ا) بھی کہتے ہیں۔ اس صورت میں دونوں بدل مبیع بننے کی صلاحت رکھتے ہیں۔ ان عوضوں میں سے ہر عوض میں بالاتفاق وہی شرائط ہوں گی جو مبیع کے لئے ہوتی ہیں اگر دونوں عوض ذوات القیم (ب) میں سے ہوں۔ اگر ان میں سے ایک ذوات الامثال (ج) میں سے ہو اور دوسرا عوض ذوات القیم میں سے ہو تو ذوات القیم والا عوض مبیع ہوگا اور ذوات الامثال والا عوض ثمن ہوگا، کیونکہ ثمن کا عقد کرتے وقت موجود ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ ذمہ میں ہوتا ہے اور ذمہ میں موجود ہونے کا اس وقت تک تصور نہیں کیا جا سکتا جب تک ذہن اس کی مقدار اور صفت کا احاطہ نہ کر سکے۔ اگر دونوں چیزیں ذوات الامثال میں سے ہوں تو احناف کے نزدیک ان عوضوں میں سے ایک عوض کی موجودگی اور تعیین ضروری ہوگی اور وہ مبیع ہوگا اور جو ذمہ میں ہوگا وہ ثمن ہوگا۔ میری رائے یہ ہے کہ دونوں کی موجودگی اور تعیین ضروری ہے کیونکہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی بطور مبیع راجح قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے جب دو جنسیں مختلف ہو جائیں تو نقد بیع ہو تو جیسا چاہو بیع کرو(4) ایک روایت میں یداً بید کی بجائے عیناً بعین کے الفاظ ہیں، تو یداً بید کی روایت کو بھی اسی معنی پر محمول کیا جائے گا۔

تیسری قسم: یہ ہے نقدی کی بیع نقدی کے ساتھ کرنا، اس کو بیع صرف کہتے ہیں۔ جب اس میں مبیع اصل میں نہیں ہوتا بلکہ اصل کے

(ا) جو نقدی نہ ہو بلکہ دوسرا سامان ہو یعنی سامان کی سامان کے بدلے خرید و فروخت۔

(ب) جن کی قیمت لگا کر قدر و منزلت پہچانی جاتی ہے جیسے جانور، سامان تجارت۔

(ج) مثلی چیزیں یعنی وزنی، کیلی اور عددی چیزیں۔ جیسے تمام اجناس گندم، جو، نمک وغیرہ۔

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 71 (محاسن) 2۔ صحیح بخاری: 1962 (ابن کثیر)

3۔ صحیح بخاری: 2759 (ابن کثیر) 4۔ صحیح مسلم: 81، جلد 12 صفحہ (علمیہ)

اعتبار سے دونوں ثمنی ہوتے ہیں تو ایک کو مبیع اور دوسرے کو ثمن بنانے کی کوئی دلیل نہیں۔ اس لئے دونوں بدلوں کو مبیع کی حیثیت دی جائے گی۔ ان دونوں کا مجلس عقد میں موجود ہونا، مجلس میں اس کی تعیین بلکہ اسی مجلس میں ان پر قبضہ بھی ضروری ہوگا کیونکہ دونوں نقدیاں صرف معین کرنے سے معین نہیں ہوتیں بلکہ قبضے کے ساتھ متعین ہوتی ہیں۔

چوتھی قسم:۔ بیع سلم کی ہے۔ یہ بیع مطلق کی ضد ہے۔ اس میں مبیع معدوم اور ثمن موجود ہوتی ہے۔ قیاس تو یہ تھا کہ یہ بیع جائز نہ ہوتی لیکن شرع نے مساکین کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اس بیع کو جائز قرار دیا ہے اور ثمن کو مبیع کا درجہ دیا ہے اور مبیع کی جانب میں کچھ شرائط لگائی ہیں۔ ہم اس کی وضاحت مداینہ کی آیت میں کریں گے ان شاء اللہ۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ بیع مال کا مال کے ساتھ مبادلہ کو کہتے ہیں تو اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مردار، خون، شراب، خنزیر، دوسری تمام چیزیں جو مال نہیں یا شرع نے جن کی مالی حیثیت کو ختم کردیا ہے تو ان کی بیع باطل ہوگی کیونکہ ان کے اندر بیع کا مفہوم معدوم ہے اسی طرح کپڑے اور اس جیسی چیزوں کی بیع ان چیزوں کے ساتھ بھی باطل ہوگی جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کپڑے کی شراب اور خنزیر کے ساتھ بیع فاسد ہوگی، اگر خریدار کپڑے پر قبضہ کرلے تو اس کی بازاری قیمت اس پر ادا کرنا لازم ہوگا۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کو بیع فسخ کرنے کا حق حاصل ہوگا تا کہ وہ گناہ سے بچ سکیں۔

ۃ لغت میں ربو زیادتی کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ "اللہ تعالیٰ صدقات میں اضافہ فرماتا ہے" اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دیئے ہوئے قرض میں اضافہ کرنے اور دونوں عوضوں میں سے ایک عوض کو دوسرے پر زیادہ کرنے کو حرام قرار دیا۔ جمہور علماء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ آیت مجمل ہے کیونکہ عمومی طور پر تجارت میں زیادتی کو طلب کرنا حرام نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے رب سے فضل کے طالب ہو" پس حرام کردہ ایک ایسی زیادتی ہے جو مخصوص صفت پر ہے جس کی پہچان شارع کی طرف سے ہی ہوگی۔ اس لئے یہ مجمل ہے اور رسول اللہ ﷺ نے چھ چیزوں میں زیادتی کی حرمت کا ذکر کیا ہے، وہ اسی مجمل کی وضاحت ہوگی۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سونا سونا کے بدلے، چاندی چاندی کے بدلے، گندم گندم کے بدلے، جو جو کے بدلے، کھجور کھجور کے بدلے، نمک نمک کے بدلے برابر برابر اور ایک ہاتھ سے لے دوسرے ہاتھ سے دے جب یہ اصناف مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو جبکہ نقد ہوں۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1) ایک روایت میں ہے سونے کو سونے کے بدلے، چاندی کو چاندی کے بدلے آخر تک ان کی بیع نہ کرو مگر برابر اور ایک ہاتھ سے لو دوسرے ہاتھ سے دو، یعنی نقداً نہ کہ ادھار لیکن تم سونے کو چاندی، چاندی کو سونے، گندم کو جو، جو کو گندم، کھجور کو نمک، نمک کو کھجور کے بدلے نقداً بیع کرو جس طرح تم چاہو حاقدین میں سے جس نے نمک یا کھجور میں کمی کی یا اس نے زیادتی کی تو اس نے ربو کیا (عوض معین کرنے کے بعد اس میں کمی یا زیادتی کی) اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے جس طرح عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اس کے آخر میں یہ اضافہ کیا جس نے زیادہ کیا یا زیادتی چاہی تو اس نے ربو کا عمل کیا اس میں لینے والے اور دینے والا دونوں برابر ہیں(2) انہیں سے ایک اور روایت ہے "سونے کو سونے کے بدلے نہ بیچو مگر برابر برابر، اس کے بعض کو بعض پر فضیلت نہ دو اور چاندی کو چاندی

1۔ صحیح مسلم: 81، جلد 11، صفحہ 12 (علمیہ) 2۔ صحیح مسلم: جلد 11 صفحہ 12-11-10 (علمیہ)

کے بدلے نہ بیچو مگر برابر برابر اور بعض کو بعض پر فضیلت نہ دو ان میں سے غائب کو موجود کے ساتھ بیع نہ کرو۔" متفق علیہ (1) ایک روایت میں ہے سونے کو سونے، چاندی کو چاندی کے ساتھ بیع نہ کرو مگر برابر برابر وزن کے ساتھ۔ اسی بارے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان چھ چیزوں کے بارے میں روایت ہے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مستدرک میں روایت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مسلم میں روایت ہے (2) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دار قطنی میں ہے، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیحین میں ہے، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بزار میں ہے، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیہقی میں ہے۔ اصحاب الظواہر، ابن عقیل جو حنابلہ میں سے ہیں ان کے نزدیک ربو صرف ان چھ چیزوں میں محصور ہوگا۔ قتادہ اور طاؤس رحمہما اللہ تعالیٰ سے بھی یہی مروی ہے۔ جمہور علماء کا نقطۂ نظر یہ ہے حرمت ان چھ چیزوں کے وصف کی بناء پر ثابت ہے۔ اب اسی وصف کی بناء پر دوسری چیزوں پر حکم لگایا جائے گا۔

ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ سب میں علت ایک امر ہے وہ مالیت ہے تو انہوں نے تمام اموال میں زیادتی کو ربا قرار دیا ہے۔ اکثر علماء اس طرف گئے ہیں ربا سونے اور چاندی میں ایک وصف کی بناء پر ثابت ہوتا ہے اور دوسری چار چیزوں میں الگ وصف کی بناء پر۔ سونے اور چاندی میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک علت ثمن ہونا ہے۔ اس وجہ سے حکم ان دونوں سے کسی اور چیز پر نہیں لگایا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک دونوں میں علت وزن ہے تو ان سے یہ حکم لوہے، سکے، زعفران اور ہر وزنی چیز کی طرف منتقل ہوگا۔ دوسری چار چیزوں میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان میں علت جنس اور کیل ہے تو ربا ہر کیلی چیز میں جاری ہوگا جب اسے ہم جنس کے ساتھ خریدا یا فروخت کیا جا رہا ہے، خواہ وہ چیز کھائی جانے والی ہو یا کھائی جانے والی نہ ہو۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہ نقطۂ نظر ہے۔ انہیں سے ایک روایت ہے وہ کھانے والی چیز ہو اور اسے اپنی جنس کے ساتھ بیع کیا جا رہا ہو۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم جنس کے ساتھ ساتھ غذائیت بھی ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قدیم قول میں فرمایا کہ خوراک ہونے کے ساتھ اس میں کیل یا وزن جاری ہو تو ہر کھائی جانے والی چیز خواہ کیلی یا وزنی ہو اس میں ربا ثابت ہوگا۔ ان چیزوں میں ربا جاری نہیں ہوگا جو کیلی یا وزنی نہ ہوں جیسے انڈے۔ جدید قول میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ربا کی علت کھانا اور جنس ہے اس لئے تمام کھائی جانے والی چیزوں میں ربا جاری ہوگا، خواہ پھل ہوں، سبزیاں ہوں یا دوائیں۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کہ اس کی علت ثمن ہونا اور کھایا جانا یا اس کا کھانے کے لئے ذخیرہ کیا جانا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اموال میں مجلس میں دونوں عوضوں پر قبضہ اور دونوں کے ہم مثل ہونے کی شرط اس کے ذی شرف ہونے کا شعور دلاتی ہے، جس طرح نکاح میں شہادت کی شرط مقصد کی عظمت کے اظہار کے لئے ہے، تو ضروری ہے کہ ہم اس کی ایسی علت بیان کریں جو اس کے شرف کو ثابت کرے کھانے بلکہ اس کے ذخیرہ کرنے میں ہر چیز موجود ہے کیونکہ نفوس کی بقاء اس کے متعلق ہے اور ثمن ہونا جس کی مدد سے تمام مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں۔ یہ زیادہ اس کی مستحق ہے کہ اسے باعث شرف مانا جائے۔ اس میں جنسیت، کیل اور وزن کی کوئی حیثیت نہیں، اس لئے ہم نے طعم، ذخیرہ کرنا اور ثمن ہونے کو ربا کی علت بنایا ہے۔ حکم کا دارومدار شرط پر ہوتا ہے جس طرح رجم کا دارومدار شادی شدہ ہونے پر ہے۔ معمر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ حکم کی علت کھانا ہے، کھانا کھانے کے بدلے میں برابر برابر۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (3) کیونکہ حکم کا کسی اسم مشتق پر مرتب ہونا اس ماخذ اشتقاق کے علت ہونے پر دال ہوتا ہے۔ جواب یہ ہے علت بیان کرتے وقت یہ ضروری ہوتا ہے کہ علت مناسب

1۔ صحیح بخاری: 2068 (ابن کثیر)   2۔ صحیح مسلم: 1584، جلد 11 صفحہ 8 (علمیہ)   3۔ صحیح مسلم: 1592، جلد 11 صفحہ 17 (علمیہ)

بھی ہو۔ مشتق پر حکم کو مرتب کرنا، یہ بھی اس بات پر دال ہے کہ مناسبت کی شرط کی بناء پر ماخذ اس حکم کی علت ہوتا ہے یہاں مناسبت مفقود ہے کیونکہ جس چیز کے ساتھ نفس کی بقاء ہوتی ہے اس کی ضرورت شدید ہوتی ہے جس میں حاجت شدید ہوتی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسانی اور وسعت بھی جاری ہوتی ہے، جس طرح پانی اور گھاس اس میں تنگی موزوں نہیں ہوتی یہ کہنا کہ طعام اسم مشتق ہے، یہ بھی ممنوع ہے بلکہ یہ تو بعض معین چیزوں کا نام ہے جیسے گندم اور جو تھا طب اس لفظ سے کسی اور مطعوم کو نہیں پہچانتے تھے جیسے کھجور جبکہ عربوں کے کھانے میں یہ چیز غالب ہوا کرتی تھی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کہ حکم کی علت کیل یا وزن ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ربو کے حرام کرنے کی حکمت لوگوں کے اموال کو ہلاک ہونے سے بچانا ہے، اسی لئے کیل اور وزن کو وضع کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان میں عدل کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا "وزن کرو صحیح میزان کے ساتھ" اور فرمایا "ہلاکت ہے کمی کرنے والوں کے لئے جب وہ لوگوں سے حقوق لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں جب ان کے لئے کیل یا وزن کرتے ہیں تو کمی کرتے ہیں۔" رسول اللہ ﷺ نے زیادتی کو حرام قرار دیا ہے اور مماثلت کو فرض قرار دیا زیادتی اور مماثلت کیل اور وزن کے ذریعے ہی پہچانی جا سکتی ہے۔ پس مناسب یہی ہے کہ اسے علت تسلیم کر لیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا اعتبار کیا ہے فرمایا "جب تول کا ایک جیسا ہو برابر وزن کیا جائے اور جس میں کیل کیا جائے تو وہ بھی اس کی مثل اور جب دونوں کی نوعیں الگ الگ ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔" دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے عبادہ اور انس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یوں ہی روایت کیا ہے(1) ابوسعید اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سواد بن غزیہ کو خیبر پر امیر مقرر کر کے بھیجا وہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں عمدہ کھجوریں لائے حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کیا خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہی ہیں؟ عرض کی نہیں قسم بخدا! یا رسول اللہ ﷺ ہم ایک صاع کھجور دو صاع کے بدلے خریدتے ہیں اور دو صاع تین صاع کے عوض خریدتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کرو لیکن اس کو ثمن کے ساتھ بیچو اور دوسری کھجور ثمن کے ساتھ خرید و۔ اسی طرح ہر اس چیز کا حکم ہوگا جس میں میزان جاری ہوتا ہے۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2) عبد ضعیف (قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کہتا ہے اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمائے، جو چیز میرے لئے ظاہر ہوئی وہ یہ ہے کہ آیت ربا مجمل نہیں کیونکہ مجمل اسے کہتے ہیں جس کے معنی کا ادراک طلب اور تامل سے حاصل نہیں کیا جا سکتا بلکہ صرف شرع سے اس کی پہچان ہو سکتی ہے، لیکن یہاں صورت حال یہ نہیں ہے، البتہ اس میں اشکال ضرور ہے جو تامل سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ربا لغت میں زیادتی کو کہتے ہیں اور زیادتی اس اضافہ کو کہتے ہیں جو مماثلت اور مساوات سے بڑھ کر ہو یہ کمی کی ضد ہے۔ یہ آیت رب العالمین کے اس ارشاد کی مانند ہے "تم بھی ان پر ایسی ہی زیادتی کرو جیسی انہوں نے کی ہے" اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے کسی پر زیادتی کرنے کی صورت میں ضمانت کو مثل اور مساوات کے ساتھ واجب کیا ہے۔ اسی طرح باہم بیع کرنے اور قرض لینے دینے میں بھی مثل اور مساوات کو واجب کیا ہے کسی کا نقصان کرنے کی صورت میں کیلی اور وزنی چیزوں میں ایسی چیز واجب ہوگی جو صورۃً اور معنیً مثل ہو، یعنی اس میں جنس اور قدر کے اتحاد کی رعایت کی جائے گی اور ذوات القیم میں کیونکہ صورۃً اور معنیً مثل کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اس لئے صرف معنوی مماثلت کا اعتبار کیا جائے گا تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ قیمت واجب ہوگی تاکہ جتنا ہو سکے اس پر عمل کیا جائے۔ قیمت اسے کہیں گے جو اہل بصیرت کے نزدیک مالیت میں اس کی مثل ہو۔ یہ زمانے کے مختلف ہونے کے ساتھ مختلف ہوتی رہتی ہے کیونکہ مختلف زمانوں میں اس کے طلب گار مختلف

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 18 (محاسن) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 17 (محاسن)

ہوتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب نقصان کی ضمانت کا مسئلہ ہو۔ جب مبادلہ کیا جا رہا ہو تو اگر جنس ایک ہو تو مماثلت میں کیل اور وزن کے اعتبار سے اجزاء میں مماثلت کا اعتبار کیا جائے گا، وہ دونوں بدل ذوات الامثال سے ہوں جس طرح نقصان کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اگر دونوں بدلوں کی جنس مختلف ہو، خواہ وہ دونوں ذوات الامثال سے ہوں یا ایک ذوات الامثال سے نہ ہو یا دونوں ذوات الامثال سے نہ ہوں تو ان کے درمیان صورۃً اور معنی مماثلت کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ صورت کے اعتبار سے مختلف ہیں، تو اس صورت میں صرف مماثلت معنوی یعنی قیمت میں مماثلت کا اعتبار کیا جائے گا جس طرح ہم نے کسی کا نقصان کرنے کی صورت میں ذکر کیا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہوگا کہ نقصان کی ضمانت کی صورت میں مالک کو اختیار نہیں ہوگا کہ اپنے مال کی کوئی مثل متعین کرے۔ وہاں کسی صاحب بصیرت کی تحکیم کا اعتبار کیا جائے گا اور خرید و فروخت کی صورت میں جب دونوں مالک مبادلہ پر راضی ہو جائیں تو انہوں نے اپنے مال کا جو بدل متعین کیا ہے تو ان کا اپنی ذات کے بارے میں حکم دوسروں کے فیصلہ سے مقدم ہوگا تو ان کی اپنی اصطلاح میں ان بدلوں میں سے ہر ایک بدل دوسرے بدل کا مکمل عوض ہوگا۔ اس وجہ سے ان میں فضیلت ظاہر نہ ہوئی۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب دونوں جنس مختلف ہوں تو جیسے چاہو خرید و فروخت کرو(1)

جب یہ بات واضح ہوگئی تو اس سے ثابت ہوگیا کہ کیلی اور وزنی چیزوں میں سے جب کسی کو اس کی جنس کے ساتھ بیچا جائے تو اجزاء کے اعتبار سے تفاضل قطعاً حرام ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اس نے ربا کو حرام قرار دیا اور ادھار بھی حرام فرمایا کیونکہ جو چیز نقد ادا کی جائے اسے ادھار پر فضیلت حاصل ہوتی ہے، تو کیل اور وزن میں مساوات کے ثابت ہونے کے بعد وہ زیادتی ربا کی زیادتی کہلائے گی۔ یہ بھی جائز نہیں کہ اس زیادتی کو مدت کے عوض میں رکھ لیا جائے جس طرح دس درہم نقد کو گیارہ درہم ادھار کے بدلے بیچ دیا جائے کیونکہ درہم تو ایک عینی چیز ہے اور مدت صرف ایک وصف ہے، ان کے درمیان عقلاً مساوات ثابت نہ ہوئی اور نہ ہی شرع میں مساوات ثابت ہے بلکہ شرع نے تو اسے باطل ٹھہرایا ہے اور اس سے منع کیا ہے۔ پس یہ بیع دس درہم کی گیارہ درہم کے مقابل ہوئی جو صراحۃً سود ہے، جس طرح یہ جائز نہیں کہ ایک بدل کے بعض اجزاء کو مدت کے مقابل رکھا جائے اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ بعض اجزاء کو عمدگی کے وصف کے برابر رکھا جائے کیونکہ عمدگی بھی تو بذات خود ایک وصف ہے جس کے درمیان اور ذات کے درمیان عقل اور شرع کے اعتبار سے مساوات کا تصور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ شرع میں تو اس سے نفی اور نہی ثابت ہے، جس طرح ہم نے سواد بن غزیہ کے قصہ میں حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

کیا کیل اور وزن میں مساوات کی صورت میں کسی ایک عوض کا اچھا ہونا بھی حرام ہوگا۔ جمہور علماء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ حرام نہیں ہوگا بلکہ شرع میں وصف کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔ صاحب ہدایہ نے کہا نبی کریم ﷺ کے فرمان کی وجہ سے عمدہ اور ردی چیز باہم بیع میں برابر ہوں گی(2) اگر یہ حدیث صحیح ہے تو یہ حجت ہے، ورنہ ہم یہ کہیں گے اوصاف کا ضبط کرنا اور ان کا اعتبار کرنا ممکن نہیں۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا پس بیع کا دروازہ بند ہوگیا۔ میں کہتا ہوں اجناس کی بیع کا دروازہ بند نہیں ہوا کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ردی چیز کی بیع ثمن کے ساتھ کی جائے اور پھر اس ثمن کے ساتھ اچھی چیز خرید لی جائے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے لیکن قرض کا دروازہ بند ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "اور تم اسے لینے والے نہیں مگر جب تم چشم پوشی کرو" یعنی تم عمدہ چیز کے بدلے میں ردی چیز قبول کرنے والے نہیں اگر تم میں سے کسی کا کسی دوسرے پر حق ہو، خواہ قرض کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے مگر جب تم چشم پوشی کرو۔ استثناء اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قرض میں وصف کی رعایت

1۔ تفسیر قرطبی، جلد 10 صفحہ 86 (الازہریہ) 2۔ نصب الرایہ، جلد 4 صفحہ 74 (علمیہ)

لازم نہیں۔ ساتھ ہی یہ آیت اس پر بھی دال ہے کہ صاحب حق اگر اعلیٰ چیز کی جگہ ردی نہ لے تو یہ اس کا حق ہے، واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ جب تر کھجوریں خشک کے بدلے میں اور کشمش انگور کے بدلے میں بیچی جائیں تو ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں نہ کیل میں برابری کے ساتھ اور نہ ہی زیادتی کے ساتھ اسی طرح تر گندم اور خشک گندم کی صورت ہوگی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ تر کھجور کی بیع خشک کھجور کے ساتھ جائز ہے کشمش اور انگور میں دو روایتیں ہیں۔ ہمارے پیش نظر سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے، انہوں نے کہا میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ سے تر کھجوروں کی خشک کھجوروں کے ساتھ بیع کرنے کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا جب وہ خشک ہو جائے تو کم ہو جاتی ہے؟ انہوں نے عرض کی جی ہاں، تو آپ ﷺ نے فرمایا پھر نہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس سے منع کیا(1) امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اصحاب السنن، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم، دارقطنی، بزار اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ سب نے زید ابی عیاش سے روایت کی ہے۔ صاحب ہدایہ نے کہا اصحاب نقل نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کسی ایک سے بھی اس کی تضعیف ثابت نہیں۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا زید ابو عیاش مجہول ہے۔ اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ انہیں نہیں جانتے تو کیا ہوا محدثین تو انہیں جانتے ہیں، گفتگو ختم ہوگئی۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی روایت ذکر کی اور اسے صحیح قرار دیا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کتاب الکنی میں ذکر کیا اور کہا انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا، انہوں نے عبداللہ بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عدول عدول سے روایت کرتا ہے، یعنی دونوں کے لئے عدل میں مبالغہ کا صیغہ ذکر کیا ہے۔ دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ثقہ ہے۔ میں کہتا ہوں حدیث صحیح ہے یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رطوبت تر کھجور کے اجزاء اصلیہ میں سے نہیں اور مساوات میں معتبر اجزاء اصلیہ ہوتے ہیں، اب اس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا تو ان کی بیع نہ تفاضل کے ساتھ جائز ہوگی نہ مساوات کی صورت میں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر تر کھجوریں خشک کھجوروں کی جنس سے ہیں تو بیع جائز ہوگی کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا برابر بیچو۔ اگر ایک جنس سے نہ ہوں تو یہ جائز ہوگا کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا جیسے چاہو بیچو(2) ہم نے کہا بے شک یہ اس کی جنس سے تو ہے لیکن اس کی رطوبت اور اجزاء کے پیوست نہ ہونے کی وجہ سے کیل کے ذریعے مماثلت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا تو یہ ایسے ہی ہوگا جیسے ان کی اندازاً بیع کی جائے۔ وہ عددی چیزیں جو قریب قریب ہوں جیسے اخروٹ، انڈے، یہ بھی مثلی ہوں گی۔ ظاہر بات یہ ہے کہ اخروٹ کی اخروٹ سے بیع کرنا جائز نہیں اسی طرح انڈے کی انڈے سے بیع کرنا جائز نہیں جب وہ ایک ہی حیوان کے ہوں کیونکہ اجزاء میں تفاضل ہو سکتا ہے مگر وزن کی صورت میں جائز ہوگا کیونکہ وزن برابری کے لئے شرعاً معتبر ہے۔ اس نوع میں اس کی مدد سے برابری حاصل ہو جاتی ہے اگرچہ یہ معروف نہیں اگر انڈے دو حیوانوں کے ہوں تو ان دونوں کا حکم مختلف جنسوں کا ہوگا۔

مسئلہ:۔ جب گندم کو جو کے ساتھ بیچا جائے تو دونوں بدلوں میں سے جو بھی اس کے مقابل رکھا گیا ہے تو ان کی اصطلاح میں دوسرے تمام کا وہ بدل ہو جائے گا۔ پس ان میں تفاضل جائز ہوگا، ادھار جائز نہ ہوگا۔ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے تفسیر مظہری میں بیان کر دی ہے۔

مسئلہ:۔ جب گندم کو لوہے کے بدلے میں بیچا جائے تو ہمارے قول کے مطابق قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں ادھار جائز نہ ہو اور

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 49 (محاسن)، سنن ابن ماجہ: 2264 (علیہ) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 24 (محاسن)

تفاضل جائز ہو اس کے مطابق حکم لگایا جاتا ہے کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان عام ہے جب دونوں جنسیں مختلف ہوں تو جیسے چاہو بیچو جبکہ وہ دست بدست ہوں۔(1)

مسئلہ:۔ جب حیوان کو گندم کے بدلے بیچا جائے یا اس جیسی کسی اور چیز کے ساتھ یا لوہے جیسی چیز کے ساتھ تو اس صورت میں حیوان مبیع ہوگا اور کیلی اور وزنی چیز ثمن ہوگی، ثمن کے پائے جانے کی شرط نہیں لگائی جائے گی بلکہ بیع صحیح ہوگی اور ثمن ادھار ہوگی۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ بیع صحیح نہ ہوتی لیکن ہم حدیث صحیح اور اجماع کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ دیں گے۔

مسئلہ:۔ جب ایک حیوان کو دوسرے حیوان کے بدلے میں بیچا جائے جب کہ وہ دونوں ایک ہی جنس یا دو جنسوں سے تعلق رکھتے ہوں تو ان میں بالا جماع تفاضل جائز ہے۔ کیا ان میں ادھار بھی جائز ہے؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے مطلقاً جائز نہیں۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے جائز ہے۔ امام مالک کا کہنا ہے اگر دونوں بدل ایک جنس سے تعلق رکھتے ہوں تو تفاضل کے ساتھ ادھار جائز نہیں اور تفاضل کے بغیر جائز ہے۔ اگر وہ دو جنسوں سے تعلق رکھتے ہوں تو مطلقاً جائز ہے، اس کو مطلقاً جائز کہنے والوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر تیار کرنے کا حکم دیا تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کی میرے پاس تو سواری نہیں۔ انہیں رسول اللہ ﷺ نے عامل زکوۃ کی واپسی پر قیمت ادا کرنے پر سواری خرید لینے کا حکم دے دیا۔ حضرت عبداللہ نے ایک اونٹ دو اونٹوں کے بدلے ادھار خرید لیا(2) میں آیت مداینة میں بیع سلم کے ضمن میں اس حدیث کا ذکر کروں گا ان شاء اللہ۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ حیوان بطور ثمن کسی کے ذمہ میں نہیں ہوسکتا کیونکہ قدر و وصف کے اعتبار سے وہ غیر معلوم ہوتا ہے، اس کی محض جنس نوع اور وصف ذکر کرنے سے وہ متعین نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے اس میں بیع سلم درست نہیں ہوتی کیونکہ اس طرح وہ متعین نہیں ہوتی۔ دلیل نقلی میں امام احمد، ترمذی، نسائی، دارمی، ابن ماجہ، ابوداؤد رحمہم اللہ تعالیٰ نے سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حیوان کی حیوان کے بدلے میں ادھار بیع سے منع کیا ہے(3) دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی مثل نقل کیا ہے۔ ترمذی اور احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے حجاج بن ارطاۃ رحمہ اللہ تعالیٰ سے وہ ابوزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی مثل نقل کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو حیوانوں کی ایک کے بدلے میں ادھار بیع کرنا صحیح نہیں، مگر دست بدست میں کوئی حرج نہیں(4) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث حسن ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر سے اس کی مثل نقل کیا ہے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے سمرہ، ابن عباس اور جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث نقل کی ہے اور طعن کا ذکر نہیں کیا۔ جب یہ احادیث عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کو ایک اونٹ کی دو اونٹوں سے بیع کرنا جائز ہے کے معارض آگئیں تو یہ احادیث دو وجوہ سے راجح ہوں گی، ایک یہ کہ جو دلیل حرمت ثابت کرنے والی ہو بطور احتیاط اس سے استدلال کرنا بہتر ہوتا ہے نہ کہ اباحت ثابت کرنے والی حدیث سے۔ ساتھ ہی اس لیے بھی تاکہ نسخ کا تکرار لازم نہ آئے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ احادیث قیاس کے موافق ہیں۔

مسئلہ:۔ عقد میں وہ شروط جن کا بیع تقاضا نہیں کرتی جبکہ ان میں متعاقدین میں سے ایک کے لئے نفع ہو تو یہ ربا کی صورت ہوگی۔ یہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کا نقطہ نظر ہے۔ ابن ابی لیلیٰ، نخعی اور حسن رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا بیع جائز ہے اور شرط فاسد ہے۔

1۔ تفسیر قرطبی، جلد 10 صفحہ 86 (الازہریہ) 2۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 69 (محاسن)
3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1237 (علمیہ) 4۔ جامع ترمذی عارضۃ الاحوذی، جلد 5 صفحہ 197 (علمیہ)

ابن شبرمہ اور احمد رحمہما اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا بیع اور شرط دونوں جائز ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بیع میں بائع کے لئے تھوڑی سی منفعت جائز ہوگی، باقی صحیح نہ ہوگی۔ ہمارے پیش نظر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "اللہ تعالیٰ نے ربا کو حرام قرار دیا" یہ اس معمولی سی منفعت کو بھی شامل ہے کیونکہ یہ دو بدلوں میں سے ایک میں زیادتی ہے جبکہ دونوں مثلی بھی ہیں جنس بھی ایک ہے اور اجزاء میں تماثل بھی ہے اور ان کے علاوہ میں جو قیمت کا تعین ہو چکا تو ان میں تماثل ثابت ہو گیا اس وجہ سے اس شرط کو مدت اور عمدگی کے مقابل کرنا صحیح نہ ہوگا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہر اس شرط کے بارے میں جس کا عقد تقاضا نہیں کرتا یہی نقطۂ نظر ہے کہ اس میں مبیع کے لئے نفع ہو جبکہ مبیع خود نفع سے فائدہ اٹھا سکتا ہو جس طرح جب اس نے غلام بیچا یا لونڈی بیچی اس شرط پر کہ تم اسے آزاد کرو گے، مکاتب بناؤ گے یا ام ولد بناؤ گے۔ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے محلّی میں، طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الاوسط میں، حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے علوم حدیث میں اور خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن سلیمان ذہلی کی سند سے، وہ عبد الوارث بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا میں مکہ مکرمہ آیا، میں نے وہاں امام ابوحنیفہ، ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کو پایا، میں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک ایسے آدمی کے بارے میں سوال کیا جو بیع کرتا ہے اور شرط لگاتا ہے، فرمایا بیع باطل ہوگی اور شرط بھی باطل ہوگی پھر میں ابن شبرمہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا میں نے ان سے پوچھا۔ فرمایا بیع جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔ پھر میں ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا میں نے اس سے پوچھا، فرمایا بیع جائز ہوگی اور شرط باطل ہوگی۔ میں نے کہا سبحان اللہ تینوں عراق کے فقہاء ہیں، ایک مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں۔ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گیا تمام صورتحال پیش کی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا میں یہ تو نہیں جانتا جو انہوں نے کہا مجھے عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے باپ سے وہ دادا سے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے بیع اور شرط سے منع کیا ہے اس لئے بیع باطل ہوگی۔ اور شرط بھی باطل ہوگی پھر ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا انہیں سب کچھ بتایا انہوں نے جواب دیا میں یہ نہیں جانتا انہوں نے کیا کہا، مجھے تو ہشام بن عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہوں نے اپنے باپ سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا کہ میں بریرہ کو خریدوں اور اسے آزاد کروں، پس بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ پھر میں ابن شبرمہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا انہیں تمام صورتحال بتائی انہوں نے کہا میں یہ تو نہیں جانتا کہ انہوں نے کیا کہا۔ مجھے مسعر نے، انہوں نے محارب بن دثار سے، وہ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو ایک اونٹنی بیچی اور شرط کر لی تھی کہ اس پر سوار ہو کر مدینہ تک جاؤں گا۔ لہٰذا بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے(1) کلام ختم ہوگئی۔ اگر یہ کہا جائے عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ کی اپنے باپ اور وہ دادا سے روایت اکثر اہل علم کے ہاں؛ یہ حدیث مرسل ہے تو انہیں یہ جواب دیا جائے گا کہ جدہ کی ضمیر کا مرجع یہاں واضح نہیں، اس کی وضاحت اس حدیث میں ہے جو ابو داؤد، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ سے وہ اپنے باپ سے اور وہ دادا عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حلال نہیں ہے۔ سلف (ا) بیع کے ساتھ نہ ہی بیع میں دو شرطیں جب تک ضمانت نہ اٹھائے نفع کا حقدار نہیں اور اس میں بیع کا حق نہیں جو تیرے پاس چیز موجود نہیں۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حدیث حسن صحیح ہے۔ حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث جو موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں ہے اس کی تائید کرتی ہے۔ طبرانی

(ا) ایک اصطلاح ہے جس کی وضاحت چند سطروں کے بعد متن میں موجود ہے۔

1۔ مسند امام ابوحنیفہ صفحہ 160-161 (الکوثر)

نے محمد بن سیرین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے، فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے بیع میں چار چیزوں سے منع فرمایا سلف اور بیع سے، بیع میں دو شرطوں سے، ایسی چیز کی بیع کرنے سے جو تیرے پاس نہ ہو اور ایسی چیز کے نفع سے جس کی ضمانت نہ اٹھائی ہو۔ بیع میں سلف یہ ہے کہ بیع میں شرط لگائی جائے کہ وہ اسے درہم قرض کے طور پر دے یہ اسی بیع کی ایک قسم ہوتی ہے جس میں متعاقدین میں سے کسی ایک کے لئے منفعت کی شرط لگائی جاتی ہے۔ یہ وہ تحقیق ہے جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن شعیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ مگر جو ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث سے استدلال کیا ہے دونوں شیوخ (ا) نے اپنی اپنی صحیحوں میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث کو روایت کیا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آئیں کہا میں نے اپنے مالک سے نو اوقیہ (ب) سونے پر مکاتبہ کیا ہے یہ سال میں ایک اوقیہ ہوگا پس میری مدد کیجئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا اگر تیرے اہل پسند کریں کہ میں انہیں تمام مال ایک دفعہ ہی دے دوں اور تجھے آزاد کر دوں میں ایسا کرنے کو تیار ہوں، شرط یہ ہوگی کہ تیری ولاء (ج) میرے لئے ہو گی۔ وہ اپنے گھر والوں کے پاس گئیں۔ انہوں نے اس پیشکش کا انکار کر دیا اور کہا ولاء ہمارے لئے ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے خریدلو آزاد کر دو پھر نبی کریم ﷺ لوگوں کو خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی۔ پھر فرمایا لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ ایسی شرطیں ذکر کرتے ہیں۔ جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں ایسی شرط جو کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے اگرچہ سو شرطیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ حق ہے اور اس کی شرط مضبوط ہے۔ ولاء پر اسی کا حق ہوگا جس نے آزاد کیا ہو (1) ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ وہ اس کو اس شرط پر بیچتے ہیں کہ ولاء ان کی ہوگی، تو حضور ﷺ نے فرمایا تم خرید لو اور ان کے لئے ولاء کی شرط مان لو بے شک ولاء پر اسی کا حق ہے جس نے اسے آزاد کیا، متفق علیہ۔ اس لفظ کے ساتھ رافعی نے ذکر کیا علماء نے کہا ہے کہ ہشام ان الفاظ کی روایت کرنے میں اکیلا ہے "اِشْتَرِطِیْ لَھُمُ الْوِلَاءَ" ان کے لئے ولاء کی شرط مان لو جبکہ دوسرے راویوں نے اس کی متابعت نہیں کی۔ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یقیناً یہ کہا گیا ہے کہ عبدالرحمن بن ایمن نے ہشام کی متابعت کی ہے اس نے زہری سے وہ عروہ سے اسی کی مثل روایت کرتے ہیں۔ جہاں تک جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا تعلق ہے تو وہ دونوں شیوخ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی زیر قیادت ایک غزوہ میں حصہ لیا جبکہ میں ایک اونٹ پر سوار تھا جو تھک چکا تھا وہ چلنے کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ نبی کریم ﷺ میرے ساتھ آ ملے، فرمایا تیرے اونٹ کو کیا ہو گیا ہے؟ میں نے عرض کی یہ تھک گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اونٹ کے پیچھے ہو لئے اسے جھڑکا، ساتھ ہی دعا بھی کی۔ پھر وہ تمام اونٹوں سے آگے آگے ہی چلتا رہا۔ آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا تیرے اونٹ کا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کی بہت بہتر ہے، اسے آپ ﷺ کی برکت حاصل ہو گئی ہے۔ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کیا تم اسے ایک اوقیہ کے بدلے بیچتے ہو میں نے آپ ﷺ کے ہاتھ بیچ دیا، ساتھ ہی یہ شرط لگائی کہ مجھے مدینہ طیبہ تک اس پر سوار ہونے کا حق حاصل ہوگا۔ جب رسول اللہ

(ا) امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ علیہ۔
(ب) وفات کی صورت اگر نسبی رشتہ دار نہ ہو تو باہم وراثت جاری ہوتی ہے۔
(ج) ایسے معاوضہ کے برابر اور آزاد کرنے والا اس کے ترکہ کا وارث بنتا ہے۔
1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 290 (وزارت تعلیم)

ﷺ مدینہ طیبہ پہنچے تو میں اونٹ لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے مجھے قیمت عطا فرمائی۔ پھر اونٹ مجھے ہی لوٹا دیا (1) ایک روایت میں ہے "بِعْنِيهِ بِوَقِيَّةٍ قَالَ فَبِعْتُهُ وَاسْتَثْنَيْتُ حِمْلَانَهُ إِلَى أَهْلِهِ" اس کا معنی بھی وہی ہے جو اوپر گزر چکا، متفق علیہ۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یہ بھی ہے آپ ﷺ نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا اس کا دین اسے دے دو، کچھ اور بھی دو۔ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک قیراط زائد دیا۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث سے بیع اور شرط دونوں کے جواز کا استدلال کیا ہے۔ نیز اس روایت سے جو انہوں نے اپنی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مرفوع روایت کی ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں جبکہ وہ حق کے مطابق ہوں۔ (2) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یہ حدیث مروی ہے، الفاظ یہ ہیں "مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں جو شرطیں حق کے موافق ہوں۔"

یہاں بحث اور تامل کی ضرورت ہے تاکہ احادیث میں تعارض ختم ہو جائے اور مراد واضح ہو جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے اگرچہ وہ سو شرطیں کیوں نہ ہوں۔ یہ اس حدیث کے معارض نہیں جس میں فرمایا گیا ہے مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں جبکہ وہ حق کے مطابق ہوں، کیونکہ دونوں حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ کچھ شروط باطل ہیں اور کچھ صحیح ہیں۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کیونکہ بیع میں بالاتفاق خیار شرط جائز ہے اور بائع کے لئے ہی ولاء ہوگی، بالاتفاق باطل ہوگی۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث جس میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع اور شرط سے منع کیا ہے، جائز نہیں بلکہ اس سے مراد شرط کی بعض قسمیں ہیں۔ اس لئے اب ضروری ہے کہ ہم شرطوں کے بارے غور و فکر کریں کہ کون ان میں سے فی نفسہ باطل ہے اور اس کے ساتھ بیع فاسد نہیں ہوتی۔ یہی بریرہ کے قصہ کا مفہوم ہوگا اور کونسی شرط فی نفسہ باطل ہوگی اس حیثیت میں کہ بیع فاسد ہوگی۔ سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں نہی کا محل یہی ہوگی اور کونسی شرط ہے جو باطل نہیں ہوتی۔ یہی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی احادیث کا معنی اور مفہوم ہوگا۔ پس ہم کہتے ہیں کہ وہ شرط جو فی نفسہ باطل نہیں ہوتی اور نہ اس کے ساتھ بیع فاسد ہوتی ہے تو وہ ایسی شرط ہوتی ہے جس کا پورا کرنا مشروط کے لئے ممکن نہیں ہوتا جیسے یہ کہنا اگر مشتری آزاد کرے تب بھی وہ غلام آزاد نہیں ہوگا۔ یا ولاء بائع کے لئے ہوگی۔ اس قسم کی شرط لغو اور باطل ہوگی، اگرچہ وہ سو شرطیں ہی کیوں نہ ہوں تو یوں ہی سمجھا جائے گا کہ ان میں سے کوئی شرط بھی موجود نہیں، اس کے ساتھ بیع فاسد نہیں ہوتی۔ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قصہ اسی باب سے تعلق رکھتا ہے۔ شیخ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس میں کوئی تصریح نہیں کہ انہوں نے آزادی کی شرط لگائی تھی، بلکہ انہوں نے تو صرف ولاء کی شرط لگائی تھی، ان میں سے بعض شرطیں ایسی ہوتی ہیں جو عقد کے تقاضا کے مطابق نہیں ہوتیں کہ انہیں صحیح کہا جائے اور نہ ان میں کسی ایک کے لئے منفعت ہوتی ہے کہ اسے ربوا کا نام دیا جائے۔ جس طرح کپڑے کی بیع کرنا کہ مشتری انہیں عید کے موقع پر پہنے گا یا جانور کی بیع کرنا کہ اسے مشتری چارہ زیادہ ڈالے گا تو یہ شرط بھی لغو ہے، اس کے ساتھ بیع فاسد نہیں ہوتی مگر وہ شرطیں جو باطل نہیں ہوتیں اور ان کا بجا لانا ضروری ہوتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی احادیث کا یہی معنی اور مفہوم ہوگا، ان میں سے کچھ ایسی ہوتی ہیں جن کا عقد تقاضا کرتا ہے۔ جس طرح یہ شرط لگانا کہ بائع مبیع کو اس وقت تک روکے رکھے گا جب تک وہ ثمن پر قبضہ نہ کرے تو یہ جائز ہے کیونکہ عقد سے جو چیز واجب ہوتی ہے اسی کی تاکید کر رہا ہے۔ انہیں شرطوں میں سے ایک یہ بھی ہوتی ہے جس کی

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 29 (قدیمی) 2۔ معجم کبیر از طبرانی، جلد 17 صفحہ 22 (الامکان)

صحت شرع سے ثابت ہو اور جس کی رد کرنے والی کوئی دلیل نہ ہو جس طرح بیع مطلق میں ثمن ادا کرنے کے لئے مدت معین کرنے کی شرط لگانا اور بیع سلم میں مبیع ادا کرنے کی مدت کا تعین کرنا یہ نص کی وجہ سے جائز ہے اگرچہ عقل کے خلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے صدر اول میں جو بیع متعارف تھی اس کو اس کے ساتھ لاحق کیا ہے جیسے کوئی جوتا خریدنا اس شرط پر کہ فروخت کرنے والا اس کو سی دے گا یا اس میں تسمہ ڈال دے گا۔ ان میں سے کچھ شرطیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن میں ثمن کے بارے اعتماد حاصل کیا جاتا ہے، جس طرح ضامن اور رہن کا مطالبہ کرنا، تو یہ شرط جائز ہوگی کیونکہ عقد بیع جس کا تقاضا کرتا ہے یعنی ثمن بائع کے حوالے کرنا اسی کی وضاحت کرتی ہے، اگر کفیل بیع کے وقت حاضر ہو اور کفالت کو قبول کرے اور رہن کے طور پر رکھی جانے والی چیز معلوم ہو اور بائع مشتری کی اجازت سے اس پر قبضہ کرے تو بیع، کفالت اور رہن مکمل ہو جائے گا۔ اگر مشتری شرط کو بجا لے آیا تو بہت بہتر ورنہ اسے قیمت ادا کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ اگر وہ قیمت نہ دے تو بائع کو فسخ کا اختیار ہوگا۔ رہی وہ شرط جو عقد کو باطل کر دیتی ہے تو اس شرط کا ہم نے ذکر نہیں کیا، وہ ایسی شرط ہے جس کا عقد کرنے والوں میں سے ایک یا اجنبی کو یا مبیع کو فائدہ ہو۔ اگر مبیع اہل استحقاق سے ہو جس طرح گندم کی بیع کرنا اس شرط پر کہ بائع اس کو پیس کر دے گا یا وہ اپنے گھر میں ایک ماہ یا ایک دن تک رکھے گا یا کپڑا خریدے کہ بائع اس کو سی کر دے گا۔ یا اونٹ بیچے اس شرط کے ساتھ کہ بائع چند مراحل تک اس پر سواری کرے گا۔ یہ شرط لگانا کہ مشتری اس چیز کو فلاں کے ہاتھ بیچے گا، یہ شرطیں عقد کو فاسد کر دیتی ہیں کیونکہ یہ ایسی زیادتی ہے جو عوض سے خالی ہے۔ پس یہ ربا ہے اس گفتگو سے روایات میں موجود ظاہری تعارض ختم ہو گیا اور ربا کی آیت اور تمام احادیث پر عمل ثابت ہو گیا سوائے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے کہ انہوں نے مدینہ طیبہ تک اس پر سوار ہونے کی شرط لگائی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں سوار ہونے کی استثناء والی شرط نفس عقد میں شامل ہی نہ تھی۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ میری رائے یہ ہے صحیحین کے الفاظ اس کا انکار کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اس حدیث پر عمل ربا والی آیت پر عمل کرنے سے بہتر نہیں ہے۔ بہتر بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث منسوخ ہے کیونکہ ربا والی آیت نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری آیات میں سے ہے۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ پر سب سے آخر میں آیت ربا نازل ہوئی۔ اصول فقہ میں یہ بات ثابت ہے کہ جب محرم اور مبیح دو دلیلیں متعارض آجائیں تو احتیاطاً محرم کو مقدم کیا جائے گا اور اس لئے بھی کہ نسخ کا تکرار ثابت نہ ہو، ربا کا معاملہ شدید ہے، اس لئے اس میں دوسروں کی نسبت زیادہ احتیاط کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے ربا کے متعلق پانچ مقامات پر وعید ذکر کی ہے۔

1:۔ پہلی تخبط کی صورت میں جب فرمایا" وہ کھڑے نہیں ہوتے مگر اس آدمی کی طرح جسے شیطان نے مجنون بنا دیا ہو۔"

2:۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں دخول جب فرمایا" جس نے حد سے تجاوز کیا وہ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

3:۔ اس کو مٹا دیا جائے گا۔ فرمایا" اللہ تعالیٰ ربا کو مٹاتا ہے۔"

4:۔ کفر کہہ کر فرمایا" باقی ماندہ ربا کو چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔"

5:۔ جنگ کا نام دے کر جب فرمایا" اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کا اعلان کرو۔" حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سب سے آخر میں آیت ربا نازل ہوئی اور نبی کریم ﷺ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے اور آپ ﷺ نے ہمارے لئے اس کی وضاحت نہیں فرمائی۔ پس ربا کو چھوڑ دو اور جس میں ربا کا شائبہ ہو اسے بھی چھوڑ دو۔

۹ یہاں یعنی جاءہ کا معنی پہنچنا ہے یعنی رسول اللہ ﷺ نے ربا کی حرمت کا حکم اور اس کے بارے نہی پہنچائی۔

۱۰ یعنی اس نے نہی کی اتباع کی۔

۱۱ یعنی نہی سے پہلے جو اس نے لے لیا اس سے واپس نہیں لیا جائے گا اور ربا لینے کی وجہ سے جو غلطی اس سے سرزد ہوئی اسے معاف کر دیا گیا ہے۔ اگر من شرطیہ بنایا جائے تو مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہوگا کیونکہ ظرف (لہ) سے پہلے وہ چیز موجود نہیں جس پر یہ اعتماد (۱) کرتی ہے یہ سیبویہ کا نقطہ نظر ہے۔

۱۲ یعنی آئندہ زمانے میں ہونے والے معاصی کے بارے میں فیصلہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے چاہے تو عذاب دے چاہے بخش دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کا معنی یہ ہے نہی کے بعد اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، اگر وہ چاہے تو اسے محفوظ رکھے، یہاں تک کہ اس سے رکنے پر اسے ثابت رکھے، اگر چاہے تو اسے ذلیل و رسوا کرے اور اسے دوبارہ اس کام میں ڈال دے۔

۱۳ سود کھانے یا اس قول "کہ بیع ربا کی مثل ہے" کی طرف لوٹا۔

۱۴ دوسری تاویل کی بناء پر معنی ظاہر ہے کیونکہ حرام چیز کو حلال کرنا یہ کفر ہے اور دائمی عذاب کا موجب ہے۔ پہلی تاویل کی بناء خلود کا لفظ زیادہ دیر تک ٹھہرنے سے مجاز ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزاء جہنم ہے جس میں ہمیشہ رہے گا۔"

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

"مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ سود کو ۱ اور بڑھاتا ہے خیرات کو ۲ اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ہر ۳ ناشکرے ۴ گنہگار کو ۵"

۱ اس کی برکت کو ختم کر دیتا ہے اور اس مال کو ہلاک کر دیتا ہے جس میں سود داخل ہو جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں "ایک آدمی سود میں کتنا ہی زیادہ مال والا ہو جائے مگر اس کا انجام قلت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے" (1) اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی صحت کا ذکر کیا ہے۔ انہیں سے ایک اور روایت ہے سود خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو وہ قلیل ہی ہوتا ہے۔

۲ یعنی اس کے ثواب کو دگنا کر دیا جاتا ہے اور اس مال میں برکت ڈالتا ہے جس سے صدقہ نکالا جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک مرفوع حدیث گزر چکی ہے بے شک اللہ تعالیٰ صدقہ کو قبول کرتا ہے، اس کو یوں بڑھاتا ہے جس طرح تم میں کوئی بچھیرے کو پالتا ہے۔ یہ روایت متفق علیہ ہے۔ انہیں سے ایک اور روایت مروی ہے صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا اور معاف کرنے سے اللہ تعالیٰ اس کی عزت میں اضافہ کر دیتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے بلند کر دیتا ہے (2) اسے امام مسلم اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے کہ مال صدقہ سے کم نہیں ہوتا۔ ان دو فرشتوں والی حدیث بھی گزر چکی ہے جو ہر روز زمین پر آتے ہیں، ان میں سے ایک

---

(۱) شبہ فعل کے عامل بننے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے پہلے نفی، استفہام، موصوف، ذوالحال وغیرہ ہو۔

1۔ سنن ابن ماجہ، باب التغلیظ صفحہ 166 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 321 (قدیمی)

یہ دعا کرتا ہے اے اللہ خرچ کرنے والے کو اچھا بدل عطا فرما، الحدیث۔

۳۔ یعنی ناپسند کرتا ہے کیونکہ قومیت کا مقتضی محبت ہے اور محبت کسی ایسے عارضہ کی وجہ سے ہی ختم ہوتی ہے جو بغض کا باعث ہو اور وہ کفر ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مخلوق اللہ تعالیٰ کا عیال ہے مخلوقات میں سے اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے محبوب وہ ہے جو اس کے عیال کے ساتھ احسان کرے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب میں حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسے روایت کیا ہے۔

۴۔ جو محرمات کی حلت پر اصرار کرنے والا ہو۔

۵۔ جو گناہوں میں منہمک ہو۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

"بے شک جو لوگ ایمان لائے ۱؎ اور کرتے رہے اچھے عمل ۲؎ اور صحیح صحیح ادا کرتے رہے نماز کو اور دیتے رہے زکوٰۃ کو ۳؎ ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۴؎"

۱۔ اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ کے رسول اور جو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام لائے اس پر ایمان لائے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی زبان سے جو انہیں حکم دیا اس پر عمل کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جن چیزوں سے منع کیا جیسے سود اس سے رک کر اعمال حسنہ کئے۔

۳۔ عموم کے بعد ان دونوں کا خاص طور پر ذکر کیا تا کہ ان دونوں کی شرافت کا اظہار ہو کیونکہ یہ دونوں بدنی اور مالی عبادت کی اصل ہیں۔

۴۔ یعنی آنے والے امر سے خوف نہیں جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے سب سے عظیم نعمت اعمال صالحہ کے ساتھ ایمان کو حاصل کر لیا تو کسی چیز کے فوت ہونے پر وہ غمگین نہیں ہوتے۔

ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں اور ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ نے کلبی کی سند سے ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ سے وہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہا ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ بنی عمرو بن عوف ثقفی بنی مغیرہ بن عبداللہ بن عمیر بن مخزوم کو ادھار دیتے اور ان سے سود لیتے جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ پر فتح عطا کی تو حضور ﷺ نے تمام سود کو ختم کر دیا تو بنی عمرو اور بنی مغیرہ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حاضر ہوئے جبکہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ مکرمہ پر امیر تھے بنو مغیرہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے ہم سے بڑھ کر سود میں کسی کو زیادہ شقی نہیں بنایا کہ ہمارے سوا تمام لوگوں سے ربو کو ختم کر دیا بنو عمرو نے کہا ہمارے ساتھ طے ہوا کہ ہمارے لئے ہمارا سود ہوگا۔ حضرت عتاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس بارے میں حضور ﷺ کو خط لکھا تو دونوں آیتیں نازل ہوئیں۔(1)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

"اے ایمان والو ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے اگر تم (سچے دل سے) ایمان دار ہو ۱؎"

۱۔ یعنی ربا میں سے اگر چیز بچ گئی ہے جس کی تم نے شرط لگائی تھی تو اس کو چھوڑ دو۔ اگر تم دل سے ایمان لائے ہو تو اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں حکم دیا ہے اس کی اطاعت کرو کیونکہ اوامر و نواہی کی تعمیل ایمان کی صداقت کی دلیل ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت

1۔ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 253 (التجاریہ)

عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے یہ ثقیف کے چار بھائیوں کے بارے نازل ہوئی، جو یہ تھے مسعود، عبد یالیل، حبیب اور ربیعہ جو عمرو بن عمیر کے بیٹے تھے، مقاتل نے بھی یہی کہا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا سدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے یہ آیت خالد بن ولید اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حق میں نازل ہوئی۔ یہ زمانہ جاہلیت میں بنی عمرو بن عمیر جو قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھتے تھے، ان کے ساتھ سودی کاروبار کرتے تھے۔ اسلام آیا، ان دونوں کے سود کا بہت بڑا مال تھا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1) نبی کریم ﷺ نے نویں ذی الحجہ کو مقام عرفات میں حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا خبردار! دور جاہلیت کی ہر چیز میرے قدموں کے نیچے ہے، دور جاہلیت کا خون بہا ختم کر دیا گیا ہے، سب سے پہلے ہم اپنے ربیعہ بن حارث کا خون بہا ختم کرتے ہیں جو بنی اسد میں دودھ پینے کی غرض سے موجود تھا کہ انہیں ہذیل نے قتل کر دیا تھا۔ جاہلیت کا سود ختم کر دیا گیا۔ سب سے پہلے حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سود ختم کرتا ہوں، یہ سب ختم کر دیا گیا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ الوداع کے موقع پر یوم عرفہ کے روز خطبہ کے بارے میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں یہ ذکر کیا ہے (2) تاہم نزول آیت کا ذکر نہیں کیا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عطاء اور عکرمہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا کہ حضرت عباس بن عبد المطلب اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کھجوروں میں بیع سلم کی جب کٹائی کا موسم آیا تو کھجوروں کے مالک نے کہا اگر تم سارے کا سارا حق لو تو میرے لئے اتنا بھی نہیں بچتا جو میرے بال بچے کے لئے کافی ہو کیا تم ایسا کر سکتے ہو کہ اس دفعہ تم نصف لے لو اور نصف کو مؤخر کر دو، میں تمہارے باقی نصف میں اضافہ کر دیتا ہوں۔ ان دونوں نے ایسے ہی کیا۔ جب وقت مقرر آیا تو ان دونوں نے کھجوروں کے مالک سے زیادتی کا مطالبہ کیا تو یہ خبر حضور ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے دونوں کو زیادہ لینے سے منع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ان دونوں نے اس آیت کو سنا اور اطاعت کی اور راس المال لے لیا۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ أَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾

"اگر تم نے ایسا نہ کیا ۱ تو اعلان جنگ سن لو اللہ ۲ اور اس کے رسول کی طرف سے ۳ اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں (مل جائیں گے) اصل مال نہ تم ظلم کیا کرو ۴ اور نہ تم پر ظلم کیا جائے ۵"

۱۔ اگر تم باقی ماندہ سود نہ چھوڑو۔

۲۔ حمزہ اور ابو بکر رحمہما اللہ تعالیٰ علیہما نے فَآذِنُوْا مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ آمنوا کے وزن پر ہے، یعنی دوسروں کو بتا دو کہ تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ حالت جنگ میں ہو۔ یہ اصل میں اذن سے مشتق ہے۔ دوسرے قراء نے فَأْذَنُوْا ہمزہ ساکن پڑھا ہے، یہ مجرد کا وزن ہوگا اور ذال مفتوح ہوگا، یعنی تم خود جان لو اور یقین کر لو۔ حرب کو تعظیم کے لئے نکرہ ذکر کیا ہے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز سود خور سے کہا جائے گا جنگ کے لئے اپنا اسلحہ لے لو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منع کیا ہے کہ کھجور کھانے کے قابل ہونے سے پہلے خریدی جائے اور فرمایا جب ربا کسی بستی میں عام ہو جائے تو انہوں نے اپنے لئے عذاب الٰہی کو حلال کر لیا۔ اسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے

1۔ تفسیر بغوی برحاشیہ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 253 (التجاریہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 397 (قدیمی)

روایت کیا ہے اور فرمایا اس کی سند صحیح ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کوئی بھی قوم ہو، جب اس میں سودی کاروبار غالب ہو جائے تو انہیں خشک سالی آلیتی ہے اور کوئی بھی قوم ہو، جب ان میں رشوت عام ہو جائے تو رعب اور خوف آلیتا ہے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

۲؎ علماء معانی نے کہا حرب اللہ سے مراد آگ اور حرب الرسول سے مراد تلوار ہے۔ اسی وجہ سے امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ سود خور سے توبہ کے مطالبہ کے بعد قتال کیا جائے، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے امر کی طرف لوٹ آئے جس طرح باغی کا حکم ہے۔ میں کہتا ہوں ظاہر بات یہ ہے اگر اس کی پشت پناہی کرنے والا کوئی نہ ہو تو امام پر واجب ہے کہ اسے قید کر دے یہاں تک کہ وہ توبہ کرے اگر اس کی کوئی پشت پناہی کرنے والا ہو امام اس کو قید کرنے پر قادر نہ ہو تو وہ باغی کی طرح ہے، اس کے ساتھ قتال کیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ یہی حکم ہوگا ہر اس آدمی کا جو کسی بھی فرض کا تارک ہو جس طرح نماز روزہ وغیرہ یا وہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرے اور اعلانیہ اس پر اصرار کرے۔ رزین رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مناقب ابی بکر میں روایت کیا ہے اگر انہوں نے پاؤں باندھنے والی رسی دینے سے انکار کیا تو میں ان کے ساتھ جہاد کروں گا۔ میں نے عرض کی اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ لوگوں کے ساتھ نرمی کیجئے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے فرمایا کیا زمانہ جاہلیت میں جری اور دور اسلام میں بزدل، بے شک وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، دین مکمل ہو چکا ہے۔ کیا میرے زندہ ہوتے ہوئے دین میں کمی کی جائے گی(1) صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی حدیث طیبہ ہے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا قسم بخدا میں ان لوگوں سے جنگ کروں گا جنہوں نے نماز اور زکوٰۃ میں فرق کیا کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، قسم بخدا اگر انہوں نے مجھے عناق (بکری کا بچہ) بھی نہ دیا جو وہ پہلے رسول اللہ ﷺ کو دیتے تھے تو اس کے روکنے پر میں ان سے جنگ کروں گا۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا میں پہچان گیا کہ یہی حق ہے۔(2)

۳؎ یعنی اپنے راس المال سے زیادہ وصول کرنے کے ساتھ ظلم نہیں کرتے۔

۵؎ ٹال مٹول کرنے اور راس المال میں کمی کرنے کے ساتھ تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (ادائے اصل میں) غنی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے(3) متفق علیہ۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ اگر انہوں نے توبہ نہ کی تو ان کو مال بھی نہیں ملے گا کیونکہ حرام چیز کے حلال ہونے پر اصرار کرنے والا مرتد ہو جاتا ہے اور اس کا مال مال فئی بن جاتا ہے، جس طرح ہم نے کہا وہ درست ہے، یعنی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق کیونکہ مرتد کا سارے کا سارا مال آپ کے نزدیک مال فئی ہے مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جو اس نے حالت اسلام میں کمایا ہے تو اس کے قتل ہونے یا دارالحرب چلے جانے کے بعد اس کا مال مسلمان وارثوں کو منتقل کیا جائے گا اور جو حالت ارتداد میں اس نے کمایا وہ مال فئی ہوگا۔ یہ مفہوم مخالف امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دلیل نہیں اس طرح کہ جب وہ مال وارثوں کا ہے تو وہ اس کا نہ ہوا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب یہ آیت نازل آئی تو بنو عمرو اور سود خوروں نے کہا بلکہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتے ہیں ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، وہ راس المال پر راضی ہو گئے۔ یہ اس حدیث کا تتمہ ہے جو ابو یعلی

1۔ مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 556 (وزارت تعلیم)　2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 1081 (وزارت تعلیم)　3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 18 (قدیمی)

رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جو مغیرہ نے تنگ دستی کی شکایت کی اور کہا کہ فصل توڑنے تک ہمیں مہلت دے دو تو انہوں نے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾

"اور اگر مقروض تنگ دست ہو۔ ۱؎ تو مہلت دو اسے خوشحال ہونے تک ۲؎ اور بخش دینا اسے (قرض) بہت بہتر ہے تمہارے لئے ۳؎ اگر تم جانتے ہو ۴؎"

۱؎ یہاں کان تامہ ہے جو خبر کا متقاضی نہیں، یعنی مقروض تنگ دست ہو اور بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی خبر نہیں، جب اسم نکرہ ہو تو یہ جائز ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے اگر آدمی نیک ہو تو اس کی عزت کر(2) میں یہ کہتا ہوں اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تنگ دست مقروض ہو۔ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے عسرہ کو سین کے ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ یہاں مبتداء محذوف ہے جو الحکم ہے یا خبر محذوف ہے جو علیکم ہے یا یہاں فلیکن فعل محذوف ہے۔ نظرہ کا معنی مہلت دینا ہے۔ نافع رحمۃ اللہ علیہ نے سین کے ضمہ اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے تنگ دست کو سہولت دی اللہ تعالیٰ اسے دنیا اور آخرت میں سہولت عطا فرماتا ہے(3) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث میں اس مفہوم کو روایت کیا ہے اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح مختصر نقل کیا ہے۔

۳؎ مہلت دینے کی بجائے انہیں معاف کر دینا زیادہ ثواب کا باعث ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں تصدق سے مراد مہلت دینا ہو کیونکہ عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کسی مسلمان کے قرض لینے کا وقت نہیں آتا وہ مقروض کو مہلت دے دیتا ہے مگر وہ قیامت کے روز اس کے لئے صدقہ ہوگا۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے یعنی مہلت دینا لینے سے بہتر ہے۔ تاہم ظاہر یہی ہے کہ یہاں تصدق سے مراد بری کرنا ہے یہ مہلت دینے کی بنسبت زیادہ اچھا اور زیادہ ثواب کا باعث ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا کہ قیامت کے روز سب سے پہلے جسے اللہ تعالیٰ کے سائے میں جگہ ملے گی، وہ وہ انسان ہوگا جس نے تنگ دست کو مہلت دی ہوگی، یہاں تک کہ وہ کوئی چیز پائے یا جس چیز کا مطالبہ کر رہا تھا اس میں سے کچھ صدقہ کرے، وہ کہے جو میرا تیرے اوپر حق تھا وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی خاطر صدقہ ہے اور اپنا صحیفہ (قرض والی کتاب) جلا دیتا ہے۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السنہ میں اس لفظ کے ساتھ روایت کیا ہے جس نے مقروض کو سہولت دی یا اس کا قرض ختم کر دیا وہ قیامت کے روز عرش الٰہی کے سائے میں ہوگا۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اس کی مثل مروی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوالیسر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے کبیر میں اسعد بن زرارہ سے اور اوسط میں شداد بن اوس سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ وہ ایک آدمی سے اپنا حق طلب کرتا تھا، وہ چھپ جاتا۔ پوچھا تجھے ایسا کرنے پر کونسی چیز برانگیختہ کرتی ہے؟ کہا تنگ دستی۔ آپ نے اس سے قسم دینے کو کہا۔ اس نے قسم اٹھا دی۔ آپ نے وہ دستاویز منگوائی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 254 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 254 (التجاریہ)　3۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 176 (وزارت تعلیم)

اور اس مقروض کو دے دی اور کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا جس نے تنگ دست کو مہلت دی یا اسے معاف کر دیا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کی مصیبت سے نجات دے دیگا(1) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں سے مرفوع حدیث نقل کی ہے۔ حضرت ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، کہا بے شک فرشتے نے ایک آدمی کی روح قبض کی جو تم سے پہلے ہو گزرا، اس سے پوچھا گیا تو نے کبھی اچھا عمل بھی کیا؟ اس نے کہا نہیں مگر میں لوگوں کو ادھار دیتا، اپنے ملازمین کو کہتا کہ خوشحال کو مہلت دینا اور تنگ دست سے درگزر کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے فرشتو اس سے بھی درگزر کرو(2) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ صحیحین میں حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی کی مثل مروی ہے۔

؎ مہلت دینے اور اس چیز کو صدقہ کرنے کی فضیلت کو تم جانتے ہو۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٨١﴾

" اور ڈرتے رہو اس دن سے لوٹائے جاؤ گے جس میں اللہ کی طرف؎ پھر پورا پورا دے دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کمایا ہے؎ اور ان پر زیادتی نہ کی جائے گی؎ "

؎ یوم سے مراد قیامت کا دن یا موت کا دن ہے۔ ان کے لئے تیاری کرو۔ ابو عمرو اور یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ نے ترجعون کی تاء کو مفتوح پڑھا ہے، یعنی تم لوٹو گے۔ اور دوسروں نے تاء پر ضمہ پڑھا ہے اور جیم پر فتحہ یعنی مجہول کا صیغہ ہے، یعنی تمہیں لوٹایا جائے گا۔

؎ یعنی خیر اور شر میں سے جو کمائے اس کی جزاء۔

؎ یعنی ثواب میں کمی کر کے اور عذاب میں زیادتی کر کے تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ یہ آخری آیت ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تو جبرئیل امین نے آپ ﷺ سے کہا کہ اسے سورۃ بقرہ دو سو اسی نمبر آیت کے بعد رکھو(3) اسی طرح امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ثعلبی سدی صغیر رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے کلبی سے، انہوں نے ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد اکیس دن اس جہان فانی میں رہے(4) بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا۔ ایک قول یہ کہا گیا کہ اکیاسی دن قربانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے صرف سات دن آپ ﷺ کا وصال ربیع الاول کی دوسری تاریخ کو ہوا جب گیارہ ہجری کا سورج زوال پذیر ہوا۔ اسی طرح ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے آیت تہدید کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ ۖ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 279 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 17 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 256-255 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 256 (التجاریہ)

فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۬ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

"اے ایمان والو جب تم ایک دوسرے کو قرض دو [1] مدت مقرر تک [2] تو لکھ لیا کرو اسے [3] اور چاہیے کہ لکھے تمہارے درمیان لکھنے والا عدل و انصاف سے [4] اور نہ انکار کرے لکھنے والا لکھنے سے جیسے سکھایا ہے اس کو اللہ نے [5] پس وہ بھی لکھ دے [6] اور لکھوائے وہ شخص جس کے ذمہ حق (قرضہ) ہے [7] اور ڈرے [8] اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے اور نہ کمی کرے اس سے ذرہ بھر [9] پھر اگر وہ شخص جس پر قرض ہے بے وقوف ہو [10] یا کمزور ہو [11] یا اس کی طاقت نہ رکھتا ہو کہ خود لکھا سکے [12] تو لکھائے اس کا ولی (سرپرست) [13] انصاف سے [14] اور بنا لیا کرو دو گواہ اپنے مردوں سے [15] اور اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں [16] ان لوگوں میں سے جن کو پسند کرتے ہو تم (اپنے لئے) گواہ [17] تا کہ اگر بھول جائے ایک عورت تو یاد کرائے (وہ) ایک دوسری کو [18] اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ بلائے جائیں [19] اور نہ اکتایا کرو [20] اسے لکھنے سے [21] خواہ (رقم قرضہ) تھوڑی ہو یا زیادہ [22] اس کی میعاد تک [23] یہ تحریر [24] عدل قائم کرنے کے لئے بہت مفید ہے اللہ کے نزدیک [25] اور بہت محفوظ رکھنے والی ہے گواہی کو [26] اور آسان طریقہ ہے تمہیں شک سے بچانے کا [27] مگر یہ کہ سودا دست بدست ہو [28] جس کا تم لین دین آپس میں کرو [29] (اس صورت میں) نہیں تم پر کچھ حرج اگر نہ بھی لکھو اسے [30] اور گواہ ضرور بنا لیا کرو جب خرید و فروخت کرو [31] اور ضرر نہ پہنچایا جائے لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو [32] اور اگر تم ایسا کرو گے [33] تو یہ نافرمانی ہوگی تمہاری [34] اور ڈرا کرو اللہ سے [35] اور سکھاتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ (آداب معاشرت) [36] اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے [37]"

[1] جب تم ایسا معاملہ کرو جس کے باعث متعاقدین میں سے ایک کے اوپر دین واجب ہو ہم نے یہاں ایک کے ذمہ کی قید ذکر کی ہے کیونکہ بالاجماع ادھار کی ادھار سے بیع کرنا جائز نہیں جو ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کی طرف منسوب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔ اسے دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے یہ آیت مطلق بیع، بیع سلم، اجارہ، قرض بلکہ نکاح، خلع اور صلح کو بھی شامل ہے۔ یہاں دین کا ذکر کیا ہے تا کہ تداین سے جزاء دینے کا وہم پیدا نہ ہو، ساتھ ہی ساتھ فاکتبوہ کی ضمیر کا مرجع بھی بنے۔ لفظ دین نکرہ ہے جو شرط کے ضمن میں واقع ہے تو یہ ہر دین کو عام ہوگا، وہ ثمن ہو یا مبیع، کیلی، وزنی ہو یا کوئی اور، ادھار ہو یا نقد۔

[2] اس سے نقد بیع خارج ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے لئے عموماً کتابت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ اس کی مدت دنوں، مہینوں یا سالوں کی صورت میں معین کرے، یہاں تک کہ مدت معلوم ہو جائے۔ یہ قید اس لئے لگائی کیونکہ ثمن موجل اور بیع سلم کی صورت میں عقد اس وقت تک ہوتا ہی نہیں جب تک اجل معلوم نہ ہو کیونکہ اس کی جہالت جھگڑے کی طرف لے جاتی ہے بیع کے اندر ثمن ادا کرنے کے لئے

مدت کی تعیین، بیع سلم میں مبیع حوالے کرنے کے لئے مدت کی تعیین ضروری ہوتی ہے پھر کیفیت نکاح اور دوسرے معاملات کی ہے مگر قرض میں مدت کی تعیین نہیں ہوتی۔ اس لئے جن میں مدت کی تعیین ہوتی ہے ان میں وقت مقررہ آنے سے قبل صاحب حق کو مطالبہ کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، نہ ہی جس نے رقم دینی ہے اس کے لئے ٹال مٹول جائز ہوتا ہے۔ رہا قرض تو اس کی مدت متعین کرنے سے بھی مدت متعین نہیں ہوتی کیونکہ شرع نے اسے عاریہ تصور کیا ہے اور جو چیز واپس کی جارہی ہے وہ بعینہ وہی چیز ہے جو اس نے پہلے دی تھی تا کہ ربوا نسیہ (1) لازم نہ آئے۔ یہ آیت اپنی عبارت النص میں ادھار رقم اور بیع سلم کو شامل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول کا بھی یہی مفہوم ہے" میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ عقد جس میں ایک معین مدت تک رقم یا مبیع ادا کرنے کی مہلت دی گئی ہو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کی اجازت دی ہے۔" اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے (مذکورہ آیت ....) حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں اسے نقل کیا ہے اور شیخین کی شروط پر اسے صحیح قرار دیا ہے۔ سند یوں ہے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے، وہ ابو حسان اعرج سے، وہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں طبرانی اور ابن ابی شیبہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے، نیز امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے معلق ذکر کیا ہے۔ قیاس بیع سلم کے عدم جواز کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ یہ بیع معدوم (جو چیز موجود نہیں) ہے کیونکہ بیع سے مقصود مبیع ہے اور ثمن اس کا وسیلہ ہوتا ہے ثمن میں تو اس کا وجود اعتباری کافی ہوتا ہے کہ کسی کے ذمہ میں معین وصف کے ساتھ متحقق ہو جائے۔ مبیع تو بیع کے ورود کا محل ہوتا ہے مبیع کے معدوم ہونے سے بیع کا معدوم ہونا ثابت ہو جاتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ایسی چیز کی بیع سے منع کیا ہے جو موجود نہ ہو، لیکن اس قیاس کو ترک کر دیا کیونکہ اس کے مباح ہونے کے بارے میں نصوص موجود ہیں اور اس بیع کے منعقد ہونے پر اجماع ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے لوگ ایک سال دو سال بعض اوقات تین سال پہلے ہی کھجوروں کی فصل کی بیع کر دیتے تھے۔ فرمایا جس پھل میں بیع سلم کرے، پس اسے چاہئے معین کیل، معین وزن اور معین مدت میں بیع کرے (1) متفق علیہ۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دور میں گندم، جو، کھجور اور کشمش میں بیع سلم کرتے تھے (2) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے احمد رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے روایت کیا ہے میں نے ابن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا تم رسول اللہ ﷺ کے دور میں گندم، جو، تمر اور تیل کی بیع سلم کرتے تھے؟ جواب دیا ہم رسول اللہ ﷺ کے دور میں غنیمت میں سے حصہ پاتے تو ہم گندم، جو، کھجور اور تیل میں بیع سلم کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کیا اس کی کھیتی ہوا یا کھیتی نہ ہو؟ فرمایا ہم ان سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کرتے تھے۔ پھر راوی ابن ابی ابزی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا تو انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو ابن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیا تھا۔ جب بیع سلم قیاس کے خلاف ہے تو اسے اسی حد تک محدود رکھا جائے گا جہاں شرع کا حکم وارد ہے اور وہ حکم یہ ہے کہ مبیع ادھار ہو اور اس کی مدت معین ہو۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبیع نقد ہو تو اس میں بیع سلم جائز نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر مبیع نقد ہو تو یہ بدرجہ اولیٰ جائز ہے یا صورت ثانیہ کو صورت اول کی طرح مان لیا جائے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ بیع سلم خلاف قیاس مشروع ہے، اس کا مقصد اس فقیر کی حاجت کو دور کرنا ہے جو اس وقت اپنے اہل خانہ کے نفقہ سے عاجز ہے اور وہ بعد میں مبیع پر قادر ہوگا اور خریدار کی ضرورت اپنے گھر والوں کے حق میں نفع کی

(1) جب دونوں عوض نقدی میں سے ہوں تو مجلس عقد میں دونوں پر قبضہ کرنا ضروری ہوتا ہے اور ان میں ادھار جائز نہیں ہوتا۔
1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 300 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 299 (وزارت تعلیم)

امید ہے۔ یہ بیع سلم میں آسان ہے کیونکہ بیع سلم میں مبیع کی عقد کے وقت قیمت کم لگائی جاتی ہے۔ تاہم یہ اس وقت تک درست نہ ہوگی جب تک مدت معین نہ کی جائے اور مدت کی تعیین نقد بیع میں تو متحقق نہیں ہوتی۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بیع سلم انہیں چیزوں میں جائز ہوتی ہے جن کی جنس، نوع، صفت اور قدر منضبط ہو سکتی ہے اس میں شرط یہ ہے کہ یہ بیع ان چار چیزوں کے ذکر کے ساتھ ہی جائز ہوگی۔ ساتھ ہی ساتھ مدت کا بھی ذکر کرے تاکہ جہاں تک ہو سکے مبیع معین ہو جائے اور جھگڑا کا امکان نہ رہے۔ جمہور علماء کے نزدیک بیع سلم کے صحیح ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ راس المال کی مقدار کا بھی علم ہو جبکہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا اس میں اختلاف ہے، وہ کہتے ہیں جس راس المال کی طرف اشارہ کر دیا تو کافی ہوگا۔ ہم کہتے ہیں بعض اوقات رقم میں کھوٹے سکے بھی ہوتے ہیں، مجلس میں جن کا تبادلہ نہیں ہوتا، اگر اس کی مقدار کا علم نہ ہو تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کتنے میں بیع سلم باقی رہی۔ بعض اوقات بائع مبیع حوالے کرنے پر قادر نہیں رہتا تو اسے راس المال واپس کرنا پڑتا ہے تو اس عقد میں موہومہ چیز ثابت شدہ چیز کی مانند ہے کیونکہ یہ منافی چیز کی موجودگی (ا) میں مشروع ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ساتویں شرط کا اضافہ کیا ہے کہ اگر مبیع سپرد کرنے میں کچھ مشقت برداشت کرنا پڑتی ہو تو اس جگہ کی تعیین بھی ضروری ہے جہاں اس نے وہ مبیع مشتری کے حوالے کرنا ہے۔ باقی ائمہ کا یہ قول ہے کہ جس جگہ عقد ہوا ہے اسی جگہ سامان پہنچانا ہوگا۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے آٹھویں شرط کا بھی اضافہ کیا ہے کہ مبیع مدت معینہ تک بازار میں موجود رہے، جبکہ جمہور علماء کا یہ نقطہ نظر ہے کہ یہ کوئی شرط نہیں بلکہ وقت مقررہ میں اس کا موجود ہونا ضروری ہے۔ جمہور علماء کی دلیل یہ ہے کہ یہ شرط شرع سے ثابت نہیں کیونکہ اصل معدوم ہے (حدیث طیبہ میں اس کی صراحت نہیں ہے) اور عام دلائل اس کی اباحت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل وہ روایت ہے جو ابو داؤد اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کی ہے، اس کے الفاظ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے، وہ ایک نجرانی آدمی سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا کہ میں کھجوروں میں بیع سلم کرتا ہوں جبکہ ابھی تک گابھے نہیں نکلتے۔ فرمایا یہ ٹھیک نہیں۔ میں نے عرض کی یہ کیوں جائز نہیں؟ فرمایا ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کھجور کے ایک باغ میں بیع سلم کی جبکہ ابھی تک اس کے گابھے نہیں نکلے تھے تو اس سال کھجور نے کچھ بھی فصل نہ دیا۔ خریدار نے کہا میں تیرے ساتھ اس معاملہ کو مؤخر کرتا ہوں یہاں تک کہ یہ پھل دے۔ بیچنے والے نے کہا معاہدہ صرف اس سال کی کھجوروں کا ہوا تھا۔ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضور ﷺ نے دریافت کیا کیا اس نے تیرے کھجوروں کے درختوں سے کوئی چیز حاصل کی۔ اس نے عرض کی کچھ بھی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو کس طرح اس کا مال اپنے اوپر حلال جانتا ہے؟ جو رقم تو نے اس سے لی تھی وہ اسے واپس کر دے اور کھجوروں میں بیع سلم اس وقت تک نہ کرو جب تک اس کا پھل استعمال کے قابل نہ ہو جائے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ابو البختری سے نقل کیا ہے میں نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کھجوروں میں بیع سلم کے بارے پوچھا انہوں نے جواب دیا رسول اللہ ﷺ نے کھجوروں کو بیچنے سے منع کیا ہے، یہاں تک کہ وہ استعمال کے قابل ہو جائے اور چاندی کی بیع ادھار نقدی کے ساتھ منع کیا ہے۔ میں نے کھجوروں میں بیع سلم کے بارے ابن عباس سے پوچھا تو جواب دیا رسول اللہ ﷺ نے کھجوروں کی بیع کرنے سے منع کیا ہے یہاں تک کہ وہ کھائی جا سکے (1) میں کہتا ہوں وہ حدیث جس میں نجرانی ہے وہ مجہول ہے۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ

(ا) یعنی خلاف قیاس مشروع ہے جس کی وضاحت متن میں گزر چکی ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 299 (وزارت تعلیم)

علیہ میں اختلاف کیا گیا ہے، پس یہ آثار حجت نہیں بن سکتے لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ایسے عقد میں زیادہ محتاط ہے جو مشروع تو ہے لیکن اس میں منافی بھی پایا جارہا ہے۔

مسئلہ:۔ کیلی، وزنی اور زرعی چیزیں جو منضبط ہو سکتی ہیں ان میں بیع سلم کے جواز کے بارے میں اتفاق ہے۔ ہمارے علاقوں میں سوتے کپڑے کے اندر بیع سلم جائز ہے جس کی چوڑائی میں تین سو، چار یا پانچ سو دھاگے ہوں کیونکہ ایسے کپڑوں میں باہم بہت کم تفاوت ہوتا ہے اور اس قسم کے علاوہ کپڑوں میں بیع سلم جائز نہیں ہوتی اور وہ عددی چیزیں جن کی اکائیاں مختلف نہیں ہوتیں ان کی بیع سلم میں بھی اتفاق ہے، مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت اس کے خلاف مروی ہے، جس طرح اخروٹ، انڈے وغیرہ، وہ عددی چیزیں جن کی اکائیوں میں باہم فرق ہوتا ہے جس طرح انار، تربوز وغیرہ۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان میں وزن اور عدد دونوں اعتبار سے بیع سلم کرنا جائز نہیں۔ یہ ان علاقوں میں ہوگا جہاں تربوز عدد کے اعتبار سے بیچے جاتے ہیں جبکہ ہمارے علاقوں میں کیونکہ وزن کے اعتبار سے بیچے جاتے ہیں تو یہ جائز ہوگا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے مطلقاً جائز ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے وزن کے اعتبار سے جائز ہوگا۔ یہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی روایت ہے۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حیوان میں بیع سلم جائز نہیں جبکہ تینوں ائمہ کے نزدیک یہ جائز ہے۔ تینوں ائمہ نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں لشکر کی تیاری کروں۔ میرے پاس اونٹ نہیں تھا تو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ صدقہ کی اونٹنیوں کے بدلہ میں اونٹ لے لے۔ وہ ایک اونٹ دو اونٹنیوں کے بدلہ میں لیتے جو صدقہ کے اونٹوں کی آمد کی مدت کے ساتھ مشروط ہوتے۔ اسے ابوداؤد نے محمد بن اسحاق رحمہما اللہ تعالیٰ سے، وہ یزید بن ابی حبیب سے، وہ مسلم بن جبیر سے، وہ ابوسفیان سے، وہ عمرو بن حریش سے، وہ عبداللہ بن عمرو بن عاص سے نقل کرتے ہیں اسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا مسلم کی شرط پر یہ صحیح ہے۔ ابن قطان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث ضعیف ہے اور اس کی سند میں اضطراب ہے۔ حماد بن سلمہ نے اسے یوں ہی روایت کیا ہے۔ جریر بن حازم نے ابواسحاق سے روایت کیا، یزید بن ابی حبیب کو ساقط کر دیا اور ابوسفیان کو مسلم بن جبیر پر مقدم کیا۔ میں کہتا ہوں ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے تحقیق میں یوں ہی ذکر کیا اور عفان نے حماد بن سلمہ سے روایت کیا ہے، اس میں کہا ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے وہ زید بن ابی حبیب سے وہ ابوحبیب سے وہ مسلم سے وہ ابوسفیان سے وہ عمرو بن حریش سے اسے ابوبکر بن ابی شیبہ نے عبدالاعلیٰ سے روایت کیا۔ اس نے یزید بن ابی حبیب کو ساقط کر دیا اور ابوسفیان کو مقدم کیا جس طرح جریر بن حازم نے کیا اور کہا مسلم بن جبیر کی جگہ مسلم بن کثیر ہے۔ اس اضطراب کے ساتھ ساتھ عمرو بن حریش مجہول الحال ہے اور مسلم بن جبیر کا میں نے ذکر نہیں پایا اور ابوسفیان میں اعتراض کی گنجائش ہے شیخ ابن حجر نے کہا ابن اسحاق میں اختلاف ہے لیکن بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اسے سنن میں لائے ہیں اور خلافیات میں عمرو بن شعیب سے، وہ اپنے باپ سے، وہ دادا سے، اور اسے صحیح قرار دیا۔ میں کہتا ہوں اسے ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث اس حدیث کے معارض ہے جو ہم نے سمرہ، ابن عباس اور جابر رحمہم اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حیوان کی حیوان کے بدلے ادھار بیع سے منع کیا ہے۔ پس حرمت ثابت کرنے والی روایت کو اباحت ثابت کرنے والی روایت پر مقدم کیا جائے گا جس طرح ہم نے وہاں ذکر کیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حیوانات میں بیع سلم کے عدم جواز پر ان روایات سے استدلال کیا ہے جو حاکم اور دار قطنی نے اسحٰق بن ابراہیم بن جوتا سے روایت کیا ہے

ہمیں عبدالملک زماری نے، انہیں سفیان ثوری نے، وہ معمر سے، وہ یحییٰ بن ابی کثیر سے، وہ عکرمہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے، وہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے حیوان میں بیع سلم کرنے سے منع کیا ہے۔ حاکم نے کہا یہ صحیح الاسناد ہے اور شیخین نے اسے روایت نہیں کیا۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابوزرعہ نے کہا عبدالملک زماری منکر الحدیث ہے۔ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ قوی نہیں ہے۔ علاس نے اس کی توثیق کی ہے۔ اسحاق بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ مجہول ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ حاکم نے اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کو پہچانا یہاں تک کہ اس پر صحت حدیث کا حکم لگا دیا۔ ظاہر امر یہ ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابن معین کی ابن حوتا کی تضعیف محل نظر ہے کیونکہ متعدد صحیح اور حسن سندوں سے اسے روایت کیا گیا (متعدد طرق سے روایت معنوی اس حدیث کے معنی کو پایہ حجت تک پہنچا دیتی ہے) اس لئے اس حدیث سے حجت پیش کی جا سکتی ہے۔ اس باب میں ابن مسعود رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اثر بھی ہے جسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حماد بن ابی سلیمان سے انہوں نے ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے، کہا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے زید بن خدیلہ بکری کو مضاربت پر مال دیا، زید نے عرلیس بن عرقوب شیبانی کے ساتھ اونٹنیوں میں بیع سلم کی۔ جب وقت مقرر آیا تو بعض مال وصول کر لیا اور بعض باقی رہ گیا۔ عرلیس تنگ دست ہو گیا۔ اسے یہ خبر پہنچی کہ اصل میں مال عبداللہ کا ہے۔ وہ اس کے پاس آیا تا کہ اس سے نرمی کا مطالبہ کرے۔ عبداللہ نے کہا کیا زید نے ایسا کیا؟ عرلیس نے جواب دیا جی ہاں۔ عبداللہ نے پوچھنے کے لئے بلا بھیجا اور کہا جو کچھ تو نے اس سے لیا اسے واپس کر دو اور اپنا راس المال لے لو اور ہمارے مال میں حیوان کی بیع سلم نہ کرنا۔ صاحب تنقیح نے کہا اس میں انقطاع ہے، یعنی ابراہیم اور عبداللہ کے درمیان انقطاع ہے کیونکہ وہ علقمہ یا اسود کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہمارے نزدیک اس قدر قدح کا باعث نہیں خصوصاً ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کی مراسیل میں کوئی حرج نہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ حدیث صحیح ہو کہ نبی کریم ﷺ نے حیوانات میں بیع سلم کرنے سے منع کیا ہے۔ تو یہ دوسرے اختلافی مسائل میں بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہو گی، وہ یہ کہ آپ کے نزدیک حیوان بطور قرض دینا جائز نہیں جبکہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ تعالیٰ علیہ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ یہ ائمہ ابورافع کی حدیث سے حیوان کو قرض پر دینے کے جواز کا استدلال کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے کسی شخص سے ایک نوجوان اونٹ بطور قرض لیا تھا۔ آپ ﷺ کے پاس صدقہ کے اونٹ آئے۔ فرمایا اسے عطا کر دو۔ لوگوں نے عرض کی ہم ان میں رباعی اور بہترین پاتے ہیں۔ فرمایا اسے دے دو کیونکہ لوگوں میں سے بہترین وہ ہوتا ہے جو حق کی ادائیگی میں بہترین ہو (1) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک آدمی کا حضور ﷺ پر حق تھا اس نے آپ ﷺ سے سختی کی تو آپ ﷺ کے صحابہ نے اسے سزا دینے کا ارادہ کیا، آپ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دو کیونکہ صاحب حق کو بات کرنے کا حق ہے۔ آپ ﷺ نے صحابہ کو ارشاد فرمایا اس کے لئے ایک سالہ اونٹ خرید دو اور اسے دے دو۔ صحابہ نے عرض کی ہم یک سالہ نہیں پاتے۔ بلکہ اس سے بہتر پاتے ہیں فرمایا اسے خرید دو اور اسے دے دو کیونکہ تم میں سے بہترین آدمی وہی ہے جو حق ادا کرنے میں بہترین ہو (2) متفق علیہ۔ حیوان میں قرض کے ناجائز ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اسے اوصاف و مقدار میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس وجہ سے اس میں قرض جائز نہیں جس طرح ادھار بیع میں اسے ثمن اور بیع سلم میں اسے مبیع بنانا جائز نہیں۔ یہ علت دو صحیح حدیثوں کے مقابلے میں مقبول نہیں جبکہ حیوان میں بیع سلم سے نہی والی حدیث صحیح نہ ہو کیونکہ سلف کا لفظ بیع سلم اور قرض دونوں کو شامل ہے۔ اگر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث صحیح ہو تو حرمت کو ثابت

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 30 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 30 (قدیمی)

کرنے والی دلیل کو اباحت ثابت کرنے والی دلیل پر مقدم کیا جائے گا، ورنہ رسول اللہ ﷺ سے بکر (نوجوان اونٹ) قرض لینے کی جو روایت ثابت ہے اسے اپنے محل تک محدود رکھا جائے گا اور دوسرے حیوانات کی بیع کو ان پر قیاس نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ قیاس کے طریقوں سے مختلف ہے۔ اگر یہ کہا جائے اگر حیوان کی صفت وقدر کو منضبط نہیں کیا جا سکتا اور ذمہ میں اس کا ثبوت جائز نہیں تو تم نے نکاح اور خلع کو غلام، لونڈی اور مہر مقرر کرنے پر کیوں جائز قرار دیا اور درمیانی جانور لازم کیا؟ ہم نے کہا یہاں دو قیاس ہیں: ایک بیع پر قیاس کرنا کہ رسول اللہ ﷺ نے ادھار بیع سے منع کیا، ایک دیت پر قیاس ہے کہ اس میں اونٹ واجب کئے۔ ہم کہتے ہیں جس میں مبادلہ مال بالمال ہے اس میں کمال انضباط ضروری ہے، وہ بیع، اجارہ اور مال کا اقرار کرنے کے بعد صلح کی طرح ہے۔ وہ امور جن میں مال کا غیر مال کے ساتھ مبادلہ کی صورت ہو، جس طرح نکاح، خلع، جرم عمد پر صلح اور انکار پر صلح، اس میں کمال انضباط شرط نہیں تو یہ دیت پر قیاس کرتے ہوئے جائز ہے۔ پھر مسلمانوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ آزاد عورت پر ناکمل بچہ کے ضائع کرنے پر چٹی غلام یا لونڈی لازم ہوگی جبکہ لونڈی کا ناکمل بچہ ضائع کرنے پر دراہم و دنانیر لازم ہوں گے جو جنین کی قیمت کا دسواں حصہ یا اس کا نصف لازم ہوگا۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے جبکہ دوسرے علماء کے نزدیک اس جنین کی ماں کی قیمت کا دسواں حصہ لازم ہوگا اور چوپاؤں کے جنین (ناکمل بچہ) کے ضائع ہونے کی صورت میں جنین کی ماں کی قیمت میں جو نقص واقع ہوا وہ لازم ہوگا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جب مال کا مال سے مبادلہ ہو تو عادۃً ان میں بڑی باریکی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، جبکہ مال کا مال کے ساتھ مبادلہ نہ ہو تو اس میں اتنی باریکی نہیں دیکھی جاتی کیونکہ اس میں مال صلہ کے قائم مقام ہے۔ شاید ان علاقوں میں اونٹ واجب ہوں اور دوسرے اوصاف کی رعایت کے بعد ان میں کم تفاوت رہ جاتا ہو۔ یہ بدیہی امر ہے۔ تھوڑا فرق قابل معافی ہوگا کیونکہ ایسی کی تو ضرورت ہوتی ہے۔ جان لو قیاس تو قرض کے عدم جواز کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ یہ اگر دراہم و دنانیر کی صورت میں ہو تو بیع صرف میں ادھار کو لازم ہوگا اگر ان کے علاوہ میں قرض ہو تو معدوم کی بیع لازم ہوگی اور ربا نسیئہ لازم آئے گا۔ لیکن جب نصوص اور اجماع سے قرض کا جواز ثابت ہے کیونکہ اس کی ضرورت ہوتی ہے تو علماء نے اس کی صحت کی توجیہ یہ کی ہے کہ شرع نے قرض کو عاریہ تسلیم کیا ہے، گویا قرض لینے والا نفع حاصل کرنے کے لئے دوسرے کا مال عاریۃً لیتا ہے جب اموال ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن سے انتفاع اس مال کے ہلاک کرنے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا جس طرح دراہم، دنانیر اور کھانا، تو اس سے نفع حاصل کرنے کے بعد اسے واپس کرنا ممکن نہیں، تو شرع نے اس کی مثل کو اس کے عین کا حکم دے دیا۔ پس جس نے مثل کے ساتھ قرض دے دیا گویا اس نے بعینہ وہ چیز دے دی۔ اسی وجہ سے قرض میں مدت لازم نہیں ہوتی جس طرح عاریہ میں مدت لازم نہیں ہوتی کیونکہ عاریہ دینے والے کو حق حاصل ہوتا ہے کہ عاریۃً لینے والے سے جب چاہے چیز واپس لے لے۔ تو ہم کہتے ہیں جس میں یہ صورت ممکن ہے اس میں قرض بھی جائز اور جس میں ایسا کرنا جائز نہیں اس میں قرض بھی ممکن نہیں۔ جب یہ بات واضح ہو گئی تو ہم کہتے ہیں کہ قرض کا دراہم، دنانیر اور مثلی چیزوں کے علاوہ میں تصور نہیں کیا جا سکتا جن میں انہیں ہلاک کرنے کے علاوہ ان سے نفع حاصل نہیں کیا جا سکتا، جس طرح کھانا، مگر وہ چیزیں جو فائدہ اٹھانے کے بعد باقی رہتی ہیں جس طرح کپڑا، جانور، غلام، لونڈی، گھر اور اس جیسی دوسری چیزیں، تو ان میں یہ توجیہ نہیں ہو سکتی کیونکہ قرض لینے والے کے پاس وہ چیز اصل صورت میں موجود ہے تو اس کی مثل کو اس کا عین تصور نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس صورت میں اگر مالک نے اپنا مال غیر کو نفع اٹھانے کے لئے دیا ہے تو لینے والے پر قرض ہوگا کہ وہی چیز دینے والے کو واپس کرے تو یہ حقیقت میں عاریہ ہوگا۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ

اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حیوان، کپڑوں، لونڈیوں، غلاموں اور اس جیسی دوسری چیزوں میں قرض جائز نہیں۔ تاہم بعض چیزوں میں اختلاف موجود ہے۔ تاہم تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ لونڈی کو وطی کے لئے قرض دینا جائز نہیں۔

مسئلہ:۔ اگر قرض لینے والے نے قرض دینے والے کو کوئی چیز تحفہ دی یا اپنی سواری پر سوار کیا یا اپنے گھر میں ٹھہرایا جبکہ یہ ان کے درمیان عام معمول نہ تھا یا جو لیا تھا اس سے زیادہ دیا یا اس سے عمدہ دیا، کیا یہ قرض دینے والے کے لئے جائز ہوگا یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے یہ قرض دینے والے کے لئے حلال نہیں بلکہ مکروہ ہے، اگرچہ اس کی شرط نہ لگائے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے اگر بغیر شرط کے اس کو یہ چیزیں دی گئی ہوں تو اس کے لئے لینا جائز ہے، اگر قرض دینے والے نے اس کی شرط لگائی ہو تو یہ جائز نہیں ہے۔ جمہور علماء نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی قرض دے قرض لینے والا اسے طبق (تحفہ) دے تو وہ اسے قبول نہ کرے، اگر اسے سواری پر سوار کرے تو سوار نہ ہو مگر اسی صورت میں جائز ہوگا کہ اس سے قبل ان دونوں کے درمیان یہ معمول ہو(1) اسے ابن ماجہ اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے فَلَا يَاْخُذْ هَدِيَّةً پس وہ تحفہ وصول نہ کرے۔ حضرت سالم بن جعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا میں نے ایک ایسے آدمی کو درہم قرض دیا جو مچھلیاں بیچتا ہے۔ اس نے مجھے ایک مچھلی تحفہ کے طور پر دی جس کی قیمت تیرہ درہم تھی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اب سات درہم لو۔ اسے ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جب تیرا کسی آدمی پر حق ہو، وہ تجھے انجیر، جو، قت (ا) وغیرہ کا ایک حمل (ب) دے تو اس سے نہ لے کیونکہ یہ ربا (سود) ہے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسے قرض سے منع کیا ہے جو نفع کو لانے والا ہو۔ اسے حارث بن اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں سوار بن مصعب متروک ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے معرفت میں فضالہ بن عبید سے موقوفاً ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے" ہر وہ قرض جو نفع لائے یہ ربا کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔" بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سنن کبیر میں عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، عبداللہ بن سلام اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے موقوفاً روایت کی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ابورافع اور حضرت ابوہریرہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ لوگوں نے عرض کی ہم ایک سالہ اونٹنی نہیں پاتے بلکہ اس سے اچھی (بہتر) اونٹنی پاتے ہیں۔ فرمایا اسے دے دو کیونکہ تم میں سے بہترین وہ ہے جو حق ادا کرنے میں بہترین ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قول کی تائید یہ حدیث بھی کرتی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے خمیر یا خبز (روٹی) کے بارے پوچھا جو پڑوسی دوسروں کو دیتے ہیں تو وہ واپس زیادہ کرتے ہیں یا کم کرتے ہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں، بے شک یہ ایسا امر ہے جس میں پڑوسی آپس میں ایک دوسرے کے درمیان نرمی برتتے ہیں، اس سے زیادتی کا ارادہ نہیں کیا جاتا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے خمیر اور روٹی کے قرض لینے کے بارے دریافت کیا آپ ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ یہ چیز تو مکارم اخلاق سے تعلق رکھتی ہے تھوڑا لے کر

(ا) ایک دانہ جس کو صحرائی لوگ کوٹ کر کھاتے ہیں، کرنجوہ۔

(ب) ایک پیمانہ۔

1۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 177 (وزارت تعلیم)

زیادہ دے دو زیادہ لے کر تھوڑا دے دو، تم میں سے بہترین وہ ہے جو حق ادا کرنے میں بہترین ہو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ان دونوں کو ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے لیکن یہ کہنا ممکن ہے کہ باہم یہ نرمی اور باہم ہدیہ پڑوسیوں میں عام ہو اور اختلاف ان چیزوں میں ہو جن میں یہ سلسلہ جاری نہیں ہوتا یہ دونوں حدیثیں جمہور علماء کے نقطہ نظر کی دلیل ہیں جو دو روٹی اور خمیر کے قرض کے جواز کا قول کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ تعداد کے اعتبار سے اور دوسرا وزن کے اعتبار سے ان کا قرض دینا جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے یہ جائز نہیں واللہ اعلم۔

3 یعنی جو تم نے قرض دیا ہے اسے لکھو لو کیونکہ یہ زیادہ قابل اعتماد اور نزاع کو ختم کرنے کا باعث ہے۔ جمہور علماء کا کہنا ہے کہ یہ مستحب ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں، جس طرح رب العالمین کا فرمان ہے جب نماز ادا کر لو تو زمین میں پھیل جاؤ۔ بعض نے کہا یہ واجب ہے۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قرض کا لکھنا اور گواہ بنانا یا رہن رکھنا فرض ہیں۔ پھر یہ سب اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے منسوخ ہو گئے "اگر تم میں سے بعض بعض سے مطمئن ہو تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ امانت واپس کر دے۔" میں کہتا ہوں ناسخ وہ ہوتی ہے جو بعد میں نازل ہو جبکہ یہ ایسے نہیں بلکہ دونوں آیتیں اکٹھی نازل ہوئیں۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ لکھنے کا حکم اور اس جیسی دوسری چیزیں مستحب ہیں۔

4 دونوں متعاقدین کے حقوق کی رعایت کرتے ہوئے لکھیں، زیادہ کریں نہ کمی کریں۔ کاتب کو عدل کا حکم دیا تو یہ امر وجوب کے لئے ہوگا۔ یہ دونوں متعاقدین کے لئے اس امر کو بھی ضمن میں لئے ہوئے ہے کہ وہ ایسے کاتب کا انتخاب کریں جو فقیہ اور دین دار ہو۔

5 یعنی نہ رکے جو کتابت کرنا جانتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے معاہدے لکھنے کی توفیق اور صلاحیت عطا فرمائی۔ یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی کتابت کے ذریعے غیر کو نفع پہنچانے سے نہ رکے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے تعلیم دے کر نفع پہنچایا ہے جس طرح رب العالمین کا فرمان ہے تم بھی احسان کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا۔

6 پس اسے چاہئے کہ وہ لکھائی گئی کتابت لکھے۔ پہلے انکار کرنے سے نہی فرمائی پھر لکھنے کا حکم دیا تو یہ تاکید کے طور پر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ کما علمہ فلیکتب کے متعلق ہو تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ لکھنے سے انکار کے ضمن میں کتابت کا حکم مطلق تھا، پھر اس کے ساتھ مقید حکم دیا۔ کیا کاتب پر کتابت اور شاہد پر شاہد بننا واجب ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب ان سے مطالبہ کیا جائے تو یہ واجب ہے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ فرض کفایہ ہے، جب انہیں کاتب یا گواہ بنا دیا جائے تو ان پر فرض ہو جاتا ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ کاتب اور شاہد پر واجب تھا تاہم اسے اس آیت نے منسوخ کر دیا وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ(1) اس ضمن میں وہی گفتگو ہے جو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

7 املال اور املاء دونوں فصیح لغتیں ہیں جن کا معنی ایک ہے۔ یعنی چاہئے یہ کہ کاتب کو لکھانے والا مقروض ہو کیونکہ اس کا اقرار اس کے خلاف دلیل ہے، بخلاف قرض خواہ کے کیونکہ اس کا قول کوئی اہمیت نہیں رکھتا جب تک مدیون اس کا اقرار نہ کرے یا حکم شرعی ثبوت کے بعد اس کے بارے میں فیصلہ نہ کر دے۔

8 اس کا فاعل املاء کرانے والا یا کاتب ہو سکتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 256 (التجاریہ)

۹؎ یعنی جو حق اس پر لازم ہے اس میں کمی نہ کرے یا مقروض نے اسے جو لکھایا ہے اس میں کمی نہ کرے۔

۱۰؎ یہاں سفیہ سے مراد ناقص العقل فضول خرچی کرنے والا ہے، اس میں مجنون بھی داخل ہوتا ہے۔

۱۱؎ یعنی بچہ یا بوڑھا جس کی عقل میں خلل واقع ہو چکا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سے مراد ضعیف العقل ہے خواہ صغر سنی اور جنون کی وجہ سے ہو۔

۱۲؎ یعنی گونگا پن، یا صحیح طور پر مطلب ادا نہ کر سکتا ہو، زبان سے ناواقفی، قید، مرض اور غائب ہونے کی وجہ سے کاتب کا حاضر ہونا ممکن نہ ہو یا وہ پردہ دار خاتون ہو جو کاتب کے پاس نہ آ سکے۔

۱۳؎ یعنی جو اس کے امور کا نگران ہو جو بچے کا ولی ہو یا جس کی عقل ٹھیک نہ ہو یا اس کا وکیل اور مترجم لکھائے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابن عباس اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ یہاں ولی سے مراد صاحب حق ہے یعنی اگر وہ آدمی جسے املاء کرانے کا حق ہے، وہ املاء کرانے سے عاجز ہو تو پھر حق لینے والا اور قرض خواہ املاء کرائے۔(1)

۱۴؎ یعنی حق پر زیادتی نہ کرے کیونکہ وہ حق کو زیادہ جاننے والا ہے اور دوسروں کی بنسبت املاء کرانے کا زیادہ حق رکھتا ہے اگر یہ سوال کیا جائے کہ قرض خواہ کے لکھانے کا کیا فائدہ، جبکہ اس کا قول غیر پر کسی حق کو لازم کرنے والا نہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کتابت کا فائدہ یہ ہے کہ دونوں متعاقدین رقم، راس المال، مسلم فیہ (مبیع)، مدت یا اس جیسی متعلقہ چیزوں کو نہ بھولیں، نہ کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کا قول حجت بن جاتا ہے کیونکہ قرض خواہ کی حجت تو گواہ ہیں۔

۱۵؎ شہادت کا مطالبہ کرو کہ اس عقد مداینت پر گواہی دیں، دو گواہ تم مسلمانوں میں سے جو آزاد ہوں کیونکہ وہی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مخاطب ہیں "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ" کیونکہ ادھار کا عقد عموماً دو آزاد آدمیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اسی لئے ہمارے نزدیک بچے کی گواہی جائز نہیں۔ کیونکہ وہ مرد نہیں یہی نقطہ نظر امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ اور عام علماء کا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ جرح (زخم) میں ان کی گواہی مقبول ہوگی، جب وہ کسی مباح امر پر اکٹھے ہوں قبل اس کے کہ وہ ادھر ادھر ہو جائیں، یہی نقطہ نظر ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ ان کی شہادت کے قبول نہ ہونے کی وجہ عقل اور تمیز کی کمی ہے اسی وجہ سے مجنون اور مخبلی کی شہادت مقبول نہیں ہوتی۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کیونکہ یہ بھی بچے کے حکم میں ہیں بلکہ عدم قبولیت میں اس سے بھی بڑھ کر ہیں ہمارے نزدیک غلام کی شہادت مقبول نہیں۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے یہی کہا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا غلام کی شہادت آزاد اور غلام دونوں کے خلاف قبول ہوگی یہی حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔ یہی امام اسحاق اور داؤد رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں کہا حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا غلام کی شہادت جائز ہے جبکہ وہ عادل ہو(2) شریح نے اس کی شہادت کو جائز قرار دیا ہے۔ نیز زرارہ بن ابی اوفی نے بھی ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے۔ غلام کی شہادت جائز ہے مگر غلام کی اپنے آقا کے حق میں جائز نہیں۔ حضرت حسن بصری اور ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بھی اس کی شہادت کو جائز قرار دیا ہے۔ شریح نے کہا تم سب غلاموں اور لونڈیوں کی اولاد ہو یہاں تک امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ تھے کسی کافر کی مسلمان کے خلاف شہادت بالاجماع جائز نہیں۔ اسی طرح کافر کی کافر کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 257 (التجاریہ)

2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 363 (وزارت تعلیم)

خلاف شہادت امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز نہیں کیونکہ وہ فاسق ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے" کافر ہی ظالم ہیں" امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کفار میں سے بعض کی بعض کے خلاف شہادت جائز ہے، اگرچہ ان کی ملت مختلف ہی کیوں نہ ہو کیونکہ ذمی ولایت کا حق رکھتا ہے لیکن غلام ولایت کا حق نہیں رکھتا کیونکہ ذمی اپنی چھوٹی اولاد کے خلاف ولایت کا حق رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ان میں سے بعض بعض کے اولیاء ہیں، نیز وہ مختلف چیزوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کا کفر فی نفسہ فسق ہوتا ہے، اگرچہ اس کے گمان کے مطابق دیانت ہوتی ہے۔ جھوٹ تمام ادیان میں حرام ہوتا ہے۔ ابوعبیدہ اور ابن ابی لیلیٰ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اگر ملتیں مختلف ہوں تو ان کی شہادت قبول نہیں کی جاتی جس طرح یہودی کی شہادت نصرانی کے خلاف قبول نہیں کی جاتی۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد مِنْ رِّجَالِكُمْ یہ مسلمان ہونے کی شرط پر دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں خطاب مومنوں کے ساتھ ہے، تاہم یہ آیت گواہوں کے مسلمان ہونے کی شرط پر دلالت نہیں کرتی مگر اس صورت میں یہ شرط ہوگی جب مشہود علیہ بھی مومن ہو۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک ملت کے لوگ دوسرے ملت کے لوگوں کے وارث نہیں بنتے نہ ایک امت کے لوگوں کی دوسری ملت کے لوگوں کے خلاف گواہی جائز ہوتی ہے مگر میری امت کے لوگ دوسرے ملتوں کے خلاف گواہ بن سکتے ہیں۔ اسے دار قطنی اور ابن عدی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث اگر صحیح ہو تو یہ ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہوگی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے لئے حجت نہ ہوگی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کفر ایک ملت ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ان میں سے کچھ وہ ہیں جو ایمان لائے اور کچھ وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا۔ اس صورت میں یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہے لیکن یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں عمر بن راشد ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ضعیف ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے استدلال کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل کتاب کی شہادت کو اہل کتاب کے خلاف جائز قرار دیا ہے(1) اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ سے ہی مروی ہے کہا یہودی ایک مرد اور عورت کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جن دونوں نے بدکاری کی تھی۔ آپ ﷺ نے یہودیوں سے پوچھا کیا وجہ ہے کہ تم ان دونوں پر حد کیوں قائم نہیں کرتے۔ انہوں نے جواب دیا ہم ایسا کرتے تھے جب ہمارا بادشاہ ہوتا، جب ہماری حکومت چلی گئی تو ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا اپنے میں سے دو عالم آدمی میرے پاس لے آؤ۔ یہودی صوریا کے دو بیٹے لے آئے۔ آپ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کیا تم ان لوگوں سے زیادہ عالم ہو جو نہیں آئے؟ انہوں نے کہا لوگ ہمارے بارے میں یہی کہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں اس اللہ کا واسطہ دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کو نازل کیا کہ تم دونوں تورات میں اس کی حد کو کیسے پاتے ہو۔ دونوں نے کہا جب چار آدمی یہ گواہی دے دیں کہ ہم نے انہیں یوں دیکھا جیسے سلائی سرمہ دانی میں ہوتی ہے تو اس پر رجم کر دیا جائے۔ اب آپ ﷺ نے فرمایا گواہ لے آؤ تو چار آدمیوں نے گواہی دی۔ نبی کریم ﷺ نے ان پر رجم کر دیا۔ اسے ابوداؤد، اسحاق بن راہویہ، ابویعلی موصلی، بزار اور دار قطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس لفظ کے ساتھ اسے روایت کیا "تَأْتُوْنِیْ بِأَرْبَعَةٍ مِّنْكُمْ يَشْهَدُوْنَ" یہ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دونوں حدیثیں ہیں اور دونوں ضعیف ہیں جن میں مجاہد بن سعید تنہا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ کوئی چیز نہیں۔ یحییٰ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب احکام الشہادۃ، صفحہ 173 (وزارت تعلیم)

نے کہا اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

(۶) دو مردوں کو گواہ بنانا میسر نہ ہو تو چاہئے کہ ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنایا جائے۔ دو آدمیوں کا شہادت کے لئے میسر نہ ہونے کی صورت میں دو عورتوں کی ایک مرد کے ساتھ گواہ بنانے کی شرط اس بات کا شعور دلاتی ہے کہ یہ دو عورتیں ایک مرد کا بدل ہیں اور اصل یہ ہے کہ عورتوں کو گواہ نہ بنایا جائے۔ اسی وجہ سے وہ احکام جو شبہ پیدا ہونے کی وجہ سے ساقط ہو جاتے ہیں جیسے حدود و قصاص ان میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں۔ اسی کی تائید کرتی ہے وہ روایت جو ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے ہمیں حفص نے بیان کیا وہ حجاج سے وہ زہری سے کہ یہی سنت جاریہ ہے حضور ﷺ سے اور آپ ﷺ کے بعد دونوں خلیفوں سے کہ حدود و قصاص میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں۔ یہ روایت مرسل ہے اور مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے۔ ان دونوں خلیفوں یعنی حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو خصوصاً اس لئے ذکر کیا کیونکہ شرع کی وضاحت و اثبات اور اجماع کے انعقاد میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے بعد میں ان ہی کی اتباع ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے بعد ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اقتداء کرنا۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حذیفہ سے نقل کیا ہے۔ شیخ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے عقیل سے انہوں نے زہری سے روایت کیا جس طرح ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ انہوں نے ان الفاظ کو زائد ذکر کیا نہ نکاح میں اور نہ طلاق میں۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے صحیح نہیں ہے۔ امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا عورتوں کی شہادت جائز نہیں مگر مالی معاملات میں خاص طور پر جائز ہے۔ اسی طرح ان چیزوں میں بھی جائز ہے جو اس کے تابع ہیں، جس طرح اذن، خیار شرط، شفعہ، اجارہ، قتل خطاء، اسی طرح ہر وہ زخم جس میں مال لازم آتا ہے۔ نکاح، طلاق، وکالت، وصیت، آزاد کرنا، رجوع کرنا، نسب اور اس جیسی چیزوں میں جائز نہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تمام حقوق میں عورتوں کی مدد کے ساتھ مل کر گواہی جائز ہے مگر حدود و قصاص میں جائز نہیں۔ ان کے قول کی دلیل یہ ہے کہ دو آدمیوں کی گواہی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی قبول کرنا امر تعبدی (۱) ہے اور خلاف قیاس ہے کیونکہ یہ اخبار آحاد سے ثابت ہے۔ یہ مدعی کی صداقت اور دوسرے فریق کے جھوٹا ہونے کے یقین کا فائدہ نہیں دیتا تو یہ مدعی کے دعویٰ کو مدعی علیہ پر لازم کرنے کو کیسے ثابت کرے گا؟ جبکہ گواہوں کے جھوٹا یا سچا ہونے کا احتمال موجود ہے۔ پس اسے وہاں تک محدود رکھا جائے گا جہاں اس بارے میں نص وارد ہوئی، وہ صرف مالی امور ہیں۔ تاہم یہ بات کیسے درست ہو سکتی ہے جب اللہ تعالیٰ نے رجوع کے بارے میں ارشاد فرمایا "اپنے میں سے دو گواہ بناؤ" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نکاح نہیں ہوتا مگر ولی اور دو عادل آدمیوں کی گواہی کے ساتھ۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، ابن مسعود، ابن عمر، ابن عباس رحمہم اللہ تعالیٰ سے اسی کی مثل نقل کیا ہے۔ روایت حدیث کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ وہاں کسی اور پر کوئی چیز لازم نہیں کی جاتی بلکہ مسلمان اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے احکام کو لازم کرتے ہیں اس حدیث کے ذریعے علم طلب کرتے ہیں اور اس کی سندوں کی تلاش کرتے ہیں۔ جب ان تک کوئی حکم قطعی طریقہ سے پہنچتا ہے اس پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اگر ظنی طریقہ سے کوئی چیز پہنچتا ہے اس طرح کہ یقینی علم اس سے ثابت نہ ہو تو ثواب کی نیت سے اس پر عمل کرتے ہیں یا عذاب کے خوف سے اس پر عمل کرتے ہیں جب تک اس کا معارضہ کسی دوسرے حکم کے ساتھ نہ ہو جو اس سے بھی قوی ہو۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس کا عقل بھی تقاضا کرتی ہے۔ نیز نصوص قطعیہ اور اجماع سے ثابت ہے کہ اخبار آحاد پر عمل کرنا واجب ہے۔ اسی وجہ سے روایت میں وہ شرائط نہیں لگائی جاتیں جو شہادت میں لگائی جاتی

(۱) ایسا حکم جس میں عقل کا کچھ عمل دخل نہ ہو بلکہ محض اللہ تعالیٰ کا حکم جانتے ہوئے اس پر عمل کرنا پڑے۔

ہیں کہ گواہ آزاد، مذکر اور دو ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ قبول شہادت اگرچہ امر تعبدی ہے اور خلاف قیاس ہے۔ تاہم بالاجماع تمام حقوق میں جاری ہے خواہ وہ مالی ہوں یا مالی نہ ہوں جب اس آیت نے مالی معاملات میں عورتوں کی شہادت کو قبول کرنے کو عبارۃ النص سے ثابت کیا ہے تو دوسرے حقوق میں دلالت النص سے بدرجہ اولیٰ یا بدرجہ مساوی ثابت کیا کیونکہ شہادت کو مطلقاً قبول کرنا لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے مشروع کیا گیا خواہ وہ حقوق مالی ہوں یا عزت سے تعلق رکھتے ہوں۔ بضعہ کی حفاظت اور عزت کی حفاظت اموال کی حفاظت سے اولیٰ ہے۔ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر یوم عرفہ کے خطبہ اور یوم النحر کے خطبہ میں ارشاد فرمایا بے شک تمہارے خون، تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں حرام ہیں(1) یہ حدیث صحیحین اور دوسری احادیث کی کتب میں ہے اور فرمایا تمہارے مال کی حرمت تمہارے خون کی حرمت جیسی ہے اور حضور ﷺ کا فرمان ہے جو اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہو جاتا ہے وہ شہید ہے جو اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جاتا ہے وہ شہید ہے، جو اپنے دین کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہوا وہ بھی شہید ہے اور جو اپنے گھر والوں کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہو گیا وہ بھی شہید ہے۔ اسے امام احمد، اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے سعید بن زید سے نقل کیا ہے۔ ہم نے عورتوں کی شہادت کو حدود اور ان جیسے دوسرے معاملات میں شہادت کے عدم جواز کا قول کیا ہے کیونکہ یہ شبہات کی وجہ سے ساقط ہو جاتے ہیں جبکہ نکاح اور دوسرے معاملات ایسے نہیں اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ یہ عورتوں کی شہادت کے جائز نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔ نص کے اوپر زیادتی دوسری آیت کی دلالت النص سے بالاجماع جائز ہے مگر یہ حدیث "نکاح نہیں ہوتا مگر ولی اور دو گواہوں کی موجودگی میں" یہ صحیح نہیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں محمد بن یزید بن سنان جو اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں۔ امام احمد اور علی رحمہما اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ راوی ضعیف ہے۔ یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ثقہ نہیں ہے۔ نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ متروک الحدیث ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔ دوسری سند میں نافع بن میسرا ابوخطیب مجہول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ایک راوی نہاش ہے۔ یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ ضعیف ہے۔ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ دوسروں سے ہیچ ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں بکر بن بکار ہے۔ یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ کچھ بھی نہیں۔ اسی سند میں عبد اللہ بن محرز بھی ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ متروک ہے۔ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ثابت بن زہیر ہے جو منکر الحدیث ہے۔ اس کی احادیث ثقہ لوگوں کی روایات سے مختلف ہیں۔ یہ ان راویوں سے خارج ہے جن کی روایات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ابو حاتم، ابن عدی اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا۔

مسئلہ:۔ اسی آیت سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ مالی معاملات میں مدعی کی قسم کیساتھ ایک گواہ کی گواہی سے فیصلہ کرنا جائز نہیں جس طرح دوسرے معاملات میں بالاتفاق جائز نہیں جبکہ جمہور علماء مالی معاملات میں جائز سمجھتے ہیں جبکہ دوسرے معاملات میں جائز نہیں سمجھتے جس طرح رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شاہد اور مدعی کی قسم کے ساتھ فیصلہ کیا(2) اسے ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے جابر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور کہا رسول اللہ ﷺ سے اس حدیث کو عمر بن خطاب، ابن عباس، ابو ہریرہ، ابن عمر، زید بن ثابت، ابو سعید خدری، سعد بن عبادہ، عامر بن ربیعہ، سہل بن سعد، عمارہ اور عمرو جو مخزوم کے بیٹے ہیں، مغیرہ بن شعبہ، بلال بن حارث، سلمہ بن قیس، انس بن مالک، تمیم داری، زینب بنت ثعلبہ اور سرق نے روایت کیا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 397 (قدیمی)
2۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 256 مکتبہ امدادیہ ملتان

ہے۔ میں کہتا ہوں جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کو احمد، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی، طحاوی رحمہم اللہ تعالیٰ نے عبدالوہاب بن عبدالمجید ثقفی کی حدیث جو انہوں نے جعفر بن محمد سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسے ثوری اور دوسرے محدثین نے بھی روایت کیا ہے، یعنی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جعفر سے انہوں نے اپنے باپ سے مرسل روایت کی ہے۔ یہ اصح ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک گواہ اور مدعی کی قسم کے ساتھ فیصلہ فرمایا یہ منقطع ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے علل میں کہا کہ جعفر کبھی اسے مرسل اور کبھی متصل ذکر کرتے۔ امام شافعی اور امام بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا عبدالوہاب نے اسے متصل ذکر کیا ہے جبکہ وہ ثقہ ہے۔ میں کہتا ہوں امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اس کی آخری عمر میں اختلاط ہو گیا تھا جہاں تک ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا تعلق ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ کیا(1) اسے ابوداؤد اور طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن قرار دیا۔ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث منکر ہے کیونکہ یہ قیس بن ساعد کی عمرو بن دینار سے روایت ہے اور ہم نہیں جانتے کہ وہ عمرو بن دینار سے کوئی حدیث روایت کرتے ہیں جہاں تک ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کا تعلق ہے کہ حضور ﷺ نے ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ کیا۔ اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، اصحاب سنن اور ابن حبان نے روایت کیا۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے یہ صحیح ہے۔ اس حدیث کو سہیل بن ابی صالح نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے۔ اس سے ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن نے سنا پھر بڑھاپے کی وجہ سے ان کے حافظے میں اختلاط واقع ہو گیا، وہ کہا کرتے تھے مجھے ربیعہ نے خبر دی کہ میں نے اسے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس قصہ کو امام شافعی اور طحاوی رحمہما اللہ تعالیٰ نے داوردی سے نقل کیا ہے۔ اس حدیث کو بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے مغیرہ بن عبدالرحمٰن ابن الزناد کی روایت جو وہ اعرج سے نقل کرتے ہیں جسے وہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اس باب میں اعرج کی حدیث سے بڑھ کر کوئی صحیح حدیث نہیں۔ طحاوی نے سہیل بن ابی صالح سے وہ اپنے باپ سے وہ زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی مثل روایت کرتے ہیں۔ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ روایت منکر ہے کیونکہ ابو صالح کی زید سے روایت معروف نہیں اس سند میں عثمان بن حکیم ہے جو عبداللہ بن وہب کے شیخ ہیں۔ یہ ان راویوں میں سے نہیں ہیں کہ اس کی روایت سے اس قسم کا حکم ثابت ہو۔ میں کہتا ہوں ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عثمان بن حکم جذامی جو ابن وہب کے شیخ ہیں۔ ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ثقہ نہیں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو بھی یہ اخبار آحاد میں سے ہے اس کے ساتھ کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں جبکہ یہ اپنے سے قوی تر روایت کے مقابل بھی ہے۔ شیخین نے اپنی اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اگر لوگوں کو محض ان کے دعویٰ کی وجہ سے ان کی مطلوبہ چیز دے دی جاتی تو لوگ ان کے خون اور مال کا دعویٰ کر دیں لیکن قسم مدعی علیہ پر ہے(2) بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو نقل کیا ہے لیکن گواہ مدعی پر ہیں اور قسم مدعی علیہ پر ہے(3) اسے دار قطنی اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اور وائل بن حجر کی روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے مدعی سے فرمایا تجھ پر گواہ لازم ہیں اس نے عرض کی میرے پاس گواہ نہیں آپ ﷺ نے فرمایا پھر اس کی قسم ہو گی اس نے عرض کی پھر تو وہ زمین لے جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس میں فیصلہ یہی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کئی سندوں سے نقل کیا ہے۔ دونوں حدیثوں میں تطبیق یوں ہو گی کہ نبی کریم ﷺ نے جنس یمین کو مدعی علیہ

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 256 مکتبہ امدادیہ ملتان 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 74 (قدیمی) 3۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 10 صفحہ 262 (الفکر)

کے لئے خاص کر دیا اور اس جنس کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں جو مدعی پر وارد ہو نیز مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان گواہوں اور قسم کے اعتبار سے تقسیم شرکت کے منافی ہے۔ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جو تم نے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ کیا ہے۔ یہ اس معنی کا احتمال بھی رکھتا ہے کہ اس کی مراد وہی ہو جو تم نے ذکر کیا کہ ایک گواہ کے ساتھ مدعی کی قسم ملی ہو تو فیصلہ ہو سکتا ہے تاہم یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مدعی علیہ کی قسم مراد لی جائے یعنی جب مدعی نے اپنے دعویٰ پر ایک گواہ پیش کیا تو اس کو آپ ﷺ نے کافی شمار نہ کیا تو آپ ﷺ نے مدعی علیہ سے قسم کا مطالبہ کیا تا کہ آپ ﷺ فیصلہ فرمادیں تو اسے روایت کیا گیا۔ یہ آپ ﷺ نے اس لئے کہا تا کہ لوگوں پر یہ چیز واضح کر دی جائے کہ مدعی کے دعویٰ کرنے کے ساتھ ہی اس کے لئے گواہی ثابت ہو جاتی ہے نہ کہ یہ معاملہ اس طرح ہے کہ اس کے لئے مدعی علیہ پر اس وقت تک قسم واجب نہیں ہوتی جب تک گواہیاں قائم نہ ہو جائیں اگر مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان کسی قسم کا التباس ہو۔ یہ بھی احتمال موجود ہے کہ اکیلا گواہی دینے والا خزیمہ ہو جیسے نبی کریم ﷺ نے دو گواہیوں کا حامل قرار دیا۔ میں کہتا ہوں یہ دوسری تاویل بعید از قیاس ہے۔ میں کہتا ہوں ان کی ایک اور تاویل کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ لفظ شاہد اور یمین میں الف لام عہدی (1) ہے یعنی شاہد سے مراد وہ شاہد ہے جو شرع میں معروف ہے وہ دو آدمیوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت ہے جو مدعی کی طرف سے پیش ہوں اور یمین معہود سے مراد وہ قسم ہے جو منکر پر لازم ہوتی ہے یا یہ الف لام جنسی ہے جس طرح حدیث طیبہ میں ہے اَلْبَيِّنَةُ لِلْمُدَّعِي وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ (1) اس صورت میں اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے شاہد اور یمین کے ساتھ فیصلہ فرمایا وحی یا کسی اور چیز کو بنیاد بنا کر فیصلہ نہیں فرمایا۔ ایک اور تاویل اس کی یہ کی جاسکتی ہے کہ حدیث میں الف لام جنسی ہے یمین سے مراد گواہ کی قسم ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے گواہ کی گواہی اور اس کی قسم کے ساتھ فیصلہ فرمایا۔ یہاں پھر یمین سے مراد گواہ کا لفظ اشہد ہوگا کیونکہ یہ صیغہ بھی قسم کے الفاظ میں سے ہے کیونکہ گواہی کی قبولیت کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ شہادت دیتے وقت اشہد کا لفظ استعمال کرے۔ یہ معانی اگرچہ بعید ہیں لیکن نصوص میں تعارض کو ختم کرنے کے لئے ان کو اپنایا جا سکتا ہے واللہ اعلم۔ حق بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ ایک اصولی اختلاف پر مبنی ہے، وہ قاعدہ یہ ہے کہ دوسرے علماء کے نزدیک خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہوتی ہے جبکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز نہیں واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ امور جن تک مردوں کی رسائی نہیں ہوتی ان میں صرف عورتوں کی گواہی جائز ہوتی ہے جس طرح پیدائش، باکرہ ہونا اور عورتوں کے عیوب۔ پھر علماء میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہاں ایک عورت جو آزاد ہو مسلمان ہو اور عادل ہو اس کی شہادت کافی ہے اور دو عورتوں میں احتیاط ہے۔ امام مالک نے کہا دو عورتوں کی گواہی ضروری ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا چار عورتوں کی گواہی ضروری ہے کیونکہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے قائم مقام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے "کیا عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف نہیں" (2) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ شہادت میں معتبر تعداد اور مذکر ہونا ہے لیکن یہاں ضرورت کی بناء پر مذکر ہونا تو ساقط ہو گیا، پس عدد باقی رہ گیا۔ ہماری دلیل وہ روایت ہے جو محمد بن حسن نے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں غالب بن عبد اللہ سے انہوں نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے سعید بن مسیب، عطاء بن رباح اور طاؤس رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایت کی ہے۔ سب نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں کی گواہی ان امور میں جائز ہے

---

(1) الف لام عہدی جب کسی اسم پر داخل ہو تو اس کی مراد متکلم اور سامع دونوں کے ذہنوں میں متعین ہوتی ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 160 (وزارت تعلیم)　　2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 363

جن کو مرد نہیں دیکھ سکتے یہ روایت مرسل ہے۔ جس پر عمل کرنا واجب ہے۔ اس استدلال کی دلیل یہ ہے کہ الف لام عہدی نہ ہونے کی وجہ سے جنسی ہے۔ پس شہادت ایک کے ساتھ صحیح ہے اور زیادہ کے ساتھ احسن ہوگی۔ عبدالرزاق نے ابن جریج سے انہوں نے زہری رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا یہی طریقہ چلتا رہا ہے کہ عورتوں کی ان امور میں شہادت جائز ہوتی ہے جن سے مرد مطلع نہیں ہوتے جیسے پیدائش اور عورتوں کے عیوب۔ اسے ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ عبدالرزاق نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا عورتوں کی تنہا شہادت جائز نہیں ہوتی مگر ان معاملات میں جن سے عورتیں ہی آگاہ ہوتی ہیں جس طرح عورتوں کے ستر۔ اس کی کئی اور سندیں بھی ہیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دائی کی شہادت کو جائز قرار دیا۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن عبدالملک کی حدیث سے انہوں نے اعمش سے نقل کیا۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان دونوں کے درمیان ایک مجہول راوی ہے محمد نے اعمش سے براہ راست نہیں سنا۔ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ یعنی وہ لوگ جو شہادت میں متہم نہ ہوں ان کے اوپر تہمت فسق، مروت کی کمی، مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان دنیاوی عداوت یا شاہد اور مشہود علیہ کے درمیان رشتہ داری موجود نہ ہو فاسق کی شہادت بالاتفاق مقبول نہیں کیونکہ روایت میں عدالت شرط ہے رب العالمین کا ارشاد ہے "اگر فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب چھان بین کر لیا کرو" تو شہادت میں تو بطریق اولیٰ یہ شرط ہوگی۔ عدالت کا معنی واجبات کو بجالانا، کبائر سے اجتناب کرنا اور صغائر پر اصرار نہ کرنا ہے۔ کبائر کی وضاحت میں بحث ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے کبائر کے بارے میں مروی ہے کہ وہ یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، جادو، انسان کو قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، میدان جنگ سے بھاگنا، مومن پاکیزہ عورتوں پر تہمت لگانا(1) متفق علیہ۔ یہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں والدین کی نافرمانی کرنا، جھوٹی قسم اٹھانا۔ یہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جھوٹی گواہی دینا،(2) متفق علیہ۔ یہ حضرت انس اور حضرت ابی بکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے دونوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تم کو کبیرہ گناہوں میں سے بڑے گناہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ کہا شرک، والدین کی نافرمانی آپ ﷺ ٹیک لگائے ہوئے تھے اور بیٹھ گئے، فرمایا خبردار جھوٹی بات اور جھوٹی شہادت، آپ ﷺ لگاتار اس کلمہ کو دہراتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے کہا کاش آپ ﷺ خاموش ہو جاتے(3) اور رسول ﷺ نے فرمایا بدکار بدکاری نہیں کرتا جب وہ بدکاری کرتا ہے اس حال میں کہ وہ مومن ہو، پھر اس کی مثل ذکر فرمایا چوری، شراب خوری، ڈاکہ زنی، مال غنیمت سے چوری۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس میں یہ چار چیزیں ہوں وہ خالص منافق ہے، جس میں کوئی ایک خصلت ہو اس میں نفاق کی خصلتوں میں سے ایک خصلت پائی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کو چھوڑ دے، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرتا ہے، جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو دھوکہ دے، جب جھگڑے تو گالی نکالے(4) متفق علیہ۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی متفق علیہ تین ہیں، آخری دو کی جگہ یہ ہے جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے گناہ کبیرہ وہ ہے جس میں حد جاری ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے گناہ کبیرہ وہ ہے جس کی حرمت نص قرآن سے ثابت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے جو بالذات حرام ہو جس طرح لواطت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے، وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی خائن اور خائنہ کی شہادت قبول نہیں اور جو اپنے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 64 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 987 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 64 (قدیمی) 4۔ ایضاً، صفحہ 56

بھائی سے دشمنی رکھتا ہو جس کے گھر والے خرچ کریں ان کی شہادت غیر کے حق میں قبول ہے۔ قانع ایسے کہتے ہیں جس پر گھر والے خرچ کریں، وہ خود محنت و مزدوری نہ کرے(1) اسے امام احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن دقیق العید، بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے لا خائنة کے بعد لازان و لازانیة کے الفاظ زائد ذکر کیے ہیں یعنی بدکار اور بدکارہ کی شہادت بھی مقبول تھی۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سند میں محمد بن راشد ہیں جو ضعیف ہیں۔ تنقیح میں ہے احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی توثیق کی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خائن اور خائنہ کی شہادت مقبول نہیں۔ اسی طرح جس پر حد قذف جاری ہو چکی ہو اس کی گواہی مقبول نہیں اسی طرح جو اپنے بھائی سے عداوت رکھتا ہو اور جس پر اس کے گھر والے خرچ کرتے ہوں جو ولادت اور قرابت میں متہم ہو اس کی شہادت بھی مقبول نہیں۔ اسے امام ترمذی، دارقطنی، بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے یزید بن زیاد دمشقی سے روایت کیا ہے۔ یہ ضعیف ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ والد کی اور والدہ کی گواہی بچے کے حق میں، عورت کی خاوند کے حق میں اور خاوند کی عورت کے حق میں، غلام کی سردار کے حق میں، آقا کی غلام کے حق میں، شریک کی شریک کے حق میں اس چیز کے اندر جس میں شراکت موجود ہو گواہی قبول نہیں لیکن دوسرے معاملات میں گواہی مقبول ہے۔ نیز مزدور کی مستاجر کے حق میں گواہی قبول نہیں اسے خصاف نے اپنی سند سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حاکم عدالت میں گواہ کی ظاہری صالحیت پر اکتفا کرے گا، اس کے حال کے بارے نہیں پوچھے گا مگر جب مد مقابل اس پر طعن کرے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے فرمایا حاکم پر اس کے بارے خفیہ طریقے سے اور اعلانیہ طریقے سے پوچھنا ضروری ہے خواہ مد مقابل طعن کرے یا نہ کرے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی یہی کہا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جو عدالت میں مشہور ہو اس کے بارے نہیں پوچھا جائے گا اور جس کی جرح معروف ہو اس کی شہادت مردود ہو گی جب شک ہو تو سوال کرے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضور ﷺ کے اس قول سے استدلال کیا ہے مسلمان سب کے سب عادل ہیں، بعض بعض کے خلاف گواہ ہیں، مگر محدود فی القذف گواہ نہیں بن سکتا۔ اسے ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ابو موسیٰ اشعری کی طرف خط لکھا، اس میں تحریر کیا تمام مسلمان عادل ہیں، بعض بعض کے خلاف گواہی دے سکتے ہیں، مگر جو محدود فی القذف ہو یا جس کی جھوٹی شہادت کا تجربہ ہو چکا ہو یا ولاء اور قرابت کی وجہ سے متہم ہو (اس کی گواہی قبول نہیں) اسے دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے جس کی سند میں عبداللہ ابوحمید ہے جو ضعیف ہے۔ دوسری سند سے اسے حسن کہا گیا۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں سندوں کے علاوہ ایک اور سند سے روایت کیا ہے۔ علماء حنفیہ نے کہا فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔ علماء نے کہا یہ اختلاف زمانہ کے اختلاف کی وجہ سے ہے، حجت اور برہان کا اختلاف نہیں، کیونکہ امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں غالب صالحیت تھی مگر صاحبین کے دور میں فساد ہو گیا۔ حق اسی طرح ہے۔ میں کہتا ہوں ہمارے زمانے میں فتویٰ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد پر ہے کیونکہ ہمارے دور میں کتابوں میں موجود شرائط کی بناء پر عادل نہیں ملتا، اگر ہم معاملہ میں سختی کریں گے تو لوگوں کے حقوق تلف ہو جائیں گے اور قضا کا دروازہ بھی بالکل بند ہو جائے گا۔ یہ فاسق ایسا ہو جو عزت دار، ہو مروت والا ہو اس کے بارے میں غالب ظن یہ ہو کہ وہ گواہی میں جھوٹ نہیں بولے گا یا قرائن اس کی صداقت پر دلالت کریں تو اس کی شہادت قبول ہو گی۔ متاخرین نے تزکیہ شہود کی جگہ قسم لینا پسند کیا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ تو نص کے

1۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 172 (وزارت تعلیم)

مقابل قیاس ہے اس لئے اسے قبول نہ کیا جائے گا۔ ہم جواب دیں گے یہ نص کے مقابل قیاس نہیں ہے بلکہ یہ نص کا مقتضی ہے کیونکہ رب العالمین کا یہ ارشاد" اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بناؤ جن سے تم راضی ہو" اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ گواہ ایسے ہونے چاہئیں، یہ قرن (زمانہ) کے پسندیدہ لوگ ہوں، ہمارے زمانے میں ایسا کس طرح ممکن ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے گواہ بنائے جائیں کیونکہ اس دور میں تو ایسا عادل ملتا ہی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا بے شک تم ایسے زمانہ میں ہو جس نے تم میں سے دسواں حصہ چھوڑ دیا جس کا انہیں حکم دیا گیا ہے وہ ہلاک ہو جائے گا۔ پھر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس نے اس میں سے دسواں حصہ کیا وہ نجات پا جائے گا۔(1) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اس حدیث کی تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے زیادہ گناہ بخش دیتا ہے جو فاسد زمانہ میں اللہ اور دار آخرت کا ارادہ کرتے ہیں بنسبت ان نیک لوگوں کے گناہ کے جو صالح زمانہ میں ہوں، اگرچہ ان کے گناہ ان کے گناہ سے زیادہ ہوں کیونکہ معاصی فاسد زمانوں میں مباح سمجھ لئے جاتے ہیں۔ ان دونوں جماعتوں کی مثال ایسے ہی ہے جس طرح دو لشکر ہوں ایک لشکر کے تمام سپاہی مکمل جہاد کرتے ہیں، ایک لشکر کے اکثر لوگ بھاگ گئے اور بعض نے کچھ صبر کیا اور نہ بھاگے تو بادشاہ ان صابرین کو زیادہ اجر عطا فرمائے گا بنسبت ان مجاہدین کے جو سب جہاد کر رہے تھے۔ فضل تو سب کا سب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے کبیرہ گناہ بھی بخش دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے صغیرہ گناہ پر بھی عذاب دیتا ہے۔

۱۷ یہاں من تبعیضیہ ہے۔ یہ لفظ اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ فاسق بھی شاہد بننے کا اہل ہے۔ اگر قاضی اس کی شہادت قبول کرے تو یہ جائز ہوگا لیکن وہ گنہگار بھی ہوگا جب اس نے حق کی طلب میں وہ کوشش نہ کی جتنی کوشش کرنی چاہئے تھی۔

۱۸ حمزہ نے ہمزہ مکسور پڑھا ہے۔ اس صورت میں تضل مجزوم ہوگا کیونکہ ان شرطیہ ہے لیکن جزم ظاہر اس لئے نہیں ہو سکتی کیونکہ آخری حرف مشدد ہے اور اس کا معنی بھول جانا ہے فتذکر اسے مرفوع پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ مبتداء کی خبر ہے اور جملہ اسمیہ جزاء بن رہا ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی فَهِيَ تُذَكِّرُهَا۔

۱۹ عام قراء نے انْ کے ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے تضل کو ان ناصبہ کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے۔ فتذکر کو معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمر رحمہما اللہ تعالیٰ نے فتذکر باب افعال سے اسے مخفف پڑھا ہے۔ باقی قراء نے باب تفعیل سے اسے مشدد پڑھا ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہے یعنی یاد کرنا جو بھول جانے کی ضد ہے۔ اس میں اس بات کا شعور دلایا گیا کہ ان کی عقل ناقص اور حافظہ کم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے تم سے بڑھ کر کسی ناقصات عقل و دین کو ایک محتاط آدمی کی دانش کو سلب کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ عورتوں نے عرض کی ہمارے عقل کا نقصان کیسے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیا عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف نہیں؟ عورتوں نے عرض کی جی ہاں فرمایا یہی عقل کی کمی ہے۔ انہوں نے پوچھا ہمارے دین میں کمی کس طرح ہے فرمایا جب ایک عورت حائضہ ہو تو وہ نماز نہیں پڑھتی اور نہ روزہ رکھتی ہے۔ فرمایا یہی دین کی کمی ہے(2) وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے جب انہیں گواہ بننے کے لئے کہا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ اس صورت میں انہیں شہداء کہنا مجاز ہوگا جو بعد میں شاہد بنیں گے۔ بعض کے نزدیک یہ امر وجوب کے لئے ہے۔ ایک قوم کا یہ نقطہ نظر ہے جب کوئی اور نہ ہو تو پھر اس کو قبول کرنا واجب ہے۔ اگر کوئی اور ہو تو پھر اختیار ہوگا۔ یہی حسن کا قول ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے یہ امر استحباب کے لئے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے جب وہ پہلے گواہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 51 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 88 (وزارت تعلیم)

بن چکے ہوں پھر انہیں گواہی دینے کے لئے دعوت دی جائے۔ یہ مجاہد، عکرمہ اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ یہ قطعی طور پر واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "تم شہادت کو نہ چھپاؤ" حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب کسی کو گواہی دینے کے لئے بلایا جائے، وہ گواہی کو چھپائے تو وہ اس آدمی کی طرح ہے جو جھوٹی گواہی دے۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے کبیر اور اوسط میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں عبداللہ بن صالح ہیں جو لیث کے کاتب ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے استدلال کیا ہے۔

مسئلہ:۔ جب گواہ کو حاکم کی مجلس میں بلایا جائے تاکہ شہادت دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اگر قاضی کی مجلس قریب ہو تو اس پر لازم ہو گا اگر دور ہو تو لازم نہیں ہوگا کیونکہ رب العالمین کا ارشاد ہے" کاتب اور گواہ کو تنگ نہ کیا جائے گا" نصر سے یہ مروی ہے اگر اتنا دور ہو کہ اسی دن گھر واپس آنا ممکن ہو تو پھر جانا واجب ہوگا کیونکہ اس صورت میں کوئی تکلیف نہیں۔

مسئلہ:۔ اگر گواہ بوڑھا ہو اور مدعی نے اسے اپنی سواری پر سوار کیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ سلیمان سے مروی ہے ایسے آدمی کے بارے میں جو گواہوں کو اپنی جاگیر پر لایا ان کے لئے سواریاں اجرت پر لیں۔ وہ اس پر سوار ہوئے تو ان کی شہادت مقبول نہیں۔ نوازل میں اس کی وضاحت ہے کہ گواہ بوڑھا ہو وہ چلنے پر قادر نہیں نہ ہی کوئی ایسا آدمی پاتا ہے جو اس کے لئے سواری اجرت پر لے تو وہ مدعی کی سواری پر سوار ہو کر آتا ہے تو اس کی شہادت مقبول ہوتی ہے مگر جو ایسا نہ ہو اس کی شہادت مقبول نہیں ہوتی۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس میں اعتراض کی گنجائش ہے کیونکہ گواہوں کی تکریم کرنا واجب ہے۔

مسئلہ:۔ اگر گواہوں کو کھانا پیش کیا گیا اگر کھانا اس سے قبل تیار کیا گیا تھا انہوں نے اسے کھایا تو ان کی شہادت قبول کی جائے گی اگر مدعی نے کھانا ان کے لئے ہی تیار کیا تھا تو ان کی گواہی قبول نہ کی جائے گی۔ یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے دونوں صورتوں میں ان کا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے دونوں صورتوں میں قول قبول کیا جائے گا۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام ابو یوسف کا قول ہی زیادہ بہتر ہے کیونکہ کھانے کے بارے میں یہی عادت ہے کہ جو آدمی بھی اس کے پاس ایسا آتا ہے جو ذی شان ہو خواہ وہ گواہ ہو یا نہ ہو یہ اس صورت میں ہوگا جب اس کی شرط ذکر نہ کی جائے مگر جب اس کی شرط لگائی جائے تو وہ اجرت و رشوت ہوگی جس کا لینا گواہ پر حرام ہے۔ اسی طرح مدعی کے لئے دینا حرام ہے۔ اگر گواہ نے یہ چیز لے لی تو اس کی شہادت قبول نہیں خواہ یہ متعین ہو جائے کہ یہی شاہد ہے یا متعین نہ ہو کیونکہ جب اس نے شرط لگا دی تو وہ مزدور بن گیا جو اجرت کے لئے اپنی ذات کے لئے عمل کرنے والا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر وہ شاہد متعین ہو چکا ہے تو اس کے لئے اجرت لینا جائز نہیں اگر متعین نہ ہو تو اجرت لینا جائز ہے کیونکہ یہ اس پر فرض نہیں۔ ہم نے کہا اگر وہ متعین ہو گیا تو اس پر فرض عین ہو چکا، ورنہ اس پر فرض کفایہ ہوگا۔ اگر اسے ہم تسلیم کر بھی لیں تو یہ مستحب ہے۔ ہمارے نزدیک عبادت پر اجرت لینا جائز نہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے صغیر میں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے۔

• ۱؎ زیادہ مقدار اینہ کی وجہ سے اکتا نہ جاؤ۔

۱؎ ضمیر سے مراد دین، حق یا کتاب ہے۔

۲۲؎ یعنی حق تھوڑا ہو یا بڑا ہو۔

۲۳؎ جو وقت آنے کی طرف منسوب ہو۔

۲۴؎ اس میں ان تکتبوہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۵؎ زیادہ عدل کا باعث ہے۔

۶؎ یعنی شہادت کی ادائیگی کے لئے زیادہ محفوظ ہے۔

۷؎ یہ اس کے زیادہ قریب ہے کہ تم شہادت دیتے وقت دین کی جنس، اس کی قدر، اس کی مدت اور اس جیسی دوسری چیزوں میں شک نہ کرو۔ یہ دونوں (قوم، ادنیٰ) اقسط کا بیان ہیں یا اس کا معنی یہ ہوگا کتابت اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ عدل کا باعث ہے اس کے بارے میں بھی جس کا حق ہو اور اس کے بارے میں بھی جس پر حق ہو، اس لئے حقدار اور مقروض دونوں نہیں بھولیں گے۔ پس مدعی زیادہ کا دعویٰ نہیں کرے گا اور مدعی علیہ بھی اس کے قریب ہوگا اور شہادت کے لئے شاہد کے حق میں زیادہ درست ہوگا۔ پس وہ شہادت دیتے وقت شہادت میں کمی بیشی نہیں کرے گا اور یہ اس کے زیادہ قریب ہے کہ اے جھگڑنے والو اور گواہو تم شک نہ کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ شاہد میں کتابت کا فائدہ صرف یہ ہے کہ وہ واقعہ کو یاد رکھے جس کی اس نے شہادت دینی ہے۔ شاہد کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ خط دیکھ کر شہادت دے مگر اس صورت میں کہ اسے گواہی بھی یاد ہو۔ قدوری اور دوسری کتابوں میں یہی کہا گیا ہے۔ صاحب ہدایہ نے کہا یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے جبکہ صاحبین کے نزدیک جب اس نے اپنا خط دیکھ لیا تو اس کے لئے شہادت دینا جائز ہے، اگرچہ اسے یاد نہ آئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ شہادت کا جائز نہ ہونا بالاتفاق ہے۔ اختلاف اس میں ہے جب قاضی کسی شاہد کی شہادت کو اپنے دیوان میں پائے جبکہ وہ سربمہر ہے، اسے کمی و زیادتی سے امن بھی ہے، کیا قاضی کے لئے اس پر عمل کرنا جائز ہے؟ وہ شہادت جو رجسٹری میں ہو جو مدعی کے قبضہ میں ہے اس کی وہ حیثیت نہیں کیونکہ اس میں تبدیلی سے امن نہیں خط تو خط جیسا ہو سکتا ہے۔ یہ کلام اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اگر مکتوب شاہد کے پاس ہو اس حیثیت میں کہ اس میں تبدیلی کا احتمال نہ ہو تو شاہد کے لئے جائز ہے کہ وہ اس پر گواہی دے، اگرچہ اسے یاد نہ بھی ہو صاحبین کا نقطہ نظر ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ جائز نہیں۔ صاحبین کے قول کی دلیل یہ ہے مکتوب جب تبدیلی سے محفوظ ہو وہ یاد رہنے والی شہادت کی طرح ہے، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ صحابہ اور تابعین نبی کریم ﷺ اور خلفاء راشدین کے مکتوبات پر اسی طرح عمل کرتے تھے جس طرح وہ آپ کے خطابات پر عمل کرتے تھے۔ عبداللہ بن جحش کا قصہ اور اس کا اس تفسیر میں مکتوب پہلے گزر چکا ہے "وہ شہر حرام میں جنگ کے بارے پوچھتے ہیں۔" امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ شہادت مشاہدہ پر مبنی ہے۔ اسی وجہ سے گواہی دیتے وقت لفظ شہادت استعمال کرنا شرط ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان بھی ہے جب تو اس معاملہ کو سورج کی طرح دیکھے تو گواہی دے۔

۸؎ عاصم رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں کو کان کی خبر ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے، جبکہ کان کا اسم مضمر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی الا ان تکون التجارۃ تجارۃ حاضرۃ۔ دوسرے قراء نے ان دونوں کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ اسم ہے۔

۹؎ جس میں مدت متعین نہ ہو یہ جملہ عاصم رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت کے مطابق تجارۃ کی صفت ہے۔ اسی طرح جمہور قراء کی قرأت کے مطابق بھی صفت یہی ہوگا اگر ہم کان تامہ بنائیں۔ ورنہ یہ جملہ خبر ہوگا۔ یہ استثناء کتابت کے امر کی طرف پھیری جائے گی نہ تجارۃ

حاضرہ یہ اس باہمی بیع وشراء کو بھی عام ہے جو نقدی کے بدلے میں کی جائے یا عینی چیز کے بدلے میں کی جائے۔

• ۳ یہاں ھا ضمیر سے مراد تجارت ہے۔

اے ۳ ضحاک اور داؤد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ امر وجوب کے لئے ہے گواہ بنانا واجب ہے خواہ بیع نقد ہو یا ادھار ہو۔ ابو سعید خدری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ واجب تھا پھر اسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے اسے منسوخ کر دیا گیا۔ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضاً جمہور علماء کے نزدیک امر استحباب کے لئے ہے کیونکہ بے شمار ایسے واقعات ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے باہم بیع کرتے وقت گواہ نہیں بنائے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے عمارہ بن خزیمہ کی روایت ذکر کی ہے جو انہوں نے اپنے چچا سے نقل کی جو صحابہ کرام میں سے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے بدو سے ایک گھوڑا خریدا۔ نبی کریم ﷺ جلدی چلے تاکہ اس کے گھوڑے کی قیمت ادا کریں۔ بدو تھوڑا پیچھے رہ گیا۔ لوگ بدو سے ملنے لگے اور گھوڑے کی قیمت لگانے لگے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے یہ گھوڑا خرید لیا ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے پہلی قیمت سے زیادہ قیمت لگائی تو بدو نے نبی کریم ﷺ کو آواز دی اگر تم اس گھوڑے کو خریدنا چاہتے ہو تو خرید و، ورنہ میں اسے بیچ دوں گا۔ جب نبی کریم ﷺ نے بدو کی آواز سنی تو آپ ﷺ رک گئے، فرمایا بلکہ میں تو اسے خرید چکا ہوں۔ بدو کہنے لگا گواہ لاؤ جو یہ گواہی دے کہ میں نے آپ ﷺ کو یہ گھوڑا بیچ دیا تھا۔ لوگ بدو کو کہنے لگے تو ہلاک ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی یہ شان نہیں کہ وہ ناحق بات کہیں، یہاں تک کہ خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ گئے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ اور بدو کی گفتگو سنی۔ بدو کہنے لگا کوئی گواہ لاؤ جو یہ گواہی دے کہ میں نے گھوڑا آپ ﷺ کو بیچ دیا تھا۔ حضرت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ تو نے گھوڑا حضور ﷺ کو بیچ دیا تھا۔ نبی کریم ﷺ خزیمہ کی طرف متوجہ ہوئے پوچھا تم کس وجہ سے گواہی دیتے ہو؟ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ کی تصدیق کرتے ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کو دو آدمیوں کی شہادت کے قائم مقام کر دیا۔ میں کہتا ہوں میرے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ فیصلہ اس لئے کیا کیونکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ اس نے بیع کی ہے۔ اب اعرابی انکار میں جھوٹ بول رہا ہے۔ آپ ﷺ نے صرف خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کی وجہ سے فیصلہ نہیں فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کو دو آدمیوں کی گواہی کے برابر اس لئے کہا کیونکہ آپ ﷺ نے اس کی قوت ایمان، کمال عقل اور کمال درایت کو دیکھا۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ جب قاضی حق کو جانتا ہو تو اس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے علم کے مطابق فیصلہ کر دے کیونکہ اس کا شاہدوں کی شہادت سے جو اسے علم ظنی حاصل ہوتا ہے اس سے قوی ہے۔ جس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خلاف فیصلہ دیا تھا کہ انہیں حضور ﷺ کی کوئی وراثت نہیں ملے گی کیونکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد جانتے تھے "ہم انبیاء کی جماعت (کسی کو اپنے مال کا) وارث نہیں چھوڑتے" نیز یہ بھی استدلال کیا جا سکتا ہے کہ بادشاہ، قاضی یا ان جیسے مناصب پر فائز آدمی جب کسی اور سے کوئی چیز خریدیں یا ان کا کسی پر حق ہو اور وہ یقینی طور پر جانتا ہو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ دوسرے سے جبراً اپنا حق لے۔ اگرچہ دوسرا اس کے حق کا انکار کرتا ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں حق لینے والے پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا لیکن اگر یہ معاملہ ایک اور قاضی کے سامنے لے جایا جائے تو دوسرے قاضی کے لئے سلطان اور قاضی جو مدعی ہیں محض ان کے علم کی بناء پر فیصلہ کرنا جائز نہیں ہوگا جب تک ان پر گواہیاں قائم نہ ہوں۔ واللہ اعلم۔

۲؎ یہ بھی احتمال ہے کہ لا یضار فعل معروف کا صیغہ ہو۔ معنی یہ ہوگا کاتب اور شہید متعاقدین میں سے کسی کو بھی تکلیف نہ پہنچائیں جب وہ شہادت اور لکھنے کے لئے متعین ہوں تو اس وقت گواہی دینے سے انکار کر کے یا کتابت اور شہادت میں تحریف اور تبدیلی کر کے نقصان نہ پہنچائیں۔ یہ طاؤس، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مجہول کا صیغہ ہو یعنی دونوں متعاقدین کاتب کو تکلیف نہ دیں کہ اسے اس کی مزدوری نہ دیں اور نہ یہ شاہد کو تکلیف دیں کہ اسے اس وقت شہادت دینے کے لئے بلائیں جبکہ وہ مصروف ہو، مریض ہو یا کمزور ہو اور وہ شہادت کے لئے متعین نہ ہو بلکہ اس واقعہ پر اس کے علاوہ گواہ ہوں۔

۳؎ جو تمہیں تکلیف پہنچانے سے منع کیا ہے۔

۴؎ یہ اللہ تعالیٰ کی طاعت سے نکلنا ہے اور اس کی معصیت ہے جس کا وبال تمہیں پہنچے گا۔

۵؎ اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت سے بچو۔

۶؎ تمہیں تمہارے دین اور دنیا کے مصالح سے آگاہ کرتا ہے۔

۷؎ تینوں جملوں میں لفظ اللہ کو مکرر ذکر کیا ہے کیونکہ تینوں جملے مستقل ہیں کیونکہ پہلا تقویٰ پر ابھارتا ہے۔ دوسرے میں انعام کا وعدہ ہے تیسرا اس کی شان کی عظمت بیان کرتا ہے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ ۖ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ ۗ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٢٨٣﴾

"اور اگر تم سفر میں ہو ۱؎ اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو ۲؎ اور اس کا قبضہ دے دیا کرو ۳؎ پھر اگر اعتبار کرے کوئی تم میں سے دوسرے پر ۴؎ پس چاہئے کہ ادا کر دے وہ جس پر اعتبار کیا گیا اپنی امانت کو ۵؎ اور ضروری ہے کہ ڈرتا رہے اللہ سے جو اس کا رب ہے ۶؎ اور مت چھپاؤ گواہی کو ۷؎ اور جو شخص چھپاتا ہے اسے تو یقیناً گناہگار ہے اس کا ضمیر ۸؎ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب جاننے والا ہے ۹؎"

۱؎ یعنی اگر تم مسافر ہو۔

۲؎ ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے فرھن کو راء اور ھاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے راء کو مکسور اور اس کے بعد الف پڑھا ہے۔ رِھٰن یہ رَھْن کی جمع ہے، جس طرح بَغْل کی جمع بغال آتی ہے۔ رُھُنٌ یہ رِھان کی جمع الجمع ہے۔ فراء اور کسائی نے اسی طرح کہا۔ ابو عبید اور دوسرے قراء نے رُھُنٌ پڑھا ہے جو رَھْن اور رَھْن کی جمع ہے، جس طرح سقف کی جمع سُقُف ہوتی ہے۔ رھن لغت میں کسی چیز کو روک لینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ شرع میں ایسی چیز کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے جسے کسی حق کے مقابلہ میں روکا گیا ہو جس کے ساتھ حق کو پورا کرنا ممکن ہو۔ جب روکنا اس کا لغوی معنی ہے اور معنی لغوی شرعی معنی میں بھی معتبر ہوتا ہے، پس یہ ایسا عقد لازم ہوگا جب تک مرتھن کا ایک درہم بھی راھن پر موجود ہو وہ مرھونہ چیز کو واپس نہیں لے سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فرھنٌ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ فعل مجہول کا نائب فاعل ہوگا۔ تقدیر کلام یوں

ہوگی فَالَّذِی یَسْتَوْثِقُ بِهٖ رَهْنٌ یَاْخُذُہٗ رَهْنٌ یَاْخُذُکُمْ رِهَانٌ۔ یہاں یہ امر کا صیغہ بالاتفاق ایجاب کے لئے نہیں بلکہ ارشاد کے لئے ہے یہاں یہ شرط عادت کے طور پر ہے کیونکہ یہ عمومی اور غالب طریقہ ہے۔ اس کا ظاہر مفہوم اس کے قائلین کے نزدیک بھی یہ مخصوص بالسفر نہیں کیونکہ حالت قیام میں بھی رہن رکھنا جائز ہے اور کاتب کی موجودگی میں بھی جائز ہے۔ مجاہد اور داؤد نے کہا یہ رہن رکھنا سفر میں ہی جائز ہوتا ہے جب کاتب موجود نہ ہو۔ ہمارے پیش نظر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی حدیث ہے جسے ائمہ ستہ نے روایت کیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ میں اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس بیس صاع جو کے عوض رکھی تھی جو آپ ﷺ نے اپنے گھر والوں کیلئے لئے تھے جب آپ ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ کی زرہ اسی یہودی کے پاس رہن کے طور پر رکھی ہوئی تھی۔

یہ اس قید کی وجہ سے قبض کی ہوئی تھی۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا رہن جائز نہیں یعنی قبضہ کے بغیر یہ لازم نہیں ہوتا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نفس عقد کے ساتھ یہ لازم نہیں ہوتا اور راھن کو رھن حوالے کرنے پر مجبور کیا جائے گا ہماری دلیل یہ ہے کہ اس کی مشروعیت اور لزوم نص قرآن سے ثابت ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ تبرع ہوتا اور لازم نہ ہوتا کیونکہ راھن اس کے مقابل مرتھن سے کسی بھی چیز کے وجوب کا مطالبہ نہیں کرتا۔ اس لئے وہاں تک محدود رکھا جائے گا جہاں نص وارد ہوئی۔ رھن میں قبضہ کی شرط کی بناء پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ مشترک چیز کو رہن کے طور پر رکھنا صحیح نہیں، خواہ وہ چیز قابل تقسیم ہو یا نہ ہو کیونکہ مشترک چیز دائمی قبضہ کے منافی ہوتی ہے بلکہ یہ مہایات (1) کا تقاضا کرتی ہے۔ تو اس کی یہ صورت ہوگی جس طرح کوئی یہ کہے میں نے تیرے پاس ایک دن رہن رکھا دوسرے دن رہن نہیں رکھا رہن کا معنی جب روکنا ہے تو یہ دائمی طور پر جس کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ جب کوئی لفظ مطلق ہو تو اس کا معنی کامل لیا جاتا ہے۔ ہبہ کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ مشترک چیز کو ہبہ کرنے سے مانع یہ چیز ہوتی ہے کہ تقسیم کے اخراجات ہبہ کرنے والے پر ہوتے ہیں تو وہ صرف ان چیزوں میں ہو سکتا ہے جس میں تقسیم جاری ہو سکتی ہو نہ کہ ان چیزوں میں جن میں تقسیم جاری ہی نہ ہو۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے کہ مشترک چیز کو رہن کے طور پر رکھنا درست ہوتا ہے خواہ وہ قابل تقسیم ہو یا قابل تقسیم نہ ہو۔

مسئلہ:۔ جب رھن قبضہ کے ساتھ مکمل ہو جائے تو مرہون چیز راھن کی ملکیت سے قبضہ کے اعتبار سے نکل جاتی ہے اور رقبہ کے اعتبار سے اس کی ملکیت میں باقی رہتی ہے اور مرتھن قبضہ کے اعتبار سے اس کا مالک بن جاتا ہے، رقبہ کے اعتبار سے مالک نہیں بنتا۔ اسی لئے راھن کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ مرہونہ چیز سے نفع حاصل کرے جیسے رہن رکھے گئے جانور پر سواری کرنا، اس گھر میں رہائش رکھنا اور اس طرح کی دوسری چیزوں سے نفع حاصل کرنا، مگر وہ مرتھن کی رضا سے ایسا کر سکتا ہے کیونکہ اگر راھن یہ فائدے اٹھائے تو یہ مرتھن کے قبضہ اور دائمی طور پر روکنے کے حق کے منافی ہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا راھن کے لئے اس مرہونہ چیز سے فائدہ اٹھانا جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ رہن پر سواری کی جائے گی اس کا دودھ دوہا جائے گا۔ اسے دار قطنی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے اعمش سے روایت کیا ہے، وہ ابو صالح سے اور وہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث میں علت کا ذکر کیا ہے، کہا ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ

---

(1) جس کی وضاحت بعد میں آ رہی ہے۔

نے ایک دفعہ اس حدیث کو مرفوع ذکر کیا، پھر اس کو مرفوع ذکر کرنا چھوڑ دیا۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ پھر بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی موقوف روایت کو مرفوع پر ترجیح دی ہے۔ ہم کہتے ہیں یہ حدیث مجمل ہے، اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ راهن کی مرکوب ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ وہ مرتہن کی مرکوب ہو، اس سے استدلال کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ:۔ راهن کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ مرہون میں تصرفات شرعیہ کرے اگر اس نے ایسا کر دیا، اگر وہ تصرف فسخ کا احتمال رکھتا ہوگا جیسے بیع، ہبہ وغیرہ تو وہ ملک رقبہ کی بناء پر منعقد تو ہو جائے گا اور مرتہن کی اجازت پر موقوف ہوگا، یا راہن فک کرنے پر موقوف ہوگا وہ تصرفات جو فسخ کا احتمال نہیں رکھتے جیسے آزاد کرنا تو وہ فسخ کا احتمال نہ رکھنے اور ملک رقبہ کی بناء پر نافذ ہو جائیں گے۔ اگر راہن خوشحال ہے تو اس پر لازم ہوگا وہ رہن رکھے گئے غلام کی قیمت مرتہن کے پاس رہن رکھے، اگر راهن تنگ دست ہے تو غلام پر لازم ہوگا کہ وہ محنت کرے اور اپنی قیمت کے برابر رقم مرتہن کو دے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی آزادی بھی بیع کی طرح موقوف ہوگی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر وہ خوشحال ہو تو نافذ ہو گی، اگر تنگ دست ہو تو نافذ نہیں ہوگی۔

مسئلہ:۔ رہن رکھی گئی چیز کا خرچ راهن پر ہوگا کیونکہ وہ اس کا مالک ہے اور مرھون کے زوائد جیسے بچہ، اون، دودھ، پھل اور اس جیسی دوسری چیزیں سب بالاتفاق راهن کی ہوں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ اس کے لئے اس کے فوائد اور اسی پر اس کے اخراجات ہوں گے(1) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ مرتہن کی ملک میں ہوگی۔ لیکن ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہ "راهن" کی ملک ہوگی کیونکہ آپ نے فرمایا کہ مرتہن اس کا نفقہ اس کے دودھ اور سواری سے پورا کرے۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مرھون کے زوائد بھی رہن کے طور پر مرتہن کے پاس رہیں گے کیونکہ ان کے لئے وہی حکم ہوگا جو ان کی اصل کا ہے۔ پس یہ زوائد بھی رقبہ کے اعتبار سے راهن اور قبضہ کے اعتبار سے مرتہن کی ملک میں ہوں گے کیونکہ مرتہن رقبہ کا مالک نہیں ہے، اس لئے مرتہن کے لئے جائز نہیں کہ وہ مرھون سے نفع حاصل کرے، اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کے لئے یہ سود ہوگا مرتہن کو یہ حق بھی حاصل نہیں ہوگا کہ وہ مرھونہ چیز میں کوئی ایسا تصرف کرے جو ملکیت کی بناء پر کیا جاتا ہے۔

مسئلہ:۔ مرتہن نے مرھون پر جو مال خرچ کیا ہے، اگر راهن کی اجازت سے خرچ کیا تو یہ راهن کے ذمہ ہوگا، اگر اس کی اجازت کے بغیر خرچ کیا تو وہ احسان کرنے والا شمار ہوگا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہر صورت میں اس کے ذمہ ہوگا، تاہم مرتہن کے لئے یہ جائز ہے کہ اس پر سواری کرے اور دودھ حاصل کر کے اپنا یہ خرچہ پورا کرے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث اَلرَّهْنُ مَرْكُوبٌ مَحْلُوبٌ سے اس پر استدلال کیا ہے، نیز اس حدیث سے بھی جو امام بخاری نے امام شعبی رحمہ اللہ تعالیٰ سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رہن پر نفقہ کے عوض سواری کی جاتی ہے اور بکری کا دودھ نفقہ کے عوض پیا جاتا ہے، جب وہ مرھون ہو خرچ اسی کے ذمہ ہوگا جو اس پر سوار ہوتا ہے یا اس کا دودھ پیتا ہے(2) اسے ابوداؤد نے یشرب کی جگہ یحلب کے الفاظ سے روایت کیا ہے اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اَلرَّهْنُ يُرْكَبُ بِنَفَقَتِهِ اِذَا كَانَ مَرْهُوْنًا

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 232 مکتبہ امدادیہ ملتان
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 141 مکتبہ امدادیہ ملتان

وَلَبَنُ الدَّرِّ يُشْرَبُ بِنَفَقَتِهٖ اِذَا كَانَ مَرْهُوْنًا کے الفاظ کے ساتھ روایت کیا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ مرھون کا نفقہ اس پر واجب ہے جو سوار ہوتا ہے اور اس بات پر اجماع ہے کہ رھن کا نفقہ راھن پر ہوگا۔ شائد یہ حکم ربا کی حرمت سے پہلے تھا۔ جب ایسے قرض سے نہی وارد نہیں ہوئی تھی جو اپنے ساتھ نفع بھی لاتا اور جب ایک چیز کو دوسری چیز کے بدلے میں لینا جبکہ معیار شرعی کی بناء پر وہ مساوی نہ ہوں ممنوع نہ تھا پس یہ حکم ربا والی آیت سے بالا جماع منسوخ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی، فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی، لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔ جہاں تک اصل حدیث میں الرھن بمافیه (جس چیز کے عوض میں اسے رہن رکھا گیا ہے) یہ منسوخ نہیں ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ مرھون جس دین میں بطور رہن رکھا گیا تھا اس میں وہ قابل ضمانت ہوگا یعنی اگر دین اس مرھونہ چیز کی مثل ہو یا اس سے کم ہو تو اس مرھونہ چیز کے برابر دین ساقط ہو جائے گا اور زائد اس کے پاس امانت ہوگی، اگر اس سے بغیر ارادہ کے ضائع ہو گئی تو کوئی چٹی نہ ہوگی، اگر اس سے غلطاً ضائع ہوئی تو پھر مرتہن اس کا ضامن ہوگا۔

مسئلہ:۔ جب راھن مرجائے تو مرھونہ کو مرتہن کا دین پورا کرنے کے لئے اسے بیچا جائے گا، راھن کے دوسرے قرض خواہوں کا حق اس کے متعلق نہیں ہوگا کیونکہ وہ ابتداء سے ہی قبضہ کے اعتبار سے مالک تھا اور ملک رقبہ کا بھی مستحق تھا تو اس کا قبضہ اپنے حق کو وصول کرنے کا قبضہ شمار کیا جائے گا۔

مسئلہ:۔ اگر بغیر تعدی کے رہن مرتہن کے قبضہ میں ہلاک ہو گیا تو امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک رہن کی ضمانت ہوگی کیونکہ وہ قبضہ کے اعتبار سے مالک تھا اور اس کا قبضہ اپنے حق کو وصول کرنے کا قبضہ تصور ہوگا اور رہن کے ہلاک ہو جانے سے حق کا وصول کرنا ثابت ہو گیا۔ اگر راھن پر دین کی ادائیگی دوبارہ لازم ہو تو ربوا لازم آئے گا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ قیمت کا ضامن ہوگا کیونکہ حق کی وصولی قیمت کے ذریعے ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دین اور قیمت میں سے جو کم ہو اس کے بدلے میں استیفاء حق ہو جائے گا، زائد امانت ہوگی۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی مثل روایت کیا ہے۔ قاضی شریح، حسن بصری اور شعبی رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین کے بدلے رہن کی ضمانت ہوگی یعنی اس کے اوپر اب دین لازم نہیں رہے گا۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا وہ مرتہن کے ہاتھ میں امانت ہے، وہ تعدی کے بغیر اس کا ضامن نہیں ہوگا کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے جس آدمی نے کسی دوسرے آدمی کے پاس جو چیز رہن کے طور پر رکھی ہے مرتہن اسے بند کر کے نہ رکھ لے بلکہ اس کے فوائد اور خرچ راہن کے لئے ہوگا۔ اسے ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں دار قطنی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے زیاد بن سعد کے واسطہ سے، وہ زہری سے، وہ سعید بن مسیب سے، وہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت ذکر کرتے ہیں۔ رہن کو کسی چیز کے ساتھ معلق نہ کیا جائے راھن کے لئے اس کا فائدہ اور چٹی لازم آئے گی۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا زیاد بن سعد حافظ ثقہ لوگوں میں سے ایک ہے یہ حدیث حسن متصل ہے۔ ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسحاق بن راشد کے واسطہ سے وہ زہری سے نقل کرتے ہیں۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سندوں کے ذریعے سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متصلاً نقل کیا ہے۔ امام اوزاعی، یونس، ابن ابی ذئب نے زہری سے انہوں نے سعید سے مرسل روایت نقل کی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ابن ابی فدیک اور ابن ابی شیبہ نے وکیع سے اور عبدالرزاق نے ثوری سے، پھر سب نے ابن ابی ذئب سے اسی طرح نقل کیا ہے

اس کے الفاظ یہ ہیں لَا يُغْلَقُ الرَّهْنُ مِنْ صَاحِبِهِ الَّذِي رَهَنَهُ لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ ابوداؤد، بزار اور دار قطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کی مراسیل کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس کی دار قطنی اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک کئی سندیں ہیں، تاہم وہ سب ضعیف ہیں۔ ابن حزم اور دار قطنی رحمہما اللہ تعالیٰ نے شبابہ کے واسطہ سے، وہ ورقاء سے، وہ ابن ابی ذئب سے، وہ زہری سے، وہ سعید بن مسیّب اور ابو سلمہ بن عبدالرحمن سے، وہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَا يُغْلَقُ الرَّهْنُ لِمَنْ رَهَنَهُ لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث حسن ہے۔ ابن عبدالبر نے اسے صحیح قرار دیا ہے عبدالحق نے متصل ذکر کیا۔ حافظ ابن حجر نے کہا اس سند میں عبد بن نصر ہے جس کی احادیث منکر ہیں اور یہ قول "لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ" یہ ابن مسیّب کے قول کا مدرج (۱) ہے۔ ابوداؤد نے مراسیل میں بھی یہی کہا ہے۔ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس لفظ کے مرفوع اور موقوف ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن ابی ذئب، معمر اور دوسرے علماء نے اسے مرفوع نقل کیا ہے جبکہ انہوں نے علی بن ابی ذئب کے اختلاف سے اسے مراسیل میں شمار کیا جبکہ دوسرے علماء نے اسے موقوف ذکر کیا۔ اس حدیث سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ رہن راھن کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتا۔ یہی لایغلق الرھن کا معنی ہے۔ لصاحبه غنمه کا معنی اس کی سلامتی اور علیه غرمه کا معنی اس کی ہلاکت ہے۔ ہم کہتے ہیں اس حدیث کا یہ معنی نہیں بلکہ اس کا معنی وہ ہے جو ابن جوزی نے ابراہیم نخعی سے ذکر کیا ہے کہ لوگ رہن رکھتے اور کہتے اگر فلاں وقت تک میں مال لے آیا تو ٹھیک، ورنہ یہ چیز تیری ہوگی۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا رہن کو معلق نہیں کیا جاسکتا۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے ابراہیم نخعی سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ مالک بن انس اور سفیان بن سعید سے بھی یہی روایت کیا گیا ہے کہ وہ بھی اسی کی مثل وضاحت کرتے تھے له غنمه کا معنی ہے جو رہن کے زوائد ہیں جیسے اولاد وہ راھن کے لئے ہیں و علیه غرمه یعنی اس کا خرچہ بھی راہن کی ذمہ داری ہوگی، اس کا یہ معنی متفق علیہ ہے۔ ضمانت کے واجب ہونے کی ہماری دلیل وہ روایت ہے جو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن خزیمہ سے انہوں نے عبیداللہ بن محمد تیمی سے نقل کی ہے، ہمیں عبداللہ بن مبارک نے خبر دی، کہا ہمیں مصعب بن ثابت نے بتایا، وہ عطاء بن ابی رباح سے نقل کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے ایک گھوڑا اپنے پاس بطور رہن رکھا تو وہ گھوڑا مرتہن کے پاس مر گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرا حق ختم ہو گیا(۱) یہ روایت مرسل ہے اور ہمارے نزدیک مرسل روایت حجت ہے۔ اس کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی الرھن بما فیه جو پہلے گزر چکی ہے۔ اسی طرح حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی روایت دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ کے پائیں بھی ہے جیسے ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے دو ضعیف سندوں سے روایت کیا ہے۔ یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ قرض کے مقا بلہ میں سے زائد چیز مرتہن کے پاس امانت ہوتی ہے۔ قیاس بھی یہی ہے کیونکہ حق کا وصول کرنا جو چیز واجب ہے اسی کے حساب سے ہوتا ہے۔

ﮯ یعنی بعض قرض خواہ بعض مقروضوں سے یا اس کی امانت کی وجہ سے رہن اور کتابت سے مستغنی ہوں ابی کی قرأت میں فان ائتمن کے الفاظ ہیں دونوں کا معنی ایک ہے۔

ﮯ یہاں امانت سے مراد دین ہے یہاں دین کو امانت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اسے اطمینان تھا۔ اسی لئے اس نے معاہدہ تحریر کرنے اور

حاشیہ (۱)۔ ایسے کلمات کو کہتے ہیں جو اس حدیث کا حصہ نہ ہوں بلکہ کسی اور حدیث یا راوی کے کلام میں سے اس میں شامل ہو گئے ہوں۔

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 232 مکتبہ امدادیہ ملتان

رہن رکھنے کو چھوڑ دیا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور ﷺ نے شاذ ہی کوئی خطبہ دیا ہو کہ اس میں یہ نہ فرمایا ہو اس آدمی کا ایمان نہیں جس میں امانت نہیں، اس کا کوئی دین نہیں جس کا عہد نہ ہو۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب میں اس روایت کو ذکر کیا ہے۔

۷ یعنی خیانت کرنے اور حق سے انکار کرنے میں انہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہئے، اس میں کئی مبالغے ہیں۔ حدیث طیبہ میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے منافق کی تین نشانیاں ہیں جس میں یہ بھی مذکور ہے جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرے۔

۸ یعنی اے گواہو گواہی کو نہ چھپاؤ۔ مقروضوں کے خلاف گواہی کو نہ چھپاؤ جب وہ خیانت کریں اور وہ حق ادا نہ کریں جس کے بارے میں تم میں سے بعض بعض سے امن میں تھے اور جس کے اوپر حق لازم تھا وہ اس کا انکار کر دیں۔ آیت اس معنی کا احتمال بھی رکھتی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اے مقروضو! جو تم پر لوگوں کے حقوق ہیں اس کی شہادت کو نہ چھپاؤ بلکہ اپنے خلاف اس کا اقرار کرو۔

۵ قلبہ کا لفظ اثم کا فاعل ہونے کی وجہ سے یا مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کی خبر اثم ہے۔ پھر یہ جملہ اسمیہ ان کی خبر ہے یہاں اثم کی نسبت قلب کی طرف کی کیونکہ چھپانا دل کا فعل ہے تو اس فعل کی نسبت دل کی طرف کرنا تاکید اور مبالغہ کا فائدہ دیتا ہے جس طرح کہا جاتا ہے رَأَيْتُهُ بِعَيْنِي میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا، سَمِعْتُهُ بِأُذُنِي میں نے اسے اپنے کانوں سے سنا، حَفِظْتُهُ بِقَلْبِي میں نے اسے دل سے یاد کیا۔ یا دل کی طرف اسے منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کیونکہ یہ تمام اعضاء کا رئیس ہے اور اس کے افعال بھی عظیم الشان ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک بنی آدم کے دل میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، جب وہ درست ہو جائے تو سارا بدن درست ہو جاتا ہے اور جب وہ خراب ہو جائے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے، خبردار! وہ دل ہے(1) یہ حدیث متفق علیہ ہے اور نعمان بن بشیر سے مروی ہے۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے دل کا مسخ کرنا۔ ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

۹ جو تم شہادت دیتے ہو یا اسے چھپاتے ہو اسے جانتا ہے اس میں دھمکی دی گئی ہے۔ یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ شہادت کو چھپانا حرام ہے اور گواہی دینا فرض ہے، اگرچہ مدعی مطالبہ نہ بھی کرے۔ اگر مدعی کو گواہ کی گواہی کا علم نہ ہو تو شاہد پر واجب ہے کہ مدعی کو بتائے کہ وہ اس معاملہ میں شاہد ہے۔ ایک قوم نے یہ کہا جب تک شہادت طلب نہ کی جائے اس سے پہلے گواہی دینا مذموم ہے کیونکہ عمران بن حصین کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے بہترین میرے زمانہ کے لوگ ہیں، پھر وہ جوان کے بعد آئیں گے، پھر وہ جوان کے بعد آئیں گے، پھر ان کے بعد ایک ایسی قوم آئے گی جو گواہیاں دے گی جبکہ انہیں گواہ نہیں بنایا جائے گا، وہ خیانت کریں گے جبکہ امین نہیں بنایا جائے گا، وہ نذریں مانیں گے لیکن وہ پوری نہیں کریں گے، ان میں موٹاپا ظاہر ہوگا۔ ایک روایت میں ہے وہ قسمیں اٹھائیں گے لیکن ان سے قسم طلب نہ کی جائے گی(2) متفق علیہ۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ کی تعظیم کیا کرو کیونکہ وہ تم میں سے بہترین ہیں، پھر وہ جوان کے بعد آئیں گے، پھر وہ جوان کے بعد آئیں گے، پھر ان میں جھوٹ عام ہو جائے گا، یہاں تک کہ ایک آدمی قسم اٹھائے گا جبکہ اس سے قسم کا مطالبہ نہ کیا جائے گا، وہ گواہی دے گا جبکہ اس سے گواہی طلب نہ کی جائے گی۔ اسے امام نسائی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث بھی ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں ان کی گواہیاں قسموں

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 13 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 515 (وزارت تعلیم)

سے اور ان کی قسمیں ان کی شہادتوں سے سبقت لے جائیں گی۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں حدیثیں مختلف طرق سے روایت کی ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں اس مذموم شہادت سے مراد جھوٹی شہادت ہے کیونکہ یہ الفاظ اس کا قرینہ ہیں پھر وہ جھوٹ کو عام کر دیں گے اور یہ الفاظ وہ خیانت کریں گے انہیں امین نہیں بنایا جائے گا، وہ نذریں مانیں گے انہیں پورا نہ کریں گے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے مالک سے وہ زید بن خالد جہنی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں بہترین گواہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ وہ وہ ہے جو پوچھنے سے پہلے ہی گواہی دے دیتا ہے یا سوال کرنے سے پہلے شہادت کے بارے خبر دے دیتا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

"اللہ تعالیٰ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے 1 اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا تم اسے چھپائے رہو 2 حساب لے گا تم سے اس کا اللہ تعالیٰ 3 پھر بخش دے گا جسے چاہے گا 4 اور عذاب دے گا جسے چاہے گا 5 اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے 6"

1۔ پیدا کرنے، بادشاہت اور ملکیت کے اعتبار سے آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر چیز کسی نہ کسی مکان میں ہے اور ممکنات میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو کل سے الگ تھلگ ہو، ورنہ اس کی خالقیت اور مالکیت کا بیان قاصر رہتا کیونکہ زیادہ اہم یہ بات ہے کہ مجردات پر مالکیت کو ثابت کیا جائے، تاہم یہ قول کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہ ثابت شدہ امر ہے کہ ممکنات میں سے مجردات ہیں جیسے انسان کی ارواح فرشتے اور دوسری چیزیں ارباب قلوب کے اوپر دل، روح، سر، خفی اور اخفی کا مجرد ہونا بھی منکشف ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات سے خوب واقف ہے وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (کوئی نہیں جانتا آپ کے لشکروں کو بغیر اس کے)۔ یہاں **ما فی السموات وما فی الارض** کے ذکر پر اکتفاء اس لئے کیا کیونکہ عوام کی نظر یہاں تک محدود رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر استدلال کرنے کے لئے اس کا ذکر کافی ہے کیونکہ استدلال کا تصور نہیں کیا جا سکتا مگر ایسے امور پر ہی جو عوام کے دیکھے بھالے اور ان کے علم میں ہوں، نہ کہ ایسے امور سے استدلال کیا جاتا ہے جو خواص پر بھی مخفی ہوں۔ اسی لئے یہاں عرش اور کرسی کا ذکر نہیں کیا جبکہ وہ دونوں آسمان و زمین میں شامل نہیں، واللہ اعلم۔

2۔ تمہارے اندر رذائل میں سے جو چیزیں موجود ہیں جیسے نفاق، ریا، تعصب، دنیا کی محبت، غضب، تکبر، فخر، آرزو، لالچ، توکل کا چھوڑنا، حسد، کینہ وغیرہ جو دل اور نفس کے اعمال ہیں۔ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ آدمی ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی بناء پر لوگوں کو بلائے اور جو عصبیت کی بناء پر مر گیا وہ بھی ہم میں سے نہیں(1) اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ حارثہ بن وہب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں جنتیوں کے بارے خبر نہ دوں؟ یہ کمزور اور جس کو کمزور سمجھا جائے اگر وہ اللہ تعالیٰ کے اعتماد پر قسم اٹھادے تو وہ اسے پورا کر دے، کیا میں تمہیں جہنمیوں کے بارے آگاہ نہ کروں؟ ہر سخت، بخیل، متکبر(2) (متفق علیہ)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے یہ بخیل، بداصل اور متکبر۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مرسل روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا کی محبت ہر غلطی کی سردار ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب ایمان میں حضرت

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 342 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 382 (قدیمی)

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی محبت ایمان اور ان دونوں سے بغض نفاق ہے۔ اسے ابن عدی نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی محبت ایمان میں سے ہے اور ان دونوں سے بغض کفر ہے، انصار سے محبت ایمان میں سے ہے اور ان سے بغض کفر ہے۔ عرب کی محبت ایمان میں سے ہے اور ان سے بغض کفر ہے جس نے میرے صحابہ کو گالی دی اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت، جس نے مجھے ان کے بارے میں محفوظ رکھا میں قیامت کے روز اس کی حفاظت کروں گا۔ اسے ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی محبت عبادت ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ ذات پاک جس نے دانے کو پھاڑا اور جس نے روح کو پیدا کیا، نبی کریم ﷺ نے مجھ سے وعدہ کیا کہ مجھ سے مومن محبت کرے گا اور منافق بغض رکھے گا(1) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ سے ہی ایک روایت مروی ہے کہ تیری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی ہے یہودیوں نے آپ علیہ السلام سے بغض کیا یہاں تک کہ انہوں نے آپ علیہ السلام کی ماں پر بہتان لگا دیا اور نصاریٰ نے آپ سے محبت کی یہاں تک کہ ان کے لئے ایسے مرتبہ کا ذکر کیا جس پر وہ فائز نہ تھے، پھر فرمایا میرے بارے میں دو آدمی ہلاک ہوں گے مجھ سے محبت میں افراط کرنے والا، وہ میرے بارے میں وہ کچھ کہے گا جو مجھ میں نہیں اور مجھ سے بغض رکھنے والا، میرے ساتھ دشمنی اسے اس بات پر برانگیختہ کرے گی کہ وہ میرے اوپر بہتان لگائے گا(2) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک مرفوع روایت مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بڑائی میری چادر ہے، عظمت میری ازار ہے، جس نے ان دونوں میں سے کسی ایک میں مجھ سے جھگڑا کیا میں اسے جہنم میں داخل کروں گا(3) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ عطیہ سعدی سے ایک مرفوع روایت مروی ہے کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ بہز بن حکیم نے اپنے باپ سے وہ دادا سے مرفوع روایت کرتے ہیں کہ غصہ ایمان کو یوں فاسد کر دیتا ہے جس طرح ایلوا شہد کو خراب کر دیتا ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب میں روایت کیا ہے۔ عمرو بن شعیب اپنے باپ سے، وہ دادا سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں اس امت کی اصلاح میں سب سے پہلا مقام یقین اور زہد کا ہے اور اس کے فساد کا باعث بننے والی چیزوں میں سب سے پہلے بخل اور جھوٹی آرزو ہے۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابن آدم کی سعادت مندی میں سے یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہو اور ابن آدم کی بدبختی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قضا پر ناراض ہو(4) اسے امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے اللہ تعالیٰ شعبان کی پندرہویں رات کو مخلوقات کی طرف نزول اجلال فرماتا ہے، وہ اپنی تمام مخلوق کو بخش دیتا ہے مگر مشرک اور دل میں کینہ رکھنے والا۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا۔ نفس کے رذائل اور اس کے محامد میں بے شمار روایتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے شہادت میں سے جو تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے ہو۔ امام شعبی اور عکرمہ رحمہما اللہ تعالیٰ کا بھی یہی قول ہے یا کفار سے دوستی مراد ہے۔ آل عمران میں لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ..... قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ (نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست..... فرما دیجئے اگر تم چھپاؤ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے۔ الخ) آیت اس کی مثل ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے

1۔ صحیح مسلم، جلد 4 صفحہ 60 (قدیمی)
2۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 160 (صادر)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 329 (قدیمی)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 37 (وزارت تعلیم)

بھی یہی کہا۔ صحیح بات یہ ہے کہ شہادت کو چھپانا اور کفار سے دوستی کرنا ان چیزوں میں سے ہیں جو تمہارے دلوں میں راسخ ہیں۔ جب تمام چیزوں پر مؤاخذہ نصوص اور اجماع امت سے ثابت ہے تو پھر ان دو چیزوں کی تخصیص کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے کہ اس کا معنی جو افعال اعضاء سے صادر ہوتے ہیں ان پر مصمم ارادہ کرنا۔ عبداللہ بن مبارک نے کہا میں نے سفیان سے کہا کیا اللہ تعالیٰ ارادہ پر بھی بندوں کا مؤاخذہ کرے گا کیا جب وہ ارادہ عزم بن جائے گا تو مؤاخذہ ہوگا۔ میں نے کہا اگر عزم پر مؤاخذہ ثابت ہے تو پھر عزم بھی دل کے گناہوں میں شامل ہوگا لیکن رسول اللہ ﷺ سے حدیث صحیح کے ساتھ یہ ثابت ہے "اگر کسی نے برائی کا ارادہ کیا، پھر اس پر عمل نہ کیا اس پر کوئی گناہ نہ لکھا جائے، اگر اس نے ایسا عمل کیا تو اس پر ایک گناہ لکھا جائے گا۔"

۳؎ یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا، پیشی کا حساب تو آسان حساب ہوگا۔

۴؎ جس کے حق میں بخشش چاہے گا اسے بخش دے گا۔ رہا مناقشہ کا حساب تو اگر اللہ تعالیٰ کسی کا ایسا حساب لے گا تو اسے پکڑے گا۔

۵؎ اور جس کو عذاب دینا چاہے گا اس کو عذاب دے گا۔ ابوجعفر، ابن عامر، عاصم اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے دونوں فعلوں کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ باقی قراء نے ان فعلوں کو مجزوم پڑھا ہے کیونکہ یہ جواب شرط پر عطف ہیں۔

۶؎ عذاب دینے، بخشنے اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں پر قادر ہے، کسی ایک کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ اس پر اعتراض کرے، اگر چاہے تو گناہ صغیرہ پر عذاب دے اور اگر چاہے تو بغیر توبہ کے گناہ کبیرہ کو بخش دے۔

اہل سنت و جماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ دل، نفس اور جسم کے معاصی کا حساب حق ہے، گناہ چھوٹے ہوں یا بڑے۔ ان پر عذاب بھی حق ہے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے۔ حضرت طاؤس اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا جس کے حق میں وہ چاہتا ہے اس کے بڑے گناہ بخش دیتا ہے، یعنی گناہ گار خواہ توبہ کرے یا نہ کرے اور جس کے حق میں چاہتا ہے اس کے چھوٹے گناہ پر اسے عذاب میں مبتلا کرتا ہے، جو وہ کرتا ہے اس کے بارے اس سے سوال نہیں کیا جاتا۔ معتزلہ، روافض اور دوسرے لوگوں نے حساب کا انکار کیا ہے۔ معتزلہ اور دوسرے لوگوں نے یہ کہا کہ گناہگاروں پر عذاب واجب ہے۔ یہ آیت اور دوسری آیات اور احادیث طیبہ ہماری دلیلیں ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز جس کا بھی حساب لیا گیا وہ ہلاک ہو گیا۔ میں نے عرض کی کیا اللہ تعالیٰ یہ ارشاد نہیں فرماتا "وہ آسان حساب لے گا" آپ ﷺ نے فرمایا وہ تو صرف پیشی ہے لیکن جس کے حساب میں سوال و جواب شروع ہو گیا وہ ہلاک ہو گیا، متفق علیہ۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق بندے کے قریب ہوگا، اپنا ہاتھ اس پر رکھے گا اور اسے ڈھانپ لے گا۔ پھر ارشاد ہوگا کیا تو فلاں گناہ کو جانتا ہے، کیا تو فلاں گناہ کو جانتا ہے؟ وہ عرض کرے گا جی ہاں میرے رب! یہاں تک کہ وہ اپنے تمام گناہوں کا اقرار کر لے گا، وہ اپنے بارے میں خیال کرے گا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں تیرے عیوب کو پوشیدہ رکھا، آج میں تجھے بخش دیتا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے نیکیوں والی کتاب عطا فرمائے گا۔ رہے کافر اور منافق تو انہیں اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے ندا دے گا "یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کے بارے میں جھوٹ بولا۔ خبردار! ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے"(1) یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ ایک آدمی آیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ بے شک میرے دو غلام ہیں جو میری تکذیب کرتے ہیں، میرے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 330 (وزارت تعلیم)

خیانت کرتے ہیں اور میری نافرمانی کرتے ہیں۔ میں انہیں گالیاں دیتا ہوں، اور انہیں مارتا ہوں پس ان میں سے کیسے ہوسکتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کا روز ہوگا جو انہوں نے تیرے ساتھ خیانت کی، تیری نافرمانی کی اور تیری تکذیب کی اور جو تو نے انہیں سزا دی سب کا حساب کیا جائے گا، اگر تیری سزا ان کے گناہوں کے برابر، ہوگی تو حساب برابر ورنہ تیرے لئے ان پر حق باقی ہوگا اور نہ انہیں کوئی سزا دی جائے گی، اگر تیری سزا گناہوں سے کم ہوئی تو تیرے لئے کچھ بچ جائیگا، اگر تیری سزا ان کے گناہوں سے بڑھ کر ہوئی تو جو تیری طرف سے زیادتی ہوئی اس کے مقابلہ میں تجھ سے بدلہ لیا جائے گا(1) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حساب اور مغفرت دونوں بابوں میں بے شمار احادیث ہیں۔

فصل:۔ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے۔ حضرت ابی امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ میری امت میں سے ستر ہزار کو بغیر حساب کے داخل فرمائے گا اور ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار کو عذاب نہیں دیا جائے گا اور میرے رب کے حثیات میں سے تین حثیات (لپ، چلو) بھی (بلا حساب و کتاب) جنت میں داخل ہوں گے(2) اسے امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اسماء بنت یزید نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا قیامت کے روز تمام لوگوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے گا ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا اور کہے گا کہاں ہیں وہ جن کے پہلو بستروں سے الگ رہتے تھے، وہ اٹھیں گے، ان کی تعداد تھوڑی ہو گی۔ وہ جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے۔ پھر دوسرے تمام لوگوں کو حساب کا حکم دیا جائے گا۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے ستر ہزار بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے اور لا یسترقون جو جھاڑ پھونک نہیں کرتے تھے اور فال بد نہیں پکڑتے تھے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے تھے(3) متفق علیہ۔ آپ ہی سے ایک طویل حدیث میں ہے۔ کتاب و سنت کے سیاق سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جن لوگوں سے حساب نہیں لیا جائے گا وہ عشاق صوفی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حساب کو نفس کے رذائل کے ساتھ متعلق کیا ہے کیونکہ فرمایا ہے: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ، جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ تمہارا حساب لے گا۔ یہاں ظاہر کرنے اور مخفی رکھنے کا ذکر برابری کے لئے ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں فرمایا" اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ"" آپ بخشش طلب کریں ان کے لئے یا نہ کریں" یہاں حساب کو نفس کے رزائل کے ساتھ مشروط کیا ہے، جبکہ اعضاء کے اعمال کا ذکر نہیں کیا، جبکہ حساب صرف نفس کے رذائل کے ساتھ خاص نہیں۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کیونکہ یہ اعضاء کے اعمال سے زیادہ سخت ہیں، نیز یہی عموماً اعضاء کے معاصی کا منشاء ہوتے ہیں۔ نفس کے تزکیہ اور دل کے تصفیہ کے بعد گناہ شاذ و نادر ہی واقع ہوتے ہیں جس طرح حضور ﷺ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے جب یہ عضو درست ہو جائے تو سارا بدن درست ہو جاتا ہے اور جب یہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ اگر گناہ شاذ و نادر صادر ہوں تو بھلائیوں سے مطمئن ہونے والے نفس اور میل و کچیل سے پاک دل فوراً شرمندہ ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر لیتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔ ابن مسعود سے ایک مرفوع روایت مروی ہے گناہ سے توبہ کرنے والا

1۔ مسند احمد، جلد 6 صفحہ 280 (صادر) 2۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 327 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 968 (وزارت تعلیم)

ایسے ہی ہے جیسے اس کا کوئی گناہ نہ ہو(1) اسے ابن ماجہ اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ انہیں سے شرح السنہ میں موقوف روایت ہے۔ شرمندگی توبہ ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں حضور ﷺ کے اس ارشاد میں مومن فقراء کہا گیا ہے میں ہی وہ پہلا شخص ہوں گا جو جنت کی کنڈی کو ہلاؤں گا، اللہ تعالیٰ میرے لئے دروازے کو کھول دے گا، مجھے جنت میں داخل فرمائے گا اور میرے ساتھ مومن فقراء ہوں گے، یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ یہ بات، وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (بلند کئے ان میں بعض کے درجے) میں گزر چکی ہے۔ جان لو فقیر اسے کہتے ہیں جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور یہ وہ قوم ہے جن کے پاس کچھ بھی نہیں۔ جہاں تک رذائل اور نفس امارہ کی بری صفات ہیں وہ سب کی سب ختم ہو چکی ہیں، جہاں تک وجود اور صفات کمال کا تعلق ہے انہوں نے ان کو عاریۃً اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت جانا، جب انہوں نے امانت کو اس کے حقدار کے حوالے کر دیا اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا، نہ ان کا کوئی نام رہا اور نہ ہی۔ کوئی علامت رہی اسی وجہ سے تم ان میں نہ عجب پاتے ہو، نہ تکبر اور نہ ہی الوہیت باطلہ کے مقتضیات میں سے کوئی چیز۔ ہم ان تمام چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد سَبْعُوْنَ اَلْفًا مَعَ كُلِّ اَلْفٍ سَبْعُوْنَ اَلْفًا میں مع کا کلمہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ستر ہزار ایک ہزار کے تابع ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، شائد اس کا معنی یہ ہو گا کہ بغیر حساب کے جنت میں جو داخل کئے جائیں گے وہ مکمل ہوں گے اور ان میں سے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار کاملین ہوں گے جو علماء، راسخین، صدیقین اور اولیاء صالحین میں سے ہوں گے اور حضور ﷺ کا فرمان "ثَلَاثُ حَثَيَاتٍ مِنْ حَثَيَاتِ رَبِّيْ" اس سے ظاہر معنی یہ ہے کہ اس سے مراد کثرت نہیں ہے کیونکہ اگر کثرت ہی مقصود ہوتی تو اللہ تعالیٰ ایک حثیہ (دو ہتھیلیوں کے برابر چیز) ہی پہلے اور پچھلے لوگوں کے لئے کافی ہو جاتا کیونکہ اس کا فرمان ہے "بے شک تمام زمین کو میں نے اپنے قبضے میں لے لیا قیامت کے روز اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوں گے" بلکہ اس سے مراد اقسام بیان کرنا ہیں، شائد تین چلوؤں سے مراد۔ 1۔ ایک وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا وہ شہداء ہیں۔ 2۔ جنہوں نے اپنی عمروں کو اللہ تعالیٰ کی طاعت میں خرچ کیا مگر وہ پہلی قسم میں شامل نہیں، یہ وہ علماء ہیں جو مرید ہیں اور اولیاء کے ساتھ وابستہ ہیں۔ 3۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنے مال خرچ کئے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے پہلوں کو محبوب جانا اور ان کے راہ پر چلے لیکن ان کے درجات تک نہ پہنچے اور نبی کریم ﷺ کا فرمان وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ یہ ان کے باطن کی صفت ہے اور تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ ان کی ظاہر صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و احسان کے ساتھ مجھے ان لوگوں میں سے بنائے۔

امام بخاری، امام مسلم، امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ اور دوسرے علماء نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ۔ یہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر بڑی شدید ثابت ہوئی وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ پہلے ہمیں ایسے امور کا مکلف بنایا گیا جس کی ہم طاقت رکھتے تھے جیسے نماز، روزہ، جہاد اور صدقہ۔ اب آپ پر یہ آیت نازل ہوئی ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی جس طرح تم سے پہلے اہل کتاب نے کہا بلکہ تم یہ کہو "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ" "ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اے ہمارے رب ہمیں بخش دے اور تیری طرف ہی پلٹ کر جانا ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 323 (وزارت تعلیم)

جب قوم نے...... یہ آیت پڑھی اور ان کی زبانوں پر یہ کلمات عام ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ان آیات کو نازل فرمایا۔(1)

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ۝

"ایمان لایا یہ رسول (کریم) اس (کتاب) پر جو اتاری گئی اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اور (ایمان لائے) مومن لے یہ سب ےے دل سے مانتے ہیں اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو ےے (نیز کہتے ہیں) ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے ےے اور انہوں نے کہا ےے ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ےے ہم طالب ہیں تیری بخشش کے ہے اے ہمارے رب اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے ےے"

لے میں یہ کہتا ہوں جب وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ نازل ہوئی تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ دل میں واقع ہونے والے خطرات پر بھی حساب لے گا یا انہوں نے اپنے نفوس کی سرکشی کو ختم کرنے کے لئے اپنے نفوس پر رذائل کی تہمت لگائی تو یہ معاملہ ان پر شدید ہو گیا تو حضور ﷺ نے انہیں تسلیم و رضا اور توکل کی صفات سکھائیں جو نفوس مطمئنہ کی صفات ہیں اور اللہ تعالیٰ نے دل میں وارد ہونے والے وساوس کے بارے میں جو ان کے گمان تھے ان کو ختم کرنے اور ایمان کی سچائی، نیتوں کی صحت، تزکیہ نفوس اور تزکیہ قلوب پر واقع ہونے والی شہادت پر انہیں تسلی دینے کے لئے اس آیت کو نازل فرمایا، کیونکہ نفس کے رذائل کو زائل کرنا یہ ایمان کے مقتضی میں سے ہے اور حقیقی و کامل ایمان نفس کو فنا کرنے اور رذائل کو ختم کرنے سے ہی حاصل ہوتا ہے اور مطلق کامل کی طرف ہی لوٹتا ہے۔ یہاں مومنین سے مراد وہ مومن ہیں جو اس زمانہ میں موجود تھے اور وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے جس طرح اس آیت کریمہ میں ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (اے نبی مکرم کافی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ اور جو آپ کے فرمانبردار ہیں مومنوں سے)۔ اب ان لوگوں کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہوں گے جن کا ایمان بھی صحابہ کے ایمان جیسا ہوگا اور وہ اہل سنت و جماعت کے لوگ ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئی اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی، سب جہنم میں جائیں گے صرف ایک جنت میں جائے گا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ وہ کون ہوں گے فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ قائم ہیں (اس راہ پر چلنے والے)(2)۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

ےے اس میں تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ اس احتمال سے خالی نہیں کہ مومنوں کا عطف رسول پر کیا جائے، تو اس صورت میں وہ ضمیر تنوین جس کے قائم مقام ہے وہ رسول اور مومنوں کی طرف لوٹے، اس اعتبار سے کل کو اپنی خبر کے ساتھ ملا کر مبتدا کی خبر بنانا صحیح ہوگا۔ اب لفظ رسول کو حکم میں الگ کر دیا تو عظمت بیان کرنے کے لئے ہے اس لئے کہ رسول کا ایمان مشاہدہ اور آنکھوں دیکھا ہوتا ہے جبکہ لوگوں کا ایمان نظر و استدلال کے ساتھ ہوتا ہے۔(3)

ےے حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کتب کی جگہ کتاب مفرد پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس سے مراد قرآن ہوگا اور قرآن پر ایمان

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 77-78 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 89 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 1 صفحہ 585 مطبوعہ دار الفکر بیروت

رکھنا تمام کتابوں پر ایمان لانے کو اپنے ضمن میں لئے ہوگا یا کتاب سے مراد جنس ہوگی جنس اور جمع میں فرق یہ ہوتا ہے کہ جنس اپنے افراد میں عام ہوتی ہے، جبکہ جمع اپنے جمعوں میں عام ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے الکتاب کا اطلاق الکتب سے زیادہ افراد پر ہے۔ اور کہا یا اس حال میں کہ وہ کہتے ہیں۔

۴ یعنی ان پر ایمان لانے میں ہم فرق نہیں کرتے جس طرح یہودیوں نے فرق کیا۔ انہوں نے کہا تھا ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ احد کا لفظ نکرہ ہے اور نفی کے سیاق میں واقع ہے، پس یہ سب کو عام ہے۔ اسی وجہ سے اس پر بین کا لفظ داخل ہوا۔ یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے لا یفرق غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور ضمیر لفظ کل کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ضمیر کے واحد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کل کے لفظ کا اعتبار کیا ہے۔

۵ اس کی ضمیر رسول اور مومنین سب کی طرف لوٹ رہی ہے یا لفظ کل کی طرف لوٹ رہی ہے اور اس صورت میں کل کا معنی ملحوظ ہوگا۔

۶ یعنی ہم نے تیرا فرمان سنا اور ہم نے تیرے حکم کی اطاعت کی اور اس پر لبیک کہی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حکیم بن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو جبرئیل امین نے حضور ﷺ سے عرض کیا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کی ثناء فرمائی ہے۔ پس آپ ﷺ سوال کیجئے آپ ﷺ کو عطا کیا جائے گا تو حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی تلقین سے یہ سوال کیا۔(1)

۷ یعنی اس سے پہلے اغفر یا نسئلک فعل محذوف ہے۔

۸ مصیر کا معنی موت کے بعد لوٹنے کی جگہ ہے۔ یہ ان کی طرف سے بعث بعد الموت کا اقرار ہے۔ یہ چیز ایمان میں داخل ہے جو ہم نے صحیحین کی حدیث کو ذکر کیا ہے وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان کا قول سمعنا اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے واقع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کی حکایت اور ان پر ثناء کے طور پر اس کا ذکر کیا۔ یہ زیادہ راجح ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ٙ وَاغْفِرْ لَنَا ٙ وَارْحَمْنَا ٙ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

"ذمہ داری نہیں ڈالتا اللہ تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو [1] اس کی اس کو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا [2] اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کمایا [3] اے ہمارے رب نہ پکڑ ہم کو [4] اگر ہم بھول جائیں [5] یا خطا کر بیٹھیں [6] اے ہمارے رب نہ ڈال ہم پر بھاری بوجھ جیسے تو نے ڈالا تھا ان پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں [8] اے ہمارے پروردگار نہ ڈال ہم پر وہ بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں قوت نہیں [9] اور درگزر فرما ہم سے [10] اور بخش دے ہم کو [11] اور رحم فرما ہم پر [12] تو ہی ہمارا دوست (اور مددگار) ہے [13] تو مدد فرما ہماری [14] قوم کفار پر [15]"

۱ یعنی جتنی اس کی طاقت ہوگی یہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ احکام قدرت ممکنہ یا اس سے کم قدرت پر مبنی ہیں۔ نیز اس بات

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 263 (التجاریہ)

کی طرف بھی مشیر ہے کہ احکام قدرت میسرہ پر مبنی ہیں، جس طرح زکوٰۃ مال کے بڑھنے، سال کے گزرنے اور اس جیسی دوسری چیزوں پر مبنی ہیں نیز یہ اس بات پر دال ہے کہ انسان کو تکلیف ما لا یطاق کا مکلف نہیں بنایا گیا تاہم تکلیف ما لا یطاق کے ممتنع ہونے پر دلالت نہیں کرتا یہاں قدرت سے مراد فعل سے پہلے قدرت موہومہ موجود ہے جیسے اوامر، اعتقادات، ظاہری و باطنی اعمال کے احکام پر دلائل و براہین قائم ہونے کے بعد اسباب و آلات کی سلامتی۔ اس سے مراد حقیقی قدرت نہیں جو فعل کے واقع ہونے کے ساتھ ساتھ پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے خطاب اور عذاب حضرت نوح علیہ السلام اور فرعون کی قوم، ابوجہل اور اس جیسے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جن کے دلوں اور کانوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی، ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے اور ان کے بارے خبر دی کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت بندے کی قدرت میں نہیں ہے۔ اسی طرح وہ مشیت بھی بندے کی قدرت میں نہیں جو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ متعلق ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا راز ہے، اس پر ایمان لانا، اس سے خاموشی اختیار کرنا اور بحث نہ کرنا واجب ہے کیونکہ ایسا کرنا قدموں میں لغزش پیدا کر دیتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جسے شیخین نے اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے کہ جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر اس آیت وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ الخ کا نزول شدید ہوا تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے سکھانے سے یہ کہا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل کیا جس سے یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ میں یہ کہتا ہوں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول فَنَسَخَ بِهٰذَا ذٰلِكَ مجاز پر مبنی ہوگا کیونکہ نسخ کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ حکم شرعی کے ثبوت کے بعد اس حکم کو اٹھا دینا ہے، یہ صرف احکام میں ثابت ہوتا ہے، اخبار میں نسخ ثابت نہیں ہوتا۔ اس آیت میں دل کے افعال پر مؤاخذہ کا ذکر تھا اس میں طاقت بشریہ سے بڑھ کر کسی امر کے مکلف نہ بنانے کی خبر ہے۔ اس وجہ سے یہ حقیقی نسخ کا احتمال نہیں رکھتی مگر جب یہ آیت دل کے وسوسے کے بارے میں مؤاخذہ کے متعلق ان کے ظن کو زائل کرنے والی ہے اور ان کی تسلی کو ثابت کرنے والی ہے تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجازاً اسے نسخ قرار دیا۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ الآیۃ اگرچہ یہ خبر ہے تاہم نفس کے رذائل کی حرمت پر دلالت کرتی ہے جس طرح رب العالمین کا یہ فرمان كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ امر کو واجب کرنے پر دلالت کرتا ہے پس یہ اپنے صیغہ کی بناء پر حدیث نفس کو بھی شامل ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ یہ حدیث نفس پر مکلف نہ بنانے پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ یہ ہماری وسعت میں نہیں کسی چیز کو حرام قرار دینا مکلف بنانا ہے جبکہ یہ عدم تحریم پر دلالت کرتی ہے۔ پس یہ اس تحریم کے لئے ناسخ ہوگی جس کے بعض پر پہلی آیت مشتمل تھی واللہ اعلم۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان وساوس سے درگزر فرمایا ہے جو ان کے سینوں میں واقع ہوں، جب تک وہ ان پر عمل نہ کریں ان کا تکلم نہ کریں (1) متفق علیہ۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا، ابن عباس، عطاء رحمہما اللہ تعالیٰ اور اکثر مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ اس آیت سے مراد وہی حدیث نفس ہے جو اس آیت کریمہ میں مذکور تھی وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ الآیۃ میں یہ کہتا ہوں اس کا مطلب ہے کہ حدیث نفس دونوں آیتوں کے حکم یعنی مؤاخذہ اور مکلف نہ بنانے میں داخل ہے۔ پس نسخ لازم آیا جس طرح ہم نے پہلے ذکر کر دیا ہے، نہ کہ اس کا یہ مفہوم ہے کہ دونوں آیتوں کا حکم صرف حدیث نفس میں منحصر ہے بلکہ دونوں آیتوں کا عموم ظاہر ہے واللہ اعلم۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 343 (وزارت تعلیم)

فائدہ:۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ نفس کے رذائل پر مؤاخذہ اعضاء کے اعمال پر مؤاخذہ سے زیادہ شدید ہوتا ہے اور تکلیف مالا یطاق بھی واقع نہیں، میں امید رکھتا ہوں کہ مومن جب اپنے نفس کے رذائل کو مجاہدہ کے ذریعے ختم کرنے کے لئے حتی الامکان کوشش صرف کرے اور اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرے، اگرچہ اسے تکلف ہی کرنا پڑے اور فقراء کے دامن کے ساتھ وابستہ رہے جبکہ وہ ان برائیوں کو زائل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے رذائل کو بخش دے اور اس کا مؤاخذہ نہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے جن چیزوں سے منع کیا تھا ان سے بچنے کے لئے اس نے حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ان چیزوں کے بارے میں معاف کردینے کا وعدہ کررکھا ہے جو اس کے بس میں نہیں مگر وہ انسان جو نفس کے عیوب کو دیکھنے کی طرف متوجہ ہی نہ ہو اور اس کے رذائل کو ختم کرنے کا قصد ہی نہ کرے وہ ہلاکت کو دعوت دے گا اور جہنم میں داخل ہوگا۔ اسی طرح صوفیاء کرام کے طریقہ کو اپنانے کی فرضیت اور فقراء کے دامن سے وابستہ ہونے کی فرضیت یوں ہی ظاہر ہوتی ہے جیسے کتاب اللہ کی قرأت اور اس کے احکام کو سیکھنے کی فرضیت عیاں ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تمہارے درمیان دو ذیشان چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، ایک کتاب اللہ اور دوسری میں اپنی اولاد۔ اسے روایت کیا ہے(۱) پس قرآن کے احکام کے استنباط، ان پر عمل کرنے، نصیحت حاصل کرنے اور قرب کے مدارج کو طے کرنے کے لئے قرآن کے ساتھ وابستہ ہونا ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی ہدایت کے مطابق نفوس اور دلوں کو مہذب بنانے کے لئے آل رسول ﷺ کے دامن کو پکڑنا ضروری ہے(ب)۔

۲؎ ضمیر سے مراد نفس ہے۔ اعضاء یا دوسرے واسطہ سے جو اس نے بھلائی کا کام کیا ہے اس کا اجر اس نفس کے لئے ہے۔

۳؎ یعنی جو اس نے برائی کی اس کا بوجھ اسی پر ہے۔ یعنی اس کی طاعت کا نفع اور اس کی نافرمانی کا نقصان صرف اسی کو ہوگا خیر کو کسب کے ساتھ خاص کیا ہے۔ شر کو اکتساب کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ اکتساب میں زیادہ مشقت ہوتی ہے، برائی کو نفس چاہتا ہے، اس کی طرف انسان کو کھینچتا ہے۔ پس برائی کو حاصل کرنے کے لئے انسان کو زیادہ محنت و مشقت کرنا پڑتی ہے، اس لئے باب افتعال سے اسے ذکر کیا جبکہ خیر کے اندر یہ صورتحال نہیں ہوتی۔

۴؎ تقدیر کلام یوں ہے قُوْلُوْا رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا۔ اس کا معنی ہے ہمیں سزا نہ دے۔

۵؎ یعنی ہم بھول جانے کی وجہ سے اپنے اوپر واجب چیز کو ترک کردیں۔ نسیان ذکر کی ضد ہے۔

۶؎ توجہ کی کمی کی وجہ سے کام نہ کرسکیں۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نسیان اور خطا پر مؤاخذہ عقلاً ممتنع نہیں ہے کیونکہ گناہ زہر کی مانند ہیں جس طرح زہر کا کھانا انسان کو ہلاک کردیتا ہے، خواہ انسان خطا کھائے۔ اسی طرح گناہوں کا ارتکاب خواہ بغیر ارادہ کے ہوں، سزا تک لے جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہ کرے یا گناہوں کا ارتکاب سینے کی تنگی اور دل کے میل کو واجب کرتا ہے۔ حضرت شیخ شہید اپنے شیخ السید السند نور محمد بدایونی سے روایت کرتے ہیں جب آپ کی خدمت میں کوئی کھانا یا کوئی اور چیز پیش کی جاتی تو اپنی نظر بصیرت کے ساتھ اسے دیکھتے، اگر اس میں کوئی تاریکی نہ دیکھتے تو اسے تناول فرماتے یا استعمال کرتے یا کسی اور کو دے دیتے بعض اوقات ان کھانوں کو دفن فرمادیتے جو آپ کی خدمت میں تحفہ کے طور پر پیش کئے جاتے جس کا دل بینا نہ ہوتا وہ آپ سے بعض اوقات عرض کرتا اے شیخ آپ کیا کررہے ہیں؟ آپ یہ کھانا کسی اور کو کیوں نہیں دے دیتے۔ آپ فرماتے سبحان اللہ کیا کسی

(۱) مصنف نے مرجع کا ذکر نہیں کیا۔
(ب) جبکہ وہ خود دین مصطفوی پر کاربند ہوں، از مترجم۔

مسلمان کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ کسی کھانے میں زہر دیکھے خود تو نہ کھائے لیکن کسی اور کو دے دے تا کہ وہ اسے کھا لے۔ یہی وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو حضور ﷺ کے اس قول کے مخاطب ہیں" اپنے دل سے فتویٰ طلب کر اگرچہ مفتی تجھے فتویٰ دیں۔" لیکن سنت سے یہ بات ثابت ہے اور اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت پر فضل واحسان کرتے ہوئے خطا و نسیان سے درگزر فرمایا ہے، یہ دعا اس لئے وارد ہوئی تاکہ بندہ اس پر دوام کو طلب کرے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت سے خطا و نسیان اور جن چیزوں پر انہیں مجبور کیا گیا ہوا اٹھا لیا گیا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ حضور ﷺ کے فرمان رُفِعَ عَنْ اُمَّتِیَ الْخَطَأُ وَالنِّسْیَانُ کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا گناہ اس سے اٹھا لیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کا محاسبہ نہیں فرمائے گا، تاہم دنیا میں اس کو اٹھانے کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوگا کیونکہ خطا نسیان اور اکراہ سے عمل واقع ہوتا ہے اور محسوس ہے، یہ مرفوع نہیں ہے، ساتھ ہی دنیا دار العمل ہے، جب اس میں کوئی چیز واقع ہو تو مکلف کے لئے جہاں تک ہو سکے اس کا تدارک ضروری ہے۔ اسی حکمت کے تحت حضور ﷺ نے فرمایا جو نیند اور بھول جانے کی وجہ سے نماز ادا نہ کر سکا جب اسے یاد آئے تو اسے پڑھے۔ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ خطا و نسیان کی وجہ سے نماز، روزے اور دوسرے امور کی قضا ساقط نہیں ہوتی اور نماز میں بھول جانے کی وجہ سے بالاتفاق سجدہ سہو واجب ہوتا ہے اور قتل خطا کفارہ اور وراثت سے محرومی کو بالاتفاق ثابت کرتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دنیاوی احکام میں خطا و نسیان کا کبھی کبھی اعتبار کرتے ہیں۔

مسئلہ:۔ نماز میں بھول کر گفتگو کرنا، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک یہ نماز کو توڑ دیتی ہے اس دلیل کی بناء پر جو ہم نے پہلے کہی (1)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ کی حدیث کی وجہ سے بھول کر گفتگو کرنا نماز کو نہیں توڑتا کہا ہمیں نبی کریم ﷺ نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی آپ ﷺ نے دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دیا، پھر آپ ﷺ کے قبلہ کی جانب تنے کے پاس تشریف لائے۔ آپ ﷺ ناراضگی کے عالم میں اس کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ قوم میں حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی تھے۔ آپ ﷺ سے گفتگو کرنے سے ڈرے۔ جلدی کرنے والے لوگ نکلے، انہوں نے کہا نماز مختصر ہو گئی ہے۔ ذوالیدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھے، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ بھول گئے یا نماز مختصر ہو گئی۔ آپ ﷺ نے دائیں بائیں دیکھا، فرمایا ذوالیدین کیا کہتا ہے۔ لوگوں نے عرض کی اس نے سچ کہا، آپ ﷺ نے دو رکعت ادا فرمائی ہیں۔ آپ ﷺ نے دو رکعت مزید ادا فرمائیں۔ سلام پھیرا، پھر تکبیر کہی، پھر سجدہ کیا، پھر تکبیر کہی۔ آپ ﷺ نے سر اٹھایا، پھر تکبیر کہی، سجدہ کیا، پھر تکبیر کہی اور سر اٹھایا۔ متفق علیہ۔ ہم یہ کہتے ہیں یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ اور زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے ساتھ منسوخ ہے۔ زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث اس آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

مسئلہ:۔ جمہور کے نزدیک حج بھول کر جماع کرنے سے بھی فاسد ہو جاتا ہے جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ جسے مجبور کیا جائے اور غلطی کی طلاق ہمارے نزدیک واقع ہو جاتی ہے جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس سے اختلاف کیا ہے اس اختلاف کی بنیاد حضور ﷺ کے فرمان رُفِعَ عَنْ اُمَّتِیْ کی وضاحت کے اختلاف پر مبنی ہے۔

مسئلہ:۔ خطأ کھانا روزے کو توڑ دیتا ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ، صاحبین اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کا نقطہ نظر ہے۔ امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا روزہ نہیں ٹوٹتا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھول کر کھانا کھانے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے قیاس بھی یہی

---

(1) خطا و نسیان آخرت میں عتاب سے تو رافع ہے لیکن دنیا میں مرفوع نہیں۔

ہے جبکہ جمہور کے نزدیک فاسد نہیں ہوتا۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھول کر کھانے سے روزہ نہ ٹوٹنے کا قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے کہا ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے جب تم میں سے کوئی بھول جائے، اس نے کھایا، پیا، پس اسے چاہئے کہ روزہ مکمل کرے، بے شک اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا اور پلایا۔(1) متفق علیہ۔

مسئلہ:۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ذبح کرتے وقت ذابح بھول کر بھی تسمیہ نہ پڑھے تو اس کا ذبیحہ حرام ہو جاتا ہے جبکہ ہمارے نزدیک خلاف قیاس حدیث طیبہ کی وجہ سے حرام نہیں ہوتا۔ ہم اس مسئلہ کی وضاحت سورۃ انعام میں مفصل کریں گے ان شاء اللہ۔

فائدہ:۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بنو اسرائیل جب ایسی چیز کو بھول جاتے جس کا انہیں حکم دیا گیا ہوتا یا خطا کرتے تو ان کے لئے عذاب جلد آجاتا تو ان کے گناہ کے حساب سے ان پر کھانے یا پینے والی کوئی چیز حرام ہو جاتی۔(2)

۷ اصر کا معنی بھاری بوجھ ہے جو اٹھانے والے کو حرکت کرنے سے روک دیتا ہے۔ یہاں اس سے مراد سخت احکام ہیں جن کو ادا کرنے کی انسان میں طاقت نہیں ہوتی۔

۸ الذین سے مراد یہود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر پچاس نمازیں فرض کی تھیں اور زکوٰۃ کے طور پر چوتھائی مال دینے کا حکم دیا تھا، کپڑے کے جس حصہ پر نجاست لگ جاتی اس کو کاٹنا پڑتا، جو کوئی گناہ کرتا تو صبح کے وقت وہ گناہ اس کے دروازے پر لکھا ہوتا۔ جب انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی انہیں کہا گیا اپنے رب کی بارگاہ میں توبہ کرو لہذا اپنے آپ کو قتل کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اصر سے مراد ایسا گناہ ہے جس پر توبہ نہ کی جائے۔

۹ بہ کی ضمیر سے مراد بلاء اور عقوبت ہے یا مشکل احکامات ہیں۔ یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تکلیف مالا یطاق (ایسے امور کا مکلف بنانا جو انسان کے بس میں نہ ہوں) جائز ہے اگرچہ فضل و احسان کے طور پر شرع کی طرف سے ان کا عدم وقوع ثابت ہے۔ یہاں لا تحملنا کو مشدد لانا فعل کو دوسرے مفعول کی طرف متعدی کرنے کی وجہ سے ہے۔

۱۰ یعنی ہمارے گناہوں پر ہمیں عذاب نہ دے۔

۱۱ یعنی ہمارے گناہ بخش دے اور ان پر پردہ ستر ڈال دے۔

۱۲ ہم پر رحم فرما کیونکہ ہم کوئی نیکی نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی برا عمل چھوڑتے ہیں مگر تیری رحمت کے ساتھ ہی لا حول ولا قوۃ الا بک۔

۱۳ مولی کا معنی سردار، مددگار، محافظ اور ولی ہے۔

۱۴ یہ ولایت کی وضاحت ہے کیونکہ آقا کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے غلاموں اور جماعتیوں کی مدد کرے۔

۱۵ کفرین سے مراد جن و انس میں سے عام کافر ہیں یہاں تک کہ نفس امارہ بھی اس میں شامل ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب سورۃ بقرہ کو ختم کرتے تو آمین کہتے(3) صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی وہ حدیث ہے جو ہم نے پہلے ذکر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نعم کہا جب حضور ﷺ نے ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا پڑھا، اللہ تعالیٰ نے نعم فرمایا۔ اسی طرح جب آپ ﷺ نے دوسرا جملہ من قبلنا تک پڑھا تو اللہ تعالیٰ نے نعم فرمایا اور

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 986 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 264 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 265 (التجاریہ)

تیسرا جملہ مَالَا طَاقَةَ لَنَابِهٖ پڑھا تو اللہ تعالیٰ نے نعم فرمایا اور جب چوتھا جملہ سورت کے اختتام تک پڑھا تو اللہ تعالیٰ نے نعم فرمایا۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک مروی روایت جو امام مسلم اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں موجود ہے، میں نعم کی جگہ یہ الفاظ ہیں کُلَّ ذٰلِکَ قَدْ فَعَلْتُ یہ سب میں نے کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی ایک روایت ہے کہ غُفْرَانَکَ کے بعد قَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ فرمایا اَوْ اَخْطَاْنَا کے بعد لَا اُوَاخِذُکُمْ فرمایا، لَاتَحْمِلْ عَلَیْنَا کے بعد لَا اَحْمِلُ عَلَیْکُمْ فرمایا، لَا تُحَمِّلْ کے بعد لَا اُحَمِّلُکُمْ اور وَاعْفُ عَنَّا آخر تک کے بعد قَدْ عَفَوْتُ عَنْکُمْ وَغَفَرْتُ لَکُمْ وَرَحِمْتُکُمْ وَنَصَرْتُکُمْ عَلَى الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ فرمایا۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا کو قبول فرماتا ہے۔ نسیان اور خطا پر عدم مواخذہ تمام امت کے حق میں بالا جماع ثابت ہے۔ اسی طرح اصر کو نہ اٹھوانا اور جس کی طاقت نہ ہو اس کو لازم نہ کرنا بھی ثابت ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ نفس پر اس کی طاقت کے مطابق احکام لازم فرماتا ہے) کیونکہ شرع ایک ہی ہے دائمی ہے جو امر پہلے لوگوں سے ساقط ہے وہ بعد والے لوگوں سے بھی ساقط ہے۔ نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی نسخ نہیں جہاں تک تمام گناہوں سے معافی اور بخشش، رحمت عام اور کافروں کے خلاف نصرت ظاہر بات یہ ہے کہ ان امور میں دعا کی قبولیت نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کے ساتھ خاص ہے۔ جس پر حدیث کے فعل ماضی کے الفاظ قَدْ عَفَوْتُ، غَفَرْتُ، رَحِمْتُ اور نَصَرْتُ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں، ورنہ مرجیہ کا مذہب لازم آئے گا بلکہ تمام کے تمام گناہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت داخل ہیں، اگر چاہے تو بخش دے اگر چاہے تو عذاب دے۔ اسی وجہ سے آپ دیکھتے ہیں کہ بہت سارے مواقع پر کفار کے خلاف مدد ثابت نہیں ہوئی۔ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ نصرت تو ولایت پر مرتب ہے جس پر فاء کا کلمہ دلالت کرتا ہے تو معاصی کے ارتکاب پر مدد کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔ اے اللہ حضور ﷺ کی امت کو بخش دے، اے اللہ حضور ﷺ کی امت پر رحم فرما، اے اللہ حضور ﷺ کی امت کو درست فرما دے۔

فصل:۔ سورۂ فاتحہ کے فضائل میں اس فرشتے کا قول گزر چکا ہے جو آسمان سے نازل ہوا، اس نے حضور ﷺ کو عرض کی آپ ﷺ کو دو نوروں کی خوشخبری ہو جو آپ ﷺ کو عطا کئے گئے جبکہ یہ آپ ﷺ سے قبل کسی نبی کو عطا نہیں کئے گئے۔ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں میں سے آپ کوئی حرف نہیں پڑھیں گے مگر وہ آپ کو عطا کر دیا جائے گا یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو دعا کرنے کا سلیقہ سکھایا، اِهْدِنَا سے لے کر سورت کے اختتام اور رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا سے لے کر سورت کے اختتام تک یہ ہمارے نبی ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ کی تمام امت قیامت تک گمراہ نہ ہوگی۔ حضور ﷺ نے فرمایا میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی (مصنف نے حوالہ ذکر نہیں کیا) اور فرمایا میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہے گی، جو اسے چھوڑ جائے وہ انہیں کچھ تکلیف نہ دے سکے گا اور نہ ان کی مخالفت کرنے والا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آ پہنچے تو وہ اس وقت بھی اسی حالت پر ہوں گے۔ شیخین نے اپنی اپنی صحیح میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضور ﷺ کو معراج کرایا گیا، آپ ﷺ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے۔ سدرۃ المنتہیٰ چھٹے آسمان میں ہے زمین سے جو چیز عروج کرتی ہے وہ یہاں تک پہنچتی ہے، پس اسے قبض کر لیا جاتا ہے، جو اوپر سے نیچے آتی ہے وہ بھی یہاں آ کر رک جاتی ہے اور اسے قبض کر لیا جاتا ہے۔ فرمایا: اِذْ یَغْشَى السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰى (جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا

تھا)، یہ سنہری فراش ہے، کہا حضور ﷺ کو تین چیزیں عطا کی گئیں، پانچ نمازیں عطا کی گئیں، سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں عطا کی گئیں اور آپ ﷺ کی امت میں سے جو شرک نہیں کرتا اس کے گناہ بخش دیئے گئے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہ کبیرہ بخشنے کا وعدہ کیا یا اس صورت میں کہ گناہ گار توبہ کرے یا اس صورت میں کہ جس کے حق میں وہ چاہے اپنی رحمت کے ساتھ انہیں بخش دے، اگرچہ وہ توبہ نہ کرے یا سزا کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ بخش دے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مومن گناہ کبیرہ کی وجہ سے ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا، جس طرح معتزلہ، روافض اور خوارج کا نقطۂ نظر ہے، اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل و رسوا کرے۔ حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ان دو آیتوں کو رات میں پڑھا اس کے لئے یہ کافی ہو جاتی ہیں۔ اسے چھ ائمہ نے روایت کیا ہے۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے ایک تحریر لکھی (1) جس میں یہ دو آیتیں نازل فرمائیں جن کے ساتھ سورۂ بقرہ کو ختم کیا، ایسا نہیں ہو سکتا کہ تین راتوں میں یہ دو آیتیں ایک گھر میں پڑھی جائیں تو شیطان اس گھر کے قریب بھی آئے (1)۔ اسے بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے اللہ تعالیٰ نے یہ دو آیتیں جنت کے خزانوں میں سے نازل فرمائیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی پیدائش سے دو ہزار برس پہلے اپنے دست قدرت سے لکھا، جس نے ان دو آیتوں کو عشاء کی نماز کے بعد پڑھا تو یہ رات بھر کی عبادت کے قائم مقام ہو جائیں گی۔ اسے ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے کامل میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ سورت جس میں بقرہ (گائے) کا ذکر ہے وہ قرآن کا (فسطاس) میزان ہے، پس اسے سیکھو کیونکہ اس کو سیکھنا برکت ہے اور اس کا چھوڑنا حسرت ہے، بطلہ اسے سیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ عرض کی گئی بطلہ کون ہیں؟ فرمایا جادوگر۔ دیلمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو مسند الفردوس میں نقل کیا ہے۔

---

(1) یہ مدت متشابہات میں سے ہے اس کی حقیقت سے اللہ اور اس کا پیارا رسول ہی آگاہ ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 286